جیتوں تو تجھے پاؤں

سعدیہ عابد



جیتوں تو تجھے پاؤں

سعدیہ عابد

''زندگی بھی عجیب شے ہے، دھوپ چھاؤں کا امتزاج لیے کبھی بہت مہربان، کبھی بہت اجنبی، آزمانے پر آئے تو تخت کو تختہ کر دے، مہربانی کرنے پر آمادہ ہو تو تختہ کو خوش بختی کی علامت بنا دے۔'' وہ لان میں کین کی کرسی پر بیٹھی گہری سوچ میں تھی۔اس کی آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ کر کے اس کے رخساروں پر لڑھک رہے تھے اور وہ زندگی کے یکدم نئے روپ پر حیران و پریشان بیٹھی تھی۔اس نے نگاہ در و دیوار پر دوڑائی تھی اس نے اتنے عالیشان گھر میں رہنے کا تصور تو دور کبھی خواب میں بھی ایسی تمنا نہ کی تھی اور وہ بنا کسی خواب و خیال میں ڈوبے آج اس جگہ موجود تھی جو نہ اس کی تھی اور نہ ہی ہو سکتی تھی۔ یہ حسین جنت عارضی تھی۔کبھی بھی اس سے واپس لی جا سکتی تھی اور وہ چھن جانے کے غم میں ہرگز بھی دبلی نہیں ہو رہی تھی جو غم اسے رلا رہا تھا وہ اس عارضی جنت میں قدم بوسی کرنے سے جڑا تھا کہ وہ اپنی جنت چھوڑ کر اس جنت تک چلی تو آئی تھی مگر اس کی نہ رضا شامل تھی اور نہ ہی خوشی اس لئے اسے یہاں وحشت سی ہو رہی تھی، اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا وہ کئی گھنٹوں سے مستقل رو رہی تھی اور آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

کافی دیر سے وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا اسے مستقل روتے دیکھتا پریشان کم حیران زیادہ ہو رہا تھا مگر سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس صورتحال میں کرے تو کیا کرے کہ وہ اس طرح کی صورتحال میں پہلی بار گرفتار ہوا تھا۔ جب کچھ سجھائی نہیں دیا تھا تو اس نے کھڑکی سے ہٹ کر بیڈ کی طرف رخ کیا تھا اور تکیہ کے پاس پڑا موبائل اٹھا کر ایک نمبر ڈائل کیا تھا۔کال ریسیو کرنے والے کو ہدایت دی تھی اور کچھ مطمئن ہوتا موبائل بیڈ پر اچھالتا شاور لینے کے ارادے سے واش روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

''آپی! تم سمجھ کیوں نہیں رہیں، بہت مجبور ہو کر میں نے تمہارے لیے یہ فیصلہ لیا ہے اور تم مجھے کمزور کر رہی ہو'' وہ ابسام حیدر کے بلانے پر ''حیدر کاٹیج'' آیا تھا اور آبدار اور کزئی کے چہرے کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا وہ اس کا ہاتھ تھامے نرمی سے بولتا چلا گیا تھا کہ اس کا چہرہ رونے کا غماز تھا اس کی آنکھیں گریہ وزاری کا مظہر تھیں۔ایسے میں آئیکت اور کزئی برداشت کی کس منزل پر جا کھڑا ہوا تھا بس وہی جانتا تھا اور وہ اس کے کاندھے سے لگ کر ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔

''آئیکت! آپ مجھے یہاں سے لے جائیں۔ میں نے یہاں نہیں رہنا۔ میں یہاں نہیں رہ پاؤں گی۔ یہاں میں مر جاؤں گی آئیکت ......'' وہ اُس کے کاندھے سے سر ٹکائے روتے ہوئے بولتی اس کی آزمائش بن گئی تھی۔

''جان آئیکت! میں نے تمہیں یہاں نہ چھوڑا، یہاں سے لے گیا تو تم پھر بھی مر جاؤ گی۔تمہاری زندگی کے لیے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔'' وہ اس کو خود سے دور کرتا اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولا تھا۔

''وہاں میں شاید زندہ رہ جاؤں آئیکت! یہاں تو میں سچ میں مر جاؤں گی۔'' اس نے سسکی بھری تھی۔

''فضول باتیں مت کرو آبی! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ جو کچھ کر رہا ہوں تمہاری زندگی اور مستقبل کی حفاظت کے لیے کر رہا ہوں۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا آبی! اور میں یہ سب بس تمہیں پانے کے لیے کر رہا ہوں۔ تم میرے لیے خود سے زیادہ اہم ہو اور میں نے تمہاری حفاظت کے خیال سے اگر تمہیں یہاں ایک اجنبی، غیر محرم شخص کے پاس لا چھوڑا ہے تو میری مجبوری کی انتہا کو سمجھو۔'' وہ اس کے آنسو اپنے دل پر گرتے محسوس کر رہا تھا۔ اس کی ایک ہی واپسی کی تکرار اسے زچ کر رہی تھی مگر سامنے کھڑی لڑکی تو دل بن کر سینے میں دھڑکتی تھی تو ایسی لڑکی پر وہ چاہ کر بھی غصہ نہیں ہو سکتا تھا بہت بے چینی سے اسے کاندھے سے لگا کر نرمی سے اسکے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا تھا۔

''میں سب سمجھتی ہوں آئیکت، مگر وہاں صرف جان و مستقبل کو خطرہ تھا اور یہاں میں اپنی عزت ہتھیلی پر لیے بیٹھی ہوں۔ ایک ڈر کے ساتھ دوسرا ڈر بھی میرے ذہن و دل سے آ چمٹا ہے۔ یہ ذہنی اذیت مجھے مار ڈالے گی۔'' وہ سینے سے اس کی شرٹ دبوچے سسک رہی تھی۔

''ایسا کبھی خیال بھی ذہن و دل میں نہ لانا کہ اپنی عزت کی حفاظت کے لیے میں نے جس شخص کا انتخاب کیا ہے اس پر بہت بھروسہ ہے، بہت مان ہے۔'' اس نے آبدار کو فاصلے پر کر کے اس کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھا تھا۔ وہ بہت ہراساں لگ رہی تھی۔

''اپنی عزت کا محافظ میں نے کسی ایسے ویسے شخص کو نہیں بنایا آبی! مجھے یقین ہے کہ ابسام مرتے مر جائے گا مگر میرا مان بکھرنے نہیں دے گا۔ تمہیں وہ میلی آنکھ سے تو کیا کبھی نظر بھر کے بھی نہیں دیکھے گا۔'' وہ بہت چونک کر آئیکت اور کزئی کو دیکھنے لگی تھی کہ جو بات وہ واضح طور پر کہنے سے قاصر تھی اس کے ڈھکے چھپے انداز میں کہنے پر بھی نہ صرف وہ سمجھا تھا بیان بھی کر گیا تھا وہ آگے سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے موقع ہی نہیں دیا تھا۔

''ہر خدشہ، ہر ڈر ذہن سے نکال دو کہ میں جانتا ہوں کہ اس روئے زمین کا ذرہ ذرہ تم پر تنگ ہو سکتا ہے مگر اس جگہ کی ہوا بھی کبھی تم پر تنگ نہیں پڑ سکتی جہاں ابسام حیدر ہو گا، جہاں ابسام حیدر ہو گا وہاں تمہاری جان عزت و آبرو سب کچھ محفوظ ہو گا کہ ایک اپنے بعد میں اگر تمہارے معاملے میں کسی پر اعتبار کر سکتا ہوں تو وہ صرف ابسام حیدر ہے۔ مان ہے، بھروسہ ہے مجھے ابسام پر، اس لیے تم اپنے نہیں میرے بھروسے کی روشنی میں یہاں رہو کہ تمہیں ذرا بھی آنچ نہ آئے گی تمہارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' وہ دھیمے دھیمے بولا تھا اس کے لفظ لفظ میں ابسام حیدر کی دوستی کے لیے مان تھا، بھروسہ تھا وہ متحیر کھڑی تھی۔ اس نے بچپن سے یہ نام بہت سنا تھا۔ بہت تعریفیں سنی تھیں مگر کبھی ملی نہیں تھی۔ دیکھا تک نہ تھا تقریبا سات سے آٹھ گھنٹہ پہلے اس نے ابسام حیدر کو اپنے روبرو دیکھا تھا۔ انتہائی وجیہہ شخص، آنکھوں میں احترام لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس پر سلامتی بھیج رہا تھا اور اس نے نظر اس پر سے ہٹا کر آئیکت کو دیکھا تھا جو بہت مطمئن سا کھڑا تھا۔ اس نے منمناتے لہجے میں سلامتی کا جواب دیا تھا۔ تب ہی آئیکت اس شخص سے دھیمے لہجے میں بات کرنے لگا تھا اسے وہی ہدایات دے رہا تھا جو اسے دے کر یہاں لایا تھا۔ اس بے حد خوبصورت دکھائی دینے والے انسان نے مسکرا کر آئیکت کو مطمئن کر دیا تھا۔ وہ آئیکت کو روکنے کے

لیے بڑھی تھی، روئی تھی۔ یہاں نہ ٹھہرنے کی منت کی تھی اور وہ اس اجنبی شخص کے سہارے اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ یکدم خود کو کھلے آسمان تلے محسوس کرنے لگی تھی کہ اس شخص نے آبدار کو ملازمہ کے ساتھ اندر جانے کا کہا تھا مگر وہ اندر جا نہیں پائی تھی کچھ دیر تک کھڑے رہنے کے بعد وہیں لان کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے وہاں بیٹھے کتنی دیر ہوئی تھی۔ وہ مستقل کتنے گھنٹوں تک روتی رہی تھی مگر یکدم آئیکت کی آمد نے اسے پرسکون کر ڈالا تھا۔ وہ خود کو محفوظ سمجھنے لگی تھی۔

آئیکت سے کہنے کو کوئی رشتہ نہ تھا اور دیکھا جائے تو ہر رشتہ ہی اس سے جڑا تھا۔ آبدار کا تایا زاد، اس کا کزن آئیکت اور کزئی جو اس پر جان و دل سے فدا تھا، جس کو آبدار سے محبت نہیں عشق ہے، اور وہ بھی اس کے لیے اپنے دل میں ایک نرم گوشہ رکھتی ہے مگر جسے زمانہ محبت یا عشق کہتا ہے وہ اس نے کبھی آئیکت کے لیے محسوس نہیں کیا، وہ پروانے کی مانند لمحہ لمحہ آبدار پر نثار ہوا اسے بے حد اچھا بھی لگا مگر محبت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ اس کی موجودگی میں آبدار نے خود کو بہت محفوظ تصور کیا مگر عشق محسوس نہیں ہوا۔ آئیکت کی بے پناہ چاہت کے باوجود وہ اسے بس ایک کزن، ایک اچھا دوست ہی لگا، ہاں بہت اچھا دوست، وہ آبدار کو خود سے زیادہ اہم کہتا ہے اور آبدار کو وہ دوست کی حیثیت سے اہم لگا ضرور مگر آئیکت کی مانند اس کے دل میں کبھی اسے دیکھ کر ہلچل نہیں ہوئی۔ آبدار پر خوشیوں کا دائرہ تنگ ہونے لگا تو وہ اس کے مستقبل کی حفاظت کے لیے اسے یہاں لے آیا اور اس کے ڈر کو ختم کرنے کے لیے آئیکت نے اس شخص کی اہمیت آبدار کو باور کروائی تھی اور وہ آگے سے چپ ہو گئی تھی کہ جانتی تھی کہ یہ ابسام حیدر، آئیکت اور کزئی کی زندگی میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بس آنسو بڑی خاموشی سے پلکوں کی دہلیز سے رخساروں تلے آ گرے تھے کہ وہ آئیکت کو سب کچھ کہہ دینے، سمجھا دینے کے باوجود اپنے محسوسات کہہ نہیں پا رہی تھی کہ وہ ابھی آئیکت کے اعتبار کی روشنی میں اس شخص کو دیکھ ضرور رہی تھی محسوس نہیں کر رہی تھی کہ اس کے ذہن و دل پر تو اس کے اپنے محسوسات کا راج تھا اور اس کے محسوسات فی الحال کچھ اچھے نہ تھے۔ وہ آبدار کو کسی انہونی کا پتہ دے رہے تھے اس لیے وہ ایک لمحہ یہاں نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی مگر وہ یہ بات آئیکت کو سمجھانے میں ناکام ہو گئی تھی اور وہ اسے چھوڑ کر پھر سے چلا گیا تھا اور اب اس کے ہمراہ کچھ اور ہدایات بھی تھیں۔ جیسے کہ اس نے رونا نہیں تھا، اس نے ابسام حیدر سے ڈرنا نہیں تھا، اس نے ابسام حیدر کے گھر کو اپنا گھر سمجھنا تھا اس نے ہر خدشہ ہر ڈر کو ذہن و دل سے نکال کر ''حیدر کاٹیج'' میں رہنا تھا مگر وہ جانتی تھی یہ کہنا آئیکت کے لیے جتنا آسان تھا اسے سہنا آبدار کے لیے اتنا ہی دشوار، آئیکت واپس جا چکا تھا اور وہ ملازمہ کی ہمرائی میں ایک ویل ڈیکوریٹڈ بیڈروم میں آ گئی تھی۔ آبدار جو حسن پرست تھی جسے خوبصورتی فوراً اپنی جانب کھینچتی تھی۔ یہاں آ کر گویا اس کی ہر حس ہی سو گئی تھی۔ اس نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی تھی جو رات کے ساڑھے گیارہ بجا رہی تھی۔ اس نے اپنے آنسو دوپٹہ کے کونے سے رگڑے تھے۔ اس کا ارادہ وضو کر کے نماز عشاء کی ادائیگی کا تھا۔ وہ واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔ وضو کر کے آئی تھی تو ملازمہ کھانے کی ٹرے سجائے کمرے میں موجود تھی۔

ملازمہ کو اس نے ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کا کہا تھا اور ڈسٹرب نہ کرنے کا کہہ کے روم لاکڈ کر دیا تھا اور مصلہ بچھا کر نماز کی نیت

باندھ لی تھی اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔اسے نماز پڑھنے میں مشکل ہو رہی تھی مگر اس نے پوری 17 رکعات ادا کی تھیں اور تسبیح فاطمہ کے بعد دعا کو ہاتھ بلند کیے تھے۔لب سے کوئی دعا آزاد نہ ہوئی تھی۔بس سسکیاں بلند ہونے لگی تھیں۔

''یا اللہ! تُو تو سب کچھ جانتا ہے...... میرے لیے آسانی عطا فرما۔'' آبدار کا سر بے اختیار سجدہ ریز ہوا تھا۔اس نے پیشانی مالک کل کے سجدہ میں رکھی تھی اور ہچکیوں کے درمیان اتنا ہی بول پائی تھی پوری رات یونہی مصلّہ پر گزری تھی۔سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔آنے والی زندگی کے لیے خدشات تھے مگر اپنے رب سے سب کچھ کہہ دینے کے بعد اس کی رحمت کا سایہ طلب کرنے کے بعد وہ کچھ مطمئن تھی۔رات بھر کھانے کی ٹرے یونہی ٹیبل پر رکھی رہی تھی۔اس نے صبح چھ بجے کا بس ایک سلائس لیا ہوا تھا مگر بھوک کا احساس نہ تھا۔رات مصلّہ پر بسر ہوئی تھی۔ فجر کی اذان کے ساتھ اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے وضو کر کے نماز ادا کی تھی اور رات کی نسبت اب خشوع وخضوع سے اپنے حق میں رب سے مناجات کی تھیں اور بستر پر آ کر لیٹ گئی تھی۔اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ نرم گرم بستر پر اسے کس وقت نیند آئی۔اس کی آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک پر کھلی تھی اور وہ بھاری ہوتے سر کے ساتھ اٹھ بیٹھی تھی۔پے در پے ہونے والی دستک اسے جگا رہی تھی اس نے مندی مندی آنکھوں سے گھڑی کی جانب دیکھا تھا۔صبح کے نو بج رہے تھے اور اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔دروازے پر ملازمہ تھی جو اسے ناشتہ کے لیے بلانے آئی تھی۔آبدار کو یکدم بھوک کا احساس ہوا تھا مگر اس نے باوجود بھوک کے ''بھوک نہیں ہے'' کہہ کر دروازہ بند کر دیا تھا مگر اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ملازمہ نے کمرے سے باہر سے ہی ٹیبل پر رکھی کھانے کی بھری ہوئی ٹرے نہ صرف دیکھی تھی ابسام حیدر کو جا کر بتا بھی دیا تھا اور ابسام کچھ دیر بعد بہ نفس نفیس خود آبدار کے لئیے مختص کمرے کے دروازے پر دستک دے گیا تھا۔اس کے تو وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دروازہ کھولے گی تو سامنے وہ اجنبی شخص کھڑا ہوگا۔ان دونوں کی نگاہ ٹکرائی تھی ایک کی نگاہ احترام سے تو دوسری کی نگاہ جھجک کر جھک گئی تھی۔

''ڈسٹرب کرنے کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں مگر بوا نے بتایا کہ آپ نے رات کھانا نہیں کھایا تھا اور ناشتہ کے لیے بھی انکار کر چکی ہیں، یہ اچھی بات نہیں ہے، آپ پلیز، ناشتہ کے لیے ڈائننگ ہال میں آجایئے میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔'' ابسام حیدر براہ راست آبدار سے پہلی طویل بات کہہ کر واپس جا چکا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈائننگ ہال میں آ گئی تھی۔جہاں ملازمہ کافی مستعد تھی اور آبدار کے سامنے ناشتہ کے مختلف لوازمات رکھتی جا رہی تھی کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا تھا اور ایک سلائس اٹھا کر دانتوں سے کترنے لگی تھی۔اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ کسی اجنبی گھر میں ایک اجنبی کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرے گی، سلائس اس کے حلق میں اٹکنے لگا تھا اس نے ہاتھ میں موجود بقیہ سلائس پلیٹ میں رکھا اور تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں سے نکل گئی تھی۔اسے نہیں پتہ تھا کہ اس کے اس طرح آنے پر ابسام حیدر نے کیا سوچا تھا۔اس نے ناشتہ پورا کیا تھا یا نہیں مگر اس نے اپنے کمرے میں آ کر ہی دم لیا تھا اور آنسو پھر رخساروں پر لڑھکنے لگے تھے۔

''یا اللہ! مجھے اس آزمائش سے نکال دے میں تیری آزمائش کے قابل نہیں۔ یا اللہ تو مجھے سکون دے۔ مجھے میرے اپنوں کے درمیان واپس بھیج دے۔'' آبدار کے لب سے دعا نکلی تھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

ابسام حیدر نے ہاتھ میں موجود سلائس پلیٹ میں رکھا ملازمہ کو آبدار اور کزئی کا خیال رکھنے کی ہدایت کی اور آفس کے لیے نکل گیا۔ وہ اس لڑکی کو لے کر بہت ڈسٹرب تھا کہ وہ دوست کی محبت اس کی دوستی میں بہت بڑی ذمہ داری قبول کر چکا تھا مگر وہ لڑکی اسے بہت ڈسٹرب کر رہی تھی وہ آنے والے وقت کا سوچ کر ہی مضطرب ہوا جا رہا تھا کہ اس کے پاس آئیکت کی کال آ گئی تھی۔ وہ آبدار کے لیے پریشان تھا اور اس نے جو بات تھی سچائی سے کہہ دی تھی۔

''اسے سیٹ ہونے میں ٹائم لگے گا ابسام، مگر وہ دھیرے دھیرے سیٹ ہو جائے گی۔'' آئیکت تھکے تھکے سے انداز میں بولا تھا اور ابسام اسے پریشان نہ ہونے کی ہدایت کرنے لگا تھا اور اسے سمجھانے لگا تھا۔

''پریشان تو بہت ہوں کہ یہاں سب آبدار کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ بابا اور چچا جان اس کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں اور وہ پاگل خود بھی اپنی جان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔ تم جانتے ہو نا ابسام کہ آبی میرے لیے کیا معنی رکھتی ہے، رات بھر سو نہیں سکا صرف اس خیال سے کہ وہ رو رہی ہوگی، وہ جاگ رہی ہوگی، مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ سب کب اور کیسے ٹھیک ہوگا۔''

اس نے دوست کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہ ابسام حیدر سے کچھ بھی نہیں چھپاتا تھا۔ دونوں کا ففتھ کلاس سے ساتھ تھا۔ تعلیم کے تمام مدارج دونوں نے ساتھ طے کیے تھے دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ ابسام حیدر جانتا تھا کہ اسے اپنی کزن سے محبت نہیں عشق ہے اور صرف دوست کی محبت میں اس نے اتنا بڑا رسک لیا تھا اور اس کی پریشانی محسوس کر کے اسے سمجھانے لگا تھا۔

''تم پریشان نہ ہو اللہ سب بہتر کر دے گا۔'' اس نے دوست کو پریشان نہ ہونے کی ہدایت کی تھی اور رابطہ منقطع کر کے گھر فون کر کے ملازمہ سے رپورٹ لی تھی جو ہرگز بھی اطمینان بخش نہ تھی۔ وہ اس بات کو سمجھتا تھا کہ آبدار کو سیٹ ہونے میں، ساری صورتحال کو قبول کرنے میں وقت لگے گا۔ اس لیے وہ سب کچھ وقت پر چھوڑتا میٹنگ کے لیے نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

بابا جان! اتنی کڑی نگرانی میں آبدار کا یہاں سے نکلنا ناممکنات میں سے تھا، مجھے تو لگتا ہے اس کے پیچھے کسی اور کا دماغ کارفرما ہے کہ آبدار سے ایسی توقع ہی عبث ہے۔'' اور کزئی ہاؤس میں کل صبح آٹھ بجے سے گویا صف ماتم بچھی ہوئی تھی کہ اس گھر کی بیٹی آبدار اور کزئی گھر سے بھاگ گئی تھی اور کزئی خاندان کی عزت کا جنازہ نکال گئی تھی وہ لوگ اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتے رہے تھے۔ ایک نیا سورج طلوع ہو گیا تھا مگر ان کی زندگی میں اب تک پرانے سورج کی تاریکی نصب تھی وہ سب ایک دوسرے سے نظر چرائے پھر رہے تھے۔ اپنے تمام اختیارات و ذرائع استعمال کرنے کے باوجود بھی وہ آبدار کو تلاش کرنے میں ناکام رہے تھے اور یہ ناکامی ان سب کے لیے کسی تازیانے

سے کم نہ تھی سب ہی بپھرے ہوئے شیر بنے ہوئے تھے اور سب سے بری حالت شاہ زیب اور کزئی کی تھی۔ اسے آبدار کے فرار ہونے کا اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ اسے یہ سب آبدار کی نہیں آئیکت اور کزئی کی سازش لگ رہی تھی اور وہ کل سے یہ سب نہ صرف سوچتا رہا تھا اس نے آئیکت پر کڑی نگاہ بھی رکھی ہوئی تھی لیکن باوجود کوشش کے وہ کوئی سراغ پا نہیں سکا تھا مگر آج سب کے سامنے وہ اس پر شک کا اظہار کر ہی گیا تھا اور شاہ زیب کا اشارہ وہ سب ہی صاف محسوس کرتے آئیکت کو دیکھنے لگے۔

''شاہ زیب کا دماغ خراب ہے آپ لوگ بہتر ہوگا اس کی طرح حماقت کا مظاہرہ نہ کریں اور مجھ پر شک کر کے وقت ضائع کرنے کے بجائے اس گھٹیا لڑکی کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں جو ہماری عزت نیلام کر گئی ہے۔'' وہ اندر ہی اندر شاہ زیب کے درست اندازے سے خائف تھا کہ وہ کل سے ہی خود کو شاہ زیب کی کڑی نگاہ کے حصار میں پا رہا تھا مگر امید نہ تھی کہ وہ سب کے سامنے اپنے شک کو زبان دے دے گا مگر وہ ایسا کر گیا تھا تو آئیکت کو خود کو کمپوز کر کے سخت غصہ میں ظاہر کرنا پڑا تھا مگر اس نے آبدار کے لیے گھٹیا کا لفظ جس دل سے ادا کیا تھا وہی جانتا تھا اور شاہ زیب جو اس کو جانچتی نگاہ سے دیکھ رہا تھا اس کے چہرے کے رنگ کو بدلتے دیکھ کر وہ اپنے شک کو گہرا ہوتے ہوئے محسوس کرتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''تم کچھ بھی کہو مجھے کم از کم تم پر اعتبار نہیں ہے۔ میں برملا کہتا ہوں کہ آبدار کے غائب ہونے میں تمہارا ہاتھ ہے۔'' شاہ زیب اب کے کھل کر بولا تھا اور آئیکت کو خود کو کمپوز رکھنا مشکل ہو رہا تھا مگر وہ جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا اس نے مضبوط قوت اعصاب کا مالک ہونے کا ثبوت فراہم کیا تھا۔

''تم مجھے شک کے کٹہرے میں کھڑا کر بھی کیسے سکتے ہو شاہ زیب کہ اس سب میں سب سے زیادہ نقصان میرا ہی ہوا ہے۔'' وہ غصہ سے شاہ زیب سے مخاطب تھا۔

''اس سب میں مگر فائدہ بھی صرف تمہارا ہے۔'' شاہ زیب دوبدو بولا تھا۔

''بکواس بند کرو شاہ زیب کہ اگر تم اپنی بہن کو لگام ڈال کر رکھنے میں ناکامیاب ہو گئے تو اس سب میں مجھے مت گھسیٹو کہ آبدار جیسی لڑکیوں پر آئیکت اور کزئی تھوکنا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے جو رات کے اندھیرے میں باپ، بھائی کی عزت کو اپنے قدموں تلے روند کر اپنے یار کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں۔'' وہ غصہ و بدلحاظی سے چیخا تھا۔ یکدم شاہ زیب کا چہرہ اہانت و تذلیل کے احساس سے تپش چھوڑنے لگا تھا۔

''یاد رکھنا کہ اس سب میں میرا کوئی کردار نہیں ہے مگر تمہاری بہن کے ملنے کے بعد میرا مرکزی کردار ضرور ہوگا۔ آبدار اور کزئی کی تو تم لوگ برسوں سے جان کے دشمن تھے میں واحد تھا جو اس کا سپورٹر تھا مگر اس گری ہوئی حرکت کے بعد اس نے آخری حمایتی بھی کھو دیا ہے جس دن وہ میرے سامنے آئے گی میں نے اس کے سینے میں سات کی سات گولیاں نہ اتار دیں تو میرا بھی نام آئیکت اور کزئی نہیں، کہ وہ تم سب کے نہیں میرے منہ پر بھی ذلت بھرا جوتا مار گئی ہے اور میری بلبلاتی انا کو جب تک سکون نہیں ملے گا۔ جب تک میری محبت، میرے

احساسات کو بھلا کر دفع ہو جانے والی آبدار اور کزئی کو میں اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ نہیں اتار دوں گا اور میرا تم سے وعدہ ہے کل تک میں آبدار کا سب سے بڑا محافظ تھا مگر اب اس کو مارے بنا ایک لمحہ بھی سکون سے جی لیا آئیکت اور کزئی تو، آئیکت اور کزئی سے بڑھ کر بے غیرت دنیا میں کوئی نہ ہوگا۔" وہ غصہ و نفرت سے پھنکارتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے شاہ زیب، تم میرے بیٹے پر الزام لگا کر اچھا نہیں کر رہے۔" بیٹے کے منظر سے ہٹتے ہی شوکت اور کزئی نے بھتیجے کو آڑے ہاتھوں لینا چاہا تھا۔

"آپ سب آئیکت کے ڈراموں پر یقین کر کے بہت بڑی بھول کر رہے ہیں، آبدار اتنی باہمت نہیں تھی خود سے یہاں سے فرار ہو جاتی۔آئیکت نے اسے غائب......"

"تڑاخ۔" باپ کے تھپڑ نے اس کی بولتی بند کر دی تھی۔

"بکواس بند کر کے دفع ہو جاؤ۔اس بدبخت لڑکی کو ڈھونڈ سکتے ہو تو ٹھیک، آئیکت کا اس سب میں نام مت لو کہ یقین ہے مجھے آئیکت ایسا کبھی نہیں کر سکتا کہ ویسے بھی جس وقت وہ منحوس اس گھر سے دفع ہوئی آئیکت شہر سے باہر تھا۔" شوکت اور کزئی سخت اشتعال میں تھے۔

"آپ سب بہت پچھتائیں گے اور باخدا جس دن آپ سب کو آئیکت کی اصلیت پتہ چلے گی، جس دن میں آئیکت کو جھوٹا اور خود کو سچا ثابت کروں گا وہ دن آئیکت کی زندگی کا آخری دن ہوگا اور باخدا میں اگر جھوٹا ثابت ہوا تو آپ سب جو چاہے میری زندگی کا فیصلہ کرنا۔" وہ باپ کو غصہ سے دیکھتا ہوا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا۔وہ پر یقین تھا کہ یہ حرکت آئیکت کی تھی اور اس کے یقین پہ ان دونوں بھائیوں کا یقین ڈگمگا کر رہ گیا تھا کہ آئیکت کو بھی جانتے تھے۔جانتے تھے کہ وہ اس گھر میں آبدار کا واحد حمایتی تھا ایسے میں اگر شاہ زیب اس پر شک کر رہا تھا تو ایسا بھی غلط نہ تھا مگر آئیکت کا غصہ اس کا آبدار کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈنا وہ دونوں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہے تھے۔کبھی آئیکت سچا لگتا تو کبھی شاہ زیب کے اندازے درست محسوس ہوتے۔جانے کون سچا کون جھوٹا ثابت ہونے والا تھا مگر وہ دونوں بھائی تھے بہت غصہ میں۔اگر آبدار کہیں سے آ جاتی تو گلا گھونٹ دیتے مگر مسئلہ ہی یہی تھا کہ وہ بے ضرر سی لڑکی یکدم کہیں غائب ہو گئی تھی۔کہاں......؟ یہ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی گھر کی عورتیں الگ زیرِ عتاب آئی ہوئی تھیں اور گھر کی لڑکیوں پر کڑی نگاہ رکھی جا رہی تھی۔اور کزئی ہاؤس میں عورتوں کو کبھی آزادی نہیں دی گئی تھی مزید زندگی تنگ کر دی گئی تھی۔عورتیں آبدار کے ملنے کی دعائیں کرتیں قیدی سی زندگی بسر کر رہی تھیں۔آبدار کو پسند تو پہلے بھی کوئی نہیں کرتا تھا اور اب تو نفرت کا وہ حال تھا کہ گھر کے مردوں کی مانند ہی وہ تمام خواتین بھی اس کی جان کی دشمن ہو چکی تھیں۔

شوکت اور کزئی اور جہانزیب اور کزئی دو بھائی تھے اور ان کی ایک ہی بہن آبشار اور کزئی تھی۔شوکت اور کزئی کی دو اولادیں،

آئیکت اورکزئی اور آمنہ اورکزئی جبکہ جہانزیب اورکزئی کا ایک ہی بیٹا شاہ زیب اورکزئی اور دو بیٹیاں مومنہ اورکزئی اور آبدار اورکزئی تھیں ۔شوکت اورکزئی کی اکلوتی بہن آبشار اورکزئی جو غیر شادی شدہ تھی اور اورکزئی پیلس میں ہی قیام پذیر تھی۔اورکزئی ہاؤس میں واحد ہستی جو سب کی نفرت سہہ رہی تھی وہ تھی آبدار اورکزئی جس نے بچپن سے سب کی بس بے گانگی و نفرت برداشت کی تھی وہ یہ کبھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ جن لوگوں کے درمیان وہ رہتی تھی اصل میں ان سب سے اس کا رشتہ کیا تھا کہ اس کی تو ماں کو بھی اس سے محبت نہ تھی۔بس وہ یہ جانتی تھی کہ اس کی ماں رخسانہ اورکزئی ہے مگر اس نے بے حد حسین عورت کے چہرے پر کبھی ممتا کا نور تو دور اپنائیت کی ہلکی سی جھلک بھی محسوس نہ کی تھی۔وہ یہ کبھی سمجھ نہیں پائی تھی کہ اس کی ماں آخر اس سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہے۔اس کے باپ نے کبھی اس کے سر پر ہاتھ کیوں نہیں رکھا، اس کا اکلوتا بھائی شاہ زیب اس کے سامنے پر منہ پھیر کر کیوں چلا جاتا ہے۔اس کی تایازاد آمنہ باجی کیوں اس سے بات نہیں کرتیں اور اس کی اپنی سگی بہن کیوں اس سے یکدم فاصلے پر چلی گئی ہے جبکہ وہ بچپن میں اچھی دوستیں ہوا کرتی تھیں مگر بڑے ہوتے ایسا کیا ہوا تھا کہ باقی سب بڑوں کی طرح وہ دونوں آمنہ اور مومنہ بھی اس سے کھچی کھچی رہنے لگی تھیں، اتنے بڑے گھر میں جہاں بہت سے لوگ تھے، بہت سے رشتے تھے ان کے درمیان رہ کر بھی اسے کبھی اپنے پن کا احساس نہیں ہوا تھا اور اتنی نفرت کرنے والی شخصیات میں ایک واحد تائی تابندہ تھیں جو اس کے ساتھ ذرا نرمی سے پیش آتی تھیں اس نے اکثر ان کے انداز میں ممتا کی جھلک پائی تھی ایک واحد وہی تھیں جو اس کا ذرا خیال رکھ لیا کرتی تھیں اور ان کی دیکھا دیکھی ان کا بیٹا آئیکت اورکزئی اس کا خیال رکھنے لگا تھا اور اس خیال نے وقت کے ساتھ پرورش پائی تھی اور یہ خیال محبت کی صورت تناور درخت بن گیا تھا مگر اس کی محبت کی کسی کو خبر نہ تھی البتہ اس نے آبدار سے کوئی راز، راز نہیں رکھا تھا وہ میٹرک میں تھی جب آئیکت نے اسے حال دل کہا تھا اتنی نفرتوں کے درمیان محبت نے اسے عجیب دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔کبھی وہ اس کی محبت کو محسوس ہی نہ کر پائی تھی کہ وہ تو نفرتوں کی عادی ہو چکی تھی اور اس بات میں الجھی تھی کہ سب اس سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں اور اس نے سب سے زیادہ اپنے لئے جس کی آنکھوں میں نفرت دیکھی تھی وہ اس کی اکلوتی پھپھو آبشار تھی اسے ان کی آنکھوں سے خوف آتا تھا وہ جب چھوٹی تھی تو وہ پھپھو کی طرف ہمکتی تھی کچھ بڑی ہوئی تھی تو اسے اپنی پھپھو سب سے زیادہ اچھی لگتی تھی کہ وہ اورکزئی پیلس کی سب سے حسین عورت تھی مگر وہ کبھی بہت چاہ کر بھی اپنی پھپھو کے قریب نہ ہو سکی تھی گھر میں ایک واحد شاہ زیب تھا جسے آبشار پیار کرتی تھی یا بات کر لیتی تھی ورنہ وہ اس گھر میں ہوتے ہوئے بھی نہ تھی نہ بھائیوں سے تعلق تھا نہ بھابھیوں سے بات چیت و روایتی لڑائی جھگڑے اس نے آبشار کو اپنے آپ میں مگن بہت کم گو پایا تھا وجہ مگر سمجھنے سے قاصر تھی اسے اپنے گھر کے ماحول میں گھٹن محسوس ہوتی تھی اس نے انٹر کیا تھا آگے پڑھنا چاہتی تھی مگر اسے اجازت نہیں ملی تھی اور پہلی بار آئیکت نے سب کے سامنے اس کی حمایت کی تھی جسے درخور اعتنا نہیں جانا گیا تھا مگر دھیرے دھیرے سب کو آئیکت کی آبدار کے ساتھ انوالومنٹ محسوس ہونے لگی تھی اور تابندہ جو اس کا خیال رکھتی تھیں یکدم وہ بھی اسے ناپسند کرنے لگی تھیں کہ وہ اسے اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی تھیں یہ تابندہ اور شوکت کو گوارا ہی نہ تھا کہ آبدار ان کی بہو بنے اس لیئے آئیکت کی بات

مومنہ سے طے کر دی تھی اور یہ بات آئیکت اور آبدار دونوں کے ذہن و دل میں کئی سوالوں کو جنم دے گئی تھی۔آئیکت یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ جب اس کی شادی مومنہ سے ہوسکتی ہے تو آبدار سے کیوں نہیں کہ آبدار اور مومنہ میں فرق ہی کیا تھا دونوں بہنیں تھیں اس کے چاچا کی بیٹیاں تھیں اور جب مومنہ کو اس کی دلہن بنانے پر کسی کو اعتراض نہ تھا تو آبدار سے شادی پہ اتنا سخت احتجاجی انکار کیوں بلند ہو رہا تھا۔۔۔؟ آئیکت ہی نہیں آبدار کو بھی یہ بات پریشان کر رہی تھی مگر آبدار کی تو ہمت نہیں ہوئی تھی کہ وہ وجہ پوچھتی مگر آئیکت نے وجہ پوچھی تھی کیونکہ وہ آبدار سے محبت کرتا تھا اس نے بچپن سے سب کا سلوک آبدار کے ساتھ حقارت لیے،نفرت آمیز محسوس کیا تھا مگر وہ کبھی کسی سے وجہ دریافت نہیں کر سکا تھا مگر اب وہ خاموش نہیں رہ سکتا کہ وہ آبدار کو کھونا نہیں چاہتا تھا اور اس کے صاف کہنے پر کہ اسے صرف آبدار سے شادی کرنی ہے اور جب اس کی مومنہ سے شادی ہوسکتی ہے تو آبدار سے کیوں نہیں۔۔۔؟ اور اس کیوں کے جواب میں جو بات اسے پتہ چلی تھی اس کی ہستی ہی ہل کر رہ گئی تھی مگر تلخ حقیقت جاننے کے بعد بھی وہ آبدار سے ہی شادی کرنا چاہتا تھا گھر میں ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی اور آبدار پر زندگی کا دائرہ مزید تنگ ہو گیا تھا۔آئیکت کے بابا جو کافی نرم مزاج تھے انھوں نے نہایت سختی سے اپنا فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ وہ آبدار کو جان سے تو مار سکتے ہیں لیکن اسے اپنی بہو نہیں بنا سکتے اور وہ سب کی نفرتوں کے درمیان پستی یکدم نئی آزمائش میں گرفتار ہوگئی تھی کہ مومنہ بھی آئیکت سے محبت کرتی تھی اور اس نے بھی آبدار کو بہت سنائی تھیں اس کی اوقات بتائی تھی اور جو بات اس کے علم میں نہیں تھی وہ بھی مومنہ اس کو بتا گئی تھی اور آبدار حقیقت جان کر بے قصور ہو کر بھی جیتے جی مر گئی تھی اس نے آئیکت سے کہہ دیا تھا کہ وہ مومنہ سے شادی کر لے وہ اس کے لائق نہیں ہے مگر آئیکت نے اس کی ایک نہیں سنی تھی اس کے حق کے لیے آواز بلند کر چکا تھا اور گھر میں ایک سرد جنگ چھڑ گئی تھی۔ جس کے خاتمہ کے لیے آبدار کے لیے آناً فاناً رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیا گیا تھا اور مختصر سے وقت میں آبدار کے لیے ایک لڑکا پسند کر کے اس کی شادی طے کر دی تھی اور اس سے پہلے کہ آبدار اور کزنئی زبردستی کسی اور کی بنا دی جاتی آئیکت نے اسے روپوش کر دیا تھا اور وہ روپوش ہونے کو کیونکر راضی ہوئی تھی یہ ایک الگ داستان تھی کہ اس کی تو ذات کا مان وغرور ہی مٹ گیا تھا اور ایسے میں وہ آئیکت کی مان گئی تھی کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا اسے زندگی سے کوئی رغبت نہیں رہی تھی۔۔۔ بچپن سے جن سوالوں کے جواب ڈھونڈتی رہی تھی ان تمام سوالوں کے جواب ایسے ملے تھے کہ اسے زندگی سے نفرت ہوگئی تھی،اپنی ذات تنکے سے بھی ہلکی لگنے لگی تھی اور باوجود زندگی سے بیزاری کے وہ باقی ماندہ زندگی اور مستقبل بچانے کو در بدر ہوگئی تھی اور آبدار کو دیکھ زندگی کو محسوس کرنے والے آئیکت اور کزنئی نے اسے منظر سے ہی غائب کر دیا تھا کہ کچھ بھی تھا،اسے آبدار اور کزنئی بہت عزیز تھی اس کی حمایت میں وہ ہمیشہ سب کے خلاف کھڑا ہوا تھا اور اس بار تو حد ہی کر دی تھی مگر اس بار وہ پس منظر میں تھا کہ وہ منظر پر آ ہی نہیں سکتا تھا۔اس نے جو کیا تھا غلط تھا اس طرح آبدار کے کردار پر انگلی اٹھ رہی تھی مگر وہ اس کی زندگی اور اس کے مستقبل کو محفوظ کر کے مطمئن تھا مگر سب کے سامنے خود کو غصہ میں اور غیر مطمئن ظاہر کر رہا تھا کہ آبدار کی زندگی کے لیے تو وہ ہنستے ہنستے جان دے سکتا تھا کچھ جھوٹ بولنا،ڈر اور غصہ ظاہر کرنا تو اس کے نزدیک کچھ تھا ہی نہیں۔کوئی وقعت نہیں تھی اس سب کی

اپنی نظر میں کہ وہ آبدار اور کزئی کو چاہتوں سے بڑھ کر چاہتا تھا اور محبوب تو ہوتا وہی ہے جس کے لیے اپنی ہستی ہی مٹا ڈالی جائے۔

☆......☆......☆

''آبدار! کہاں ہیں۔''اس نے آفس سے آنے کے بعد سب سے پہلے اسی کا پوچھا تھا۔

''بی بی صاحبہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔''ملازمہ نے ادب سے بتایا تھا۔

''کھانا کھایا تھا۔''اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے نیا سوال کیا تھا۔

''نہیں صاحب۔ میں نے بہت کہا مگر بی بی صاحبہ نے کھانے سے منع کر دیا اور روم لاکڈ کر دیا۔ میں ابھی چائے دینے گئی تو دروازہ ہی نہیں کھولا۔''بوڑھی ملازمہ پریشانی سے بولی تھی۔

''آپ جا کر انہیں بلا کر لے آیئے۔ میں جب تک فریش ہو کر آتا ہوں۔''وہ ایک گہری سانس بھرتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد واپسی ہوئی تھی تو ملازمہ نرگس پریشان سی گویا اسی کی منتظر تھی اور اس کے یہ بتانے پر کہ آبدار نے دروازہ نہیں کھولا وہ مضطرب سا اس کمرے تک آ گیا تھا جو آبدار اور کزئی کے لئے مختص کیا گیا تھا۔

''آبدار۔ دروازہ کھولیے پلیز......''بے تحاشہ دروازہ پیٹنے پر بھی ہنوز خاموشی رہی تھی تب اس نے پریشانی سے ساتھ اسے پکارا بھی تھا مگر ہنوز خاموشی تھی۔

''اس روم کی ڈپلیکیٹ چابی لے کر آیئے۔''وہ سخت پریشانی محسوس کرتے ہوئے بولا تھا اور جس وقت وہ روم ان لاکڈ کر کے کمرے میں داخل ہوا تھا اس کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ وہ تیر کی مانند بیڈ پر لیٹی آبدار کی طرف بڑھا تھا۔ ذرا جھک کر اس کی پیشانی چھوئی تھی لگا تھا کوئی انگارہ چھو لیا ہو۔ اس نے پریشانی سے اب نبض چیک کی تھی اور قدرے مطمئن ہو کر اس نے ڈاکٹر کو کال کی تھی۔ تقریباً دو گھنٹہ بوڑھی ملازمہ نے اس کے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھی تھیں اور اس کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ دونوں ہی کچھ پرسکون ہوئے تھے کہ بخار اور مستقل بھوکے رہنے کی وجہ سے نقاہت ہو گئی تھی اسی لئے وہ بے ہوش تھی۔ اس کی لیٹے لیٹے نظر جیسے ہی کھڑکی کے ساتھ کھڑے ابسام حیدر پر پڑی تھی وہ اٹھ بیٹھی تھی۔ ابسام حیدر نے اس کی عجلت صاف محسوس کی تھی مگر بولا کچھ نہ تھا اور بوا نرگس کو اس کے لیے سوپ لانے کی ہدایت دی تھی۔ وہ پانی کا باؤل اور تولیہ لیے کمرے سے نکل گئی تھیں۔

''زندگی میں آزمائشیں آ جاتی ہیں مس آبدار! مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان بالکل ہمت ہار دے۔''

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی جو اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے خفیف سی ہو کر نگاہ واپس جھکا لی تھی۔

''آپ اللہ پر بھروسہ رکھیے اس نے مشکل دی ہے وہی دور بھی کر دے گا۔ آپ بس حوصلہ مت ہاریئے کہ زندگی جب آزماتی ہے تو اس آزمائش سے وہی کامیاب ہو کر نکل جاتے ہیں جو حوصلہ رکھتے ہیں اپنی ذات پر یقین رکھتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اپنے اللہ پر یقین

رکھتے ہیں۔''اس کے انداز میں نرمی تھی اور اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''آپ پلیز آئیکت کو سمجھائیں، ان سے کہیں کہ وہ آ کر مجھے لے جائیں۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔'' وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے سسک اٹھی تھی۔

''میں نے آئیکت کو بہت سمجھایا تھا مگر اس نے میری نہیں سنی کہ اس نے یہ فیصلہ بہت مشکل سے لیا ہے اور اب جب ایک کام ہو چکا ہے اسے پلٹنا ممکن نہیں ہے۔ آپ تمام حالات سے واقف ہیں۔ آپ آئیکت کی مجبوری کو جانتی ہیں آپ کمپرومائز کر لیں کہ آپ کو یہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی اور آپ بے فکر رہیں آئیکت کوشش میں ہے وہ آپ کو لے کر ملک سے باہر چلا جائے گا مگر اسے تمام صورتحال کو اپنے موافق کرنے کے لیے جتنا وقت درکار ہے اس وقت تک تو آپ کو یہ سب ہمت سے برداشت کرنا ہوگا کہ آئیکت آپ کو لے کر بہت پریشان ہے۔ اسے آپ کی طبیعت کا پتہ چلے گا تو وہ اور پریشان ہو جائے گا جبکہ اسے حالات اپنے موافق کرنے کے لئے کم از کم آپ کی طرف سے بے فکر ہونے کی ضرورت ہے ورنہ وہ یکسوئی و توجہ سے کچھ نہیں کر پائے گا۔'' اس نے دھیمے سنجیدہ لہجے میں آبدار کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''آپ پلیز خود کو سنبھالیے یہ آزمائش ان شاءاللہ جلد ختم ہو جائے گی۔'' اس کا انداز ہمت بڑھانے، حوصلہ دینے والا تھا۔

''مجھے آئیکت سے بات کرنی ہے۔ آپ میری آئیکت سے بات کروا دیں پلیز۔'' وہ آنسو ہاتھ کی پشت سے رگڑتے ہوئے نمناک لہجہ میں بولی تھی۔

''بات کرنا یا اس کا اب یہاں آنا ممکن نہیں ہے۔'' اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس احمق لڑکی کو کیسے سمجھائے جو سوالیہ نگاہ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''شاہ زیب کو یقین ہے کہ آپ کے اورکزئی پیلس سے نکلنے میں آئیکت کی معاونت شامل رہی ہے اس لیے وہ احتیاطاً آپ سے رابطہ نہیں کر سکتا کیونکہ شاہ زیب نے آئیکت پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی ہے اسے ذرا بھی شک ہو گیا کہ اس کا شک غلط نہیں ہے تو قیامت آ جائے گی۔ آپ کی سوچ سے زیادہ صورتحال خراب ہے۔ جسے ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا اور جب تک آپ کو حوصلہ سے کام لینا ہوگا۔ میں مانتا ہوں کہ ایک انجان گھر میں انجان لوگوں کے ساتھ رہنا آپ کے لیے مشکل ہے مگر یقین رکھیں آپ کو یہاں بالکل بھی پریشانی نہیں ہوگی۔'' اس کے انداز میں بلا کی نرمی تھی، اپنائیت تھی، حوصلہ بڑھاتا ہوا لہجہ تھا اب کہ وہ آگے سے کچھ نہیں بولی تھی اور خاموشی طویل ہوتی کہ بوڑھی ملازمہ سوپ لے کر آ گئی تھی۔ اس کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا آنکھوں کے گوشے اپنی بے بسی پر گیلے ہونے لگے تھے۔

''آپ سوپ لیجیے پلیز۔ اس کے بعد آپ کو میڈیسن بھی لینی ہے اور بھروسہ رکھیے کہ یہاں آپ کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔'' وہ دھیمے سے کہتا کمرے سے نکل گیا تھا اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی سوپ لیا تھا۔ اس کے بعد میڈیسن لی تھی اور آنکھیں موند کر لیٹ گئی تھی۔

زندگی یکدم کیا سے کیا ہوگئی تھی وہ اپنے ہی گھر میں ایک اجنبی کی مانند رہی تھی مگر اب صورتحال اس کے لیے مزید خراب ہوگئی تھی کہ ابسام حیدر کے گھر میں ابسام حیدر اور بوڑھی ملازمہ نرگس کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ اگر گھر میں خواتین ہوتیں تو شاید اسے یہاں رہنا اتنا عجیب محسوس نہ ہوتا مگر مجبوری تھی کہ اسے اس طرح یکسر اجنبی شخص کے ساتھ ایک چھت تلے رہنا پڑ رہا تھا اس کے دل سے ایک یہی صدا بلند ہو رہی تھی کہ ''خدا کسی دشمن پر بھی یہ وقت نہ لائے۔'' اور وہ رب سے بس یہی مناجات کر رہی تھی کہ ''اللہ! اسے جلد اس آزمائش سے نکال دے۔''

اسے گھر والے یاد آ رہے تھے۔ وہی اپنے جو بہت بیگانے تھے مگر تھے تو اپنے اور اپنا تو مارتا بھی ہے تو ڈالتا چھاؤں میں ہی ہے اور وہ اس چھاؤں کی منتظر تھی جو اس پر دھوپ میں سایہ کر دیتی۔

☆......☆......☆

''شاہ! آپ پلیز کچھ کریں ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' وہ گہری نیند میں تھا جب اس کی آنکھ موبائل ٹون کی آواز پر کھلی تھی اس نے ہاتھ مار کر بند آنکھوں سے موبائل تلاش کرنا چاہا تھا اور تکیہ کے ساتھ پڑا موبائل کچھ ہی دیر میں اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ اس نے یس کا بٹن پش کر کے موبائل کان سے لگایا تھا۔ مدھر نسوانی آواز کانوں میں گونجی تھی وہ آگے سے کچھ کہتا یا پوچھتا وہ سسکتے ہوئے بولی تھی۔

''کیا ہوا ہے عریم! بتاؤ مجھے کیوں رو رہی ہو اتنا۔'' وہ سکون سے آنکھیں موندے اپنے مخصوص انداز میں اوندھا لیٹا ہوا تھا اور موبائل کان سے لگا ہوا تھا۔ عریم کی بات سن کر بھی اس کی پوزیشن میں فرق نہیں آیا تھا مگر لہجہ اس قدر پریشانی کی چغلی کھا رہا تھا جیسے اسے اس کی بہت فکر ہو۔ وہ اس کے لیے بہت پریشان ہو۔

''پاپا، میری شادی کر رہے ہیں شاہ۔'' اس نے سسکتے ہوئے روح فرسا خبر سنائی تھی۔

''عریم! یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔'' خبر ایسی تھی کہ شاہ زیب اورکزئی یکدم ہی اٹھ بیٹھا تھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں شاہ! پاپا نے میری بات فارس بھائی سے طے کر دی ہے مگر آپ جانتے ہیں میں نے فارس بھائی سے شادی نہیں کرنی، میں صرف آپ سے محبت کرتی ہوں شاہ۔ مجھے صرف آپ سے شادی کرنی ہے۔'' بلکتی ہوئی آواز کانوں میں اتر رہی تھی اس کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بھر گئی تھی۔

''یو ڈونٹ وری عریم! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم رونا بند کرو شاباش! میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔'' وہ کچی نیند سے جاگے جانے کے سبب سر میں درد محسوس کر رہا تھا۔ کنپٹی کو دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے مسلتا معمول کے مطابق بولا تھا۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے شاہ۔'' وہ سسک رہی تھی اور وہ بہت پرسکون تھا۔

''تم ڈرو نہیں۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ بول رہا ہوں نا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ یو ڈونٹ وری۔'' وہ بستر سے نکلا تھا دروازہ کھول کر اس نے ملازمہ کو آواز دے کر چائے کا آرڈر دیا تھا اور راکنگ چیئر پر آ بیٹھا تھا۔

''آپ معاملے کی گھمبیرتا کو نہیں سمجھ رہے شاہ! آپ پاپا کو نہیں جانتے وہ فیصلہ کر چکے، وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلیں گے اور میں آپ کے بغیر سچ میں مرجاؤں گی۔''اس کی رورو کر آواز بیٹھنے لگی تھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے میں اپنی جان کو مرنے دوں گا۔''سگریٹ سلگاتے ہوئے نہایت خوبصورت لب ولہجہ میں بولا تھا اور وہ جیسے بے بس ہوگئی تھی آگے سے کچھ نہیں بولی تھی۔

''دیکھو جان! تم بالکل پریشان نہ ہو میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔''اس نے اس کی خاموشی محسوس کر کے دلکشی سے بولتے ہوئے ایک گہرا کش لیا تھا اور دھواں فضا میں آزاد کر دیا تھا۔

''آپ ہمیشہ ایسے ہی بولتے ہیں شاہ، مگر کرتے کچھ بھی نہیں ہیں۔آپ کو میں کب سے بول رہی ہوں کہ آپ پاپا سے مجھے مانگ لیں مگر آپ سنتے ہی نہیں ہیں۔''وہ نم لہجے میں ناراضگی سمو کر بولی تھی۔

''جان! مانگنا میری سرشت میں شامل نہیں ہے۔میں تمہیں زمانے سے چرالوں گا، تمہیں چھین لوں گا اس وقت سے جو بے رحم چال چلتا مجھے تم سے چھین لینا چاہتا ہے مگر بھروسہ رکھو اپنے شاہ پر، وہ ایسا ہونے نہیں دے گا۔تم صرف میری ہو اور تم سے مجھے کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ تمہارے بابا بھی نہیں۔''وہ ایک کے بعد ایک سگریٹ سلگا تا دلکش لب ولہجہ میں بول رہا تھا عریم کے بے قرار دل کو گویا سکون آنے لگا تھا۔

''آپ ہمیشہ ایسے ہی بولتے ہیں مگر کرتے کچھ نہیں ہیں۔میں آپ سے کب سے بول رہی ہوں کہ آپ اپنے پیرنٹس کو بھیج دیں مگر آپ سنتے ہی نہیں ہیں۔''وہ اس کے لفظوں کے جال میں ہمیشہ کی طرح الجھ رہی تھی۔وہ بے بس ہوئی جارہی تھی وہ اسے تسلی، دلاسے دے رہا تھا اور وہ یکدم نم لہجہ میں بول گئی تھی۔

''تم خوامخواہ میں پریشان ہو رہی ہو جان! ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوگا اور تم رونا دھونا بند کر دو۔سچ میں مجھے تمہاری بہت فکر ہو رہی ہے۔ ایسے روؤ گی تو تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔کیوں، اپنے شاہ کو پریشان کر رہی ہو؟''اس نے بھاپ اڑاتے چائے کے مگ کو ملازمہ سے لیا تھا۔اسے دروازہ بند کر جانے کی ہدایت کی تھی اور اس کے منظر سے ہٹتے ہی کمال جذباتی انداز میں بولا تھا۔

''میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی شاہ، مگر میں خود رات سے بہت اپ سیٹ ہوں۔مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس بار آنی ایک خاص مقصد سے آئی ہیں۔میں تو انجان ہی رہتی وہ تو میں رات پانی پینے کے لیے جاگی کہ کمرے میں ملازمہ پانی رکھنا بھول گئی تھی اس لیے میں کمرے سے نکل کر کچن تک گئی اور ماما، پاپا کے کمرے کے باہر سے گزرتے ہوئے میں نے سن لیا کہ آج شام آنی میر افارس بھائی کے لیے رشتہ ڈال گئی ہیں۔پاپا نے منع نہیں کیا اور وہ اگلے مہینہ کی ہی کوئی تاریخ دے دیں گے۔''وہ بھاری لہجہ میں تمام تر تفصیل اس کے گوش گزار کر گئی تھی یکدم شاہ زیب کو پریشانی نے آ گھیرا تھا۔

''واٹ! اتنی جلدی کیا ہے تمہارے پاپا کو۔۔۔؟ کون سی تمہاری عمر نکلی جارہی ہے۔''اس نے چائے کا مگ ٹیبل پر منتقل کیا تھا اور

مضطرب سا بولا تھا۔اتنی دیر میں وہ اب صحیح معنوں میں پریشان ہوا تھا۔

''پتہ نہیں شاہ! پاپا کو تو آپ جانتے ہی ہیں کتنے سخت گیر ہیں۔کس قدر مجھ پر پابندیاں ہیں۔کس طرح میری نگرانی کی جاتی ہے وہ تو میٹرک کے بعد ہی میری شادی کر دینا چاہتے تھے مگر نانو کی مداخلت کے سبب ایسا نہیں ہو پایا تھا کہ نانو اتنی جلدی میری شادی کے خلاف تھیں مگر اب تو نانو بھی نہیں رہیں شاہ، اور ماما، پاپا سے اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتیں، پاپا فیصلہ لے چکے ہیں اس منتھ کے لاسٹ میں میرے سیکنڈ ائیر کے پیپرز ہو جائیں گے اور نیکسٹ منتھ کے لاسٹ ویک میں وہ میری شادی کر دیں گے۔''اس نے بھیگے لہجے میں جو تفصیل اسے بتائی تھی اسے سن کر وہ پریشان ہو گیا تھا کہ اسے جو کچھ کرنا تھا اس کے لیے اب وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

''مجھے تم سے ملنا ہے عریم۔''وہ ایک لمحہ کی تاخیر کے بنا فیصلہ لیتے ہوئے بولا تھا۔

''میں گھر سے نہیں نکل سکتی شاہ! کہ آپ تو جانتے ہی ہیں کالج آف ہے اور کالج کے علاوہ تو میں کہیں جاتی ہی نہیں۔''وہ شاہ زیب کی فرمائش سن کر پریشان سی بولی تھی۔

''تم کچھ بھی بہانہ کر دو، کیسے بھی بس کالج پہنچو، میں تمہیں گیٹ پر ملوں گا۔''شاہ زیب کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا جبکہ اس کے دماغ کا فیوز اڑ چکا تھا وہ مضطرب ہو گئی تھی۔

''نن......نہیں شاہ......مم......میں نہیں آ سکتی......پاپا کو پتہ ہے کالج کی چھٹیاں ہیں۔''

''میں کچھ بکواس کر رہا ہوں عریم، تمہیں سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھے تم سے آج ہی ملنا ہے۔''وہ غصہ سے اس کی بات کاٹ گیا تھا اور اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے تھے۔

''آپ غصہ کیوں کر رہے ہیں، آپ کو پتہ تو ہے میری مجبوری......''وہ سسکی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں پتہ، بہانہ کر کے، کیسے بھی کالج پہنچو۔''وہ اس کی آواز کی لرزاہٹ کو محسوس کر کے بھی نرم نہیں پڑا تھا کہ جو بات وہ اس سے نرمی سے نہیں منوا پاتا تھا وہ غصہ کے ذریعے منوا لیتا تھا کہ وہ ذرا سا لہجہ بلند کرتا تھا کہ اس کی جان پر بن آتی تھی۔

''شاہ......''اس کے دوٹوک انداز پر وہ بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔

''کچھ نہیں سننا مجھے، بس یس اور نو میں آنسر دو۔''اس نے کھڑکی کے پردے ہٹائے تھے تاکہ دھواں کھلی فضا میں بکھر جائے۔رات بارش ہوئی تھی۔پیڑ پودے کچھ نکھر آئے تھے۔سڑکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں، آسمان کا نیلا رنگ نارنجی شعاعیں بکھیر رہا تھا، صبح کے ساڑھے سات بج رہے تھے سورج اپنی جولانی پر تھا، پنچھی آزاد فضا میں اڑ رہے تھے اور وہ جیسے قید ہوئی جا رہی تھی۔

''شاہ! بہت مشکل ہے، کل ہی تو میں ایڈمٹ کارڈ لینے کالج گئی تھی، اب تو کالج جانے کا کوئی جواز ہی نہیں ہے۔''وکسی بے بس پنچھی کی مانند گویا فریاد کناں تھی۔وہ شخص جو اس کے دل میں بستا تھا اس کی روح کا عکس تھا وہ اس سے خفا ہو رہا تھا اور وہ بے بسی کی انتہا پر جا پہنچی تھی۔

''میری بکواس سمجھ نہیں آ رہی کہ کوئی بھی بہانہ کر دو۔'' وہ اس کے منت کرنے پر غصہ سے چیخا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

''تمہیں بچوں جیسی کرتیں کرنی ہیں تو ٹھیک ہے میں فون رکھ رہا ہوں۔'' وہ جھنجلا کر رہ گیا۔ اس کا بات بے بات رونا شاہ زیب کو کوفت میں مبتلا کر دیتا تھا۔

''شاہ! پلیز......'' اس نے نمناک لہجے میں منت کی تھی۔

''تم گیارہ بجے تک کیسے بھی کالج پہنچو میں تمہارا ویٹ کروں گا اور ابھی فون رکھ رہا ہوں۔ شاید ماما آواز دے رہی ہیں۔ اللہ حافظ......'' اس کے رونے کی آواز، اس کی سسکیاں شاہ زیب کے اعصاب متاثر کر رہی تھیں اس لیے شاہ زیب نے اس کی سنے بغیر آرڈر جاری کیا تھا اور بہانہ بنا کر فوراً رابطہ منقطع کر دیا تھا اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ عریم کا گھر سے نکلنا کس قدر مشکل ہوتا ہے اس لیے اس نے جو بھی کرنا تھا آج ہی ملاقات میں کرنا تھا کہ وہ وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا کہ تین دن بعد وہ ویسے ہی ایک کانٹریکٹ کے سلسلے میں ملک سے باہر جانے والا تھا اور واپسی کا بھی کچھ اندازہ نہ تھا کب ہونی تھی اس لحاظ سے اس کے پاس صرف تین دن تھے مگر اس کو عریم کا بھی پتہ تھا۔ اسے کنفرم نہیں تھا کہ وہ آج آ پائے گی یا نہیں اس لیے اس نے تیاری اپنے طور پر مکمل رکھنی تھی اور جو کرنا تھا ان تین دنوں میں ہی کرنا تھا اس نے کچھ سوچتے ہوئے واش روم کا رخ کیا تھا۔ باتھ لے کر فریش ہوا تھا اور والٹ و گاڑی کی چابی اٹھائے کمرے سے نکل آیا تھا اس کا رخ اپنے اکلوتے دوست کے گھر کی جانب تھا اسے پک کیا تھا اور اپنے اپارٹمنٹ پر آ گیا تھا۔ یہ اپارٹمنٹ اس نے سب کو لاعلم رکھ کر خریدا تھا۔ حاشر کے علاوہ اس اپارٹمنٹ کے بارے میں کسی کو خبر نہ تھی۔ حاشر صبح صبح اس کی آمد سے پریشان ہوا تھا وجہ بھی پوچھی تھی مگر وہ چپ رہا تھا اور اپارٹمنٹ پہنچ کر جو کچھ اس نے کہا تھا وہ سن کر حاشر کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

''تم بہت غلط کر رہے ہو......''

''میں تم سے بہتر جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں اور جو کر رہا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط۔ وعظ سننے کا میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔ تم بس اتنا کہو کہ میری مدد کرنی ہے یا نہیں......'' اس نے تو غصہ میں اپنی بات کے آگے تو اپنے باپ کی نہیں سنی تھی دوست کی کیا سنتا۔ اس نے ترش و بدلحاظ انداز میں حاشر کی بات کچھ یوں منقطع کی تھی کہ وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا تھا۔

''تم جانتے ہو شاہ کہ تم ہمیشہ مجھے اپنے ہمقدم پاؤ گے چاہے غلط ہی کیوں نہ ہو مگر......''

''اگر مگر چھوڑو حاشر کہ جانتا ہی نہیں مانتا بھی ہوں کہ میں غلط ہوں مگر مجھے اس معاملے میں غلط ہی کرنا ہے اور تم وجہ بھی جانتے ہو میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں چھپایا اور تم جب کسی بات سے انجان نہیں ہو تو یہ بات سمجھنا بھی تمہارے لیے مشکل نہیں ہونی چاہیے کہ میں پھر بھی بہت اچھا کرنے جا رہا ہوں، بہت کچھ غلط کرنے جا رہا ہوں مگر اس غلط میں بھی بہت سے صحیح چھپے ہوئے ہیں اور میں کچھ صحیح کرنے کے لیے یا صحیح رکھنے کے لیے صحیح کرنے کی کوشش نہیں کر رہا بس جو میں کرنے جا رہا ہوں اس پر میرا ضمیر مطمئن رہے بس، اس لیے غلط کو بھی صحیح

طریقے سے کرنے جا رہا ہوں۔ بہت کچھ غلط ہو کر بھی بہت کچھ اس میں صحیح رہے گا اس لیے تم نہ الجھو، نہ مجھے الجھاؤ بس وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں کہ میرے پاس صرف تین دن ہیں اور ان تین دنوں میں، میں نے بازی کھیلنی بھی ہے اور بازی جیتنی بھی ہے۔ بساط بچھانی بھی ہے اور مہرے پلٹنے بھی ہیں یعنی سب کچھ ان تین دنوں میں ہی کرنا ہے۔" اس نے حاشر کا یکدم چپ ہو جانا محسوس کیا تھا۔ عجیب سا گلٹ محسوس ہوا تھا اس لیے کھل کر بولتا چلا گیا تھا۔

"میں تمہارا ساتھ دوں گا شاہ کہ میں جانتا ہوں کہ تم برے نہیں ہو اور یہ سب کیوں کرنے جا رہے ہو مگر برا کرتے ہوئے بھی نیت تمہاری بری نہیں اس لیے مجھے امید ہے کہ سب ایک دن ٹھیک۔۔۔"

"پلیز حاشر! فلسفہ بند کرو کہ تم جانتے ہو میں اپنے اندر کی اچھائی سے مجبور ہوں ورنہ کچھ اچھا کرنے کا میرا ارادہ ہی نہیں ہے میرے اختیار میں ہو تو سب کچھ فنا کر ڈالوں۔ کچھ ٹھیک کرنے کی مجھے حاجت نہیں ہے۔" وہ ایک بار پھر درشتگی سے حاشر صدیقی کی بات کاٹ گیا تھا۔

"اوکے، کیا کرنا چاہتے ہو۔" حاشر نے بات کہی اور کہہ کر گنوائی کی صورتحال سے بچنے کو آگے سے کچھ نہ کہنا ہی بہتر سمجھتے ہوئے اس کی پلاننگ دریافت کی تھی اور وہ اپنا تمام لائحہ عمل حاشر کے گوش گزار کر گیا تھا۔

"ٹھیک ہے سارے انتظامات ہو جائیں گے۔" اسے غلط بھی لگ رہا تھا تو وہ دوست کی دوستی میں غلط بھی کرنے کو تیار تھا یکدم شاہ زیب نے اسے تشکر بھری نگاہ سے دیکھا تھا اور گھڑی پر نظر دوڑائی تھی صبح کے ساڑھے نو ہو رہے تھے۔

"سب کچھ بہت احتیاط سے کرنا حاشر اور سارے انتظامات ایک گھنٹہ میں تم مکمل کر لو میں آفس جا رہا ہوں کہ میری سوا دس بجے ایک اہم میٹنگ ہے۔ اگر کینسل کی تو بابا خفا ہوں گے کہ آبدار والے معاملے کی وجہ سے بابا مجھ پر پہلے ہی خفا ہیں اور جو میں کارنامہ سرانجام دینے جا رہا ہوں اس وجہ سے فی الوقت بابا کی ناراضگی مول نہیں لے سکتا۔" وہ حاشر کو پورا کام سمجھا تا اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کا سر بری طرح دکھ رہا تھا مگر اس کا ذہن مستقل کام کر رہا تھا، اس کے ذہن کے کسی کونے میں یہ خدشہ موجود تھا کہ عریم خان نہیں آئے گی مگر دل میں اطمینان سا موجود تھا کہ وہ لڑکی جو اس کے ذرا سا غصہ کرنے پر گھنٹوں منتیں کر کے اسے مناتی تھی اس کا غصہ ختم کرنے کے لیے بے حساب میسجز کرتی تھی۔ لاتعداد کالز کرتی تھی اس کے غصہ سے رابطہ منقطع کر دینے پر رابطہ منقع کرنے کی وجہ سے واقف ہونے کے باوجود ایسا ممکن ہی نہ تھا کہ وہ، وہ نہ کرتی جو اس کے غصہ کو دور کرنے کا سبب بن پاتا اسے امید تھی کہ وہ کچھ بھی کر کے ضرور آئے گی۔

"تمہیں آج ہر حال میں آنا ہو گا عریم کہ آج تمہاری زندگی کو برباد ہونے سے تم تو کیا تمہارا وہ باپ محمود خان بھی نہیں بچا سکتا اور تم خود چل کر اپنی بربادی کے راستے تک نہ آئیں تو میرا تم سے، تمہارے باپ سے وعدہ ہے کہ میں خود تمہیں اس راستے تک لاؤں گا۔" وہ میٹنگ ہال کی جانب بڑھتے ہوئے تنفر سے سوچ رہا تھا۔ اس کے عزائم پختہ تھے۔ اس کی سوچ میں کوئی نرمی نہ تھی۔ وہ عریم کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور وہ اپنی بربادی سے انجان آنے والی بے رحم ساعتوں سے انجان خود اپنی بربادی کے لیے راہیں ہموار کرنے کی

کوششوں میں ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ جب زندگی آزمانے پر آتی ہے تو تخت کو تختہ بنتے دیر ہی کب لگتی ہے اور اس کی خوش بختی کا سفر بدبختی کی راہیں ڈھونڈنے لگا تھا۔ جیسے ہر دکھ کے بعد سکھ آتا ہے ویسے ہی ہر بہار کے بعد خزاں کو آنا ہی ہوتا ہے اور اس کے نصیب کی بہاریں خواب وخیال ہونے کو تھیں اور اس کے نصیب میں خزاں کا موسم ٹھہر جانے کو تھا۔

☆......☆......☆

''آبی ٹھیک ہے ابسام؟'' اس نے آئیکت اور کزنی کے سوال پر ایک گہری سانس کھینچی تھی کہ اس کے پاس گویا کوئی بات ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ چند باتوں کے بعد آبدار کے بارے میں سوالات شروع کر دیتا تھا۔

''آئیکت! تم بے فکر رہو آبدار بالکل ٹھیک ہیں، گزرے ہفتہ میں کافی حد تک ایڈجسٹ کر گئی ہیں اور اگلے دو دن میں ماما، پاپا واپس آ رہے ہیں جو تھوڑا بہت ڈر یا ایڈجسٹمنٹ پرابلم ہے وہ بھی ماما کے آتے ہی ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے آئیکت کو نہ صرف بھرپور انداز میں تسلی دی تھی اسے گونا گو سکون کی کیفیت عطا کر گیا تھا کہ آئیکت کو کوئی مسئلہ نہیں تھا کہ اسے دوست پر خود سے زیادہ اعتبار تھا مگر مسئلہ آبدار کا تھا اور اگر وہ ان سکیور فیل کر رہی تھی تو رونگ بھی نہیں تھا کہ ابسام حیدر اس کے لیے یکسر اجنبی تھا اس لیے وہ دل ہی دل میں دعا گو تھا کہ ابسام کے پیرنٹس پاکستان واپس آ جائیں۔ ابسام حیدر، حیدر سلطان کا اکلوتا بیٹا تھا جس نے باپ کے وسیع کاروبار کو باپ کے ساتھ مل کر سنبھالا ہوا تھا۔ حیدر سلطان نے فضہ ابراہیم سے لو میرج کی تھی، فضہ کی پوری فیملی برسوں سے ڈنمارک میں مقیم تھی اس کا پورا ننھیال اور ددھیال وہیں مقیم تھا ایک دفعہ میٹنگ کے سلسلے میں حیدر سلطان ڈنمارک گئے تھے اور ان کی ایک شاپنگ مال میں فضہ سے ملاقات ہوئی تھی اور اچانک ملاقات نے ملاقات کے سلسلے کچھ یوں نکالے تھے کہ دونوں محبت کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے مگر جب شادی کی بات چلی تھی تو دونوں کے لیے کئی مسائل تھے کہ حیدر پاکستان میں ہی رہنا چاہتا تھا اور فضہ کو پاکستان کے نام سے ہی وحشت ہوتی تھی۔ اس نے حیدر کو بہت سمجھایا تھا پاکستان چھوڑ آنے کے لیے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی تب حیدر نے اس سے ایک ہی بات کہی تھی:

''فضہ! میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنے والدین کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ماما، بابا کو میں عمر کے اس حصہ میں اکیلا نہیں کر سکتا جب انہیں میری ضرورت ہے، میرے ساتھ کا مان چاہیے......'' حیدر سلطان کا لب ولہجہ بہت عام سا تھا مگر اس میں والدین کی محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جو فضہ کو متاثر کر رہا تھا۔

''تو تم کیا مجھے چھوڑ دو گے حیدر۔'' سرسراتی آواز میں پوچھا تھا۔

''میں نے ایسا نہیں کہا فضہ، بس تم اتنا یاد رکھنا کہ تم جب بھی جس سے بھی شادی کرو گی تمہیں اپنے والدین کی دوری برداشت کرنی پڑے گی کہ یہی زمانے کی ریت ہے مگر میں اس بے رحم ریت کا حصہ نہ ہوں نہ کبھی بننا چاہوں گا کہ جس میں اولاد والدین کی قربانیاں فراموش کر کے انہیں چھوڑ دیتی ہے۔ میں ماما، پاپا کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' اس کے انداز سے لفظ، لفظ سے والدین کی محبت عیاں ہو رہی تھی۔

''حیدر، میں نے کب کہا تم اپنے پیرنٹس کو چھوڑ دو۔ میں نے تو بس یہ کہا تم پاکستان چھوڑ دو۔ ماما پاپا کو یہاں ڈنمارک بلا لو۔'' اس نے حیدر کی بات کاٹ کر کہا تھا۔

''ناممکن ہے یہ فضہ، پاپا کبھی پاکستان چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوں گے، اور میں انہیں اپنی محبت میں اتنا مجبور کرنا بھی نہیں چاہتا کہ انہیں بیٹے اور وطن کی محبت میں سے کسی ایک محبت کا انتخاب کرنا پڑے۔'' اس کے انداز میں بلا کا سکون براجمان تھا۔ یکدم وہ تلخی سے ہنس دی تھی۔

''تم مجھے مجبور کر سکتے ہو، اپنی محبت کو ہتھیار بنا کر مجھ سے یہ تقاضہ کر سکتے ہو کہ میں تمہارے لیے اپنا ملک چھوڑ دوں، اپنے پیرنٹس کو چھوڑ کر سات سمندر پار چلوں۔'' وہ یکدم بہت تلخی سے بولی تھی۔

''فضہ! تمہیں سمندر تو پار کرنا ہی ہے اب ایک بڑا سمندر عبور کرو کہ سات سمندر پار کرو یہ تمہاری مجبوری ہے مگر مجھے اس مجبوری میں مت الجھاؤ، کہہ رہا ہوں نا کہ میں تمہارے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں بس ماما، پاپا کو نہیں چھوڑ سکتا کہ بیٹیوں کو والدین کے گھر سے رخصت ہونا ہی پڑتا ہے مگر بیٹے کو اتنا خودغرض نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ فضہ کی بات قطع کر کے دھیمے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا تھا اور وہ اس کے اسی انداز پر تو فدا تھی نرمی سے سنجیدگی سے بات کرتا حیدر سلطان اس کا دل دھڑکا دیتا تھا۔ وہ جیسے یکدم اس کی ہر بات کی قائل ہوگئی تھی اس کی محبت میں سات سمندر پار کرنے کو تیار ہوگئی تھی کہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ جو شخص والدین سے اس قدر محبت و عقیدت رکھ سکتا ہے وہ یقیناً ایک اچھا شوہر بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

''حیدر، تم سے کب، کیسے، کیوں محبت ہوگئی میں جان نہیں پائی مگر ہر ملاقات میں تمہیں دل سے قریب، روح کے آس پاس محسوس کیا اور تمہاری اعلیٰ سوچ مجھے اپنی محبت پر فخر میں مبتلا کر دیتی ہے کہ دنیا کی بھیڑ میں جو ایک شخص من میں سمایا ہے وہ ہے ہی چاہے جانے کے لائق۔'' وہ دھیمے سروں میں بولتی حیدر سلطان کو بہت پیاری لگ رہی تھی۔

''تمہیں میں کبھی اپنے کسی بھی عمل سے مایوس نہیں کروں گا اگر تم مجھ پر اعتبار کر کے زندگی کا سفر میری ہمراہی میں قبول کرو گی تو مجھے ہمیشہ بے حد مخلص اور اپنے ساتھ پاؤ گی۔'' وہ یکدم ٹیبل پر رکھے اس کے نرم و گداز ہاتھ پر ہاتھ رکھ گیا تھا اس نے حیدر سلطان کو دیکھا تھا اور مسکرا دی تھی یہ مسکراہٹ اقرار کی تھی، اسے قبول کرنے، اپنا آپ سونپ دینے کا پیامبر بن کر لبوں سے آزاد ہوئی تھی اور حیدر سلطان کے لبوں پر اطمینان کی مہر کی صورت ٹھہر گئی تھی۔ فضہ کی فیملی کو لاکھ اعتراضات تھے مگر کہتے ہیں نا کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی، سب کے اعتراضات دھرے کے دھرے رہ گئے تھے اور فضہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیدر سلطان کی ہوگئی تھی۔ حیدر کے پیرنٹس نے فضہ کو ایک بیٹی کی سی چاہت اور مان دیا تھا۔ شادی کے ایک سال بعد ابسام حیدر نے ان کی ازدواجی زندگی کو نئے رنگ عطا کر دیئے تھے ان کی مسکراہٹیں بڑھ گئی تھیں، ساتھ مزید مضبوط ہو گیا تھا۔ ابسام کا نام اس کے دادا نے رکھا تھا۔ ابسام دادا، دادی کو بے حد عزیز تھا۔ فضہ شادی سے پہلے جن خدشات کا شکار تھی وہ اسے درپیش ہی نہ آئے تھے اور تمام خدشات ہوا میں پانی کے بلبلے کی مانند تحلیل ہو گئے تھے۔ حیدر نے اسے عزت،

محبت زندگی کا ہر سکھ دیا تھا، ڈنمارک ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا کہ فضہ کی پوری فیملی ڈنمارک میں تھی وہ ہر خوشی، غمی میں اپنوں کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ حیدر نے اسے کبھی انکار نہیں کیا تھا، ضروری سے ضروری کام ملتوی کرنا پڑا تو اس نے کر دیا تھا اور یکے بعد دیگرے حیدر کے پیرنٹس وفات پا گئے تھے اور دادا کی وفات کے وقت ابسام گیارہ سال کا تھا اور تب فضہ نے ساس، سسر کی وفات کے بعد حیدر سے پاکستان سے شفٹ ہو جانے کی بات کی تھی اور اس نے نرمی سے پھر اسے قائل کر لیا تھا۔

''فضہ! تم جب کہتی ہو میں تمہیں تمہارے پیرنٹس کے پاس لے جاتا ہوں، لے جاتا رہوں گا، ماما، پاپا نہیں رہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرا پاکستان میں رہنے کا ہر جواز ہی ختم ہو گیا۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں، میرے والدین کی قبور یہاں پاکستان میں ہیں، میں فاتحہ خوانی کے لیے جب چاہے جا سکتا ہوں۔ وہاں دیارِ غیر میں چلا جاؤں گا تو کون میرے والدین کی قبور پر فاتحہ خوانی کے لیئے جائے گا کہ میرا تو کوئی بھائی، بہن بھی نہیں۔ میں اپنے پیرنٹس کی مٹی، اپنے پیرنٹس کے احساس کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا فضہ، اس لیے بس اس مطالبہ کو بھول جاؤ، باقی میرا جو کچھ ہے سب تمہارا ہے جو چاہے مانگ لو۔'' وہ بیوی کے حسین چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا تھا اور وہ مطمئن سی مسکرا دی تھی کہ حیدر اپنے قول و فعل میں سچا اور کھرا تھا اس نے جو کہا تھا پورا کیا تھا ایسے شخص کے لیے وہ کوئی امتحان نہیں بننا چاہتی تھی۔

ابسام ان کی اکلوتی اولاد تھا جسے انہوں نے ناز و نعم میں پالا تھا مگر اس کی تربیت پر فضہ نے خصوصی توجہ دی تھی۔ بیٹے کے جوان ہونے کے بعد حیدر سلطان خود کو مضبوط تصور کرتے تھے۔ انہیں اپنے باپ کے چہرے پر پھیلی وہ دھیمی مسکان یاد آتی تھی جو وہ ان کی آنکھوں میں محسوس کرتے تھے جب وہ خود باپ کے سامنے ہوتا تھا اس وقت ان کی آنکھوں میں جو مان و فخر ہوتا تھا وہ حیدر سلطان کو بیٹے کو دیکھ کر محسوس ہوا تھا۔ فضہ سال میں دو چکر ڈنمارک کے ضرور لگاتی تھیں اور شادی بیاہ کی تقریبات نکل آئیں تو الگ، کبھی انہوں نے نہ روکا تھا نہ ہی روکنے کی نوبت آئی تھی۔ آج کل وہ دونوں میاں بیوی ڈنمارک میں تھے کیونکہ تقریباً دو سال پہلے فضہ کے والد صاحب وفات پا گئے تھے اور آج کل والدہ کی طبیعت ناساز تھی اس لیے وہ پہلی فلائٹ سے ڈنمارک پہنچ گئے تھے وہاں گئے انہیں اب بیس دن ہو گئے تھے۔ ماں کی طبیعت دیکھ کر فضہ کا واپسی کا دل ہی نہیں کرتا تھا جبکہ ابسام انہیں فون کر کے کئی بار واپسی کے لیے کہہ چکا تھا اور جب سے آبدار آئی تھی تب سے وہ صبح و شام واپسی کا تقاضا کر رہا تھا مگر سب بے سود رہا تھا کہ ان کا فی الحال واپسی کا ارادہ نہیں تھا۔ ان کو گئے تقریباً بیس دن ہو گئے تھے۔ پہلی کبھی ایسا ہوا تھا تو حیدر سلطان بیوی کو چھوڑ کر آ گئے تھے مگر جب سے بزنس بیٹے نے سنبھالا تھا وہ کبھی آ جاتے تھے اور کبھی وہیں کے ہو رہتے تھے اور اس نے والدین کو واپس نہ آتے دیکھ کر بالآخر باپ کو یہاں کی تمام صورتحال سے آگاہ کیا تھا، آئیکت کا مدد طلب کرنا اور اس کا مدد کرنا سب کچھ باپ کے گوش گزار کر کے واپسی کے مطالبہ کو شدید تر کر دیا تھا اور حیدر سلطان نے فوراً ہی واپسی کا قصد کر لیا تھا اور بیوی کو واپسی کے لیے تیار نہ دیکھ کر بیٹے کا کارنامہ بیوی کے گوش گزار کر دیا تھا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے ابسام کا۔۔۔ ایسے کیسے کسی بھی لڑکی کو گھر میں رکھ لیا ہے۔'' وہ تو سنتے ہی غصہ میں آ گئی تھیں۔

''وہ لڑکی کسی نہیں ہے فضہ، اپنے ابسام کے اکلوتے دوست آئیکت کی کزن ہے۔'' نرمی سے ان کی اصلاح کی تھی۔

''بات یہ نہیں ہے کہ لڑکی کون ہے حیدر، بات یہ ہے کہ وہ لڑکی ہے اور یہ بات کسی بھی طرح سے ٹھیک نہیں ہے کہ ہماری غیر موجودگی میں ایک جوان لڑکی ہمارے گھر میں رہے۔'' وہ اپنا غصہ و ناگواری چھپا ہی نہیں پا رہی تھیں۔

''برا مجھے بھی لگا ہے، ابسام کو ہم سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔'' وہ بھی صاف گوئی سے کہہ گئے تھے۔

''اس گدھے نے مشورہ نہیں کیا تھا اگر وہ لڑکی گھر آ ہی رہی تھی تو ہم سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ ہم پاکستان پہنچ جاتے۔ فضول میں حماقت کر کے بیٹھ گیا ہے، ہم جس سسٹم میں رہتے ہیں وہاں کیا یہ بات کسی کو بھی ہضم ہو گی کہ ہماری غیر موجودگی اور صرف ابسام کی موجودگی میں کوئی لڑکی ہمارے گھر میں رہے۔ بھائی صاحب کو یہ بات پتہ لگی تو وہ کیا سوچیں گے۔'' وہ اپنی ناگواری کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے خدشات کا بھی تذکرہ کر گئی تھیں۔

''ابسام نے حرکت تو غلط کی ہے اب جا کر ہی اسے دیکھتے ہیں۔ فی الحال تم یہاں کسی سے ذکر مت کرنا۔'' انہوں نے بیوی کو دیکھتے ہوئے بات ختم کرنے کے ساتھ انہیں ہدایت بھی دی تھی۔

''کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ حیدر، کہ بھلا ایسی باتیں بھی کبھی چھپی ہیں۔ ہماری غیر موجودگی میں وہاں کسی لڑکی کا ابسام کے ساتھ ہونا ہزار سوالوں اور شکوک کو جنم دے گا اور آپ بھائی صاحب کو تو جانتے ہیں وہ ان باتوں کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔'' وہ بیٹے پر شدید غصہ تھیں اور انہیں کئی خدشات بھی لاحق تھے کہ چند سال قبل انہوں نے اپنے سب سے بڑے بھائی شکیل احمد کی بیٹی سے ابسام کی منگنی کی تھی۔ شکیل احمد کافی کنزرویٹو مائنڈ رکھتے تھے اور انہیں اپنی روایات، رسم و رواج بے حد عزیز تھے وہ ایک با اصول شخص تھے اور اصولوں سے نہ انحراف کرتے تھے نہ انحراف کرنے والوں کو پسند کرتے تھے۔ ابسام حیدر اور نوائم احمد کی منگنی بڑوں کا فیصلہ تھا جس میں دونوں کی رضامندی شامل تھی مگر محض رضا کہ محبت جیسا جذبہ دونوں کے دل میں ہی موجود نہ تھا مگر دونوں کو ہی رشتہ پر اعتراض نہ تھا اور یوں ان کی منگنی ہو گئی تھی۔ نوائم احمد اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور کبھی پاکستان نہیں آئی تھی۔ ابسام سے مگر اس کی کافی اچھی بات چیت تھی اتنی انڈر اسٹینڈنگ جتنی کسی بھی کزن سے ہونی چاہیے یا ہو سکتی ہے۔ نوائم انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر رہی تھی یہ اس کا فرسٹ ائیر تھا۔ فضہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور ایک واحد وہی شادی ہو کر پاکستان گئی تھی۔ شکیل احمد کو ابسام پسند تھا۔ دھیمے لہجہ میں بات کرتا سنجیدہ مزاج نرم خو ابسام حیدر انہیں اپنی بیٹی کے لیے پرفیکٹ لگتا تھا جبکہ نائلہ احمد کو اعتراض تھا کہ وہ اکلوتی بیٹی کو نگاہ سے اتنی دور نہیں بھیجنا چاہتی تھیں مگر جس طرح حیدر سلطان نے کبھی سات سمندر کی دوری ان لوگوں کو محسوس نہ ہونے دی تھی اس بات نے فیصلہ لینے میں آسانی پیدا کر دی تھی اور اسی لیے جب فضہ حیدر نے بھائی سے اپنے بیٹے کے لیے ان کی بیٹی کا ہاتھ مانگا تھا تو شکیل احمد نے انکار نہیں کیا تھا۔

''تم اپنی جگہ درست کہہ رہی ہو فضہ، مگر بس تم پاکستان جانے کی تیاری کرو پھر بعد میں دیکھتے ہیں کہ یہاں سب کے علم میں بات

کیسے لانی ہے۔'' وہ بیوی کو چپ کروا گئے تھے اور ان کا تو اسی دن واپسی کا ارادہ تھا مگر اچانک فضہ کی والدہ کی طبیعت بگڑ گئی تھی اس لیے ارادہ ملتوی ہو گیا تھا مگر اگلے دن کی انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی سیٹ کنفرم کروالی تھی اور بات کے پتہ چلنے کے پانچویں دن دونوں میاں بیوی پاکستان پہنچ گئے تھے۔

☆......☆......☆

''ابسام کہاں ہے۔'' فضہ حیدر نے گھر میں قدم رکھتے ہی ملازمہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بیٹے کا پوچھ لیا تھا۔

''چھوٹے صاحب تو اپنے کمرے میں ہیں۔'' ملازمہ ترنت بولی تھی۔

''ایک سیکنڈ میں بلا کر لے کر آؤ۔'' انہوں نے ہینڈ بیگ صوفے پر منتقل کرتے ہوئے حکم دیا تھا تب ہی حیدر سلطان چلے آئے تھے۔

''فضہ! تسلی سے بیٹھ جاؤ۔ سفر سے آئی ہو تھکی ہوئی ہو، بات تو آرام سے بعد میں بھی کی جا سکتی ہے۔'' انہوں نے بیوی کو ٹہلتے دیکھ دھیمے سے کہا تھا۔

''آپ کو لگتا ہے حیدر کہ یہ بات بعد میں کرنے والی ہے۔'' وہ ناگواری سے شوہر کو دیکھنے لگی تھیں تب ہی ابسام حیدر نے پُر جوش انداز میں انٹری دی تھی۔

''السلام علیکم ماما، پاپا۔'' اس کے انداز میں خوشی تھی۔ حیدر سلطان نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا تھا مگر فضہ بیٹے کے سلام کو ان سنا کر گئی تھی۔

''ابسام! ایک سیکنڈ میں مجھے بتاؤ کہ تم نے اتنی احمقانہ حرکت کی کیسے؟'' وہ ماں کے غصہ کو دیکھ کر تمام تر ایکسائٹمنٹ بھول گیا تھا کہ وہ والدین کی اکلوتی اولاد تھا اسی لحاظ سے ان سے اٹیچمنٹ بھی تھی۔ ماں میں تو اس کی جان بستی تھی۔ وہ اتنے دن کے لیے کبھی پاکستان سے باہر نہیں رہی تھیں بہت سے بہت ہفتہ بھر میں ان کی واپسی ہو جاتی تھی اور اب تو وہ تقریباً 27 دن بعد واپس آئی تھیں وہ انہیں بہت مس کر رہا تھا مگر انہوں نے اسے بے قراری ظاہر کرنے کب دی تھی وہ ماں کے سوال پر باپ کو دیکھنے لگا تھا جنہوں نے فون پر ہی اسے بتا دیا کہ فضہ حیدر بہت غصہ میں ہیں اور اس نے تو سوچ لیا تھا وہ ماں کو ہمیشہ کی طرح پیار سے منا لے گا مگر اس بار اسے کچھ مشکل محسوس ہوا تھا کہ اس نے ماں کو اتنے شدید غصہ میں تو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔

''ماما! آپ سفر سے آئی ہیں پلیز بیٹھ تو جائیے میں تمام بات آپ کو بتا دوں گا۔'' وہ ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔

''بتا نہیں دوں گا، بتا دو۔'' وہ بیٹے کو سخت غصہ سے دیکھتیں فاصلے پر ہو گئی تھیں اور اس نے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے تمام تر تفصیل ماں کے گوش گزار کر دی تھی۔

''تمہاری نظر میں ماں، باپ کی اتنی سی اہمیت نہیں ہے کہ تم ایک فیصلہ لیتے وقت ان سے مشورہ کر لو، اور مشورہ کے قابل نہ سمجھو تو کم

از کم فیصلہ سے آگاہ ہی کر دو۔‘‘ تفصیل کے جواب میں وہ غصہ سے بولی تھیں اور وہ تو سٹپٹا ہی گیا تھا۔ بے قراری سے ماں تک پہنچ کر ان کے ہاتھ تھام گیا تھا۔

’’ماما ایسا نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔‘‘

’’ایسا نہیں تھا تو ایسا ہو کیسے گیا، تم نے پروف تو یہی کیا ہے کہ ماں باپ کی کوئی اہمیت اور وقعت ہی نہیں ہے تمہاری نگاہ میں۔‘‘ وہ نہ صرف اس کے ہاتھ جھٹک گئی تھیں اس کی بات کو درمیان سے کاٹ بھی گئی تھیں اور وہ تڑپ ہی تو گیا تھا۔

’’ماما! پلیز ایسے مت کہیں، آپ جانتی ہیں ایسا نہیں ہے میں آپ کو اور پاپا کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا، آپ نانو کی طبیعت کو لے کر ہی پریشان تھیں ایسے میں، میں نے آپ کو نہ بتانا ہی مناسب سمجھا۔‘‘ وہ دھیمے سے بولا تھا۔

’’ہمیں پریشانی سے بچانے کے لیے تم نے ہمیں بہت زیادہ نہ صرف پریشان کیا ہے بہت تکلیف بھی دی ہے۔‘‘ وہ بھیگے لہجہ میں کہتیں اپنے کمرے کی جانب بڑھی تھیں اور وہ لپک کر ماں کی راہ میں نہ صرف آیا تھا ان کو شانوں سے تھام گیا تھا۔

’’ماما، پلیز ایسے تو مت کہیں۔ میں نے صرف آئیکت کی مدد کی ہے کم از کم آپ تو مجھے سمجھیں۔‘‘ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیسے ماں کی ناراضگی، ان کا غصہ ختم کر دے۔

’’ایک میں اور تمہارے پاپا ہی ہیں جو تمہیں سمجھ سکتے ہیں، تمہارے عمل کو مثبت انداز میں دیکھ سکتے ہیں، ورنہ تمہارا عمل کہیں سے بھی قابل ستائش نہیں ہے کیونکہ مدد کرنے، نیکی کرنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ گر ایسا نہ ہو تو مثبت و منفی کا فرق ہی مٹ جائے۔ ہمیشہ یاد رکھنا مثبت سوچ کے ساتھ کوئی کام کرنا مگر غلط طریقے سے کرنا انتہائی غلط ہے کیونکہ دنیا کی نظر میں صرف عمل آتا ہے، سوچ نہیں اور عمل کی پاکیزگی کو محسوس کرنے کے لیے بھی نظر کی نہیں بصارت کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے نیکی کرنے سے پہلے بھی تمام باتوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے ورنہ نیکی کر دیا میں ڈال والی بات ہو جاتی ہے۔‘‘ وہ بیٹے کو مضطرب ہوتے دیکھ کر خود کو کنٹرول کرتیں دھیمے سروں میں بولی تھیں۔

’’ماما! میں مانتا ہوں میری غلطی ہے مگر آئیکت بہت پریشان تھا اس نے مدد چاہی تو میں انکار نہ کر سکا۔‘‘ وہ ماں کا ہاتھ تھامے صوفے تک پہنچا تھا انہیں صوفے پر بٹھا کر خود کارپٹ پر ان کے پیروں کے پاس ٹک گیا تھا۔

’’آئیکت کو جانتی ہوں میں، تمہارا دوست ہے۔ اس کی مدد کی تم نے، اچھا کیا مگر بات یہاں ایک لڑکی کی ہے، اس کی عزت کی ہے کہ معاشرہ اس سب کو کبھی بھی مثبت انداز میں نہیں دیکھے گا۔ کرنے کو تو تم نے نیکی کر لی مگر جب یہ نیکی منظر عام پر آئے گی تو نہ صرف تم پر، اس لڑکی پر بھی انگلیاں اٹھیں گی، تم مرد ہو اس لیے بچ نکلو گے، اس لڑکی کی تو عمر بھر کی نیک نامی پر حرف آ جائے گا۔‘‘ وہ بیٹے کو دیکھتے ہوئے غصہ کی اصل وجہ سے آگاہ کر رہی تھیں کہ وہ اس خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جہاں عزت کو اولیت دی جاتی تھی۔

’’میں یہاں ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی، اس طرح میری غیر موجودگی میں اس لڑکی کا یہاں آنا، گزشتہ دس دن سے اس کا یہاں رہنا

بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جسے تم نیکی سمجھ رہے ہو یہ تو گلے کی وہ ہڈی ہے جسے تم نہ نگل سکو گے نہ اگل سکو گے۔'' وہ مضطرب سی بولی تھیں تب ہی ان کی نگاہ اٹھی تھی لاؤنج کی دہلیز پر ایک اجنبی چہرہ آنسوؤں سے تر ان کی نگاہ میں آ گیا تھا۔ آبدار عشاء کی نماز سے فراغت کے بعد کمرے سے نکلی تھی کہ عشاء کی نماز سے قبل ملازمہ اسے رات کے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی اور اس نے نماز کے بعد کھانا کھانے کا کہا تھا مگر اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ابسام حیدر کے پیرنٹس نہ صرف آ چکے ہیں اس کی یہاں موجودگی پر اس کی ماما سخت غصہ ہیں، وہ بیٹے کو سائیڈ پر کرتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں اور آبدار، ابسام حیدر کی ماما کو عین سامنے کھڑے دیکھ کر مضطرب ہو گئی تھی اور مارے گھبراہٹ کے اس کے آنسو تھم سے گئے تھے۔

''میں فضہ حیدر ہوں، ابسام حیدر کی ماما۔'' وہ اس کے چہرے سے ہی سمجھ گئی تھیں کہ وہ وہاں کافی دیر سے نہ صرف موجود تھی ان کے نادر خیالات اور غصہ سے فیض یاب ہو چکی تھی اس لئے وہ نرمی سے تعارف کروا گئی تھیں اور آبدار یکدم پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی فضہ حیدر نے کچھ کہنے کی بجائے آگے بڑھ کر اسے اپنے کاندھے سے لگا لیا تھا اور اسے تو کسی ہمدردی کی ضرورت تھی وہ اور شدتوں سے رونے لگی تھی۔

''یاد رکھنا رونا ہر مسئلہ کا حل نہیں ہوتا۔'' وہ اسے خود سے الگ کرتے ہوئے دھیمے لہجہ میں کہہ کر ملازمہ کو پانی لانے کے لیے آواز لگا گئی تھیں۔ انہوں نے آبدار کو نرمی سے پچکارتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بمشکل صوفہ پر ٹک گئی تھی۔ کمرے میں یکدم خاموشی چھا گئی تھی کمرے میں آبدار کے علاوہ تین نفوس اور تھے مگر تینوں ہی اس کے لیے اجنبی تھے، غیر شناسائی تھی مگر اسے یہ غیر شناسائی نہیں رلا رہی تھی کہ اس نے تو شناسا لوگوں کے درمیان رہ کر بھی غیر شناسائی و اجنبیت کا عذاب جھیلا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تو اس کی بے بسی کا نشان تھے، آبدار کو تو یہاں اپنی موجودگی رلا رہی تھی اور تب ہی ابسام حیدر کی ماما دھیمے سروں میں بہت کچھ کہہ گئی تھیں انہوں نے صاف کہا تھا کہ انھیں آبدار کے یہاں ہونے پر نہیں، ان کی غیر موجودگی میں ہونے پر اعتراض ہے۔ انہیں اپنے بیٹے پر، اپنی تربیت پر پورا بھروسہ ہے مگر وہ غلط کو کبھی بھی صحیح نہیں کہہ سکتیں اور ان کے بیٹے کا عمل غلط تھا اور وہ یہ صاف کہہ رہی تھیں اور آبدار ان کی باتیں سن کر اپنے آپ میں چور بن کر رہ گئی تھی۔

''میں ایسے یہاں نہیں آنا چاہتی تھی، میں نے آئیکت کو بہت روکنا چاہا تھا مگر آئیکت نے میری نہیں سنی، مجھے سب کا مجرم بنا دیا۔ میں سب کی نظروں سے گر گئی ہوں۔ آپ سے میں بے حد شرمندہ ہوں۔ بٹ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ آپ کو میں پریشان نہیں کروں گی۔'' آبدار کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں وہ دونوں باپ بیٹے مضطرب سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جبکہ فضہ حیدر بڑی پرسکون سی بیٹھی تھیں۔

''میں نے تم سے یہاں سے جانے کو نہیں کہا کہ اگر میرے بیٹے نے کسی کی مدد کا بیڑہ اٹھایا ہے تو میں اپنے بیٹے کے ساتھ ہوں۔'' ان کا لہجہ بڑا ہموار تھا وہ حیرت سے ماں کو دیکھ رہا تھا کہ کہاں وہ اس پر خفا ہو رہی تھیں، آبدار کو صاف گوئی سے بہت کچھ سنا گئی تھیں اور کہاں اب یکدم وہ بیٹے کو اپنے ساتھ کا یقین دے رہی تھیں۔ اور آبدار بھی ابسام حیدر کی والدہ کو حیرت سے تک رہی تھی اور فضہ حیدر اس کی حیرت

بھانپ گئی تھیں اور انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی تھی۔

''میں بحثیت ایک ماں اپنے بیٹے کی درست جانب نشاندہی کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں اس لئے میں نے ابسام کی نیکی میں جو برائی پوشیدہ ہے اس سے اپنے بیٹے کو آگاہ کر دیا ہے تا کہ وہ آئندہ نیکی کو نیکی کی طرح انجام دے، نیکی کبھی برائی کے قالب میں ڈھلتی محسس نہ ہو اور اسی لیے بیٹا میں نے تم سے بھی سچائی سے دل کی بات کہی کہ میں جانتی ہوں، سمجھتی ہوں کہ تم نے اپنے گھر کی چاردیواری کن حالات میں عبور کی، کہ عورت چاردیواری کے لیے اپنا سب کچھ تیاگ دیتی ہے اور تم اس چاردیواری کی حدود سے نکل آئی ہو تو سبب معمولی ہرگز نہیں، تمہارا دکھ، تمہاری مجبوری سب عیاں ہے اس لیے میں تمہیں غلط نہیں کہہ رہی اور تم یہاں میرے گھر میں، بے فکر ہو کر رہ سکتی ہو کہ آج سے تم میری بیٹی ہو اور بیٹیوں کی حفاظت ماؤں کی ذمہ داری ہوتی ہے، آج سے تم میری ذمہ داری ہو۔'' فضہ حیدر کا نرم لہجہ خاموشی کا پردہ چاک کر رہا تھا اور آبدار کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں کہ ایک اجنبی انجان عورت اسے بیٹی کہہ رہی تھی، اس کی ذمہ داری لے رہی تھی جبکہ اسے تو کبھی اس کی ماں نے بھی بیٹی کہہ کر نہیں پکارا تھا، اس کی ذمہ داری نہیں لی تھی کہ اگر اس کی ماں اس کی محافظ ثابت ہوتی تو اسے کبھی چاردیواری عبور نہ کرنی پڑتی۔ ابسام حیدر کی والدہ نے اسے اپنے کاندھے سے لگا لیا تھا اور زندگی میں دوسری بار آبدار کو کسی عورت میں ماں کی جھلک محسوس ہوئی تھی، اپنائیت کی رمق محسوس ہوئی تھی اور وہ فضہ حیدر کے کاندھے سے لگی بلک رہی تھی۔ اسے وہ پہلی عورت یاد آنے لگی تھی جس نے اسے ممتا کا احساس بخشا تھا اس کی تائی اماں، آئیکت اور کزئی کی والدہ، جو ہزار اجنبی چہروں میں ہمیشہ اس کے لیے اپنائیت کی دیوار ثابت ہوئی تھیں مگر یکدم وہی سب سے زیادہ بیگانہ ہو گئی تھیں اور جو انکشافات اس کی ذات پر ہوئے تھے اس کے بعد تو اسے تائی سے تو کیا کسی سے بھی کوئی گلہ نہیں رہا تھا کہ وہ جان گئی تھی سب کے پاس اس سے نفرت کرنے کا ٹھوس جواز موجود تھا اور وہ تھی ہی نفرت کے لائق۔۔۔! وہ جانے کتنی دیر روتی رہتی خود ترسی کا شکار ہوتی رہتی کہ فضہ حیدر نے اسے پیار سے ڈپٹ کر اس کے آنسو صاف کیے تھے اور فریش ہو کر آنے کو کہا تھا۔

☆......☆......☆

''شاہ! پلیز میری کال تو ریسیو کریں۔'' عریم نے بہت روتے ہوئے ٹیکسٹ ٹائپ کر کے شاہ زیب اور کزئی کے نمبر پر سینڈ کیا تھا کہ وہ اسے مستقل گھنٹہ بھر سے کال کر رہی تھی مگر وہ اس کی کال ریسیو ہی نہیں کر رہا تھا ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ عریم کی کال ریسیو نہ کرے۔ اگر بہت غصہ میں ہوتا تھا تو تیسری یا چوتھی بیل پر کال ریسیو کر ہی لیتا تھا یا ٹیکسٹ کر کے کہہ دیتا تھا کہ وہ اسے کال نہ کرے وہ بات نہیں کرنا چاہتا اور جب وہ ایسا کرتا تھا تو عریم کی جان پر بن آتی تھی وہ ایک کے بعد ایک ٹیکسٹ کرتی اسے منانے کی کوشش میں سرگرداں ہو جاتی تھی جبکہ وہ اس کی ہزار کوششوں کے بعد یوں کال ریسیو کرتا تھا جیسے عریم پر احسان کر رہا ہو مگر آج بلا مبالغہ پچیس، تیس کال کے بعد بھی شاہ زیب نے کوئی ریسپانس نہیں دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شاہ زیب ناراض ہو گا مگر اتنی شدید ناراضگی کا تو اس نے تصور بھی نہ کیا تھا اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔

''پلیز شاہ۔آپ کال تو ریسیو کریں، میں آپ کو سب بتا دوں گی۔سوری میں بہت چاہ کر بھی نہ آسکی۔'' شاہ زیب جلے پیر کی بلی کی مانند کمرے میں چکرا رہا تھا۔اس کا بس چلتا تو پہلی بیل پر اس کی کال ریسیو کر کے اسے بے نکت سناتا مگر ایسا بہت چاہ کر بھی نہیں کر پایا تھا اور گھنٹہ بھر سے مستقل آتی بیل کو نظر انداز کرتا جا رہا تھا کہ اب اس کے متواتر ٹیکسٹ آنے لگے تھے۔

''آئی ایم سوری شاہ۔پلیز ایسا مت کریں۔میں مر جاؤں گی۔پلیز کال ریسیو کریں۔''اس نے ٹیکسٹ پڑھ کر ڈیلیٹ کیا تھا اور عریم کا نمبر ریڈائل کر دیا تھا اور وہ تو جیسے منتظر ہی تھی سیکنڈ کی تاخیر کے بغیر وہ شاہ زیب کی کال ریسیو کر گئی تھی۔

''خبردار! جو تم نے مجھے کوئی کال کی یا اب پھر کوئی ٹیکسٹ کیا ورنہ میں خود تمہیں جان سے مار دوں گا۔''وہ کال ریسیو ہوتے ہی دھاڑا تھا۔

''شاہ! پلیز میری بات تو سنیں، مجھے اپنی صفائی دینے کا ایک موقع تو دیں۔''وہ سسکی تھی۔

''بکواس بند کر دو عریم! تم نے مجھے پاگل سمجھا ہوا ہے۔میں وہاں دھوپ میں گھنٹوں کے حساب سے کھڑا انتظار کرتا رہا اور تم نے آنا تو دور ایک کال کر کے مجھے یہ تک بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ تم نہیں آؤ گی۔''وہ غصہ کی انتہا پر تھا اور وہ بے کسی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔

''مجھے اندازہ تھا شاہ! مگر میں کیا کرتی، پاپا نے مجھے کالج جانے سے منع کر دیا تھا۔'' وہ اس کی تکلیف و پریشانی کے احساس سے پہلے ہی کم مضطرب نہ تھی اس کے اظہار پر تو گویا تڑپ اٹھی تھی جبکہ اس نے تو جھوٹ ہی بولا تھا کہ وہ تو نہایت سکون سے اپنے آفس میں بیٹھا، دفتری امور انجام دیتا رہا تھا کہ اسے پتہ تھا کہ وہ پہنچتے ہی اسے کال کرے گی مگر اس نے تو سرے سے کوئی کال ہی نہیں کی تھی اس کا نمبر آف تھا۔یہ بات پریشانی والی تھی کہ اس کا نمبر آف ہے اور وہ جو اپنے طور پر تمام انتظامات کر چکا تھا اسی لیے اسے شدید غصہ تھا جو وہ اس پر نکال رہا تھا اور وہ ایسا صرف پریشرائز کرنے کے لیے کر رہا تھا تا کہ وہ جو آج نہیں آئی تھی تو کہیں آئندہ بھی نہ آئے جبکہ اس کے پاس تو وقت ہی نہ تھا۔آج کا دن گزر گیا تھا اب اسے جو کرنا تھا کل کرنا تھا کہ وہ پرسوں کا رسک نہیں لے سکتا تھا اس کے غصہ سے تو عریم کی پہلے ہی جان جاتی تھی اس کے چیخنے پر وہ پوری جان سے لرز کر رہ گئی تھی۔

''کال کرنے کو بھی تمہارے پاپا نے منع کیا ہوگا، اتنی ہی اپنے پاپا کی فرمانبردار ہو تو مجھے اب کیوں کال کر رہی ہو، ضرورت ہی نہیں ہے تمہیں مجھے کال کرنے کی، میں فون بند کر رہا ہوں اور خبردار مجھے پھر سے کال کی۔''وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ درشتگی سے بولا تھا۔

''پلیز شاہ! فون بند مت کیجیے گا۔ایک بار میری بات سن لیں پلیز۔۔۔! آپ کو میری قسم شاہ۔''وہ بہت روتے ہوئے بمشکل بولی تھی اور وہ اس سے بات ایسے کر رہا تھا جیسے اس کی سات پشتوں پر احسان کر رہا ہو اور وہ کچھ کہتی کہ اس سے قبل اسے بے نکت سناتا چلا گیا تھا۔

''تمہیں ہر وقت بس بحث کرنی ہوتی ہے۔اپنی مجبوری کی داستان سنانی ہوتی ہے میں تو جیسے احمق ہوں، فارغ بیٹھا ہوتا ہوں۔تمہاری مرضی کا غلام ہوں جب محترمہ کا دل چاہے مجھ سے بات کریں اور میں لبیک کہوں۔میری تو اپنی کوئی لائف نہیں ہے۔میری کوئی مرضی نہیں ہے۔میری پریشانی کا تو تمہیں احساس تک نہیں ہے۔وہاں کالج کے باہر گھنٹوں سے حساب سے کھڑا رہا، تمہارے لیے

پریشان ہوتا رہا، پاگلوں کی طرح تمہیں کال کرتا رہا مگر تمہیں میری پریشانی سے کیا تم تو مزے سے اپنے گھر میں بیٹھیں آرام کر رہی تھیں۔''
وہ بلا تکان اسے بے نکت سناتا ہی چلا گیا تھا اور وہ کچھ کہنے کی چاہ میں بس آنسو بہاتی سنتی جا رہی تھی کہ یکدم چیخ پڑی تھی۔
''بس کر دیں شاہ۔ میں کوئی مزے سے نہیں بیٹھی تھی۔'' شاہ زیب یکدم لب بھینچ گیا تھا کہ یہ ان کے ایک سالہ ساتھ میں پہلی دفعہ ہوا تھا کہ وہ غصہ کر رہا تھا، کچھ کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی بات کاٹ کر کچھ کہہ گئی تھی۔
''پاپا نے منع کر دیا تھا مجھے کالج جانے سے۔ میں نے پاپا سے بہت کہا کہ میری فرینڈز آ رہی ہیں، مجھے ان سے نوٹس لینے ہیں بٹ پاپا نے اجازت نہیں دی۔ میں نے پاپا کے آفس جانے کے بعد ماما سے انسسٹ کیا، ان سے ریکوئسٹ کی تو ماما میرے لیے راضی ہو گئیں......'' وہ لحظہ بھر کو رکی تھی جبکہ وہ بیڈ کے کونے پر ٹکا بے توجہی سے اسے سن رہا تھا کہ تفصیلات سے اسے کبھی شغف نہیں رہا تھا وہ وضاحت دینا ضروری نہیں سمجھتا تھا اکثر وہ اسے وضاحتوں پر وضاحتیں دے کر اسے چڑا دیتی تھی جیسے اس وقت وہ غصہ کے ساتھ چڑچڑاہٹ کے شکار ہونے لگا تھا۔
''ماما نے پاپا کو کال کر کے کہہ دیا تھا کہ وہ اور میں شائستہ خالہ کے گھر جا رہے ہیں اور میں ماما کے ساتھ کی وجہ سے آپ کو کال نہیں کر پائی کہ آپ کو کال کرتی تو آپ آگے سے بات کرتے میں ماما کی موجودگی میں آپ کو کوئی آنسر نہیں دے سکتی تھی میں ماما کے ساتھ کالج جا تو رہی تھی مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آپ سے کس طرح مل پاؤں گی تب ہی ماما نے کہا تھا کہ وہ گاڑی میں ہی میرا انتظار کریں گی میں جلدی سے اپنی فرینڈز سے نوٹس لے کر آ جاؤں۔ یکدم مجھے سکون سا محسوس ہوا تھا میں نے سوچ لیا تھا کہ آپ کو ٹیکسٹ کر دوں تا کہ آپ کالج آ جائیں مگر میں ٹیکسٹ نہیں کر پائی تھی راستے میں تھے کہ ہماری گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔'' اس کی حد درجہ طویل گفتگو میں یکدم ایک لفظ شاہ زیب کو چونکا گیا تھا۔ وہ اس کو اب ایکسیڈنٹ کی تفصیل بتا رہی تھی اور اب کے وہ اسے غور سے سن رہا تھا۔
''عریم۔ تم ٹھیک ہو، تمہیں کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟'' وہ انتہائی فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔
''میں بالکل ٹھیک ہوں شاہ۔ بٹ ماما کافی انجرڈ ہوئی ہیں۔'' وہ سسکی تھی وہ بیک سیٹ پر لیفٹ سائیڈ پر تھی اس لیے وہ محفوظ رہی تھی کہ گاڑی رائٹ سائیڈ سے درخت سے ٹکرائی تھی اس لیے اس کی ماما ہی نہیں ڈرائیور بھی کافی زخمی ہو گیا تھا۔
''آنٹی، کیا بہت زیادہ زخمی ہوئی ہیں۔'' وہ دھیمے سے پوچھ رہا تھا۔
''ماما کا ہاتھ فریکچر ہو گیا ہے اور کافی چوٹیں بھی آئی ہیں۔ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں، میں اور پاپا ہاسپٹل میں ہی تھے اس لیے میں نے آپ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔'' وہ اپنے آنسو رگڑتے ہوئے بھیگے لہجہ میں بولی تھی اس نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔
''سوری، مجھے اس سب کا پتہ نہیں تھا اور تم احمق اتنے ٹیکسٹ اور کال کر رہی ہو جانتی تو ہو مجھے غصہ میں کچھ سمجھ نہیں آتا، تم مجھے ایک ٹیکسٹ ہی کر دیتیں تو میں خود تمہیں کال کر لیتا۔'' وہ بناوٹ وجھوٹ سے پاک جملہ بول ہی گیا تھا۔

''آپ بھی تو جانتے ہیں، آپ کے غصہ سے میری جان جاتی ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا، صبح سے ہاسپٹل میں تھی ابھی آٹھ بجے آئی اور گھر پہنچتے ہی آپ کو کال کی، کچھ کھانا یا فریش ہونا تو دور کی بات ہے۔'' عریم کی بات سن کر اسے یکدم اپنے رویے پر شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی مگر وہ یہ ظاہر نہیں کرسکتا تھا۔

''تم فریش ہو کر آرام کرو، میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔'' وہ نرم پڑ گیا تھا۔

''آپ ناراض تو نہیں ہیں مجھ سے؟'' اس کے نم لہجہ میں کیسی بے قراری تھی یکدم شاہ زیب کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''نہیں، میں اپنی عریم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔'' وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے جواب کی منتظر ہے اس لیے خود کو کمپوز کر کے بولا تھا۔

''آپ کبھی مجھ سے خفا مت ہونا شاہ، آپ بات نہیں کرتے تو میری جان نکلنے لگتی ہے۔'' وہ بھیگے لہجہ میں بولی تھی شاہ زیب کے لیے اس سے مزید بات کرنا مشکل ہونے لگا تھا۔

''فضول بات مت کیا کرو، اپنا خیال رکھو، آرام کرو پھر بات کریں گے۔'' وہ اس کی جذباتیت سے خائف دھیمے سے بولا تھا۔

''آئی لو یو شاہ!'' بھیگے لہجے میں اظہار ہوا تھا کہ اسے خود کو کمپوز رکھنا مشکل لگنے لگا تھا مگر پچھلے سال میں وہ اتنے ڈرامے کر چکا تھا کہ وہ خود کو کمپوز کرتا دھیمے سے گویا ہوا تھا۔

''لو یو ٹو سویٹ ہارٹ، اپنا میرے لیے خیال رکھنا، میں تمہیں رات میں کال کروں گا تم ابھی آرام کرو۔'' اس کا بھاری گھمبیر لہجہ عریم کے دل کی دنیا زیروزبر کر گیا تھا، ہتھیلیاں نم پڑ گئی تھیں۔

''اوکے شاہ! میں آپکی کال کا انتظار کروں گی۔۔۔ گڈ بائے۔'' اس کے لہجہ کی لرزاہٹ میں چھپی حیا کو وہ محسوس کرتا آگے سے ''گڈ بائے، ٹیک کیئر یور سیلف'' کہتا رابطہ منقطع کر گیا تھا اور بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔

''تم نے اپنی پوری زندگی بہت محتاط، شفاف گزاری ہے تمہارا یہ ایک عمل تمہیں کٹہرے میں کھڑا کردے گا اور تم دنیا کی عدالت سے تو بحیثیت مرد باعزت بری ہو جاؤ گے مگر ضمیر کی عدالت میں کبھی سرخرو نہیں ہو پاؤ گے اس لیے میری مانو تو بھول جاؤ وہ سب جو تمہیں تمہاری اچھی روش چھوڑنے پر اکسا رہا ہے، تمہیں ایک معصوم کی زندگی سے کھیلنے پر مجبور کررہا ہے، مت کرو ایسا شاہ، کہ یہ سب بہت غلط ہے۔'' حاشر کی آواز کانوں میں گونجی تھی۔ چکراتے قدم تھم گئے تھے۔ اس نے اپنا سر تھام لیا تھا۔ وہ جو کرنا چاہتا تھا درحقیقت وہ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر پھر بھی پلاننگ کررہا تھا مگر اس کے ارادہ پر آج پانی پھر گیا تھا مگر باوجود اس کے اس نے اپنا ارادہ بدلا نہیں تھا۔ رات گئے عریم کو کال کی تھی اور اس سے یہی کہا تھا کہ ہاسپٹل کے بہانے وہ گھر سے نکل کر اس سے ملے یا ہاسپٹل سے نکلنا اس کے لیے ممکن ہو تو وہ ہاسپٹل پہنچ کر اس سے رابطہ کرے کہ وہ اس سے ہر حال میں ملنا چاہتا ہے اور عریم نے فی الحال ملنے سے منع کیا تھا تب وہ خفا ہونے لگا تھا اور اسے ناراض ہوتے دیکھ کر اس نے حامی بھر لی تھی۔ قسمت نے ایک بار اسے اندھے کنوئیں کی نذر ہونے سے بچا لیا تھا مگر وہ خود اپنی دشمن بنی ہوئی تھی۔ اسے شاہ زیب کا اصل چہرہ نظر نہیں آرہا تھا کہ اس کی آنکھوں پر تو پیار کی پٹی بندھی تھی اور جب اسے شاہ زیب کا چہرہ نظر آتا تو اس پٹی کو اتر

جانا تھا کہ اور مضبوطی سے کس جانا تھا یہ وقت نے ہی ثابت کرنا تھا۔ اس کے حامی بھرنے پر وہ مطمئن تھا کہ جانتا تھا کہ وہ ضرور آئے گی اور اس نے صبح سب سے پہلے حاشر کو کال کر کے انتظامات کے حوالے سے بات کی تھی اسے ریڈی رہنے کو کہا تھا اس نے پھر سمجھانا چاہا تھا مگر شاہ زیب نے اس کی سنے بغیر اپنی سنا کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ وہ آفس میں تھا جب دن کے ڈھائی بجے عریم کی کال آنے لگی تھی۔ وہ لمحہ ضائع کیے بنا اس کی کال ریسیو کر گیا تھا کہ اس کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

☆......☆......☆

''آنٹی! مجھے سچ میں کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا وہ اس گھر کے مکینوں کے لیے اہمیت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ فضہ حیدر نے اسے تیار ہونے کے لیے کہا تھا کہ ان کا ارادہ اسے شاپنگ کروانے کا تھا جسے سن کر وہ مضطرب سی بولی تھی۔

''میں نے ایسا تو کچھ کہا ہی نہیں کہ تمہیں جب کسی چیز کی ضرورت ہوگی تب وہ تمہیں دلاؤں گی۔'' ان کے ٹھہرے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہنے پر وہ کنفیوز ہوگئی تھی اور گڑبڑا کر انہیں دیکھنے لگی تھی جو چائے گھونٹ گھونٹ پیتیں کافی غیر معمولی سنجیدہ لگ رہی تھیں۔ اس کی تو آگے سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی تب حیدر سلطان بول پڑے تھے۔

''بیٹا! آپ اپنی آنٹی کے ساتھ چلی جاؤ کہ آپ کی آنٹی شاپنگ کبھی بھی ضرورتاً نہیں کرتیں کہ ان کا ماننا ہے کہ شاپنگ تو شوق کے لیے، مائنڈ فریش کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔'' حیدر سلطان کا انداز بیوی کو چھیڑنے والا تھا۔

"آپ تو بس چپ ہی رہیں ایک ہی میرا شوق ہے وہ بھی آپ کو بری طرح کھٹکتا ہے۔'' فضہ حیدر نے شوہر کو دیکھتے ہوئے منہ بنا کر کہا تھا۔ وہ ہمیشہ حیدر سلطان سے بچوں کی طرح ہی الجھتی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان انڈرسٹینڈنگ کمال کی تھی۔

''ایک تو مجھ معصوم پر الزامات کی بوچھاڑ ہو جاتی ہے، کھٹکتا ہوتا نا تمہارا شوق تو تمہارے شوق پر پیسہ پانی کی طرح کبھی بھی نہ بہاتا۔۔'' وہ کباب کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے بولے تھے یکدم وہ دونوں ہی جیسے پس منظر میں چلے گئے تھے۔ ابسام کے لیے یہ سب معمول کی بات تھی وہ سنجیدگی سے چائے کے سپ لیتا ان کے درمیان موجود تھا جبکہ وہ کافی حیرت سے یہ سب انجوائے کر رہی تھی کہ اس نے میاں بیوی کے درمیان انتہا کی انڈرسٹینڈنگ پہلی دفعہ دیکھی تھی ان دونوں کے درمیان رشتہ بہت مضبوط تھا اور وہ ایک دوسرے کو محبت، عزت اور اہمیت دیتے آبدار کو اس جہاں کے تو نہیں لگتے تھے کہ اس نے تو اپنے گھر میں مردوں کو عورتوں پر حکمرانی کرتے دیکھا تھا۔ بات بات پر ذلیل کرتے دیکھا تھا۔ اس کے بابا اس کی ماں کو مارنے تک سے گریز نہ کرتے تھے اور یہاں محبت سے اپنے رشتے کو نبھاتے فضہ اور حیدر اسے خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیتے تھے۔ چائے کے سپ لیتے ابسام کی نگاہ اس پر اٹھی تھی جو سبز کا ہی رنگ کے سوٹ میں اپنی تمام تر خوبصورتی کے ساتھ بیٹھی تھی اس کی کانچ سی بھوری آنکھوں میں شوق کا ایک جہاں آباد تھا، بچوں کا سا اشتیاق تھا۔ وہ فضہ اور حیدر کو حیرت سے تکتی کتنی معصوم لگ رہی تھی۔ اس کی نگاہ ٹھہر ٹھہر گئی تھی کہ اچانک کوئی الارم سا بجا تھا اور وہ خود پر لعنت ملامت بھیجتا نہ صرف نگاہ ہٹا گیا تھا ہاتھ میں موجود ادھ بھرا کپ ٹیبل پر منتقل کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''اوہ! یعنی اب آپ مجھے جتائیں گے۔'' فضہ حیدر کی آنکھوں میں ناگواری نے جگہ بنائی تھی۔

''میری یہ مجال کہ کچھ جتاؤں کہ یار جو کچھ میرا ہے وہ تمہارا ہی تو ہے مجھ سمیت، اس لیئے جتانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ اپنی مخصوص دلکشی سے مسکرا کر بولے تھے یکدم فضہ کے لبوں پر حیا آمیز مسکان بکھر گئی تھی اور آبدار سوچ رہی تھی کہ کاش اپنے گھر میں بھی کبھی یہ حسین منظر اس کی آنکھوں نے دیکھا ہوتا مگر وہ تو اپنے باپ سے صدیوں کے فاصلے پر تھی اس نے تو کبھی اپنے باپ کی آنکھوں میں اپنے لیے نرمی تو دور اپنائیت کی ہلکی سی جھلک تک نہ دیکھی تھی اسے تو یوں لگتا تھا جیسے محض ایک فارمیلیٹی کے طور پر اس کی ولدیت کے خانے میں اس کے باپ کا نام جہانزیب اور کزئی لکھا تھا اور یہ سوچ ایسی تھی کہ وہ بے چین ہو جاتی تھی کہ اسے اپنے باپ سے کبھی شفقت اور ماں سے ممتا نہیں ملی تھی اور ماں کی لاتعلقی، غیریت بھی تو سوالیہ نشان کی مانند تھی۔ اس کی آنکھیں جانے کس خیال سے بھیگ گئی تھیں ابسام حیدر کے اٹھتے قدم تھم سے گئے تھے۔ وہ گلاب سے رخساروں پر شبنمی قطرے گرتے دیکھ رہا تھا۔ دل نے ایک عجیب سی خواہش نے سر ابھارا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر ان موتیوں کو انمول خزانے کی مانند سمیٹ لے مگر اس کی سوچ عمل نہیں بن سکتی تھی کہ وہ اپنی حدود جانتا تھا۔ وہ سر جھٹک کر چلے جانا چاہتا تھا مگر قدم آگے بڑھنے سے انکاری تھے تب ہی آہٹ سی ہوئی تھی اور سامنے آئیکت اور کزئی کو پا کر اس کا اضطراب جانے کیوں بڑھ گیا تھا جبکہ آبدار کی حالت بھی کم و بیش ایسی ہی تھی وہ جو پہلے اس کو بلانے کے لیے بار بار ابسام سے کہتی تھی آج اس کو سامنے پا کر مضطرب ہو گئی تھی اور مضطرب تو آئیکت بھی ہو گیا تھا کہ اس نے آبدار کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے اور کیا بے بسی تھی کہ وہ انہیں صاف کرنا تو دور اس کی خیریت تک دریافت نہیں کر سکتا تھا آئیکت نے ابسام سے اور اس کے فادر سے مصافحہ کرتے ہوئے فضہ حیدر پر سلامتی بھیجی تھی اور اس پر نگاہ کی تھی جو رونے کو جیسے تیار کھڑی تھی۔ فضہ حیدر نے اس کی بے چینی کو بھانپتے ہوئے شوہر اور بیٹے کو اشارہ کیا تھا اور لمحہ کی تاخیر کے بعد وہ دونوں لاؤنج میں اکیلے رہ گئے تھے مگر جانے کیوں وہاں سے جاتے ہوئے ابسام حیدر کو اپنا آپ بہت خالی خالی سا محسوس ہوا تھا مگر وہ وجہ سمجھنے سے قاصر تھا جبکہ وہ بھی تو آئیکت کے سامنے مضطرب و بے بس سی کھڑی تھی وہ اس کی خیریت دریافت کر رہا تھا، اپنی بے قراری کی داستان سنا رہا تھا اور وہ نظر چرائے کھڑی تھی کہ اس کے دل میں تو ابسام حیدر کی شبیہ اتر گئی تھی اور وہ جو پہلے مسکرا کر آئیکت کی محبت اس کی فکر کو انجوائے کرتی تھی اب یکدم سب کچھ بدل گیا تھا اس کی بے قراری۔ اس کا اظہار محبت، اس کی فکر سب کچھ آبدار کو مضطرب کر رہا تھا اور اس کی غیر معمولی خاموشی کو وہ بھانپ گیا تھا۔

''آبی! کیا ہوا ہے، اتنی خاموش کیوں ہو؟'' وہ اس کا ہاتھ تھام کر نرمی و محبت سے استفسار کر رہا تھا۔

''آئیکت! میری دربدری کب ختم ہو گی؟ مجھے اپنے گھر جانا ہے۔'' وہ سسک اٹھی تھی۔

''میں خود بہت پریشان ہوں آبی، سب کچھ کب اور کیسے ٹھیک ہو گا، شاہ زیب مجھ پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے ایسے میں، میں ابھی ہمارے باہر جانے کا انتظامات کرنے سے بھی قاصر ہوں۔'' وہ آبدار کے آنسو صاف کرتے ہوئے بے بسی سے بول رہا تھا۔

''میں نے اسی لیے آپ کو منع کیا تھا، گھر سے نکلنا مسئلے کا حل نہیں تھا آئیکت......''

''تم اس بات کو رہنے دو، جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے تمہیں یوں کسی کے گھر بھیج کر میں سکون میں ہوں، سکون کو ترس گیا ہوں میں آبی، ایک لمحہ کو سکون نہیں میسر، میری تو نیندیں تک اُڑ گئی ہیں، تمہاری فکر اوپر سے شاہ زیب کی تلوار ہر وقت سر پر منڈلاتی رہتی ہے۔ کم از کم تم تو میری مجبوریوں کو سمجھو، چند پل دنیا کی نظر سے چرا کر تمہارے ساتھ کی آرزو میں تم تک آیا ہوں تو کم از کم میرے ان لمحوں کو میرے لیے یادگار بنا دو، میری مشکل و پریشانی کے لیے زادہ راہ دے دو۔'' وہ اس کے متورم چہرے کو دیکھتا بے بسی سے کہتا یکدم نہایت جذباتی ہو گیا تھا کہ دنیا کی بھیڑ میں ایک ہی چہرہ تو من میں بسا تھا اور جو من میں بسے ہوں ان کی فکر یونہی تل تل کر کے مارتی ہے۔ آبدار اس کی جذباتیت پر، اپنے آپ میں چور سی بن گئی تھی، ایک لفظ کہنے کو نہ تھا اس کے پاس، اس کی نظر جھک گئی تھی اور میکانکی انداز میں وہ اس کے مضبوط ہاتھ کی گرفت سے اپنا ہاتھ کھینچ گئی تھی۔ جسے وہ بڑی سرعت سے محسوس کر گیا تھا۔

''تم آج بہت اجنبی لگ رہی ہو آبی۔'' وہ چونک کر آئیکت کو دیکھنے لگی تھی جس کی خوبصورت پرفسوں آنکھیں آبدار کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ وہ اس کی آنکھوں کے سوال سے خائف ہوتی قدرے خوفزدہ سی نگاہ چرا گئی تھی۔

''آپ کا وہم ہے آئیکت۔ میں تو یہاں اجنبیت محسوس کرتی ہوں، آپ کی مشکلوں کو سمجھتی ہوں مگر میں بھی بہت مجبور ہوں، آپ مجھے بس یہاں سے لے جائیں۔'' وہ نظر چرا کر منمنا رہی تھی پلکوں کی دہلیز پر آنسو رُکنے لگے تھے۔

''تم فکر مت کرو، میں ہوں نا، میں بہت جلد سب ٹھیک کر لوں گا، ہم بہت جلد ایک ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔'' وہ آبدار کے آنسو پوروں پر چنتا اسے نئی امید دے رہا تھا مگر اس امید کی تو اس کے دل سے چاہ ہی مٹ گئی تھی کہ اس کا دل نئی امیدیں لگا بیٹھا تھا وہ آگے سے کچھ نہیں بولی تھی اور وہ اسے حوصلہ دیتا، اپنے ساتھ کا یقین سونپتا واپس چلا گیا تھا مگر جاتے جاتے آبدار کا رہا سکون بھی لے گیا تھا۔ وہ اپنے بدلتے جذبات سے ہی نہیں آئیکت کے جذبات سے بھی نہایت ہراساں تھی۔

☆......☆......☆

''ہیلو! عریم۔۔۔'' وہ بے قراری سے کال ریسیو کرتے ہی بولا تھا۔

''ماما! ابھی ہاسپٹل میں ہیں۔'' وہ مضطرب سی بولی تھی۔

''تم کہاں ہو؟'' مطلب کی بات پوچھی تھی۔

''میں ڈرائیور کے ساتھ گھر جا رہی ہوں۔'' وہ بھاری لہجے میں بولی تھی کہ مستقل رونے سے آواز بیٹھ گئی تھی۔

''تمہارے پاپا کہاں ہیں؟'' وہ اس کی بات کاٹ کر پوچھ گیا تھا۔

''ماما کو ابھی ڈسچارج نہیں کیا گیا اس لیے پاپا ہاسپٹل میں ہیں اور میں گھر جا رہی ہوں۔ پاپا نے کہا ہے میں شام میں آ جاؤں......'' اس نے تفصیل بتائی تھی اور وہ یکدم الرٹ ہو گیا تھا۔

''تم غور سے سنو جو بھی میں کہہ رہا ہوں......'' ہدایت دے کر اس نے تفصیل کہنی شروع کی تھی۔

''تم ڈرائیور کے ساتھ گھر پہنچ جاؤ مگر اندر مت جانا، میں تمہیں تمہارے گھر کے باہر سے ہی پک کر لوں گا۔'' اس نے شاہ زیب کی بات پر بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

''میں گھر میں نہیں جاؤں گی تو پاپا کو پتہ لگ جائے گا شاہ......'' وہ مزید ہدایات دے رہا تھا تب وہ منمنائی تھی۔

''تم اتنی احمق کیوں ہو عریم۔۔! کیسے لگ جائے گا پتہ۔۔۔جب تم گھر میں ہی نہیں جاؤ گی تو ملازم یہی سمجھیں گے کہ تم ہاسپٹل میں ہو اور تمہارے پاپا کی تسلی کے لیے تم کال کر کے کہہ دینا کہ گھر پہنچ گئی ہو۔'' وہ دانت کچکچا کر بہت ضبط کے ساتھ بولا تھا۔

''لیکن شاہ، مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہا ہے آپ نے مجھ سے مل کر جو بات کہنی ہے فون پر ہی کہہ دیں پلیز......'' وہ اس کے غصہ سے خائف ہو کر منمنائی تھی۔

''فون پر کہہ سکتا ہوتا تو کہہ دیتا، تم صاف بتاؤ تم نے آنا ہے یا نہیں۔'' وہ اس کی گھبراہٹ محسوس کر کے کچھ اور غصہ سے بولا تھا۔

''ماما کی طبیعت نہیں ٹھیک شاہ، میں ماما کی وجہ سے پریشان ہوں پلیز ہم پھر کبھی مل لیں گے۔'' وہ روتے ہوئے بولی تھی کہ وہ شاہ زیب سے سال بھر میں کوئی دس بارہ بار تو مل ہی چکی تھی۔ کیسے یہ بہت مشکل اور الگ سوال تھا کہ اس کے پاپا کی طرف سے پرمیشن نہیں تھی وہ ہمیشہ اس کی دوست رومیلہ کے گھر جانے کے بہانے ہی اس سے مل پاتی تھی مگر اس وقت اس کا مطالبہ اس کی سمجھ سے باہر تھا وہ بے طرح الجھ گئی تھی مگر اس سے پوچھ نہیں سکتی تھی کہ وہ غصہ ہونے لگتا تھا اور اس کے غصہ سے تو عریم کی جان جاتی تھی۔

''او کے فائن۔ اللہ حافظ۔'' وہ سختی سے بولا تھا۔

''شاہ......'' وہ گھبرا کر اسے پکار گئی تھی۔

''بس رہنے دو پتہ چل گئی ہے میری اوقات۔ اب کال، ٹیکسٹ کچھ نہیں کروں گا۔'' وہ اب کے بے چارگی سے افسردہ سے لہجہ میں بولا تھا۔

''آئی ایم سوری، میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ......''

''تم جو کہہ رہی تھیں آ گئی مجھے سمجھ۔ تم گھر جاؤ، جا کر آرام کرو، ٹیک کیئر۔'' وہ بات کاٹ کر بولا تھا۔

''ناراض ہو گئے ہیں؟'' وہ پارکنگ میں کھڑی رو رہی تھی اسے احساس نہیں تھا کہ اسے کتنے لوگ دیکھ رہے ہیں، کیا سوچ رہے ہیں۔

''تمہیں پتہ ہے میں خود سے ناراض ہو سکتا ہوں تم سے نہیں۔ اس لیے بے فکر رہو، ناراض نہیں ہوں۔ بس برا ضرور لگا ہے مجھے۔'' وہ اس کی بے کلی محسوس کر کے جلتی پر تیل کا کام کر گیا تھا۔

''آپ مجھے پک کر لیں شاہ۔'' وہ ہار گئی تھی اور وہ سکون و طمانیت سے مسکرا دیا تھا۔

''نہیں رہنے دو عریم! تم آرام سے گھر جاؤ۔ تمہاری ماما صحت یاب ہو جائیں اس کے بعد ملیں گے۔'' وہ شکار کو جال میں پھنسا دیکھ کر فارمیلٹی نبھا رہا تھا۔

''آپ کو ہرٹ کر کے تو مجھے ایک پل کو چین نہیں آتا شاہ! اور آپ کل سے میری وجہ سے کتنا ہرٹ ہو رہے ہیں، میرا دھوپ میں انتظار کرتے رہے اور آپ کو جب میری اتنی پرواہ ہے تو میں کیوں اتنا سا آپ کے لیے نہیں کر سکتی۔ آپ مجھے پک کر لیں۔'' وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی تھی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ شاہ زیب پر بھروسہ کر کے وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی بھول کر گئی ہے ایسی غلطی جسے سدھارا نہیں جا سکتا، جسے پلٹانا اس کے لیے ناممکن ہوگا، کوئی معافی، کوئی ندامت اس کی غلطی کا ازالہ نہیں بن پائے گی۔ شاہ زیب نے فاتحانہ انداز میں ایک نظر اپنے خوبرو سراپے کو آئینہ میں دیکھا تھا اور کمرے سے باہر نکل آیا تھا اس کا رخ عریم خان کے گھر کی طرف تھا یعنی محمود خان کو بربادی کی طرف لے جانے کو اس کے قدم اٹھ رہے تھے اور وہ جو اندھی کھائی میں گرنے جا رہی تھی وہ اپنی بدقسمتی سے انجان وہ کر گئی تھی جو اسے شاہ زیب نے کرنے کو کہتا تھا۔ شاہ زیب نے گاڑی اس طرح کھڑی کی تھی کہ گلی میں کوئی اور گاڑی انٹر نہیں ہو سکتی تھی یہی وجہ تھی کہ محمود خان کے ڈرائیور کو گاڑی روکنا پڑی تھی۔

''میری گاڑی خراب ہوگئی ہے کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟'' شاہ زیب نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ڈرائیور سے کہا تھا اور اس نے شاہ زیب کو جواب دینے کے بجائے پیچھے بیٹھی عریم کی جانب دیکھا تھا جیسے اس کی اجازت درکار ہو۔

''بابا، آپ ان کی مدد کریں میں واک کر کے گھر چلی جاتی ہوں۔'' وہ ڈرائیور سے کچھ کہنے سے پہلے ہی گاڑی سے اتر گئی تھی۔

''بی بی صاحبہ۔ میں آپ کو چھوڑ......''

''کوئی بات نہیں بابا۔ پانچ گھر چھوڑ کر تو گھر ہے میں چلی جاؤں گی۔ آپ ان کی مدد کر کے گاڑی ورکشاپ پر لے جائیں، کچھ مسنگ کر رہی ہے۔ زیادہ گڑبڑ ہوگئی تو بہت پرابلم ہو جائے گی۔'' وہ جلدی سے کہتی قدم بڑھا گئی تھی اور اس نے ڈرائیور کو یہ ہدایت سوچی سمجھی پلاننگ سے نہ دی تھی کہ جس وقت وہ گاڑی میں آکر بیٹھی تب ڈرائیور نے خود بتایا تھا۔

''بی بی صاحبہ۔ آپ کو کہیں جانا تو نہیں ہوگا؟'' وہ سوالیہ نظروں سے ڈرائیور کو دیکھنے لگی تھی۔

''میرے کہنے کا مطلب ہے آپ اب رات تک ہی ہاسپٹل جائیں گی نا؟'' وہ اثبات میں سر ہلا گئی تھی۔

''جی، مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' وہ ڈرائیور کے سوال پر کچھ گھبرا گئی تھی کہ اس کے دل میں چور تھا۔

''صاحب نے گاڑی ورکشاپ پر نے جانے کو کہا ہے کچھ مسنگ کر رہی ہے اس لیے پوچھا میں نے۔'' اس نے یکدم سانس خارج کی تھی تب ہی شاہ زیب نے ٹیکسٹ کر کے کہا تھا کہ وہ اپنی گاڑی کی خرابی کا بہانہ کرے گا وہ پیدل گھر جائے گی مگر راستے میں اس کا ویٹ کرے گی تب اس نے بھی آگے سے ٹیکسٹ کر کے ڈرائیور کو ورکشاپ جانے کا بتایا تھا اور یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی۔ وہ پیدل چل پڑی تھی اس کی رفتار معمول سے کہیں زیادہ کم تھی۔ وہ سست روی سے جا رہی تھی۔ شاہ زیب نے گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو گاڑی کو دھکا لگانے کو کہا تھا اور گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی شاہ زیب نے ڈرائیور کا ہاتھ ہلا کر شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی تھی اور ڈرائیور گاڑی کو وہیں سے بیک کر کے لیفٹ سائیڈ پر گاڑی دوڑا گیا تھا۔ شاہ زیب نے درخت کی سائیڈ پر کھڑی عریم کو اشارہ کیا تھا اور وہ بڑی

تیزی سے فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی تھی۔شاہ زیب نے ایک اچٹتی ہوئی نظر اس پر ڈالی تھی۔سیاہ لباس میں اس کی دودھیا رنگت دمک رہی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ملائمت تھی اور اس کی سوگواریت اور اس کی سرخ آنکھیں گویا اس کے حسن کو چار چاند لگا گئی تھیں،شاہ زیب کی نگاہ پلٹنے سے انکاری ہو چکی تھی مگر وہ وقت کی نزاکت کو مدنظر رکھتا،نظر قابو میں کرتا گاڑی اسٹارٹ کر گیا تھا۔گاڑی میں معنی خیز سی خاموشی پھیلی تھی۔وہ گاہے بگاہے مہارت سے ڈرائیو کرتے شاہ زیب پر نظر ڈال رہی تھی مگر اس کی مستقل خاموشی اس کو ہراساں کیے دے رہی تھی تب ہی وہ اس کے بولنے کی منتظر خود بول پڑی تھی۔

''شاہ! کچھ بولیے نا، مجھے آپ کی خاموشی سہا رہی ہے۔'' وہ جیسے اس کی آواز پر کسی خواب سے جاگا تھا اور اسے دیکھنے لگا تھا جو اپنے مومی ہاتھوں کو باہم جوڑے اضطراری حالت میں مسلتی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔دونوں کی نگاہ ٹکرائی تھی شاہ زیب کی آنکھوں میں سردمہری اور خاموشی تھی جبکہ عریم کی آنکھوں میں ہراس اور محبت کا ملا جلا تاثر تھا جبکہ اس کا دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا اور شاہ زیب کی مستقل خاموشی پر اس کی آنکھ میں ٹھہرے آنسو رخساروں پر قدم بوسی کرنے لگے تھے۔اس نے سردمہر نگاہ اس کے متورم چہرے سے ہٹا کر تمام تر توجہ ڈرائیونگ کی جانب مبذول کر دی تھی جبکہ اس کی جان ہوا ہونے لگی تھی کچھ کہنے کو لب لرزے تھے اور کچھ کہنے میں ناکام ہو گئے تھے اور وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے سسک اٹھی تھی۔شاہ زیب کو یکدم کوفت نے آ گھیرا تھا اور اس نے کار کی اسپیڈ کچھ اور بڑھا دی تھی۔

''رونا بند کرو،ہم میرے اپارٹمنٹ جا رہے ہیں۔وہیں جا کر بات کریں گے۔'' اس کی طرف ٹشو بڑھاتے ہوئے بولا تھا اور وہ رونا بھول کر اس کی طرف دیکھنے لگی تھی کہ اس کے ساتھ اس نے دو چار بار ہوٹلنگ کی تھی وہ اسے اپنے گھر کبھی نہیں لے گیا تھا اور اب اپارٹمنٹ لے جا رہا تھا۔وہ متوحش ہو کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''تھوڑا سا انتظار کر لو عریم،تمہارے ہر سوال کا تمہیں جواب مل جائے گا۔'' وہ دھیمے سے کہتا ٹشو لینے کا اشارہ کر گیا تھا۔وہ اس کے ہاتھ سے ٹشو تھام کر آنسو صاف کر گئی تھی یہ جانے بناء کہ آنسوؤں کا سیلاب اس کا منتظر ہے۔

❁ ❁

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے،بقیہ واقعات آئندہ ماہ،اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

''آنٹی آپ نے اتنا کچھ لا دیا ہے مجھے، اتنی چیزوں کی تو مجھے ضرورت بھی نہ تھی۔'' وہ پھیلے ہوئے سامان کو دیکھتی شرمندہ سی بولی تھی۔ آئیکت کی اچانک آمد کے سبب وہ اس دن شاپنگ پر نہیں جا پائے تھے اور اگلے دن جب فضہ نے اسے پھر سے تیار ہونے کا کہنا چاہا تھا کہ اس سے قبل ہی ابسام حیدر نے مداخلت کر دی تھی۔

''ماما! آپ نے جو بھی شاپنگ کرنی ہے بہتر یہ ہوگا کہ آپ اکیلے ہی کر آئیں کہ جو بھی حالات ہیں آپ ان سے واقف ہیں۔ ایسے میں آبدار کا گھر سے نکلنا بہت بڑا رسک ہوگا۔'' ابسام حیدر کے انداز میں ازلی سادگی و نرمی تھی۔ حیدر صاحب نے فوراً ہی بیٹے کی بات کی حمایت کر دی تھی تب وہ دھیمے سے بولی تھیں۔

''سوچ تو رہی تھی میں بھی یہ سب مگر پھر سوچا بچی گھر میں قید ہو کر رہ گئی ہے اسی بہانے کچھ آؤٹنگ ہو جائے گی۔''

فضہ حیدر فطرتاً ایک نرم خو اور پر خلوص عورت تھیں۔ وہ آبدار کا ہر ممکن خیال رکھتی تھیں۔ اسے اپنائیت کا ہر لحظہ احساس سونپتی تھیں، اس کے لیے فکرمند رہتی تھیں ان کی سادگی سے کہنے پر وہ دونوں باپ بیٹا مسکرا دیئے تھے کہ فضہ کی اچھائی کے تو وہ دونوں معترف تھے۔

''آپ کی نیت پر کسی کو شک نہیں ہے مادام۔'' حیدر صاحب دلکشی سے بولے تھے اور وہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئی تھیں اور کچھ دیر بعد نک سک سے تیار لوٹی تھیں اور بیٹے کے ساتھ شاپنگ پر چلی گئی تھیں کہ حیدر صاحب کی طبیعت کچھ دن سے گری گری سی تھی۔ تقریباً تین گھنٹوں بعد ان کی واپسی ہوئی تھی اور ایک کے بعد ایک چیز وہ آبدار کو دکھاتیں ساتھ کہتی جا رہی تھیں۔

''تمہاری پسند سے واقف نہیں ہوں اس لیے اپنی پسند سے لائی ہوں دیکھ کر بتاؤ تمہیں کسی لگی میری چوائس۔'' وہ فضہ حیدر کے خلوص کے آگے کچھ بول نہیں پا رہی تھی کہ ویسے بھی ہر چیز ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔ ڈریسز، سینڈلز، پرس، پرفیوم، لپ اسٹک کے ڈیفرنٹ شیڈز، ہر چیز نہ صرف قیمتی تھی ان کی اعلیٰ چوائس کا منہ بولتا ثبوت بنی ہوئی تھی اور وہ اتنی چیزیں دیکھ کر شرمندہ ہوئی جا رہی تھی۔

''فضول بکواس کرو گی تو ایک لگا دوں گی۔ ضرورت کے تحت میں کچھ نہیں لائی۔ میں ہر چیز بہت پیار سے اپنی بیٹی کے لیے لائی ہوں۔ ہاں تم مجھے ماں نہ سمجھو، غیریت دکھاؤ تو سارا سامان یہیں چھوڑ دو۔'' ان کے انداز میں نرمی و سختی کا عجیب امتزاج تھا اور وہ تو لفظ ''بیٹی'' پر ہی پانی بن گئی تھی یوں روئی تھی کہ فضہ ہی نہیں کچھ دور فاصلے پر صوفے پر بیٹھا نیوز سنتا ابسام بھی پریشان ہو گیا تھا۔

''آپی، آئی ایم سوری۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ مضطرب سی بولنے لگی تھیں۔

''سوری مت بولیں آنٹی۔ مجھے آپ کی بات بری نہیں لگی۔ آپ کی بات میں حق و مان بولتا مجھے اپنا اسیر کر گیا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی تھی اور ان کی جان میں جان آ گئی تھی۔

''اف، پوری احمق لڑکی ہو تم تو، میری جان نکال دی۔ میں سمجھی میری بات بری لگی اور بھاں بھاں رونا شروع کر دیا۔'' وہ اس کے

گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے بولی تھیں۔

''سوری، آپ کی محبت اور خلوص پر میری آنکھیں بھر آئیں۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے منمنائی تھی۔

''اوہو، آنکھ بھر نہیں آئی، تم نے تو پوری بالٹی ہی بھر دی۔'' انہوں نے ہنس کر اپنی زندہ دلی کا ثبوت دیا تھا اور وہ لب کا کونا دانت تلے دباتی شرمندہ سی نظر جھکا گئی تھی۔ اس کی جانب متوجہ ابسام حیدر کی نظر ٹھہر ٹھہر گئی تھی۔ یہ لڑکی دھیرے دھیرے اسے اپنی جانب مائل کر رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ توجہ کھینچ رہی تھی اور ہر بار بے اختیاری میں ٹھہرنے والی نگاہ، شرمندگی سے جھکتی چلی گئی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے وہاں سے نکلتا چلا گیا اور وہ اس کی موجودگی سے ناواقف تھی، واقفیت کے بعد مضطرب ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سارا سامان اٹھائے اپنے کمرے میں آنے کے بعد بھی الجھی رہی تھی یہ سوچ اسے مضطرب کرنے کو کافی تھی کہ

''ابسام بھی کیا سوچتے ہوں گے مجھے اور کوئی کام ہی نہیں ہے ہر وقت بچوں کی طرح روتی رہتی ہوں۔'' اسے اپنے رونے پر افسوس ہو رہا تھا۔ اپنی جذباتیت بری لگ رہی تھی۔

''ابسام نہ جانے اس سب پر کیا سوچیں، میں ان سے کہوں گی وہ آنٹی کو منع کر دیں، آنٹی میرے لیے اتنا نہ کریں کہ میں تو اتنی محبت کی عادی ہی نہیں، عادت خراب ہوگئی تو یہاں سے جانا مشکل ہو جائے گا جبکہ میرا تو دل بھی مجھے اس گھر سے اس گھر کے مکینوں سے، ابسام حیدر سے باندھ رہا ہے، دل میں محبت کا دیا یوں روشن ہوا جا رہا ہے کہ میری آنکھیں چندھیانے لگی ہیں۔ ابسام حیدر کی محبت یوں دل کا دیا روشن کر رہی ہے کہ آئیکت کی محبت کا احساس اس میں دھندلاتا جا رہا ہے۔'' وہ شاپرز الماری میں رکھ کر ٹہلتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کی سوچ بدل گئی تھی وہ بستر پر آ کر لیٹی تھی، کروٹیں بدلتی وہ اپنی نئی سوچ کو سوچتی، محبت کا اعتراف کرتی تو کبھی محبت سے خائف ہوتی کروٹیں بدلتی سو گئی تھی جبکہ وہ دن میں سونے کی کبھی بھی عادی نہیں رہی تھی۔ شاید یہ خیال خوبصورت تھا کہ خوابوں کی دنیا سج گئی تھی اور وہ نیند کی وادی میں اتر گئی تھی اور جاگتی آنکھوں کا سپنا تکیے تلے مسکرانے لگا تھا۔

☆......☆......☆

''عریم! مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟'' وہ اس کے عین سامنے صوفے پر بیٹھا گہری سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا وہ جو اس کی خاموشی سے خائف تھی، راستے بھر اس کے بولنے کی منتظر رہی تھی پچھلے دس منٹوں سے اس کے کچھ کہنے کی منتظر تھی اس کے سوال پر چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں؟'' وہ اس کی نظریں خود پر محسوس کرتی لب کا کونا دانتوں تلے کچلتے ہوئے سوال کے جواب میں کنفیوز سی سوال ہی کر گئی تھی۔

''خود سے زیادہ تمہیں چاہتا ہوں، تمہارے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔'' وہ صوفے سے اٹھا تھا اور نیچے کارپٹ پر اس کے پیروں کے پاس دوزانو ہو کر بیٹھ گیا تھا اور اس کا ہاتھ تمام تر جذباتی لہجہ میں بولا تھا اس کا چہرہ حجاب آلود سرخی سمیٹ لایا تھا اور پلکیں عارضوں

کو سجدہ کرنے لگی تھیں۔

''عرمی! تم سے بے حد و بے حساب محبت ہے، تمہارے بنا جینے کا تصور بھی میرے لیے محال ہے، میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔'' اس کا جذباتی لہجہ کمرے کی خاموش فضا میں بکھر رہا تھا اور عریم کے دل کے ساز بجا رہا تھا وہ اپنا ہاتھ کھینچ گئی تھی مگر بہت چاہ کر بھی اٹھ نہیں پائی تھی نہ ہی اس سے نظر ملا رہی تھی جبکہ وہ اس بدلی کیفیت، حجاب آلود گھبراہٹ محسوس کرتا مزید گویا ہوا تھا۔

''میں تمہیں کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا عرمی، تب ہی تمہیں آج یہاں لایا ہوں۔ اپنا بنانے کے لیے تمہارے حقوق حاصل کرنے کے لیے، ہماری محبت کو نام دینے کے لیے۔'' وہ اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ گیا تھا وہ اس کی اتنی نزدیکی کہاں برداشت کر پا رہی تھی۔ اس کے لفظ ہی نہیں اس کا لمس بھی بول رہا تھا وہ جو نظر چرا رہی تھی، لب حیا سے لرز رہے تھے وہ اسے بہت چونک کر دیکھنے لگی تھی۔

''تمہارے اور میرے درمیان ہزار فاصلے ہیں عرمی، زمانے کی سنگلاخ رسمیں ہیں، میں تمہیں ان رسموں کو توڑ کر نہیں پا سکتا ہوں اس لیے میں تمہیں تمہاری رضا سے پانا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کی گھبراہٹ سے واقف اس کے چونکنے پر کسی قسم کا ری ایکشن دیئے بغیر بولا تھا اور وہ بالآخر خاموشی کو زبان دے گئی تھی۔

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، میں سمجھ نہیں پا رہی۔'' وہ اپنے گھٹنے سے اس کا ہاتھ ہٹاتی دھیمے سے منمنائی تھی اور اسے اٹھنے کو پر تولتے دیکھ کر وہ کارپٹ سے اٹھ کر صوفے پر اس کے برابر ٹک گیا تھا وہ نامحسوس طریقے سے کچھ فاصلے پر ہوئی تھی۔

''مجھ سے شادی کرو گی عریم۔'' اس نے گویا کوئی دھماکہ کیا تھا وہ گردن ترچھی کر کے اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی گویا اس کی بات کا یقین کر لینا چاہتی ہو جبکہ وہ آس سی جگائے اس کی جانب دیکھتا جواب کا منتظر تھا۔

''بولو عریم۔ مجھ سے شادی کرو گی؟'' وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا مومی ہاتھ تھام گیا تھا جو بے حد سرد ہو رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں لرز کر رہ گیا تھا۔

''آپ میرا جواب جانتے تو ہیں شاہ۔'' وہ ہاتھ کھینچتی جھینپتے ہوئے لہجے میں بولتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا تھا اور اس کے بے حد سرخ چہرے کو دیکھ رہا تھا، حیا سے اُٹھتی، جھکتی پلکیں، لرزتے لب، کچھ بھی تو نظر انداز کرنے والا نہ تھا مگر اس وقت اسے اس کی خوبصورتی نہیں حیا متاثر کر رہی تھی کہ وہ تو ایک جوا کھیلنے جا رہا تھا اور ہار جیت سے ماورا ہو کر جو بات اس کے اطمینان کے لیے کافی تھی وہ یہی تو تھی کہ شکست نصیب بھی ہو گی تو اس کا سر اٹھا رہے گا کہ وہ جسے انتقام کی بھینٹ چڑھانے جا رہا تھا، جسے انتقاماً اپنی زندگی میں شامل کرنے کے لیے لائحہ عمل تیار کرتا منصوبہ بندی کر رہا تھا وہ ہر لحاظ سے اس قابل تھی کہ ایک شریف مرد کی زندگی کا حصہ بن سکے اور یہ اس کے لیے باعث اطمینان تھا۔

''شاہ! آپ پلیز مجھے گھر چھوڑ آئیں...... پلیز......'' وہ اس کے عجیب و غریب رویے سے ہراساں، اس کے سوال پر کنفیوز ہوتی

آنکھوں میں آنسو لیے ملتجی ہوئی تھی۔

''کیا تم مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتیں؟'' وہ پینٹ کی جیب میں ہاتھ پھنسائے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور وہ تو گویا تڑپ ہی اٹھی تھی۔

''شاہ! میں نے ایسا تو نہیں کہا۔'' اس کی نم آنکھوں میں یکدم خفگی کا تاثر بکھرا تھا اور اس کی آنکھوں کی دلکشی کو بڑھا گیا تھا ایک لمحہ کو اس کی نگاہ، عریم کی نگاہ سے الجھ کر رہ گئی تھی اور شاہ زیب کی پلکوں کے اٹھنے کی دیر تھی اس کی نگاہ حیا کے بار سے عارضوں کو سجدہ کرنے لگی تھیں۔

''تم نے وہ بھی نہیں کہا جو میں سننا چاہتا ہوں، وہ بھی تو تم نہیں بولیں جو میرے اطمینان کا باعث ہو، جو مجھے میری محبت کا یقین سونپ دے، تم نے انکار نہیں کیا تو اقرار بھی تو نہیں کیا، مجھے اپنانے کا، میرا بننے کا اقرار۔'' وہ اتنی دیر میں پہلی دفعہ بناوٹ سے پاک مسکراہٹ مسکرایا تھا مگر اس کے لفظ بڑے جھوٹے تھے، مائل کرنے والے تھے۔ سب کچھ داؤ پر لگا کر اپنا بنانے کے فن سے لبریز تھے وہ معصوم لفظوں کے داؤ پیچ سے نابلد لفظوں کی پہچان کے بنا ان کی تاثیر کو محسوس کرتی شاہ زیب سے اپنے من کی سچائی کو بیان کر گئی تھی۔

''میرا یہاں ہونا ہی میرا اقرار ہے شاہ، لڑکی نہ ہر کسی کے ساتھ چل پڑتی ہے نہ ہر کسی کے ساتھ میں سکون ملتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ آپ کی محبت میں ہی تو یہاں تک آئی ہوں اور میری محبت کو آپ نام دیں گے، ایک سند دینا چاہیں گے تو میں انکار کیسے کر سکتی ہوں۔ آپ تو مجھے زندگی کی نوید دے رہے ہیں میں جینے سے کیسے انکار کر سکتی ہوں۔'' اس کا لہجہ دھیما تھا، نگاہ جھکی ہوئی تھی اور وہ چند قدموں کی دوری، دور کرتا عین اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

''تم آج انکار کر دیتیں عرمی تو میں جیتے جی مر جاتا۔ تم نے اپنی محبت میرے نام کی، مجھے اپنا بنانے کا اقرار کیا، میری زندگی میں آنے کا عندیہ دیا مجھے گویا زندگی بخش دی۔'' وہ اس کو شانوں سے تھامے گمبھیر لہجہ میں بولا تھا۔

''زندگی تو مجھے آپ نے بخش دی ہے شاہ۔ ورنہ جب سے پتہ چلا ہے پاپا نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے جان سولی پر لٹکی تھی، ہر لحظہ یہی ڈر تقویت پا رہا تھا کہ میں آپ کو پا نہیں سکوں گی، ہماری محبت وصل کے درشن نہیں کر پائے گی مگر آج آپ نے شادی کی بات کر کے مجھے گویا پھر سے جینے کا حوصلہ دیا ہے۔ میں منتظر رہوں گی شاہ اس دن کی جب آپ اپنے پیرنٹس کو لے کر آئیں گے اور مجھے میرے پاپا سے مانگ لیں گے اور مجھے اپنا بنا لیں گے۔'' اس کا لہجہ خوشی کے احساس سے بھیگ گیا تھا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا، عریم۔'' وہ اس کے حیا و خوشی سے دمکتے چہرے سے نظر چرا کر بولا تھا اور وہ چونک کر یکدم فاصلے پر جانے والے شاہ زیب کو دیکھنے لگی تھی۔

''شاہ! کیا نہیں ہو سکتا۔'' اس کے لہجے میں یکدم ہی خدشے بول اٹھے تھے۔

''میں اپنے پیرنٹس کو تمہارے گھر نہیں بھیج سکتا، میں چاہ کر بھی یہ نہیں کر سکتا عریم۔'' وہ اس کی طرف گھوما تھا جس کے قدم کھڑے

کھڑے بھی لڑکھڑا سے گئے تھے وہ پوری جان سے لرز کر اسے دیکھنے لگی تھی جس نے زندگی کی نوید دے کر یکدم موت کے ترانے شروع کر دیئے تھے۔

''یہ......یہ......آ......آپ......آپ کیا......کہہ رہے ہیں......'' اس کے لفظ ساتھ دینے سے انکاری تھے۔زبان لڑکھڑا کر رہ گئی تھی۔

''ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی نہیں ہوتی۔بابا کبھی تمہارے لیے میرا پرپوزل لے کر نہیں آئیں گے اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا عریم۔'' اس نے پھر فاصلہ عبور کیا تھا اور اسے شانوں سے تھام گیا تھا۔

''شاہ! جو کہنا ہے کھل کر کہیں، پہلیاں مت بجھوائیں۔'' وہ اس کے ہاتھ جھٹکتی، سسکتے ہوئے بولی تھی۔

''عریم! میں نے بابا کو راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ نہیں مانے لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی کوشش میں لگا ہوا تھا مگر جب تم نے اپنے پرپوزل کا بتایا تو مجھے لگا کہ میں تمہیں کھو دوں گا اس لیے میں نے تمہیں ملنے پر تیار کیا اور یہاں لے آیا نکاح کے لیے......'' بلی تھیلے سے باہر آئی تھی کوئی آسمان تھا جو عریم کے سر پر ٹوٹا تھا وہ رونا بھول کر حیرانگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں عریم، یہ بہت غلط ہے مگر میں بہت مجبور ہوں۔بابا نہیں مان رہے، تمہارے پاپا بھی نہیں مانیں گے ایسے میں ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ ہم اپنے اپنے پیرنٹس کے خلاف جا کر نکاح کر لیں۔'' وہ بڑی تیزی میں اس تک پہنچا تھا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا تھا جیسے بہت تکلیف میں ہو۔جو کہا ہو بہت مجبوری میں کہا ہو اور وہ اس کا ہاتھ جھٹک گئی تھی۔

''آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں۔'' وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

''عریم......'' شاہ زیب نے آگے بڑھ کر اس کے کاندھے تھامنا چاہتا تھا مگر اس نے موقع ہی نہیں دیا تھا۔

''ڈونٹ ٹچ می۔'' وہ غصہ سے چیخی تھی اور وہ لب بھینچ کر اسے دیکھنے لگا تھا جو بری طرح رو رہی تھی۔

''آپ نے سارے فیصلے خود سے کر لیے، میری ماما بیمار ہیں، ہاسپٹل میں ہیں۔آپ نے کچھ نہیں سوچا پلاننگ کی اور مجھے یہاں لے آئے۔آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں اپنے پیرنٹس کے خلاف جا کر آپ سے نکاح کروں گی۔'' وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

''بچوں کی طرح بی ہیو مت کرو عریم۔تمہیں کیا لگتا ہے میرے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت آسان تھا۔میں بہت مجبور ہو کر اس فیصلہ تک پہنچا ہوں۔'' وہ جز بز ہو کر رہ گیا تھا ضبط کا یارا ابھی نہ تھا اور وہ پھر بھی گہرے ضبط کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''مگر میں ابھی اتنی مجبور نہیں ہوئی ہوں، آپ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں۔'' وہ آنسو رگڑتے ہوئے باہر کی طرف بڑھی تھی اور اس کی کلائی شاہ زیب کی گرفت میں آ گئی تھی۔

''پاگل مت بنو عرمی۔میری بات کو سمجھو، یہ سب ناگزیر ہے۔'' وہ نرمی سے بولا تھا۔

''پلیز شاہ۔میں ایسا نہیں کر سکتی۔پاپا، ماما مجھ پر کتنا بھروسہ کرتے ہیں ان کا بھروسہ توڑ کر آپ سے باتیں، ملاقاتیں کی مگر میں اب

اس حد تک نہیں جاسکتی کہ میرے والدین سر اٹھا کر نہ جی سکیں، میں نے آپ سے محبت کی ہے۔میری محبت کو میرا جرم نہ بنائیں۔میری محبت کو میں اپنے والدین کا جرم نہیں بنا سکتی۔پلیز واپس چلیں، مجھے گھر چھوڑ آئیں۔'' وہ اپنی کلائی آزاد کروانے کی ناکام کوشش میں ہلکان ہوتی سسک رہی تھی اس سے ملتجی ہوئی تھی۔اس کو یہ بتانا چاہا تھا کہ اسے ماں باپ کی عزت کا خیال ہے جس کا وہ پاس رکھے گی اور یہ بات تو شاہ زیب کو آگ لگا گئی تھی۔اس کی گرفت کچھ اور سخت ہوگئی تھی۔

''تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟'' وہ گرفت سخت کرتے ہوئے پوچھ گیا تھا۔

''آپ سے محبت ہے شاہ، لیکن میں آپ کی محبت میں اتنا آگے نہیں جاسکتی۔آپ......'' اس نے روتے ہوئے دایاں ہاتھ آگے کیا تھا اور ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں ہلکان ہو کر رہ گئی تھی۔

''یہ تمہاری کیسی محبت ہے کہ تم مجھے پانا تک نہیں چاہتیں۔'' وہ اس کی کلائی چھوڑتا ہوا اسے پوچھ رہا تھا کہ اس کی جان لبوں پر آگئی تھی۔وہ دو قدم پیچھے ہوئی تھی اور وہ اس کے شانوں پر گرفت کر گیا تھا۔

''جواب دو عریم۔یہ کیسی محبت ہے تمہاری کہ تم مجھے کھو دینا چاہتی ہو۔'' وہ اس کو شانوں سے تھامے سوال کر رہا تھا اور اس کی آنکھیں روانی سے بہتی جارہی تھیں۔

''آپ بار بار میری محبت پر سوال نہ اٹھائیں، آپ کی محبت میں ہی یہاں تک آئی ہوں۔گر محبت نہ ہوتی تو میں آپ کی ایک فون کال پر یہاں نہ چلی آتی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بلکتے ہوئے بولی تھی یکدم وہ لاجواب ہو کر کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

''شاہ! آپ بار بار مجھ سے تو کہہ رہے ہیں یہ میری کیسی محبت ہے کہ میں آپ کو کھو دینا چاہتی ہوں۔اگر یہی سوال میں آپ سے کروں کہ آپ کی کیسی محبت ہے کہ آپ مجھے چور راستوں سے حاصل کرنا چاہتے ہیں، کیسی محبت ہے آپ کی شاہ کہ آپ میرا وجود اپنے گھر والوں سے تسلیم نہیں کروا سکتے، مجھے باضابطہ طور پر اپنوں کو گواہ بنا کر نہیں پا سکتے......'' وہ اس کی خاموشی پر اس کے ہاتھ جھٹکتی چٹکتے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

''میں بہت مجبور ہوں عری۔'' وہ لاجواب ہو کر رہ گیا تھا مگر کب تک خاموش رہتا بالآخر کچھ بولا تھا مگر قابل ذکر بول نہیں پایا تھا اور وہ یکدم ہنس دی تھی۔

''مجبور ہیں آپ یا مجھے مجبور کر رہے ہیں۔میرے لیے ہر راستہ بند کر دینا چاہتے ہیں آپ۔میری محبت کو اب یوں بھی نہ آزمائیں شاہ کہ میں کھل کر سانس تک نہ لے سکوں......'' وہ آنسو گرتے ہوئے صوفے پر گر سی گئی تھی۔

''مجھے احساس ہے عری مگر سچ میں، میں بہت مجبور ہوں۔ماما، بابا راضی نہیں ہو رہے مگر میں بہت کوشش کر رہا تھا اور مجھے امید تھی میں منا لوں گا مگر تمہارے رشتے کی خبر نے مجھے بہت ہراساں کر دیا ہے۔کل میں تقریباً ماہ، دو ماہ کے لیے ملک سے باہر جا رہا ہوں۔میرے

پیچھے میں نہیں چاہتا تم کسی اور کی بنا دی جاؤ اس لیے میں نے یہ راہ چنی ہے جو مانتا ہوں غلط ہے مگر ہماری محبت کے لیے ہمارے ایک ہونے کے لیے ناگزیر ہے۔'' وہ دھیمی سی چال چلتا عین اس کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا تھا اور دھیمے سے نرم لہجے میں کہتا چلا گیا تھا۔

''میں تم پر اپنا فیصلہ، اپنی مرضی لاگو نہیں کر رہا عرمی، فیصلہ کا اختیار کلی طور پر تمہیں حاصل ہے۔ ہوگا وہی جو تم چاہو گی، جو تمہاری مرضی ہے عرمی......'' وہ بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ ایک وجیہہ الشکل نوجوان تھا جس کی آنکھوں میں امید تھی اور چہرے پر ہراس، ماتھے پر فکر کی سلوٹ بڑی نمایاں تھی اس کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا کہ اس چہرے سے اسے عقیدت تھی اس شخص سے اسے بے پناہ چاہت تھی وہ نہیں جانتی تھی اسے احساس نہیں ہوا تھا کب، کیسے وہ ایک اجنبی شخص اس کے لیے بہت اہم، بہت ضروری ہو گیا تھا۔ بس وہ تو یہ جانتی تھی کہ جب سے اس نے یہ ایک چہرہ دیکھا تھا اس کے بعد تو کچھ دیکھ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ نظر، محبت بن کر یوں شاہ زیب کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی کہ پھر نظر کسی چہرے پر اٹھی ہی نہ تھی اس چہرے کو دیکھ کر اسے اپنی زندگی میں بہاروں کی موجودگی کا شدت سے احساس ہوتا تھا اور وہ چہرہ آج فکر سے انجانے خوف سے خزاں کا منظر پیش کر رہا تھا ایسے میں عریم محمود کے دل کی دھڑکن ٹھہر ٹھہر گئی تھی تو ایسا کوئی اچھنبا بھی تو نہ تھا کہ اس شخص کی چاہت میں وہ یہاں تک چلی آئی تھی۔ وہ میکانکی انداز میں اٹھی تھی اور صوفہ کے پاس اس کے قدموں میں کسی داسی کی مانند آ بیٹھی تھی۔

''آپ کو کھونے کے احساس سے تو میری بھی جان نکلنے لگتی ہے، میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی شاہ مگر ایسے پانا بھی نہیں چاہتی، آپ کے رشتوں کے خلاف جا کر، اپنے والدین کو دکھ دے کر۔'' وہ اس کے گھٹنے پر سر رکھ کر بلک رہی تھی اور وہ ششدر سا بیٹھا تھا ایک لمحہ کو احساس ندامت نے اسے جکڑا تھا مگر دوسرے لمحے وہ خود کو مضبوط بنا گیا تھا بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ خود کو بے حس بنا گیا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور عریم کے سر پر ٹھہر گیا تھا۔

''تم میری مجبوریوں سے واقف نہیں ہو اور میں تمہیں کچھ سمجھا بھی نہیں پا رہا، اس لیے تم صرف ابھی میری نظر سے دیکھو۔ سمجھو، تو تمہیں پتہ لگے گا کہ میں نے یہ فیصلہ کس حد تک مجبور ہو کر کیا ہے اور عریم! میں تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں چاہتا نہ ہی تمہارے حق کو سوالیہ نشان بننے دوں گا۔ آج ہم نکاح کر لیتے ہیں بعد میں ہم اپنے پیرنٹس کو منانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور مجھے امید ہے ہم کامیاب ہو جائیں گے اور جو نکاح میں تم سے تمہیں کھونے کے ڈر سے کر رہا ہوں اس نکاح کی کی اپنوں کے ساتھ مل کر تجدید کریں گے۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ یہ نکاح صرف ہم دونوں کی تسلی کے لیے ہے، یہ نکاح تمہارے حقوق کسی اور کو تفویض ہونے سے روکنے کے لیے ہے۔ تم مجھ پر بھروسہ رکھو میں تمہارے ساتھ زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔'' شاہ زیب کے انداز بیاں میں ایسا سحر تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح اس میں جکڑتی جا رہی تھی۔

''لیکن، شاہ......'' اس نے سر اونچا کر کے اس کو دیکھا تھا اور کچھ کہنا چاہا تھا کہ وہ یکدم غصہ میں آ گیا تھا۔

''او کے فائن، نہیں ہے تمہیں مجھ پر بھروسہ تو ٹھیک، اٹھو، میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔'' وہ اسے سائیڈ میں کرتا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور وہ لب کچلنے لگی تھی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر پائی تھی اور وہ مزید بولا تھا۔

''میں کل ایبروڈ جا رہا ہوں، مجھے نہیں پتہ کہ کب لوٹوں گا، تم مجھے یہ بتانے کو کوئی کال اور ٹیکسٹ نہیں کرو گی کہ تم کسی اور کی ہو گئی ہو۔''
وہ گاڑی کی چابی اُٹھاتے ہوئے شدید اشتعال میں بول رہا تھا۔

''ایسے کیوں بول رہے ہیں آپ۔'' وہ اس کی راہ میں آ گئی تھی۔

''اور کیسے بولوں تم بتا دو مجھے، کہ میں تو احمق ہوں عقل ہی نہیں ہے مجھے......'' وہ چبا چبا کر بولا تھا اور اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''میں نے ایسا تو کچھ بھی نہیں کہا، جو آپ یوں غصہ ہو رہے ہیں۔'' وہ سسکی تھی۔

''شٹ اپ عریم! اور یہ رونا دھونا بند کرو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔ میں ہی احمق تھا جو تم پر، اپنی محبت پر بھروسہ کیا، مان تھا مجھے کہ تم میری مجبوریوں کو سمجھو گی میرا ساتھ دو گی پھر ہم مل کر سب کو اپنے حق میں کر لیں گے حالات کو اپنے موافق بنا لیں گے مگر میری امیدوں کا محل مسمار ہو گیا ہے۔ آج لگا ہے پتہ کہ محبت کے دعوے کرنا اور محبت نبھانا دونوں میں بہت فرق ہے اور یہ فرق ہمارے راستے الگ کر کے رہے گا اور اس کی ذمہ دار صرف تم ہو گی۔'' وہ اس کا بازو جکڑتا غصہ سے کف اڑا رہا تھا اور اس کے رونے میں قدرے اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ کہنا بے حد آسان ہے کہ حق ہے آپ کا مگر ثابت کوئی نہیں کر پاتا کہ حق دینے کے خواب دکھانا اور حق دینا بڑے دل جگرے کا کام ہوتا ہے۔

''یاد رکھنا میری یہاں غیر موجودگی میں کچھ ہوا، تم نے کسی اور کا ساتھ قبول کیا تو میں تمہیں اور تمہارے اس عاشق نامدار کو گولی سے اڑا دوں گا۔'' اس کی مضبوط گرفت میں عریم کو لگا تھا کہ اس کی انگلیاں اس کے بازو میں پیوست ہونے کو ہیں اس نے بے اختیار سسکی لی تھی اور اس نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو آزاد کر دیا تھا وہ بری طرح لڑکھڑائی تھی اور شدتوں سے روتی چلی گئی تھی۔

''اب تم نے چلنا ہے یا میرے مرنے کا ابھی سے سوگ منا رہی ہو۔'' وہ دھاڑا تھا۔

''ایسے مت بولیں، مجھے تکلیف ہوتی ہے۔'' وہ روتے ہوئے چیخی تھی۔

''کیوں نہ بولوں میں عریم۔ کیا مجھے تمہیں اس طرح روتے دیکھ کر تکلیف نہیں ہو رہی۔ بہت ہو رہی ہے مگر کیا کروں میں کیسے تمہیں چھین لوں زمانے سے، کیسے تمہیں تکلیف سے بچاؤں میں بہت لاچار ہوں۔'' وہ آگے بڑھا تھا اور اسے بازو سے بھینچ کر سینے سے لگا گیا تھا اور وہ اس کے سینے سے لگی بچوں کی طرح رونے لگی تھی۔

''آپ جیسا کہیں گے میں ویسا کر لوں گی شاہ۔ بس آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔ آپ غصہ نہ ہوں ورنہ میں مر جاؤں گی۔ آپ کو تکلیف دے کر، آپ سے الگ ہو کر مر جاؤں گی۔'' وہ اس کے سینے سے لگی زار و قطار روتی ہوئی بول کیا رہی تھی شاہ زیب کو فتح کے قریب کر گئی تھی اس کے لبوں پر یکدم سکون آمیز مسکراہٹ در آئی تھی ایسی سکون آمیز مسکراہٹ جس میں دوسرے کی بے سکونی چھلک رہی ہوتی ہے اور وہ اپنی تباہی سے انجان اس کی چالبازی میں آ گئی تھی، اس کی چکنی چپڑی باتوں کو محبت سمجھ بیٹھی تھی اور محبت کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا گئی تھی۔ شاہ زیب جانتا تھا وہ مان جائے گی اسے خود پر یقین تھا کہ وہ اسے منا لے گا اور اس کے یقین کی جیت ہوئی تھی۔ وہ عریم محمود کو منا

چکا تھا اس نے دس منٹ قبل ہی عریم سے نظر بچا کر حاشر کو قاضی لے کر آنے کے لیے ٹیکسٹ کر دیا تھا اور جتنی دیر میں اس کے اقرار کے بعد اسے سہانے خواب دکھا سکتا تھا دکھائے تھے اور حاشر کے آتے ہی نکاح کی رسم ادا ہوئی تھی، ایجاب وقبول کے مرحلے کیا تھے، اذیت بھری کسک تھی جو عریم کے دل سے ہوک کی مانند اٹھ رہی تھی اور سینے میں ہی دبی رہ گئی تھی اس نے کانپتے ہاتھوں سے نکاح نامہ پر سائن کر دیئے تھے۔عریم محمود سے عریم شاہ زیب بن گئی تھی اور اسے تو لگا تھا کہ نکاح کے بعد وہ اسے چھوڑ آئے گا لیکن نہیں اس کا تو کچھ اور ہی پروگرام تھا اور وہ اس کی ہر چال کی مانند نئی چال سے انجان اس کے کہنے پر فریش ہونے چلی گئی تھی اسے یہاں آئے تقریباً سوا گھنٹہ ہو گیا تھا اسے یکدم گھر جانے کی جلدی پڑ گئی تھی اس نے منہ دھویا تھا اور جس وقت واش روم سے نکلی تھی شاہ زیب بڑے ریلیکس موڈ میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے سگریٹ پھونکنے میں مشغول تھا اور وہ ششدر سی اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ پوچھ تک نہیں پائی تھی کہ وہ سگریٹ نوشی بھی کرتا ہے کہ اس کی بے تکلفی اس کے چودہ طبق روشن کرنے کو کافی تھی ایسے میں اس نے لب کچلتے ہوئے اپنے دوپٹہ کے لیے نگاہ دوڑائی تھی جو بیڈ پر عین شاہ زیب کے قدموں میں رکھا ہوا تھا اس نے ہوا سے اڑتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا تھا اور دھیمی چال چلتی ہوئی بیڈ تک پہنچی تھی اور جیسے ہی دوپٹہ اٹھانے کو جھکی تھی وہ اس کی کلائی کچھ اس انداز میں پکڑ کر کھینچ چکا تھا کہ وہ پورے وجود سے اس پر گرتی چلی گئی تھی اور آگے کے لمحات اس پر قیامت سے بڑھ کر ثابت ہوئے تھے اس کا گریز، اس کے بچاؤ کی ہر کوشش ناکام ٹھہری تھی اور جیسے شاہ زیب اور کزنی نے اس کے کورے من میں اپنی شبیہہ اتاری تھی ٹھیک ویسے ہی اس کے اَن چھوئے جسم پر اپنے حق کی بساط بچھاتا چلا گیا تھا جس میں مات صرف عریم کو تھی اور وہ فاتح ٹھہرا تھا کہ وہ کسی بے بس پنچھی کی مانند صیاد کے قدموں میں گری تھی۔ وہ اپنی فتح پر شاداں وفرحاں تھا اور اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کا غرور حق کے نام پر خاک میں ملاتا اپنے قدموں تلے روندتا کمرے سے فریش ہو کر جا چکا تھا اور اس کے رونے میں ہر گزرتے پل کے ساتھ مزید شدت آتی جا رہی تھی کہ اسے شاہ زیب سے اس قدر برے سلوک کی توقع ہی نہ تھی۔اس کا بدلا رنگ اسے شکست سے دوچار کر گیا تھا۔

ہر رنگ میں یہ دنیا
سو رنگ دکھاتی ہے
رو کر کبھی ہنستی ہے
ہنس کر کبھی گاتی ہے
یہ پیار کی باہیں ہیں
یا موت کی انگڑائی
میں اور میری تنہائی

اس کی سسکیوں میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا کہ پیار کا یہ روپ اس کے لیے بہت کربناک تھا کہ وہ تو ابھی دنیا کو ہی پیار سے دیکھ رہی تھی۔ شاہ زیب کا ہر روپ سچا دکھائی دے رہا تھا اور نقاب کیسے لمحہ بھر میں اترا تھا کہ وہ جو نکاح کرتے وقت اس کی مرضی چاہتا تھا، اسے منا رہا تھا، راضی کر رہا تھا نکاح کے بعد جیسے اس کی مرضی کی کوئی ویلیو ہی نہیں رہ گئی تھی وہ اسے اس کی مرضی سے پانے کا دعویٰ کرتا یکدم اسے اس کی ایماء کے بنا حاصل کر چکا تھا اس کے جسم پر حق کی بساط بچھا چکا تھا ایسے میں وہ تہی دامن نہ رہتی تو کون رہتا کہ وہی تو حرماں نصیب ثابت ہوگئی تھی۔

اوس پڑی تھی رات بہت اور ہلکی تھی گرمائش پر
سِیلی سی خاموشی میں، وہ بولے تو فرمائش پر
فاصلے ہیں بھی اور نہیں، ناپا تولا کچھ بھی نہیں
لوگ بضد رہتے ہیں پھر بھی رشتوں کی پیمائش پر
منہ موڑا اور دیکھا کتنی دُور کھڑے تھے ہم دونوں
آپ لڑے تھے ہم سے بس اِک کروٹ کی گنجائش پر
کاغذ کا اِک چاند لگا کر رات اندھیری کھڑکی میں
دِل میں کتنے خوش تھے اپنی فرقت کی آرائش پر
دِل کا حجرہ کتنی بار اُجڑا بھی اور بسایا بھی
ساری عمر کہاں ٹھہرا ہے کوئی ایک رہائش پر
دُھوپ اور چھاؤں بانٹ کے تم نے آنگن میں دیوار چنی
کیا اتنا آسان ہے زندہ رہنا اس آسائش پر

☆......☆......☆

''فارغ وقت ضائع کرنے سے بہتر یہ ہے کہ تم اپنی ایجوکیشن کنٹی نیو کرلو۔'' حیدر صاحب کی فرمائش پر فضہ حیدر ان کے لیے بریانی بنا رہی تھیں اور آبدار ان کی مدد کرنے کو آ پہنچی تھی اور انہوں نے اسے ٹرائفل بنانے کی ذمہ داری سونپتے ہوئے بریانی ٹوٹلی خود ہی بنائی تھی کہ حیدر صاحب کو ان کے ہاتھ کی بریانی بہت پسند تھی اور آج تو فرمائش کی تھی اس لیے وہ دلجمعی سے بریانی بناتیں ساتھ ساتھ آبدار سے باتیں بھی کر رہی تھیں اور باتوں باتوں میں خیال آیا تھا تو اسے مشورے سے بھی نواز گئی تھیں اور سلاد بناتی آبدار یکدم چونک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''ارے اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہو؟ میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے، اسٹوڈنٹ تو ہوگی تم انٹر یا بی اے کی، تو تعلیم جاری کرنے میں کیا حرج ہے۔'' وہ اس کے جواب کی منتظر تھیں اور اس نے کچھ نہیں کہا تھا تو انہوں نے بریانی دم پر لگاتے ہوئے اس کو دیکھا تھا اور اس کی حیرت بھانپ کر اسے ٹوک گئی تھیں۔

''انٹر کیا ہے آنٹی، انٹر کے بعد تعلیم کا سلسلہ روک دیا۔'' وہ یوں بولی تھی جیسے بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہو۔ یہ الگ بات تھی کہ اس جرم کے پیچھے اس کی مجبوری اور کسی کی طاقت کا ہاتھ تھا کیونکہ وہ تو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن اسے انٹر کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے سے روک دیا گیا تھا اور اس کے احتجاج اور منت کی پرواہ تک نہیں کی گئی تھی اس نے بھیگتے لہجے میں فضہ حیدر کو تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا۔

''تم چاہو تو پرائیویٹ بی اے کر سکتی ہو اور مجھے پوری امید ہے آئیکت تمہاری ہیلپ کرے گا۔'' انہوں نے کچن سے باہر نکلتے ہوئے اسے ایک نئی راہ دکھائی تھی۔

''جب سے دل نے بغاوت کی ہے آئیکت کے سامنے سے ہی ڈر لگتا ہے اور اس کی مزید عنایتوں سے خوف آتا ہے۔'' اس نے فضہ حیدر کے پیچھے ہی کچن سے نکلتے ہوئے سوچا تھا۔

''کیا سوچنے لگیں بیٹا، زندگی میں آزمائشیں آہی جاتی ہیں، صبر و استقامت کا مظاہرہ کر کے ہر آزمائش سے بڑی کامیابی سے نکلا جا سکتا ہے۔'' وہ لاؤنج میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس کی خاموشی کو نوٹ کرنے کے بعد بولی تھیں۔

''آنٹی آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے مگر میں اپنی وجہ سے آئیکت کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ سنگل صوفے پر آبیٹھی تھی اور قدرے مرجھائے ہوئے سے انداز میں بولی تھی۔

''آئیکت ایک بہت اچھا لڑکا ہے، تم سے محبت کرتا ہے اور جو کچھ تمہارے لیے کر رہا ہے تمہاری محبت میں کر رہا ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ کوئی جب محبت میں کچھ کرے تو اسے احسان نہیں حق سمجھنا چاہیے اور قدر کرنی چاہیے کہ ناقدری کرنے سے اپنے ہی نہیں محبت بھی روٹھ جاتی ہے۔'' فضہ حیدر کے لہجہ میں محبت بول رہی تھی۔ وہی محبت جو انہوں نے حیدر صاحب سے حق سمجھ کر وصول کی تھی اور محبت کے عوض محبت ان پر نچھاور کی تھی۔ ان کی بات پر وہ بے چین ہو گئی تھی کہ اس نے اب تک حق سمجھ کر ہی آئیکت کی محبت وصول کی تھی مگر دل نے یوں بے ایمانی کی تھی کہ ہر حق کہیں پیچھے رہ گیا تھا اور وہ یہ نہیں سمجھ پائی تھی کہ وہ کون سا احساس تھا جو آئیکت کی اتنی محبت کے باوجود اس کے دل میں جاگ نہیں پایا تھا اور یہ کون سا احساس ہے جو وہ ابسام حیدر کی کترائی نظر کے باوجود محسوس کر رہی تھی اس شخص کی نگاہ نہیں اٹھتی تھی اور اس کا دل مناجات کرنے لگتا تھا کہ ایک نظر کا سوال ہے سائیں......اس کو پہروں سوچنا، اس کا سامنا ہونے پر دل کا دھڑکنا یہ سب کچھ آئیکت کے لیے وہ محسوس کر ہی نہیں پائی تھی جو وہ ابسام کے لیے محسوس کرنے لگی تھی اور ابسام حیدر بھی تو بچہ نہیں تھا اس کی نظر کا اٹھنا اور پھر ٹھہر جانا محسوس کر رہا تھا اور ہر گزرتے دن کے ساتھ مضطرب ہوتا جا رہا تھا کہ وہ دوست کے اعتبار کو زک نہیں پہنچانا چاہتا تھا اور جہاں وہ

آبدار کی نگاہ کو بے اختیار ہوتا محسوس کرتا تھا وہیں اس کا اپنی نگاہ پر سے بھی تو اختیار بکھرتا جا رہا تھا اور اس کی اپنی ہی آواز تھی دل نے جو کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیا تھا دل نے جو کبھی نوائم کے لیے محسوس نہیں کیا تھا وہ آبدار کے لیے محسوس کر رہا تھا اور یہ بات معمولی نہ تھی کہ آبدار کسی کی امانت تھی، کسی کی محبت تھی اور کسی کے اعتبار کی نشانی تھی جو اس کو سونپ دی گئی تھی اور کیا اس کا دل بغاوت پر اتر تا اس کو رسوا کرنے والا تھا؟ اسے خائن اور بے اعتبار ٹھہرانے والا تھا؟ یہ سوچ ایسی تھی کہ وہ بے چین ہو جاتا تھا اور آئیکت سے اب تو وہ خود کچھ جلدی کا کہہ گیا تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ قیامت کے آنے سے قبل چلتی پھرتی قیامت اس کی نظر سے دور چلی جائے کہ وہ خائن نہیں بننا چاہتا تھا، دوست کا اعتبار توڑ کر دوستی کا مان نہیں بکھیرنا چاہتا تھا۔

''جی آنٹی، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، آئیکت کی میں بہت عزت کرتی ہوں ان کے جذبات کی قدر کرتی ہوں۔'' وہ ان کو جواب کا منتظر پا کر دھیمے سے بولی تھی۔

''صرف قدر کرتی ہو، محبت نہیں کرتیں......؟'' وہ اس کے جواب کو ادھورا پا کر بے چین سی سوال کر گئی تھیں اور ان کی بے چینی آبدار کی بے چینی کو سوا کر گئی تھی وہ آگے سے بہت چاہ کر بھی کچھ بول نہیں پائی تھی۔

''تمہارے جواب کے بعد تمہاری خاموشی بھی بہت کچھ کہہ رہی ہے آبدار۔'' وہ چونک کر فضہ حیدر کو دیکھنے لگی تھی۔

''مجھے پہلے ہی محسوس ہوا تھا کہ جو جذبات اور محبت آئیکت کے دل میں ہے، تمہارے دل میں نہیں ہے۔ محبت یکطرفہ ہے۔'' وہ ان کے صاف گوئی سے کہہ دینے پر دھک سے رہ گئی تھی۔

''محبت کبھی بھی زبردستی کسی سے نہیں کروائی جا سکتی۔ محبت کب، کیسے، کیوں کس سے ہو جائے یہ محبت کو بھی پتہ نہیں ہوتا۔ محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں آئیکت سے محبت نہیں بس اس کے احسانات اور اس کے جذبات کی تم قدر کرتی ہو اور یہ بھی کم نہیں ہے کہ محبت کی قدر کرنے والے بھی بہت کم ہوتے ہیں اور تمہیں آئیکت سے محبت نہیں تو کسی اور سے بھی تو محبت نہیں ہے اس لیے ایک نہ ایک دن مجھے پوری امید ہے کہ تمہیں آئیکت سے محبت ہو جائے گی کہ محبت خود بہ خود اپنی جگہ بنا لیتی ہے۔'' وہ اس کے زرد چہرے کو دیکھ کر نرمی سے بولی تھیں یکدم وہ مسکرا دی تھی۔

''آپ محبت پر بہت اچھا بول لیتی ہیں۔'' اس نے خود سے فوکس ہٹانے کو کہا تھا کہ وہ یہ ان سے کم از کم نہیں کہہ سکتی تھی کہ اب آئیکت کی محبت کبھی جگہ نہیں بنا سکتی کہ اس کے کورے من میں کسی اور کی شبیہ اتر گئی ہے اور ایک تصویر من میں بس جائے تو پھر ہر ایک تصویر گویا حرام ہو جاتی ہے کہ دل تو توحید کے قائل ہوتے ہیں، شرک سے مبرا، ایک کا کلمہ پڑھنے والے۔

''پوری زندگی محبت میں گزر گئی ڈیئر، اب بھی محبت پر بولنا نہیں آئے گا۔'' وہ دلکشی سے ہنسی تھیں اور وہ زندہ دل عورت کو دیکھنے لگی تھی جن کے ہر انداز سے حیدر صاحب کے لیے محبت جھلکتی تھی۔

''میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا ایک شخص میرے دل میں یوں اترے گا کہ میری ذات کہیں کھو کر رہ جائے گی، حیدر کو جب پہلی بار دیکھا تو بس دیکھ لیا مگر کچھ عرصہ گزرا تو حیدر کی نگاہ خود پر محسوس کی اور اس احساس نے نوٹس لینے پر مجبور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیدر دل کی سب سے اونچی مسند پر براجمان ہو گئے کہ ان کو کھونے کا تصور ہی سوہان روح لگتا تھا۔'' وہ دھیمے دھیمے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولتی جا رہی تھیں۔

''قسمت نے ساتھ دیا، رب مہربان ہوا محبوب ہی شریک حیات بن گیا۔ عمر نے طویل ساعتیں طے کر لیں مگر دل کا دھڑکا نہ گیا۔ آج بھی حیدر کو کھونے کا خیال جان نکال دیتا ہے کہ محبت ایسی ہی تو ہوتی ہے جان ڈال دینے والی اور جان نکال لینے والی، حیدر کے ساتھ میں جسم میں جان محسوس ہوتی ہے اور جہاں حیدر کی توجہ ادھر ادھر ہوئی جسم بے جان ہونے لگتا ہے کہ یہ محبت ہوتی ہے وقت اور عمر نہیں دیکھتی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس میں شدت آ جاتی ہے اور محبت شدتوں سے گزر کر نکھر جاتی ہے۔'' وہ انہیں دیکھ رہی تھی وہ حسین عورت، اس وقت حسین ترین لگ رہی تھی کہ محبت نے اس کے حسن کو نکھار بخش دیا تھا۔

''آپ بہت لکی ہیں آنٹی کہ جسے چاہا اسے پا لیا اور جو آپ کی چاہت ہے آپ بھی اس کی چاہت ہیں۔'' وہ ان کے چہرے سے نظر ہٹاتی اپنے ہاتھ کی لکیروں سے نظروں کو الجھاتی کھوئے کھوئے سے انداز میں بولی تھی۔

''ہاں، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے حیدر کی بے پناہ چاہتوں سے نوازا۔'' احساس تشکر سے ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

''آنٹی میرے لیے دعا کیجیے گا کہ مجھے بھی اللہ اتنی پرخلوص چاہت سے نواز دے۔'' وہ ڈائریکٹ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی اس لیے بات برائے بات کہی تھی۔

''کیوں نہیں بیٹا۔ اور تم ماشاءاللہ بہت خوش نصیب ہو، آئیکت جیسا مرد جس لڑکی کو بے پناہ چاہتا ہو اس لڑکی کی خوش بختی پر رشک کیا جا سکتا ہے۔'' ان کا انداز چھیڑنے والا تھا اور وہ بے چین ہوتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور نگاہ دور کھڑے ابسام حیدر پر پڑی تھی۔ دونوں کی نگاہ ٹکرائی تھی، ہمیشہ کی طرح ابسام نگاہ چرا کر منظر سے غائب ہو گیا تھا۔

''آپ کا یوں نظر چرا کر جانا دل کو کتنی تکلیف دیتا ہے کاش میں آپ کو بتا سکتی ابسام......'' وہ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی اور آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرتی چلی گئی تھیں۔

☆......☆......☆

شاہ زیب کی نگاہ اٹھی تھی وہ لاؤنج کی دہلیز پر کچھ شرمندہ سی متورم چہرے کے ساتھ کھڑی تھی اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھری تھیں اس کو دیکھ کر شاہ زیب کو شرمندگی نے آ گھیرا تھا مگر ہمیشہ کی طرح یہ شرمندگی محض لمحہ بھر کی تھی۔

''بچوں کی طرح بی ہیو کرنے کی ضرورت نہیں ہے عریم، چہرے کے زاویے درست کرو اور یہ رونا دھونا بند کر دو، ابھی نکاح کا کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے۔'' وہ ٹیبل سے موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھاتا عین اس کے سامنے آ کر بولا تھا اور اس کے آنسو رخساروں پر گرنے لگے تھے۔

''عریم! کنٹرول یور سیلف، میں ہوں نا، سب ٹھیک کر دوں گا، یو ڈونٹ وری......'' وہ نہایت فکر مند لہجے میں کہتا آنسو صاف کرنے کو ہاتھ بڑھا گیا تھا۔

''ڈونٹ ٹچ می!'' وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی چیخی تھی اور اس نے لب ہی نہیں مٹھی بھی بھینچ لی تھی جو اس کی ضبط کی گواہ تھی۔

''آپ بہت برے ہیں شاہ، آپ کا رویہ، آپ کا سلوک میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ آپ نے مجھے چیٹ کیا ہے، میری مرضی، میری مرضی کہہ کر میر مرضی ہی چھین لی، مجھ سے میرا غرور چھین لیا ہے آپ نے، اور اس کے لیے میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' وہ بلکتے ہوئے بول رہی تھی اور اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ اس کا ہاتھ اٹھا تھا اور عریم کے نم دائیں رخسار کی خیریت دریافت کر گیا تھا۔

''تڑاخ......'' وہ گال پر ہاتھ رکھے آنکھوں میں آنسو لیے بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''بکواس بند کر کے رکھو اپنی، چیٹ کرنا ہوتا تو نکاح نہ کرتا میں، اور آج تو میرا ہاتھ جھٹکنے کی غلطی کی ہے آئندہ یہ حماقت نہ کرنا، میرے حق کو تم تو کیا تمہارا باپ بھی چیلنج نہیں کر سکتا۔'' وہ اس کو کاندھوں سے جکڑے غصہ سے کف اڑا رہا تھا اور وہ اس کے بدلے روپ کو ششدر نگاہ سے دیکھتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک تیز غصیلی نگاہ اس پر ڈالی تھی اور جھٹکے سے اسے گرفت سے آزاد کرتا وہ باہر کی جانب بڑھا تھا اور اس کی کلائی شاہ زیب کی گرفت میں تھی وہ اس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی تھی اس کی آنکھیں پھر بہنے لگی تھیں۔ واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا وہ غصہ میں بڑی خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

''میں کل کی فلائٹ سے آسٹریلیا جا رہا ہوں، واپسی کب ہو گی نہیں جانتا، تمہیں کال خود کروں گا، تم مجھ سے رابطہ نہیں کرو گی اور بچوں کی طرح بی ہیو بالکل مت کرنا۔ ابھی ہمارے بارے میں کسی کو پتہ نہیں لگنا چاہیے۔ میں واپس آ کر سب خود سنبھال لوں گا اور جہاں تک تمہارے رشتے کی بات ہے تم صاف منع کر دینا۔'' اس نے از خود اپنی خاموشی کو توڑا تھا اور ایک کے بعد ایک حکم جاری کرتا چلا گیا تھا اس نے نہ کچھ کہا تھا نہ ہی اس کی طرف دیکھا تھا کہ اس کی آخری بات پر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

''تمہیں انکار کرنا ہو گا عرمی، بہادر بنو، بچی نہیں ہو تم کہ ایک ایک بات سمجھاؤں۔ کچھ اپنی عقل کا بھی استعمال کرو۔'' وہ اس کی خاموشی سے لپٹے جواب کو محسوس کرتا ہوا بولا تھا۔

''میں بالکل بے بس و بے اختیار ہوں، نہ پاپا سے کچھ کہہ سکتی ہوں نہ بابا سے کچھ منوا سکتی ہوں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے آپ سے کچھ کہنے اور منوانے کی ہمت نہیں مجھ میں، آپ کی مرضی کے آگے میری نہیں چلی، پاپا کے سامنے بھی میری نہیں چلے گی کہ میری چل سکتی ہوتی تو پاپا کے رشتہ طے کرنے پر آپ کی منتیں نہ کرتی کہ آپ اپنے پیرنٹس کو میرا رشتہ لے کر بھیج دیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی تھی اور اس لہجے میں چھپا کرب اور اذیت شاہ زیب کو مضطرب کر گئی تھی۔

''آئی ایم سوری عرمی۔'' اس نے گاڑی روک دی تھی اور دھیمے سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا تھا۔

''بعض اوقات صرف بھروسے نہیں ٹوٹتے، رشتے اور تعلقات بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر لاکھ کوشش کرو جوڑنے کی نہیں جڑتے کہ ایک ٹوٹا گلاس نہیں جڑ سکتا تو ایک پورا انسان کیسے جڑ سکتا ہے۔'' اس کے سوری کرنے پر عریم نے اذیت سے سوچا تھا مگر بولی کچھ نہیں تھی کہ اب بولنے کی چاہ ہی نہیں رہی تھی۔

''تم ماما سے بات کرنا ہمارے رشتے کا بتانا، صرف میرا ذکر کر دینا، وہ تمہارے پاپا سے پھر خود بات کر لیں گی اور ماما نہ کر پائیں تو تم منگنی کر لینا، باقی میں آ کر دیکھ لوں گا۔'' وہ اس کی خاموش نگاہ سے خائف ہو کر رہ گیا تھا اور خود کو کمپوز کر کے بولا تھا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی باقی سفر خاموشی سے گزر گیا تھا۔

''عریم، یاد رکھنا جیسے جیسے انسان کی برداشت کم ہونے لگتی ہے وہ شکست کے قریب ہوتا جاتا ہے کیونکہ فتح حوصلہ و برداشت سے حاصل ہوتی ہے۔ تمہیں آج مجھ پر بہت غصہ آ رہا ہے اور آنا بھی چاہیے مگر میں نے جو کیا دل سے مجبور ہو کر کیا اس لیے وضاحت نہیں دوں گا اور تم اب میری بیوی ہو، میری عزت ہو، تم پر حرف نہیں آنے دوں گا۔ زندگی کا یہ وقت کڑا ضرور ہے مگر تمہیں برداشت و حوصلہ سے کام لینا ہو گا۔ اپنے لیے اور میرے لیے، اور میں تمہارے ساتھ ہوں اپنا بہت سارا خیال رکھنا میں تم سے رابطے میں رہوں گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یو ڈونٹ وری۔'' وہ گاڑی عریم کے گھر سے کچھ فاصلے پر روکے اس کا ہاتھ تھامے بول رہا تھا اور اس کے بلکتے دل کو جیسے قرار آنے لگا تھا کہ جانے محبّ کے لفظوں میں کیسی تاثیر ہوتی ہے کہ موت بھی زندگی کے درشن کرنے لگتی ہے اور وہ خود کو یکدم ہی زندہ تصور کرنے لگی تھی۔

''آئی لو یو......'' اس نے عریم کو خود سے لگا کر سرگوشی کی تھی اور پیشانی پر لب رکھے تھے وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تھی شاہ زیب کا اقرار، ہر اذیت کا گویا از خود مداوا بن گیا تھا مگر یہ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اقرار آج آخری بار ہوا تھا اور وہ اس کے وعدوں پر یقین کرتی گاڑی سے اتری تھی اور گھر کی طرف قدم بڑھا دیئے تھے۔ یہ اس کی امان جہاں اس نے تحفظ کے ساتھ محبت و عزت بھری زندگی گزاری تھی اور اپنے چاہنے والے ماں باپ کو دھوکہ دے کر وہ اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کر چکی تھی وہ شاہ زیب اور کزئی کی محبت میں اتنا آگے بڑھی تھی کہ اس کے نام اپنے تمام تر حقوق کر ڈالے تھے، گئی تھی تو عریم محمود تھی اور لوٹ کر آئی تھی تو عریم شاہ زیب اور کزئی بن کر، اس کا حوالہ ہی نہیں، ذات کا نکھار بھی بدل گیا تھا کہ اب شاہ زیب اور کزئی کی سہاگن تھی مگر یہ صرف وہ جانتی تھی اور اس نے یہ راز ابھی راز رکھنا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کچھ غلطیاں، کچھ گناہ منظر عام پر آ کر ہی رہتے ہیں۔ کچھ راز ہوتے ہی افشا ہو جانے کے لیے ہیں خاص کر وہ راز جن کا تعلق محض انسان کی ذات سے نہیں کئی لوگوں سے اور ان کی زندگیوں سے جڑا ہوتا ہے۔

کچھ اس ادا سے آج وہ پہلو نشیں رہے
جب تک ہمارے پاس رہے، ہم نہیں رہے
یارب کسی کے رازِ محبت کی خیر ہو
دستِ جنوں رہے نہ رہے، آستیں رہے

دردِ غمِ فراق کے یہ سخت مرحلے
حیراں ہوں میں کہ پھر بھی تم، اتنے حسیں رہے
جا اور کوئی ضبط کی دنیا تلاش کر
اے عشق ! ہم تو اب تیرے قابل نہیں رہے
اللہ رے چشمِ یار کی معجز بیانیاں
ہر اک کو ہے گماں کہ مخاطب ہمیں رہے
اس عشق کی تلافیء ما بعد دیکھنا
رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے

☆......☆......☆

''نوائم ! سب پاکستان جا رہے ہیں، تم جاؤ گی یا نہیں۔'' مومل نے دلجمعی سے کیوٹکس لگاتی نوائم سے پوچھا تھا۔

''یہ تو بابا پر منحصر ہے وہ مجھے ساتھ لے جائیں گے یا چھوڑ کر جائیں گے۔'' اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھائی تھیں اور بات مکمل کر کے اپنے کام میں مشغول ہو گئی تھی۔

''تمہارا اپنا دل کیا کہتا ہے، ساجن کے دیس میں جانے کو مچل رہا ہے کہ نہیں۔'' مومل کے انداز میں شرارت تھی۔ مومل اس کے چچا عقیل احمد کی بیٹی تھی مومل سے چھوٹی کومل تھی اور یہ دو ہی بہنیں تھیں کہ فضہ حیدر تین بھائی بہن تھے دو بھائی شکیل احمد اور عقیل احمد اور ایک فضہ جو شادی کے بعد پاکستان میں مقیم تھیں۔

''او، ہیلو، ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے مومل کو گھورتے ہوئے ترنت کہا تھا اور وہ ہنس دی تھی۔

''پھر کیسا ہے ڈیئر سویٹ ہارٹ ......'' اس کے انداز میں بے تکلفی تھی کہ وہ دونوں ہم عمر اور ہم جماعت تھیں۔

''بکواس بند کرو مومل، کہ تم جانتی ہو، ابسام صرف بابا کی پسند ہے میں نے ابسام کے بارے میں کبھی خاص انداز سے نہیں سوچا اس لیے پاکستان جانے کے لیے میں بالکل بھی ایکسائیٹڈ نہیں ہوں اور خاص کر اس لیے کہ وہاں میرا اکلوتا منگیتر رہتا ہے۔'' وہ قدرے صاف گوئی سے بولتی گیلی کیوٹکس پر پھونکیں مارنے لگی تھی۔

''تم اتنی بور کیوں ہو نوائم، میرا ہوتا نا اتنا ہینڈسم منگیتر تو میں تو ہوا کے رتھ پر سوار ہو کر اس کے دیس پہنچ جاتی۔'' وہ خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔

''ہینڈسم اور ابسام۔ اس سے بڑے بڑے ہینڈسم پڑے ہیں دنیا میں۔'' اس نے گویا مومل کی بات چٹکیوں میں اڑا دی تھی۔

''تم تو ہو ہی سدا کی ناشکری، مفت میں بیٹھے بٹھائے مل گیا ہے نا اتنا چارمنگ، ویل ایجوکیٹڈ، ہینڈسم فیانسی تو لوگوں کے دماغ چوتھے آسمان پر جا پہنچے ہیں، ہمیں دیکھو کوئی چھوٹا، بوٹا سا منگیتر بھی نہیں دستیاب، ہینڈسم کی تو دور کی بات ہے۔'' وہ نوائم کو گھورتے ہوئے کہتی آخر میں چہرے پر بے بسی ولاچارگی سی طاری کر گئی تھی اور اسے دیکھ نوائم کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

''اتنی بکواس کیسے کر لیتی ہو تم۔'' نوائم اسے تکیہ مارتے ہوئے ہنسی کے درمیان بولی تھی۔

''اڑالو مذاق، جس دن ملا نہ مجھے ایک ہینڈسم فیانسی تب گن گن کر بدلے لوں گی۔'' تکیہ اس کے کاندھے سے ٹکراتا زمین بوس ہو گیا تھا جسے اٹھا کر گود میں رکھتے ہوئے وہ نوائم کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی۔

''ویسے مومی، مجھے اندازہ نہیں تھا تمہیں ابسام اس حد تک پسند ہے، تم کہو تو میں تمہارے حق میں دستبردار ہو جاتی ہوں۔'' وہ کیوٹکس اور نیل فائلر ڈریسنگ پر رکھتے ہوئے حاتم طائی بنی ہوئی تھی۔

''حاتم طائی کی نانی بکواس بند کرو۔ بڑی آئیں میرے حق میں دستبردار ہونے والیں۔ ڈئیر میری زندگی میں جب ہیرو ٹائپ فیانسی آئے گا نا تب بس تم جلتی رہنا۔'' وہ اسے تکیہ مارتے ہوئے پر امید تھی اور وہ تکیہ بازوؤں میں دبائے عین اس کے سامنے بیڈ پر آ بیٹھی تھی۔

''خیر تو ہے آج ایک فیانسی کی کمی اتنی شدت سے کیوں محسوس ہو رہی ہے۔'' نوائم کا انداز چھیڑنے والا تھا۔

''اپنی ماسی کی بیٹی کی مالی کے بیٹے سے منگنی ہو گئی ہے۔ تب سے احساس کمتری ہو رہا ہے۔'' وہ مایوسی سے بولی تھی اور نوائم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی تھی۔

''تمہیں مالی بابا کا جمیل اتنا پسند ہے تو پہلے بولتیں ہم تمہارے رشتے کی بات چلاتے۔'' وہ ہنستے ہنستے مومل کو چھیڑ رہی تھی۔

''کیا بولتی، میں ٹھہری مشرقی لڑکی ابسام کو تم لے اڑیں اور جمیل کو وہ سکینہ...... میں بے چاری منگنی کی آس میں زندگی کے پل کاٹ رہی ہوں۔'' وہ برا مانے بغیر ہنوز بے چاری سی میلوڈی کوئین بنی ہوئی تھی۔

''دفعہ کرو دو پیاری، تمہارے نصیب کا ہینڈسم تمہیں بہت جلد ٹکرا جائے گا اور ویسے تم اپنی قریب کی نظر ٹھیک کر لو تو......''

''آگے کچھ مت کہنا وہ فضول چھچھورا عبیر عباسی مجھے زہر سے بھی زیادہ برا لگتا ہے۔'' وہ اس کی بات درمیان سے پکڑتی کڑے نیم کریلے سے لہجے میں بولی تھی۔

''تمہیں وہ آخر اتنا برا کیوں لگتا ہے اتنا تو ہینڈسم ہے وہ......'' وہ مومل کے انداز پر ہمیشہ کی طرح خائف ہوتی نا سمجھ آنے والے انداز میں بولی تھی۔

''کچھ تو لوگ بس اچھے نہیں لگتے، کیوں، یہ انسان کبھی جان نہیں پاتا اور عبیر مجھے نہیں پسند، اس کی ہزار خوبیاں اپنی جگہ مگر وہ مجھے اچھا نہیں لگتا اس لیے فضول بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ دوٹوک انداز میں گویا بات ہی ختم کر گئی تھی۔

''تم غلط کر رہی ہو ایک انسان تمہیں اتنا چاہتا ہے اور تمہیں قدر ہی نہیں کوئی۔ یونیورسٹی کی آدھی درجن سے زائد لڑکیاں مرتی ہیں اس پر جسے تم بے وجہ ناپسند کرتی ہو۔ اگر وہ تمہارے انکار سے بے دل ہو کر ادھر ادھر ہو گیا نا تو سر پکڑ کر روؤ گی۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

''دنیا میں لڑکوں کا ابھی ایسا کال بھی نہیں پڑا کہ اس چھچھورے عبیر عباسی کے ادھر اُدھر ہو جانے پر مجھے سر پکڑ کر رونا پڑے۔'' وہ ہنکارا بھرتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''فضول میں میرے اتنے اچھے موڈ کا تم نے ستیاناس مار دیا ہے، میں جا رہی ہوں اور ہاں میں تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ تم بھی پاکستان جا رہی ہو۔'' مومل اسے گھورتی ہوئی باہر کی طرف بڑھی تھی اور نوائم نے دوڑ کر اس کا بازو جکڑ لیا تھا۔

''تم سے کس نے کہا۔'' نوائم اسے دیکھ رہی تھی جس کے چہرے سے ہی صاف اس کے موڈ آف ہونے کا پتہ لگ رہا تھا۔

''تایا ابو نے تو تم جانتی ہی ہو تمہارے پاکستان جانے کی مخالفت کی تھی مگر دادو نے تمہارے جانے کی حمایت کی ہے اور دادو بھی پاکستان جا رہی ہیں اس لیے اب تم بھی ہمارے ساتھ پاکستان جا رہی ہو۔'' اس نے نروٹھے انداز میں تفصیل سنائی تھی اور نوائم ایک دم ہی ایکسائیٹڈ ہو گئی تھی کہ وہ کبھی پاکستان نہیں گئی تھی اور اسے جانے کیوں پاکستان دیکھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

''دادو کو تو ڈاکٹر نے سفر سے منع کیا تھا تو پھر وہ کیسے پاکستان جا سکتی ہیں؟'' وہ مومل کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''بابا نے ڈاکٹر سے پرمیشن لے لی ہے۔ دادو، فضہ پھپھو سے ملنے جانا چاہتی ہیں اس لیے، اور دادو اب بالکل صحت یاب ہیں اس لیے ڈاکٹر نے اجازت دے دی ہے۔'' وہ تفصیل سے نوائم کو آگاہ کر گئی تھی۔

''یہ سارے فیصلے کب ہوئے، میں کہاں تھی۔'' وہ حیرانگی سے بولی تھی۔

''یہ تو تم جانتی ہی ہو دادو جائیں گی کہ نہیں یہ مسئلہ زیرِ غور تھا آج کچھ دیر پہلے ڈاکٹر انکل نے اجازت دے کر مسئلہ حل کر دیا اور دادو جا رہی ہیں تو تم اکیلے تو رک نہیں سکتیں اس لیے تم بھی جا رہی ہو۔'' نوائم اس کی بات سن کر بہت زیادہ خوش ہو گئی تھی روٹھی روٹھی سی مومل کو کاندھوں سے تھام کر گھما ڈالا تھا۔

''تم نے بہت زبردست خبر دی ہے مومی، می سو ہیپی۔'' اس کے لہجے سے اس کی خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''ابھی تو بڑی باتیں کر رہی تھیں، اب کیوں خوش ہو رہی ہو۔'' وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''تم اپنی غلط فہمی دور کر لو کہ میں اس لیے خوش ہو رہی ہوں کہ میں اپنے فیانسی کے ملک جا رہی ہوں۔ تم جانتی ہو کہ ابسام محض ایک کزن ہے اس کے لیے میرے دل میں محبت یا سوفٹ کارنر نہیں ہے نہ ہی ابسام میرے لیے اپنے دل میں محبت رکھتا ہے۔ ہمارا رشتہ بڑوں کا فیصلہ ہے۔ خوشی تو پاکستان جانے کی ہے یہ وہی ایکسائٹمنٹ ہے جو تم نے آج سے چار سال قبل محسوس کی تھی جب پہلی دفعہ پاکستان گئی تھیں۔'' نوائم نے صاف گوئی کی انتہا کر ڈالی تھی۔

''ابسام سے محبت کیوں نہیں ہے تمہیں؟'' وہ واپس بیڈ پر بیٹھتے ہوئے حیرانگی سے بولی تھی۔

''اگر یہی میں پوچھوں کہ تمہیں عبیر سے محبت کیوں نہیں ہے تو تم کیا جواب دوگی؟'' نوائم کے دوبدو سوال پر وہ چڑ کر واپس اٹھ گئی تھی۔

''تم نے اس سڑے ہوئے عبیر کا نام لے کر میری ضرور تپانی ہوتی ہے۔'' اس کا موڈ انتہائی حد تک خراب ہوگیا تھا۔

''آغاز ہمیشہ تمہاری طرف سے ہوتا ہے اور یاد رکھنا کہ ابسام بھی فی الحال مجھ سے محبت نہیں کرتے ہمارا رشتہ ٹوٹلی بڑوں کی رضا، ان کا فیصلہ ہے۔ مجھے ابسام سے محبت بے شک نہیں ہے مگر میں اسے ناپسند بھی نہیں کرتی اور یہی حال ابسام کا بھی ہے جبکہ تم ایک محبت کو ٹھکرانے کی غلطی کر رہی ہو محبت تمہارے تعاقب میں ہے اور تم اس سے بھاگتیں سرپٹ دوڑتی جا رہی ہو مگر یہ کبھی مت بھولنا کہ محبت کے منکر، محبت کے دام میں یوں پھنستے ہیں کہ پھر محبت کے سوا انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔'' نوائم کا انداز سنجیدہ، قدرے ناصحانہ تھا۔

''اپنی فلاسفی تم اپنے پاس رکھو میری محبت عبیر کبھی نہیں ہوسکتا اس لیے اس کی حمایت کرنا چھوڑ دو اور پاکستان چلنے کی تیاری کرو اور میری مانو تو اس بار زبردست تیاری کے ساتھ ابسام کے سامنے جانا، حسین تو تم ہو کچھ ادا کا ہتھیار آزمانا ابسام تمہاری محبت میں گرفتار ہو جائے گا۔'' اس نے شوخی سے کہہ کر آنکھ دبائی تھی۔

''انتہائی گھٹیا باتیں وحرکتیں کرنے لگی ہو تم۔'' وہ جھینپ کر سرخ پڑ گئی تھی کہ محبت بھلے نہ تھی مگر رشتہ تو تھا اور جب سے منگنی ہوئی تھی وہ ابسام کے ذکر پر یوں ہی لال پیلی ہو ہی جاتی تھی۔

''صحبت کا اثر ہے بس، سوچ رہی ہوں دوست بدل لوں، نوائم نامی جو دوست ہے اس کی دوستی میں کچھ بگڑتی جا رہی ہوں۔'' مومل شوخی سے بولی تھی اور ساتھ ہی دوڑ لگا دی تھی کہ جانتی تھی اتنے نادر خیالات کے اظہار کے بعد نوائم نے کہاں اسے چھوڑنا تھا اور نوائم سے بچنے کو اس نے نوائم کے کمرے سے سرپٹ دوڑ لگائی تھی اور اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ نوائم کے کمرے کی طرف آتے عبیر عباسی سے بری طرح ٹکرائی تھی۔ عبیر اس افتاد پر بوکھلا کر رہ گیا تھا بری طرح لڑکھڑایا تھا مگر کمال مہارت وعجلت سے اس نے مومل کا بازو کچھ یوں جکڑا تھا کہ وہ زمین بوس ہونے سے بچ گئی تھی۔ اس کے پیچھے لپک کر آتی نوائم خوبصورت تصادم پر مسکراتی واپس پلٹ گئی تھی جبکہ وہ حواس باختہ سی عبیر عباسی کے بہت نزدیک کھڑی تھی۔

''قسم خدا کی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ مومل احمد کبھی میرا اتنا حسین استقبال کریں گی۔'' وہ اس کے حسین چہرے کو وارفتگی سے تکتے ہوئے شوخ ہوا تھا اور وہ کرنٹ کھا کر گویا فاصلے پر ہوگئی تھی۔

''کچھ دیر پہلے کا منظر بھی کیا منظر تھا، جانِ حیات، زندگی کی نوید بن کر کاندھے سے جھول رہی تھی اور اب وہ عالم ہے کہ زندگی، زندگی سے کترائی ہوئی سی معلوم ہو رہی ہے۔'' وہ جو مارے خجالت کے سرخ پڑ گئی تھی عبیر کی بکواس پر دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا تھا اس نے نگاہ اٹھائی تھی اور عبیر کے آنکھ مارنے پر پوری جان سے جل کر رہ گئی تھی۔

''یہ سڑک چھاپ لڑکوں کی طرح چھچھوری حرکتیں کم از کم میرے سامنے مت کیا کرو۔'' وہ غصہ سے چیختے لہجے میں بولتی تن فن کرتی

اس کی سائیڈ سے نکلنے کو تھی کہ وہ اس کا بازو جکڑ گیا تھا۔

''حسن ہم سے آٹکرائے تو یہ حسن والوں کی ایک ادا، اور ہم حسن کی شان میں کچھ عرض کر دیں تو سڑک چھاپ چھچھورے، مائی لو یہ کھلا تضاد آخر کیوں؟'' وہ اس کا بازو گرفت میں لئے بظاہر سادگی سے پوچھ رہا تھا مگر اصل راز تو اس کی کانچ سی نیلی آنکھیں افشا کر رہی تھیں اس کی حسین آنکھوں میں ناچتی شرارت لحہ بھر کو مومل کو کنفیوز کر گئی تھی کہ وہ عبیر عباسی سے دو بدو بحث کر لیا کرتی تھی۔ اسے دو کی چار سنا دیا کرتی تھی مگر اس کی حسین آنکھوں میں کبھی دیکھ نہیں پاتی تھی اس کی بولتی بند ہو جاتی تھی یکدم اس نے نگاہ چرا کر لب بھینچ لیے تھے اور اسے کنفیوز پا کر عبیر نے مسکرا کر ہوا سے اُڑتی اس کے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے کی تھی اتنی دیر میں وہ خود کو کمپوز کر چکی تھی اس کا ہاتھ اپنے بازو سے جھٹک کر دور ہوئی تھی۔

''بکواس بند کرو عبیر، اور اپنی فضول حرکتوں سے بھی باز آ جاؤ ورنہ میں انکل سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔'' وہ غصہ سے اسے وارننگ دے گئی تھی۔

''ڈیڈی سے کیا کہو گی ڈیئر؟'' وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر اسے دیکھنے لگا تھا جو گلابی رنگ کے کاٹن کے سوٹ میں خود بھی گلابی ہو رہی تھی، غصہ سے لمبی ستواں ناک سرخ ہوئی جا رہی تھی اور ٹکرانے کے سبب کاندھوں پر سلیقہ سے سیٹ دوپٹہ بے ترتیب ہو کر ایک کاندھے پر جھول رہا تھا اور لانبی سیاہ ناگن سی چوٹی لہرا کر بائیں کاندھے پر آ رکی تھی اس کی نگاہ بے اختیاری سمیٹ لائی تھی اور وہ اس کی نگاہ خود پر محسوس کرتی لب بھینچ گئی تھی۔

''جو تمہاری حرکتیں ہیں وہی کہوں گی۔ اور یاد رکھنا تم جانتے ہو مجھے ڈرتی نہیں ہوں میں، سچ میں انکل سے سب کہہ دوں گی۔'' وہ دل ہی دل میں اسے کوستی وارننگ دیتی آگے بڑھی تھی اور وہ لپک کر اس کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔

''مجھے پتہ تو چلے آخر تم ڈیڈی سے کہو گی کیا، ڈیڈی کے سامنے ہمت بعد میں دکھانا پہلے میرے سامنے تو ہمت کا مظاہرہ کرو بتاؤ مجھے کیا ہیں میری حرکتیں......'' عبیر کا انداز زچ کرنے والا تھا۔

''میں انکل سے کہہ دوں گی کہ تم انتہائی بدتمیز انسان ہو، مجھے دیکھ کر گلی کے آوارہ لڑکوں کی طرح ہوٹنگ کرتے ہو اور بہانے بہانے سے ٹچ کرنے کی کوشش کرتے ہو۔'' اس نے تھوک نگلتے ہوئے سوچا تھا، الفاظ ذہن میں ترتیب دیئے تھے اور نظر اٹھائی تھی اور عبیر کو خود کو تکتا پا کر لفظ جیسے کہیں کھو سے گئے تھے اور وہ لب بھینچ کر بڑی تیزی میں وہاں سے نکل گئی تھی اور پیچھے اس کے قہقہہ نے اس کا تعاقب کیا تھا اور وہ دل ہی دل میں اسے کوسنے لگی تھی کہ اس کی مجبوری یہ تھی کہ وہ چاہے کتنا ہی برا لگتا تھا۔ اس کی حرکتوں سے چاہے وہ کتنی ہی خائف و پریشان تھی کہہ کسی سے نہیں سکتی تھی کہ اس کی دوست، اس کی ہمراز و دمساز نوائم احمد بھی تو اس معاملے میں اسے سپورٹ نہیں کرتی تھی کہ اسے عبیر جتنا ناپسند تھا نوائم اتنی ہی اس کی تعریفیں کرتی عبیر کی محبت ایکسپٹ کر لینے پر اکسانے لگتی تھی اور دونوں کے درمیان بحث چھڑ جاتی تھی ایسے میں، وہ بڑوں تک اپنا مسئلہ کم از کم نوائم کے ذریعے نہیں پہنچا سکتی تھی۔ عبیر عباسی، عقیل احمد کے بچپن کے دوست کبیر عباسی کا اکلوتا بیٹا تھا۔

بچپن سے اس کا ان کے گھر آنا جانا تھا اور نہ جانے کب اسے نک چڑھی موحل اچھی لگنے لگی تھی وہ جتنا اسے اہمیت دینے لگا تھا وہ اتنی ہی چڑنے لگی تھی دیکھتے دیکھتے پسندیدگی محبت میں ڈھل گئی تھی۔عبیر، موحل سے ایک سال بڑا تھا یونیورسٹی میں ایک سال سینئر تھا اور ہمیشہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا کالج میں بھی یہی حال تھا اور جب وہ فسٹ ایئر میں تھی تب موحل کے کلاس فیلو نے اسے پرپوز کیا تھا اس کا عبیر نے جو حال کیا تھا وہ کیا تھا اس کے بعد ہی اس نے موحل کو نہ صرف پرپوز کیا تھا اپنی محبت کا اظہار بھی کر ڈالا تھا اور اس نے تب ہی عبیر کو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی وہ ہرٹ تو ہوا تھا مگر اس نے تین سال گزرنے کے باوجود ہمت نہیں ہاری تھی اور جب سامنا ہوتا تھا اسے اپنی محبت کا یقین ضرور دلانے کی کوشش کرتا تھا اور اس کی یہ کوشش موحل کو چڑانے کے ساتھ بےزار کرتی جا رہی تھی مگر عبیر پر یقین تھا کہ وہ اپنی محبت سے ایک دن موحل کے دل میں گھر کر لے گا اس لیے اسے تنگ کرتا تھا کہ وہ اس سے الجھتی، پھر نگاہ چراتی اسے بہت دلکش لگتی تھی اس لیے وہ موحل کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا اور نوائم ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھی کہ نوائم کا کوئی بھائی نہ تھا۔وہ عبیر کو بھائی کہتی تھی اور موحل و نوائم کی دوستی بہت مضبوط تھی تب ہی موحل، عبیر کو سپورٹ کرنے پر نوائم سے لڑتی تھی، بحث کرتی تھی پھر بات آئی گئی ہو جاتی تھی کہ موحل کو نوائم کی دوستی اور اس کے خلوص پر ذرا برابر شک نہ تھا۔شک تو عبیر کی اچھائی اور محبت پر بھی نہ تھا مگر وہ کبھی عبیر کے بارے میں اس طرح سوچ ہی نہیں پاتی تھی، کبھی بہت چاہ کر بھی اس کے جذبوں کو پذیرائی نہیں کر پاتی تھی کہ محبت اسے کبھی محسوس ہوئی ہی نہیں تھی اور جب محبت ہی محسوس نہ ہوئی تھی تو محبت کی پذیرائی کیسے ممکن تھی!!

☆......☆......☆

''عریم! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے بیٹا؟'' وہ جو بےخیالی میں چائے کے مگ پر انگلیاں پھیر رہی تھی ماں کی متفکر آواز پر چونک کر رہ گئی تھی۔

''جی ماما'' وہ منمنا کر چائے کے گھونٹ بھرنے لگی تھی۔

''میں کچھ دنوں سے تمہاری غائب دماغی محسوس کر رہی ہوں بیٹا! اگر تم میری طبیعت کو لے کر پریشان ہو تو میں بالکل ٹھیک ہوں، کوئی اور بات پریشان کر رہی ہے تو ماما سے شیئر کرو بیٹا'' وہ نہایت نرمی و حلاوت سے بول رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے تھے۔

''ماما۔پیپرز کی ٹینشن ہے۔'' وہ بمشکل بولی تھی کہ کچھ تو کہنا ہی تھا کہ اصل الجھن تو وہ ماں سے کہہ نہیں سکتی تھی کہ ہفتہ بھر پہلے جو کارنامہ سرانجام دے چکی تھی وہ کس منہ سے بتاتی......؟ اوپر سے شاہ زیب بھی ہفتہ بھر سے غائب تھا نہ کال کی تھی اور نہ ہی کوئی ٹیکسٹ ہی کیا تھا اور اس کی ہدایت کے مطابق وہ بھی ٹیکسٹ نہیں کر سکتی تھی اس لیے ہر وقت جلتی کڑھتی رہتی تھی۔کبھی شاہ زیب کا رویہ اسے پریشان کرنے لگتا تھا تو کبھی اس کا کارنامہ یاد آتا تھا تو وجود میں عجیب بےقراری سی دوڑ جاتی تھی اور ہراساں الگ ہو جاتی تھی کہ ماما، پاپا کو پتہ لگ گیا تو کیا ہوگا۔

''پریشان ہونے والی تو کوئی بات نہیں ہے عریم! ایگزامز کی تیاری کرو اور اچھے سے پیپرز دو'' وہ بیٹی کا ہاتھ تھام گئی تھیں اور اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے بمشکل مسکرا کر ماں کی طرف دیکھا تھا۔

''جی ماما'' وہ بدقت تمام بولی تھی۔

''آئی تھنک ،اس فرائیڈے کو ہے نا تمہارا فرسٹ پیپر؟'' وہ بیٹی کو رونے کو مچلتے دیکھ کر نرمی سے پوچھ گئی تھیں اپنے خدشات فی الحال اس سے نہ کہے تھے نہ ہی کچھ دریافت کیا تھا۔

''جی ماما!'' وہ ماں کی نگاہوں سے جز بز ہوتی دھیمے سے اقرار کرگئی تھی۔

''اٹھو کمرے میں جاؤ اور پوری یکسوئی سے پڑھائی کرو۔فی الحال ہر ٹینشن کو ذہن سے نکال دو کہ اگر رزلٹ خراب آیا تو تمہارے پاپا غصہ ہوں گے اس لیے اس وقت صرف ایگزامز کی فکر کرو باقی ہر ٹینشن بھول جاؤ۔'' وہ بیٹی سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھیں مگر اسے بتانے پر آمادہ نہ دیکھ کر موضوع ہی نہیں چھیڑا تھا اور وہ ماں کی بات پر اثبات میں سر ہلاتی اٹھ گئی تھی ان سے یہ نہیں کہہ سکی تھی کہ تین دن بعد پیپر ہے اور اس کی تیاری نہ ہونے کے برابر ہے۔

''شاہ! آپ نے مجھے کہاں پھنسا دیا ہے۔'' وہ تکیہ میں منہ دیئے سسک اٹھی تھی۔

☆......☆......☆

''میں ٹھیک ہوں آئیکت۔آپ کیسے ہیں؟'' اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ دروازے پر ابسام ہوگا۔دونوں کی نگاہیں چار ہوئی تھیں اور بے بسی سے جھک گئی تھیں۔آبدار نے لاپروائی سے کاندھے پر جھولتے دوپٹہ کو سلیقہ سے سر تک لیا تھا اور اس نے دانستہ اس کی جانب دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''آئیکت کی کال ہے وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' اس نے نظر اٹھا کر خوبرو ابسام حیدر کی جانب دیکھا تھا اور خاموشی سے سیل فون تھام لیا تھا وہ محض ایک نظر اس کے یکدم مضطرب ہوجانے والے چہرے کو دیکھتا مڑ گیا تھا اور اس نے مری مری سی آواز میں ''ہیلو'' کہا تھا دوسری جانب بڑی بے قراری سے اس کی خیریت دریافت کی گئی تھی اور اس نے ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اپنی خیریت کی اطلاع دے کر اخلاقیات نبھاتے ہوئے اس کی خیریت دریافت کرلی تھی۔

''تم بن اداس اور بہت ادھورا ہوں۔'' وہ اپنے مخصوص دلربا انداز میں بولا تھا۔موبائل آبدار کے ہاتھ میں لرز کر رہ گیا تھا اور وہ لب کچلنے لگی تھی۔

''گھر میں سب کیسے ہیں آئیکت۔کیا کوئی مجھے یاد کرتا ہے۔'' وہ محض بات بدلنے کو پوچھ گئی تھی۔

''گھر میں سب ٹھیک ہیں۔شاہ زیب ملک سے باہر ہے تب ہی میں اتنی آزادی سے تم سے بات کررہا ہوں۔'' وہ موضوع بدلنے پر بدمزہ تو ہوا تھا مگر ظاہر نہیں کیا تھا۔

''شاہ زیب بھیا کہاں اور کیوں گئے ہیں؟'' وہ اپنے آنسو روکتے ہوئے پوچھ گئی تھی۔

''آفیشل ٹرپ ہے۔دو چار ہفتوں میں واپس آجائے گا۔اس کی غیر موجودگی کا بہت زیادہ نہیں مگر تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہوا ہے۔ میں نے اپنے اور تمہارے باہر جانے کے انتظامات کافی حد تک مکمل کرلیے ہیں۔'' وہ دھیمے سروں میں تفصیلات سے آگاہ کررہا تھا کہ شاہ

زیب کی کڑی نظر تھی اس لئے وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قاصر تھا مگر وہ اب خود تو نہیں تھا مگر جانتا تھا کہ اس کے کچھ آدمی اس پر اب بھی نظر رکھے ہوئے ہیں اس لیے کافی محتاط انداز میں وہ سارے انتظامات کر رہا تھا۔ وہ آبدار کو وہ تفصیل بتا رہا تھا جس کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

''آئیکت۔ مجھے سب گھر والے خاص کر ماما بہت یاد آتی ہیں۔'' وہ سسکی تھی۔

''میں تمہاری تکلیف سمجھتا ہوں آپی، بس کچھ دن کی تکلیف ہے میں بہت جلد تمہیں باہر لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔'' اس کا رونا کہاں برداشت ہوا تھا اسے نہ رونے کی ہدایت کرتے ہوئے بھرپور انداز میں تسلی دی تھی۔

''آپ مجھے باہر لے جانے میں، میرا مستقبل بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے آئیکت، مگر میرے اپنوں کو مجھ سے کیسے ملائیں گے۔ میں نے ہر رشتہ کھو دیا ہے۔'' وہ بلکنے لگی تھی۔

''آپی! ڈونٹ کرائے پلیز، بھروسہ رکھو مجھ پر ایک دن سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہارے کھوئے رشتے بھی تمہیں مل جائیں گے۔'' وہ مضطرب سا اسے دلاسہ دے رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں آئیکت ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میرے نصیب میں اپنوں کا ساتھ، رشتوں کا سکھ لکھا ہی نہیں ہے، میں بچپن سے اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کے ساتھ کو ترستی رہی ہوں اور گھر سے بھاگ کر وہ نام نہاد آدھے، ادھورے رشتے بھی مجھ سے روٹھ گئے ہیں میں بہت بدنصیب ہوں، میرے پاس کچھ نہیں ہے، بھری دنیا میں، میں بالکل اکیلی ہوں۔ ایک رشتہ نہیں ہے میرے پاس، کوئی اپنا نہیں ہے۔'' وہ بری طرح بلکتے ہوئے بول رہی تھی وہ آگے سے بہت چاہ کر بھی کچھ نہیں بول پایا تھا کہ آبدار نے ٹھیک ہی تو کہا تھا وہ حرماں نصیب اتنے ڈھیروں رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی آج غیروں کے رحم وکرم پر پڑی تھی۔

''تم رونا بند کر دو، میرا وعدہ ہے تم سے، میں تمہیں تمہارا حق، تمہارے رشتے ایک دن ضرور دلا کر رہوں گا۔'' وہ اسے ڈپٹ کر عزم سے بولا تھا اس کے دلاسہ پر وہ مزید بلک اٹھی تھی۔

''میرے پاس ہمیشہ سے ایک رشتہ رہا دوست کا اور وہ بھی مجھے لگتا ہے میں ایک دن کھو دوں گی۔'' وہ لائن کاٹتے ہوئے بلکتے ہوئے سوچ رہی تھی جبکہ دوسری جانب آئیکت بہت پریشان ہو چکا تھا۔

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

''آپ نہ میری کال ریسیو کر رہے ہیں، نہ میرے کسی ٹیکسٹ کا رپلائی کر رہے ہیں۔ میں آپ کی کال کی منتظر ہی رہی شاہ، ایسا کیوں کر رہے ہیں پلیز کال می۔'' مستقل بیل بج رہی تھی اس نے ایک بار ''عریم کالنگ'' دیکھ کر موبائل سائیڈ پر ڈال دیا تھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا تھا۔ موبائل بج، بج کر یکدم خود ہی خاموش ہو گیا تھا۔ کافی دیر بعد میسج ٹیون سنائی دی تھی جسے وہ کال کی طرح نظر انداز کر گیا تھا اور گھنٹہ بعد جب اپنے کام سے فارغ ہوا تھا موبائل اٹھا کر انبوکس اوپن کیا تھا عریم کے لاتعداد میسجز تھے۔ اسے آسٹریلیا آئے آج کوئی گیارہواں دن تھا یعنی عریم سے بات کئے پورے بارہ دن ہو گئے تھے اس نے کچھ سوچ کر عریم کو کال بیک کی تھی۔ تیسری کال پر کال ریسیو ہوئی تھی، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، وہ بول پڑا تھا۔

''بکواس کی تھی میں نے کہ مجھے کال اور ٹیکسٹ کر کے پریشان مت کرنا۔'' اس کے ''ہیلو'' کے بعد غصہ و ناگواری سے بولا تھا۔

''آپ ایسے کیوں بول رہے ہیں میرا کال کرنا یا میرے ٹیکسٹ آپ کو پریشان کب سے کرنے لگے؟'' وہ تو پہلے ہی نڈھال تھی اب تو گویا مرنے والی کیفیت تھی۔

''ہر بات کا الٹا مطلب نکالا کرو تم، بکواس کی تھی میں نے کہ آفیشل ٹرپ ہے، بزی ہوں گا، اس لئے رابطہ نہیں کر پاؤں گا، اہم میٹنگ میں تھا اور تمہاری کال پر کال آ رہی تھی۔ یہی اہمیت ہے میری بات کی تمہاری نظر میں......'' وہ اس کی پریشانی کو خاطر میں لائے بناء اس پر برس رہا تھا۔

''آپ کی بات کی اہمیت ہی ہے شاید جو پورے گیارہ دن بعد آپ کو کال کی ہے وہ بھی اس لئے کہ پاپا میری شادی کر رہے ہیں۔'' وہ سسکی تھی اور وہ یکدم مضطرب ہو گیا تھا۔

''شادی کر رہے ہیں کیا مطلب، سمجھایا تو تھا تمہیں کہ تم صاف انکار کر دینا۔'' وہ بے چینی چھپائے بھڑک کر بولا تھا۔

''سب کچھ ویسے نہیں ہو سکتا شاہ! جیسے آپ کہیں گے یا آپ چاہیں گے۔''

''مطلب کیا ہے تمہاری بات کا۔'' غصہ سے عریم کی بات کاٹ دی تھی سیل فون کان سے لگا تھا اور اس نے دراز کھول کر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا تھا۔

''مطلب صاف ہے شاہ! میں نے انکار کیا تو پاپا بہت خفا ہوئے اور انہوں نے اسی ویک انگیج منٹ اور نیکسٹ منتھ شادی کی ڈیٹ فائنل کر دی ہے، پاپا میری نہیں سن رہے، ماما سے آج مجھے بہت ڈانٹ پڑی ہے، میرے انکار پر ماما نے......'' وہ تفصیل سے بتاتے ہوئے یکدم ہچکیوں سے رونے لگی تھی جبکہ وہ کافی مطمئن سا سگریٹ کے کش پر کش لگاتا جا رہا تھا۔

''تم روؤ نہیں ہنی! ماما سے ڈانٹ پڑ گئی اس میں اتنا رونے والی کیا بات ہے یار، میں خود آج تک ماما سے ڈانٹ کھاتا رہتا ہوں۔'' وہ

دھواں فضا میں آزاد کرتا یوں نارملی بولا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

''ماما نے جسٹ ڈانٹا نہیں ہے مجھے شاہ، ماما نے مجھے، اپنی عریم کو تھپڑ مارا'' اس کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔ لمحہ بھر کو وہ چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

''میری وجہ سے ایک لڑکی کو کیا کچھ فیس کرنا پڑ رہا ہے۔'' اس نے ندامت و کرب سے سوچا تھا اور اس کی سسکیاں شاہ زیب کی ندامت میں اضافہ کر رہی تھیں اسے خود کو کمپوزڈ کرنے میں کافی ٹائم لگ گیا تھا۔

''آج انکار پر پڑا ہے تھپڑ، کل جو ماما اور پاپا کو آپ کے بارے میں، ہمارے رشتے کے بارے میں پتہ لگے گا تو پاپا مجھے جان سے مار دیں گے۔'' وہ خاموش تھا خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہو گا ہنی! یو ڈونٹ وری۔'' وہ بمشکل بولا تھا۔

''ایسا ہی ہو گا اور آپ کو تو پتہ بھی نہیں لگے گا، آپ کے پاس مجھے کال کرنے کا تو کیا میرا ایک ٹیکسٹ کا آنسر کرنے کا وقت نہیں ہوتا میرے جنازے میں شرکت کا کیا وقت ملے گا آپ کو'' وہ بری طرح بلک رہی تھی اور اس کی جذباتیت اس کی ندامت کو بڑھا گئی تھی کہ وہ جو اس کے ساتھ کر چکا تھا اس سے زیادہ برا کرنے والا تھا اس کی ہی پلاننگ کر رہا تھا وہ کچھ دیر پہلے اسی لحاظ سے اس وقت خود پر کنٹرول کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کچھ بھی تھا، کچھ بھی کرنے جا رہا تھا وہ یہ سب کرنا نہیں چاہتا تھا اس کے اندر کی اچھائی اسے بے چین کر رہی تھی مگر وہ اپنی اچھائی کو از خود شکست دینا چاہتا تھا۔

''فضول بکواس بند کرو عرمی، میں پہلے ہی بہت ڈسٹرب ہوں تم میری مشکلوں اور مت بڑھاؤ'' وہ بے بسی سے چیخ پڑا تھا۔

''آپ کی مشکل تو میں ہی ہوں جب ہی آپ نہ کال کرتے ہیں، نہ کال ریسیو کرتے ہیں مگر آپ سن لیں شاہ، میں بہت کمزور ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ پاپا میری شادی کروا دیں گے۔'' اس کے رونے میں ذرا بھی کمی واقع نہ ہوئی تھی۔

''دماغ خراب ہے تمہارا۔ ایسے کیسے تم میرے نکاح میں ہوتے ہوئے کسی اور سے شادی کرلو گی۔'' وہ بھڑک کر چیخا تھا۔

''نکاح پر نکاح میں بھی نہیں کرنا چاہتی مگر میں کچھ نہیں کر پا رہی، پاپا میری نہیں سن رہے شاہ، آپ آ جائیں پلیز۔ آپ پاپا کو سب آ کر بتا دیں ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' اس کے رونے میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم ریلیکس رہو، ابھی کسی پر کچھ بھی شو مت کرنا۔ مجھ سے رابطے میں رہنا۔ میں اسی ہفتے پاکستان واپس آ رہا ہوں۔ اپنے پیرنٹس سے بات کر کے انہیں تمہارے گھر لے آؤں گا۔'' وہ پھر اُسے خواب دکھا رہا تھا۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں شاہ۔'' وہ اس کی بات کاٹ کر بے قراری سے بولی تھی۔

''ہاں۔'' اس نے دکھتے سر کو بائیں ہاتھ سے پش کرتے ہوئے ایک لفظی جواب دیا تھا۔

''آپ کے پیرنٹس نہیں مانے تو......'' وہ خدشات کا شکار تھی۔

''میں منا لوں گا تم پریشان نہ ہو اور پلیز کوشش کر کے تم شادی کو التواء میں ڈال دو، منگنی کر لو بس، اتنے عرصہ میں، میں بھی اپنے پیرنٹس کو منا لوں گا۔'' وہ دھیمے سے اسے سمجھا رہا تھا۔

''میں کچھ نہیں کر سکتی ہوں شاہ کہ میرے بار بار انکار سے پاپا شک کا شکار ہو گئے ہیں۔ ماما مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ اس انکار کے پیچھے کوئی لڑکا ہے تو میں بتا دوں، میرا دل کر رہا تھا میں آپ کا نام لے دوں مگر آپ نے مجھے روکا ہوا ہے آخر میں کروں تو کیا کروں۔'' وہ پھر رونے لگی تھی۔

''ابھی میرے بارے میں کسی کو پتہ نہیں لگنا چاہیے عرمی، ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا، تم کچھ سمجھداری سے کام لو، کہہ رہا ہوں نا منگنی کر لو اپنے پیرنٹس کا اعتماد بحال کر دو۔'' وہ اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

''میں کوشش کروں گی شاہ۔ بس آپ اپنے پیرنٹس کو لے آئیں پلیز، آپ کو ہماری محبت کا واسطہ ہے۔'' وہ بچوں کی طرح سسکتے ہوئے بولی تھی اور اس نے کچھ دیر اسے سمجھانے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''ایسا کیا کروں کہ بات صرف منگنی تک محدود رہے۔'' وہ اپنے لئے کافی بناتے ہوئے سوچ رہا تھا اور مستقل سوچتے رہنے سے بالآخر ایک آئیڈیا اس کے ذہن میں کلک ہوا تھا اور وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

''محمود خان، تمہیں برباد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا، جو ذلتیں تمہارے سبب اور کزئی خاندان کا مقدر بنی تھیں تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی اور وہ ذلتیں لوٹ کر تمہارے وجود سے لپٹ جائیں گی یہ میرا شاہ زیب اورکزئی کا وعدہ ہے تم سے۔'' اس نے کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے نفرت وحقارت سے سوچا تھا۔

☆......☆......☆

''موحل! کیا تم مجھے مس کرو گی۔'' جب سے عبیر عباسی کو موحل کے پاکستان جانے کا پتہ چلا تھا وہ کافی مضطرب تھا اور آج اسپیشلی اس سے ملنے کے لئے احمد کاٹیج آیا تھا وہ جو اس کو دیکھ کر کرسی کھسکا کر اٹھی تھی وہ اس کے سامنے آ کر آزردگی سے سوال کر گیا تھا۔

''ابھی موحل احمد کا دماغ خراب نہیں ہوا کہ وہ ہرا یرے غیرے کو یاد کرتی پھرے۔'' وہ دو قدم پیچھے لے کر یقینی تصادم سے بچتی نہایت ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تھی اس کا چہرہ یکدم تاریک ہو گیا تھا اور کچھ فاصلے پر موجود نوائم تاسف سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''تم اتنی بے حس کیوں ہو موحل، آخر تمہیں میری محبت نظر کیوں نہیں آتی۔'' وہ اس کا بازو جکڑے بے بسی سے سوال کر رہا تھا۔

''اپنی حد میں رہو عبیر۔'' وہ اس کا ہاتھ جھٹکتی دبے دبے انداز میں غرائی تھی۔ اس وقت لان میں وہ دونوں ہی تھے نوائم انہیں چھوڑ کر اندر جا چکی تھی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان دونوں نے اکیلا ہی رہنا تھا کوئی بھی کسی بھی وقت وہاں آ سکتا تھا ایسے میں عبیر کا اقدام اس کو

سخت غصہ میں مبتلا کر گیا تھا کہ عبیر کو خیال نہ ہوگا مگر اسے نہ صرف اپنی، اپنے گھر والوں کی عزت کا بھی خیال تھا تب ہی ناگواری سے فاصلے پر جاتی غصہ سے اسے حد میں رہنے کی تنبیہہ کر گئی تھی۔

''اب تک میں اپنی حد میں ہی رہا ہوں موحل، تم نے میرے جذبات کی ہمیشہ توہین کی، مجھے دھتکارا اور میں نے تمہاری محبت میں سب کچھ برداشت کر لیا مگر اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ تمہیں میری انسلٹ کرنے کا پرمٹ حاصل ہو چکا ہے۔'' وہ اس کے غصہ سے خائف ہوئے بناء نہایت درشتگی سے اس کا بازو جکڑے آنکھوں میں ناگواری و غصہ لئے اس کے صبیح چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''میں نے تم سے نہیں کہا کہ تم اپنی انسلٹ کرواؤ۔ جب ایک بار کہا تم سے نہیں محبت، تو تم پیچھے کیوں نہیں ہٹ جاتے۔'' وہ اس کے تیوروں سے خائف تو ہوئی تھی مگر ظاہر نہیں کیا تھا اور اس سے زیادہ ناگواری سے بولی تھی۔

''یہ معمولی سا سوٹ لینے اور نہ لینے کا فیصلہ نہیں ہے کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں، محبت کرتا ہوں تم سے ڈیم اٹ، اور میری محبت تمہاری بےزاری و نفرت سے مزید بڑھتی ہے، گھٹتی نہیں ہے۔ تم ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے لیے اہم سے اہم تر ہوتی جا رہی ہو۔'' وہ اس کا بازو چھوڑتے ہوئے جذبوں سے چور لہجے میں بولا تھا وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''تم اپنی محبت سے باز نہیں آنا چاہو تو تمہاری مرضی ہے عبیر، کہ یاد رکھنا تم زبردستی میرے دل میں اپنی محبت نہیں ڈال سکتے۔'' وہ ایک تیز نظر اس پر ڈالتی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی اور وہ ساکت کھڑا رہ گیا تھا۔

''زبردستی نہ کر سکتا ہوں، نہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو بس کوشش کرتا ہوں اور کوشش ترک نہیں کر سکتا۔'' وہ آزردگی سے سوچتا جیسے آیا تھا ویسے ہی واپس چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

''پاپا، میں موحل سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' کبیر عباسی اپنے اکلوتے بیٹے کو متحیر سے دیکھ رہے تھے اور وہ دھیمے لہجے میں گہری سنجیدگی میں ان سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کر کے جلد از جلد شادی پر زور ڈال گیا تھا۔ وہ بیٹے کی بات غور سے سننے کے بعد اس کی جلدی کی گردان پر مسکرا دیئے تھے۔

''یو ڈونٹ وری، میں بہت جلد عقیل سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔'' انہیں بیٹے کی پسند پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ موحل دیکھی بھالی لڑکی تھی ان کی تو خود دلی خواہش تھی کہ ان کے دوست کی بیٹی ان کی بہو بنے اور دوستی کا رشتہ کچھ اور مضبوط ہو جائے۔ وہ باپ کے اقرار پر کھل سا گیا تھا۔

''بہت جلد کیوں پاپا۔ میں چاہتا ہوں آپ کل ہی انکل سے بات کر لیں۔'' وہ کرسی سے اٹھ کر باپ کے پاس ان کے قدموں میں آن بیٹھا تھا۔

''کیا بات ہے میرے بیٹے کو شادی کی اتنی جلدی کیونکر ہوگئی ہے۔'' کبیر عباسی بے تکلفی سے قدرے شریر انداز میں بیٹے کو دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

''پاپا! میں مومل کو بہت چاہتا ہوں۔ اس کو کھونے سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ وہ پاکستان جارہی ہے اور میرا دل بند ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ جب پاکستان جائے تو اس سے میرا ایک مضبوط، بہت گہرا رشتہ ہو۔ وہ وہاں جا کر مجھے بھول نہ جائے۔'' وہ جذباتی انداز میں بہت کچھ کہنے کی چاہ میں بے ربط ہوا جا رہا تھا۔ کبیر عباسی نے بارہا اس کی دلچسپی مومل میں صاف محسوس کی تھی آج اس کے واضح اظہار اور حد درجہ بے تابی دکھانے پر وہ کچھ مسرور بھی ہوئے تھے اور قدرے متفکر بھی ہو کر رہ گئے تھے۔

''مومل کی تمہارے بارے میں کیا رائے ہے۔ تمہارے جذبات یکطرفہ ہیں یا دونوں طرف پسندیدگی کے جذبات کارفرما ہیں۔'' انہوں نے بیٹے کے گھنیرے بالوں والے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نرمی سے استفسار کیا تھا اور اس نے کچھ سوچ کر باپ سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔

''پاپا! میں مومل سے محبت کرتا ہوں لیکن مومل کے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا تھا جس کا چہرہ یکدم ہی تاریک ہو گیا تھا۔

''مومل کے دل میں جب ایسی کوئی بات نہیں ہے تو رشتہ ڈالنا ٹھیک رہے گا؟'' وہ بیٹے کے اترے چہرے کو دیکھ کر سوال کر گئے تھے۔ وہ باپ کے قدموں کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''پاپا! میں تو محبت کرتا ہوں نا، اور مومل کے دل میں اپنی شبیہ اتارنے کی ہر ممکن کوشش کی اسے اپنی محبت کا مگر یقین دلانے میں ناکام ٹھہرا ہوں۔ مگر ایک بار اپنی قسمت آزمالینا چاہتا ہوں۔''

انہیں اپنے بیٹے کا لہجہ بھیگا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ بیٹے کی پشت دیکھتے گہری سانس بھر کر کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''آپ انکل سے بات کریں شاید دل میں کندہ نام ہی ہاتھوں کی لکیروں میں بھی جگمگا رہا ہو اور دل کی خواہش تقدیر کے ہاتھوں گزرتی پوری ہو جائے۔'' وہ خود کو کمپوز کرتا باپ کی جانب رخ کر گیا تھا۔

''مومل کسی کو پسند کرتی ہے۔'' کچھ سوچ کر وہ پوچھ گئے تھے۔

''پاپا، وہ بس مجھے ناپسند کرتی ہے۔ وجہ آج تک جان نہیں سکا۔ اور اگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو تو میں اس کی خوشی کے لئے اپنی ہر خوشی تیاگ دیتا مگر مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی کو پسند نہیں کرتی، عبیر عباسی کو بھی نہیں۔ اور صرف اسی بات نے مجھے قسمت آزمانے پر اکسایا ہے کہ اگر وہ کسی کو پسند کرتی تو میں کبھی آپ کو پرپوزل لے جانے کا نہ کہتا۔'' وہ قدرے یاسیت سے بولا تھا اور انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''یو ڈونٹ وری، میں کل ہی عقیل سے بات کرتا ہوں اور مجھے پوری امید ہے اقرار ہی ہوگا کیونکہ میرا بیٹا ہر لحاظ سے اتنا قابل اور

پرفیکٹ ہے کہ اسے آنکھ بند کر کے اپنا داماد بنایا جا سکے۔'' وہ نہایت سچائی وفخر سے مسکرائے تھے۔

''پاپا، آپ کو تو میں اچھا ہی لگوں گا آپ کا بیٹا جو ہوں۔'' وہ باپ کو پر یقین دیکھ کر نرمی سے مسکرایا تھا۔

''اوہوں۔ بٹ دیکھ لینا کہ عقیل انکار نہیں کرے گا کہ وہ بھی تمہاری تعریفوں میں اکثر رطب السان رہتا ہے۔'' ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی اور وہ جھینپ گیا تھا۔ کبیر عباسی نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا کہ عقیل احمد کی پوری فیملی ماسوائے مومل کے عبیر عباسی کو پسند کرتی تھی۔ عقیل احمد کو دوست اور اس کے بیٹے پر بھروسہ تھا تب ہی وہ اتنے دھڑلے سے ان کے گھر آیا جایا کرتا تھا وگرنہ وہ کافی محتاط طبیعت انسان تھے۔

''اوکے پاپا۔ میں کمرے میں جا رہا ہوں اسائنمنٹ فائنل کرنا ہے آپ کل ہی انکل سے بات کر لیں اور منگنی سے زیادہ نکاح پر زور دیجیے گا اور شادی مومل کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد......'' وہ بیٹے کو دیکھ کر رہ گئے تھے کہ ابھی رشتہ ڈالنا تھا اور وہ سارے فیصلے ہی کرتا جا رہا تھا۔ انہوں نے بیٹے کو نہ ٹوکا تھا۔ نہ تصحیح کی تھی صرف خیر مقدمی مسکراہٹ چہرے پر سجالی تھی اور دل ہی دل میں بیٹے کے لئے دعا کرتے اس کے جانے کے بعد واپس چیئر پر آ بیٹھے تھے اور کتاب اٹھالی تھی کہ دس سے گیارہ کا وقت وہ اسٹڈی روم میں ہی گزارا کرتے تھے کہ کتاب ان کی ہمیشہ بہترین دوست رہی تھی۔

☆......☆......☆

''ماما! مجھے منگنی پر اعتراض نہیں ہے جب پاپا چاہیں میری منگنی کر دیں بس میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' آج اس کا لاسٹ پیپر تھا اور دو دن بعد اس کی خالہ زاد فارس نقوی سے منگنی تھی اور اگلے ماہ میں شادی کا ارادہ تھا۔

''ہوگا وہی جو تمہارے پاپا چاہتے ہیں اس لئے فضول کے واویلے کرنا چھوڑ دو۔'' وہ تھکے ہوئے انداز میں بول گئی تھیں کہ محمود خان ایک حاکم پسند طبیعت کے مالک تھے ان کے ساتھ انہوں نے زندگی جبر مسلسل کی مانند گزاری تھی۔ وہ کبھی محمود خان سے اپنی کوئی بات نہیں منوا پائی تھیں جو اپنے لئے کچھ نہیں کر پائی تھیں بیٹی کے لئے بھی کرنے سے از حد قاصر تھیں۔ بیٹی کے انکار پر وہ اس پر ہاتھ تک اٹھا چکی تھیں جس کا انہیں بے حد افسوس تھا اور اس وقت اس کی بے چارگی سی محسوس کر کے وہ گہری اذیت میں خود کو ڈوبتا محسوس کر رہی تھیں کہ کیسی ماں تھیں اولاد کی خوشی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

''ماما! میں خود بھی کب پاپا کے خلاف جانا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ وہی کیا جو پاپا نے چاہا۔ میں تو شادی بھی پاپا کی پسند کے لڑکے سے ہی کروں گی بس اتنی جلدی نہیں کم از کم میرا گریجویشن تو مکمل ہو جائے۔'' اس کے آنسو گرنے لگے تھے اور انہوں نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا تھا۔

''میں تمہارے پاپا سے بات کروں گی۔'' ان کی آواز بھیگ گئی تھی۔

''تم رونا بند کر دو اور خوش رہا کرو، دن بہ دن صحت خراب ہو رہی ہے تمہاری۔'' انہوں نے بیٹی کے آنسو صاف کیے تھے اور وہ لب

کچلنے لگی تھی۔ایگزامز کی ٹینشن اور شاہ زیب کی لاتعلقی نے اسے صحیح معنوں میں مضطرب کیا تھا وہ شاہ زیب کا عجیب وغریب رویہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ کہاں تو وہ اس سے ملنے اور بات کرنے کے لئے بے چین رہتا تھا اور اب فون تک نہیں کر رہا تھا کتنی بے قراری ظاہر کر کے اس سے نکاح کیا تھا اس پر چاہتیں نچھاور کی تھیں اپنے قرب سے نوازا تھا اور وہ ساری چاہتیں اور بے قراریاں یکدم کہیں جا سوئی تھیں وہ اس کو کال کرتی تھی تو بزی ہوں کا نعرہ لگا تا رہتا تھا ٹیکسٹ کا گھنٹوں بعد رپلائی کرتا تھا وہ جو اس کی وارفتگیوں کی عادی تھی اس کی بے رخی سہنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔گلابی چہرہ دن بہ دن زرد پڑتا جا رہا تھا مگر شاہ زیب کو کہاں پرواہ تھی وہ تو جیسے اسے اپنا بنا کر بھول ہی گیا تھا۔

’’تم تیار ہو جاؤ کچھ ضروری شاپنگ کرنی ہے اور واپسی میں تمہیں پالر جانا ہے کہ دو دن بعد منگنی ہے اور تم نے ایگزامز کی ٹینشن میں شکل ہی بگاڑی ہوئی ہے۔‘‘وہ اس کے آنسو صاف کرتیں خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولی تھیں اور اس نے جانے سے صاف منع کر دیا تھا۔

’’تم ہر بات میں بہت ضد کرنے لگی ہو عریم۔‘‘انہوں نے بیٹی کو ناگواری سے گھورا تھا وہ قدرے خفیف ہو گئی تھی۔

’’تم دن بہ دن کافی چینج ہو رہی ہو ہر بات کی توجیہ مانگتی ہو، ہر بات سے انکار کرتی ہو، بحث کرتی ہو تمہارے پاپا کو یہ سب پسند نہیں اس لئے محتاط ہو جاؤ۔‘‘وہ کافی عرصہ سے بیٹی میں بدلاؤ محسوس کر رہی تھیں آج کافی کڑے انداز میں اسے تنبیہ کر گئی تھیں اور اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے کانوں میں یکدم شاہ زیب کی آواز گونجی تھی۔

’’بچوں کی طرح بی ہیو بالکل نہ کرنا عریم، تم نے سمجھ داری سے کام لینا ہے تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔‘‘اس نے لب بھینچ لئے تھے کہ دھیرے دھیرے اسے شاہ زیب کی باتیں یاد آنے لگی تھیں اس لئے ٹہلتے ہوئے رک کر موبائل چیک کیا تھا۔

’’نہ کال، نہ میسج ......آپ جانے کیوں مجھے اس طرح اگنور کر رہے ہیں۔‘‘بے دلی سے موبائل بیڈ پر اچھالتے ہوئے اس نے دلگرفتگی سے سوچا تھا اور آزردگی سے جانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

’’آنٹی نے بالکل درست جانب میری توجہ دلائی ہے، میں کرتا ہوں آپی کے ایڈمیشن کا انتظام۔‘‘آبدار آج کل اپنے جذبوں کی وجہ سے آئیکت سے خائف وکترائی، کترائی سی رہنے لگی تھی اس لئے فضہ حیدر کے مشورہ پر دل ودماغ کو جھکتا محسوس کرنے کے باوجود اس نے آئیکت سے بات نہیں کی تھی اور ابسام اس کی حالت وکیفیت سے انجان تھا جب فضہ حیدر نے اس سے ذکر کیا تھا تو اسے بھی ماں کا مشورہ انتہائی مناسب لگا تھا اسی لئے آج اس نے چند باتوں کے بعد آئیکت سے ماں کا مشورہ کیا تھا آئیکت کو جو انتہائی مناسب لگا تھا اور اس نے پہلی فرصت میں آبدار کا ایڈمیشن کروانے کی حمایت کر دی تھی۔

’’ویسے تم نے سوچا کیا ہے تقریباً چار ہفتوں سے زائد ہو گئے ہیں۔‘‘اس نے دھیمے سے پوچھا تھا اور آئیکت دوست کو دیکھنے لگا تھا۔

’’میں کوشش میں تو لگا ہوں مگر کر کچھ بھی نہیں پا رہا کہ شاہ زیب نے بابا جان اور تایا ابو کے ذہن میں بھی شک بٹھا دیا ہے۔میں بینک

سے ذرا بھی رقم نکلواتا ہوں تو بابا جان باز پرس کرنے لگتے ہیں ایسے میں، میں باہر جانے کے انتظامات نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ میں تو شہر سے باہر جانے سے بھی قاصر ہوں۔ آپی کی بہت فکر ہے۔ اندازہ ہے زیادہ عرصہ تمہارے گھر رہنا بھی مناسب نہیں مگر میں کچھ نہیں کر پا رہا۔ دھیرے دھیرے مشکلات میں پھنس رہا ہوں کہ شاہ زیب کی نظر سے بچنا میرے لئے از حد مشکل ثابت ہو رہا ہے۔'' آئیکت نے تمام تر تفصیلات و پریشانی سے دوست کو آگاہ کیا تھا۔

''بات ہے تو بہت پریشانی والی مگر تم پریشان نہ ہو کچھ مہینوں تک حالات سازگار ہو ہی جائیں گے اور جہاں تک بات میرے گھر رہنے کی ہے مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے کہ ماما نے آبدار کو بیٹی بنالیا ہے، ماما کو پرابلم نہیں تو مجھے پرابلم ہو ہی نہیں سکتی۔'' اس نے صاف گوئی سے یہ بات کہی تھی آئیکت یکدم خود کو پرسکون محسوس کرنے لگا تھا۔

''میں تیرا، تیری فیملی کا بے حد احسان مند ہوں کہ اس کڑے وقت میں تم نے میری مدد کی۔'' آئیکت دوست کو مشکور نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

''اپنے جذباتی ڈائیلاگ تو لڑکیوں کے سامنے بولا کر مجھے تو معاف ہی رکھ۔'' ابسام دوست کو گھورتے ہوئے بولا تھا۔

''میری ایسی قسمت کہاں کہ میری زندگی میں لڑکیوں کی بھرمار ہو، میں تو فقط ایک لڑکی پر تکیہ کیے بیٹھا ہوں۔'' آئیکت نے لاچارگی سے کہا تھا۔

''شرم کرو کچھ۔ شریف لڑکوں کو ایسی چھچھوری باتیں زیب نہیں دیتیں۔'' ابسام کچھ اس انداز میں بولا تھا کہ وہ بے ساختہ قہقہہ لگا گیا تھا۔

''ایک تو تم اور تمہاری شرافت کی باتیں۔'' آئیکت نے معنی خیزی سے آنکھ دبائی تھی۔ ابسام کا چہرہ یکدم سرخ ہو گیا تھا۔

''اپنی بکواس بند کر کے دفع ہو جاؤ کہ کچھ دیر بعد میری میٹنگ ہے اور تم بے وقت نہ صرف نازل ہوئے، بے وقت کی بکواس بھی کیے جا رہے ہو۔'' ابسام نے خفت مٹانے کو اسے چلتے پھرتے نظر آنے کا الٹی میٹم دیا تھا۔

''مجھے تو مستقبل قریب میں صاف نظر آ رہا ہے کہ بھابھی تجھ سے نہیں، تو بھابھی سے شرما رہا ہوگا۔'' ابسام کے حسین چہرے پر جھنجھلاہٹ اس قدر بھلی لگ رہی تھی کہ آئیکت نے مزے سے چٹکلا چھوڑا تھا۔

''ہو گئی تیری بکواس۔'' اس نے لب بھینچ کر آئیکت کو دیکھا تھا اور وہ ہنستا ہوا پھر آنے کا کہہ کر چلا گیا تھا اور ابسام نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے فائلز اپنے آگے کر لی تھیں اور کام میں مصروف ہو گیا تھا کہ جب سے آبدار اس کے گھر میں رہ رہی تھی تب سے وہ خود بہت کم آئیکت کی طرف جاتا تھا وہی اس کے آفس اور گھر کا اکثر چکر لگا لیتا تھا یہ احتیاط صرف اس لئے تھی کہ ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو اس کا راز فاش کر دے اس لئے آج بھی آئیکت لنچ آورز میں ابسام کے آفس آ گیا تھا دونوں نے ساتھ لنچ کیا تھا ڈھیروں باتیں الگ۔ یہ الگ بات تھی کہ آئیکت پریشان تھا اور ابسام محض اسے جھوٹی تسلیاں دیتا رہتا تھا کہ ابسام خود نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ یہ

اونٹ آخر کس کروٹ بیٹھے گا؟

☆......☆......☆

''آپ پلیز فوراً گھر آ جائیں۔'' گھر کے لینڈ لائن نمبر سے کال آ رہی تھی جسے ریسیو کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ذرا بھی خیال نہیں گزرا تھا کہ کال آبدار کی ہو گی جو اس کے ہیلو کے جواب میں ترنت کچھ ایسا بولے گی جو اسے مضطرب کر دے گا۔

''آپ پلیز مجھے بتایئے کیا ہوا ہے؟ سب خیر تو ہے۔ ماما کہاں ہیں؟'' آبدار کا لہجہ بھیگا ہوا تھا اسی لئے پریشانی سی محسوس کر کے اس نے یکدم کتنے ہی سوال کر ڈالے تھے۔

''آنٹی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے آپ پلیز جلدی سے گھر آ جائیں۔'' وہ اس کی پریشانی محسوس کرتی اپنی ہتھیلیوں کو نم ہوتا محسوس کرنے لگی تھی۔اس نے ذرا فاصلے پر بیٹھیں فضہ حیدر کو بے چارگی سے دیکھا تھا اور ان کے ''کیری آن'' کے اشارے دیکھ کر وہ دھیمے سے منمنائی تھی۔

''ماما، صبح تک تو بالکل ٹھیک تھیں۔ اچانک کیا ہو گیا ہے؟'' وہ سیٹ سے اٹھ چکا تھا۔ بڑی عجلت میں گاڑی کی چابی اٹھائے باہر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا تھا۔

''بی پی ہائی ہے۔آپ کتنی دیر میں آ رہے ہیں۔'' وہ اس کی فکر پر ندامت سی محسوس کرنے کے باوجود منمنائی تھی۔

''میں آفس سے نکل رہا ہوں، ڈاکٹر کو بھی کال کر دوں گا۔آپ ماما کا خیال رکھیں پلیز۔ میں کچھ دیر میں پہنچ رہا ہوں۔'' وہ تقریباً بھاگتے ہوئے پورچ تک پہنچا تھا اور بڑی تیزی میں گاڑی کی طرف لپکا تھا۔

''ڈاکٹر کو میں نے کال کر دی ہے۔آپ بس جلدی سے آ جائیں۔'' آبدار نے دھیمے لہجے میں کہا تھا اس نے آگے سے کچھ کہنے کے بجائے لائن کاٹ دی تھی اور بڑی تیزی میں گاڑی نکالی تھی اور رش ڈرائیونگ کرتا وہ گھر پہنچا تھا۔ ہال کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔اس نے پہلا قدم رکھتے ہی ماں کو پکارا تھا۔

''ماما'' دوسرے قدم پر تھا کہ لائٹس آن ہو گئی تھیں۔ساتھ ہی گنگناہٹیں بھی۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو...... ہیپی برتھ ڈے ڈیئر ابسام، ہیپی برتھ ڈے......'' فضہ حیدر مسکراتے چہرے کے ساتھ کچھ فاصلے پر ٹیبل پر خوبصورت کیک سجائے صوفے کے نزدیک کھڑی تھیں ان کی دائیں طرف حیدر صاحب تھے جو مکمل بیوی کا ساتھ دیتے مسکراتے ہوئے گنگنا رہے تھے جبکہ بائیں طرف آبدار کھڑی تھی جس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور لب یوں باہم پیوست تھے کہ جیسے کبھی کھلیں گے ہی نہیں۔

وہ ان تینوں کو باری باری دیکھتا لپکتا ہوا ماں تک پہنچا تھا۔

''ماما! آپ ٹھیک ہیں۔'' وہ ماں کو شانوں سے تھامے بہت فکر مندی سے سوال کر رہا تھا۔

''مجھے کیا ہونا ہے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ایک دم فٹ۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں کھلکھلائی تھیں اور وہ ماں کو دیکھ کر یکدم آبدار کی جانب گھوما تھا۔

''آپ کو شرم آنی چاہیے۔اس طرح کی فضول حرکتیں آپ کو ہرگز بھی زیب نہیں دیتیں۔'' ابسام کا لہجہ انتہائی حد تک غصیلا تھا۔وہی نہیں وہ دونوں میاں بیوی بھی ساکت رہ گئے تھے۔

''ابسام! بی ہیو یور سیلف۔یہ تم آبدار سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔'' حیدر صاحب نے فوراً ہی بیٹے کو ناگواری سے ٹوکا تھا۔

''کیسے بات کر رہا ہوں پاپا۔انہوں نے میری جان نکال دی تھی۔میں کیسے یہاں تک پہنچا ہوں میں ہی جانتا ہوں۔انہوں نے تو بس کہہ دیا کہ فوراً آ جاؤں، ماما بیمار ہیں۔اس فوراً آنے میں تو میری دنیا ہی ہل کر رہ گئی۔آپ خود بتایئے اس طرح فون کرنا، ماما کی طبیعت کی ناسازی کا جھوٹ بولنا انہیں زیب دیتا ہے۔'' وہ بالکل مدھم نہیں پڑا تھا۔کچھ اور سختی سے بول رہا تھا اس کے مخاطب چاہے حیدر صاحب تھے مگر انداز و لفظ تو اسی کے لئے تھے۔اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''آئی ایم سوری......'' وہ منمنائی تھی۔

''سوری فار واٹ......کسی کی جان نکال دو اور سوری کر لو، آخر آپ نے ماما کی بیماری کا جھوٹ کہا کیوں۔'' وہ گویا اسے بخشنے کو بالکل تیار نہ تھا۔

''بس کر دو ابسام۔آبدار کی کوئی غلطی نہیں ہے یہ تو تمہیں کال کرنا چاہتی ہی نہیں تھی۔میرے کہنے پر کال کی اور وہی کہا جو میں نے آبدار کو کہنے کا کہا تھا۔غصہ کرنا ہے تو مجھ پر کرو کہ یہ سارا پلان ہی میرا تھا۔'' بپھرے ہوئے بیٹے کو بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے بولی تھیں اور اس نے لب بھینچ لئے تھے۔

''ماما! آپ نے بالکل اچھا نہیں کیا۔میں کتنا ڈر گیا تھا۔آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ ماں کو ناراضگی سے دیکھ رہا تھا۔آبدار نے اپنے آنسو رگڑے تھے اور جانے کو قدم بڑھائے تھے کہ حیدر صاحب نے اسے روک لیا تھا۔

''تمہاری ماما کو میں نے بھی بہت سمجھایا۔روکا کہ اس طرح تم پریشان ہو جاؤ گے بٹ تمہاری ماما کو تو سرپرائز دینے کا بھوت چڑھا تھا۔'' وہ روتی ہوئی آبدار کو دیکھ کر شرمندگی محسوس کرتے نہایت ناگواری سے بیوی کو دیکھتے تفصیل بتا گئے تھے اس نے نگاہ اٹھائی تھی وہ کچھ فاصلے پر کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔وہ جس پریشانی کے عالم میں گھر آیا تھا وہی جانتا تھا تب ہی وہ ماں کی گنگناہٹ پر بہت کچھ سمجھ لینے کے باوجود اس طرح ری ایکٹ کر گیا تھا اور اب شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

''آئی ایم سوری......'' وہ نہایت ندامت سے بولا تھا۔اس نے نگاہ اٹھائی تھی اور ابسام کی ندامت میں اضافہ ہو گیا تھا اس کی خوبصورت آنکھیں پانیوں سے بھری ہوئی تھیں اور سبب اس کی ذات تھی وہ آگے سے کچھ اور کہہ نہیں پایا تھا اور وہ ''اٹس اوکے'' کہہ کر نظر جھکا گئی تھی۔

''تم انتہائی بدتمیز ہوابسام۔تم نے میرا سرپرائز خراب کر دیا ہے اور میری اتنی پیاری بیٹی کو رلا دیا ہے۔'' وہ آبدار کو کاندھے سے لگائے ہوئے بیٹے پر خفا ہوئی تھیں۔

''میں بہت شرمندہ ہوں اور آبدار سے سوری کرتا ہوں۔ بٹ ماما آپ کے سرپرائز دینے کا انداز بہت برا تھا۔ میں بہت ہرٹ ہوا ہوں۔'' وہ آبدار سے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ نہایت سچائی سے بولا تھا۔

''اب کیا چاہتے ہو میں سوری کروں تم سے۔'' انہوں نے پہلے آبدار کے آنسو صاف کیے تھے اور بیٹے کو قریب بلا کر قدرے نروٹھے انداز میں بولی تھیں۔

''ماما۔پلیز بڑی ہو جائیں اب آپ۔ ہر وقت بچوں کی طرح بی ہیو کرتی ہیں۔'' وہ ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے دھیمے سے بولا تھا اور وہ ہنس دی تھیں۔

''زندگی کو اپنے آس پاس محسوس کرنے کے لئے یہ جذباتیت، یہ سرپرائز بہت ضروری ہیں میری جان۔'' وہ اس کا گال تھپتھپا کر بولی تھیں اور حیدر صاحب انہیں تاسف سے دیکھنے لگے تھے۔

''اس سب میں چاہے اگلے کی جان نکل جائے۔'' ابسام نے منہ بنایا تھا۔

''کوئی نہیں نکلتی جان۔اب فضول کے ڈائیلاگز بند کر کے کیک ذبح کرو۔دن بھر لگا کر میں نے کیک خود بیک کیا ہے اور تمہاری پسند کی ڈشز بنائی ہیں۔'' وہ ایک زندہ دل، من موجی قسم کی خاتون تھیں، نرمی سے ماحول کا بوجھل پن دور کر گئی تھیں۔آبدار انہیں دیکھ رہی تھی کہ اس کی تائی آئیکت کو اور ماما، شاہ زیب کو بہت چاہتی تھیں، پرواہ کرتی تھیں مگر آبدار نے فضہ حیدر کو بیٹے کے لئے بہت پچی محسوس کیا تھا وہ میاں اور بیٹے کا بہت خیال رکھتی تھیں اور اس عمر میں بھی کافی شرارتی وشوخ طبیعت رکھتی تھیں۔ان کی یہ والہانہ محبت، زندہ دلی آبدار کو حیران بھی کرتی تھی اور رشک میں بھی مبتلا کر دیتی تھی۔

''میں نے آبدار سے کال اس لئے کروائی تھی کہ سوچا تھا تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔ملازمہ سے کرواتی کال تو اس کی خیر نہیں مگر تم نے تو آبدار کی بھی کلاس لے ڈالی۔'' اس نے ماں باپ کی دعاؤں اور اپنائیت بھرے ساتھ میں کیک کاٹا تھا آبدار کے لبوں سے کتنی ہی دعائیں آزاد ہوئی تھیں وہ کچھ دیر پہلے کی انسلٹ بھلائے اس کی خوشی میں خوش ہو رہی تھی اسے ماں سے لاڈ اٹھواتے دیکھ رہی تھی کہ فضہ حیدر کی بات پر وہ ہی نہیں ابسام بھی جھینپ گیا تھا۔اس نے نظر اٹھا کر سنگل صوفے پر سلیقہ سے دوپٹہ سر تک لئے آبدار کو دیکھا تھا اس کی آنکھوں میں ندامت کے رنگ آبدار نے صاف محسوس کیے تھے۔

''اٹس اوکے آنٹی، مجھے برا نہیں لگا کہ ابسام کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس نے ایسے ہی بی ہیو کرنا تھا کہ بہرحال غلطی تو میری تھی۔'' اس نے ندامت کم کرنے کو فضہ حیدر کو مخاطب کر کے درحقیقت اسے سنایا تھا۔

''اس کے لئے میری طرف سے سوری کہ میں نے تمہیں مجبور کیا تھا۔'' فضہ حیدر نے خالی کیک کی پلیٹ ٹیبل پر منتقل کرتے ہوئے اس سے معذرت کی تھی۔

''آنٹی، آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔'' وہ فضہ حیدر کو دیکھنے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے نہیں کرتی شرمندہ۔'' وہ دھیمے سے مسکرائی تھیں اور وہ تینوں بھی ان کے ساتھ ساتھ مسکرا دیئے تھے کہ وہ دونوں مانتے تھے کہ ان کی زندگی کی ہر رونق، ہر خوشی فضہ حیدر کے دم سے تھی۔ حیدر صاحب کی نگاہ میں وارفتگی اترنے لگی تھی۔ میرون رنگ کے اسٹائلش سوٹ میں ان کی خوبصورتی متاثر کن تھی کہ انہوں نے خود کو کافی مین ٹین رکھا تھا اور زندگی کو زندگی کی طرح گزارنے والی فضہ حیدر کافی ینگ لگتی تھیں کم تو حیدر صاحب بھی کسی طرح نہیں تھے ان کی جوڑی کمال کی تھی وہ شوہر کی نگاہ محسوس کرتیں تشکر سے مسکرا دی تھیں۔

☆......☆......☆

کبیر عباسی نے بیٹے کا پرپوزل دیا تھا اور عقیل احمد نے صرف رسمی طور پر سوچ کر جواب دینے کا کہا تھا ورنہ انہیں عبیر ہر لحاظ سے بیٹی کے قابل لگتا تھا کہ خود ان کی یہی خواہش تھی۔

''تو نے جتنا سوچنا ہے سوچ، بس اتنا یاد رکھنا کہ یہ میری اور میرے بیٹے کی دلی خواہش ہے، مومل کو ہم بہت خوش رکھیں گے، میں بہو نہیں بیٹی بنا کر لے جاؤں گا۔'' عبیر عباسی کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے آخر بیٹے کی خوشی، اس کی محبت کا سوال تھا۔ عقیل احمد دوست کی بات پر مسکرا دیئے تھے اور کچھ کہتے کہ حاجرہ بیگم بول پڑی تھیں۔

''تمہاری نیت وخلوص پر ذرا شک نہیں ہے بس گھر میں مشورہ کر لیں اور مومل کی مرضی معلوم کر لیں اس کے بعد تمہیں جواب دیں گے۔'' عقیل احمد کے انداز میں نیم رضامندی تھی جو کبیر عباسی کے اطمینان کے لئے کافی تھی مگر مومل کی مرضی معلوم کرنے والی بات کبیر عباسی کو بے چین کر گئی تھی مگر اظہار نہیں کیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد عقیل احمد نے صاف رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

''مجھے بھی عبیر اپنی مومل کے لئے انتہائی موزوں لگتا ہے۔'' عقیل احمد کی اہلیہ نے بھی لب کشائی کی تھی۔

''تم مومل کی مرضی معلوم کر لینا بیٹا۔'' حاجرہ بیگم نے بہو سے نرمی سے کہا تھا۔

''مجھے اپنی بیٹی پر اپنی تربیت پر پورا بھروسہ ہے وہ وہی فیصلہ لے گی جو ہمارا فیصلہ ہوگا۔'' عقیل احمد کے لہجے میں ایک مان تھا مومل جو کافی دیر سے دہلیز پر جمی ان سب کی باتیں اور فیصلے سن رہی تھی، دل ہی دل میں عبیر کو کوستی صاف انکار کا تہیہ کر رہی تھی یکدم اس کی سوچ لڑکھڑا سی گئی تھی۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن ایک دفعہ مومل سے پوچھ لینا بہتر ہے کہ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ اولاد کی خوشی کو پیش نظر رکھ کر کرنا چاہیے۔'' حاجرہ بیگم کا اپنا ہی انداز تھا۔ ابسام کے لئے نوائم کی مرضی بھی پوچھی گئی تھی اس نے مشرقی لڑکیوں کی طرح فیصلہ کا اختیار اپنے والدین کو

دے دیا تھا اور مومل سے بھی یہی امید کی جا رہی تھی۔ فیصلہ کا اختیار تو اس نے والدین کو ہی دینا تھا لیکن عبیر نہ ہوتا تو، نہ جانے کیوں اسے عبیر ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ بڑی تیزی میں وہاں سے نکلی تھی کہ نوائم سے ٹکرا گئی تھی جو اس سے ذرا فاصلے پر رکی تھی۔

''تم انکار کر دو گی مومل......؟'' اس نے سرگوشی کی تھی۔

''ہاں! مجھے عبیر بالکل پسند نہیں ہے میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' مومل صاف گوئی سے کہتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ نوائم اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔

''جانتی ہو تمہارے انکار سے کیسا طوفان آئے گا۔'' نوائم روم میں داخل ہوتے ہی بولی تھی۔

''کوئی طوفان نہیں آئے گا۔ میں دادو سے بات کروں گی۔'' مومل اندرونی اضطراب کو چھپائے بولی تھی۔

''بابا اور چاچو کے مزاج سے تم واقف ہو اور گھر میں کسی کو بھی عبیر کے رشتے پر اعتراض نہیں ہے تمہارا انکار ہزار سوالوں کو جنم دے گا اور آخر تم انکار کا جواز کیا پیش کرو گی۔'' وہ مضطرب نظر آتی مومل کو دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

''مجھے نہیں سمجھ آ رہا نوائم کہ بابا نے جیسے کہا کہ انہیں اپنی بیٹی پر بھروسہ ہے ان کی بیٹی کا فیصلہ وہی ہو گا جو وہ چاہیں گے اس کے بعد میرے پاس انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ میں بابا کا مان نہیں توڑ سکتی لیکن میں عبیر سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' مومل کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''تم خوامخواہ میں عبیر سے عناد پال کر بیٹھی ہو ورنہ وہ ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل شخصیت ہے۔ تم سے محبت کرتا ہے تم اس کے ساتھ خوش رہو گی۔'' نوائم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''میں کچھ بھی سننا، سمجھنا نہیں چاہتی۔ مجھے وہ ناپسند ہے وجہ نہیں ہے میرے پاس لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا اور جس طرح کا ہمسفر میرے ذہن میں ہے عبیر اس خاکہ پر نہیں اترتا میرے پاس انکار کے کئی جواز ہیں مگر میں جانتی ہوں میں انکار نہیں کر سکتی۔'' مومل جیسے پہلے ہی موڑ پر اپنی شکست تسلیم کر گئی تھی۔

''تم میری مدد کرو نوائم، تم عبیر کو سمجھاؤ اسے بتاؤ کہ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ نوائم سے مدد طلب کر رہی تھی۔

''سوری مومل۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی کہ میں عبیر کا ساتھ دینے پر خود کو مجبور پاتی ہوں کیونکہ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور مجھے پورا یقین ہے وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔'' نوائم نے صاف ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔

''میرے کمرے سے دفع ہو جاؤ، میں خود کچھ کر لوں گی۔'' وہ نوائم کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتی چیخی تھی۔

''جو مرضی آئے کرو مگر یاد رکھنا تمہارا کوئی بھی غلط قدم تمہیں اور تمہاری فیملی کے لئے نقصان دہ ثابت ہو گا اس لئے میری مانو تو خاموشی سے خوشی خوشی عبیر سے شادی کرو۔ ایسا چاہنے والا ہمسفر قسمت سے ملتا ہے۔'' نوائم بڑی پرسکون تھی کہ وہ عبیر کے جذبوں اور مومل کی

ناپسندیدگی سے واقف تھی اور مومل کی ناپسندیدگی اسے حماقت ہی تو لگتی تھی اس لئے اسے عبیر کا فیصلہ انتہائی مناسب لگا تھا وہ پرپوزل کا سن کر بے حد خوش تھی اور مومل کے غصہ و ناپسندیدگی کے اظہار کے باوجود وہ کھل کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔

''اپنے فلسفے اپنے پاس رکھ کر میرے کمرے سے دفع ہو جاؤ۔'' مومل نے نہایت بدتمیزی سے کہا تھا اور وہ مومل کو گھورتی اس کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ مومل کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے کہ اسے خوب اندازہ تھا کہ وہ انکار کا حق رکھتی ہے مگر اختیار نہیں اس لئے اس نے عبیر سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ وہی تھا جو اسے اس عذاب سے بچا سکتا تھا۔

☆......☆......☆

''ہیپی برتھ ڈے ابسام۔'' وہ ڈنر کے بعد حسب عادت لاؤنج میں بیٹھا نیوز سن رہا تھا کہ اس کا موبائل رنگ کرنے لگا تھا اور نمبر چیک کرنے پر اسے حیرانگی نے آ لیا تھا اور اسی حیرت کے ساتھ اس نے کال ریسیو کی تھی۔ دوسری جانب موجود نوائم نے سلامتی بھیجنے کے بعد اسے برتھ ڈے وش کی تھی اور ابسام کی حیرت دو چند ہو گئی تھی۔

''تھینک یو، نوائم۔'' وہ دھیمے سے مسکرایا تھا اور وہ جو کچن سے نکل کر لاؤنج سے ہوتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی چونک کر کچھ فاصلے پر بیٹھے ابسام کو دیکھنے لگی تھی جس کے حسین چہرے پر تبسم یوں بکھرا تھا جیسے رات کے پہلو میں چاندنی چٹکتی ہے وہ بے اختیار اسے دیکھنے لگی تھی۔

''ویسے تم نے بڑی دیر میں وش کیا ہے۔'' ابسام اپنی حیرت سے نکل آیا تھا اس لئے شرارت سے مسکرا رہا تھا جبکہ وہ بری طرح جھینپ گئی تھی اور خود کو کمپوز کر کے بولی تھی۔

''مجھے آپ کی برتھ ڈے یاد تھی۔ وش بھی کرنا چاہتی تھی لیکن عجیب سا لگ رہا تھا بس اس لئے اتنی دیر ہو گئی۔'' نوائم کے سادگی و سچائی سے کہنے پر ابسام نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا اور آبدار کا دل گویا مٹھیوں میں آ گیا تھا۔ ابسام، نوائم سے بات کر رہا تھا اور وہ مزید برداشت نہ کر پاتے ہوئے بڑی تیزی سے وہاں سے نکل گئی تھی جبکہ آبدار کی موجودگی سے انجان وہ بے تکلفی سے نوائم سے بات کر رہا تھا۔ منگنی سے پہلے اکثر ان کی بات ہوتی تھی منگنی کے بعد یہ سلسلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

''صرف وش پر ٹرخا رہی ہو، گفٹ کہاں ہے میرا۔'' ابسام کو نوائم کا کال کرنا بے حد اچھا لگا تھا کہ چاہے اس نے نوائم کے بارے میں کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا مگر وہ اسے ناپسند بھی نہیں کرتا تھا اس لئے اپنی برتھ ڈے کے دن نوائم کی کال آنا اسے کافی اچھا لگا تھا۔

''گفٹ لینے کے لئے تو آپ کو ڈنمارک آنا پڑے گا۔'' نوائم شرارت سے مسکرائی تھی۔

''اگر میں یہ کہوں کہ گفٹ دینے کے لئے تمہیں پاکستان آنا پڑے گا تو......'' وہ ہنستے ہوئے بولا تھا اور وہ یکدم نروس ہو گئی تھی۔ آگے سے کچھ بول ہی نہیں پائی تھی۔

''میرا برتھ ڈے گفٹ تم پر ادھار رہا نوائم کہ میں ڈنمارک آ کر گفٹ نہیں لوں گا تمہیں پاکستان آ کر گفٹ دینا ہوگا۔'' وہ اس کی خاموشی اور خاموشی کے پس منظر میں حجاب تصور کرتا دلکشی سے بولا تھا اور نوائم کا دل پہلی بار بے اختیار ہو چلا تھا اسے خود کو کمپوز کرنے میں دشواری کا سامنا تھا مگر وہ بہر حال خود کو کمپوز کرتی دھیمے سے بولی تھی۔

''وعدہ رہا آپ کا برتھ ڈے گفٹ میں ضرور پاکستان آ کر ہی دوں گی۔'' وہ مسکرا رہی تھی کہ وہ جانتی تھی وہ بہت جلد پاکستان جانے والی ہے مگر وہ اس بات سے انجان تھا کہ عقیل احمد کا پورا خاندان فضہ حیدر کو سرپرائز دینا چاہتا تھا اس لئے وہ لوگ پاکستان آنے کی تیاری کر رہے تھے مگر فضہ حیدر کو لاعلم رکھا گیا تھا کیونکہ اگلے ماہ ان کی شادی کی پچیسویں سالگرہ تھی اور وہ اس موقع پر پہلی بار سب کے سب پاکستان آ رہے تھے وگرنہ فضہ حیدر کے ولیمہ میں حاجرہ بیگم، ان کے شوہر اور عقیل احمد نے شرکت کی تھی سب کا پاکستان آنا ممکن نہ تھا کہ بچے چھوٹے تھے اور ہزار طرح کے مسائل تھے اور فضہ حیدر کی خواہش تھی کہ ان کے سارے اپنے ایک ساتھ اُن سے ملنے آئیں اور حاجرہ بیگم، بیٹی کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنے تمام بچوں کے ساتھ اگلے ماہ پاکستان آ رہی تھیں۔

''زہے نصیب۔ ویسے کب آ رہی ہیں آپ پاکستان۔'' ابسام شرارت پر آمادہ تھا، نرمی سے اسے چھیڑ رہا تھا۔

''جب آپ کہیں جب آ جائیں گے۔ آپ حکم تو کریں۔'' وہ اس کی شرارت محسوس کر کے خود بھی نرم سی شرارت سے بولی تھی۔ ابسام نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

''حکم کیا کروں جب پتہ ہے تعمیل نہیں ہوگی۔'' ابسام نے لہجے میں میں گہری سنجیدگی سمو کر کہا تھا۔

''آپ حکم کر کے تو دیکھیں حکم کی تعمیل نہ ہو تو سر قلم کر دیجیے گا۔'' نوائم ہنسی روکے دھیمے سے بولی تھی۔

''ایسی بات ہے تو بس آ جاؤ اسی مہینے یا اگلے مہینے...... یا اگلے سال۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا تھا۔

''کوئی ایک ڈیڈ لائن دیں تو میں سوچوں بھی۔'' وہ دھیمے سے ہنستے ہوئے بولی تھی اور جانے کیسے ابسام کے منہ سے پھسل گیا تھا۔

''ٹھیک ہے اگلے ماہ آ جاؤ۔'' یکدم نوائم کا چہرہ رنگ بکھیرنے لگا تھا۔

''اگلے ماہ......'' وہ زیر لب بولی تھی کہ وہ بول اٹھا تھا۔

''دیکھ لو میں تو حکم دے ہی نہیں رہا تھا اب سن کر ہی بدحواس ہو گئی ہو۔'' وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔

''کیا پتہ میں اگلے ماہ آ ہی جاؤں۔'' وہ مسکرائی تھی۔

''دیکھیں گے لوگ وعدے کے کتنے سچے اور کتنے کچے ہیں۔'' وہ فل مذاق کے موڈ میں تھا وہ آگے سے کچھ نہیں بولی تھی اور یکدم ہی ''خدا حافظ'' کہتی لائن کاٹ گئی تھی۔ ابسام کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

عریم مارکیٹ آ تو گئی تھی مگر اس کی بے زاری عروج پر تھی وہ بس ماں کے ساتھ ایک شاپ سے دوسری شاپ میں جانے کا تردد کر رہی تھی اور وہ بیٹی کی بے زاری محسوس کرنے کے باوجود کچھ نہیں بولی تھیں۔

''ماما! میں بہت تھک گئی ہوں آپ نے اور کتنی خریداری کرنی ہے۔'' اس کی بے زار سی آواز پر وہی نہیں کچھ فاصلے پر موجود شاہ زیب بھی چونک اٹھا تھا۔ اس نے گردن گھمائی تھی اور شک کی تصدیق ہوگئی تھی کہ آواز سن کر اسے عریم کا خیال آیا تھا اور وہ سامنے کھڑی تھی۔ فیروزی کاٹن کے سوٹ میں خوبصورت چہرے پر بیزاریت طاری کیے وہ عریم ہی تو تھی۔ وہ سائیڈ پر ہو گیا تھا تا کہ عریم کی نگاہ اس پر نہ پڑے۔ یہ اور بات تھی توجہ اسی طرف لگی تھی۔

''بس دو ایک چیزیں اور لینی ہیں، پھر چلتے ہیں۔'' انہیں بیٹی پر غصہ تو بہت آ رہا تھا مگر ظاہر نہیں کیا تھا۔

''ماما! میں گاڑی میں آپ کا ویٹ کر رہی ہوں آپ شاپنگ کمپلیٹ کر کے آ جائیں پلیز۔'' عریم ملتجی ہوئی تھی وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر بیٹی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر نرم پڑ گئی تھیں اور وہ ماں کی اجازت ملتے ہی بڑی تیزی میں شاپ سے نکلی تھی وہ پارکنگ کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اپنے نام کی پکار پر چونک کر پلٹی تھی اور شاہ زیب کو دیکھ کر ساکت رہ گئی تھی وہ چلتا ہوا عین اس کے سامنے آن رکا تھا اور وہ خود کو کمپوز کرتی اسے بالکل نظر انداز کرتی قدم بڑھا گئی تھی۔ شاہ زیب کو اس سے کہاں ایسی امید تھی وہ حیرت زدہ سا کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا اور حیرت سے نکلا تھا تو بڑی تیزی میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھتی عریم کا بازو دبوچ گیا تھا۔

''شاہ! پلیز جانے دیں مجھے۔ میں نے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی ہے۔'' وہ بازو چھڑاتی ناگواری سے بولی تھی۔

''وجہ۔'' وہ فقط ایک لفظ بول کر اسے گھورنے لگا تھا۔

''وجہ آپ اچھے سے جانتے ہیں۔ پہلے ہی آپ کی وجہ سے میرا بہت تماشا بن چکا ہے۔ بہتر ہوگا میرے راستے سے ہٹ جائیں اور مجھے مزید تماشا نہ بنائیں۔'' وہ اس کے غصہ سے خائف ہونے کے بجائے شدید غصہ سے بولی تھی۔

''میں نے بنایا ہے تمہارا تماشا...... میں بناؤں گا تمہارا تماشا۔ ہوش میں رہ کر بات کرو عریم۔'' وہ غصہ سے کف اڑا رہا تھا پبلک پلیس نہ ہوتا تو وہ جانے کیا کر گزرتا۔

''ہوش میں تو میں آ گئی ہوں۔ آپ نے کیا سمجھا مجھے بس ہوس مٹانے کا ذریعہ۔'' وہ جو اتنے دنوں کی اذیت تھی اسے کال اور ٹیکسٹ کرنے کی خواری تھی وہ آج کھل کر ظاہر ہوئی تھی اور وہ کہاں اتنا رکیک الزام برداشت کر سکتا تھا ساری مصلحتیں بالائے طاق ہوگئی تھیں۔ اس کا ہاتھ اٹھا اور عریم کے گال پر ثبت ہو کر رہ گیا تھا۔

''بکواس بند کرو عریم ورنہ جان سے مار دوں گا۔''

''جان سے مار دیں تو زیادہ بہتر ہے یوں تل تل کر کے مرنے سے تو ہی اچھا ایک ہی دفعہ جان کنی کا مرحلہ طے ہو جائے۔'' وہ بری

طرح سسکتے ہوئے بولی تھی اور اس نے لب بھینچ لئے تھے۔ صد شکر کہ وہ پارکنگ کی سب سے ویران سائیڈ پر کھڑے تھے ورنہ سچ میں آج کچھ ٹھیک ٹھاک قسم کا تماشا لگتا کہ شاہ زیب کو تو کبھی اپنے غصہ پر قابو کرنا آیا ہی نہ تھا اور آج تو وہ بھی بپھری ہوئی شیرنی بنی ہوئی تھی۔

''اور آپ کو غصہ کیوں آ رہا ہے۔ ایسا کون سا جھوٹ اور غلط کہہ دیا ہے میں نے۔ آپ نے جو مجھے سمجھا آپ تو بیان کرنے سے رہے۔ آج خود اپنے منہ سے اپنی اوقات بتا دی ہے۔'' وہ مستقل روتے ہوئے بول رہی تھی۔ شاہ زیب نے لب بھینچ لئے تھے اور اس کی خاموشی نے عریم کو مزید بولتے رہنے پر اکسایا تھا۔

''پہلے تو آپ کال کر لیتے تھے اور اب کال کا جواب تک نہیں دیتے اور کیوں دیں گے جب آپ کا مقصد پورا ہو چکا۔ آپ محبت، محبت کا راگ الاپتے جسم حاصل کر چکے تو اب آپ کو کیا ضرورت کال کرنے کی یا کال ریسیو کرنے کی۔ میں جیوں...... یا مروں آپ کی بلا سے۔ آپ کو تو وہ حاصل ہو گیا جو آپ حاصل کرنا چاہتے تھے۔'' وہ سسکتے ہوئے بولتی تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں سے نکلی تھی اور وہ اپنے اندر کے چور کے یوں عیاں ہو جانے پر ساکت کھڑا تھا نہ اس کو کچھ کہا تھا نہ اسے روکا تھا اور نہ ہی اس کے پیچھے گیا تھا جبکہ وہ گاڑی میں بیٹھی بری طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ وہ بہت حساس تھی جو کچھ ہو گیا تھا وہ اسے مضطرب رکھے ہوئے تھا۔ یہ ڈر کہ ماما، پاپا کو پتہ نہ چل جائے اوپر سے شاہ زیب کا اگنور کرنا اور گھر میں ہوتیں منگنی کی تیاریاں وہ دہرے محاذ پر دہرے عذاب میں مبتلا تھی اس لئے آج شاہ زیب سامنے ہر کنٹرول کھو گئی تھی اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں عریم کو سچائی پتہ تو نہیں چل گئی مگر دوسرے ہی لمحہ وہ اپنی سوچ کی خود ہی نفی کر گیا تھا یہ کہہ کر کہ عریم کے فرشتوں کو بھی کچھ علم نہیں ہو سکتا۔ وہ خود کو ریلکس کر گیا تھا مگر وہ عریم کو لے کر مضطرب ضرور ہو چکا تھا آج وہ جذباتیت کا مظاہرہ کرتی، غصہ دکھاتی کچھ اضطراب اسے بھی سونپ گئی تھی کہ جس آگ میں وہ جل رہی تھی کچھ اس پر اثر انداز ہو ہی گئی تھی۔

☆......☆......☆

''میرا دل میرے اختیار میں نہیں رہا۔ ابسام کی اور بڑھا جا رہا ہے ابسام کے لئے دھڑکنا سیکھ گیا ہے۔ محبت میرے اردگرد منڈلانے لگی ہے اور میں بے بس...... ابسام سے حال دل کہہ تک نہیں سکتی کیونکہ ابسام کسی اور کو پسند کرتے ہیں، کسی اور سے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔'' وہ جب سے ابسام کو نوائم سے بات کرتا سن کر آئی تھی مضطرب تھی، سوچ بھٹک رہی تھی اور آنسو روانی سے رخسار بھگوتے جا رہے تھے۔

''اور میں خود بھی تو کسی کی پابند ہوں، احسانات تلے دبی ہوں مگر دل کا کیا کروں جو میری سنتا ہی نہیں، میرے سینے میں دھڑکتا ہے مجھ سے بغاوت کر کے کسی اور کے لئے، اور دل کا دھڑکنا جہاں لطف دیتا ہے وہیں حقیقت کا اژدھا مجھے نگلنے کو ہے۔ میں آئیکت کی پابند ہوں اور ابسام صرف نوائم کے ہیں۔ جب تمام تر حقائق مجھ پر آشکار ہیں تو دل میری کیوں نہیں سنتا کیوں ان حقائق پر نظر نہیں رکھتا جو چیخ چیخ کر کہتے ہیں کہ دل کی خواہش پوری نہ ہو گی۔ قسمت کے نصیب میں وصل نہیں آئے گا کہ محبت کے ظہور سے قبل ہی قسمت میں ہجر رقم ہو

چکا۔'' وہ تکیہ میں منہ دیئے خود سے الجھتی روتی جارہی تھی۔

''ابسام کا ڈانٹنا بے حد بھلا لگا، اپنائیت کا اپنے پن کا احساس ہوا، میں خود یہ سوچنے لگی تھی کہ ابسام کے لئے میں بہت اہمیت اختیار کرنے لگی ہوں میری خام خیالی تھی۔ ابسام کی ڈانٹ اپنائیت سے لبریز نہیں اپنی ماما کی فکر میں ڈوبی ہوئی تھی اور میں نے کیا کچھ سوچ لیا اور نوائم......'' وہ دکھ سے سوچتی اٹھ بیٹھی تھی۔

''ابسام جس طرح فون پر بات کر رہے تھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ دوسری جانب موجود لڑکی سے خاص اپنائیت کا تعلق جڑا ہے اور اپنائیت کیوں نہ ہو رشتہ بھی تو بہت خاص ہے یقیناً ابسام نے نوائم سے منگنی اپنی پسند سے کی ہوگی۔'' یکدم وہ لب کچلنے لگی تھی ہاتھ اضطرابی حالت میں مسلتی وہ کافی قابل رحم لگ رہی تھی مگر اس کی حالت دیکھنے والا اس کے دکھ کو سمجھنے والا کوئی نہ تھا وہ دنیا کے میلے میں، اپنوں وغیروں کے جھمیلے میں بھی بالکل اکیلی تھی اس کا دکھ بانٹنے والا کبھی کوئی رہا ہی نہ تھا وہ مزید احساس کمتری میں مبتلا ہوتی بری طرح سسکنے لگی تھی۔

''مجھے زندگی میں کبھی کوئی رشتہ خالص نہیں ملا، کسی رشتے سے اپنائیت، محبت، کچھ نہیں ملا......اور میرا دل یوں باغی ہوا ہے کہ لگتا ہے کہ آگے بھی محرومیاں ہی میرا مقدر ہیں۔'' وہ بستر پر آگری تھی احساس محرومی سوا ہوا تھا وہ خود سے الجھتی روتی، تڑپتی، شکوے کرتے رات کے نہ جانے کون سے پہر سوگئی تھی کہ کوئی مہربان ہو کہ نہ ہو نیند مہربان ہو ہی جاتی ہے۔

☆...☆...☆

وقت بھی کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے کل تک عریم اسے کال کرتی جواب کی منتظر تھی اور آج وہ کال پر کال کر رہا تھا اور جواب ندارد......کئی کالز کے باوجود عریم نے کال ریسیو نہیں کی تھی پہلے وہ دیکھے کو ان دیکھا کرتی رہی تھی بعد میں اچانک آجانے والے سسرالیوں کے نرغے میں ایسی پھنسی تھی کہ کال کا خیال ہی ذہن سے محو ہو گیا تھا۔ اس کی خالہ جو عنقریب ساس کے عہدے پر فائز ہونے والی تھیں اپنے بیٹی اور داماد کے ساتھ اس کی بری کا سامان لے کر آئی تھیں۔ منگنی کا سوٹ اور اس کی میچنگ کی ہر چیز وہ اسے شوق سے دکھا رہی تھیں اور وہ ضبط سے مسکراتی رہی تھی اور رات گئے جب کمرے میں آئی تھی شاہ زیب کی بیس مسڈ کالز دیکھ کر اس کے آنسو گرنے لگے تھے اس نے کال بیک کرنا چاہی تھی یکدم انا آڑے آگئی تھی۔

''احساس ہونا چاہیے شاہ کو کہ جب کوئی کال ریسیو نہ کرے تو کیسی اذیت سے گزرنا پڑتا ہے......شاہ کو یہ احساس بھی ہونا چاہیے کہ کال بیک کا جب شدت سے انتظار ہو اور کال بیک نہ کی جائے تو کیسی وحشت و تکلیف کا سامنا ہوتا ہے۔'' وہ موبائل بے دلی سے سائیڈ پر ڈالتی سوچ رہی تھی اس کے آنسوؤں پر اس کا اختیار نہیں رہا تھا کہ وہ شاہ زیب کی طرح مفاد پرست و بے حس نہیں تھی وہ ایک حساس لڑکی تھی رات بھر اس خیال سے بے چین رہی تھی کہ اس نے شاہ زیب کو ٹینشن دی ہے وہ اس کی وجہ سے پریشان ہوگا۔ سر راہ ملنے پر بکواس کرنا اور اس کے بعد کال ریسیو نہ کرنا اسے شرمندہ کر رہا تھا وہ اس بات سے انجان تھی کہ شاہ زیب کو جو ذرا سی ندامت ہوئی تھی وہ اس کے کال ریسیو

نہ کرنے پر ختم ہو چکی تھی اور وہ جس کی فکر میں دبلی ہوتی کروٹیں بدل رہی تھی وہ اول شب سے پرسکون نیند سو رہا تھا کہ رت جگے تو اس کا نصیب ہوئے تھے اس کی نگاہ اپنے ہاتھوں پر جمی تھی اس کی نند نغمانہ جو اس سے عمر میں چار سال بڑی تھی مگر اچھی بااخلاق دوستانہ مزاج رکھتی تھی اس کی نغمانہ سے کافی بنتی بھی تھی مگر اب تو اس کی خود سے نہیں بن رہی تھی کسی اور سے کیا بنتی۔ نغمانہ نے اس کے خوبصورت ہاتھوں پر مہندی سے ڈیزائن بناتے ہوئے کتنا چھیڑا تھا وہ فارس کا نام لے لے کر عریم کو تنگ کرتی رہی تھی اور وہ اذیت سے دوچار بظاہر سر جھکائے بیٹھی تھی اور اب اس کی نگاہ مہندی سے بنے گل بوٹوں پر تھی جو بہت دلکش لگ رہے تھے مگر اسے تکلیف دے رہے تھے کہ وہ کسی کے نکاح میں ہوتے ہوئے کسی اور کے نام کی مہندی لگائے اس کے نام کی انگوٹھی پہننے جا رہی تھی اس کی اذیت و پریشانی سے بس وہی واقف تھی جو شخص محبت کا دعویدار تھا جس نے ہزار دعوؤں اور وعدوں کے بعد اسے اپنے نکاح میں لیا تھا وہ اس کی اذیتوں سے واقف ہو کر انجان بنا اپنی زندگی میں مگن تھا۔

''میں اس سب کے لئے آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی شاہ۔ اپنے محبت کرنے کا مجھ سے بہت بڑا اخراج لیا ہے۔ میری زندگی کانٹوں کی رہگزر بن گئی ہے۔ میں اپنے والدین کی، اپنے اللہ کی مجرم بن گئی ہوں۔ میں کتنے لوگوں کو دھوکا دے رہی ہوں صرف آپ کے لئے شاہ......اور آپ کی طرف سے دو حرف تسلی کے بھی مجھے نصیب نہیں ہیں۔ یہ آپ کی کیسی محبت ہے شاہ۔ جس نے مجھے دہرے عذاب میں مبتلا کر دیا ہے۔'' وہ جنونی انداز میں اپنی ہتھیلیاں آپس میں مسلتی یکدم چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بلک اٹھی تھی۔ اسے آج سے زیادہ کل کے دن کا خوف تھا کہ آج تو اس نے سب کو فیس کر لیا تھا۔ مہندی بھی لگوالی تھی، شرارت پر گردن جھکا کر مسکرا بھی دی تھی مگر کل تو وہ باقاعدہ ایک رشتہ میں بندھنے جا رہی تھی کتنے ہی لوگوں کا سامنا کرنا تھا اور یہ سب سوچ کر اس کا دل بند ہو رہا تھا وہ شاہ زیب کے رویّے سے خائف اس سے ہزار شکوے کرتی ناراضگی وغصہ کا اظہار کرتی نیند کی وادی میں اتر گئی تھی اور اس کی سوچ و فکر کے مطابق نیا دن بہت آزمائش بھرا تھا مہمانوں کی آمد سہ پہر سے ہی شروع ہو گئی تھی ہلہ گلہ، گانے و شرارتیں، ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ اور وہ اس سب کو جیسے برداشت کر رہی تھی وہی جانتی تھی۔ چھ بجے کے بعد بیوٹیشن آ گئی تھی اسے سجایا سنوارا جا رہا تھا اور اسے اپنا آپ کتنے لوگوں کا مجرم لگنے لگا تھا اس نے آئینہ میں اپنے جھلملاتے عکس کو دیکھا تھا اور دل میں کیا تھا ساری سجاوٹ تہس نہس کر دے اور وہ شاید ایسا کر بھی گزرتی کہ اس کی توجہ بجتے موبائل نے کھینچ لی تھی اس نے مرے مرے سے قدم اٹھاتے ہوئے سائیڈ ٹیبل تک کا سفر کیا تھا اور موبائل اٹھا کر چیک کیا تھا۔ موبائل کی اسکرین پر ''شاہ کالنگ'' بلنک کر رہا تھا۔ اس نے کال یس کر دی تھی۔

''عریم۔ تم میری کال ریسیو کیوں نہیں کر رہی تھیں۔ اندازہ ہے تمہیں میں کل سے کس قدر پریشان ہوں۔'' وہ چھوٹتے ہی بولا تھا اور اسے جس شخص سے ہزار رہا امیدیں تھیں اس کی خودغرضی صاف محسوس ہوئی تھی کہ اسے صرف اپنی پریشانی کی پرواہ تھی صرف بیس مرتبہ کال کر کے چپ سادھ لینے والا اپنی پریشانی کا ذکر کر رہا تھا اور اس کی پریشانی کو کسی خاطر میں نہیں لایا تھا جس نے ایک ماہ میں ان گنت کال

اور میسجز کیئے تھے جو دہرے عذاب سے نبرد آزما تھی اس کی خود غرضی محسوس کرتی وہ چٹختے لہجے میں بولی تھی۔

''صرف مسڈ کالز دینے سے آپ پریشان ہو گئے ہیں شاہ۔ میرا سوچا ہے جو پچھلے ایک ماہ میں اتنی بار کال کر چکی ہوں کہ جن کا شمار ہی نہیں کوئی۔'' وہ اپنے لہجے کو نم ہونے سے بچا ہی نہیں پائی تھی۔

''یعنی تم اب مجھ سے بدلے لوگی۔'' شاہ زیب کا لہجہ نہایت کڑوا تھا۔

''میں کیا بدلہ لوں گی کسی سے...... کہ مکافات عمل تو میرے لئے لگتا ہے شروع ہو چکا۔ آپ اپنی زندگی انجوائے کریں کیوں مجھے کال کر کے اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ میں جیوں یا مروں آپ کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اس نے لب بھینچ کر خود کو کمپوز کیا تھا۔

''فضول بکواس بند کرو۔ یہ مت بھولو کہ مجھے چپڑ چپڑ کرتیں ہر بات میں بحث کرتیں عورتیں سخت ناپسند ہیں اور تم کل دوپہر بہت بکواس کر چکی ہو اور میں اس وقت بکواس سننے کے بالکل موڈ میں نہیں ہوں۔'' وہ اس کی جذباتی تقریر سے متاثر ہوئے بناء کافی درشتگی سے بولا تھا۔

''بکواس نہیں سن سکتے تو فون بند کر دیں کہ میں جس مشکل میں گرفتار ہوں، جس دہری اذیت میں مبتلا ہوں ایسے میں...... میں آپ سے رومانوی باتیں نہیں کر سکتی۔ نہ مزید آپ کا دل بہلا سکتی ہوں۔'' وہ جو اس کے غصہ سے خائف ہوتی آگے سے ایک لفظ نہیں بولتی تھی اس کے غصہ سے اس وقت گویا بالکل متاثر نہ ہوئی تھی اور گہرے طنز سے بولی تھی اور شاہ زیب کے تو کانوں سے گویا دھواں نکلنے لگا تھا وہ اپنی تذلیل محسوس کرتا ماتھے کو شکن آلود ہونے سے محفوظ رکھنے میں سخت ناکام ہوا تھا۔

''تم کل سے میری توہین کر رہی ہو عریم! اور میں برداشت نہیں کر سکتا۔ دماغ درست ہو جائے تو کال کر لینا۔ خدا حافظ۔'' وہ پھنکارا تھا۔ اسے شاہ زیب کی سخت غصیلی آواز کانوں میں گھستی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''میرا کچھ کہنا آپ کو اپنی توہین لگ رہا ہے۔ یہ آپ کو توہین نہیں لگ رہا کہ آپ کی بیوی جسے آپ نے منتوں و خوشامدوں کے بعد نکاح میں لیا اپنی خلوت کا حصہ بنایا...... آج ایک غیر مرد کے لئے پور پور سجی ہے۔'' وہ لائن کاٹنے کو تھا مگر عریم کی تیز آواز اور اس کے الفاظ اسے ایسا کرنے سے روک گئے تھے اور اس کا آخری جملہ شاہ زیب کے چودہ طبق روشن کر گیا تھا۔ اس کی رنگت خطرناک حد تک سرخ پڑ گئی تھی۔

''اس بکواس کا مطلب......''

''مطلب صاف تو ہے شاہ اور کیسے مطلب سمجھاؤں کہ میری آج فارس کے ساتھ منگنی ہے۔'' وہ اس کی ادھوری بات کے درمیان چلائی تھی اور اس نے لب بھینچ لئے تھے کہ صحیح معنوں میں توہین تو یہ تھی اس کی بیوی کسی اور کے نام کی انگوٹھی پہننے جا رہی تھی اس سے بڑھ کر ذلالت کی بات اس کے لئے کیا ہو سکتی تھی وہ یکدم گونگا ہو گیا تھا کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

''میں مر رہی ہوں شاہ۔ پلیز کچھ کریں مجھے اس عذاب سے نکالیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نے صرف آپ سے محبت کی ہے اور آپ کی محبت میں، میں نے ہر حد پھلانگ دی۔ ماں باپ کی عزت کا پاس بھی نہیں رکھا۔ کچھ تو میری چاہتوں کا صلہ دیں۔ اس منگنی کو آ کر رکوا دیں......'' وہ بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتی چلی گئی تھی اور سسکتے ہوئے اس کی منتیں کر رہی تھی۔

''یہ آپ کی غیرت آخر کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ آپ کی منکوحہ، آپ کی بیوی کسی اور کے لئے سنگھار کرے، کسی اور کے نام کی انگوٹھی پہنے، آپ ہمارا نکاح نامہ لے کر آ جائیں۔ پھر جو بھی ہو، چاہے پھر پاپا کچھ بھی کریں۔ چاہے مجھے جان سے مار دیں۔ پلیز آپ آ جائیں شاہ۔'' وہ منتیں کر رہی تھی۔ شاہ زیب کو اکسا رہی تھی اور وہ دم سادھے ہوئے تھا کہ اس کی پلاننگ کچھ اور تھی اس کی غیرت کو عریم نے للکارا تھا اور وہ پور پور خاک ہو جانے کے باوجود چپ تھا کچھ کرنے سے قاصر تھا کہ وہ کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کسی اور کے لئے ذلت کا پروگرام ترتیب دیا ہوا تھا اور اس شخص کو ذلت سے دوچار کرنے سے قبل خود ذلتوں سے گزر رہا تھا۔

''تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا منگنی کوئی مضبوط رشتہ نہیں ہے۔ اس کی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ تم اس کڑوے گھونٹ کو پی جاؤ۔ میں رات......''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کے وعدے، دعوے سب جھوٹے ہیں۔ آپ کو اپنی غیرت کا پاس نہیں ہے۔ میری کیا عزت رکھیں گے۔ آپ جیسے آج منگنی کا مشورہ دے رہے ہیں مجھے تو لگنے لگا ہے کچھ دنوں بعد نکاح کرنے کا بھی یونہی اتنے آرام سے کہہ دیں گے۔''

اسے کہاں شاہ زیب سے ایسے جواب کی توقع تھی وہ تو اس برہم میں تھی کہ وہ سن کر بے قرار ہو جائے گا فوراً خود سے نکاح نامہ لے کر آنے کی بات کرے گا اور اس نے تو اس کے کہنے کو بھی صاف نظر انداز کر دیا تھا اور لگے ہاتھ مشورہ دے ڈالا تھا ایسے میں وہ اپنے حواس قائم رکھے ہوئے تھی تو یہ اس کا ہی حوصلہ تھا مگر وہ چپ نہیں رہی تھی اس نے بھی وہ تک کہہ دیا تھا جو اسے کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ شاہ زیب سے اس انداز میں بات کر گئی تھی جس کا تصور بھی نہ کیا تھا مگر سب کچھ الٹ ہو رہا تھا سب کچھ ویسے نہیں ہو رہا تھا جیسے اس نے سوچا تھا۔ وہ ویسا بھی کچھ نہیں کر رہی تھی جیسا کرنا چاہتی تھی کہ اس کے دل و دماغ اپنے قابو میں نہیں تھے۔ دل نے نچایا تھا اور وہ شاہ زیب کی ہر بات مانتی چلی گئی تھی اور اب دماغ چل رہا تھا تو شاہ زیب کا دماغ گھمانے میں اس نے کسی قسم کی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ وہ اس کی غیرت پر حملے پر حملے کرتی چلی گئی تھی اور وہ صبر کے گھونٹ پی رہا تھا۔ عریم کی آخری بات اس کے دماغ پر جا کر لگی تھی اس نے کچھ کہنے اور مزید سننے کے بجائے موبائل دیوار پر دے مارا تھا۔ کمرے کو تہس نہس کر دیا تھا مگر عریم کے لفظوں نے جو آگ لگائی تھی وہ ایسے بجھنے والی نہیں تھی وہ سر دیواروں سے ٹکراتا پھر رہا تھا اور اس نے شاہ زیب کے صاف کہنے پر پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی اس کی خاموشی کے بعد کوشش کا جواز ہی ختم ہو گیا تھا اور اس نے روتے دل کے ساتھ ذہن کرب و اذیت محسوس کرتے ہوئے ایک پروقار تقریب میں فارس نقوی کے ہاتھوں سے انگوٹھی پہن لی تھی۔

ہر موڑ نئی الجھن ہے، قدموں کا سنبھالنا مشکل ہے
وہ ساتھ نہ دیں پھر دھوپ تو کیا سائے میں بھی چلنا مشکل ہے
یارانِ سفر ہیں تیز اے قدم اے کش مکش دل کیا ہو گا
رکتا ہوں تو بچھڑ جاتا ہوں چلتا ہوں تو چلنا مشکل ہے
اب ہم پہ کھلا ہے رازِ چمن، الجھا کے بہاروں میں دامن
کانٹوں سے نکلنا آسان تھا پھولوں سے نکلنا مشکل ہے
تابانی حسن عالم ہے گرمئی محبت کے دم سے
پروانے اگر محفل میں نہ ہوں پھر شمع کا جلنا مشکل ہے
ناکامی قسمت کیا شے ہے کیاچیز شکستہ پائی ہے
دوگام پہ منزل ہے لیکن دو گام بھی چلنا مشکل ہے
یہ میرا مذاق تشنہ بھی لے آیا مجھے کس منزل پر
بہکوں تو ہنسے گا مے خانہ سنبھلوں تو سنبھلنا مشکل ہے
لکھتے رہے خون دل سے جسے تائید نگاہ دوست میں ہم
اقبال اب اس افسانے کا عنوان بدلنا مشکل ہے

☆......☆......☆

''نرگس! جا کر دیکھو تو سہی یہ آبدار ابھی تک جاگی کیوں نہیں۔'' فضہ حیدر نے ملازمہ سے کہا تھا کہ آبدار سحر خیز تھی فجر کی نماز کے وقت اٹھتی تھی اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد کچھ دیر لان میں واک کرتی تھی یہی معمول فضہ حیدر کا تھا اس لئے آبدار کی عادت انہیں نہ صرف مرغوب تھی وہ اسے سراہتی بھی تھیں کہ انہیں فجر کی نماز کے بعد سونا بالکل پسند نہ تھا کہ وہ شوہر اور بیٹے کے آفس جانے کے بعد دس سے گیارہ سویا کرتی تھیں اور آبدار کا بھی تقریباً یہی معمول تھا کہ وہ فجر کے بعد نہیں سوتی تھی۔ نو بجے کے بعد کسی بھی وقت سو جاتی تھی اور آج وہ واک کے لئے نہیں آئی تھی اور نہ ہی اب تک ناشتہ کے لئے ٹیبل پر پہنچی تھی کہ وہ فضہ حیدر کے ساتھ واک کے بعد جوس یا چائے لیتی تھی اور ناشتہ سب کے ساتھ آٹھ بجے ہوتا تھا اور آج وہ ابھی تک غائب تھی۔ حیدر صاحب کے ساتھ ساتھ اندر آتا ابسام بھی چونک اٹھا تھا۔ اس نے والدین پر سلامتی بھیجتے ہوئے اپنی مخصوص چیئر سنبھالی تھی وہ تینوں ناشتہ کی ٹیبل پر آبدار کے منتظر تھے۔ کچھ دیر بعد ملازمہ اس اطلاع کے ساتھ چلی آئی تھی کہ آبدار دروازہ نہیں کھول رہی۔ وہ تینوں یکدم ہی مضطرب ہو گئے تھے کہ خلاف توقع چیز انسان کو اکثر مضطرب و پریشانی

کے گھیرے میں مقید کر دیتی ہے اور یہی حال ان تینوں کا تھا۔

''آپ دونوں ناشتہ شروع کریں میں دیکھتی ہوں۔'' وہ پریشانی سے کرسی کھسکا کر اُٹھتیں آبدار کے کمرے کی جانب بڑھی تھیں اور پے درپے ہونے والی دستک کے باوجود جواب ندارد تھا۔ وہ دونوں بھی اٹھ کر آ گئے تھے۔ فضہ حیدر کی پریشانی دیدنی تھی کچھ سوچ کر ابسام نے ملازمہ سے اس روم کی چابی لانے کو کہا تھا اور دروازہ ان لاکڈ کر کے فضہ حیدر کمرے میں داخل ہوئی تھیں اور بڑی تیزی میں بیڈ کی جانب بڑھی تھیں وہ بیڈ پر بے سدھ لیٹی تھی۔ انہوں نے پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا لگا تھا کہ کوئی انگارہ ہاتھ کو چھو گیا ہو انہوں نے متفکر سے انداز میں حیدر صاحب کو پکارا تھا اور وہ دونوں پھر مناسب سمجھتے ہوئے ان کے ساتھ ہی اندر کمرے میں آئے تھے اور فضہ حیدر کی پکار پر وہ باپ، بیٹا آگے پیچھے داخل ہوئے تھے۔

''حیدر اسے بہت تیز بخار ہے۔'' وہ بے ہوش آبدار کے سرہانے بیٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ اس نے ایک نظر آبدار کے متورم چہرے پر ڈالی تھی اور باپ کی ہدایت پر باہر نکلا تھا اور ڈاکٹر کو کال کر دی تھی کچھ ہی دیر میں ان کا فیملی ڈاکٹر آ گیا تھا۔

''بخار کی شدت کے باعث بے ہوشی طاری ہے۔ بٹ آپ پریشان نہ ہوں مسز حیدر کچھ دیر میں بخار اتر جائے گا۔'' ڈاکٹر مہران نے دھیمے سے کہتے ہوئے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کی ہدایت کے ساتھ انجکشن لگایا تھا اور دوائیاں لکھ کر دوائیوں کا پرچہ حیدر صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے ابسام کی رہنمائی میں روم سے باہر نکل گئے تھے۔

''حیدر، آپ اور ابسام جا کر ناشتہ کر لیں اور آفس چلے جائیں۔ آبدار کے پاس میں ہوں۔'' وہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے ہوئے بولی تھیں۔

''رات تک بالکل ٹھیک تھی یوں اچانک اتنا تیز بخار کیسے ہو گیا۔'' حیدر صاحب متفکر تھے کہ اپنی نیک عادات کے باعث وہ ان دونوں میاں بیوی کی پسندیدہ بن چکی تھی کہ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی اور آبدار کی صورت میں یکدم بیٹی کی کمی دور ہو گئی تھی اس لئے وہ دونوں اس وقت بلا مبالغہ اس کے لئے اس حد تک پریشان تھے جتنا اگر ان کی اپنی سگی بیٹی ہوتی تو وہ اس کے لئے پریشان ہوتے۔

''موسم بھی تو بدل رہا ہے حیدر......اور یہ لڑکی لاپرواہ بھی بہت ہے۔'' وہ بہت دھیمے سے بولی تھیں اور وہ کمرے سے نکل گئے تھے۔ ناشتہ کا بالکل بھی دل نہیں تھا اس لئے انہوں نے ابسام کے بہت کہنے کے باوجود صرف ایک کپ چائے لی تھی اور وہ سلائس کے بائٹ لیتا باپ کو بے حد متفکر دیکھ رہا تھا۔

''آپ اور ماما آبدار سے بہت زیادہ اٹیچ ہوتے جا رہے ہیں جبکہ آپ دونوں کو ہی پتہ ہے کہ وہ یہاں کچھ دنوں کی مہمان ہیں۔'' وہ آبدار کے سامنے سے ہی کتراتا تھا اور یوں اچانک اس کی بیماری نے اسے ڈسٹرب کر دیا تھا مگر ماں، باپ کی بے انتہا فکر اس کے لئے پریشانی کا باعث تھی تب ہی اس نے انہیں کچھ یاد دلانے کی کوشش کی تھی حیدر صاحب بیٹے کی بات پر مسکرا دیئے تھے۔

''جس وقت تم نے ہمیں آبدار کی یہاں موجودگی کے بارے میں بتایا تھا میں اور تمہاری ماما بہت پریشان ہو گئے تھے۔ یہی سوچ رہے تھے کہ جانے کیسی لڑکی کو تم نے دوست کی محبت میں اپنے گھر میں رکھ لیا ہے مگر آبدار بیٹی کو دیکھ کر عجیب سی اپنائیت محسوس ہوئی اور اس بچی نے اپنی سادہ طبیعت اور نیک اطوار سے ہمارا دل ہی جیت لیا ہے۔ ہمیشہ مجھے اور تمہاری ماما کو ایک بیٹی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی، دل میں ہمیشہ ایک خواہش سی رہی کہ کاش ہماری بھی ایک بیٹی ہوتی اور آبدار کو دیکھ کر لگا کہ ہماری بیٹی ہوتی تو بالکل آبدار کے جیسی ہوتی اور جب آبدار کو ہم نے بیٹی مان لیا ہے تو اس کے لئے بے قراری، اور فکر فطری بات ہے اور جہاں تک اس کے چلے جانے کی بات ہے تو بیٹیاں تو ہوتی ہی مہمان ہیں۔ والدین کے گھر میں آنکھ ہی مہمان کی حیثیت سے کھولتی ہیں۔ میکے سے سسرال جانے کے لئے تربیت و پرورش پاتی ہیں۔ آبدار جب یہاں سے جائے گی تو ہم بھی یہی سمجھ لیں گے کہ ہماری بیٹی اپنے گھر رخصت ہو گئی ہے۔'' حیدر صاحب نے بڑے مفصل الفاظ میں اپنی اور اپنی اہلیہ کی فیلنگز بیٹے کے گوش گزار کر دی تھیں اور باپ کے اتنے واضح الفاظ میں اقرار کے بعد ابسام کے پاس کہنے کو کچھ نہیں بچا تھا وہ آگے سے کچھ نہیں بولا تھا کہ وہ بہت کچھ محسوس تو خود بھی کر رہا تھا آج واضح اقرار بھی ہو گیا تھا۔

''تمہیں برا لگتا ہو گا اندازہ ہے ہمیں۔'' وہ بیٹے کی خاموشی محسوس کرتے دھیمے سے مسکرائے تھے ان دونوں میاں بیوی کی ہی عادت تھی کہ وہ اکثر بات ''ہم'' سے ہی کرتے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے ساتھ دوسرے کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ وہ باپ کی شرارت سمجھے بنا حیرانگی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''مجھے برا کیوں لگے گا پاپا۔'' وہ متحیر سا بولا تھا۔

''برا لگنا تو چاہیے۔'' ان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

''مجھے برا نہیں لگتا پاپا کہ میں تو آبدار کو اتنی عزت و محبت دینے پر آپ دونوں کا ہی مشکور ہوں کہ آئیکت نے مجھ پر بھروسہ کیا اور آپ دونوں نے آبدار کو محبت و اہمیت دے کر دوست کے سامنے میرا مان رکھ لیا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تھا حیدر صاحب کو اپنے بیٹے کی یہی سنجیدگی بہت پسند تھی کہ وہ جب اس کی عمر کے تھے اتنے ہی سنجیدہ، اپنے کام سے کام رکھنے والے تھے۔

''برخوردار میں تو بس اس لئے کہہ رہا تھا کہ تم نے ہمیشہ تمام تر توجہ و محبت اکیلے سمیٹی ہے کوئی بھائی بہن نہ تھا اس لئے شراکت برداشت نہیں کرنی پڑی اب جب سے آبدار بیٹی آئی ہے میری ہی نہیں تمہاری ماما کی بھی توجہ آبدار کی جانب ہو گئی ہے اس لئے کہہ رہا تھا کہ تمہیں برا تو لگتا ہو گا۔'' انہوں نے نرمی سے وضاحت دی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا۔

''اس پوائنٹ آف ویو سے دیکھا جائے تو ہاں مجھے برا لگتا ہے آپ کی تو پھر بھی خیر ہے مگر ماما کی توجہ مجھ پر کچھ کم ہو گئی ہے اور یہ مجھے سچ میں برا لگتا ہے۔'' وہ بچوں کی طرح منہ بنا کر بولا تھا اور وہ ہنس دیئے تھے۔

''میں فضہ تک تمہارے ارشادات پہنچا دوں گا۔'' وہ شریر انداز میں بولے تھے۔

''جی پلیز۔'' وہ دھیمے سے ہنس کر بولا تھا۔

''تم تیار ہو کر آفس چلے جاؤ میں کچھ دیر سے آ جاؤں گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولے تھے اور ابسام انہیں آبدار کے کمرے کی طرف بڑھتے دیکھ کر کچھ کہے بنا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا اور کچھ ہی دیر میں گھر سے آفس کا سفر شروع ہو گیا تھا جبکہ وہ دونوں میاں بیوی اس کی تیمارداری میں لگے تھے۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے کا کافی فائدہ ہوا تھا اس نے تقریباً گھنٹہ بعد مکمل طور پر آنکھیں کھول دی تھیں اور نقاہت کے باوجود بار بار شرمندگی کا اظہار کر رہی تھی اور فضہ حیدر نے اسے ڈپٹ دیا تھا اور ناشتہ اپنی نگرانی میں کروایا وہ ان کی اس قدر محبت پر بے اختیار رو پڑی تھی کہ اس طرح محبت اور توجہ سے تو اس کی سگی ماں نے اسے کچھ نہیں کھلایا تھا اتنے حق سے تو کبھی اسے کسی نے نہیں ڈانٹا تھا وہ ان دونوں میاں بیوی کے خلوص اور چاہتوں کی مقروض ہوتی جا رہی تھی اس کی جان پر ان کے کتنے قرض چڑھتے جا رہے تھے۔

آبدار کے لیے زندگی کچھ سہل ہو گئی تھی ابسام حیدر کے گھر میں اسے محبت، اپنائیت اور رشتوں کے اصل معنی و مفہوم سمجھ آنے لگے تھے۔ ابسام حیدر کے پیرنٹس کی اسے مکمل توجہ حاصل تھی۔ آبدار کو اب اس گھر میں اپنا دم گھٹتا محسوس نہیں ہوتا تھا، زندگی سی محسوس ہونے لگی تھی اور اس محسوس ہونے والی زندگی میں ایک جذبہ اس کے دل میں یوں سر اٹھانے لگا تھا کہ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی کہ آبدار کہ تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ دھیمے لہجے میں بات کرتا نہایت سنجیدہ وخوبرو ابسام حیدر اس کے دل کے ساز یوں چھیڑ دے گا کہ اسے اپنے چہار سو محبت محو رقص محسوس ہونے لگے گی مگر وہ اپنی فیلنگز سے نہایت خوفزدہ تھی۔ ابسام حیدر سے اس کا سامنا کھانے کی ٹیبل پر ہوتا تھا اور جب سے محبت نے اس کے گرد حصار باندھا تھا اس کی نگاہ ابسام حیدر کے گرد طواف کرنے لگی تھی، لاکھ نگاہ بچاتی تھی، نگاہ اٹھ ہی جاتی تھی، ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی، وہ ابسام حیدر کے احساس سے دامن چھڑانا چاہتی تھی اور وہ اس کے دل میں اور گہرائی سے اترتا جا رہا تھا اور ایسے میں آئیکت کا خیال ہی اسے بے چین کر دیتا تھا۔ وہ شخص جس نے اسے بہت چاہا تھا جس نے اسکی حفاظت کے لیے خود کو مشکل میں ڈال لیا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ لاکھ چاہت کے اقرار کیے تھے آئیکت اور کزئی نے اس سے، مگر اس کے دل میں اس کی شبیہہ کبھی نہیں اتری تھی۔ اس شخص کے ساتھ اسے ہمیشہ تحفظ کا احساس ہوا تھا۔ جس شخص کو اس نے ہمیشہ اپنے لیے مخلص پایا تھا وہ اس کے دل میں کبھی نہیں اتر سکا تھا باوجود اس کے کہ وہ ایک آئیکت پر ہی بھروسہ کرتی تھی۔ اسے ہمیشہ یقین ہوتا تھا کہ آئیکت اسے اکیلا نہیں چھوڑے گا اور اس مان کے باوجود کبھی آئیکت اسے اتنا اچھا نہیں لگا تھا جتنا ابسام حیدر لگنے لگا تھا۔

وہ احساس جو وہ ابسام کیلئیے محسوس کرنے لگی تھی وہ احساس لاکھ آئیکت کی چاہتوں کے باوجود وہ آئیکت کے لئیے محسوس نہیں کر پائی تھی اور یہ بات آبدار کے لیے تشویشناک تھی، وہ الجھی الجھی سی رہنے لگی تھی، ابسام سے ہر ممکن کترانے کی کوشش کرتی تھی۔ ابسام حیدر کے گھر میں رہتے ہوئے آبدار کو پورا ایک ماہ گزر گیا تھا اور فقط ایک ماہ کے ساتھ میں (اس ساتھ میں جس میں مدد کار فرما تھی) اسے ابسام حیدر اپنے ذہن و دل پر چھایا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ جذبہ جو وہ کبھی آئیکت کے لیے محسوس تک نہیں کر پائی تھی وہی جذبہ ابسام حیدر کے لیے

محسوس کررہی تھی۔آئیکت سے بات ہوئے تقریباً بیس دن گزر گئے تھے کہ اچانک آئیکت ''حیدر کاٹیج'' چلا آیا تھا اور کچھ دن پہلے تک جو وہ اس کے نہ آنے پر، بات نہ کرنے پر مضطرب تھی اب اس کے آجانے پر، پریشان ہوگئی تھی کہ اس کی بدلی سوچ، اس کے بدلے جذبات و محسوسات اسے خود سے ہی نہیں آئیکت اور کرنزئی سے بھی خائف کرگئے تھے۔

☆......☆......☆

''آبدار کو گھر سے گئے ایک ماہ سے زیادہ ہوگیا ہے۔اللہ جانے کہاں ہوگی، کس حال میں ہوگی۔'' تابندہ شوکت، آبدار کا ذکر کرتیں آبدیدہ ہوگئی تھیں۔

''بھابھی آپ اس بدبخت لڑکی کو یاد کرنا چھوڑ دیں جو جانے کس کے ساتھ منہ کالا کر کے بھاگ گئی اور ہمارے لئے عذاب چھوڑ گئی۔'' رخسانہ جہانزیب کے لہجے میں نفرت کی آنچ تھی۔

''ایسے نہ بولا کرو رخسانہ کہ مجھے پورا یقین ہے کہ آبدار ایسی نہیں تھی۔'' وہ دیورانی کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

''وہ کیسی تھی یہ اس کے گھر سے بھاگنے سے ہی لگ گیا ہے پتہ۔ارے جس کے باپ کے کردار، حسب نسب کا نہیں پتہ اس لڑکی سے اچھے کی امید ہی عبث تھی۔آپ نے ہی اسے سرچڑھایا ہوا تھا۔لگا گئی وہ آپ کی ناک پر چونا اور آپ کو ابھی بھی اس کی نیک نامی عزیز ہے۔'' رخسانہ اپنے مزاج کے مطابق بولی تھیں کہ وہ جس وقت رخصت ہو کر اور کرنزئی پیلس آئی تھیں سیدھی سادی جٹھانی ہی نے ان کا استقبال کیا تھا تابندہ شوکت اور کرنزئی بھی دھیمے مزاج کے اپنے کام سے کام رکھنے والے انسان تھے۔رخسانہ کا خود جتنا مزاج تیکھا تھا شوہر کا مزاج الامان الحفیظ...... کہ جہانزیب اور کرنزئی کہنے کو شوکت اور کرنزئی سے چار برس چھوٹے تھے مگر گھر میں حکم و حتمی فیصلہ جہانزیب کا ہی مانا جاتا تھا کہ وہ سخت مزاج کے ایک غصیلے انسان تھے۔رخسانہ نے شوہر کی پاور کو چند دن میں ہی بھانپ لیا تھا اور شوہر کے مزاج کے مطابق چلتی تھیں کہ سب کچھ ان کا ہی تھا اور یہی وجہ تھی کہ شوہر کی طرح گھر میں ان کی چلتی تھی۔گھر کے پانچوں بچوں پر ہی ان کا اچھا خاصا رعب تھا۔پانچوں ہی رخسانہ جہانزیب کے سامنے دم نہیں مارتے تھے۔

''بس کردو رخسانہ، میں نے تمہارے سامنے اس لئے دل کی بات نہیں کی تھی کہ تم اس بچی کے بخیہ ادھیڑنا شروع کردو۔'' وہ ناگواری سے کہتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''آبدار کی حرکت کی وجہ سے گھر کی دونوں بچیوں کو گھر میں محصور کردیا گیا ہے اور اس کے باوجود آپ اس کی حمایت کررہی ہیں۔'' وہ جیٹھانی کی بات پر تلملائی تو بہت تھیں مگر ظاہر نہیں کیا تھا کہ تابندہ کی ان کے شوہر بہت عزت کرتے تھے اور وہ چاہے خاندان بھر میں تابندہ شوکت کے نام کا ڈنکا بجنے کی وجہ سے ان سے کتنی خائف رہتی تھیں مگر بظاہر میٹھی چھری ہی بنی رہتی تھیں اس وقت بھی لحاظ و مروت کا مظاہرہ کرگئی تھیں۔

''میں حمایت نہیں کر رہی رخسانہ۔ مگر وہ بچی میرے سامنے پل کر بڑی ہوئی ہے۔ اس کی تربیت و پرورش کی ہے میں نے اور مجھے اس پر گھر کی دونوں لڑکیوں کی طرح ہی بھروسہ ہے۔'' وہ رک کر دھیمے سے بولی تھیں۔

''بھروسہ تو وہ خیر آپ کا توڑ گئی ہے اور اس اندھے بھروسے کی مالا اب تو جپنا بند ہی کر دیں تو بہتر کہ اس کے کارنامے کا اثر اس گھر کی بچیوں پر ہی پڑے گا۔ ابھی زمانے سے چھپایا ہوا ہے آبدار کے بھاگ جانے کا مگر کب تک چھپا کر رکھیں گے آخر، ایک نہ ایک دن بات گھر سے نکل ہی جائے گی۔'' تابندہ کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھیں مگر رخسانہ کی زبان درازی اور منہ پھٹ فطرت سے خائف ہی رہتی تھیں اور انہوں نے آبشار کو بھی دیکھ لیا تھا اس لئے آگے سے کچھ نہیں بولی تھیں اور لاؤنج سے نکل گئی تھیں جبکہ اپنے کمرے تک آتے آبشار اور کنزئی نے گویا پل صراط کا سفر طے کیا تھا۔

''میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی آبدار کہ تمہارے باپ کے دیئے گھاؤ آج بھی مجھے زندہ رکھے ہوئے ہیں اور تم نے باپ کی سی فطرت کا مظاہرہ کر کے میرے گھاؤ کچھ اور بڑھا دیئے ہیں۔ تم باپ بیٹی میری زندگی کا روگ ہو۔ کبھی میں تمہارے باپ کا گریبان پکڑ کر اس سے اپنا قصور نہ پوچھ سکی۔ تل تل کر کے زندگی گزاری مگر اف تک نہ کی اور تم نے اپنے باپ کے خون کا اثر یوں دکھایا کہ میری مشکلات میں اضافہ کر گئیں اور بددعا تو میں تمہارے باپ کو بھی نہیں دے پائی تھی تمہیں کیا دوں گی۔ بس امید پر جی رہی ہوں کہ ایک دن حساب ہوگا، مجھے ذلیل و رسوا کرنے والوں کا حساب ہوگا اور روز محشر میں تمہارے باپ کو اور تمہیں معاف نہیں کروں گی آبدار۔ میں اپنی ذلت و رسوائی کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' وہ نیچے کارپٹ پر بیٹھی تھیں بری طرح سسک رہی تھیں ان کی سسکیاں ہمیشہ کی طرح کمرے کی فضا میں گونجتی وہیں ٹھہرتی جا رہی تھیں۔ کچھ دیر قبل کمرے کی ہر شے رو رہی تھی اور اب ہر شے پر سکوت طاری تھا۔ موت کا سا سناٹا جس میں روح اذیت سے چیخ رہی ہوتی ہے اور جسم کرب سے بلبلا رہا ہوتا ہے اور بظاہر خاموشی کا راج ہوتا ہے اور وہ برسوں سے ایسی ہی وحشت ناک خامشی کے درمیان زندگی کے کاسے میں سانسوں کے سکے گرا رہی تھیں کہ زندگی اصل زندگی تو بہت پہلے مر گئی تھی۔ روح کب کی فنا ہو چکی تھی ایک جسم زندہ تھا۔ سانس کے آنے تک جسے زندہ ہی رہنا تھا۔

☆......☆......☆

''کیسی ہو عرمی؟'' عریم لان میں بیٹھی ناول ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی کہ اس کی چائے بھی رکھے رکھے ٹھنڈی ہو چکی تھی ناول کے صفحات بھی یونہی پلٹتے جا رہے تھے کہ اس کی اپنی زندگی خود ایک فسانہ بنی ہوئی تھی وہ فرضی فسانوں میں کہاں ذہن و دل کو اٹکا سکتی تھی اس پر متضاد فارس کی آمد نے اس کے ذہن و دل کی کثافت کچھ اور بڑھا دی تھی وہ سلام کرتی اٹھ کر جانے لگی تھی کہ نہایت بے تکلفی سے پوچھا تھا اور وہ چونک کر رکتی اسے دیکھنے لگی تھی جس کے چہرے پر اپنائیت بھری مسکان تھی۔ فارس اس کی اکلوتی خالہ کا اکلوتا بیٹا تھا جس کا آنا جانا لگا رہتا تھا جس سے اس کی کافی اچھی سلام دعا تھی کافی حد تک بات چیت تھی وہ رشتہ کیا بدلا تھا اس سے گریزاں ہو گئی تھی کہ وہ فارس کو دھوکا نہیں

دینا چاہتی تھی مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ اس کو دھوکا دے رہی تھی اس کے جذبات سے کھیل رہی تھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' وہ نظر چرا کر بولی تھی۔

''ٹھیک لگ تو نہیں رہی ہو۔'' وہ اس کی جھلملاتی آنکھیں دیکھ کر دھیمے سے بولا تھا اور اسے خود کو کمپوز رکھنا قیامت لگنے لگا تھا۔

''بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ اس کو ضبط سے گزرتے دیکھ کر دھیمے سے بولا تھا اور وہ بڑی خامشی سے کرسی پر آن بیٹھی تھی۔

''ماما تمہیں اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں اور یہ رشتہ ماما کی ہی نہیں میری بھی دلی خواہش ہے۔ میں نے اپنے ذہن و دل کی آمادگی کے ساتھ رشتہ جوڑا ہے اور تم سے منگنی سے پہلے بھی تمہاری مرضی پوچھی تھی آج پھر پوچھ رہا ہوں کیونکہ تم مجھے اس رشتے سے بالکل خوش نہیں لگ رہی ہو۔'' وہ بیٹھتے ہی گہری سنجیدگی سے بولتا چلا گیا تھا کہ اس نے منگنی سے پہلے اس کی مرضی پوچھی تھی اور وہ اقرار و انکار کا حق نہ رکھتے ہوئے فیصلہ کا بھی اختیار اپنے پاپا کو دے گئی تھی اور وہ عریم کے انداز دیکھ کر مضطرب ہو گیا تھا مگر یہ سوچ کر خاموشی اختیار کر لی تھی کہ وہ اپنے خالو سے بھی اچھی طرح واقف تھا مگر دن بہ دن عریم کا گریز اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا آج کھل کر بات کرنے پر مجبور کر گیا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ خود کو کمپوز کر کے بولی تھی۔

''پھر کیسی بات ہے عرمی۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔'' اس کی سنجیدگی ہنوز برقرار تھی۔

''میں اتنی جلدی شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ کچھ سوچ کر بولی تھی اور وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''پاپا نے نیکسٹ منتھ کی ڈیٹ فکسڈ کر دی ہے جبکہ میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔'' وہ دھیمے سے بول رہی تھی اور اس کی رکی ہوئی سانس بحال ہو گئی تھی کہ اسے عریم سے محبت تھی اور عریم کا گریز اس کے دل کی دنیا تہہ و بالا کرنے کے درپر تھا یکدم گونا گو سکون میسر آ گیا تھا۔

''بس اتنی سی بات تھی۔'' وہ مسکرایا تھا اور وہ حیرت سے فارس کو دیکھنے لگی تھی اور اس کی حیرت محسوس کرتا وہ دلکشی سے بولا تھا۔

''میرے لئے تم اور تمہاری خوشی اہم ہے عرمی، تم اگر اس شام جب میں نے تم سے تمہاری مرضی پوچھی تھی تب ہی یہ سب کہہ دیتیں تو اتنے دن تم پریشان نہ رہتیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا اور وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''سمجھ نہ آنے والی کیا بات ہے۔ ہوگا وہی جو تم چاہو گی۔ شادی اگلے ماہ نہیں ہوگی۔ تمہارے گریجویشن کے بعد ہوگی۔'' وہ ٹیبل پر ہاتھ جماتا قدرے اس کے چہرے کے پاس جھکتے ہوئے دلکشی سے بولا تھا اور وہ تو ایک دم ہی کھل اٹھی تھی۔

''آپ، سچ کہہ رہے ہیں۔'' وہ بے ربط ہوئی تھی اور وہ اس کے اداس چہرے پر سمٹ آنے والی بہار کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا تھا۔

''تمہاری قسم، سچ۔'' وہ خمار آلود لہجے میں بولا تھا اور وہ کہاں اس کی بے قراری اس کی نظر کا ٹھہرنا اس کے جذبے سمجھ پائی تھی کہ وہ تو خوشی کے مارے مر جانے کو تھی وہ تو اس بات میں کھوئی تھی کہ شادی اگلے ماہ نہیں ہو رہی چونکی تو جب تھی جب اس کے ٹیبل پر رکھے ہاتھ پر

فارس کا ہاتھ آن ٹھہرا تھا وہ بہت چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی جو اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا تھا اور وہ نظر چراتی ہاتھ کھینچ کر کرسی سے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''بلیومی عرمی، شادی تمہارے گریجویشن کے بعد ہی ہوگی۔ میں ماما اور انکل سے بات کرلوں گا یوڈونٹ وری۔'' وہ اس کے مقابل آتا ہوا بولا تھا۔

''پاپا کبھی نہیں مانیں گے۔'' وہ دونوں ہاتھ اضطراری حالت میں آپس میں مسلتے ہوئے منمنائی تھی۔

''سب کو کیسے ہینڈل کرنا ہے وہ میرا مسئلہ ہے تم اس ٹینشن سے نکل جاؤ اور خوش رہا کرو۔ تمہاری خوشی بہت معنی رکھتی ہے میرے لئے۔ میں تمہاری خوشی کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔'' وہ اس کے لئے اپنے دل میں موجود جذبات سے اسے آگاہی فراہم کررہا تھا وہ لب کچلنے لگی تھی۔

''کچھ بھی......''اس نے نظر اٹھائی تھی اور وہ عزم ویقین سے مسکرادیا تھا۔

''ہاں۔ کچھ بھی۔ آزما کر دیکھ لینا۔'' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی تھی جبکہ وہ فارس کی نگاہ میں تادیر نہ دیکھ سکی تھی نگاہ چراتی بڑی تیزی میں اندر کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اسے فارس پر یقین تھا کہ وہ پاپا کو منالے گا اور وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے پہلے کیوں فارس سے مدد لینے کا خیال نہیں آیا، وہ کافی دن بعد خود کو ریلیکس محسوس کررہی تھی اور آج تقریباً پندرہ دن بعد اس نے خود شاہ زیب کا نمبر ملایا تھا اور ہر بیل کے ساتھ اس کے دل سے صدا بلند ہورہی تھی کہ کاش وہ اس کی کال ریسیو کرلے شاید قبولیت کی گھڑی تھی۔ پہلی بیل پر شاہ زیب کا گمبھیر لہجہ کانوں میں گونج اٹھا تھا اور اس سے دل کا سنبھالنا مشکل ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

''عبیر۔ تم نے میری ناپسندیدگی کے باوجود یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتی آخر کیا سوچ کر اپنا پرپوزل بھیجا ہے۔''
عبیر کلاس لے کر نکلا ہی تھا کہ اس کا انتظار کرتی مومل اس کی راہ میں آگئی تھی اور بات کرنی ہے کہہ کر کینٹین کی طرف بڑھ گئی تھی وہ اس کے تیوروں سے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ پرپوزل کے حوالے سے بات کرنا چاہتی ہے وہ دونوں کینٹین میں آمنے سامنے بیٹھے تھے کہ وہ اس سے آرڈر کرنے کا کہتا کہ وہ کڑے تیوروں سے اسے گھورتی دبے دبے لہجے میں غرائی تھی۔

''تم مجھ سے ناپسندیدگی کا اظہار کرسکتی ہو، نفرت کا ڈنکا بجاسکتی ہو مگر مجھے نہ محبت کرنے سے روک سکتی ہو اور نہ ہی قسمت آزمانے سے۔'' وہ مومل کی آنکھوں سے نکلتے شعلے دیکھ کر خاکستر ہی تو ہوگیا تھا اس لئے مومل سے زیادہ کڑوے لہجے میں بہت کچھ باور کروانا چاہا تھا مگر وہ کہاں کم تھی سخت اشتعال میں آگئی تھی۔

''بکواس بند کرو عبیر۔ تم اپنی ان حرکتوں کی وجہ سے ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید برے لگنے لگے ہو۔ یاد رکھنا میں تم کو پسند نہیں

کرتی، نہ ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔تم مجھ پر دباؤ نہیں ڈال سکتے۔'' وہ آنکھوں میں چنگاریاں لئے آس پاس سیٹوں پر براجمان اسٹوڈنٹس کی وجہ سے کافی دھیمے لہجے میں بول رہی تھی وگرنہ اس کا بس چلتا تو چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتی اور وہ سچ میں غصہ میں بدلحاظی سے چیخ پڑتی اور یونیورسٹی میں ان کا اسکینڈل بنتا اس سے قبل ہی وہ سیٹ سے اٹھ گیا تھا اور وہ وہیں پیچ و تاب کھاتی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی اور جیسے ہی دماغ کچھ سوچنے و سمجھنے کے قابل ہوا تھا۔وہ کینٹین سے باہر نکلی تھی اور وہ اسے دور سے ہی اپنی گاڑی کے پاس کھڑا نظر آیا تھا۔وہ اس بات سے انجان کہ وہ اس کا ہی انتظار کر رہا ہے تقریباً دوڑ کر اس تک پہنچی تھی۔

''تم میری پوری بات سنے بغیر کہیں نہیں جا سکتے۔'' وہ اس سے کچھ فاصلے پر ٹھہرتی غرائی تھی وہ اس کا ضبط سے پڑتا لہو رنگ چہرہ دیکھ کر بھی کچھ نہیں بولا تھا اور فرنٹ ڈور کھول دیا تھا۔اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہی نوائم کو ایک ٹیکسٹ کیا تھا۔

''میں عبیر کے ساتھ جا رہی ہوں اس سے بات کرنی ہے تم یونیورسٹی میں ہی میرا ویٹ کرنا ایک گھنٹہ تک آ جاؤں گی۔'' اس نے موبائل بیگ میں ڈال دیا تھا۔گاڑی کی رفتار معمول سے کہیں زیادہ کم تھی کہ اس نے بات مول سے گاڑی میں ہی کرنی تھی کہ وہ جو بات کرنا چاہ رہی تھی وہ گھر پر نہیں ہو سکتی تھی اور جو اس کے تیور تھے ان کی وجہ سے وہ پبلک پلیس سے اٹھ آیا تھا اور ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے پھٹ پڑنے کا منتظر تھا اس نے موبائل بیگ میں ڈالا اور سنجیدگی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے عبیر کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''عبیر، جب مجھے تم سے شادی کرنی ہی نہیں ہے تو تم کیوں کر رہے ہو یہ سب......''

''قسمت آزما رہا ہوں۔'' وہ بات کاٹ کر بولا تھا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم اس طرح مجھ پر دباؤ ڈال کر سرخرو ہو جاؤ گے، مجھے پا لو گے۔'' وہ کنٹرول کھونے لگی تھی۔

''یقین نہیں ہے مگر امید ضرور ہے کہ ہاں، میں تمہیں پا لوں گا۔'' وہ اسپیڈ مزید کم کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگا تھا اور وہ ایک پل کے لئے چپ کی چپ رہ گئی تھی اور دوسرے پل اسی سنگدلی سے بولی تھی جو اس کے لئے مخصوص تھی۔

''یاد رکھنا زبردستی تم بس مجھ سے شادی کر سکتے ہو، میرے دل میں جگہ نہیں پا سکتے۔میرے دل میں مقام نہیں بنا سکتے۔میری محبت نہیں بن سکتے۔'' اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی وہ اس سنگدل کو دیکھ رہا تھا جس پر اس کی محبت اثر ہی نہیں کرتی تھی۔وہ تو شکر تھا کہ اسپیڈ نہ ہونے کے برابر تھی اسی لئے چند لمحوں میں وہ پھر اسٹیئرنگ پر گرفت کر گیا تھا مگر دل پر گرفت کیسے کرتا جو سینے سے نکلنے کو بے تاب تھا وہ کچھ بولنے سے قاصر ہی رہا تھا اور وہ مزید بولی تھی۔

''میں شادی سے انکار نہیں کر سکتی ہوں کہ پاپا کا ووٹ تمہارے حق میں ہے اور میں پاپا سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے عبیر سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ دھیمے لہجے میں بے بسی سے بول رہی تھی کہ وہ انکار کر پاتی تو اس سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

''کاش! تم مجھ سے بھی یہ نہ کہہ پاتیں کہ تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتیں......کاش تم یہ بھی نہ کہتیں کہ تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔'' اس نے

بے بسی سے سوچا تھا۔

''اور تم میری اس بے بسی سے فائدہ مت اٹھاؤ کہ زبردستی کے رشتے کسی کو خوشی نہیں دیتے۔ میں اور تم ایک ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔'' وہ اسے تنبیہ کرتی گویا پیش گوئی کا شعبہ سنبھال گئی تھی۔

''مجھ سے شادی نہ کرنے کی وجہ کوئی 'اور' ہے...... یا کوئی اور وجہ ہے۔'' وہ دھیمے سے پوچھ رہا تھا۔

''تم فضول میں اپنا دماغ مت چلاؤ کہ یاد رکھنا کہ میں تمہیں ناپسند کرتی ہوں اور شادی نہ کرنے کی یہی وجہ کافی ہے۔'' وہ اسے گھور رہی تھی جسے گونا گو سکون کا احساس ہوا تھا مگر موحّل پر اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔

''یہ کبھی مت بھولنا عبیر عباسی کہ ایک بیٹی کمزور پڑ سکتی ہے مگر ایک لڑکی نہیں۔ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی گر مجبور ہوئی تو صرف اپنے پاپا کے لئے کہ میں ان کا مان کبھی نہیں توڑنا چاہوں گی۔ میرے فرض کو میری کمزور مت سمجھنا کہ اگر میرے ذہن و دل میں کوئی 'اور' ہوتا تو میں اسے پانے کی کوشش ضرور کرتی کہ میں کمزور نہیں ہوں۔'' وہ آگے بھی بہت کچھ بول رہی تھی کہ یکدم وہ گاڑی روکتا اس کا بازو دبوچ گیا تھا۔

''میں بھی اسی لئے قسمت آزما رہا ہوں...... کوشش کر رہا ہوں کہ میں کمزور نہیں ہوں اور جب تم کوشش کرتیں تو میں کیوں کوشش نہ کروں؟'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سوال کر رہا تھا یکدم وہ لب دانتوں تلے دبا گئی تھی کہ اسے ایک لمحہ میں احساس ہوا تھا کہ اس نے فی الحال جو کچھ کہا تھا وہ خود اس کے انگیسٹ میں اور عبیر کے فیور میں چلا گیا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم مجھے ناپسند کرتی ہو مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم کسی اور کو پسند نہیں کرتیں اس لئے میں نے پرپوزل بھیجا...... اور مجھے یقین ہے کہ ہماری شادی ضرور ہوگی اور مجھے امید ہے کہ ایک دن تمہیں بھی مجھ سے محبت ہو جائے گی۔'' وہ اسے ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتی بازو آزاد کروانے کی کوشش میں تھی کہ اس نے موحّل کے حسین چہرے کو محبت پاس نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کا بازو آزاد کر دیا تھا۔

''تم نے اگر میری مرضی کے خلاف، مجھے مجبور کر کے شادی کی تو میں تمہاری زندگی جہنم بنا دوں گی۔'' وہ پھنکاری تھی اور وہ ہنس دیا تھا۔

''میری زندگی میں جس دن موحّل احمد شامل ہوگی میری زندگی جنت بن جائے گی۔'' وہ اسے چڑا رہا تھا اور وہ لب بھینچ گئی تھی کہ وہ جو اسے شادی سے باز رکھنے کے لئے کہنے کو آئی تھی یہ اور بات تھی کہ بازی ہی پلٹ گئی تھی کہ وہ خود کو مضبوط ثابت کرنے کی کوشش میں بہت کمزور اور کمزور ثابت کرنے کی کوشش میں مضبوط ثابت کرتی اس کے ارادوں کو نئی راہ دکھا گئی تھی کہ اس کے ارادوں کو مضبوط تو کرنے کو تو یہ بات ہی کافی تھی کہ وہ اگر اسے ناپسند کرتی ہے تو کسی اور پسند بھی تو نہیں کرتی اور وہ مطمئن و سرشار سا اسٹریو آن کر گیا تھا۔

آج تو غیر سہی پیار سے بیر سہی
تیری آنکھوں میں کوئی پیار کا پیغام نہیں
تجھ کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں

گانے کے بول ایسے تھے کہ وہ اسے دیکھنے لگی تھی جس کے لبوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''اپنی چھچھوری حرکتوں سے باز رہو اور گاڑی کی اسپیڈ بڑھاؤ۔ نوائم میرا ویٹ کر رہی ہوگی۔''اس نے اسٹریو بند کرتے ہوئے ناگواری سے کہا تھا۔

''گانا بہت اولڈ سہی مگر حسب حال ہے اسی لئے چلایا ہے۔''وہ مزے سے کہتا اسٹریو پھر آن کر گیا تھا اور سنگر کے ساتھ ساتھ اب خود بھی گنگنا رہا تھا اور اس کی یہی حرکتیں تو اسے سخت زہر لگتی تھیں۔ وہ لب پر لب سختی سے جما کر خود کو کچھ کہنے سے باز رکھ گئی تھی جبکہ عبیر نے سنگر کی آواز کا گلا گھونٹا تھا اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ خود گنگنا رہا تھا اور وہ شدید ناگواری و غصہ کے باوجود اسے سننے پر مجبور تھی کہ اس نے آج یہ مصیبت خود مول لی تھی اس سے بچنے کی راہ تلاشنے آئی تھی اور اسے قسمت آزمانے کی راہ پر چلنے کی کوشش کو تیز کرنے کی راہ دکھا کر جا رہی تھی اس لئے وہ شکستہ تھی اور وہ بے حد مطمئن اور سرشار تھا اور اس کا اطمینان اس کے لہجے سے عیاں تھا اس کی گنگناہٹ میں جذبے ہی نہیں عزم بھی بول رہا تھا۔

ساری دنیا میں فقط تجھ سے محبت کی ہے
تو کسی اور کی ہو جائے یہ ممکن ہی نہیں
نام تیرا ہی میرے نام کے ساتھ آئے گا
تو کسی اور کی کہلائے یہ ممکن ہی نہیں
ناز ہے تجھ کو بہت حسن پہ اپنے لیکن
تیرے سر کو نہ جھکایا تو میرا نام نہیں
تجھ کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں

گاڑی یونیورسٹی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تھی وہ اترنے کو تھی کہ وہ اس کا بازو تھام گیا تھا۔

''تجھ کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں''

وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا شوخی سے گنگنایا تھا اور وہ ایک جھٹکے سے اپنا بازو آزاد کرواتی پھنکاری تھی۔

''بہت پچھتاؤ گے عبیر عباسی۔''اس کے بس میں ہوتا تو وہ عبیر کی مسکراہٹ نوچ کر پھینک دیتی جو اس کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔

''تمہاری زندگی جہنم نہ بنا دی تو کہنا۔''مومل کے لہجہ میں کوئی رعایت، کسی قسم کی لچک نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ ہنس دیا تھا کہ زندگی مانگنے آئی تھی اور زندگی دے کر جا رہی تھی وہ مسرور کیوں نہ ہوتا۔

''کہتے ہیں اپنا مارتا بھی ہے تو ڈالتا چھاؤں میں ہی ہے اسی لئے ایک بار میری بن جاؤ پھر جو چاہے سلوک کرنا۔''اس نے آنکھ دبائی تھی

اور وہ یکدم سرخ پڑتی اس کی مزید بکواس سننے سے قبل ہی گاڑی سے اتر گئی تھی اور اس نے نوائم کو موحل کی طرف آتے دیکھ کر گاڑی بڑی تیزی میں دوڑا دی تھی۔نوائم نے موحل کو دیکھا تھا جس کے چہرے کی رنگت سرخ تھی اس کے ہونٹ خود بہ خود سیٹی کے انداز میں کھل گئے تھے۔

''لگتا ہے آج پہلی بار تم نے عبیر سے پیار و محبت کی باتیں کر ہی ڈالی ہیں۔'' نوائم معنی خیزی سے کہتی شرارت سے مسکرا رہی تھی جبکہ موحل جو پہلے ہی جلی بیٹھی تھی اس کی بکواس پر جل کر خاکستر ہو گئی تھی۔

''بکواس بند کردو۔عبیر عباسی سے رومینس کرتی ہے میری جوتی۔ بڑا زعم ہے اسے خود پر، اپنی محبت پر، ناکوں چنے نہ چبوا دیئے تو میرا بھی نام موحل احمد نہیں۔'' وہ تنفر سے بولتی گاڑی کی طرف بڑھ گئی تھی اسے موحل کی بات ہی نہیں انداز بھی برا لگا تھا مگر بولی کچھ نہیں تھی نہ ہی کچھ پوچھا تھا کہ جانتی تھی کہ جب غصہ تھوڑا کم ہو گا وہ خود آ کر اسے تمام تر تفصیل سے آگاہ کر دے گی۔

☆......☆......☆

''کیسی ہو جان شاہ۔'' شاہ زیب نے کافی عرصہ بعد گھمبیر لہجہ میں محبت سمو کر نوائم کو پکارا تھا اور شاہ زیب کی پکار میں تو تھا ہی کوئی سحر وہ یوں اس کی اور بڑھتی تھی جیسے پروانہ شمع کی اور بڑھتا ہے۔

''ٹھیک۔'' اس کے لب لرز کر رہ گئے تھے۔

''ٹھیک لگ تو نہیں رہی ہو۔'' اس نے بڑی فرصت سے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے سگریٹ سلگائی تھی اور وہ اس کے لہجے کے معنی خیزی محسوس کرتی سرخ پڑ گئی تھی۔

''آئی مس یو یار۔'' وہ جانتا تھا کہ وہ اب آگے سے کچھ نہیں بولے گی کہ وہ اس کے جذبوں کے آگے یونہی بے بس ہو جاتی تھی وہ کبھی ترنگ میں آ کر اسے چھیڑتا تھا تو وہ ''ہوں، ہاں'' کے علاوہ کوئی معقول جواب دے ہی نہیں پاتی تھی اور وہ کبھی کبھی ابھرنے والی ہوں اور سانسوں کی آواز سے اس کی موجودگی کو یقینی بنائے اسے مزید تنگ کرتا جاتا تھا اور آج اس کا موڈ نہایت خوشگوار تھا کہ وہ جس پراجیکٹ پر کام کر رہا تھا وہ کامیاب رہا تھا آج اس کو سراہا گیا تھا اور وہ مسرور تھا اور اس نے کچھ سوچ کر ہی عریم کو کال ملائی تھی اور اسے تنگ کرتے ہوئے اپنی خوشی اس کے ساتھ بانٹی تھی کہ اس کے عزائم کچھ بھی تھے اسے عریم سے اپنے سکھ، دکھ کہنا جانے کیوں بہت بھلا لگتا تھا اور وہ تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی کہ جب وہ اس سے اپنی بات شیئر کرتا تھا تو اسے اپنی ویلیو کا خوب اندازہ ہوتا تھا وہ طمانیت سے مسکرا رہی تھی اسے خوب دل سے بہت اچھے سے مبارک باد دی تھی جس کے جواب میں اس نے بے قراری سے کہا تھا۔

''مس یو ٹو۔'' وہ منمنائی تھی۔

''ملنا ہے تم سے...... بولو کب آ سکتی ہو۔'' اس کے خیال میں عریم کا حسین سراپا لہرایا تھا اور وہ سگریٹ ایش ٹرے میں ڈالتا، بے چینی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ملنے تو نہیں آسکتی شاہ۔'' وہ اس کی فرمائش پر منمنائی تھی۔

''کیوں۔'' یکدم اس کا لہجہ انتہائی سرد ہو گیا تھا۔

''وجہ آپ جانتے تو ہیں۔'' وہ اس کے فقط ایک لفظ سے اس کے مزاج کی برہمی پا گئی تھی۔

''فضول بات نہیں سننی ہے میں نے عریم۔ صرف یہ بتاؤ کب آسکتی ہو کہ میں نے تم سے کل ہی ملنا ہے۔'' وہ برہمی سے بولا تھا اور اس کی جان پر بن آئی تھی کہ اس کی ناراضگی سے اس کی جان جاتی تھی۔

''میں نہیں آسکتی ہوں شاہ، گھر سے اکیلے نکلتی نہیں ہوں اور کالج آج کل آف ہے خود بتایئے آپ سے ملنے کی سبیل کیونکر ہو۔'' وہ الجھ کر مضطرب سی بول رہی تھی۔

''تم جانتی ہو عریم۔ انکار سننے کا میں عادی نہیں ہوں۔ آج بہت خوش ہوں۔ تم میری خوشی کافور کرنا چاہتی ہو تو صاف کہہ دو۔'' وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے برہم ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔

''آپ بھی تو میری مجبوریوں کو سمجھا کریں۔'' اس کا لہجہ نمناک ہو گیا تھا۔

''تم نے آنا ہے یا نہیں؟'' اس کا وہی سنگدلانہ انداز تھا۔

''نہیں۔'' اسے کہاں عریم سے صاف جواب کی امید تھی اس کی پیشانی کی رگ پھڑک اٹھی۔

''اپنی تذلیل بھولتا نہیں ہوں میں......'' وہ سلگ کر بولا تھا۔

''میں نے آپ کی تذلیل نہیں کی ہے شاہ۔ بس اپنی مجبوری بتائی ہے۔'' وہ اس کے بھڑکنے پر بالکل بے بس ہو گئی تھی اس کے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے مگر اس بے حس انسان کو اس کے لہجے کی نمی سے کوئی لینا دینا نہ تھا کہ وہ صرف اپنی منوانا چاہتا تھا اس کی نظر میں صرف اپنی اہمیت تھی اور وہ صرف اپنی بات کو اہمیت دیتا تھا۔

''مجبوری مائی فٹ......اس شام کی بے عزتی بھولی نہیں ہے مجھے عریم جو تم نے تڑاخ، تڑاخ اپنی باتوں کے جوتے میرے منہ پر مارے تھے اور آج تمہارا صاف انکار میرے منہ پر جوتے کی طرح آ لگا ہے۔ اگر تمہاری مجبوریاں ہیں تو میں بھی تم سے ملنے کو تڑپ نہیں رہا۔ آخری کال تھی یہ میری۔ میری جوتی کو بھی غرض نہیں پڑی تمہیں کال کر کے تم سے بات کرنے کی۔ خدا حافظ۔'' وہ بھگو بھگو کر مار رہا تھا۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اپنی کہہ کر رابطہ منقطع کر گیا تھا اور وہ ساکت سی موبائل ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی اس کے رونے میں یکدم ہی شدت آ گئی تھی اس نے موبائل اٹھا کر پھینک دیا تھا اور بلک بلک کر روئی تھی۔ شاہ زیب نے موبائل سائیڈ پر ڈال کر پانی پیا تھا کہ کچھ تو غصہ ٹھنڈا ہو مگر اس کے غصہ میں اضافہ ہی ہوا تھا کہ جب بھی اس نے اس طرح کا ری ایکشن دے کر فون بند کیا تھا عریم کی کال آنے لگتی تھی اور وہ ریسیو نہیں کرتا تھا تو ٹیکسٹ متواتر آتے تھے مگر اس کا فون بالکل خاموش پڑا تھا۔

''عریم! تم مجھے ایٹی ٹیوڈ دکھانے لگی ہو۔تمہارے اس ایٹی ٹیوڈ کے ساتھ تمہیں بھی تباہ و برباد کردوں گا میں، کسی کی اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ شاہ زیب اورکزئی کے آگے دم مار سکے اور تم چھٹانک بھر کی لڑکی میرے منہ کو آنے لگی ہو'' وہ کمرے کی ہر چیز کو ٹھوکر پر اڑاتا باہر نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا اس نے عریم کو بھی اس طرح اپنے سحر میں جکڑا تھا، اپنی کچھ ایسی دھاک بٹھائی تھی کہ وہ اس کے آگے ایک لفظ نہیں بول پائی تھی اور کہاں اب وہ اس سے بحث کرنے لگی تھی، آگے سے جواب دینے لگی تھی۔اس کی بات سے انکاری ہونے لگی تھی اور یہ اس جیسے خود پسند وانا پسند شخص کے لئے ناقابل برداشت تھا آج وہ جس قدر خوش تھا دن بھر جس طرح اس نے اپنی کامیابی کو سیلیبریٹ کیا تھا اندازہ نہیں تھا کہ عریم سے اس بار اپنی خوشی سیلیبریٹ کر کے اسے اپنی خوشی کو ہی کافور کرنا پڑے گا وہ اس بے عزتی کا بدلہ لینے کا پورا ارادہ باندھ گیا تھا اور سڑک پر بے مقصد گاڑی دوڑاتا وہ کہیں نہ کہیں اب بھی موبائل بجنے کا منتظر تھا مگر وہ بھی جیسے قسم کھائے بیٹھی تھی کہ اب اس شخص کے ہاتھوں مزید ذلیل نہیں ہونا وہ رودھو کر سوگئی تھی اور آج کی رات شاہ زیب اورکزئی کے لئے قیامت کی رات تھی اسے ساکت پڑا فون اس کی تذلیل کرتا۔اسے بہت کچھ پلان کرنے پر مجبور کررہا تھا اور کچھ رات ڈھلی تھی شاہ زیب کی برداشت جواب دے گئی تھی اسے نے موبائل فون اٹھا کر دیوار پر دے مارا تھا۔اس نے پوری رات آنکھوں میں کاٹ دی تھی اور وہ شاہ زیب کے غصہ سے انجان اس کی پلاننگ سے ناواقف خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی اور وہ انتقام کی نئی راہ سوچتا فجر کی اذان کے ساتھ ہی نیند کو مہربان نہ ہوتے دیکھ کر نیند کی گولیاں پھانک گیا تھا یہ شاہ زیب کی زندگی کا پہلا موقع تھا کہ نیند آنکھوں سے گزری ہی نہ تھی اور رات گزر گئی تھی اور صبح بھی نیند سے خالی تھی اور اس نے بے بسی کے عالم میں نیند کی گولیاں پھانک لی تھیں کچھ دیر اس کا ذہن بڑی تیزی سے بہت کچھ سوچتا رہا تھا وہ عریم سے اپنی تذلیل کا بدلہ لینے کی پلاننگ کرتا رہا تھا کہ دھیرے دھیرے گولیاں اپنا اثر دکھانے لگی تھیں سوچ کی طنابیں بکھری تھیں اور وہ نیند کی وادی میں اترتا چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

''مومی! تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔سو کیوں نہیں رہی ہو'' مومل کو بے قراری سے کروٹیں بدلتے دیکھ کر نوائم نہ صرف بستر سے اٹھی تھی اس نے لائٹس بھی آن کردی تھیں۔

''مجھے نیند نہیں آرہی'' وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی تھی اور نوائم بے چین ہوگئی تھی کہ مومل کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔وہ اس کے سرہانے آبیٹھی تھی اور اس کے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تھا اس کا اندازہ درست تھا مومل رو رہی تھی۔

''مومی کیا ہوا ہے۔مجھے بتاؤ پلیز'' وہ بہت نرمی و تفکر سے پوچھ رہی تھی۔

''نوائم! میں نے عبیر سے شادی نہیں کرنی ہے'' وہ اٹھتے ہوئے بولی تھی نوائم اسے عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی تھی اور وہ آج دن سے ہی عجیب وغریب حرکتیں کررہی تھی پہلے ٹیکسٹ کر کے کہا کہ عبیر کے ساتھ جارہی ہے واپسی پر اسے کچھ نہیں بتایا اس نے گھر آ کر بھی

پوچھا مگر وہ نوائم کے ہاتھ ہی نہیں لگی تھی اور وہ سونے کی تیاری میں تھی جب مومل دروازے پر دستک دے کر اس کے روم میں آئی تھی اور اس کے روم میں سونے کا کہتی اس کا جواب سنے بغیر بستر پر دراز ہوئی تھی اور چادر منہ تک تان لی تھی نوائم کو فطری فکر و تجسس نے آ گھیرا تھا اس نے بہت کچھ پوچھنا چاہا تھا مگر اس نے موقع نہیں دیا تھا فقط اتنا بولی تھی۔

''نوائم! میرے سر میں بہت درد ہے اور مجھے نیند آ رہی ہے۔ تم مجھے ڈسٹرب نہ کرو میں سونا چاہتی ہوں۔'' مومل کی گہری سنجیدگی سے کہنے پر نوائم بہت کچھ کہنے کی چاہ میں چپ کی چپ رہ گئی تھی اور روم لاکڈ کر کے بڑی خاموشی سے لائٹس آف کر سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔ دونوں کا الگ کمرہ تھا مگر وہ اکثر ایک دوسرے کے کمرے میں ہی پائی جاتی تھیں اکثر رات گئے تک باتیں کرتیں وہ ایک دوسرے کے کمرے میں سو جاتی تھیں مگر آج بالکل خاموشی تھی ایک سو نہیں رہی تھی اور دوسری کی نیند اڑنے لگی تھی اور جب مومل کے کروٹ پہ کروٹ بدلنے میں اضافہ ہوا تھا اس نے لائٹس آن کر دی تھی اور مومل کو روتا پا کر کم بے چین نہ ہوئی تھی کہ اس کی بات پر مزید بے چین ہو گئی تھی۔

''تم سے گھر میں کسی نے کچھ کہا ہے مومل......اور دن میں عبیر سے کیا بات ہوئی تھی۔'' وہ روتی ہوئی مومل سے سوال کر رہی تھی۔

''عبیر، میری سننے کو تیار نہیں ہے اور میں نے بھی حماقت ہی حد کر دی کہ اس سے ہر بات سچ کہہ دی اور اب تو وہ بالکل بھی شادی سے انکار کو راضی نہیں ہے۔'' وہ شد و مد سے روتی عبیر سے ہوئی بات حرف سے لفظ تک بتاتی چلی گئی تھی۔ نوائم کے لبوں پر یکدم مسکراہٹ بکھر گئی تھی کہ اسے عبیر بہت پسند تھا اس کی تو دلی خواہش تھی کہ مومل کی عبیر سے شادی ہو جائے اور نوائم کو بہت اچھے سے پتہ تھا کہ ناپسندیدگی کے پیچھے کوئی وجہ نہیں ہے نہ ہی مومل کسی کو پسند کرتی ہے اس لئے وہ مومل کو عبیر کے حق میں راضی کرنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی اور مومل کی تمام باتیں سن کر اسے مومل کی حماقت پر ہنسی بھی آئی تھی اور اس کی معصومیت پر پیار بھی آیا تھا۔

''عبیر بہت اچھا ہے یار......اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے اور جس انسان کو آپ سے محبت ہو اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے۔'' وہ تفصیل سننے کے بعد بولی تھی اور مومل رونا دھونا بھول کر اسے گھورنے لگی تھی۔

''تمہیں یہ بات کیوں نہیں آتی سمجھ کہ مجھے عبیر پسند نہیں ہے۔ نہیں کرنی اس سے شادی۔'' وہ نوائم کو بے دریغ گھورتے ہوئے نفرت سے پھنکاری تھی۔

''ٹھیک ہے یہ بات تم عبیر کو بتا چکیں، وہ نہیں انکار کو راضی تو تم کر دو انکار بات ختم۔'' نوائم بڑے سکون سے بولی تھی۔

''تم جانتی ہو میں نہیں انکار کر سکتی اس لئے میں نے عبیر سے بات کی تھی مگر وہ انتہائی بدتمیز انسان ہے۔ آج اس نے مجھ سے بہت بکواس کی اور چھچھورا انسان مجھے دیکھ دیکھ کر گانے بھی گا رہا تھا۔'' مومل مرے مرے انداز میں بولتی یکدم دانت کچکچانے لگی تھی جبکہ نوائم سے ہنسی کنٹرول کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ ضبط کے باوجود وہ بے اختیار ہنس دی تھی۔

''یہاں میری جان پر بنی ہے اور تمہیں ہنسی آ رہی ہے۔ تم دوست ہو کہ دشمن۔'' وہ نوائم کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھور رہی تھی اور

نوائم خود کو سنبھال گئی تھی۔

''دوست ہوں جبھی تمہیں سمجھاتی رہتی ہوں کہ عبیر تمہارے لئے بیسٹ چوائس ہے۔'' اس کے اطمینان میں جو ذرا کمی آئی ہو اور مومل کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔

''عبیر نے مجھے صاف ہری جھنڈی دکھادی ہے اور تم بھی دشمن بنی ہوئی ہو۔ میں پاپا کو انکار کر کے انہیں ہرٹ نہیں کر سکتی۔'' وہ لحظہ بھر کو رکی تھی اس کے آنسو روانی سے بہہ رہے تھے نوائم کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔

''عبیر کو میں صاف کہہ آئی ہوں کہ اس نے مجھ سے شادی کی تو میں اس کی زندگی برباد کر دوں گی کہ مجھے پسند کا حق حاصل ہے اور وہ اپنی پسند کے لئے محبت کو ضد وانا کا مسئلہ بنا کر مجھ سے میری پسند کا حق چھین رہا ہے جس کا بہت نقصان اٹھائے گا۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ اور نوائم میں تمہیں بھی معاف نہیں کروں گی۔'' مومل سسکیاں بھرتے ہوئے لب چباتی نوائم کو دیکھنے لگی تھی جس کے چہرے کی رنگت یکدم ہی اڑ گئی تھی۔

''مجھے زندگی میں پہلی دفعہ دوست کی ضرورت ہے۔ دوست کی سپورٹ کی ضرورت ہے اور تم نے اچھی دوستی نبھائی ہے مجھ سے۔ میری کوئی مدد نہ کر کے۔ اور اس کے لئے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' مومل کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ نوائم بے قراری سے اس کی طرف آئی تھی اس کے ہاتھ تھام گئی تھی۔

''تم مجھے غلط مت سمجھو مومی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہاری خوشی میرے لئے بہت معنی رکھتی ہے۔'' وہ کہنے لگی تھی مگر مومل اس کے ہاتھ جھٹکتی دور ہو گئی تھی۔

''تم میرے ساتھ نہیں ہو تم عبیر کے ساتھ ہو تم اسے سپورٹ کر رہی ہو۔ میری خوشی تمہارے لئے معنی نہیں رکھتی۔ تمہارے لئے عبیر کی خوشی اہمیت رکھتی ہے۔'' مومل حلق کے بل چلائی تھی۔

''ایسا نہیں ہے مومی۔ تم میرے سمجھانے کو غلط انداز میں مت لو۔ عبیر چاہے کتنا اچھا سہی اگر تمہیں وہ نہیں پسند تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے مومل کے شک کو ختم کر کے اپنی طرف سے اس کا دل صاف کر دے۔

''تم میرے ساتھ نہیں ہو اس لئے جھوٹے دعوے مت کرو کہ اگر تم میرے ساتھ ہوتیں تو تم عبیر کو سمجھاتیں، اسے شادی سے باز رہنے کو کہتیں مگر تم اس کا ساتھ دے رہی ہو صرف اس لئے نا کہ وہ تمہیں بہن کہتا ہے۔ تو تمہارے لئے بھائی کے آگے دوست کی خوشی معنی ہی نہیں رکھتی۔'' وہ حیرانگی سے مومل کو دیکھ رہی تھی اسے کہاں اندازہ تھا کہ وہ جو مومل کی محبت میں اسے صحیح بات سمجھاتی تھی وہی کاوشیں اس کی دشمن بن جائیں گی اس کی دوست اس سے بدگمان ہو جائے گی۔ وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ چاہے وہ اسے سمجھاتی رہتی تھی اسے عبیر کے لئے قائل کرتی تھی یہی سب وہ عبیر کو بھی سمجھاتی تھی اسے قائل کرنے کی کوشش کرتی تھی مگر نہ وہ قائل ہوا تھا اور نہ ہی مومل قائل ہوئی تھی۔ عبیر

کا پتہ نہیں تھا مگر موول اس سے بدگمان ہو چکی تھی ان کی دوستی میں بدگمانی نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔موول بے تحاشا رو رہی تھی اور نوائم کے آنسو آنکھوں میں ہی سہم کر ٹھہر گئے تھے۔

''پاپا نے ڈنر کے بعد مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا انہوں نے عبیر کے لئے میری رائے پوچھی تھی اور میں پاپا سے نہیں کہہ سکی کہ میں عبیر سے شادی نہیں کرنا چاہتی کہ پاپا چاہے مجھ سے میری مرضی پوچھ رہے تھے مگر ان کی آنکھوں میں ایک مان تھا، آس تھی کہ میں انکار نہیں کروں گی اور میں پاپا کی آس بکھیر نہیں سکتی تھی میں نے پاپا سے کہہ دیا نوائم جو نہیں میرے لئے بہتر لگے وہ فیصلہ کر لیں۔'' وہ یکدم کارپٹ پر دوزانو گرتی روتے ہوئے بول رہی تھی اور نوائم کو لگا تھا کہ کمرے کی چھت اس کے سر پر آ گری ہو کہ وہ موول کو اپنے کمرے میں دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا تھا مگر جسے نوائم نے عبیر سے ہوئی بات سے جوڑ لیا تھا مگر اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بات یہ ہو گی کہ عقیل احمد خود بیٹی کی مرضی معلوم کر کے اسے بے بس کر دیں گے۔نوائم دوست کو اچھے سے جانتی تھی کہ وہ چاہے زبان و غصہ کی تیز تھی، نازک مزاجی کا وہ عالم تھا کہ سب ہی پریشان رہتے تھے۔مگر وہ غصیلی لڑکی جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی وہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی تھی ان کا احترام کرتی تھی اور ان کا مان سلامت رکھنے کو اس نے ایک ناپسندیدہ شخص کی ہمراہی قبول کرنے کا عندیہ دے دیا تھا۔اس نے ایک اچھی بیٹی ہونے کا ثبوت فراہم کیا تھا مگر اس کے اندر کی لڑکی سسک اٹھی تھی کہ اس کے اپنے ارمان بکھر گئے تھے۔اس نے جیون ساتھی کے حوالے سے جو خواب دیکھے تھے وہ پلکوں پر سجے رہ گئے تھے اور خوابوں کی کرچیاں آنکھوں میں چبھتیں اسے خون کے آنسو رلا رہی تھیں۔وہ کوئی آئیڈیل پرست لڑکی نہیں تھی مگر کچھ خواب تھے اس کے جو پلکوں کی دہلیز پر بن بلائے آن بیٹھے تھے۔اس نے عبیر کو کبھی اس طرح نہیں سوچا تھا وہ اس کے آئیڈیل کے خاکہ پر اترتا ہی نہ تھا اور وہ زبردستی اس کے جنون میں سب سے خاص و اہم مقام حاصل کرنے جا رہا تھا اور وہ اس شخص کے ساتھ ساتھ دوست سے بھی ناراض ہو گئی تھی۔نوائم خود کو کنٹرول کرتی کمپوز کر کے اس کی طرف بڑھی تھی، کچھ کہتی کہ موول اٹھی تھی اور اس کے کمرے سے نکلتی چلی گئی تھی۔نوائم کے کب کے ٹھہرے ہوئے آنسو پلکوں کی دہلیز پار کر آئے تھے وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

❁ ❁

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

''تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی ہے، تم گھر چلے جاؤ۔ میٹنگ میں ہینڈل کرلوں گا۔'' آئیکت نے اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے نرم سی آفر کی تھی۔

''آئی ایم فائن۔'' وہ اس کی ہمدردی پر غصیلے و بے مروت والے انداز میں بولا تھا۔ آئیکت نے یکدم ہی لب بھینچ لئے تھے کہ عرصہ قبل تک ان دونوں میں کافی دوستانہ مراسم تھے مگر جب سے اس کی دلچسپی آبدار میں ظاہر ہوئی تھی سب ہی اس سے خفا تھے۔ شاہ زیب ان میں سرفہرست تھا وجہ شاہ زیب خود بھی نہیں جانتا تھا اور جب سے آبدار گھر سے غائب ہوئی تھی ان دونوں کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو گئے تھے کہ شاہ زیب کو سو فیصدی یقین تھا کہ آبدار کے غائب ہونے میں آئیکت کا ہاتھ ہے مگر وہ اپنے یقین کو ثابت کرنے میں ناکام تھا۔ اس لئے اس کی جو پہلے آئیکت سے کافی بنتی تھی وہ اب آئیکت سے کھچا کھچا سا رہنے لگا تھا اور آئیکت وجہ جاننے کے باوجود اس کے ساتھ نارمل بی ہیو کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آج ناشتہ کی میز پر باقی سب کی طرح شاہ زیب کی کمی محسوس کی تھی اور آفس آیا تھا تو اس نے بے حد سرخ آنکھوں سے آئیکت کو فطری طور پر پریشان کیا تھا اور وہ محبت میں ایک آفر کر گیا تھا جسے شاہ زیب نے اپنے اکھڑ انداز میں نہایت بدتمیزی کے ساتھ مسترد کر دیا تھا۔

''شاہ! تمہیں نہیں لگتا کہ تم ایک بے بنیاد شک کی بناء پر ہماری دوستی کو زک پہنچا رہے ہو۔ رشتہ داری کو کمزور کر رہے ہو۔'' وہ کمپوز کر کے بولا تھا اور شاہ زیب کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے۔

''میرا شک ہرگز بھی بے بنیاد نہیں ہے میں بہت جلد پروف کروں گا اور جہاں تک دوستی و رشتہ داری کی بات ہے وہ تم نے خود خراب کی ہے۔ جو حرکت تم کر چکے ہو اس کے بعد سونے کے بھی بن کر آ جاؤ گے تو کم از کم شاہ زیب اور کزنئی کا اعتبار نہیں پا سکتے۔ میری نگاہ میں واپس اپنا وہی مقام نہیں حاصل کر سکتے۔ اس لئے اپنی انرجی ضائع کرنا چھوڑ دو۔'' وہ نہایت زہرخند لہجے میں بولتا آئیکت کو بدحواس چھوڑ کر میٹنگ ہال کی جانب بڑھ گیا تھا۔ آئیکت نے بمشکل خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے تھے۔ شاہ زیب اس سے دو سال بڑا تھا اس لئے وہ اس کی عزت کرتا تھا مگر اسے آج شاہ زیب کا انداز انتہائی برا لگا تھا وہ بعد میں اس سے بات کرنے کا فیصلہ کرتا جس وقت میٹنگ روم میں پہنچا تھا وہاں صرف شاہ زیب موجود تھا اور کھڑکی میں کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا کہ وہ دونوں غصہ میں وقت سے پہلے میٹنگ ہال میں آ گئے تھے۔ آئیکت واپس پلٹا تھا مگر اپنے بابا کو آتے دیکھ کر اس نے واپسی کا ارادہ ترک کر کے اپنی نشست سنبھال لی تھی جبکہ شوکت اور کزنئی نے بھتیجے کو ناگواری سے دیکھا تھا اور ٹھیک ٹھاک انداز میں اسے سرزنش کر ڈالی تھی۔ شاہ زیب کا دماغ درد سے پھٹ رہا تھا اور اس نے تایا کو کچھ کہنے کے بجائے بڑی خاموشی سے بچی ہوئی سگریٹ جوتے تلے مسل ڈالی تھی اور انہوں نے شاہ زیب کو غور سے دیکھا تھا تو انہیں بھی وہ ٹھیک نہیں لگا تھا۔ انہوں نے بیٹے والی آفر دی تھی اور اس نے جتنی بدتمیزی سے آئیکت کی آفر ریفوز کی تھی اتنے ہی آرام سے وہ شوکت

اورکزئی کی آفر قبول کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا میٹنگ ہال سے ہی نہیں آفس سے بھی نکلتا چلا گیا تھا اور بے مقصد گاڑی سڑک پر دوڑاتا پھٹتے سر کی وجہ سے کچھ سوچتا کافی شاپ میں آ گیا تھا جہاں پہنچ کر اس کے سر کا درد کچھ اور سوا ہو گیا تھا وہ عریم کو ایک ہینڈسم شخص کے سامنے میز پر بیٹھے دیکھ کر ضبط سے مٹھیاں بھینچ گیا تھا اور فارس کی کسی بات پر مسکراتی عریم کی نگاہ بے ساختہ سامنے اٹھی تھی اور شاہ زیب کو دیکھ کر اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی تھی دونوں کی نظر ٹکرائی تھی۔ عریم کی آنکھوں میں ہراس اتر آیا تھا اور شاہ زیب کی نگاہ میں اشتعال و نفرت کی چنگاری تھی جو عریم کو جلا کر خاکستر کرتی کہ وہ بڑی تیزی میں وہاں سے نکل گیا تھا جبکہ اس کے چہرے پر در آنے والے ہراس کو فارس نہایت حیرانگی سے دیکھتا مضطرب سا وجہ دریافت کر گیا تھا۔

''عرمی! کیا ہوا ہے، آر یو آل رائٹ؟'' وہ کمپوز کرنے میں ناکام ہوتی محض اثبات میں سر ہلا گئی مگر اس کی تشفی نہیں ہوئی تھی اس لئے اس کا اصرار بڑھا تھا۔

''گھر چلیں فارس، میرے سر میں اچانک بہت شدید قسم کا درد ہونے لگا ہے۔'' وہ منمنائی تھی کہ شاہ زیب کو اس نے اتنے غصے میں پہلی بار دیکھا تھا اور وہ تو فون پر بھی اس کے غصہ سے ڈر جاتی تھی اور اب تو اس کی حالت مرنے والوں جیسی ہو رہی تھی۔ وہ بہت چاہ کر بھی خود کو کنٹرول نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی زرد رنگت دیکھ کر فارس پریشان ہو گیا تھا کہ اس نے ماں سے سفارش کروا کر عریم کے ساتھ لنچ کے لئے انکل سے اجازت لی تھی اور عریم کے انکار کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی فارس کے ساتھ چلی آئی تھی۔ وہ جتنی خاموش تھی فارس اتنا ہی بول رہا تھا اس کے ہر انداز سے دوستی اور عریم کے لئے محبت ظاہر ہو رہی تھی اور یہ بات عریم کو ڈسٹرب کر رہی تھی اس کے باوجود وہ خود پر ضبط کئے اس کی باتوں کے مختصر جواب دے رہی تھی اور وہ لنچ کے بعد اسے اپنے فیورٹ کافی شاپ میں لے آیا تھا اور اسے اپنی پسند و ناپسند سے آگاہ کر رہا تھا وہ خاموشی سے سن رہی تھی کہ عین وقت پر شاہ زیب وہاں کچھ یوں آیا تھا کہ عریم ضبط ہی نہیں کر پائی تھی۔

''مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔'' فارس گاڑی کی چابی اور موبائل اٹھاتے ہوئے فکرمندی سے بولا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولی تھی اور مرے مرے قدموں سے باہر کی طرف بڑھی تھی فارس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا کہ خوشگوار ملاقات کا اتنا برا اختتام اس کے ذہن میں کہیں نہیں تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے فارس کو دیکھ کر یکدم عریم شرمندہ ہوئی تھی کہ وہ کافی حد تک خود کو کمپوز کر چکی تھی اس نے ڈاکٹر کے پاس جانے سے انکار کر دیا تھا اور معذرت کرتی گاڑی سے اتری تھی اور بڑی تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی اور فارس اندر آنے کی بجائے اپنے گھر واپس چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

''اب کیسی ہے طبیعت آپ کی؟'' آبدار جو تقریباً دو دن بعد آج اپنے کمرے سے نکلی تھی چونک کر ابسام کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ اس کے متوجہ ہوتے ہی رسمی مسکراہٹ لبوں پر سجا گیا تھا۔

''فائن۔'' وہ انتہائی سرد لہجے میں بے رخی سے بولتی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی جبکہ وہ حیران سا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

''برخوردار! یہاں ایسے کیوں کھڑے ہو۔'' وہ آبدار کی بے رخی کی وجہ کا سرا ڈھونڈنے کی کوشش میں تھا کہ حیدر صاحب کی آواز اسے مراقبہ سے باہر نکال لے گئی تھی۔

''ایسے ہی پاپا۔'' وہ خود کو کمپوز کرتے دھیمے سے بڑبڑایا تھا۔

''نیکسٹ منتھ ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔'' وہ بیٹے کے ساتھ چلتے ہوئے بولے تھے۔

''آپ نے ماما کو سرپرائز دینا ہے۔'' وہ مسکرایا تھا۔

''میں کہاں تمہاری ماما کو سرپرائز دے سکتا ہوں کہ ہر بار وہ مجھے سرپرائز کر دیتی ہے۔'' ان کے چہرے پر محبت کا ہر احساس روشن ہو گیا تھا جبکہ ابسام کے چہرے پر بکھری مسکان گہری ہو گئی تھی کہ حیدر صاحب غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ فضہ حیدر کو چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو آج بھی بچوں کی طرح سلیبریٹ کرنے کی عادت تھی وہ دونوں ہر بار کچھ نہ کچھ پلان کرتے تھے مگر فضہ حیدر بازی لے جاتی تھیں۔

''تمہاری ماما کو سب سے زیادہ خوشی ڈنمارک جا کر ملتی ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ فضہ کی خوشی کے لئے ہم ڈنمارک جا کر وہاں اپنوں کے ساتھ مل کر خوشیاں منائیں۔'' انہوں نے دھیمے سے کہا تھا اور ابسام نے ڈس ایگری نہیں کیا تھا کہ وہ خود اس بات کو مانتا تھا کہ اس کی ماما ایک زندہ دل خاتون تھیں۔ زندگی کو ہنس کر جینے والی خاتون......مگر وہ جتنا مسرور انہیں اپنی نانی کے گھر میں محسوس کرتا تھا اتنا پرسکون وطمانیت سے بھرا مسکراتا چہرہ اسے اپنے گھر میں بھی نظر نہیں آتا تھا اور وہ اس کا کئی بار اظہار بھی کر چکا تھا اور فضہ حیدر مسکرا دیتی تھیں کہ بیٹے کو یہ نہیں سمجھا سکتی تھیں کہ لڑکیوں کے لئے ماں باپ کی چھایا ہی سب کچھ ہوتی ہے ماں کے دامن میں ان کے کتنے دکھ سمٹے ہوتے ہیں اور ماں کے چہرے کی جھریوں میں خوشیاں پنپ رہی ہوتی ہیں تو وہ کیوں اس گھر میں طمانیت محسوس نہ کریں جہاں انہوں نے خوشیوں کے ہزاروں پل دیکھے تھے اور دکھ کی ہر گھڑی ان کے اپنوں نے یوں بانٹی تھی کہ وہ جب جب تنہا ہوتی تھیں تو اس ساتھ کی کمی کو محسوس کرتیں اس ساتھ کے لئے سات سمندر پار پہنچ جاتی تھیں اور ہر دکھ و پریشانی سے یوں نابلد ہو جاتی تھیں جیسے دکھ ملا ہی نہ ہو۔ زندگی سکھ کی بانہوں میں چلی آئی ہو۔

''گریٹ آئیڈیا پاپا کہ ماما کو جتنی خوشی نانو کے گھر میں ملتی ہے اتنی خوشی تو انہیں دنیا کے کسی کونے میں حاصل نہیں ہو سکتی۔'' ابسام نے باپ کے آئیڈیے کی فوراً حمایت کی تھی۔

''رائٹ......مگر میں سوچ یہ رہا تھا کہ اگر تمہاری ماما کو سرپرائز دینا چاہیں گے تو کیا یہ ممکن ہوگا؟'' وہ پرسوچ انداز میں بولتے ابسام کو چونکا گئے تھے۔

''آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''ارے یار! تیاری تو تمہاری ماما ہی کرتی ہیں۔ کیا لے کر جانا ہے کیا نہیں۔ اب سرپرائز دینا چاہیں گے تو ہم دونوں کو انتظامات

سنبھالنے ہوں گے اور مسئلہ انتظام سنبھالنے کا نہیں ہے تمہاری ماما بہت شارپ ہیں۔ وہ سمجھ جائیں گی اور ہماری محنت ضائع، اس لئے سوچ رہا ہوں کہ سرپرائز کی جگہ کہہ دوں کہ ہم اس بار اپنی شادی کی سالگرہ ڈنمارک میں منائیں گے۔'' حیدر صاحب نے کھل کے وضاحت کی تھی۔

''جی پاپا یہ بہتر رہے گا کہ ماما تو سرپرائز دینے میں ملکہ رکھتی ہیں اور ہمارے سرپرائز کو پہلے ہی جج کر کے محنت ضائع کر دیتی ہیں۔''

اس نے منہ بنا کر کہا تھا کہ وہ دونوں باپ بیٹا جب بھی فضہ حیدر کو سرپرائز دینے کا پروگرام تشکیل دیتے تھے بھانڈا پھوٹ ہی جاتا تھا۔

''اوہوں...... میں تمہاری ماما سے کرتا ہوں بات اور تم بھی اپنی تیاری رکھنا کہ اس بار تمہارا جانا بھی ضروری ہوگا۔'' وہ بیٹے کو ہدایت کرنے لگے تھے۔ وہ مسکرا دیا تھا۔

''آف کورس پاپا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ کی اور ماما کی ویڈنگ اینورسری کی سلیبریشن ہو اور میں اس میں شرکت بھی نہ کروں۔''

ابسام کے لہجہ میں خوشی و جوش سا تھا اور وہ بیٹے کے انداز پر مسکرا دیئے تھے کہ وہ عادت و مزاج میں بالکل ان کے جیسا تھا نہایت سنجیدہ، بردبار رکھ رکھاؤ والا مگر اس نے کچھ عادات اپنی ماں بھی ایڈاپٹ کی تھیں اور خوشی کے اظہار میں وہ ماں پر گیا تھا اس کا حسین چہرہ خوشی کے اظہار کا مرکز بن جاتا تھا۔ اسے چھوٹی چھوٹی خوشیاں بہت اٹریکٹ کرتی تھیں اور وہ ماں کی طرح انہیں سلیبریٹ بھی کیا کرتا تھا۔ اسی وقت آبدار چائے کی ٹرے لئے چلی آئی تھی۔

''ارے بیٹا! آپ نے کیوں زحمت کی......'' وہ قدرے نرمی سے بولے تھے اور وہ انہیں دیکھنے لگی تھی۔

''زحمت کی تو کوئی بات نہیں ہے انکل۔'' اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کی چھاپ تھی۔ ابسام نے غور کیا تھا اس کے حسین چہرے کی رونق ماندسی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ بیماری سے اٹھی ہے۔

''آپ کی طبیعت ناساز تھی بس اس خیال سے کہا ورنہ اپنی بیٹی کے ہاتھ کی چائے کو تو میں بہت مس کر رہا تھا۔'' وہ شفقت سے بولے تھے۔ آبدار سے فضہ حیدر کام نہیں کرواتی تھیں کہ کام کے لئے ملازمہ موجود تھی جب وہ خود کام کرتی تھیں، کھانا وغیرہ کا خصوصی اہتمام کرتی تھیں تب آبدار ان کا ہاتھ بٹا دیتی تھی البتہ کچھ عرصہ سے شام کی چائے اکثر آبدار بنا لیتی تھی کیونکہ اس نے ایک دفعہ چائے بنائی تھی جو حیدر صاحب کو بہت اچھی لگی تھی اور وہ نرمی سے فرمائش پر اس سے چائے بنوا لیتے تھے اور آج تو فضہ حیدر خصوصی طور پر اس کو چائے بنانے کا کہہ گئی تھیں کہ وہ دوست کے گھر میلاد شریف میں گئی ہوئی تھیں۔ اسے بھی چلنے کو کہا تھا مگر وہ بڑی سہولت سے انکار کر گئی تھی اور وہ فضہ حیدر کے جانے کے بعد بھی کمرے سے نہیں نکلی تھی جس وقت حیدر صاحب کی گاڑی کا مخصوص ہارن سنائی دیا تھا تب وہ چائے بنانے کے ارادے سے کمرے سے نکلی تھی کہ وہ کب تک کمرہ بند رہ سکتی تھی کہ وہ ابسام سے بچنے کو اس کے سامنے سے ہراساں کمرے سے ہی نہیں نکل رہی تھی۔ باوجود اس کے اس کے یوں کمرہ بند رہنے سے جب دونوں میاں بیوی ہی پریشان تھے اس کو کمرے سے باہر نہ آتے دیکھ کر اس کی بیماری کو سیریس لینے پر مجبور تھے اور وہ انہیں مطمئن کرتی رہتی تھی۔ حیدر صاحب کے شفقت سے کہنے پر وہ دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

''میں تو روز چائے کیا کھانا بھی بنالوں مگر آنٹی مجھے کچھ بھی کرنے ہی نہیں دیتیں۔'' وہ چائے کا مگ ان کو پکڑاتی ٹرے ٹیبل پر رکھ گئی تھی۔ اس نے ابسام کی طرف مگ نہیں بڑھایا تھا انداز واضح کترایا ہوا تھا اور وجہ جاننے سے قاصر ابسام اس کے صبیح چہرے سے نگاہ ہٹا گیا تھا۔

''کچھ غلط بھی نہیں ہے۔میں آپ کی آنٹی کے ساتھ ہوں۔'' وہ گھونٹ بھرتے ہوئے قدرے بے تکلفی سے بولے تھے اور اس کی مسکراہٹ یکدم بے ساختہ ہلکی سی ہنسی میں بدل گئی تھی۔

''آپ آنٹی سے اتنا ڈرتے ہیں۔'' وہ اس کی ہنسی کی جلترنگ میں جکڑ سا گیا تھا کہ اس کے لہجے میں پہلی دفعہ نرم سی شرارت پروہی نہیں حیدر صاحب بھی متحیر اسے دیکھنے لگے تھے جس کے چہرے پر اپنائیت اور خوبصورت آنکھوں میں ہلکی سی شرارت کی لکیر تھی۔ وہ اپنی حیرت سے نکلتے دھیمے سے بے چارگی سے بولے تھے۔

''ہاں بیٹا، ڈرنا مجبوری جو ٹھہرا...... کہ میں نہیں ڈروں گا تو آپ کی آنٹی نے کون سا مجھے چھوڑ دینا ہے۔میں بے چارہ تو رعب حسن کے آگے کچھ کہہ بھی نہیں پاتا۔'' حیدر صاحب کے انداز میں اپنائیت بھری شرارت تھی اور وہ ہنس دی تھی۔

''آنٹی ہیں ہی اتنی پیاری کہ ان کی کسی بات سے انکار کیا ہی نہیں جا سکتا۔'' وہ دل سے بولی تھی کہ جتنی اپنائیت وچاہت اسے چند دنوں میں فضہ حیدر سے ملی تھی اتنا اپنا پن تو اسے اس کی ماں سے بھی حاصل نہیں ہو پایا تھا۔

''ایک پیاری لڑکی دوسری پیاری خاتون کی تعریف کر رہی ہے، اللہ خیر کرے۔'' وہ چائے کے گھونٹ بھر کے مسکرا دیئے تھے اور وہ یکدم جھینپ گئی تھی۔اس کے چہرے پر سرخی چھا گئی تھی جو اسے کچھ اور دلکش بنا گئی تھی اور یہ ابسام کی نگاہ صاف کہہ رہی تھی کہ وہ وہاں موجود ہو کر بھی ثانوی سی حیثیت رکھتا تھا اس نے ان دونوں کی چھیڑ چھاڑ میں ہرگز بھی مداخلت کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ تو پل پل حیران ہو رہا تھا کہ یہ لڑکی اسے یونہی حیران کرتی تھی کہ وہ کبھی بہت سنجیدہ لگتی تھی اور کبھی بہت شرارتی، نٹ کھٹ سی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا کہ آبدار نے اپنے چہرے پر دو آنکھیں محسوس کر کے نگاہ اٹھائی تھی اور وہ شرمندہ ہو کر نظر چرا گیا تھا۔اب اس سے ہاں ٹھہرنا محال ہو گیا تھا کہ وہ پہلے جان کر اسے نظر انداز کر رہی تھی اور بعد میں حیدر صاحب کی شرارت کا شرارت سے جواب دیتی اس کی موجودگی یکسر فراموش کر گئی تھی مگر اس کی موجودگی کے احساس کے بعد وہ آگے سے ایک لفظ بھی بول نہیں پائی تھی جبکہ حیدر صاحب کچھ کہہ رہے تھے اور وہ نرمی سے مسکراتی یکدم ایکسکیوز کرتی ان کے درمیان سے نکلتی چلی گئی تھی۔

''چائے لو ابسام۔ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' وہ باپ کی آواز پر چونکا اور بڑی خاموشی سے مگ اٹھا کر اس نے لبوں سے لگا لیا تھا۔

''آبدار چائے بہت مزے کی بناتی ہے۔'' انہوں نے تبصرہ کیا تھا جس سے سو فیصدی اتفاق ہونے کے باوجود اس نے آگے سے انکار و اقرار نہیں کیا تھا۔

''ابسام، آبدار تو میرے ذہن میں بالکل نہیں تھی۔'' وہ چائے کا خالی مگ رکھتے ہوئے کسی خیال سے چونک کر بولتے اسے ان

گنت سوالوں کے گرد پھنسا گئے تھے۔

''میرا مطلب ہے کہ جب ہم ڈنمارک جائیں گے تو آبدار کا کیا ہوگا'' وہ بیٹے کی نگاہ کے سوال کے جواب میں بولے تھے اور وہ بھی یکدم مضطرب ہو گیا تھا کہ یہ مسئلہ تو بہت بڑا تھا۔

''اکیلے چھوڑ کر جا نہیں سکتے اور نہ ہی ساتھ لے جانا ممکن ہوگا کہ پاسپورٹ وغیرہ دس ہزار مسائل ہوں گے۔'' وہ خود مضطرب ہونے کے ساتھ اسے بھی پریشان کر گئے تھے۔

''جی پاپا، کہ اگر باہر جانا اتنا آسان ہوتا تو اب تک آئیکت یہ انتظام کر چکا ہوتا'' وہ دھیمے سے بولا تھا کہ آبدار کبھی شہر سے باہر نہیں گئی تھی ملک سے باہر جانا تو دور کی بات تھی اور پاسپورٹ وغیرہ کے مسائل تھے اور شاہ زیب نگاہ رکھے ہوئے تھا اس لئے وہ ایسی کوئی کوشش کرنے سے قاصر تھا اسی لئے آبدار نہ چاہتے ہوئے بھی حیدر ولاز میں رہائش پذیر تھی۔

''آپ ماما سے مشورہ کر لیجئے گا پاپا کہ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا'' اس نے صاف پہلو بچایا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ فی الحال ڈنمارک جانے کا خیال مسترد کرنا پڑے گا کہ آبدار کو اکیلے چھوڑ کر جانا ممکن نہیں ہوگا اور تمہاری ماما کا تو تمہیں پتہ ہے کہ کتنی جذباتی ہیں میکے جانے کے نام سے خوش ہو جائیں گی اور جا نہیں پائیں گی تو اگلے کئی ماہ اداس رہیں گی اس لئے ڈنمارک جانا کینسل، کچھ اور پلان کرنا ہوگا۔'' وہ حتمی انداز میں بولے تھے اور ایسے میں ابسام کے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ تھی کہ حیدر صاحب کی بات میں وزن تھا۔

''پاپا۔ ایسا کرتے ہیں ہم ڈنمارک جانے کی بجائے نانو کی فیملی کو پاکستان بلا لیتے ہیں اور یہ سرپرائز ماما کو بہت خوش کر دے گا۔'' کوئی خیال ذہن میں کوندے کی طرح لپکا تھا اور وہ جوش سے بولتا لمحہ بھر کے لئے حیدر صاحب کو ششدر کر گیا تھا مگر جیسے ہی حیرانگی کے بادل چھٹے تھے انہوں نے بیٹے کے آئیڈیے کو ڈن کر دیا تھا۔

''دیٹس گریٹ آئیڈیا۔ میں آج ہی بھائی صاحب سے بات کرتا ہوں۔'' وہ بیٹے کے مشورے سے سو فیصدی متفق نظر آرہے تھے۔

''آج نہیں پاپا، ابھی کر لیں کہ ابھی ماما نہیں ہیں اور ماما کی موجودگی میں بات ہوگی تو ماما کو سرپرائز نہیں دے پائیں گے۔'' ابسام کا انداز قدرے جوشیلا تھا اور وہ بیٹے کے انداز پر متبسم ہوتے اس کے مشورے پر عمل کرتے عقیل احمد کا نمبر ڈائل کرتے کال ریسیو ہونے کا ویٹ کرنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

عریم جب سے گھر آئی تھی مضطرب و ہراساں تھی اس کی اتنی بھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ شاہ زیب کو کال کر لے کہ ایک دم بجنے والے فون پر اس کی دھڑکنیں ساکت ہو گئی تھیں۔ چہرے کی رنگت زرد پڑ گئی تھی اس نے کانپتے ہاتھوں سے سیل فون اٹھایا اور خیال کے عین

کے مطابق شاہ زیب کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔اس نے ڈرتے ڈرتے کال ریسیو کر لی تھی اور پھنسی پھنسی سی آواز میں ''ہیلو'' بولی تھی اور جواباً جو کچھ شاہ زیب نے کہا تھا اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

''میں دس منٹ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔'' شاہ زیب کا لہجہ رعایت سے یکسر عاری تھا اور اس نے مزید کچھ کہے بنا عریم کو بولنے کا موقع دیئے بناء رابطہ منقطع کر دیا تھا اور جیسے ہی کچھ دیر میں عریم کے حواس لوٹے تھے وہ شاہ زیب کو کال ملانے لگی تھی مگر بیل جاتی رہی اس نے ریسیو نہ کی۔

''پلیز شاہ! کال تو ریسیو کریں۔'' اس نے ٹیکسٹ ریڈ کر کے لاپروائی سے ڈیلیٹ کر دیا تھا۔

''میرا سکون برباد کر کے تم مزے کرتی پھر رہی ہو مگر میں تمہیں سکون سے جینے تو کیا مرنے بھی نہیں دوں گا۔'' اس نے نفرت سے سوچتے ہوئے موڑ کاٹا تھا۔موبائل متواتر بج رہا تھا اس نے کوئی گیارہویں کال پر اس کی کال ریسیو کی تھی۔

''فون پر بات کرنی ہوتی تو فون بند نہ کرتا۔بکواس کی ہے کہ دس منٹ میں لینے آ رہا ہوں تو مطلب آ رہا ہوں۔انرجی ضائع کرنے کی بجائے گیٹ پر پہنچو۔'' وہ کال ریسیو کرتے ہی پھنکارا تھا۔

''شاہ! پلیز مت کریں ایسا۔میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی...... پاپا......''

''بکواس کی تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا عریم۔اور یاد رکھنا بہت سن چکا تمہاری بکواس، تمہارے جھوٹے بہانے، ایک غیر مرد کے ساتھ تمہارے اس باپ نے تمہیں جانے دیا اور تم اس کے ساتھ جا سکتی ہو تو میرے ساتھ جانے میں تمہیں کیا اعتراض ہے۔منگنی کے بعد بھول چکی ہو کہ تم میرے نکاح میں ہو۔'' شاہ زیب کب اسے رعایت دیتا تھا پھنکارا تھا اور اس کے ہاتھ، پاؤں لرزنے لگے تھے۔

''مم، میں کچھ نہیں بھولی ہوں شاہ......اور میں فارس کے ساتھ نہ چاہتے ہوئے بھی گئی تھی۔خوشی سے نہیں گئی تھی میں ان کے ساتھ یقین کریں میرا۔'' وہ اس کے غصہ سے ہراساں من، من کر رہی تھی اور اس کی یہی من، من اسے شیر بناتی تھی۔

''کتنی مجبوری سے گئی تھیں یہ تو تمہارے ہنستے چہرے اور بے تکلف انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔'' وہ بھڑک کے بولا تھا اور وہ لب کچلنے لگی تھی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے شاہ......یقین رکھیں میرا۔'' وہ اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے موقع ہی کب دیا تھا۔

''بکواس بند کر لو عریم۔مجھے زبان چلاتی عورتیں زہر لگتی ہیں۔'' اس کی اشتعال انگیز آواز پر وہ کانپ اٹھی تھی آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی لب کا نچلا کونا وہ اضطراری حالت میں چباتی زخمی کر گئی تھی۔گلابی لب پر سرخ خون نمودار ہو گیا تھا۔

''میں نے تم کل تم سے کہا کہ میں نے تم سے ملنا ہے تو تم صاف منع کر گئیں اور اپنے اس ہوتے سوتے کے ساتھ ہنس ہنس کر کافی انجوائے کر رہی تھیں۔سیر سپاٹے کر رہی تھیں۔یاد رکھنا میں تمہیں اس بے غیرتی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔تمہیں مجھ سے نہیں ملنا تو

میری جوتی کو غرض نہیں پڑی تم سے ملنے کی، یاد رکھنا اپنی توہین میں کسی کو معاف نہیں کرتا...... اور گزشتہ کچھ دنوں سے تم میری بے عزتی کر رہی ہو...... اور آج پہلی و آخری دفعہ تم اپنے اس نام نہاد منگیتر کے ساتھ وقت گزار کر آئی ہو۔ زیادہ ہی اچھا لگتا ہے تو میں تمہیں طلاق دے دیتا ہوں کہ میرے نکاح میں ہو کر تم یوں بے غیرتی کے مظاہرے نہیں کر سکتیں۔'' شاہ زیب کے جو منہ میں آیا تھا اس نے جو کہنا تھا وہ سب کچھ کہہ دیا تھا اور وہ موبائل ہاتھ لئے ساکت بیٹھی تھی کہ جس شخص کو اس نے اتنا چاہا تھا جس کے لئے وہ ہر حد سے گزر گئی تھی اس شخص کو اس پر اعتبار تک نہ تھا۔ احساسِ ذلت سے عریم کی آنکھوں میں آنسو ٹھہر گئے تھے۔ کانوں میں اب تک شاہ زیب کا شکی، نہایت نفرت آمیز لہجہ گونج رہا تھا اور وہ جیسے بیٹھے بیٹھے ہی مر سی گئی تھی۔

☆......☆......☆

''یہ آئیڈیا تمہارے ذہن میں کیونکر آ گیا۔'' حیدر صاحب نے سلام دعا کے بعد انہیں پاکستان آنے کا کہا تھا تب عقیل احمد دھیمے سے بولے تھے اور انہوں نے صاف تفصیل سے ہر بات کہہ دی تھی۔

''آپ کی بہن کو خوش کرنا چاہ رہے ہیں بس۔'' حیدر صاحب نے اپنے پلان سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسے منسوخ کرنے کی وجہ سے آگاہ بھی ساتھ ہی کیا تھا اور دوسرے پلان کا بتاتے ہوئے وہ آخر میں شرارت سے بولے تھے جس پر عقیل احمد کا بے ساختہ قہقہہ فضا میں بلند ہوا تھا۔ لاؤنج سے نکلتی نوائم نے چونک کر قدرے خوشگوار حیرت سے باپ کو دیکھا تھا کہ وہ اس قدر خوشگوار موڈ میں ذرا کم ہی ہوا کرتے تھے۔

''اپنی بہن کو خوش کرنے کے لئے تو ہم نے بھی یہی پلاننگ کر رکھی تھی۔ آپ جناب یہ بولئے کہ اپنی بیوی کو خوش کرنے کی پلاننگ ہو رہی ہے۔'' عقیل احمد کے انداز میں بے ساختگی و بے تکلفی میں اپنائیت تھی کہ حیدر صاحب اپنے نیک اطوار اور اعلیٰ کردار کے سبب عقیل احمد کی گڈ بکس میں تھے تب ہی وہ ان سے ہمیشہ اچھے سے عزت و محبت کے ساتھ ہی کلام کرتے تھے۔

''ہم سب کا نصب العین ایک ہی بندی کو خوش رکھنا ہے چاہے اب رشتہ کسی کا بھی کچھ بھی ہو۔'' حیدر صاحب ہنستے ہوئے بولے تھے جس کی عقیل احمد نے تردید نہیں کی تھی اور انہوں نے اپنی پلاننگ سے آگاہ کیا تھا جسے سن کر حیدر صاحب خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئے تھے۔

''آپ نے ہمارا سرپرائز خراب کر دیا ہے۔'' عقیل احمد کی دھیمی آواز ابھری تھی۔

''جی...... لیکن ہم سب مل کر فضہ کو سرپرائز دیں گے۔'' حیدر صاحب مطمئن سے بولے تھے کہ یہ سن کر انہیں حقیقی خوشی ملی تھی کہ عقیل احمد کا پورا گھرانہ پاکستان آ رہا ہے۔ صرف فضہ حیدر کی خوشی کے لئے انہیں سرپرائز دینے کے لئے۔

''انشاءاللہ۔'' عقیل احمد نے بہنوئی کی طمانیت محسوس کرتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔

''انشاءاللہ، ہم سب کو مل کر کوشش کرنی ہوگی کہ فضہ کو کانوں کان خبر نہ ہو۔'' حیدر صاحب نے ان کے منہ کی بات کہہ دی تھی۔

''ارادہ تو یہی ہے اسی لئے ہم سب کی سیٹیں کنفرم ہوگئی ہیں۔باوجود اس کے آپ لوگوں کو اب تک اس سب سے آگاہ نہیں کیا تھا۔''

حیدر صاحب نے فلائٹ کی ڈیٹ اور ٹائمنگ پوچھی تھی اور چند ایک باتوں کے بعد رابطہ منقطع کر دیا تھا اور جب تمام بات جو ابسام کافی حد تک ان کی باتوں سے سمجھ گیا تھا اسے نئے سرے سے آگاہ کرتے وہ بیٹے کو بھی بے حد مسرور کر گئے تھے۔وہ دونوں باپ، بیٹا بہت خوش تھے اور خوشی خوشی پلاننگ کر رہے تھے۔

☆......☆......☆

''مومی! تم مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی ہو۔'' نوائم کو اس نے ایسے دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تم جانتی ہو اس لئے معصوم نہ بنو اور مومل کی نگاہ کی تحریر پڑھتی، نوائم غصہ میں آ گئی تھی کہ مومل صبح سے اسے اگنور کر رہی تھی۔کلاس میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی نہ ہی راستے میں ہی مومل ایک لفظ بولی تھی اور اب فری پیریڈ میں اکیلی ہی کینٹین آ گئی تھی اور نوائم اس کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں چلی آئی تھی اور نروٹھے انداز میں شکوہ کیا تھا مگر دوسری جانب پرواہ کسے تھی۔وہ نوائم سے لاتعلق سی کولڈ ڈرنک کے سپ لے رہی تھی۔

''تم ہماری دوستی ایک ایسی بات پر خراب کر رہی ہو مومل، جس سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں ...... کہ جب تم انکار کا حق رکھتے ہوئے انکار کرنے سے قاصر ہو تو میں تمہارے لئے کیا کر سکتی ہوں۔'' وہ غصہ ضبط کرتی قدرے کڑوے، کسیلے انداز میں طنزیہ بولی تھی جواباً مومل نے کوئی رسپانس ہی نہیں دیا تھا۔

''اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں عبیر کو سمجھاؤں، اس سے کہوں کہ تم اس میں انٹرسٹڈ نہیں ہو اس لئے وہ تم سے شادی کا خیال ذہن و دل سے نکال دے تو تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے میں ایسا کر چکی ہوں۔''

نوائم کی بات پر وہ سپ لینا بھول گئی تھی اور مومل منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر خفگی کے ساتھ سچائی نور کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

''میں عبیر کو کافی عرصہ سے سمجھاتی رہی ہوں اس لئے اس کے پرپوزل کا سن کر مجھے حیرانگی بھی ہوئی تھی اور میں نے اسے سمجھانے کی پھر کوشش کی تھی جو ناکام ہوئی۔مجھے عبیر چاہے تمہارے لئے بہتر چوائس لگتا ہے کیونکہ وہ تمہارے ساتھ مخلص ہے، تم سے محبت کرتا ہے لیکن باوجود اس کے میں تمہاری خوشی کی خاطر، تمہاری پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے عبیر کو اس فیصلے سے باز رکھنے کی ناکام کوشش کر چکی ہوں۔'' نوائم اس کی بدگمانی دور کرنے کو تمام تر تفصیلات سے آگاہ کرتی چلی گئی تھی اور مومل کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''سوری نوائم، رات میں نے تم سے بہت بدتمیزی کی اور جانے کیا کچھ بکواس کر گئی، مجھے تم پر، تمہاری دوستی پر رتی برابر شک نہیں ہے بس تم عبیر کی سائیڈ لیتی ہو تو بہت بری لگتی ہو۔'' وہ روتے ہوئے نم لہجے میں بولتی نوائم کو بہت معصوم لگی تھی۔

''یو ڈونٹ وری مومی، میں ماما سے بات کروں گی پھر ماما خود چاچی سے بات کر لیں گی۔'' وہ پورے خلوص سے بولی تھی۔

''نہیں نوائم، اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں انکار کرنا ہی نہیں چاہتی اول و آخر میں نے شادی پاپا کی پسند کے لڑکے سے ہی کرنی ہے تو اس رشتے سے انکار کر کے کیوں پاپا کو ہرٹ کروں، خود سے بدگمان کروں۔ جب میری زندگی میری قسمت میں یہ سب لکھا جا چکا ہے تو......'' وہ آزردگی سے بولی تھی نوائم کو اس کی سمجھ نہیں آئی تھی کبھی تو وہ بہت، قناعت پسند، قسمت پر صابر رہنے والی بن جاتی تھی اور کبھی غصہ سے دنیا کو آگ لگانے اور قسمت بدلنے کے درپہ ہو جاتی تھی اس کے دھوپ چھاؤں کے مزاج سے نوائم کو حقیقی معنوں میں خوف محسوس ہوتا تھا۔

''مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی مومی، جب تم قسمت پر قانع ہو کر بیٹھی ہو تو رونا دھونا کیوں۔ عبیر سے انکار کروانے کی کوشش کیوں......'' وہ موحل کے عجیب و غریب رویے سے الجھ کر مضطرب سی بولی تھی۔

''نہ تم سمجھ سکتی ہو نوائم نہ ہی میں تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ قسمت میں بدل نہیں سکتی، ہاں عبیر خود غرضی نہ دکھاتا تو مجھے شاید اپنی قسمت بدلنے کا موقع مل جاتا اس لئے اب صرف جو شکوے ہیں، جو غصہ ہے جو ہلکی سی ناپسندیدگی تھی جو اب نفرت کے قالب میں ڈھل گئی ہے وہ سب عبیر کے لئے ہے اور میری مجبوری سے فائدہ اٹھانے والے کو سکون تو میں لینے نہیں دوں گی۔ وہ مجھے پانا چاہتا ہے نا تو میں بھی اسے بتا دوں گی کہ وہ مجھے پا کر بھی پانے میں بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔'' وہ آنسو پونچھتی نفرت انگیز لہجہ میں بولتی نوائم کو ساکت بیٹھا چھوڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور نکلتی چلی گئی تھی اور نوائم جاتی ہوئی موحل کو دیکھ کر مستقبل کا سوچتی پریشان ہو رہی تھی کہ وہ موحل کو جانتی تھی کہ وہ جتنی نرم خو ہے اتنی ہی سختی بھی اپنے اندر رکھتی ہے اس کی فطرت میں ضد نہیں تھی وہ اکثر بڑی خاموشی سے اپنی ہار تسلیم کر لیتی تھی مگر اپنی ہار کو دوسرے کی کامیابی نہیں بننے دیتی تھی۔ دوسرے کی ضد مان کر اسے ناکوں چنے چبوا دیتی تھی اور نوائم جو اس کی رگ رگ سے واقف تھی اس کے تیوروں سے سہم اٹھی تھی کہ وہ سمجھ چکی تھی کہ موحل اپنی مجبوری کو عبیر کے گلے کا طوق بنانے کا تہیہ کر چکی ہے۔ وہ باز نہیں رکھ سکتی تھی اس لئے ایک لمحہ میں اس نے عبیر سے بات کرنے اور اسے سمجھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆...☆...☆

''یس کم اِن۔'' دروازے پر دھیمی سی دستک ہوئی تھی اور ابسام نے کمپیوٹر اسکرین پر نظر جمائے مصروف سے انداز میں دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دی تھی۔ دروازہ کھلا تھا وہ ہنوز اپنے کام میں مصروف تھا اور وہ دہلیز پر ٹھہر گئی تھی اور اسے دیکھا تھا جو پیٹ کے بل بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ نظر اسکرین پر تھی اور انگلیاں کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔

''کھانا کھا لیں آکر۔'' وہ قدرے جھجک کر بولی تھی اور وہ آواز پر تیر کی طرح سیدھا ہوتا اسے دیکھنے لگا تھا جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس کے کمرے میں پہلی دفعہ آئی تھی۔

''آپ چلیں میں آتا ہوں۔'' اس نے دھیمے سے کہا تھا اور وہ اس کی طرف دیکھے بناء بڑی تیزی میں پلٹ گئی تھی۔

''آبدار مجھ سے خفا لگ رہی ہیں مگر میں وجہ جاننے سے قاصر ہوں۔'' وہ لیپ ٹاپ ٹیبل پر منتقل کرتے ہوئے سوچتا ہوا کمرے سے نکل آیا تھا۔

''تمہاری ماما بھی جہاں جاتی ہیں وہیں کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔'' وہ تینوں بڑی خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے کہ حیدر صاحب کی آواز نے خاموشی کو توڑ ڈالا تھا۔

''آپ ماما کو مس کر رہے ہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرایا تھا۔

''فضول مت بولا کرو ہر وقت۔'' وہ آبدار کو مسکراتے دیکھ کر بیٹے کی بات پر خفت کا شکار ہوتے خفت مٹانے کو بیٹے کو ڈپٹ گئے تھے۔ آبدار کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی وہ مسکراہٹ چھپانے کو گردن جھکا گئی تھی مگر ابسام کی نگاہ اس پر اٹھی تھی اور اس کی مسکراہٹ اس کی نگاہ میں سما گئی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں آبدار کی مسکراہٹ کو سراہا تھا وہ باپ کی طرف اپنی توجہ رکھ نہیں پایا تھا کہ اس کی نگاہ آبدار پر تھی اور سوچ آبدار کی مسکراہٹ کے گرد طواف کر رہی تھی۔ آبدار نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور اسے اپنی جانب متوجہ پا کر اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا اور چہرے کی رنگت سرخ ہوگئی تھی اور ابسام اس کی بدلتی کیفیت سے انجان یکدم اس کے دیکھنے پر شرمندہ ہوتا نظر چراتا توجہ کے تمام ارتکاز باپ کی جانب مرکوز کر گیا تھا۔

''ماما نے ساڑھے نو تک واپسی کا کہا تھا ابھی پونے نو بج رہے ہیں۔ تھوڑا سا انتظار فرما لیں آپ کی زوجہ محترمہ آ جائیں گی۔'' اس نے باپ کی تنبیہ سنی کب تھی انہیں خاموش دیکھ کر اس نے ایک بار پھر شرارت کی تھی۔

''انتظار ہی کرنا پڑے گا اور میں بے چارہ کر بھی کیا سکتا ہوں۔'' انہوں نے بیٹے کی شرارت پر اب کے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تھا اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرنے لگے تھے۔

''ماما کو لینے آپ چلے جائیں گے پاپا کہ مجھے کل کی میٹنگ کے لئے اہم پوائنٹس تیار کرنے ہیں۔'' وہ یکدم سنجیدہ ہوتا ہوا بولا تھا اور حیدر صاحب کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا اور اسی وقت فضہ حیدر کی کال آ گئی تھی۔ جنہوں نے لینے آ جانے کا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا تھا اور وہ فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''انکل چائے پی کر چلے جائیے گا۔ چائے تیار ہے۔'' وہ تینوں ہی کھانے کے بعد چائے پینے کے عادی تھے اس لئے وہ ٹیبل پر آنے سے پہلے ہی چائے چڑھا آئی تھی اس لئے دھیمے سے بولی تھی۔

''چائے بیٹا آپ کی آنٹی کے ساتھ پیوں گا۔ آپ ابسام کو چائے دے دیں اور اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں۔ آج شام سے فضہ گھر پر نہیں ہے آپ مصروفیت کے باعث بہت تھک گئی ہوں گی۔'' وہ نہایت دھیمے سے شفقت سے پر لہجے میں بولتے نکلتے چلے گئے تھے۔

''آپ میری چائے بوا کے ہاتھ میرے کمرے میں بھیج دیجئے گا۔'' ابسام کرسی کھسکا کر اٹھا تھا اور اس کے چہرے کی طرف دیکھتے

ہوئے بولتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ ملازمہ نے ٹیبل صاف کی تھی اور آبدار چائے مگ میں نکال کر ان سے کہا تھا کہ وہ ابسام کو دے آئیں۔ بوڑھی ملازمہ نے نرمی سے درخواست کی تھی کہ ابسام کو چائے وہ خود دے آئے کہ انہیں گھٹنوں میں درد کی شکایت تھی وہ یکدم شرمندہ ہوتی خاموشی سے چائے کی ٹرے اٹھا کر ابسام کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھی کہ ابسام سے بچنے کی وجہ سے اس نے بوا سے ابسام کو بلا کر لانے کو کہا تھا تب بھی انہوں نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ ابسام کو خود بلا لائے اس لئے اب اسے ان سے کہنا ہی نہیں چاہئے تھا اسی لئے وہ شرمندہ بھی ہوئی تھی۔ ابسام کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اس کے قدموں کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی کہ ابسام کے لئے جو وہ جذبات محسوس کرنے لگی تھی اس کے بعد تو وہ پہلے ہی اس سے کتراتی تھی اور جب سے اس نے بے تکلفی سے نوائم سے بات کرتے سنا تھا وہ اس سے خائف کم خفا زیادہ تھی اس لئے حتی المقدور کوشش کر رہی تھی کہ اس کا ابسام سے کم سے کم سامنا ہو اور دو دن وہ اس میں کامیاب رہی تھی مگر آج فضہ حیدر دوست کے گھر میلاد شریف کی محفل میں گئی ہوئی تھیں اس لئے اسے شعوری احتیاط کے حصار سے باہر آنا پڑا تھا اور وہ جو اس کے سامنے سے کترا رہی تھی دوسری بار اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے گئی تھی جبکہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کمپیوٹر چیئر پر بیٹھے ابسام نے گردن ترچھی کر کے دیکھا تھا اور اسے اندر آنے کی اجازت دی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کمرے میں داخل ہوئی ٹیبل تک پہنچی تھی بڑی خامشی سے اس نے ٹیبل پر چائے کی ٹرے رکھی تھی اور پلٹ گئی تھی کہ ابسام نے اسے پکارا تھا۔

''آبدار۔'' اسے کہاں امید تھی کہ وہ اسے پکار سکتا ہے وہ یکدم پتھر کی ہوگئی تھی آگے بڑھنے سے قاصر، پلٹنے سے گریزاں......جبکہ وہ کرسی چھوڑ کر اٹھتا عین اس کے سامنے آن رکا تھا اس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر ابسام حیدر کو دیکھا تھا اس کے حسین چہرے پر سنجیدگی تھی اور آبدار سے دل کا سنبھالنا مشکل ہونے لگا تھا کہ سامنے ابسام حیدر مجسم اس کی محبت بنا اس کے بہت قریب کھڑا تھا اور جب محبت سامنے موجود ہو، جب محبوب نظر کے سامنے ہو تو دھڑکنوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا۔ ہر عضو دل کی دھڑکن بنا محبوب کے قدموں میں نچھاور ہونے کو تیار رہتا ہے۔ اس کی نظر میں بے اختیاری در آئی تھی جسے وہ محسوس کرتا یکدم اسے روکنے پر پچھتاوا سا محسوس کرنے لگا تھا مگر اسے روک چکا تھا اس لئے گلا کھنکارا تھا اور وہ اپنی بے اختیاری کو خیر باد کہتی نظر چراتی لب کچلنے لگی تھی مگر اس کا ہر عضو کان بن گیا تھا وہ ابسام کے کچھ کہنے کی دل و جاں سے منتظر تھی۔

''کیا آپ مجھ سے میرے مس بی ہیوئیر کی وجہ سے اب تک ناراض ہیں۔'' ابسام کے لہجے میں سادگی تھی مگر وہ اسے ایک بار پھر دیکھنے لگی تھی مگر اس بار اس نے حواس قائم رکھے تھے۔

''جی نہیں، میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔'' وہ اسے دیکھنے لگا تھا جس کے لفظ کچھ کہہ رہے تھے اور لہجہ کچھ اور کہہ رہا تھا اور آنکھوں و چہرے پر لکھی تحریر یکسر الگ تھی وہ اس کتاب سی لڑکی کو دیکھے گیا تھا جس کو اپنے تاثرات چھپانے نہیں آتے تھے یا وہ اس کے سامنے ہی کھلی کتاب بن گئی تھی۔ اس کے لفظ کہہ رہے تھے کہ وہ ناراض نہیں ہے مگر نروٹھا لہجہ چیخ چیخ کر اظہار کر رہا تھا کہ وہ اس سے خفا ہے۔

''اچھا......مگر مجھے آپ ناراض لگ رہی ہیں۔'' وہ ''اچھا'' کو قدرے کھینچ کر بولتا دھیمے سے جملہ مکمل کر گیا تھا اور اس کے صاف کہہ دینے پر اس کا چہرہ آتش ہو گیا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے میں آپ سے بھلا کیوں ناراض ہوں گی۔ آپ سے میرا رشتہ ہی کیا ہے۔'' وہ اس کے نروٹھے لہجے پر چونکا تھا مگر اس کا نروٹھا لہجہ جملے کے اختتام تک عجب سی بے بسی سے بھر گیا تھا وہ اس پیاری سی لڑکی کو دیکھنے لگا تھا جس کی آنکھوں میں آنسو ہلکورے لینے لگے تھے۔

''یقین رکھیں میں آپ سے ناراض نہیں ہوں......اور اس بات پر تو بالکل بھی نہیں کہ بے شک غلطی میری نہیں تھی پھر بھی آپ ڈانٹنے میں حق بجانب تھے اس لحاظ سے میری ناراضگی بنتی ہی نہیں ہے۔'' وہ نظر جھکائے آنسو پینے کی کوشش کرتی خود کو کمپوز کرتی دھیمے مگر صاف گو انداز میں کہتی اسے حیران چھوڑ کر باہر نکل گئی تھی اور وہ آبدار کے عجیب وغریب رویے پر الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆...☆...☆

''تم سمجھ کیوں نہیں رہے ہو عبیر، مومل تم سے محبت نہیں کرتی۔'' وہ اپنی سوچ پر عمل کرتی عبیر کو سمجھانے چلی آئی تھی مگر وہ تو محبت کا مسافر تھا اور محبت کے مسافر کو دلیل کہاں سمجھ آتی ہے۔ وہ کسی منطق کو کہاں مانتا ہے وہ اسے سمجھانے میں ناکام ہوتی جھنجھلا کر رہ گئی تھی جبکہ وہ دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

''مومل مجھ سے محبت نہیں کرتی جانتا ہوں اور میں اسے خود سے محبت کرنے پر مجبور بھی نہیں کر سکتا نوائم، لیکن......میں خود کو مومل سے محبت کرنے سے باز بھی نہیں رکھ سکتا۔ میں مومل کی محبت میں اس حد تک جا چکا ہوں جہاں سے آگے بڑھنے کے ہزار راستے ہوتے ہیں مگر پلٹنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور راستہ تلاش کرو تو ہر راستہ بند ملتا ہے کہ محبت سے واپسی کا راستہ بنا ہی نہیں ہے۔'' وہ عبیر کو دیکھ رہی تھی جس کے خوبرو چہرے پر سچائی تھی اس کی آنکھوں میں مومل کا عکس یوں لہرا رہا تھا کہ نوائم کو اپنی کوشش پر شرمندگی ہو رہی تھی مگر وہ مومل کے لئے خودغرض بن گئی تھی تب ہی تو عبیر کی آنکھوں میں رقصاں محبت کو محسوس کرنے کے باوجود اسے محبت سے باز رہنے کو کہہ رہی تھی۔

''کتابی باتیں بند کرو عبیر اور پریکٹیکل ہو کر سوچو ایسی لڑکی جو تمہیں بالکل پسند نہیں کرتی جس کے دل میں تمہارے لئے بالکل بھی گنجائش نہیں ہے اس کے ساتھ تم اپنی تمام عمر کیسے بسر کرو گے۔'' وہ اس کی محبت پر دل کو جھکتا محسوس کرتی مومل کی ناپسندیدگی جو نفرت کے قالب میں ڈھلنے لگی تھی کے پیش نظر اسے اس کام سے باز رہنے کا کہہ رہی تھی جس سے باز آنا اتنا ہی ناممکن تھا جتنا سورج کا رات ڈھلے طلوع ہونا کہ محبت زندگی اور سورج دن کی روشنی کی علامت تھا۔

''میں تو عمر محبت کے ساتھ بسر کرنا چاہتا ہوں نوائم، اس لئے مجھے مومل کے رویے کا کوئی ڈر نہیں ہے کہ میں محبت کی بازی کھیلنے جا رہا ہوں اور محبت کی بازی میں ہار بھی مات کب کہلاتی ہے۔'' وہ بہت سکون سے بولا تھا اور وہ آگے سے کچھ نہیں بولی تھی کہ جان گئی تھی۔ اہل

دماغ کو سمجھایا قائل کیا جاسکتا ہے مگر اہل دل کو سمجھا پانا یا قائل کر لینا ناممکنات میں سے تھا۔ مومل کے رضامندی ظاہر کرنے پر عبیر کا رشتہ ڈن کر دیا گیا تھا اور عبیر کے والد نے بیٹے کی خوشی کے لئے منگنی کے بجائے نکاح کی بات کی تھی اور شادی کا دونوں کی تعلیم کے بعد کا کہا تھا۔ عقیل احمد نے کچھ کہنے کی بجائے بھائی کی طرف دیکھا تھا کہ وہ خود سے تو کوئی فیصلہ لے ہی نہیں سکتے تھے۔

''ہمیں نکاح پر اعتراض نہیں ہے۔ فضہ سے بات کریں گے اس کا جب ڈنمارک آنا پوسیبل ہو گا تب کی کوئی تاریخ دے دیں گے۔'' عقیل احمد نے فوراً نہ صرف حامی بھری تھی صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک فضہ نہیں آئیں گی وہ کوئی بھی تاریخ دینے سے قاصر رہیں گے اور عقیل احمد کی بات سے سب ہی نے سوفیصدی اتفاق کیا تھا۔ یہاں تک کہ کبیر عباسی کے پاس اختلاف کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بھائی صاحب کہ گھر کی تقریب گھر کی بیٹی کے بغیر تو ہونے سے رہی۔'' کبیر عباسی نے تمہید باندھی تھی۔

''لیکن آپ لوگ پاکستان جا رہے ہیں تو فضہ کا ڈنمارک آنا کافی ماہ تک ممکن نہ ہو گا جبکہ میں اپنی بیماری کے پیش نظر جلد از جلد عبیر کی شادی کر دینا چاہتا ہوں اسی لئے تو میں نے منگنی کے بجائے نکاح کی بات کی ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بول رہے تھے انہوں نے کافی سبھاؤ سے سوچ سمجھ کر اپنی بیماری کو ڈھال بنا کر بات کی تھی کہ وہ ہارٹ پیشنٹ تھے۔ ان کے بیٹے کا بس چلتا تو کھڑے کھڑے مومل کو رخصت کروا لیتا اور بیٹے کے دل کی بات کہہ نہیں سکتے تھے اس لئے طریقے سے ہر بات مومل کی فیملی کے سامنے رکھی تھی۔ کبیر عباسی کی بات میں دم تھا وہ سب ہی یکدم سوچ بچار میں مبتلا ہو گئے تھے۔

''کہتے تو آپ ٹھیک ہیں کبیر بھائی، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ فضہ کے بغیر مومل کا نکاح بھی تو نہیں کیا جاسکتا۔'' اب کے عقیل احمد کی بیوی نے لب کشائی کی تھی۔ کبیر عباسی آگے سے کچھ نہیں بولے تھے کہ جانتے ہی تھے کہ فضہ حیدر کی غیر موجودگی میں وہ اتنی بڑی تقریب کا اہتمام کر ہی نہیں سکتے تھے۔

''تم بھی ہمارے ساتھ پاکستان کیوں نہیں چلتے۔'' کبیر عباسی جو یکدم خاموش ہو گئے تھے حیرانگی سے دوست کو دیکھنے لگے تھے جبکہ عقیل احمد نے دوست کی حیرانگی محسوس کر کے بات کو مسکراتے ہوئے آگے بڑھایا تھا۔

''تم کافی عرصہ سے پاکستان جانا چاہ رہے تھے۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی مسئلہ ایسا آیا کہ تم پاکستان جا نہیں پائے۔ اب جب ہم سب ہی جا رہے ہیں تو تم بھی چلو۔'' عقیل احمد نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا تھا کہ وہ دوست کی خواہش سے واقف ہی تھے کہ وہ خود تو یہیں پیدا ہوئے تھے اس لئے پاکستان جانے کے بارے میں انہوں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان کے دادا ڈنمارک میں آ بسے تھے اور تب سے ان کا پورا خاندان یہیں کا ہو رہا تھا جبکہ کبیر عباسی پاکستان کے ایک چھوٹے سے قصبہ سے تعلق رکھتے تھے اور ذریعہ معاش کی تلاش میں یہاں آئے تھے اور ایک کرسچین لڑکی سے شادی کیا ہوئی تھی پاکستان سے ہر ناطہ توڑ کر ڈنمارک کے ہو گئے تھے۔ کبھی لوٹ کر پاکستان نہیں گئے تھے۔ یکے بعد دیگرے والدین کی وفات ہو گئی تھی اور جن والدین نے زندگی دی ان کا آخری دیدار تک نہیں کیا تھا مگر کچھ عرصہ سے پاکستان

جانے کی لگن دل میں سما گئی تھی مگر وہ جا نہیں پا رہے تھے کہ مارتھا (ماریہ اسلامی نام) نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی مگر وہ بھی راضی نہیں ہوئی تھی کہ وہ پاکستان جائیں اس لئے بیوی کی وفات کے بعد سے انہوں نے پاکستان جانے کا سوچا تھا مگر ہارٹ پیشنٹ تھے اور دس ہزار مسائل الگ، اس لئے بیوی کی وفات کو تین سال گزر گئے تھے اور وہ آج بھی پاکستان جانے میں ناکام تھے مگر اب دوست کی بات پر سوچ میں پڑ گئے تھے۔

''گھر جا کر آرام سے تسلی سے سوچ لینا کبیر اور عبیر سے بھی مشورہ کر لینا۔ تم دونوں اگر ہمارے ساتھ چلو گے تو نکاح کی تقریب پاکستان میں ہو جائے گی۔'' عقیل احمد مزید بولے تھے اور وہ خاموشی سے ان کے گھر سے نکل آئے تھے ان سے یہ تک نہیں کہا گیا تھا کہ پاکستان جانے کی خواہش ہی نہیں رہی کہ پاکستان میں اب ان کے لئے کچھ رہا ہی کب تھا۔ بوڑھے ماں باپ مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ بھائی، بہن کوئی تھے نہیں اس لحاظ سے پاکستان میں ان کے لئے کوئی کشش باقی نہیں رہی تھی اس لئے ان کی کوشش میں ہی کمی تھی مگر وہ پاکستان جانے کا سوچ رہے تھے اور جیسے ہی فیصلہ ہوا تھا دل کا وہ کونا جو خاموش و ویران ہو گیا تھا اس میں یکدم ہی ہلچل مچ گئی تھی، زندگی سا حسین چہرہ آنکھوں کے سامنے یوں لہرایا تھا جیسے اس کو چھوڑ کر آئے لمحہ بھر پہلے کی بات ہو۔

''پتہ نہیں، اسے میں یاد بھی ہوں گا کہ نہیں......'' دل سے ایک آہ سی نکلی تھی۔

''لوگ تو وفاداروں کو بھول جاتے ہیں کبیر عباسی، تم تو پھر بے وفائی کر کے آئے تھے تمہیں کس نے یاد رکھنا تھا۔ مگر بے وفائی میری جانب سے تو نہ تھی۔ مجھے تو فرمانبرداری کی نظر کر کے مجھ سے محبت چھین لی گئی تھی۔''

آہ بے بسی میں ڈھل گئی تھی اپنی سوچ کی خود ہی نفی کی تھی یہ جانے بغیر کہ کچھ لوگ وفاداروں کو ہی نہیں بے وفاؤں کو بھی بڑا دل سے یاد رکھتے ہیں اور جسے وہ چھوڑ آئے تھے وہ آج بھی اسی ایک لمحہ میں زندہ تھی کہ زندگی کو کسی کی خاطر کسی کے قدموں میں نچھاور کر دینے والے جب زندگی جیتے ہیں تو صرف اس لئے کہ سانس چل رہی ہوتی ہے ورنہ زندگی سے ان کا کوئی لینا دینا نہیں ہوتا۔ زندگی ان کے لئے ہوتی ہی نہیں کہ زندگی تو چھوڑ کر جانے والے کی قدم بوسی کو کچھ یوں بڑھتی ہے کہ زندگی، زندگی میں سانسوں کی آماجگاہ بن جاتی ہے اور جسے وہ چھوڑ آئے تھے وہ آج بھی زندہ تھی مگر وہ زندہ ہو کر بھی زندہ نہ تھی۔

تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے
یہ مانا کہ محفل جواں ہے حسیں ہے
جدھر بھی یہ دیکھیں جہاں بھی یہ جائیں
تجھے ڈھونڈتی ہیں یہ پاگل نگاہیں
میں زندہ ہوں لیکن کہاں زندگی ہے
میری زندگی تو کہاں کھو گئی ہے

''میرے استقبال کو چاہے پاکستان میں کوئی نہیں مگر میں پھر بھی پاکستان جاؤں گا کہ جس وطن میں جی نہیں سکا مرنا وہیں چاہتا ہوں۔'' انہوں نے دھکتے دل پر ہاتھ سے دباؤ ڈالتے ہوئے فیصلہ لیا تھا اور ان کا فیصلہ جب ان کے اکلوتے بیٹے کو پتہ چلا تھا وہ متحیر ہی رہ گیا تھا۔ عبیر کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ باپ کی بات پر کیا ردعمل ظاہر کرے۔ ان کے فیصلہ کی حمایت کرے کہ تردید کرے، وہ کبیر عباسی کو بس حیرانگی سے تکتا جا رہا تھا کہ اسے باپ سے ایسے فیصلے کی امید بھی نہ تھی اور یوں اچانک فیصلہ کی تو بالکل بھی نہیں کہ وہ وجہ تک سمجھنے سے قاصر تھا۔

☆......☆......☆

''پاپا! کیا سوچ رہے ہیں۔'' وہ باپ کے بلاوے پر اسٹڈی میں آیا تھا اور وہ کافی دیر کچھ نہیں بولے تھے تب ابسام نے الجھ کر پوچھا تھا۔

''شکیل بھائی صاحب نے اپنے پاکستان آنے کا کنفرم کر دیا ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ان سب سے آبدار کا کیا کہہ کر تعارف کروائیں گے۔'' انہوں نے اپنی پریشانی بیٹے سے کہی تھی کہ بیوی کو سرپرائز دینا تھا ایسے میں ان سے مشورہ نہیں کر سکتے تھے اور باپ کی بات نے ابسام کو بھی مضطرب کر دیا تھا کہ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

''پاپا۔اس کے بارے میں کوئی بھی مشورہ دینے سے میں تو بالکل ہی قاصر ہوں۔'' اس نے بے چارگی سے کہا تھا۔

''میں خود بھی سمجھ نہیں پا رہا اور مسئلہ یہ ہے کہ فضہ سے بھی مشورہ نہیں کیا جا سکتا۔'' ان کے بے چارگی سے کہنے پر ابسام کو ہنسی آ گئی تھی۔

''پاپا! آپ بھی نا، کبھی تو کوئی فیصلہ ماما کی مرضی کے بنا لے لیا کریں۔'' وہ انہیں چھیڑ رہا تھا۔

''سوچتا ہوں اس بغاوت کے بارے میں، مگر میرا ذہن و دل مجھے یہ بغاوت کرنے ہی نہیں دیتے۔'' وہ مزے سے بولے تھے۔

''اوہوں، پھر کچھ ایسا سوچیں کہ ماما کو نانو وغیرہ کے پاکستان آنے کا پتہ بھی نہ چلے اور وہ اس بارے میں مشورہ بھی دے دیں۔'' اس نے مسکرا کر ایک سب سے آسان اور سادہ حل باپ کے سامنے رکھا تھا اور اسی وقت اسٹڈی کا دروازہ کھلا تھا اور فضہ حیدر چلی آئی تھیں انہوں نے شوہر کی طرف چائے کا مگ بڑھاتے ہوئے بیٹے کو دیکھا تھا کہ وہ اس وقت اس کی یہاں موجودگی پر حیران تھیں کیونکہ حیدر صاحب رات ساڑھے دس سے ساڑھے گیارہ اسٹڈی میں ہی گزارتے تھے اور اس ایک گھنٹہ میں انہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کر سکتا تھا یہاں تک کہ ان کی چہیتی اہلیہ بھی نہیں کہ وہ مکمل یکسوئی سے کتب بینی کے عادی تھے۔ وہ ہوتے تھے اور ان کی چائے یا کافی ہوتی تھی جو فضہ کبھی ملازمہ کے ہاتھ بھجواتی تھیں اور کبھی خود دے کر بڑی خاموشی سے اسٹڈی چھوڑ دیتی تھیں اور کبھی خود ان کا کتب بینی کا ارادہ ہوتا تو وہ وہیں بیٹھ کر کوئی بھی کتاب اٹھا لیتی تھیں۔ ایسے میں وہ بیٹے کو وہاں دیکھ کر حیران نہ ہوتیں تو کیا کرتیں کہ بیٹے کا تسلی سے بیٹھا ہونا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ ان کی آمد سے پہلے کسی خاص موضوع پر بات کر رہے تھے۔

''آپ دونوں کیا کسی خاص بات کو ڈسکس کر رہے تھے؟'' انہوں نے حیرت کو زبان دی تھی۔

''ہاں، بہت خاص، تم بیٹھو میں تمہیں بلوانے ہی والا تھا۔'' حیدر صاحب سنجیدگی سے بول کر انہیں تفکرات کے سائے تلے کھڑا کر

گئے تھے۔

''میں سمجھی نہیں حیدر، سب خیر تو ہے؟'' وہ الجھ کر شوہر کو دیکھ رہی تھیں جو مسکرا دیئے تھے۔

''سب خیر ہے۔ آبدار کے سلسلے میں بات کرنی ہے۔'' اسٹڈی میں رکھے صوفے پر وہ ٹک گئی تھیں اور سوالیہ نگاہوں سے شوہر کو دیکھنے لگی تھیں۔

''آج جب تم گھر پر نہیں تھی تو ڈنمارک سے عقیل بھائی صاحب کی کال آئی تھی وہ آبدار نے ریسیو کی تھی۔'' حیدر صاحب کی بات پر فضہ حیدر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

''اف، آبدار نے کیوں کال ریسیو کر لی اور بھائی صاحب سے کیا کہا اس نے......'' وہ مضطرب سی بول رہی تھیں کہ حیدر صاحب درمیان میں ہی بول اٹھے۔

''آبدار نے کال اس لئے ریسیو کی کیونکہ تم ہی نہیں ہم دونوں بھی گھر پر نہیں تھے۔ اس نے ہیلو ہی کہا تھا اور اسی وقت میں اور ابسام آفس سے لوٹے تھے اس لئے آبدار نے اور کچھ کہے سنے بغیر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔'' یکدم فضہ حیدر نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

''آج تو بچت ہوگئی مگر اس طرح کی صورتحال پھر سے جنم لے سکتی ہے اس لئے میں ابسام سے یہ ڈسکس کر رہا تھا کہ آبدار ہمارے گھر میں کب تک رہیں گی اور آبدار جب تک یہاں ہیں تو ہمیں آپ کی فیملی کو کیا بتانا چاہیئے کہ ان کے علم میں کسی اور ذریعے سے یہ بات آئے ہمیں خود بتا دینا چاہیئے۔'' حیدر صاحب نے نہایت سمجھ داری سے ایک جھوٹی کہانی ترتیب دے کر ان سے مشورہ طلب کیا تھا ابسام باپ کی سمجھ داری کا کچھ اور قائل ہو گیا تھا۔

''جی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میں کل صبح ہی بات کر کے اماں جان کو بتا دوں گی۔'' وہ دھیمے سے بولی تھیں اور وہ سوالیہ نگاہوں سے یوں دیکھنے لگے کہ جیسے جاننا چاہ رہے ہوں کہ کیا بتائیں گی......؟ مگر انہوں نے شوہر کی سوالیہ نگاہوں کو نظر انداز کیا تھا اور بیٹے سے بولی تھیں۔

''آبدار کے بارے میں تمہاری آئیکت سے کیا بات ہوئی، وہ کب تک یہاں رہے گی؟'' اب مضطرب ہونے کی باری ابسام کی تھی۔

''ماما! آئیکت کوشش تو کر رہا ہے مگر وہ ابھی کچھ بھی کر نہیں پا رہا اور جب تک آئیکت باہر جانے کے انتظامات نہیں کر لیتا آبدار کہیں اور نہیں جا سکتیں وہ یہیں ہمارے گھر میں رہیں گی۔'' اس نے قدرے جھجک کر کہا تھا۔

''تقریباً دو ماہ ہونے والے ہیں ابسام اور ایک غیر بچی کو ہم زیادہ دن اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے کہ زیادہ دن گزریں گے تو ہم پر اغواء وغیرہ کا بھی کیس بن سکتا ہے اور اسکے علاوہ بھی دس ہزار مسائل ہیں۔'' وہ بیٹے کی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہنے لگی تھیں۔

''آئیکت تمہارا دوست ہے اور تم نے دوست کی محبت میں ایک اقدام اٹھایا تو میں نے کچھ نہیں کہا کہ ویسے بھی ایک کام ہو جانے کے بعد کچھ کہنا ہی بے کار تھا۔'' فضہ حیدر کے صاف گوئی سے کہنے پر ابسام شرمندہ ہو گیا تھا کہ اسے اندازہ تھا کہ اس نے آئیکت کی دوستی

میں ایک بہت بڑا فیصلہ لیا وہ بھی والدین کو یکسر لاعلم رکھ کر اور اس کے والدین کی اعلیٰ ظرفی کے انہوں نے اس کے فیصلے کو ناپسند کرنے کے باوجود اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔

''مگر اب بہت وقت گزر گیا ہے اور مزید گزرے گا تو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آبدار ایک اچھی لڑکی ہے اور میں اتنی سمجھ دار لڑکی سے ایسی حماقت کی توقع نہیں کر سکتی تھی مگر وہ ایک بڑی حماقت کر چکی ہے، گھر وہ ایک ایسے لڑکے کے لئے بھاگ آئی ہے جس سے محبت تک نہیں کرتی۔'' فضہ حیدر کی بات پر وہ دونوں باپ بیٹے حیرانگی سے اس کی شکل دیکھنے لگے تھے۔

''آئیکت کی آنکھوں میں آبدار کے لئے محبت صاف محسوس ہوتی ہے مگر آبدار کو دیکھ کر کبھی نہیں لگا کہ اسے آئیکت سے محبت ہے اور یہ میرا اوہم بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ لحظہ بھر کو رکی تھیں اور ابسام مضطرب ہو گیا تھا۔

''مجھے یہ بات پریشان کر رہی ہے کہ جب آبدار کو آئیکت سے محبت ہی نہیں ہے تو پھر کیوں وہ اس کے لئے اپنا گھر چھوڑ آئی۔''

''فضہ! تم مفروضوں پر بات نہ کرو۔'' حیدر صاحب نے انہیں ٹوکا تھا۔

''میری آبزرویشن رانگ نہیں ہوتی حیدر۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔'' وہ برا مانے بغیر بولی تھیں۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں ماما، پلیز صاف کھل کر کہہ دیجئے۔'' وہ دونوں آپس میں الجھنا شروع کرتے کہ ابسام نے دھیمے سے کہا تھا۔

''میں صرف اتنا کہنا چاہ رہی ہوں کہ مجھے ہر گزرتے دن کے ساتھ پریشانی ہونے لگی ہے، مجھے آبدار سے کوئی پرابلم نہیں ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ اب وہ اپنے گھر چلی جائے کہ مجھے تو لگتا ہے کہ آئیکت نے جو وجہ بتائی ہے وہ درست نہیں ہے۔'' وہ صاف گوئی سے بولی تھیں۔

''ماما! آئیکت نے سچ کہا ہے یا جھوٹ، یہ آئیکت کا مسئلہ ہے۔ میں نے اس کی مدد سچے دل سے اس کی دوستی کے لئے کی ہے اس لئے میں خود اس سے کہہ نہیں سکتا کہ وہ آبدار کو میرے گھر سے لے جائے اس لئے وہ خود سے جب تک انتظام نہیں کر لیتا آبدار ہمارے ہی گھر میں رہیں گی، نانو کی فیملی کو کیا بتانا ہے وہ آپ سوچ لیں۔'' وہ دھیمے سے کہتا اٹھا تھا اور نکلتا چلا گیا تھا۔

''کبھی کبھی تم بھی حد کر دیتی ہو۔'' انہوں نے بیوی کو دیکھا تھا۔

''فضول میں مت بولیں حیدر کہ آپ جانتے ہیں کہ ابسام نے جو وجہ بتائی اس سے میں ہرگز بھی مطمئن نہیں مگر ابسام ایک کام کر چکا تھا اس لئے میں خاموش ہو گئی کہ مجھے اپنے بیٹے کی نیت پر کوئی شک نہیں مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے مجھے پریشانی گھیرنے لگی ہے۔'' وہ اپنی ہرا لجھن شوہر سے کہہ گئی تھیں۔

''یہ فکر تو مجھے بھی لاحق رہتی ہے کہ کل کلاں کو آبدار کی فیملی نے ہم سے باز پرس کی یا ہم پر کسی قسم کا کیس بنا دیا تو ہم کیا کریں گے؟ مگر ابسام کا منہ دیکھ کر خاموش ہونا پڑتا ہے۔'' حیدر صاحب نے بھی ذہن و دل کی بات بالآخر کہہ ڈالی تھی۔

''میں ابھی تو اماں وغیرہ سے کہہ دوں گی کہ آبدار میری دوست کی بیٹی ہے اور وہ بیمار ہے اپنے علاج کے لئے ملک سے باہر گئی ہے تو

اس لئے اس کی بیٹی ہمارے گھر میں رہ رہی ہے۔'' انہوں نے ایک معقول بہانہ سب کے سامنے رکھنے کے لیے ایک بات بنائی تھی۔

''اوہوں، ٹھیک ہے۔'' حیدر صاحب نے کوئی اختلافی پہلو نہیں نکالا تھا۔

''مگر آپ سن لیں حیدر کہ میں اس سب قصہ کو زیادہ دن برداشت نہیں کرسکتی ہوں۔ اگر ابسام نہیں کرسکتا دوست سے بات تو کچھ دن تک میں خود آئیکت سے بات کروں گی۔'' فضہ حیدر فیصلہ کن انداز میں بولی تھیں۔

''تمہیں ایک دم یہ آبدار کیوں بری لگنے لگی ہے۔'' وہ کافی الجھے ہوئے سے انداز میں بولے تھے۔

''بری نہیں لگنے لگی ہے حیدر، کہ آپ جانتے ہیں فضول پر خاش پالنے کی عادت ہی نہیں میری، میں تو کال کا سن کر مضطرب ہوگئی ہوں اور جو بات کافی دن سے سوچ رہی تھی وہ کہہ دی ہے کہ کچھ بھی ہے آبدار کی ذمہ داری لے کر ہم نے غلطی کی ہے۔ اللہ نہ کرے کسی بھی قسم کی اونچ نیچ ہوئی تو ہم کس کس کو جواب دیں گے۔'' وہ اس شام سے الجھی ہوئی تھیں جب انہوں نے آئیکت کی آنکھوں میں پیار اور آبدار کی آنکھوں میں گریز دیکھا تھا اور آبدار سے ایک دفعہ جب باتوں میں انہوں نے پوچھا تھا کہ وہ آئیکت سے محبت نہیں کرتی اور آبدار کے یکدم خاموش ہوجانے پر وہ سوچ میں پڑ گئی تھیں اور انہیں یہ بات مضطرب کررہی تھی کہ محبت نہیں تھی تو پھر کیا وجہ تھی ایسی کہ آبدار ایک انتہائی قدم اٹھا گئی تھی کہ لڑکیاں تو لڑکوں کی باتوں میں آکر اس طرح کے اقدامات محبت میں ہی اٹھالیتی ہیں ورنہ انہیں اس نہج پر لے جانا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ انہوں نے اپنی ہر الجھن شوہر کے سامنے رکھی تھی اور انہیں بھی پریشان کرڈالا تھا۔

☆...☆...☆

''پاپا! میں سمجھ نہیں پارہا کہ آخر اتنی اچانک آپ نے ایسا فیصلہ کیوں کرلیا ہے؟'' عبیر الجھن سی محسوس کرتا باپ کے نہایت سنجیدہ انداز کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''کچھ فیصلے اچانک ہی لینے پڑتے ہیں اگر فیصلہ لینے کا محض سوچتے رہو تو ایک عمر گزر جاتی ہے مگر فیصلہ نہیں ہو پاتا۔'' ان کا انداز تھکن سے لبریز تھا اس نے باپ کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''پاپا! آپ پلیز مجھے کچھ تو بتائیں۔'' اس کے انداز میں لجاجت تھی۔

''بتانے کو تو کچھ بھی نہیں ہے عبیر، بس اتنا سمجھ لو کہ صبح کا بھولا شام کو گھر جانا چاہتا ہے۔'' ان کی آنکھوں میں کرب اترنے لگا تھا۔

''جانتا ہوں بہت دیر ہوچکی ہے وہاں میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں مگر میں اس بھاگتی دوڑتی ظالم زندگی سے نکل کر کچھ دیر سکون کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ جس سرزمین کو جن محبتوں کو چھوڑ آیا تھا اب تجدید کا وقت نہیں رہا عبیر کہ مجھے میری راہ تکنے والے تو منوں مٹی تلے جا سوئے ہیں اور میں زندہ رہ کر تو ان کے ساتھ نہ رہ سکا، مر کر ان کا ساتھ قبول کرنا چاہتا ہوں۔''

''پاپا......'' وہ جو باپ کے عجیب وغریب رویے پر حیران بھی ہورہا تھا دکھ بھی محسوس کررہا تھا۔ اچانک ان کی بات پر تڑپ کر رہ گیا تھا۔

''میں نے عمر تو اس اجنبی دیار میں گزار دی لیکن میں مرنا اپنی سرزمین پر چاہتا ہوں، جہاں میں نے بچپن گزارا، جہاں زندگی گزاری، اب میں چاہتا ہوں کہ جب مجھے موت آپنی آغوش میں لے تو مجھے میرے والدین کے پہلو میں دفن کر دیا جائے کہ ان کے گھر سے نکل آیا تھا۔ یہ اور بات کہ ان کے دل میں، میں ہی سدا رہا اور میں اس پہلو کو آباد کر دینا چاہتا ہوں۔'' ان کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''پاپا! آپ پریشان نہ ہوں، ہوگا وہی جو آپ چاہتے ہیں۔'' وہ کافی دیر بعد فیصلہ کن انداز میں بولا تھا۔ کبیر عباسی اسے متحیر سے دیکھنے لگے تھے کہ کہاں اس کے ماننے کی امید تھی۔

''ابھی تو ہم صرف وزٹ پر پاکستان چلتے ہیں...... یا آپ چاہیں تو آپ وہیں ٹھہر جایئے گا، میں کچھ ماہ میں سب کچھ وائنڈ اپ کر کے پاکستان آجاؤں گا اور ہم دادا ابو کے گھر سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔'' اس نے باپ کے انداز میں، لفظوں میں ندامت محسوس کی تھی اور وہ کچھ عرصہ سے انہیں پاکستان جانے کے لئے تڑپتا محسوس کر رہا تھا اس لئے اس نے باپ کی محبت میں فوراً ایک جذباتی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ باپ سے سو فیصد متفق تھا کہ کچھ فیصلے بہت اچانک، فوراً سے لینے پڑتے ہیں اگر عجلت کا مظاہرہ نہ کیا جائے تو فیصلہ لینے کے لئے ایک عمر بھی کم پڑ جاتی ہے۔

☆......☆......☆

''کیا آپ ابھی تک ناراض ہیں شاہ۔'' شاہ زیب آج بڑی فرصت میں لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ کافی عرصہ بعد اس نے ٹی وی پر کوئی ٹاک شو دیکھا تھا وہ حاشر کی طرف جانے کا سوچ رہا تھا کہ بن بلائے مہمان کی طرح عریم کا ٹیکسٹ آ گیا تھا اس نے یکدم ہی لب بھینچ لئے تھے کہ جب اس نے عریم کو فارس کے ساتھ کافی شاپ میں دیکھا تھا اس کے بعد ان کے درمیان جو تلخ کلامی ہوئی تھی اس کے بعد تو شاہ زیب نے اسے کال کرنے کا سوچا بھی نہ تھا اور ایک ہفتہ تک عریم کی طرف سے بھی خلاف توقع بالکل خاموشی رہی تھی مگر آج اس کا ہی ٹیکسٹ چلا آیا تھا جسے وہ حسب عادت اگنور کر گیا تھا تب ہی آمنہ چائے کی ٹرے اٹھائے اس کے پاس آ رکی تھی۔

''شکریہ آمنہ، اس وقت چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔'' اس نے تشکر آمیز نظروں سے اپنی تایا زاد آمنہ کو دیکھا تھا جو اس سے تقریباً ایک سال چھوٹی تھی کہ وہ آئیکت سے ایک سال بڑی اور وہ خود آئیکت سے دو سال بڑا تھا۔ جہانزیب اور کرنئی کی شادی بھائی کی شادی کے تقریباً تین سال بعد ہوئی تھی مگر شادی کے پہلے سال ہی رخسانہ کی گود میں شاہ زیب آ گیا تھا اور یہ بات بھی رخسانہ کو فخر پر اکساتی تھی کہ ان کی جیٹھانی اولاد سے محروم تھیں اور تابندہ کی محرومی شادی کے پانچویں سال دور ہو گئی اور تابندہ کی سونی گود آمنہ کی آمد سے بھر گئی تھی مگر رخسانہ کو اب بھی اپنا پلڑا بھاری ہی لگتا تھا کہ وہ بیٹے کی ماں تھیں اور گاہے بگاہے وہ فخریہ بات کہتی بھی تھیں مگر آمنہ کی پیدائش کے اگلے ہی سال آئیکت کی آمد نے رخسانہ کے تمام بڑے بولوں اور فخر کو چپ سا کروا دیا تھا یہ اور بات تھی کہ انہیں اپنے بیٹے شاہ زیب پر کچھ زیادہ ہی ناز تھا۔ شاہ زیب کی بات پر آمنہ دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

''آپ کو چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی تو آپ کہہ دیتے میں پہلے ہی آپ کے لئے چائے لے آتی۔'' آمنہ کے لہجے میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ وہ اسے دیکھنے لگا تھا اس کے گلابی چہرے پر کتنے ہی رنگ بکھرے تھے آنکھیں حیاء کے بار سے جھکتی جا رہی تھیں۔شاہ زیب کو خطرہ کی گھنٹی تو کافی عرصہ سے بجتی محسوس ہو رہی تھی اس وقت وہ بری طرح چونکا تھا کہ آمنہ کے انداز اسے کافی کچھ سمجھا رہے تھے اور وہ اس کی نگاہ محسوس کرتی سرخ پڑ گئی تھی یکدم شاہ زیب کو بے زاری سی ہونے لگی تھی۔

''مجھے کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو میں ماما اور مومنہ سے کہنا پسند کرتا ہوں تم میرا خیال رکھنے کے بجائے اپنی پڑھائی پر توجہ دو، اسی سال پاپا اور تایا تمہاری شادی کر دیں گے۔'' وہ یکدم اپنے اکھڑ روپ میں جاتا نہایت بے رخی سے بولا تھا اور چائے کا مگ منہ سے لگا گیا تھا جبکہ آمنہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔

''اب کھڑی کیوں ہو، جاؤ اپنے کمرے میں۔'' وہ اس کے دیکھنے اور وہاں جم کر کھڑے رہنے پر چڑ کر بولا تھا اور وہ آنسو پیتی بڑی تیزی میں وہاں سے نکل گئی تھی جبکہ اس کا موڈ سخت خراب ہو چکا تھا۔اوپر سے ایک کے بعد ایک میسج کرتی عریم اب کال کرنے لگی تھی اور اس کا غصہ ساتویں آسمان پر جا پہنچا تھا۔

''تم جانتی ہو عریم! میں کال ریسیو نہیں کروں گا تو پھر کال کرنے سے کیا فائدہ......لاحاصل کوشش کرنا ترک کر دو۔'' وہ چائے کا ادھ پیا کپ ٹیبل پر پٹختا کمرے میں چلا آیا تھا تب فون حالتِ سکوت میں آ چکا تھا وہ کال کر کے تھک گئی تھی یا قسمت پر یکدم شاکر ہو گئی تھی وہی جانتی تھی مگر اس کی ہر سوچ سے انجان شاہ زیب نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے کال بیک کی تھی اور اس کے کال ریسیو کرتے ہی وہ اپنے مخصوص تلخ و اکھڑ لہجے میں کہتا چلا گیا تھا۔

''آپ کیوں کر رہے ہیں ایسا شاہ......کیا میں آپ کو اتنی بری لگنے لگی ہوں کہ آپ ہر وقت غصہ کرتے رہتے ہیں۔'' وہ سسکتے ہوئے بولی تھی اور اس کے اعصاب مزید کشیدہ ہوتے چلے گئے تھے۔

''بری تو تم واقعی بہت لگنے لگی ہو عریم کہ تم بہت بدل گئی ہو۔'' شاہ زیب نے اب کے قدرے نروٹھے انداز میں شکوہ کیا تھا اور اس کی تو سانس سینے میں اٹکنے لگی تھی۔

''بدل میں نہیں گئی ہوں شاہ، بدل تو آپ گئے ہیں۔نہ پہلے کی طرح کال کرتے ہیں......نہ ہی میری کال ریسیو کرتے ہیں، بس ہر وقت غصہ ہی کرتے رہتے ہیں۔'' وہ آنسوؤں کو روکنے میں ناکام ہوتی بری طرح آنسو بہاتی بولتی چلی گئی تھی۔

''میں ایسا ہی ہوں شروع سے......تم میرے غصہ سے بھی واقف ہو۔بدلا میں نہیں ہوں، بدل تو تم گئی ہو عرمی کہ تم مجھ سے بحث کرنے لگی ہو یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھے بحث سے ایک خاص قسم کی چڑ ہے۔مجھے انکار سے سخت کوفت ہوتی ہے۔'' وہ ''میں'' کی گردان شروع کر چکا تھا اور وہ کسی غلطی کے نہ ہونے کے باوجود اس کی وجہ سے سفر کرنے کے باوجود بھی اس سے ''سوری'' کر گئی تھی اور اس کی

بلبلاتی انا پر کچھ چھینٹے سے پڑ گئے تھے۔

''سوری کی ضرورت نہیں ہے اور جو حل ہے وہ تم کر نہیں سکتیں مجھے اپنی انسلٹ محسوس ہوا اس سے بہتر ہے کہ کچھ دن ہم بات نہ کریں۔'' وہ قدرے تلخی سے کہہ گیا تھا اور وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی کہ وہ اس کے لئے جتنا کرتی تھی وہ اس سے زیادہ کی توقع لگا بیٹھتا تھا۔

''آج رات کو پاپا آفس کے کام کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی جا رہے ہیں۔ میں دوست کے گھر جانے کا ماما سے منوا لوں گی آپ مجھے پک کر لیجئے گا۔'' اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے کہ آج وہ اس کو فون ہی اس لئے کر رہی تھی کہ وہ جانتی تھی کہ وہ اب ملے بغیر اس کا موڈ ٹھیک کرنے میں ناکامیاب رہے گی اسی لئے جیسے ہی اس سے ملنے کی ایک راہ سی نکلی تھی تو اس سے رابطہ کر کے اپنے پروگرام سے آگاہ کر گئی تھی یکدم شاہ زیب کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ بکھر گئی تھی اس نے ٹائم اور جگہ فائنل کی تھی اور رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''تم دیکھ لو، جان لو کہ تمہاری بیٹی میرے کیسے ایک اشارے پر جان وارنے کو تیار ہو جاتی ہے تو شرم سے مر جاؤ محمود خان ......مگر تم میں اتنی شرم وحیا ہوتی تو بات ہی کیا تھی ......مگر زندگی کے چلتے میں تمہیں عزت وغیرت کے مطالب سمجھا کر رہوں گا۔تم میرے قدموں میں گر کر اپنی عزت کی بھیک مانگو گے اور میں تم پر ثابت کر دوں گا کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔تمہارے پھیلے کاسہ کو ٹھوکر نہ لگائی تو میرا بھی نام شاہ زیب اورکزئی نہیں۔'' وہ موبائل بیڈ پر اچھالتا تلخی سے سوچ رہا تھا اس کی سوچ میں عریم کے لئے حقارت اور اس کے باپ کے لئے نفرت کا ایک جہان آباد تھا اس کے بس میں ہوتا تو وہ محمود خان کو کل ہی اس کی بیٹی کے کارنامے دکھا کر اس کو اپنے قدموں میں لے آتا مگر محمود خان سے بے عزتی کا بدلہ لینے کو اس کی پلاننگ اتنی عام نہیں تھی۔اس کی پلاننگ بہت دور تک کی تھی سب کچھ جلا کر خاک کر دینے والی، سب کچھ فنا کر دینے والی تھی اور اس نے اپنے انتقام کی آگ میں محمود خان کو بھسم کر کے ہی رہنا تھا تب ہی اس کے من میں جلتی برسوں کی آگ کو ٹھنڈا ہونا تھا کہ اس کا سکون محمود خان کی تباہی میں پوشیدہ تھا۔

☆......☆......☆

''آئیکت! مجھے سمجھ نہیں آتا کہ اگر آپ نے کوئی پلاننگ ہی نہیں کی تھی تو مجھے یہاں کیوں چھوڑا ہے۔'' وہ تقریباً ایک ماہ بعد اس سے ملنے حیدر کاٹیج آیا تھا اور وہ اپنی محبت وبے قراری کی داستان کہتا اس کے لئے فکر کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ قدرے نروٹھے انداز میں کہتی آئیکت کو متحیر کر گئی تھی۔

''کسی نے تم سے کچھ کہا ہے آبی......؟'' وہ مضطرب سا اس کی آنکھوں میں ناچتی نمی کو دیکھ رہا تھا۔

''نہیں، لیکن مجھے لگا ہے کہ آپ کسی کے کہنے کے ہی منتظر ہیں۔'' وہ تڑخ کر بولی تھی۔

''واٹ ہیپن آبی! اس طرح کیوں بات کر رہی ہو؟'' اسے آبدار کا لہجہ برا لگا تھا وہ ناگواری چاہ کر بھی چھپانے میں ناکام ہو گیا تھا۔

''سن لیں آئیکت، میں اس سب سے بہت زیادہ تنگ آ چکی ہوں، آپ کی باتوں میں آ کر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی

غلطی کی ہے۔''اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''آبی......''

''پلیز آئیکت، آپ کچھ کر سکتے ہیں تو کریں نہیں تو میں گھر واپس آجاتی ہوں۔''اس نے آئیکت کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور آئیکت کا دماغ یکدم کام کرنا چھوڑ چکا تھا کہ اس کی بکواس نے اس کے دماغ کا فیوز ہی اڑا دیا تھا۔ وہ آگے سے جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی حیدر کا ٹیج میں مزید نہ رہنے کا کہتی اسے کچھ کرنے کا بولتی وہ بری طرح سسک رہی تھی وہ خود کو کمپوز کرتا اس کو شانوں سے تھام گیا تھا۔

''پاپا نے تمہاری شادی کی ڈیٹ فکسڈ کر دی تھی ایسے میں تمہیں وہاں سے نکالنے کے سوا مجھے کوئی دوسرا حل نظر نہیں آیا وہ بھی اس صورت میں کہ تم گھر والوں کی مرضی کے بناء نکاح کے لئے تیار نہیں تھیں۔''وہ اس کو چپ کرواتے ہوئے اب دھیمے دھیمے بول رہا تھا۔

''وہ سب تمہیں ناپسند کرتے ہیں......وجہ سے تم بھی واقف ہو اور تمہارے گھر سے نکلنے کے بعد نفرت و ناپسندیدگی کی وجہ بدل گئی ہے۔ اب اس گھر کے دروازے تم پر کبھی نہیں کھل سکتے ......اور تم وہاں آنے کی کبھی حماقت نہ کرنا۔'' آئیکت کی صاف گوئی آبدار کے دل کا خون کر گئی تھی اس کے آنسو ٹھہر سے گئے تھے۔

''میں اسی لئے یہ انتہائی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی۔''وہ اذیت سے بولی تھی۔

''مگر تم نے میرے مجبور کرنے پر یہ انتہائی قدم اٹھایا آبی، اور میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔''وہ اس کو روتے دیکھ کر اذیت سی محسوس کر رہا تھا مگر کر کچھ نہیں سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی وجہ جو بن گیا تھا۔

''آبی! اس گھر میں اب تمہیں حیثیت و مقام میرے حوالے سے ہی مل سکتا ہے۔ جب تم گھر چھوڑ ہی چکی ہو تو نکاح کرنے میں کیا حرج ہے۔ نکاح کے بعد ہم سب کو منا لیں گے۔''اس نے سنگل صوفہ پر اداس سی صورت بنائے بیٹھی آبدار کو دیکھا تھا۔

''آپ اپنا وعدہ مت بھولیں آئیکت۔ میں نے آپ سے نکاح کرنا ہوتا تو یوں غیروں کے در پر نہ پڑی ہوتی۔ آپ وعدہ یاد کریں آپ نے کیا کہہ کر مجھے یہاں لا چھوڑا تھا۔''وہ آنسو رگڑتی ناگواری سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''آبی، تم نکاح کے لئے مان جاؤ۔ مجھے اپنا ہر وعدہ یاد ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں بس شاہ زیب کی نگرانی کی وجہ سے میری کوشش میں تیزی نہیں ہے۔''اس نے بے چارگی سے کہا تھا۔

''آپ پلیز اپنا وعدہ پورا کریں اور میں بھی اپنے وعدے سے نہیں پھروں گی۔''اس نے آئیکت کو کچھ یاد دلانا چاہا تھا وہ یکدم صوفے سے اٹھ گیا تھا۔

''میں بھی کب اپنے وعدے سے پھر رہا ہوں آبی۔ میں تو بس یہ کہہ رہا ہوں کہ تم نکاح......''

''نہیں۔''وہ اس کی بات کاٹ کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

''اُس گھر میں مجھے کبھی محبت، عزت مان کچھ نہیں ملا۔اس گھر کو چھوڑ تے ہوئے میری یہی شرط تھی کہ آپ مجھے میرا مقام دلائیں گے۔'' وہ اس کی لمحہ بہ لمحہ سرخ ہوتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔

''میں تمہیں تمہارا مقام دلواؤں گا آبی، تمہیں بحیثیت بیوی اور کرزئی پیلس لے جاؤں گا، ہمیشہ تمہارے حق کے لئے لڑوں گا، تمہیں تمہارا حق دلواؤں گا۔'' وہ آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام گیا تھا۔

''مجھے پہلے میرا نام، میرا مقام دلوا دیں آپ...... میری پہچان دلوا دیں کہ میں اپنی پہچان کے ساتھ آپ کے نکاح میں آنا چاہتی ہوں۔'' اس کے آنسوؤں میں پھر روانی آ گئی تھی وہ ہاتھ چھڑا کر فاصلہ پر چلی گئی تھی۔

''میں نہیں چاہتی ہوں کہ جس طرح زندگی بھر ہر رشتہ سے مجھے نفرت ملی اس رشتہ سے بھی مجھے کچھ حاصل نہ ہو۔'' وہ اس کو ساکت چھوڑ کر بڑی تیزی میں ڈرائنگ روم سے نکل گئی تھی۔ ہر بار آبدار سے ملاقات سے واپسی اسے اذیت کے گہرے جہان میں اتار دیتی تھی اور آج تو اذیت کا وہ عالم تھا کہ دل کر رہا تھا کہ دنیا کو آگ لگا دے۔وہ حیدر کاٹیج سے نکل آیا تھا اس کا ذہن بہت تیزی میں کام کر رہا تھا اس نے تہیہ کیا تھا کہ وہ شاہ زیب کی نگرانی سے قطع نظر ہو کر اس سے ڈرے بغیر کرے گا جو کچھ کرے گا کہ وہ خود بھی اذیت سے نکلنا چاہتا تھا اور آبدار کو بھی نکالنا چاہتا تھا۔آج آبدار کے تیور بدلے ہوئے تھے اور اس کے خطرناک تیوروں کے پیچھے چھپی اذیت اسے بہت کچھ سمجھا گئی تھی وہ اس کے کہے بناء بھی جان گیا تھا کہ حیدر کاٹیج میں اس کا زیادہ دن رہنا ممکن نہیں اور یہ احساس اسے پہلے بھی تھا مگر آج اس کی شدت محسوس کرتا بے چین ہو چلا تھا اور اس بے چینی کا اس نے اب حل نکال کر رہنا تھا۔

☆......☆......☆

''می سو پپی نوائم۔'' نوائم بے خبر سو رہی تھی جب وہ آندھی طوفان کی مانند اس کے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور اسے جھنجوڑ کر اٹھا ڈالا تھا وہ پوری طرح بیدار نہ ہو پائی تھی نہ ہی اس افتاد پر اس پر غصہ کر پائی تھی تب وہ باقاعدہ ڈانس کرتے ہوئے بولتی نوائم کا غصہ و نیند اڑا گئی تھی۔

''اب ناچتی ہی رہو گی یا کچھ منہ سے پھوٹو گی بھی۔'' وہ بکھرے بال سمیٹتے ہوئے خوشی سے بھنگڑے ڈالتی مومل کو گھورتے ہوئے بولی تھی۔

''تو پھوٹنا نہ ہوتا تو یہاں آتی ہی کیوں۔'' وہ دھم سے اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھی تھی اور نوائم قدرے کوفت کا شکار ہو گئی تھی کیونکہ ان دونوں کی پسند ناپسند کافی ملتی تھیں مگر عادات میں کافی فرق تھا۔نوائم جتنی سنجیدہ مزاج کی کم گو سی لڑکی تھی مومل اتنی ہی غیر سنجیدہ ہر وقت اودھم مچائے رکھنے والی لڑکی تھی۔نوائم کبھی بھی خوشی کا اتنا والہانہ اظہار نہیں کرتی تھی اور نہ ہی دکھ پر رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی تھی اس کے برعکس مومل نہ صرف خوشی کا اظہار بچوں کی طرح والہانہ انداز میں کرتی تھی دکھ پر اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ زمین آسمان ایک کر ڈالے۔اسی لئے اکثر اس کی بچوں جیسی حرکتوں پر نوائم چڑ جاتی تھی جیسے اس وقت اس کے چہرے پر ناگواری صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔

''اب تم تجسس پھیلاؤ گی۔'' مومل کو گھورا تھا اور وہ ہنس دی تھی۔

''بالکل بھی نہیں۔ میں تو خوشی سے پاگل ہونے کو ہوں۔ بات زیادہ دیر مجھ سے سنبھالی جاتی، تو میں صبر کر کے تمہارے جاگنے کا انتظار نہ کرلیتی۔'' وہ معنی خیزی سے مسکرائی تھی۔

''جب سے عبیر سے تمہارا رشتہ طے ہوا ہے تب سے تم اتنی مشکوک حرکتیں کرنے لگی ہو۔ صدمہ کہیں دماغ پر تو نہیں لگ گیا۔'' اس کی ہنسی، اس کے معنی خیز جملے نوائم کو کوفت میں مبتلا کرنے کے ساتھ تجسس میں بھی ڈال گئے تھے تب ہی وہ چڑ کر بولتی مومل کو یکدم قہقہہ لگانے پر مجبور کر گئی تھی۔

''میرے دماغ کی تو چھوڑو جانی، کسی کے دل کی خیر نہیں ہے۔'' مومل شوخی سے اس کے رخسار پر ایک چپت لگاتی اس کے سامنے سے اٹھ گئی تھی یکدم نوائم کا تجسس کچھ اور بڑھ گیا تھا مگر وہ بولی کچھ نہیں تھی کہ جانتی تھی کہ مومل کچھ دیر بکواس کے بعد اسے اصل بات بتا دے گی اور یہی ہوا تھا کچھ معنی خیز جملے اس نے اور ادا کئے تھے اور یکدم بم پھوڑ ڈالا تھا۔ نوائم اسے حیرانگی سے دیکھ رہی تھی۔

''عبیر کی تو ہوئی چھٹی...... کیونکہ پاپا نے عبیر کے پاپا کو رشتہ سے انکار کر دیا ہے۔'' وہ کمرے میں گول گول گھومتی یکدم پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولتی نوائم کی سانس اٹکا گئی تھی۔

''یہ...... یہ...... تم...... کیا بکواس کر رہی ہو'' وہ بے ربط ہوئی تھی مومل ہنستے ہوئے ایک بار پھر دھم سے اس کے سامنے آ بیٹھی تھی۔

''بکواس نہیں ہے یہ ایک دم سچ ہے یقین نہیں آ رہا تو جا کر پاپا سے پوچھ لو۔'' مومل کے انداز میں سکون اور لاپرواہی کا امتزاج تھا جبکہ نوائم بے حد مضطرب ہو چکی تھی اسے بات بتانے پر بضد ہوئی تھی مگر مومل کو اتنی جلدی نہیں تھی وہ اسے خوب ستانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھی اسی لئے کچھ نہیں بولی تھی مگر نوائم سے کہاں ہوا تھا برداشت، وہ اس پر خفا ہونے لگی تھی۔

''تم مجھے بتا کیوں نہیں رہی ہو آخر کیا بات ہوئی ہے چاچو نے کیوں انکار کر دیا ہے۔'' اس کو تو عبیر سے رشتہ سے انکار کا سن کر ہی ہول اٹھنے لگے تھے اور وہ مذاق برطرف کرتی سنجیدگی سے اسے تمام بات بتا گئی تھی۔ کبیر عباسی نے ہمیشہ کے لئے پاکستان شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا اور جب یہ بات ان لوگوں کے علم میں آئی تھی تو عقیل احمد نے رشتہ سے صاف انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو اتنی دور نہیں بھیجنا چاہتے تھے انہیں عقیل احمد اور ان کی والدہ نے بھی قائل کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں مانے تھے۔

''بھائی صاحب، مومل کے لئے آپ جو فیصلہ لیں گے مجھے منظور ہوگا مگر میں مومل کو پاکستان نہیں بھیجنا چاہتا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں آپ کے فیصلہ سے انحراف کر رہا ہوں۔'' عقیل احمد بڑے بھائی کی بے حد عزت کرتے تھے گھر میں حتمی فیصلہ ہمیشہ شکیل احمد کا ہوا کرتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب کبیر عباسی نے رشتہ ڈالا تھا تو انہوں نے بھائی بھاوج کی ایماء جانے بغیر اپنی طرف سے مثبت جواب دے کر سب سے مشورہ کر لینے کی بات فارمیلیٹی کے طور پر کی تھی اور انہیں جو حق و مان تھا کہ ان کے فیصلہ سے انحراف کیا جائے گا تو ہوا بھی ٹھیک

ویسے ہی تھا عقیل احمد اوران کی اہلیہ نے فیصلہ کا تمام تر اختیار بھائی کو دے دیا تھا اور یوں عبیر کا رشتہ منظور کرلیا گیا تھا اوراب بھی انکار کسی کو نہیں تھا مگر پاکستان شفٹ ہونے والی بات عقیل احمد اوران کی اہلیہ کو ہضم نہیں ہو رہی تھی اس لئے انہوں نے نہایت شائستگی سے اپنا موقف بھابی کے سامنے رکھ دیا تھا جسے سن کر عقیل احمد نے کوئی اختلافی پہلو نہیں نکالا تھا اور بھائی کی وضاحت پر نرمی سے مسکرا دیئے تھے۔

''میں تمہیں اچھے سے جانتا ہوں عقیل اس لئے وضاحت کی ضرورت نہیں ہے اور جہاں تک پاکستان کی بات ہے تو مجھے اس میں حرج نہیں لگتا تب ہی میں نے نوائم کے لئے ابسام کو پسند کیا ہے اور اگر اس لحاظ سے دیکھو تو دونوں بہنیں جن میں دوستی بھی بہت ہے پاکستان میں رہیں گی تو دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا رہے گا۔'' شکیل احمد بھائی کو مضطرب دیکھ کر نرمی سے کہتے ان کی مشکل دور کر گئے تھے۔ان کا ہر خدشہ دور کر گئے تھے کہ کہیں شکیل احمد کو برا نہ لگا ہو مگر انہوں نے بڑے ہونے کا کھلے دل کا ثبوت دیا تھا۔

''بھائی صاحب، آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے لیکن اگر بات ابسام کی ہے تو وہ وہیں پیدا ہوا، وہ پاکستان میں اسٹیبلش ہے جبکہ عبیر کو پاکستان جا کر اسٹیبلش ہونے میں بھی وقت لگے گا اس لئے میں اس رشتہ کو قبول کرنے میں خدشات کا شکار ہو گیا ہوں باقی آپ اور اماں جو مناسب سمجھیں۔'' عقیل احمد نے اپنا ہر خدشہ سب کے سامنے رکھ دیا تھا اور کچن میں کھڑی سب کے لئے چائے بناتی مومل دعا کرنے لگی تھی کہ انکار ہو جائے۔ عقیل احمد کے خدشات ایسے تھے کہ شکیل احمد اوران کی اہلیہ اوران کی والدہ نے بھی حمایت کی تھی کہ وہ کہہ تو ٹھیک ہی رہے تھے۔

''تمہاری بات میں دم ہے عقیل، تمہارا ہر خدشہ درست ہے کہ عبیر پاکستان میں جا کر نئے سرے سے سب کچھ شروع کرے گا جس میں جتنے چانسز کامیابی کے ہوں گے اتنے ہی چانسز ناکامی کے بھی ہوں گے۔'' عقیل احمد کا انداز پرسوچ تھا۔

''مگر انکار کرنا بھی تو صحیح نہیں ہے ہم کبیر بیٹے کو بلا کر ہر بات اس سے کر لیتے ہیں۔ برسوں کی دوستی واپنائیت کے رشتے ہیں یوں تو رشتوں میں دراڑیں پڑ جائیں گی۔'' عقیل احمد کی والدہ نے دھیمے سے کہا تھا کہ بیٹے کے خدشات ٹھیک لگ رہے تھے مگر وہ رشتوں میں دوریاں بھی نہیں چاہتی تھیں۔

''بات وغیرہ سب ہو جائے گی میں تو کہتی ہوں کہ مومل بیٹی سے ہی پوچھ لیا جائے کہ اگر اسے پاکستان جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو ان خدشات کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جاتی کہ زندگی میں دکھ، سکھ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔'' شکیل احمد کی والدہ نے مثبت سمت کی جانب اشارہ کیا تھا اور وہ جو کافی دیر سے چائے کو فضول میں محض باتوں کو سننے کی وجہ سے کھولاتی رہی تھی ایسا آخر کب تک کر سکتی تھی چائے مگوں میں نکال کر ٹرے اٹھائے لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ اسے دیکھ کر کمرے میں یکدم خاموشی طاری ہو گئی تھی اس نے سب کو چائے دی تھی اور وہ جاتی کہ دادی کی آواز پر ٹھہر کر انہیں دیکھنے لگی تھی اور دادی کے ایک اشارے پر وہ صوفے پر آ بیٹھی تھی تب شکیل احمد کی اہلیہ نے زیر بحث مسئلہ اُن کے سامنے رکھا تھا۔

''میری زندگی کا کلی اختیار آپ سب کو حاصل ہے، آپ لوگ جو فیصلہ کریں گے مجھے منظور ہوگا۔'' وہ نظر جھکائے دھیمے لہجے میں بولتی سب کو طمانیت عطا کر گئی تھی۔

''ہماری خوش بختی ہے کہ ہماری بیٹی ہماری پرورش و تربیت کی لاج رکھنا جانتی ہے مگر بیٹا اس وقت مسئلہ دوسرا ہے تمہاری فرمانبرداری اپنی جگہ مگر ہم چاہتے ہیں کہ اگر تمہیں پاکستان میں رہنے پر کوئی بھی اعتراض ہے تو تم ابھی کہہ دو۔'' پوتی کے جواب نے انہیں اندر تک پرسکون کر ڈالا تھا۔ ایک فخریہ مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے نرمی سے پوچھا تھا۔

''دادو، میں پاکستان نہیں جانا چاہتی۔'' وہ ایک جملہ میں بات ختم کرتی وہاں سے نکل گئی تھی۔

''شکیل، تم کبیر کو بلاؤ اس مسئلہ پر آج ہی بات ہوگی اور مجھے لگتا ہے کہ ہمیں عبیر کے رشتہ سے انکار کر دینا چاہیئے۔'' وہ پوتی کے فیصلہ کے بعد فیصلہ کن انداز میں بولی تھیں اور عقیل احمد نے فوراً ماں کی بات کی حمایت کر ڈالی تھی۔

''ٹھیک ہے جب سب کی یہی مرضی ہے تو کبیر کو انکار کر دیں گے۔'' وہ تایا کی بات سن کر اپنے دل کو خوشی سے بے قابو ہوتا محسوس کرنے لگی تھی اور دوڑی دوڑی نوائم کے پاس پہنچ گئی تھی جو تفصیل سن کر صدماتی کیفیت میں چلی گئی تھی۔

''تم اگر یہ کہہ دیتیں مومل کہ تمہیں پاکستان میں رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو کیا حرج تھا۔'' وہ مومل کے ہنستے خوش باش چہرے کو دیکھ کر دکھ سے بولی تھی کہ وہ تو یہ سوچ رہی تھی کہ عبیر کو جب انکار اور اس کی وجہ پتہ چلے گی تو وہ کتنا زیادہ ہرٹ ہوگا۔

''دماغ خراب نہیں ہے میرا کہ اپنے پاؤں پر جیسے اب تک کلہاڑی مارتی آئی تھی اب کلہاڑی پر ہی پاؤں رکھ دیتی......اونہہ......'' وہ نوائم کو کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتی بیڈ سے اتر گئی تھی۔

''تم کتنی خودغرض ہو مومی، تمہیں احساس ہی نہیں ہے ایک شخص تم سے اس قدر محبت کرتا ہے اور تم محبت ٹھکرا کر کفران نعمت کر رہی ہو۔ یاد رکھنا بے لوث چاہتیں مقدر سے ملتی ہیں اور اگر محبت کو بار بار ٹھکرایا جائے تو وہ راستہ بدل لیتی ہے کہ محبت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے، محبت، محبت کی توہین برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ نہایت خفگی سے بولی تھی مومل یکدم چپ کی چپ رہ گئی تھی۔

''میں جیسی ہوں تمہارے سامنے ہوں اپنے لاڈلے بھائی کی فکر میں دبلا ہونا چھوڑ دو اور یہ یاد رکھنا کہ پاکستان نہ جانے کی بات میں نے عبیر سے شادی سے بچنے کے لئے نہیں کی ہے کہ تم اچھے سے جانتی ہو جب چار سال قبل میں پاکستان گئی تھی۔ جاتے ہوئے جتنی پرجوش تھی آنے کے بعد اتنی ہی بےزار۔'' وہ خود کو کمپوز کر کے بولنے لگی تھی۔ نوائم ایک گہری سانس بھر کر رہ گئی تھی کہ یہ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی کہ اسے پاکستان بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا وہ باقاعدہ اسے سمجھاتی رہتی تھی کہ وہ اپنا ملک چھوڑ کر جانے کی حماقت کر رہی ہے اسے ابسام سے شادی نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ جس ملک میں رہتا ہے وہ رہنے کے قابل نہیں وہاں دس ہزار مسائل ہیں۔ وہ اتنا کچھ کہتی تھی کہ نوائم چڑ جاتی تھی مگر اس کا جواب ایک ہی ہوتا تھا کہ اس کے پاپا نے ابسام کو اس کے لئے پسند کیا ہے اب ابسام جہاں بھی رہتا ہو اس کا مسئلہ نہیں

ہے اور جو بات اس کے لئے مسئلہ نہیں تھی وہ موحل کے لئے تھی اور جو اس کو سمجھاتی رہتی تھی خود کیسے راضی ہو سکتی تھی وہ بھی ایک ایسے شخص کی ہمراہی میں جو اسے سخت ناپسند تھا۔نوائم نے اس کے تمام نادر خیالات، پاکستان کے خلاف تمام تر باتیں نہایت تحمل سے سن لی تھیں کہ وہ جانتی تھی کہ موحل کو سمجھانا دنیا کا ناممکن کام ہے اس لئے وہ فی الحال بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی اور وہ نوائم کو چپ دیکھ کر بڑی خاموشی سے اس کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆......☆......☆

''ماما، پلیز مان جائیں نا۔'' وہ ناگواری سے بیٹی کو دیکھنے لگی تھیں جو دوست کے گھر جانے کی ضد کر رہی تھی۔

''دماغ مت کھاؤ میرا عرمی۔'' جیسے ہی عریم نے لاڈ سے ماں کے گرد بازوؤں کا گھیرا تنگ کیا تھا وہ خود کو بے بس محسوس کرنے لگی تھیں کہ نہ انکار بس میں تھا نہ ہی اقرار کا یارا تھا۔

''مجھے تو لگتا ہے جیسے میں آپ کی اور بابا کی سوتیلی بیٹی ہوں۔ نا پاپا مجھ سے محبت کرتے ہیں نہ ہی آپ۔'' اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے تھے وہ مزید بے بس ہو گئی تھیں۔

''تمہارے پاپا بھی تم سے بہت محبت کرتے ہیں اور میں بھی......تم میں تو میری جان بستی ہے۔'' انہوں نے بیٹی کے چہرے کو ہاتھوں کے پیالے میں لے کر محبت سے کہا تھا۔

''میری اتنی سی فرمائش تک تو پوری کر نہیں سکتیں آپ، محبت کیا خاک ہے مجھ سے۔'' وہ ماں کو نرم پڑتا دیکھ کر انہیں مزید جذباتی کرنے لگی تھی۔

''اپنی جذباتی بلیک میلنگ بند کر دو۔'' انہوں نے بیٹی کو ڈپٹا تھا۔

''اچھا ایسا کرتی ہوں رومیلہ کے گھر نہیں جاتی میں، اسے کالج بلا لیتی ہوں۔ میں اس سے مل بھی لوں گی اور کالج کی لائبریری سے کچھ بکس بھی اشو کروا لوں گی۔'' اس کو یکدم ہی نیا آئیڈیا سوجھا تھا جو کہہ بھی گئی تھی کہ رومیلہ کے گھر جانے کا کہہ کر جاتی تو کچھ دیر کے لئے ہی سہی رومیلہ کے گھر بھی جانا پڑتا اور وہ جلدی کرتی تو رومیلہ نے لازمی خفا ہونا تھا اس لئے اسے بروقت لائبریری کا بہانہ مناسب لگا تھا۔

''لائبریری جانے دے سکتی ہوں مگر تم بکس لے کر آؤ گی تو پھر کچھ دن بعد واپس کرنے جانے کی ضد پکڑ لو گی۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ تم بکس کے نام لکھ دو میں ڈرائیور سے وہ تمام بکس کسی اچھے بک شاپ سے منگوا دوں گی۔'' انہیں دوست کے گھر جانے پر اعتراض تھا اسی لئے وہ اسے ٹالتی جا رہی تھیں۔ لائبریری جانے پر اعتراض نہیں تھا مگر انہوں نے انکار کی معقول وجہ بھی ڈھونڈ نکالی تھی۔

''ایسا کریں بکس کے ساتھ ساتھ بازار سے رومیلہ کو بھی منگوا لیں۔'' وہ نہایت چڑ کر بولی تھی اور وہ حیرانگی سے اپنی بیٹی کو دیکھنے لگی تھیں۔

''لے دے کر ایک ہی دوست ہے اس سے بھی نہیں مل سکتی۔ میرے والدین دنیا بھر کے نرالے ہیں جنہیں اپنی اولاد پر بھروسہ ہی

نہیں ہے۔'' وہ غصہ وہ ناگواری سے بول رہی تھی ساتھ ساتھ روتی بھی جا رہی تھی۔

''اچھا زیادہ ملکہ جذبات نہ بنو اور فریش ہو کر چلی جاؤ مگر جلدی واپس آ جانا۔'' ہر بار کی طرح انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور وہ ماں سے لپٹ گئی تھی۔

''تھینک یو ماما! آپ بہت اچھی ہیں۔'' وہ ماں کی طرف سے ملنے والی اجازت پر خوش ہوتی ان کا رخسار چوم گئی تھی اور بڑی عجلت میں وہاں سے تقریباً دوڑتے ہوئے نکلی تھی کہ ابھی اس نے شاہ زیب کو بھی تو کال کر کے اپنے آنے کا بتانا تھا اور اس نے لپک کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھے اپنے موبائل کو اٹھایا تھا اور شاہ زیب کو کال کی تھی جو دوسری بیل پر ریسیو کر لی گئی تھی۔ اس نے شاہ زیب کو کالج پہنچنے کا کہا تھا اور رابطہ منقطع کر کے کپڑے سلیکٹ کرنے لگی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ شاہ زیب کا پسندیدہ رنگ سبز ہے اس نے کچھ سوچ کر سبز سوٹ نکال لیا تھا یوں تو جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ شاہ زیب کو سبز رنگ پسند ہے تب سے اس نے سبز رنگ کے کافی سوٹ بنا لئے تھے مگر جس سوٹ کا اس وقت اس نے انتخاب کیا تھا یہ انتہائی حسین سوٹ تھا۔ لانگ شرٹ اور ٹراؤزر کے ساتھ شفون کا دوپٹہ تھا اور شرٹ پر نہایت نفیس کڑھائی کی گئی تھی اس نے جلدی جلدی ساری میچنگ کی چیزیں نکالی تھیں کہ آج وہ بہت زیادہ اچھی لگنا چاہتی تھی کہ نکاح کے بعد وہ شاہ زیب سے پہلی دفعہ ملنے جا رہی تھی اسی لئے اس کی تیاری معمول سے ہٹ کر تھی کہ اس کے پاپا کو سجنا سنورنا بالکل پسند نہیں تھا اس نے اپنی ماما کو ہمیشہ ڈھلے ہوئے منہ کے ساتھ دیکھا تھا وہ تو تقریبات میں بھی نہایت سادگی سے جاتی تھیں اس لئے عریم نے بھی اب تک اپنی زندگی میں پہلا سنگھار منگنی والے دن کیا تھا اس سے قبل تو اس نے کبھی اپنی آنکھوں میں کاجل تک نہیں لگایا تھا اور آج وہ اچھے سے تیار ہونا چاہتی تھی اس نے ڈریس چینج کرنے کے بعد وہ بیوٹی باکس نکالا جو فارس کے گھر سے منگنی کے سامان میں آیا تھا اس نے لائنر و مسکارا کو حسرت سے دیکھا تھا کہ اسے اپلائی نہیں کرنا آتا تھا اس نے غصہ سے دونوں چیزیں ڈریسنگ ٹیبل پر ڈال دی تھیں اور کاجل نکالا تھا اور آنکھوں میں لگانے لگی تھی اس کی بڑی بڑی سیاہ چمکدار آنکھیں کاجل لگنے سے مزید کشادہ ہوتیں حسین ترین لگنے لگی تھیں۔ اس نے کاجل لگانے کے بعد اپنی آنکھوں کو آئینہ میں دیکھا تھا اور لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اسے اپنی آنکھیں بہت پیاری لگی تھیں۔

''شاہ زیب! آج تو آپ گئے کام سے۔'' اس نے شرارت سے سوچا تھا اور اپنی سوچ پر خود ہی حیاء سے مسکرا دی تھی اور لپ اسٹک کے شیڈز چیک کرنے لگی تھی اس نے چار لپ اسٹک شیڈز میں سے سب سے لائٹ شیڈ کا انتخاب کیا تھا۔ ہونٹوں پر پھیرنے ہی لگی تھی کہ اسے یکدم ماما کا خیال آ گیا تھا۔

''ماما نے لپ اسٹک دیکھی تو وہ خفا ہوں گی اور شک کا شکار بھی ہو سکتی ہیں۔'' اس کا دل یکدم بجھ گیا تھا اس نے بے دلی سے لپ اسٹک ڈریسنگ پر ڈال دی تھی اور بجھے دل سے خود پر اسپرے کرنے لگی تھی اس وقت ذہن میں کچھ کلک ہو رہا تھا اس نے موبائل کے ساتھ ساتھ لپ اسٹک بھی اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال لی تھی وہ اب قدرے مطمئن تھی اس نے دوپٹہ شانوں پر ڈالا اور کمرے سے نکل آئی۔ وہ بیٹی کو

دیکھ کر چونک گئی تھیں کہ اس کے چہرے پر کچھ نیا محسوس ہو رہا تھا اور غور کرنے پر وہ اس کی آنکھوں میں لگا کاجل دیکھ کر اسے جانچتی نگاہ سے دیکھنے لگی تھیں۔

''تم نے کاجل کیوں لگایا ہے عریم؟'' ان کے انداز میں خفگی تھی اور وہ بری طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔

''ماما......وہ......میں۔'' وہ بری طرح ہکلائی تھی۔

''آج تو لگایا ہے آئندہ مت لگانا، تمہارے پاپا کو نہیں پسند......'' وہ اپنی ماں کو دیکھنے لگی تھی اسے ان کی آنکھوں میں نمی محسوس ہو رہی تھی۔

''بہت جلد تمہاری شادی ہونے والی ہے۔ شادی کے بعد خوب سجا سنورا کرنا۔ اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔'' انہوں نے بیٹی کے معصوم چہرے کو دیکھ کر دل سے دعا دی تھی اور بڑی تیزی میں وہاں سے نکل گئی تھیں جبکہ وہ بڑے بوجھل دل کے ساتھ گھر سے نکلی تھی کہ اسے اپنی ماں پر کبھی کبھی بہت رحم آتا تھا۔ یکدم اسے اپنے باپ سے کچھ اور گلے ہو گئے تھے۔ وہ جس وقت کالج پہنچی تھی پہلے سے ہی شاہ زیب کی گاڑی کھڑی تھی اس کا دل ایک دم ہی پوری روانی سے دھڑکنے لگا تھا اس نے ڈرائیور کو کال کر کے بلانے کا کہا اور گاڑی سے اتر آئی تھی اس نے اپنی گاڑی کے منظر سے ہٹتے ہی کالج کی طرف بڑھتے قدموں کو روکا تھا اور شاہ زیب کی گاڑی تک چلی آئی تھی۔ وہ تو تھا ہی اس کا منتظر اس نے فرنٹ ڈور اوپن کر دیا تھا اور وہ کھلے ڈور سے جیسے ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی شاہ زیب نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

گاڑی میں دو نفوس کی موجودگی میں بڑی معنی خیز خاموشی کا راج تھا جسے شاہ زیب کی آواز نے منتشر کر دیا تھا۔

''کیا سوچ رہی ہو عرمی......'' اس کے نرم سے سوال پر اس نے محض گردن نفی میں ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر عریم کو دیکھا تھا جس کی نگاہ گود میں رکھے ہینڈ بیگ پر تھی وہ اس کو دیکھنے لگا تھا جس کا گلابی چہرہ سبز رنگ کے سوٹ میں مزید کھلا کھلا لگ رہا تھا اور وہ بے چینی سے لب کچلتی اسے مسکرانے پر مجبور کر گئی تھی۔

''اتنی نروس کیوں ہو ڈئیر۔'' اس نے اسپیڈ کم کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے بازو کو جکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا تھا وہ کہاں اس افتاد کے لئے تیار تھی بوکھلا کر رہ گئی تھی جبکہ اس کی توجہ ڈرائیونگ سے یکسر ہٹ گئی تھی۔ وہ تو اپنی جانب دیکھتی عریم کو توجہ سے دیکھ رہا تھا جس کی آنکھوں کی خوبصورتی آج ایک نئی داستان بیان کر رہی تھی۔

''پلیز شاہ، ڈرائیونگ پر توجہ دیں۔'' وہ منمناتی بازو آزاد کروا کر قدرے سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

''آج ہر دن سے بہت پیاری لگ رہی ہو، کیا کچھ خاص کیا ہے تم نے......یا میری چاہتوں کا اثر ہے۔'' وہ مہارت سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے شرارت وشوخی سے بولا تھا اس کے چہرے کی رنگت دہک اٹھی تھی۔ ہاتھ اضطراری حالت میں مسلتی وہ لب کچلنے لگی تھی۔ وہ کچھ بول نہیں پائی تھی اور اس نے گاڑی اپنے فلیٹ کے گیٹ سے اندر داخل کرتے ہوئے اسے دیکھا تھا جو آج معمول سے بڑھ کر حسین لگ رہی تھی۔

''کوئی بات تو ضرور ہے عرمی، آج کچھ نئے پن کا احساس ہو رہا ہے۔'' ہمیشہ اس نے عریم کو نہایت سادگی سے دیکھا تھا اس لئے

اس کی آنکھوں کا کاجل نہ صرف اسے حسین بنا گیا تھا۔ وہ اسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرایا تھا۔ اس کی نظریں حیا کے بار سے جھک گئی تھیں مگر وہ اس کے اصرار پر دھیمے سے منمنا کر آخر اس کی تشفی کو بول پڑی تھی۔

''کاجل لگایا ہے شاہ۔'' وہ اسے شانوں سے تھامے کھڑا تھا اور وہ نظر چرا کر منمنائی تھی اور وہ اس کے پر حجاب انداز کو دیکھ کر یکدم ہنس دیا تھا۔

''یعنی آج محترمہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہمیں قتل کرنے آئی ہیں۔'' اس نے شوخی سے کہتے ہوئے انگلی کی مدد سے اس کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے چہرہ اونچا کیا تھا۔

''جج......جی......نن......نہیں......تو......'' وہ منمنا کر دور چل گئی تھی۔

''اچھی لگتی ہو سادگی میں اور کاجل تمہاری آنکھوں میں لگ کر قیمتی ہو گیا ہے۔ لگایا کرو تم......تمہاری آنکھیں اور حسین ہو گئی ہیں۔'' وہ جذبوں سے چور لہجے میں بولا تھا کہ عریم کی حیا اسے اپنی اور کھینچ رہی تھی اور وہ سرخ پڑتی محض اثبات میں سر ہلا گئی تھی۔

''ویسے تم اور لڑکیوں کی طرح تیار شیار کیوں نہیں ہوتی ہو۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔ وہ خود کو کمپوز کرتی سنگل صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔

''پاپا کو نہیں پسند۔ ماما نے کبھی میک اپ کیا ہی نہیں اس لئے میں نے بھی نہیں کیا۔ مگر آج دل کیا کہ میں آج بہت اچھی لگوں بس اس لئے......'' وہ دھیمے سے کہتی نظر جھکا گئی تھی۔ شاہ زیب اسے دیکھنے لگا تھا۔ سچائی نور کی طرح اس کے حسیں چہرے پر پھیلی اسے حسین ترین بنا رہی تھی اور مرد کے لئے عورت کے حسن سے بڑھ کر کوئی شے ہوتی ہے وہ ہے عورت کی حیا اور عریم کے ہر انداز سے حیا یوں عیاں تھی کہ وہ اس کی طرف مائل ہوا جا رہا تھا۔ اس کی نظر عریم کے چہرے پر چپک کر رہ گئی تھی اور وہ مزید کنفیوز ہو کر رہ گئی تھی مگر لب کچل کر اس نے اپنی بات پوری ضرور کی تھی اور جسے سن کر وہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو کر رہ گیا تھا۔

''میں تو لپ اسٹک بھی لگا رہی تھی ماما کے خیال سے نہیں لگائی کہ ماما کو تو کاجل بھی پتہ لگ گیا تھا۔'' وہ دھیمے سے اپنے نرم لہجے میں بول رہی تھی۔

''میں نے اسی لئے لپ اسٹک اپنے پرس میں رکھ لی تھی۔ سوچا تھا کالج میں لگا لوں گی مگر آپ پہلے سے ہی موجود تھے اس لئے رہ گئی۔'' اس نے بچوں کی طرح منہ بنایا تھا اور وہ ہنس دیا تھا۔

''میں پورے راستے یہی سوچ رہا تھا کہ تمہارے پرس میں آخر ایسا کیا خزانہ ہے کہ تمہاری نگاہ ہی نہیں ہٹ رہی۔ اب لگا پتہ کہ اس میں تو میرے قتل کا سامان موجود تھا۔'' وہ شوخی سے کہتا اس تک پہنچا تھا اور اسے کاندھوں سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کر لیا تھا۔ شاہ زیب کے مخمور لہجے پر اس کی جان لبوں پر آنے لگی تھی۔ وہ اس پر مہربان ہو رہا تھا اور وہ اس کی آخری ملاقات کی وارفتگیاں، نزدیکیاں و قربتیں ہی

نہیں بھولی تھی اس کی مہربانیاں اس کے چودہ طبق روشن کرنے لگی تھیں مگر اس میں فاصلہ کم کرنے کا یارانہ تھا وہ لمحہ بہ لمحہ اس پر چاہتوں کی بارش کرتا دوریاں مٹا رہا تھا کہ یکدم اس کا سیل فون شدومد سے بجنے لگا تھا جہاں وہ بدمزہ ہوا تھا عریم نے سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ عریم کو اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کئے ٹیبل پر رکھا موبائل اٹھا گیا تھا اور ''بابا کالنگ'' دیکھ کر اس میں کال کاٹنے کا بھی یارانہ تھا اس نے فوراً کال ریسیو کی تھی اور جو خبر اسے ملی تھی اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی تھی اس نے فوراً پہنچنے کا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''تایا ابو کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ مجھے ہاسپٹل پہنچنا ہے۔'' وہ گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا تھا اور وہ جو اتنی دیر میں خود کو سنبھال گئی تھی بے ترتیب ہوئے آنچل کو سلیقے سے کاندھے پر لیتی واپسی کے لئے قدم اٹھا گئی تھی۔

''میں تم سے بعد میں رابطہ کروں گا۔ مصروفیت میں کال نہ کر سکوں یا کال ریسیو نہ کروں تو پلیز بار بار کال کر کے مجھے پریشان نہ کرنا، فری ہو کر میں خود کال بیک کر لوں گا۔'' اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اسے ہدایت کی تھی کہ اس کی حماقتوں سے واقف تھا کہ اس کی بھی اپنی ہی نرالی سوچ تھی جہاں شاہ زیب نے کال ریسیو نہ کی اسے لگتا تھا کہ وہ کوئی مصیبت میں نہ ہوا اسے اگنور کر رہا ہے کبھی یہ نہیں سوچتی تھی کہ وہ مصروف ہو گا۔ شاہ زیب کی ہر بار کی ہدایت پر اس نے ہر بار کی طرح محض اثبات میں گردن ہلا دی تھی اور اس نے ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے کالج کے باہر چھوڑا تھا اور خود بڑی تیزی میں یہ جا وہ جا ہو گیا تھا۔ عریم نے گاڑی میں بیٹھتے ہی رومیلہ کو کال کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے وہاں پہنچنے کے دس منٹ بعد رومیلہ وہاں آ چکی تھی۔ دونوں نے کوئی آدھ گھنٹہ باتوں میں اور کتابیں اشو کروانے میں لگایا تھا اور واپسی کی راہ لی تھی وہ جاتے ہوئے جتنی خوش تھی واپسی میں اتنی ہی اداس تھی کہ شاہ زیب سے اس نے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آج اسے اپنے پیرنٹس کو بھیجنے کے لئے منا کر ہی لوٹے گی مگر اس کی قسمت میں جانے کیا لکھا تھا کہ اس کی نوبت ہی نہیں آ سکی تھی۔ شاہ زیب نے اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور اچانک آنے والی کال کے بعد تو بات کرنے کا جواز ہی نہیں رہا تھا اس لئے وہ آج کی ملاقات ضائع جانے پر سخت ملول تھی کہ فارس نے وعدہ کے مطابق محمود خان کو شادی آگے بڑھانے پر راضی کر لیا تھا مگر اس کی جان کو تو کوئی دھڑکے لگے تھے جس کا اس نے آج سدباب نکالنا تھا مگر ہر تدبیر، تقدیر کے ہاتھوں ہار گئی تھی اور اب وہ ملول دل کے ساتھ شاہ زیب کے تایا کی صحت یابی کے لئے دعا کر رہی تھی۔

☆......☆......☆

''آئیکت! یو ڈونٹ وری۔ تایا ابو کو کچھ نہیں ہو گا وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔'' شاہ زیب ہاسپٹل پہنچ چکا تھا اور زیادہ تر بھاگ دوڑ وہی کر رہا تھا کہ شوکت اورکزئی کو ہارٹ اٹیک آیا تھا اور شاہ زیب نہ دل کا برا تھا نہ ہی آئیکت سے اس کی کوئی ذاتی پرخاش تھی اس لئے اسے بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلتے دیکھ کر وہ نہ صرف اس کے پاس آن ٹھہرا تھا بھرپور انداز میں اس کو ہمت دیتے ہوئے اپنے ساتھ کا یقین بخشتا تھا۔ آئیکت نے اس مشکل گھڑی میں شاہ زیب کو اپنے ساتھ پایا تھا تو اسے گونا گو سکون کا احساس ہوا تھا۔

''انشاءاللہ۔'' اس نے اپنے کاندھے پر رکھے شاہ زیب کے ہاتھ کو تھام کر یقین سے کہا تھا۔

''صبح تک تو تایا ابو بالکل ٹھیک تھے اچانک ایسا کیا ہوا کہ ہارٹ اٹیک۔'' وہ آئیکت سے پوچھ رہا تھا کہ اس نے ناشتہ تو سب کے ساتھ ہی کیا تھا اور آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ عریم کی کال آ گئی تھی اس لئے اس نے آفس جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور عریم سے ملنے چلا گیا تھا اس لئے اسے نہیں پتہ تھا کہ اس کے پیچھے ایسا کیا ہوا تھا کہ نوبت ہارٹ اٹیک تک جا پہنچی تھی۔ آئیکت نے کچھ بتانے کی بجائے خاموشی کو ہی بہتر جانا تھا کہ وہ شاہ زیب کے مزاج سے واقف تھا اور کچھ عرصہ سے تو وہ آبدار کے نام پر ہی بھڑک اٹھتا تھا اس لئے وہ چپ رہا تھا کہ خود اس کے بھی تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ کبھی ایسی بھی نوبت آ سکتی ہے۔

''تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔'' شاہ زیب بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا وہ آئیکت کے چہرے کی یکدم بدلتی رنگت پر ٹھٹک گیا تھا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے شاہ زیب، بس بابا کے اچانک سینے میں درد اٹھا میں اور چاچو ہاسپٹل لے آئے۔'' وہ صاف کنی کترا گیا تھا اور مزید اس کے سوالوں سے بچنے کو وہ وہاں سے ہٹ کر چاچا کے ساتھ بینچ پر جا بیٹھا تھا۔ اس نے باوجود اس کے شاہ زیب سے کچھ چھپا نہیں رہے گا اس کو فی الحال کچھ نہیں بتایا تھا کہ آخر بتاتا بھی کس منہ سے کہ وہ تو خود بہت پریشان تھا۔ ان لوگوں نے یہ بات اپنے طور پر چھپا کر رکھی ہوئی تھی کہ آبدار گھر سے کہیں چلی گئی ہے مگر برائی کب سات پردوں میں چھپی رہ پاتی ہے گھر کی بات کسی ملازم کے ذریعے گھر سے باہر نکل گئی تھی۔ شوکت اور کزئی اور جہانزیب اور کزئی نے اپنے طور پر جس لڑکے سے آبدار کا رشتہ طے کیا تھا اس کے گھر سے بھاگ جانے کے باوجود رشتہ ختم نہیں کیا تھا اور انہیں کہہ دیا تھا کہ آبدار ملک سے باہر کچھ عزیزوں کے گھر گئی ہوئی ہے مگر جانے کیسے لڑکے کی فیملی کو اصل بات پتہ چل گئی تھی اور لڑکے کے والدین صبح ہی صبح اور کزئی پیلس چلے آئے تھے اور جتنا ذلیل کر سکتے تھے کیا تھا اور رشتہ ختم کر کے چلے گئے تھے۔ شوکت اور کزئی جو پہلے ہی کتنے زخم سینے میں دبائے بیٹھے تھے نئے چر کے کچھ ایسے لگے تھے کہ ان کے دل نے دھڑکنے سے انکار کر دیا تھا اور وہ ہاسپٹل پہنچ گئے تھے اور اس وقت زندگی و موت کی کشمکش میں تھے اور سب کے ساتھ ساتھ آئیکت بھی بہت پریشان تھا مگر اس کی پریشانی میں احساس زیاں و ندامت بھی ہلکورے لے رہا تھا کہ اس نے کہاں سوچا تھا کہ کچھ ایسا بھی ہو سکتا ہے وہ ڈوبتے دل کے ساتھ خود کو اپنے اقدام پر کوستا باپ کی صحت یابی کے لئے دعا گو تھا اور جیسے ہی شوکت اور کزئی کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی اسے جان میں جان آتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ رب کا شکر ادا کرتا اس مسئلہ سے جلد نکلنے کے لئے سوچنے لگا تھا وہ سب کے ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم میں موجود تھے۔ شوکت اور کزئی نے بھائی کو پکارا تھا اور جہانزیب اور کزئی لپک کر بھائی کے پاس بیڈ کے کنارے پر ان کے ہاتھ تھام کر بیٹھ گئے تھے۔ تب شوکت اور کزئی نے قدرے نحیف لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا وہ آمنہ اور شاہ زیب کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ جہانزیب اور کزئی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر بھائی جان، ہو گا وہی جو آپ چاہیں گے۔ آپ صحت یاب ہو جائیں اس کے بعد شاہ زیب اور آمنہ بیٹی

کی شادی دھوم دھام سے کریں گے۔'' شاہ زیب جو کچھ میڈیسن لینے گیا ہوا تھا اندر آتے ہوئے باپ کی بات سن کر پتھر کا ہی تو ہو گیا تھا جبکہ شوکت اور کزئی نے آج ہی نکاح پڑھوانے کی بات کر کے رہی سہی کسر بھی پوری کر ڈالی تھی۔

''ٹھیک ہے بھائی جان۔ میں نکاح کا انتظام کرواتا ہوں۔ آپ دماغ پر زور نہ ڈالیں آپ ریسٹ کریں، سب کچھ آپ کی مرضی کے عین مطابق ہوگا۔'' جہانزیب اور کزئی چاہے غصہ کے انتہائی تیز تھے مگر وہ بھائی کی عزت بہت کرتے تھے ہمیشہ ان کی بات کو ویلیو دیتے تھے ان کے احترام میں وہ زندگی میں ایسے تلخ فیصلہ لے گئے تھے کہ جن کو سوچ کر وہ اندر تک خاک ہو جاتے تھے مگر بھائی کو انکار کا یارا نہ تھا اس لئے سر تسلیم خم کر گئے تھے اور آج تو بات کچھ بھی نہ تھی کہ خود ان کی بھی یہی خواہش تھی کہ ان کے بھائی کی بیٹی ان کی بہو بنے اس لئے انہوں نے سارے فیصلے از خود لے لئے تھے۔ شاہ زیب سے کچھ پوچھنے کی زحمت تک نہ کی تھی کہ وہ ہمیشہ یکطرفہ فیصلہ لینے کے عادی تھے انہوں نے کبھی بیوی اور بیٹے کو اتنی اہمیت نہیں دی تھی کہ وہ ان کے فیصلہ پر چوں بھی کر سکے اور آج تک بھی ایسی نوبت آئی بھی نہیں تھی مگر یہ تو شاہ زیب کی زندگی کا فیصلہ تھا اور وہ جو قدم اٹھا چکا تھا اس کے بعد وہ آمنہ سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس نے آمنہ کا جھکاؤ بارہا محسوس کیا تھا لیکن خود اس کے ذہن و دل میں آمنہ دور دور تک نہ تھی اس نے آگے بڑھ کر دوائیوں کا شاپر مومنہ کو تھمایا تھا تب ہی اس کی نظر مومنہ کے ساتھ کھڑی آمنہ پر اٹھی جس کا چہرہ گلرنگ ہو رہا تھا جو اس بات کا گواہ تھا کہ اسے باپ کے فیصلہ پر کوئی اعتراض نہیں، اس نے لب بھینچے اور بڑی تیزی میں وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ اس کے خاموشی سے جانے کو سب ہی نے محسوس کیا تھا مگر بولا کوئی نہ تھا جہانزیب اور کزئی کے بھائی کو ایک بار پھر تسلی دی تھی۔ اپنی طرف سے اقرار کہہ کر نکاح کی تیاری کا عندیہ دے کر وہ باہر نکلے تھے کہ انہوں نے بیٹے سے بات کرنی تھی کہ ان کے حساب سے اسے وہیں ٹھہرنا چاہئے تھا اور اس نے جبکہ ایسا نہیں کہا تھا انہوں نے شاہ زیب کو تلاش میں نگاہ دوڑائی تھی مگر وہ دور دور تک کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ انہوں نے کچھ سوچ کر بیٹے کا نمبر ملایا تھا شاہ زیب کی پہلی بیل پر باپ کی کال ریسیو کی تھی اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے سرد لہجے میں بول پڑا تھا۔

''میں آمنہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' انہیں کہاں بیٹے سے صاف انکار کی توقع تھی۔

''میں نے تم سے تمہاری مرضی نہیں پوچھی ہے شاہ زیب، صرف تمہیں اپنے فیصلہ سے آگاہ کرنے کے لئے فون کیا ہے۔ دو گھنٹہ کے اندر تمہارا نکاح ہے۔'' جہانزیب اور کزئی بیٹے کے انکار پر کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئے تھے مگر جب بولے تھے تو اپنے مخصوص بے لچک فیصلہ کن انداز میں بولے تھے اور اب خاموش ہو جانے کی باری شاہ زیب کی تھی۔ باپ کے اٹل انداز میں فیصلہ صادر کرنے کے بعد اس کے پاس اقرار و انکار کا جواز تک باقی نہیں رہا تھا مگر وہ اس فیصلہ کو مان بھی نہیں سکتا تھا اس لئے خود کو کمپوز کر کے اس نے اپنی بات پھر دہرائی تھی۔

''بابا! میں نے کہا نہ میں نے آمنہ سے شادی نہیں کرنی ہے آپ تایا ابو کو منع کر دیں۔'' اس کے انداز میں جھنجلاہٹ سی تھی اور وہ تو اشتعال کی آخری حدوں تک جا پہنچے تھے۔

''اپنے مشورے اپنے پاس رکھو شاہ زیب۔'' وہ غصہ سے دھاڑے تھے۔شاہ زیب نے لب بھینچ لیئے تھے۔

تم اگر اس غلط فہمی میں ہو کہ میں بھائی جان کو انکار کروں گا تو اس حماقت سے باہر آ جاؤ کیونکہ بھائی جان نے نکاح کا کہہ دیا سمجھو نکاح ہو گیا۔تم اپنا دماغ چلانا بند کرو اور خاموشی سے آ کر نکاح نامہ پر سائن کر دو۔'' جہانزیب اور کزئی نے نہایت غصہ سے اسے بہت کچھ باور کروایا اور اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی لائن ڈسکنکٹ کر دی تھی اور وہ ہاسپٹل کی راہداری میں موبائل فون ہاتھ میں لیئے ساکت سا کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کرے تو کیا کرے کہ وہ باپ سے بھی واقف تھا اور مسئلہ یہ تھا کہ شوکت اور کزئی نے نکاح کی بات ایسے وقت میں کی تھی کہ اس کے انکار کی وجہ سے انہیں کچھ ہو جاتا تو سارا الزام اس پر آ جانا تھا۔وہ ڈرائیونگ کرتا مستقل اس مسئلہ سے بچنے کے لیئے کوئی راستہ تلاش کرنے کو مستقل سوچ رہا تھا۔دماغ کے گھوڑے دوڑا رہا تھا ایسے میں اس کا سیل اپنی موجودگی کا احساس دلا گیا تھا۔ وہ ہاسپٹل سے کال نہ ہو یہ سوچتا اسپیڈ کم کرتا فوراً کال ریسیو کر گیا تھا۔اس نے ڈرائیونگ کے دوران کال ریسیو کی تھی اس لیئے نمبر تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی اور کال اس کی توقع کے برخلاف عریم کی تھی۔

''شاہ'' عریم کا بھاری لہجہ کانوں میں کیا گونجا تھا ذہن و دل یکدم کوفت کا شکار ہو گئے تھے۔

''عریم! میں ابھی راستے میں ہوں۔ ہاسپٹل سے گھر جا رہا ہوں۔فری ہو کر تمہیں کال کروں گا۔'' شاہ زیب اپنی بےزاری چھپانے میں ناکام رہا تھا جبکہ اس نے کہاں شاہ زیب کا لہجہ اس کے الفاظ سنے تھے وہ تو اپنی ہی پریشانیوں میں الجھی تھی۔

''شاہ۔کال کٹ مت کیجیئے گا۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔'' وہ بری طرح سسکتے ہوئے بولی تھی اور وہ جو بیچ میں لائن کاٹ رہا تھا عریم کے لہجہ میں لہجہ ایسا ضرور تھا کہ وہ لائن کاٹتے کاٹتے رک گیا تھا اور غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''کیا ہوا ہے عریم، تم ٹھیک ہو۔'' اس کا اتنا بولنا تھا کہ وہ بلک اٹھی تھی اور بری طرح روتے ہوئے جو انکشاف اس نے کیا تھا کوئی بم سا شاہ زیب کی سماعتوں پر پھٹا تھا وہ جو خود ایسا ہی چاہتا تھا یکدم اس نیوز کو سن کر خود پر قابو نہیں رکھ پایا تھا کہ کہاں اندازہ تھا کہ عریم ایسی خبر دے گی وہ خبر میں ایسا الجھا تھا کہ اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت کمزور ہو گئی تھی اور جب تک وہ اپنے حواس قابو کرتا اسٹیئرنگ پر پھر سے گرفت کرنے کی کوشش میں اتنی دیر ضرور ہوئی تھی کہ لیفٹ میں سائیڈ سے آتا ٹرالر یکدم موڑ کاٹتا ہوا اس کی گاڑی سے آن ٹکرایا تھا۔شاہ زیب کی بے ساختہ چیخیں اور عجیب و غریب شور، روتی ہوئی عریم تک صاف پہنچا تھا اور وہ جو پہلے ہی عذاب میں مبتلا تھی یکدم دوہرے عذاب میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ ''شاہ، شاہ'' چلا رہی تھی اور موبائل سے آتی ''ٹوں ٹوں'' کی آواز اس کا منہ چڑاتی اسے یہ باور کروا رہی تھی کہ وہ زندگی کے کڑے امتحان سے دوچار ہو چلی ہے۔وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گری بری طرح رو رہی تھی کہ اس کی قسمت میں اب صرف رونا ہی لکھا تھا اور دوسری جانب خطرناک ایکسیڈنٹ کے نتیجہ میں شاہ زیب اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا تھا یہ زندگی کا وہ موڑ تھا جہاں اس کی پریشانی دوسرے کی اذیت و ذلت کا باعث بننے والی تھی یہ زندگی کا وہ موڑ تھا جہاں وہ بستر مرگ پر تھا اور جسے ''محبت'' کا دعویٰ کر کے اپنے

نکاح میں لیا تھا وہ زندگی میں موت کا مزہ چکھ رہی تھی کہ زندگی میں کچھ موڑ ایسے بھی آتے ہیں جب جسم زندہ ہوتا ہے اور روح جینے کی آرزو ترک کر دیتی ہے کہ شریعت کے تقاضوں کو جھٹلانے والے، خدا کے فرمان سے روگردانی کرنے والے، خدا کے نافرمان زندگی میں ذلت کا مزہ ضرور چکھتے ہیں کہ اصل زندگی تو ہوتی ہی ان کے لئے ہے جو زندگی کی قدر کرتے ہیں اور زندگی کو اللہ کے احکامات کے مطابق بسر کرتے ہیں اللہ کے احکامات سے منکر ہو جانے والے سزا ضرور پاتے ہیں اور عریم محمود خان کا بھی مکافات عمل شروع ہو رہا تھا اور شاہ زیب اور کزئی کے لئے زندگی تنگ پڑنے والی تھی کہ ختم ہونے والی تھی اس کا فیصلہ محض چند گھنٹوں میں ہو جانا تھا کہ اسے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ ڈاکٹرز اس کی جانب سے یکسر مایوس ہو چکے تھے۔ انہوں نے جواب دے دیا تھا مگر رب کائنات تو وہ ہے چاہے تو تنکے میں جان ڈال دے اور اس بے جان پڑے شاہ زیب اور کزئی میں اللہ نے پھر سے جان ڈالنی تھی یا اس کی رسی کو دراز کرنے سے قبل ہی کھینچ لینا تھا، عریم محمود خان کا امتحان کچھ اور کڑا کرنا تھا کہ اسے ایک موقع دینا تھا یہ فیصلہ چند گھنٹوں کا یا چند لمحوں کا محتاج تھا رب کے حضور کتنے ہی ہاتھ دعا کو اٹھے ہوئے تھے شاہ زیب اور کزئی کی زندگی مانگ رہے تھے۔ کسی معجزہ کے انتظار میں تھے مگر ہر بار معجزہ ہو یہ ضروری تو نہیں......!!

☆......☆......☆

''کیا ہوا ہے ابسام اتنی جلدی میں کہاں جا رہے ہو۔'' وہ جو بڑی عجلت میں باہر کی طرف بڑھ رہا تھا ماں کی آواز پر تھم گیا تھا۔

''آئیکت کے بابا ہاسپٹل میں ہیں۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔'' وہ رخ ماں کی طرف موڑتے ہوئے دھیمے سے بولا تھا جہاں فضہ حیدر پریشان ہوئی تھیں وہیں کچن سے لاؤنج کی طرف آتی آبدار کی تو جان ہی نکل کر رہ گئی تھی وہ لپک کر ان کے درمیان میں آئی تھی۔

''تایا ابو کو کیا ہوا ہے؟'' وہ ابسام سے پوچھ رہی تھی اور وہ دونوں ماں بیٹے یکدم چپ کے چپ رہ گئے تھے کہ کہاں اندازہ تھا کہ وہ اس بات سے باخبر ہو جائے گی جو اس سے فی الحال چھپانی تھی۔

''بتایئے پلیز، کیا ہوا ہے تایا ابو کو......'' پریشانی وفکر اس کے حسین چہرے سے ہویدا تھی۔

''ہارٹ اٹیک آیا ہے۔'' اس نے ناچار بتایا تھا اور اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''آپ پریشان نہ ہوں انکل ٹھیک ہیں۔'' اس نے دھیمے سے کہا تھا فضہ حیدر نے آگے بڑھ کر اسے کاندھے سے لگا لیا تھا۔

''میں نے ہاسپٹل جانا ہے۔'' وہ سسکی تھی اور وہ ماں کے اشارے پر باہر کی طرف بڑھا تھا اور آبدار، فضہ حیدر کا حصار توڑ کر نکلی تھی اور ابسام کی راہ میں حائل ہو گئی تھی۔

''مجھے بھی ساتھ لے جائیں پلیز......'' وہ ملتجی ہوئی تھی۔ ابسام کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اسے تسلی دے تو کس طرح سے، اسے منع کرے تو کیسے کرے۔ فضہ حیدر کی ہی بیٹے کی مدد کو آگے بڑھی تھیں اور اسے جانے کا کہہ کر بلکتی ہوئی آبدار کو سینے سے لگا گئی تھیں۔

''میں بہت بری ہوں آنٹی، کتنی بدنصیب ہوں۔ اپنوں سے دور ہوں۔ مشکل وقت میں ان کے ساتھ نہیں ہوں۔'' اس کی ہچکیاں

بندھی ہوئی تھیں۔ وہ بوجھل ذہن ودل کے ساتھ گھر سے نکلا تھا جبکہ فضہ حیدر سے اسے سنبھالنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔

''حوصلہ رکھو آبدار، مشکل وقت ہے گزر جائے گا اللہ سے دعا کرو۔'' وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے ملازمہ سے پانی لے کر اس کی طرف بڑھا گئی تھیں مگر اس نے پینے سے انکار کر دیا تھا۔

''کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں جانتی ہوں اب کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔'' وہ تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں سے نکلی تھی فضہ حیدر ساکت بیٹھی رہ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

عریم کے لئے آج کا دن تباہیاں لے کر طلوع ہوا تھا۔ وہ لائبریری سے واپسی کے بعد کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی کہ کالج آف تھا اس لئے فرصت ہی فرصت تھی اسے کوئی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ اسے قے محسوس ہوئی تھی اور وہ کتاب صوفے پر ڈالتی واش روم کی جانب بھاگی تھی اور تقریباً پانچ سے دس منٹ بعد جب نڈھال سی تولیہ سے منہ خشک کرتی کمرے میں آئی تھی ماں کو اپنا منتظر پایا تھا اور وہ جو اس کو شاپنگ پر چلنے کا کہنے آئی تھیں اس کی زرد رنگت دیکھ کر بری طرح پریشان ہوگئی تھیں۔

''عرمی! کیا ہوا ہے بیٹا۔ رنگت اتنی زرد کیوں ہو رہی ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے تمہاری......'' انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تھا۔ پیشانی بے حد سرد تھی وہ اسے عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگی تھیں۔

''پتہ نہیں ماما، طبیعت کو اچانک کیا ہوا ہے۔ بہت عجیب طبیعت ہو رہی ہے۔'' وہ طوفان سے انجان دھیمے سے منمنائی تھی اور بیٹی کی اڑی رنگت ان کے حواس معطل کرنے لگی تھی کہ وہ ایک بار پھر واش روم کی طرف لپکی تھی اور وہ یوں ساکت کھڑی رہ گئی تھیں جیسے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ بیٹی کی حالت جو نشان دہی کر رہی تھی وہ سوچتے بھی انہیں خوف آ رہا تھا اور اتنی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ صوفے پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھی عریم سے اپنے شک کی تصدیق کو کچھ پوچھ لیتیں مگر وہ چپ بھی تو نہیں رہ سکتی تھیں کہ اس کی حالت جس جانب اشارہ کر رہی تھی وہ ان کے لئے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ طیش کے عالم میں بیٹی کی جانب بڑھی تھیں اسے کاندھے سے پکڑ کر اپنے مقابل بڑے جارحانہ انداز میں کھڑا کر گئی تھیں۔ کچھ کہتیں کہ اسی وقت وہاں ملازمہ چلی آئی تھی ان کے لب یکدم باہم پیوست ہوگئے تھے۔ انہوں نے ملازمہ کی جانب دیکھا تھا جس نے ان کا سیل فون ان کی جانب بڑھایا تھا۔ شوہر کا نمبر بلنک ہوتا دیکھ کر ان کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی مگر مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق انہوں نے کال ریسیو کی تھی۔ صد شکر کہ محمود خان نے از خود مختصر بات کی تھی مگر اپنے کل آنے کا بتا کر ان کے سکون کو مزید تباہ کر دیا تھا وہ جس وقت لائن کاٹ کر وہ پھر بیٹی کی طرف مڑی تھیں اسی وقت وہ لہرا کر کارپٹ پر گرتی چلی گئی تھی۔ انہوں نے بیٹی کو ہوش میں لانے کی تدبیر کرتے ہوئے ڈاکٹر کو کال کی تھی اور ڈاکٹر شمسہ نے ان کے شک کی کچھ یوں تصدیق کی تھی کہ ان کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ انہوں نے بت بنی بیٹی کی جانب پتھرائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر کب کی بم

بلاسٹ کر کے جا چکی تھی اور ان دو نفوس کی موجودگی میں موت کا سا سناٹا تھا اور کمرے میں اب تک ڈاکٹر شمسہ کی آواز گونج رہی تھی۔

''مسز محمود! آپ کی بیٹی پریگننٹ ہے۔''ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ ہارے ہوئے سے انداز میں بیڈ پر گری تھیں اور اس نے پاؤں سمیٹتے ہوئے اپنے آنسو رگڑے تھے۔

''ماما......''

''مت کہو مجھے ماما عریم ،تم نے میری تربیت ،میری پرورش کو گالی بنا دیا ہے میرے لئے۔'' وہ دھاڑی تھیں۔

''ماما! میری بات تو سنیں آپ پلیز۔'' وہ کھسک کر ماں کے قریب ہونا چاہتی ہی تھی کہ وہ اسے پیچھے دھکیلتیں بیڈ سے ہی اٹھ گئی تھیں۔

''اب کہنے سننے کو باقی کیا رہ گیا ہے مجھے تو اندازہ تک نہیں تھا کہ میری بیٹی اتنی نفس پرست ہوگی۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور وہ تڑپ کر ان کے مقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔

''ماما! سچ میں، میں نے کچھ غلط نہیں کیا ہے۔'' وہ کچھ کہنے کو تھی اپنی صفائی میں مگر ماں کا تھپڑ رخسار پر کچھ یوں پڑا تھا کہ لفظ حلق میں کہیں اٹک کر رہ گئے تھے۔

'' بکواس بند کرو اپنی، غلط نہیں کیا ہے کہ بچی ،تم ماں بننے والی ہو۔ اوہ میرے خدا۔ یہ سب سننے، دیکھنے سے پہلے مجھے موت کیوں نہیں آگئی۔'' وہ لگاتار اس کے منہ پر تھپڑ لگاتیں دیوانوں کے سے انداز میں چیختیں بیٹھتی چلی گئی تھیں اور وہ ماں کے سامنے ہی آن بیٹھی تھی اور روتے ہوئے الف سے لے کر یے تک پوری داستان ان کے گوش گزار کر دی تھی۔

''ماما! مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں ،شاہ زیب کے بغیر میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اس لئے میں نے شاہ کی ہر بات مان لی۔ آپ کو میری بات کا نہیں یقین تو میں آپ کو نکاح نامہ دکھا دوں گی۔'' وہ تمام تر تفصیل سننے کے بعد کچھ نہیں بولی تھیں اور وہ نظر چراتے بولتی چلی گئی تھی۔ ان کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتی ہر وہ بات جو کہنا چاہتی تھی کہہ گئی تھی۔

''میں مانتی ہوں ماما میں نے جو کیا بہت غلط کیا مگر میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔'' رونے و مستقل بولنے سے اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی۔

'' بکواس بند کرو اپنی اور فون کرو اپنے ہوتے سوتے کو تمہارے باپ نے کل آ جانا ہے۔ میں نے اس سے آج ہی مل کر بات کرنی ہے۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تھیں اور عریم نے یکدم لب بھینچ لئے تھے۔ وہ اٹھی تھی اور سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر شاہ زیب کا نمبر ڈائل کر گئی تھی اور اس کا گڈ لک تھا کہ شاہ زیب نے اس کی کال فوراً ہی ریسیو بھی کر لی تھی جبکہ نتاشہ نڈھال سے انداز میں کمرے سے ہی نکل گئی تھیں کہ بیٹی کے اقدام نے ان کا سارا سکون لوٹ لیا تھا۔ آنے والے وقت کا سوچ کر ان کا ابھی سے دم گھٹ رہا تھا مگر وہ کر کچھ نہیں سکتی تھیں کہ بیٹی سے ایسی امید ہی نہیں تھی۔ اس نے ماں کے قدموں سے لپٹی شکست اور تکلیف محسوس کی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے

لگے تھے لیکن شاہ زیب کی آواز ''ہیلو'' اس کے کانوں میں کچھ یوں گونجی تھی کہ وہ ماں کی حالت پر زیادہ دیر افسوس وملال تک نہیں کر پائی تھی اس نے چھوٹتے ہی شاہ زیب سے کہا تھا کہ اسے اس کی ضرورت ہے اور اسے شاہ زیب کا بھی پتہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ کہیں کال کاٹ نہ دے اس لئے وہ ملتجی ہوگئی تھی۔

''شاہ! پلیز میری بات غور سے سنیں۔ میں نے ماما کو ہمارے نکاح کے بارے میں بتادیا ہے۔''

''واٹ...... دماغ خراب ہے تمہارا۔ منع کیا تھا میں نے......'' اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت قدرے کمزور ہوگئی تھی اور وہ غصہ سے چلایا تھا۔

''میں ماما کو اب بھی کچھ نہ بتاتی تو قیامت آجاتی شاہ......'' وہ سسکی تھی۔

''ایسی کیا آفت ٹوٹ پڑی تھی جو تم نے ماما کو نکاح کا بتادیا۔ جانتی بھی ہو میں ابھی کتنا پھنسا ہوا ہوں۔ تایا ابو ہاسپٹل میں ہیں اور تمہیں اپنے چونچلوں سے غرض ہے بس۔'' وہ موڑ کاٹتے ہوئے دانت کچکچا کر بولا تھا اس کا بس چلتا تو وہ عریم کا قتل کردیتا جبکہ دوسری جانب موجود عریم لمحہ ضائع کئے بنا اس کی سماعتوں پر کوئی بم گرا گئی تھی۔

''میں پریگننٹ ہوں شاہ۔'' اسٹیئرنگ پر شاہ زیب کی گرفت کمزور پڑتی چلی گئی تھی۔

''ماما مجھ پر بہت غصہ ہو رہی تھیں۔ وہ مجھے غلط سمجھ رہی تھیں اس لئے میں نے انہیں تمام تر سچائی سے آگاہ کردیا۔'' وہ اب تفصیل اسے بتا رہی تھی آنے والی قیامت سے انجان اسے اپنی ماں سے ملنے کے لئے بلا رہی تھی جبکہ وہ تو لفظ ''پریگننٹ'' پر کچھ یوں اٹکا تھا کہ حواس معطل ہوگئے تھے۔ اسٹیئرنگ پر گرفت کمزور ہوگئی تھی اور اس کی گاڑی ٹرالر سے ٹکرائی تھی شاہ زیب کی چیخیں سن کر عریم مضطرب ہوگئی تھی۔

''شاہ......'' وہ بے ربط ہوئی جا رہی تھی مگر آگے سے اسے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور لہرا کر زمین پر آ رہی تھی۔

ایک لمحے کو معطل نہیں تپنے کا عمل
زندگی جلتے دیئے پر ہے ہتھیلی کی طرح

❁ ❁

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

جہانزیب اور کرزئی آنے والی قیامت سے انجان محض پون گھنٹہ میں نکاح کی تیاری کر گئے تھے اور بیٹے کو کال ملاتے اس کے کال ریسیو نہ کرنے پر غصہ سے پیچ وتاب کھا رہے تھے اور بیٹے کا سارا غصہ بیوی پر نکال گئے تھے۔

" کیسے بھی اپنے لاڈلے سے رابطہ کرواگر وہ کچھ دیر میں یہاں پر نہیں پہنچا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" وہ بیوی پر برس رہے تھے جو خود اس تمام صورتحال سے پریشان تھیں کچھ بولتیں کہ اسی وقت آئیکت پریشان سا وہاں چلا آیا تھا اور جو خبر دی تھی وہ سن کر ان دونوں میاں بیوی کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی تھی۔

" چاچو، شاہ زیب کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے۔" وہ بے یقینی سے آئیکت کو دیکھ رہے تھے اور وہ تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا کہ ابسام اس کے بابا کو دیکھنے آیا تھا اور وہ اُسے چھوڑنے باہر تک گیا تھا اور کاریڈور سے گزرتے اسٹریچر کو دیکھ کر وہ لپک کر اس تک پہنچا تھا خون میں لت پت وہ کوئی اور نہیں شاہ زیب تھا جس کا ایکسڈنٹ ہاسپٹل سے کچھ فاصلے پر ہی ہوا تھا اس لئے اُسے جائے وقوعہ کے سب سے قریبی ہاسپٹل میں ہی لایا گیا تھا اور یہ شاہ زیب کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے اس حالت میں آئیکت نے دیکھ لیا تھا وگرنہ اس کا علاج ٹھیک طرح سے شروع کیا جانا ممکن نہ تھا آئیکت نے ڈاکٹر کو پیشنٹ کے ساتھ ہونے کا یقین دلا کر ٹریمینٹ شروع کرنے کا کہا تھا اور جہانزیب اور کرزئی تک چلا آیا تھا، اور ان کے آئی سی یو کے باہر پہنچنے کے اگلے لمحہ ڈاکٹر نے انھیں فارم فل کرنے کیلیے کہا تھا اور انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے فارم فل کیا تھا۔ ان سب کا روم روم شاہ زیب کی صحت یابی کیلیے دعا گو تھا مگر اس کی حالت بے حد نازک تھی۔ جسم پر چھوٹی بڑی کئی چوٹیں وزخم آئے تھے مگر دماغ پر کچھ ایسی چوٹیں آئی تھیں کہ ڈاکٹر نے چند گھنٹوں میں مریض کے ہوش میں آنے کو اسکی زندگی کیلیے ضروری قرار دے دیا تھا، مگر چھ گھنٹے گزر گئے تھے اور وہ بے سدھ تھا۔ شاہ زیب کے ایکسیڈنٹ سے شوکت اور کرزئی کو لاعلم رکھا گیا تھا کیونکہ وہ خود بیمار تھے ان کی اہلیہ تابندہ نے ہی فی الوقت اُنھیں نکاح کی بات نہ کرنے پر راضی کر لیا تھا۔ اُنھیں ہاسپٹل میں آئے تقریباً گیارہ گھنٹے گزر گئے تھے اور جبکہ شاہ زیب تقریباً آٹھ گھنٹوں سے آئی سی یو میں تھا ڈاکٹرز بالکل مایوس تھے کہ جانے کس کی دعا رنگ لائی تھی شاہ زیب کے وجود میں ہلچل ہوئی تھی مگر وہ چند منٹوں کے بعد پھر سے بے ہوش ہو گیا تھا ڈاکٹرز اپنی سی کوشش کر رہے تھے اُسے انڈر آبزرویشن رکھا گیا تھا اور تقریباً سولہ گھنٹوں کی بے ہوشی کے بعد اس نے آنکھیں کھول دی تھیں ان سب کی جان میں جان آگئی کہ وہ اب خطرے سے باہر تھا۔ جہانزیب اور کرزئی نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے صدقہ وخیرات کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی کہ وہ رب کے آگے جھکے جا رہے تھے کہ ان کے اللہ نے انھیں کڑی آزمائش سے بچا لیا تھا ان کے اکلوتے بیٹے کو زندگی دے دی تھی کہ اللہ جسے چاہے زندگی دے، جسے چاہے موت کی نیند سلا دے کہ کاروبار زندگی، حیات وموت کے سلسلے سب اسی باری تعالیٰ کی مرضی کے محتاج ہیں اور انسان اُس رب کی مرضی کے آگے بے بس کہ وہ نہیں ہوتا جو انسان چاہتا ہے وہ ہوتا ہے جو رب چاہتا ہے اور خوش ومطمئن زندگی وہ بسر کرتے ہیں جو رب کی مرضی کو اپنی مرضی بنا لیتے ہیں۔

☆......☆......☆

''ماما، میں کیسے سمجھاؤں آپکو۔شاہ کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔وہ خود مشکل میں ہیں۔وہ کیسے آسکتے ہیں؟ میں کیسے بلاؤں انہیں؟'' وہ ماں کی ایک ہی تکرار، کہ وہ شاہ زیب کو نکاح نامے کے ساتھ بلائے، سے تنگ آکر چیخی تھی۔

''چٹاخ۔۔۔زیادہ بکواس کی تو جان سے ماردوں گی۔'' وہ ماں کے یکدم بے رحم ہو جانے پر پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''تم نے باپ کی عزت، ماں کی پرورش خاک میں ملادی ہے۔۔۔اور اب بھی تمہیں اس بد بخت انسان کی فکر ہے، جس نے تمہیں کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔'' وہ لگا تار اس کے منہ پر تین تھپڑ لگا کر ہذیانی انداز میں بولی تھیں۔وہ آگے سے ماں کو کچھ کہہ پائی تھی نہ ان کا ہاتھ روک پائی تھی۔بس خاموشی سے پٹ رہی تھی۔

''تمہاری بات پر یقین کر لوں ناں۔۔۔کہ تم نے نکاح کیا ہے۔۔۔تو لاؤ ثبوت۔۔۔تم ماں بننے والی ہو اور یہ بات اتنی معمولی نہیں ہے۔دنیا ثبوت مانگے گی۔۔۔کس کس کو دو گی اپنی بے گناہی کا ثبوت۔۔۔کس کس کو بتاؤ گی کہ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔تم نے محض اپنی خوشی کے لئے ہم سے سر اٹھا کر جینے کا حق ہی چھین لیا ہے عریم۔۔۔''

وہ ہارے ہوئے انداز میں بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔

''ماما! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے، مجھے معاف کر دیں۔۔۔ لیکن مجھ پر یقین رکھیں۔۔۔سچ میں، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔شاہ زیب نے مجھ سے نکاح کیا ہے۔۔۔'' وہ سسک پڑی تھی۔

''نکاح چھپ چھپا کر نہیں ہوتے عریم۔۔۔نکاح ایک جائز، شرعی عمل ہے جسے تم نے اپنے عمل سے گناہ بنا دیا ہے۔کیا میں نہیں جانتی کہ سرپرست کی مرضی کے بناء کیا نکاح باطل ہوتا ہے۔۔۔جس نکاح کی اب تک دہائی دے رہی ہو اس کی شرعی حیثیت ہی نہیں ہے۔اپنے والی وارث سے چھپ کر نکاح کر لیا، محض نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لئے اور اب نکاح اور شرعیت کی دہائی دے رہی ہو، یہ مت بھولو کہ جائز کام کو ناجائز طریقے سے کیا جائے تو وہ گناہ بن جاتا ہے اور تم گناہ کی مرتکب ہو چکیں۔۔۔جس کے عشق میں ڈوب کر تم نے اپنی، اپنے والدین کی عزت داؤ پر لگا دی، وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا، تمہارے بچے کو اپنا نام نہیں دے گا کیونکہ اگر اس کی نیت صاف ہوتی تو وہ تمہیں اس حد تک مجبور ہی نہ کرتا اور اگر وہ خود مجبور تھا تو کم از کم نکاح کی ایک کاپی تو تمہیں دیتا۔۔۔جسم کے حصول کو تم محبت سمجھو، شرعیت کی آڑ میں رشتوں کا مذاق بناؤ تو یہ تمہاری غلطی ہے۔۔۔اور جس کی سزا تم سے زیادہ تمہارے ماں باپ بھگتیں گے۔۔۔'' وہ ماں کو منہ پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے سن رہی تھی کہ انہوں نے تلخی کی بھی حد کر دی تھی۔حقیقت کا پردہ کچھ یوں چاک کیا تھا کہ ان کی بیٹی کی روح تک کانپ اٹھی تھی۔اسے ماں کی ہر بات سچ ہی تو لگ رہی تھی اور اسے سچ کیوں نہ لگتی کہ شاہ زیب کا رویہ بھی تو ایسا نہ تھا کہ وہ ماں کی کسی بات کو جھٹلا پاتی مگر دل کی بھی اپنی دہائی تھی وہ اب بھی شاہ زیب کے نام کی مالا جپ رہا تھا۔

''نہیں، شاہ ایسے نہیں ہیں۔۔۔میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ میں مشکل میں ہوں۔نکاح کو منظر عام پر لانا کتنا ناگزیر ہو گیا ہے، سب

کچھ بتا دیا ہے میں نے شاہ کو اور میں نے دھماکہ کی آواز سنی تھی۔۔۔میرا دل کہہ رہا ہے کہ شاہ مشکل میں ہیں۔۔۔جیسے ہی ان کی مشکل دور ہوگی وہ نکاح نامہ لے کر آ جائیں گے۔ ماما کے تو ہمات غلط ثابت ہو جائیں گے۔شاہ ایسے نہیں ہیں۔شاہ کو جسم کی چاہ نہیں تھی۔شاہ نے سب کچھ صرف میری محبت میں کیا کیونکہ وہ مجھے کھونا نہیں چاہتے تھے۔شاہ کو پتہ ہے میں مشکل میں ہوں۔۔۔وہ مجھے اس مشکل سے نکالنے کو آتے ہوں گے۔شاہ اپنے بچے کو نام دیں گے۔۔۔وہ ایسے نہیں ہیں، میں جانتی ہوں شاہ کی محبت جھوٹی نہیں ہے۔'' وہ خالی خالی نظروں سے ماں کو دیکھتی، خود کلامی کر رہی تھی۔انہوں نے فقط ایک نظر بیٹی پر ڈالی تھی۔یہ وہ چہرہ تھا جسے دیکھ کر ان کی صدیوں کی تھکن اتر جاتی تھی، وہ خود کو زندہ تصور کرتی تھیں اور آج انہیں کراہیت محسوس ہوئی تھی، وہ خود کو مردہ تصور کرنے لگی تھیں۔وہ میکانکی انداز میں اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔عریم کی بڑبڑاہٹ ہنوز جاری تھی کہ محبت ابھی خوش گمانیوں کے حصار میں تھی۔

☆......☆......☆

شاہ زیب دوائیوں کے زیر اثر سو رہا تھا کہ یکدم ہڑبڑا کر جاگ گیا۔اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اپنے جسم کے ہر عضو سے درد کی ٹیسیں سی اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔اس کا دماغ بری طرح چکرا رہا تھا۔وہ خود کو خلاء میں محسوس کر رہا تھا۔تکلیف کی شدت کچھ اس قدر تھی کہ اس کی آنکھوں سے گرم سیال مادہ بہنے لگا تھا جو اس کی کنپٹی کے بالوں میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔اس نے دماغ پر زور ڈالنے کی کوشش کی تھی۔کچھ ثانیے کے بعد اس کو اپنے دماغ میں دھماکے سے ہوتے محسوس ہوئے تھے اور کانوں میں جیسے پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جانے لگا تھا۔

''شاہ! کہاں ہیں آپ۔۔۔میں بہت بڑی مصیبت میں ہوں۔میری مدد کریں شاہ، میری زندگی بھر کی نیک نامی داؤ پر لگی ہے۔۔۔ایک واحد آپ میری بے گناہی کا ثبوت دے سکتے ہیں۔خدا کے لئے ہمارا نکاح نامہ لے کر آ جائیں شاہ۔۔۔میں آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔شاہ۔۔۔آپ سن رہے ہیں خدا کے لئے چپ نہ رہیں جواب دیں ورنہ میں مر جاؤں گی شاہ۔'' عریم کا بھیگا دردناک لہجہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا اور وہ لب بھینچے تکیہ پر سر پٹخ رہا تھا۔وہ جو چاہتا تھا وہ ہو چکا تھا۔وہ محمود خان کی بیٹی کو اس مقام پر لے آیا تھا جہاں سے عریم کی ہی نہیں بلکہ محمود خان کی تباہی و بدنامی کے دن بھی شروع ہو گئے تھے۔جس مقصد کے حصول کے لئے اس نے بہت لمبی تپسیا کی تھی، جس کے لئے اس نے مہینوں پلاننگ کی تھی، اپنی سوچ، اپنی اچھائی کو تیاگ کر جھوٹ کا پلندہ تیار کیا تھا، محبت کے جھوٹے دعوے کئے تھے، ہر کام ایمانداری سے کرنے والے شاہ زیب اورکزئی نے زندگی کے بہت اہم فیصلہ کو بے ایمانی کی نذر کر دیا تھا۔ اس نے انتقام کی راہ پر چلتے اپنے اندر کی اچھائی کا از خود گلا گھونٹ دیا تھا اور جب اسے حسب منشا نتائج کی خبر ملی تھی تب سے وہ بے حد بے چین تھا۔یہ نہیں تھا کہ اس کا انتقام سرد ہو چکا تھا۔انتقام تو یونہی بھڑک رہا تھا مگر عریم کا بھیگا، اذیت کی بھٹی میں سلگتا ہوا لہجہ اس کو اندر تک سلگا گیا تھا۔اسے شدت سے احساس ہوا تھا کہ اس نے انتقام کی راہ بڑی غلط چنی تھی۔اس سب میں عریم کا کوئی قصور نہ تھا۔اسے زندگی بھر جو

ایک دم گھوٹتی سسکی سنی تھی وہ دگنی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کر عریم کے پاس جائے اور نکاح نامہ دکھا کر اس لڑکی کی، جو محبت میں اپنا سب کچھ، اپنی انا، اپنا وقار، اپنی نسوانیت سب ہی کچھ تو اس کے قدموں میں رکھ گئی تھی یہ جانے بغیر کہ دوسری جانب محبت کی میٹھی میٹھی لگن نہیں انتقام کی وحشت ناک آگ بھڑک رہی ہے جو اس معصوم کے ارمانوں کو، اس کی محبت، اس کے وقار کو جلا کر بھسم کر دے گی۔ وہ کہاں شاہ زیب کے عزائم جانتی تھی اور آج وہ محبت کے انجام پر رو رہی تھی۔ ابھی تو ماں کی نظروں میں معیوب ٹھہری تھی اور اس نے ابھی تو پوری ایک بے رحم دنیا کا سامنا کرنا تھا۔ شاہ زیب کے کانوں میں عریم پھر اذیت ناک سرگوشیاں کرنے لگی تھی۔

''شاہ! محبت کو میرا جرم مت بنائیں، خدا کے لئے مجھ سے ملیں، میں سب کی نظروں سے گر جاؤں گی۔ ماما کی نظروں سے تو گر ہی چکی ہوں، وہ مجھ سے بات نہیں کر رہیں، وہ میری کسی بات کا یقین بھی نہیں کر رہیں۔ آپ نکاح نامہ لے کر آجائیں شاہ، ماما کو یقین دلا دیں کہ ان کی عریم غلط نہیں ہے ان کی تربیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ شاہ! آپ کی خاموشی مجھے بے موت مار دے گی۔ میں تو پہلے ہی ہراساں ہوں مجھے سانس لینے کا حق تو دیں۔۔۔ خدا کے لئے کچھ کہیں شاہ۔۔۔'' شاہ زیب نے تڑپ کر تکیہ پر سر پٹخا تھا۔ اس کا دل کیا تھا کہ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ لے۔ وہ عریم کی آواز کی بازگشت سے جان چھڑا لے مگر وہ ایسا نہیں کر پایا تھا کہ اس نے بستر پر بے جان ہوئے ہاتھوں کو اٹھانے میں خود کو ناکام محسوس کیا تھا۔ بائیں ہاتھ میں فریکچر کی وجہ سے پلستر چڑھا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ میں لگی ڈرپ اس کے ارادوں کی راہ میں حائل ہو گئی تھی۔ اس نے اٹھنا چاہا تھا مگر اس کی چیخیں فضا میں بلند ہو گئی تھیں۔ ایکسیڈنٹ میں اس کی ریڑھ کی ہڈی بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ وہ اٹھنا تو دور ہلنے سے بھی قاصر تھا۔ اس کی چیخوں پر پرائیویٹ روم کے باہر ٹھہرا آئیکت اور کزنئی اندر بھاگا آیا تھا اور شاہ زیب کو درد سے تڑپتے دیکھ کر ڈاکٹرز کو آوازیں دینے لگا تھا۔ ڈاکٹر نے شاہ زیب کو نیند کا انجکشن لگا دیا۔ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا تھا آخری سوچ عریم سے متعلق تھی اور وہ جو اپنے منصوبہ کی کامیابی پر خوش تھا اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ اس نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ ''عریم'' پکارا تھا۔ سائیڈ پر کھڑا آئیکت بری طرح چونک اٹھا تھا اور وہ حیرت سے بت بنا بے سدھ پڑے شاہ زیب کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ شاہ زیب جس طرح کا زاہد خشک قسم کا انسان تھا، لڑکیوں کا نام سننا بھی جو گوارا نہ کرتا تھا آج سوئی جاگی سی کیفیت میں ایک ہی نام کا کلمہ پڑھتا اسے چونکا رہا تھا تو کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ اس نے شاہ زیب کی یکدم رک جانے والی بڑبڑاہٹ پر ایک سانس خارج کی تھی۔ اس کا ذہن اس ادھیڑ بن میں لگ گیا تھا کہ آخر یہ ''عریم'' کون ہے؟ مگر وہ محض ایک نام سے کچھ بھی اخذ نہ کر سکتا تھا نہ ہی کسی نتیجہ پر پہنچ سکتا تھا۔ اس نے شاہ زیب کی صحت یابی تک اپنے ذہن میں اٹھتے سوالوں کو دبا کر رکھنا تھا۔ اس نے کمرے سے نکل کر ڈاکٹر کے روم کا رخ کیا تھا اور ڈاکٹرز کا وہی جواب تھا جو وہ کل سے دے رہے تھے کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ شاہ زیب اور کزنئی پھر اپنے پیروں پر کھڑا بھی ہو سکتا ہے کہ نہیں؟ ڈاکٹرز کے مطابق شاہ زیب اور کزنئی اگلے ماہ، دو ماہ تک تو بیڈ سے ہلنے کے بھی قابل نہ تھا۔ کچھ ماہ بعد جب وہ

کچھ ریکور کر لیتا اس کے چھوٹے بڑے زخم مندمل ہو جائے اس کے بعد اس کے کچھ ٹیسٹ ہونے تھے اور جس کے بعد ہی اسے پھر سے اپنے پیروں پر چل سکنے یا نہ چل پانے کا فیصلہ ہونا تھا۔ یوں اپاہج بن کر شاہ زیب کا بستر سنبھال لینا عریم کے علم میں نہ تھا کہ وہ شاہ زیب کے بارے کہاں زیادہ جانتی تھی۔ وہ تو ایک بار بہت اچانک ہی شاہ زیب اور کزئی سے شاپنگ مال میں ٹکرا گئی تھی اور یہ ٹکراؤ سوچی سمجھی سازش کے تحت تھا۔ جب ہی تو پلاننگ کے مطابق شاہ زیب نے عریم محمود کے ہاتھ سے گرے ہوئے شاپرز ''سوری'' کے ساتھ اسے اٹھا کر دیتے ہوئے اپنا موبائل فون اس کے ہاتھ سے گرے ہوئے ایک شاپنگ بیگ میں ڈال دیا تھا اور عریم جو زندگی میں کئی لوگوں سے ملتی رہی تھی، اچھی بری نظروں کا سامنا بھی رہا تھا مگر رہ کر اٹھنے والی شاہ زیب کی نگاہ میں جانے کیسا احساس تھا کہ وہ گھر آ کر بھی اسے ہی سوچتی رہی تھی اور فریش ہونے کے بعد جب تسلی سے اپنی شاپنگ لے کر بیٹھی تھی تو ایک قیمتی موبائل دیکھ کر اس کی جانے کیوں سٹی گم ہو گئی تھی۔ وہ حیرت سے اس قیمتی موبائل کو دیکھتی ڈرتے ڈرتے اس کی اسکرین کو ٹچ کر گئی تھی اور ایک سیکنڈ میں اسکرین روشن ہوئی تھی اور شاہ زیب کا مغرور چہرہ، سحر کرنے والی آنکھیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ باقاعدہ لرزنے لگے تھے۔

''یہ تو وہی ہے جو مجھ سے مال میں ٹکرایا تھا۔ اس کا موبائل میرے سامان میں کیسے آ گیا۔۔۔؟'' وہ بے قابو ہوتے دل کے ساتھ لب کچلتی ہوئی سوچ رہی تھی۔

''یقیناً سامان سمیٹ کر دیتے ہوئے غلطی سے اس کا قیمتی موبائل بھی میرے سامان میں گر گیا ہوگا۔'' اس نے موبائل کی اسکرین سے نظر ہٹاتے ہوئے سوچا تھا اور قسمت اس کی سوچ پر مسکرا دی تھی کہ وہ پلاننگ کو اتفاق سمجھ رہی تھی۔ وہ جانے کب تک اس سب کو سوچتی کہ ہاتھ میں موجود موبائل بج اٹھا تھا۔ کسی انگلش گانے کی ٹیون لگی تھی۔ وہ لب کچل رہی تھی اور اٹھائے نہ اٹھائے کی الجھن میں تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ جس شخص کا موبائل ہے، اس تک موبائل پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ کال ریسیو کی جائے۔ اس نے اسکرین پر بلنک ہوتے ''شاہ کالنگ'' کو ایک نظر دیکھا تھا اور کال ریسیو کر لی۔ شاہ زیب اور کزئی نے بڑی شائستگی سے اپنا مسئلہ بتایا تھا اور اپنے موبائل کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا مگر وہ کہاں اس کی تفصیل سن رہی تھی۔ وہ تو شاہ زیب اور کزئی کے گھمبیر لہجے کے اتار چڑھاؤ میں اپنے دل کو ڈوبتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ اس کے خوبصورت لب ولہجہ میں کچھ یوں کھوئی کہ اس کی ساری سدھ بدھ کھو گئی تھی۔ چونکی تو وہ تب، جب وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کب اور کیسے اس کا موبائل اسے لوٹا سکتی ہے اور سوال ایسا تھا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے پہلے ٹکراؤ کا منظر لہرا گیا اور پتلیوں پر شاہ زیب کا ہینڈسم سراپا رقص کرنے لگا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ کوئی چھچھوری سی دل پھینک ٹائپ لڑکی تھی۔ وہ تو بہت عام سی سیدھی سادی لڑکی تھی جس کے دوستوں کی بھی فہرست کوئی بہت لمبی نہیں تھی۔ لے دے کر ایک ہی دوست تھی اور گھر کا ماحول بھی کافی اچھا، بلکہ یہ کہا جائے کہ کافی سخت تھا تو غلط نہ ہوگا کہ اس کے والد محمود خان جن کی وہ اکلوتی اولاد تھی وہ خواتین کی آزادی کے سخت مخالف تھے۔ اس نے بچپن سے یہی دیکھا تھا کہ گھر میں اس کے والد کا حکم چلتا تھا اور ماں کی حیثیت بڑی ثانوی سی ہے اور جب اس کی ماں کو ہی کہیں آنے

جانے کی اجازت نہ تھی تو اسے بھی سخت پابندیوں میں ہی رکھا گیا تھا اور اسے یہ گھٹا ہوا ماحول عجیب نہیں لگتا تھا کہ وہ اس ماحول کی عادی تھی۔ اسکول، کالج سے کبھی کسی دوست کے گھر نہیں گئی تھی۔ ماں کے علاوہ کبھی کسی دوست کے ساتھ یا اکیلے شاپنگ مال اور آؤٹنگ پر نہ گئی تھی۔ کسی پکنک، پارٹی کو اس نے کبھی جوائن نہ کیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا، بلکہ وہ ماں سے ضد بھی کرتی تھی، مگر ماں اسے ہمیشہ باتوں میں لگا کر اس کی ضد کو ختم کر دیتی تھیں۔ اسے اپنے پاپا سے کئی شکایات تھیں مگر وہ کبھی کہہ نہیں سکی تھی کہ اول تو اسے اپنے پاپا سے ڈر لگتا تھا اور دوم اسے اپنے پاپا سے اتنی محبت تھی کہ ان کی بے جا سختیوں پر بھی وہ ان کے خلاف ان سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ اسی طرح کئی سختیوں کے درمیان وہ پل کر جوان ہوئی تھی اور عمر کے سترہ سال سکون سے، ذہن و دل میں باغی خیالات کے جنم لینے سے قبل ہی گزر گئے تھے۔ تبدیلی تو وہاں سے شروع ہوئی جب اسے شاہ زیب اورکزئی سے پہلی نظر میں اپنائیت محسوس ہوئی اور اس سے بات کر کے اپنا دل غیر ہوتا محسوس ہوا اور جب وہ کالج کے گیٹ پر پہلی بار شاہ زیب اورکزئی سے ملی تو دل دیوار توڑ کر باہر کچھ یوں آیا کہ شاہ زیب اورکزئی کے قدموں پر نچھاور ہو گیا، محبت بن کر اس کی آنکھوں میں رہ گیا۔ وہ اپنی حالت پر خود متحیر تھی مگر شاہ زیب اورکزئی کی شخصیت ہرگز بھی نظر انداز کرنے والی نہ تھی اور وہ تو تھا ہی شکاری۔ جان بوجھ کر اس کے گرد جال بچھا رہا تھا اور وہ معصوم اس میں پور پور پھنس گئی تھی۔ اسے کالج گیٹ پر شاہ زیب سے ملنا بہت عجیب لگا تھا۔ وہ ہراساں بھی تھی مگر وہ ہر ڈر کے باوجود جانے کون سی غیر مرئی طاقت کے ذریعے اس سے مل کر اسے اس کا موبائل لوٹا گئی تھی اور موبائل کے ساتھ اپنا دل بھی اسے دے دیا تھا۔ اسے بعد میں حیرت بھی ہوئی تھی کہ اس نے باپ کے ڈر سے کہ اگر انہیں موبائل کا پتہ لگے گا تو وہ ہزار سوال کریں گے اس پر غصہ ہوں گے اور وہ باپ کے غصہ سے بچنے کو بنا سوچے سمجھے ایک انتہائی قدم اٹھا گئی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ تک نہ آیا تھا کہ اگر اس کے یوں ایک اجنبی سے ملنے کا اس کے باپ کو پتہ لگا تو اس کے پاپا اس کا کیا حشر کریں گے۔ وہ تو پہلی ہی نظر میں جو جذبات شاہ زیب کے لئے محسوس کرنے لگی تھی، اس نے اتنی طاقت دی تھی کہ وہ اپنی زندگی کا پہلا بولڈ اسٹیپ اٹھا گئی تھی جو آخری ہرگز ثابت نہیں ہوا تھا۔ شاہ زیب نے اپنی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اس کے گرد محبت کا جال بن دیا تھا۔ اپنا موبائل اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس کا مشکور ہوا تھا۔ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوا تھا کہ فی زمانہ کون کسی کے لئے اتنا تردد کرتا ہے اور بھی بہت کچھ کہا تھا مگر وہ تو اس کی طرف نگاہ تک نہیں اٹھا پائی تھی اور شاہ زیب جس نے پلاننگ تو کر لی تھی مگر کامیابی کی امید نہ تھی، مگر اپنے سامنے سرخ چہرے والی بے حد کم عمر لڑکی کو دیکھ کر اپنی پلاننگ کو ابھی سے ہی کامیاب تصور کرنے لگا تھا اور اس سوچ کے آتے ہی وہ مسکرا دیا تھا اور اس نے نہایت شائستگی سے عریم کا نمبر مانگا تھا۔ وہ نظر اٹھا کر اس خوبرو انسان کو دیکھنے لگی تھی جو اسی کو دیکھ رہا تھا وہ اس کو منع کر دینا چاہتی تھی، نمبر دینے سے معذرت کرنا چاہتی تھی مگر جانے کیسے اس کے لبوں سے پھسل گیا تھا۔

''مجھے آپ کا نمبر یاد ہے۔ میں آپ کو اپنے نمبر سے بیل دے دیتی ہوں'' شاہ زیب نے ترچھی نظر کر کے اسے دیکھا تھا جواب لب کچل رہی تھی اور وہ مسکرا دیا تھا کہ اس کے انداز صاف کہہ رہے تھے کہ وہ، وہ کہہ چکی ہے جو کہنا نہیں تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے عریم

سے کہا تھا کہ جو نمبر وہ یاد کر چکی ہے وہ اس کے یوز میں بہت کم رہتا ہے اور اس کا جو نمبر ہر وقت ایکٹو رہتا ہے وہ نمبر اس کے موبائل میں تھا جس پر وہ اس سے بات کرنے کے بعد آج اس کے سامنے موجود تھی۔شاہ زیب نے تفصیل سے آگاہ کرنے کے بعد اس سے اس کا موبائل فون طلب کیا تھا جو اس نے ہینڈ بیگ سے نکال کر بڑی خاموشی سے شاہ زیب کی طرف بڑھا دیا تھا جس پر اس نے اپنے نمبر پر بیل دے کر اپنا نمبر شاہ کے نام سے سیو کر دیا تھا۔وہ موبائل اس کے ہاتھ سے واپس لیتی آگے بڑھی تھی کہ شاہ زیب کی آواز پر اسے رک جانا پڑا تھا۔

''آپ کی شارپ میموری کے باوجود میں نے اپنا نمبر اپنے نام کے ساتھ سیو کر دیا ہے۔نمبر یاد نہ بھی ہوا تو امید ہے آپ میرا نام نہیں بھولیں گی۔'' وہ اس کے ہلکے پھلکے مذاق پر جھینپ گئی تھی اور کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی تھی اس لئے محض نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور اس کے ترنت مسکرانے پر وہ کنفیوز ہوتی نہ صرف نظر جھکا گئی تھی بلکہ وہاں ٹھہری بھی نہ تھی اور اس کے بعد کالز اور ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا تھا۔وہ تقریباً اسے روز فون کرتا تھا۔مارننگ، گڈ آفٹر نون اور گڈ نائٹ کے میسج الگ ہوتے تھے۔وہ دھیرے دھیرے ان کالز اور میسجز کی عادی ہو گئی تھی اور یہ محسوس نہ کر پائی تھی کہ دھیرے دھیرے شاہ زیب کے ٹیکسٹ کم ہونے لگے ہیں اور خود اس کے میسجز کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔وہ اس کو فوراً رپلائی کرتا تھا اس لئے وہ اتنی بڑی تبدیلی محسوس نہیں کر پائی تھی کہ کال اور میسجز اب ہمیشہ اس کی طرف سے جاتے تھے اور وہ ایک روٹین کی طرح رپلائی کرتا تھا۔اسے تبدیلی تو جب محسوس ہوئی جب رپلائی میں تاخیر کا سلسلہ شروع ہوا۔اس کے ہر شکوے پر اس کا مصروفیت کا رونا اور جہاں وہ ناراض ہوتی تو اس کو یوں منانا کہ وہ ہر شکوہ بھول جاتی تھی۔وہ چونکہ گھر میں ہی رہتی تھی اس لئے اسے لوگوں کی اتنی پرکھ نہ تھی۔وہ شاہ زیب کی چالبازیوں کو سمجھ ہی نہ سکی تھی اور اس کے ہاتھوں بے وقوف بن رہی تھی جو دھیرے دھیرے اس کو اپنی محبت کے جال میں پھنسانے کے بعد اسے ذہنی طور پر بھی کافی حد تک اپنے ماتحت کر چکا تھا۔وہ جب کال کرے وہ بات کرے اور " کالج سے لیٹ نہ ہو جاؤں " کے عذر کو اس نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی۔وہ دھیرے دھیرے اس پر اپنے غصہ کو بھی یوں ظاہر کرتا رہا تھا کہ وہ شاہ زیب کے آگے چوں بھی نہیں کر پاتی تھی کہ وہ غصہ میں کبھی ہائپر ہو جاتا تھا اور اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول جاتے تھے اور کبھی ناراض ہو جاتا تو ہفتوں تک اس کے کسی ٹیکسٹ کا آنسر نہیں کرتا تھا اور اس کی جان پر بن آتی تھی۔غرض یہ کہ شاہ زیب اسے ہر طرح سے اپنے اختیار میں کر چکا تھا اور پلاننگ کے تحت وہ اس سے ملتا رہا اور جہاں اس کی شادی کا پتہ چلا تھا فوراً ہی پلاننگ کا ڈراپ سین کر دیا۔اس نے عریم سے راہ ورسم جس پلاننگ کے ساتھ بڑھائے تھے وہ اس میں عریم کی معصومیت کے سبب تبدیلی کر گیا تھا کہ جو پلاننگ اس نے کی تھی اس پر اس کا دل و دماغ بھی راضی نہ تھے۔اس لئے اس نے عریم سے شادی کی تھی اور نکاح کے بعد اس کے تمام تر حقوق حاصل کر کے اس کے وجود پر اپنے حق کی بساط بچھائی تھی۔اس کی پلاننگ بس یہیں تک کی تھی۔اس نے جان کر عریم کو نکاح نامے کی کاپی نہیں دی تھی اور اس احمق نے شاہ زیب کی بات کا یقین کر کے مطالبہ تک نہ کیا تھا۔نکاح کے بعد اپنی مصروفیت کا رونا رو کر اس نے رابطے کم کر دیئے تھے اور وہ جو اس کی توجہ کی عادی تھی، اس کی محبت میں اپنا سب کچھ اس پر نثار کر چکی تھی، اس کے بدلتے رویے پر اندر ہی اندر گھلنے لگی تھی۔اس کے شکوے

بھی تو شاہ زیب پر اثر نہیں کر رہے تھے۔وہ الٹا اس پر غصہ ہونے لگتا تھا اور وہ چپ ہو جاتی تھی مگر اب جس مشکل میں گرفتار ہوئی تھی وہ چپ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔اسے شاہ زیب اورکزئی کا صرف نام معلوم تھا اس کے علاوہ تو اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا وہ ہمیشہ اسے باتوں میں لگا کر تفصیل سے اس کا ذہن ہٹا دیتا تھا اور وہ اب پچھتا رہی تھی کہ اس نے کبھی شاہ زیب سے اس کے بارے میں کیوں نہیں پوچھا تھا کہ اس کے دونوں نمبر آف آ رہے تھے۔اسے تو شاہ زیب کے آفس کا نمبر نہیں پتہ تھا کہ اسے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ شاہ زیب پر اندھا اعتماد کرتی تھی اور اب اسے لگ رہا تھا کہ اس کی بینائی ہی کہیں کھو گئی ہے۔

''کیا ماما ٹھیک کہہ رہی ہیں،شاہ نے مجھے دھوکا دیا ہے۔۔۔''اس نے سسکتے ہوئے سوچا تھا مگر دل فوراً ہی انکاری ہو گیا تھا۔

''نہیں،میرے شاہ ایسے نہیں ہیں۔وہ یقیناً کسی مشکل میں ہیں ورنہ وہ اتنی بڑی خبر سننے کے بعد ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ مجھ سے رابطہ نہ کریں۔''

اس نے اپنی پہلی سوچ کی خود ہی تردید کر ڈالی تھی۔

''شاہ نے تو اس دن میری کسی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔میں ہی بولتی رہی۔۔۔باپ بننے کی خبر سن کر بھی وہ چپ تھے۔۔۔نکاح نامہ لے کر آ جانے کا سن کر بھی کچھ نہیں بولے۔۔۔ایسا کیوں کیا شاہ نے۔۔۔''اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔وہ اپنی بات کی خود ہی تردید کرتی تھی۔کبھی مثبت تو کبھی منفی سوچ رہی تھی جیسے جیسے وہ شاہ زیب کے پچھلے رویے کو دہرا رہی تھی اسے ماما کی ہر بات سچ لگنے لگی تھی اور اس کا دل بیٹھنے لگا۔اسے خود پر غصہ آنے لگا۔اس نے جو پہلے سوچا نہ تھا اب اس پر ملال ہو رہا تھا کہ کم از کم اسے شاہ زیب کے بارے میں تمام تر تفصیلات سے تو آگاہی حاصل کر لینی چاہیئے تھی۔تب ہی اس کے ذہن میں کچھ کلک ہوا تھا۔وہ آنسو رگڑتی لاؤنج میں آئی اور ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھا کر اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔اس نے ''اورکزئی انٹرپرائزز'' کا نمبر ڈائل کیا تھا اور کال ریسیو ہوتے ہی شاہ زیب اورکزئی سے بات کروانے کے لئے کہا تھا۔جواباً جو اسے بتایا گیا تھا وہ سن کر موبائل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا اور وہ بری طرح رونے لگی تھی اور پھر روتے روتے یکدم ہی ہنسنے لگی۔کوئی اسے یوں روتے سے ہنستا دیکھتا تو اسے پاگل سمجھتا مگر وہ پاگل نہیں ہوئی تھی کہ وہ تو اس بات پر مطمئن تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ اس کی ماما غلط تھیں۔اس کی سوچ بھٹک رہی تھی جبکہ اس کا شاہ ایسا نہیں تھا۔

''ماما،میں کہتی تھی نا،شاہ ایسے نہیں ہیں۔۔۔وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے تب ہی انہوں نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔''وہ ایک بوجھ سرک جانے پر خوش تھی۔یہ خبر تکلیف دہ تھی کہ شاہ زیب ہاسپٹلائزڈ ہے مگر یہ بات اس کی سوچوں کو منفی ہونے سے بچا گئی تھی۔وہ پھر سے مثبت سوچ رہی تھی اسے پھر شاہ زیب سے اچھا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔وہ شاہ زیب کے مکروہ چہرے سے انجان ،اس کی سازشوں سے بے خبر اس کی صحت یابی کے لئے دعا گو تھی۔اسے پورا یقین تھا کہ وہ چند دنوں میں اس سے رابطہ کرے گا مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ چند دن تو کیا چند ماہ تک خود دوسروں کا محتاج ہے۔وہ خود اپنے لئے کچھ کرنے سے قاصر ہے اس کے لئے کیا کرے گا جبکہ اس

کے لئے ایک ایک لمحہ قیامت خیز ثابت ہونے والا تھا اور وہ اس قیامت سے انجان اپنا دل شاہ زیب کی طرف سے صاف کر گئی تھی اور اس کے لئے دعا کرتی اس کا انتظار کرنے لگی تھی۔ اس بات سے بالاتر ہو کر کہ کچھ انتظار رائیگاں جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

''خدا کے لئے آبی چپ کر جاؤ۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔''

آبدار کو جب سے تایا جان کے ہاسپٹل میں ہونے کی خبر ملی تھی اس نے رو رو کر حشر کیا ہوا تھا اور ایک ہی گردان کئے جا رہی تھی کہ اسے بھی ہاسپٹل جانا ہے اور اسے سمجھانے میں ناکام ہو کر ابسام حیدر نے تمام صورتحال سے آئیکت اور کزئی کو آگاہ کر دیا تھا۔ وہ جو پہلے ہی باپ کے ہاسپٹل میں ہونے کے باعث پریشان تھا، شاہ زیب کے ایکسیڈنٹ نے اس کی پریشانی کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ وہ آبدار کی جانب سے بھی پریشان ہو گیا تھا اور اس وقت وہ ابسام حیدر کے گھر جا کر آبدار سے مل کر اسے سمجھا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے اس نے لامحالہ اسے کال کی تھی مگر شاہ زیب کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور اپنے بابا کی صحت کی طرف سے اسے تسلی دینی چاہی تھی مگر وہ کچھ سننے سمجھنے کو تیار ہی کب تھی اور وہ اس کی ضد سے تنگ آ کر جھنجلا کر بولا تھا اور آبدار کے رونے میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''یہ سب آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ میں نے آپ کو کتنا سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر آپ پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔ دیکھ لیا نا آپ نے کہ برے کا انجام کبھی بھی اچھا نہیں ہوتا۔۔۔ آپ مانیں نہ مانیں تایا جان کی اس حالت کے ذمہ دار میں اور آپ ہیں۔'' وہ روتے ہوئے بولتی چلی گئی تھی اور آئیکت نے لب بھینچ لئے تھے۔

''میں نے جو کیا صرف تمہارے لئے، تمہاری خوشی کے لیے کیا آبی۔۔۔ اور تم ہی مجھے ہر بات کا الزام دے رہی ہو۔۔۔ اگر میں نے تمہیں تحفظ دینا چاہا تو کون سا غلط کیا، میری محبت کو میرا جرم نہ بناؤ۔'' وہ کافی دیر کی خاموشی کے بعد قدرے بے بس لہجے میں بولتا آبدار کو شرمندہ کر گیا تھا۔

''آئی ایم سوری آئیکت لیکن مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ میں خود کو بہت بے بس پاتی ہوں۔ یہاں اجنبیوں کے درمیان پڑی ہوں اور وہاں میرے اپنے میری وجہ سے مشکل میں ہیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے آئیکت، مجھے واپس لے جائیں۔۔۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی اور اس کا یوں رونا آئیکت پر گراں گزر رہا تھا جبکہ کچھ فاصلہ پر ٹھہرا ابسام حیدر کچھ حیرانگی سے تو کچھ پریشانی سے آبدار کو روتے دیکھ رہا تھا کہ اس نے اپنے موبائل پر آئیکت کا نمبر ملا کر اسے دیا تھا۔ وہ لاؤنج سے نکلنے کو تھا کہ آبدار کی بات پر اس کے قدم رک گئے تھے اور یکدم اس کے اندر تجسس کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہو گیا تھا۔ وہ کچھ فاصلے پر ٹھہرا آبدار کی گفتگو سن رہا تھا جو وہ آئیکت سے کر رہی تھی اور وہ باتوں کو سن کر کچھ الجھ گیا تھا کہ جو داستان بیان کر رہی تھی وہ تو ابسام کے علم میں ہی نہ تھی کہ اسے آئیکت نے تو کچھ اور ہی داستان سنائی ہوئی تھی۔

''کیوں پاگلوں جیسی باتیں کر رہی ہو آپی، یہاں ہم سب پہلے ہی بہت مشکل میں گھرے ہوئے ہیں۔تم ایک دم گھر آ ؤ گی تو مسئلے بڑھ جائیں گے۔چاچو جان تمہیں جان سے مار دیں گے۔'' وہ اس کے گھر آنے کی ضد پر غصہ کے ساتھ بے بسی بھی محسوس کرتا اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اچھا ہے نا، بابا جان مجھے مار دیں۔روز روز کے مرنے سے تو بہتر ہے میں ایک ہی بار جان سے چلی جاؤں۔''

اس کی سسکیوں میں اضافہ ہو گیا تھا اور آئیکت کی برداشت ختم ہونے لگی تھی اور ابسام وہ جانے کیوں اپنے دل کو گداز ہوتا محسوس کر رہا تھا۔دل کر رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اس کے آنسو اپنی پوروں پر چن لے مگر وہ لب اور مٹھیاں بھینچے کھڑا تھا۔

''بکواس بند کرو آپی۔ یہاں میں اتنا پریشان ہوں، میری ہمت بندھانے کی بجائے تمہیں اپنی پڑی ہے۔تمہارے رونے ہی پورے نہیں ہو رہے۔۔۔'' وہ ضبط کرتے بھی چیخ اٹھا تھا اور وہ بے یقینی کے باعث رونا ہی بھول گئی تھی کہ آئیکت نے اس سے کب اس انداز میں بات کی تھی۔اسے یکدم احساس ہوا تھا کہ وہ آئیکت کی پریشانی بانٹنے کی بجائے اس کی پریشانی کو بڑھا رہی تھی۔

''آئی ایم سوری آئیکت، لیکن مجھے سچ میں یہاں نہیں رہنا، مجھے گھر لے جائیں، میں سب سے ہاتھ جوڑ کر پاؤں پکڑ کر معافی مانگ لوں گی۔'' وہ بلکتے ہوئے بولی تھی اور آئیکت نے اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ پہلے جو ذرا سی نفرت تھی وہ اب پہاڑ بن چکی ہے۔اور کزئی پیلس میں اس کے مکینوں کے دل میں ذرا برابر آبدار کے لئے جگہ نہیں ہے۔وہ اسے معاف نہیں کریں گے۔آئیکت نے ایک گہری سانس کھینچی تھی اور اسے نرمی سے سمجھا کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔وہ موبائل بے دلی سے صوفے پر ڈالتی اپنے آنسو صاف کرنے لگی تھی۔ابسام نے ایک نظر اس پر ڈالی تھی اور آگے یہ سوچتا ہوا بڑھ گیا تھا کہ وہ کیسے بھی کر کے اصل بات تک پہنچنا تھا۔وہ یہ کھوج لگانا چاہتا تھا کہ اگر بات وہی تھی کہ آبدار کے ذریعے کچھ کچھ اس کے علم میں آئی تھی تو آئیکت نے اس سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔وہ الجھ گیا تھا اور اب اسے جلد سے جلد اپنی الجھن کا سراغ لگانا تھا۔

☆...☆...☆

عبیر عباسی گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ عقیل احمد کی فیملی کی جانب سے ہو جانے والے انکار پر کس طرح ری ایکٹ کرے کہ وہ تو اپنی تمام تر سدھ بدھ ہی کھو بیٹھا تھا۔

''تم پریشان نہ ہو عبیر، میں عقیل سے بات کروں گا۔''

وہ بیٹے کی غیر معمولی خاموشی محسوس کر کے نرمی سے بولے تھے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب بات کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

''مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ اقرار کے بعد انکار کیوں کر دیا گیا؟'' وہ بری طرح الجھ کر باپ کو دیکھ رہا تھا۔وہ مومل پر بھی شک نہیں کر سکتا تھا کہ یہ تمام کھڑاک اس کا پھیلایا ہوا ہے۔اس سے بات کر کے تو اسے خوب اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کم از کم شادی سے انکار نہیں کر سکتی اور وہ

اس کی اس کمزوری سے نہ چاہتے ہوئے بھی فائدہ اٹھا کر مومل کو اپنی زندگی میں شامل کرنے جا رہا تھا کہ اس کے ارادے نیک تھے، وہ اپنی محبت میں سچا تھا۔اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ شادی کے بعد مومل کا دل اپنی محبت سے جیت لے گا مگر اس کے ہر ارادے پر گویا پانی پھر گیا تھا۔

کبیر عباسی نے ایک نظر بیٹے کے اداس چہرے کو دیکھا تھا اور انکار کی وجہ سے آگاہ کر دیا تھا۔

''انکار عقیل کی طرف سے ہوا ہے اسے لگتا ہے کہ پاکستان جا کر سیٹل ہونے میں تمہیں وقت لگے گا اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کی بیٹی سفر کرے۔۔۔" وہ تفصیل سن کر لب بھینچ گیا تھا کہ اس کے تو وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ انکار کے پیچھے یہ وجہ ہو گی مگر وہ یہ بات اچھے سے سمجھ گیا تھا کہ اس سب کے پیچھے مومل ہی تھی۔

''شکیل انکل کیا کہتے ہیں۔۔۔؟''

''شکیل کو پاکستان میں رہائش اختیار کر لینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اس نے تو خود اپنی اکلوتی بیٹی کا رشتہ اپنے بھانجے سے کیا جو پاکستان میں مقیم ہے مگر عقیل کو اعتراض ہے اور مومل نے بھی صاف کہہ دیا ہے کہ وہ پاکستان نہیں جانا چاہتی اسی لئے شکیل نے رشتہ سے معذرت کر لی ہے۔'' کبیر عباسی نے بیٹے کو اندھیرے میں نہیں رکھا تھا جو تفصیل ان تک پہنچی تھی وہ من وعن بیٹے کے گوش گزار کر دی تھی۔

''مومل، یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔تم نے میرے جذبات کی توہین کی، میری محبت کی قدر نہ کی اور اب ایک بے بنیاد بات کو وجہ بنا کر رشتہ سے انکار کر دیا ہے۔'' وہ تفصیل سے آگاہ ہونے کے بعد قدرے غصہ اور ناراضگی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مومل کو دل ہی دل میں مخاطب کرتے ہوئے بولا تھا کہ باپ کی بات پر چونک کر ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔تمہاری شادی مومل سے ہی ہو گی۔'' وہ نافہم انداز میں باپ کے پرسکون چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''ہم پاکستان نہیں جائیں گے۔'' وہ باپ کی بات پر ششدر رہ گیا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہی جو تم نے سنا، شادی سے انکار کی وجہ ہی ختم ہو جائے گی تو شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔'' ان کے سکون میں ذرا برابر کمی نہ آئی تھی جبکہ عبیر بے سکون ہو چکا تھا۔

''میرے لئے آپ کچھ بھی کینسل نہ کریں۔میرے لئے آپ سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے، اس لئے ہم طے کردہ پروگرام کے مطابق پاکستان جائیں گے۔'' وہ خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولا تھا۔

''میں جس وقت ڈنمارک آیا تھا سب کو روتا چھوڑ آیا تھا، میرا یہاں آنا کتنے ہی لوگوں کی خوشیاں نگل گیا۔کتنے ہی ارمان بکھر گئے اور میں ماضی میں کی غلطی دہرانا نہیں چاہتا۔میں پاکستان سے آیا تو میرے ماں باپ دکھی ہو گئے۔۔۔اور اب میں پاکستان جاؤں گا تو میرے

بیٹے کی خوشیاں بکھر جائیں گی۔۔۔میں ماضی میں خود غرض بن گیا تھا عبیر لیکن اب نہیں کہ میری وجہ سے میرے ماں باپ تو سکون کی موت تک نہ مر سکے کم از کم میری وجہ سے تم پر زندگی تنگ نہ ہو گی۔ہم یہیں ڈنمارک میں رہیں گے اور مومل ہی میری بہو بنے گی۔''وہ بہت دکھی نظر آنے لگے تھے مگر ان کا انداز دوٹوک تھا وہ جو فیصلہ لے چکے تھے اس میں گویا کوئی لچک نہ رکھی تھی۔

''ہم پاکستان جا رہے ہیں۔مومل میرے نصیب میں ہو گی تو ہم پاکستان میں اپنی زندگی شروع کریں گے اور مومل میرے نصیب میں ہی نہیں ہو گی کہ تو آپ کی قربانی لاحاصل رہے گی اس لئے آپ پاکستان جانے کی تیاری کریں اور میرے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو صرف دعا کریں کہ مومل میرا نصیب بن جائے۔''وہ باپ کے فیصلہ کی تردید کرتا دھیمے لہجے میں دعا کی درخواست کر گیا تھا اور وہ آگے سے کچھ نہیں بولے تھے۔زندگی کے اس موڑ پر وہ بالکل بے بس ہو گئے تھے۔انہیں اپنے بوڑھے ماں باپ کے چہرے یاد آئے تھے کہ جب انہوں نے پاکستان چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا تو کیسے دکھ کا منظر پیش کر رہے تھے۔اکلوتے بیٹے کی جدائی کے خیال نے ہی انہیں آزردہ کر دیا تھا۔آج بیٹے کو اداس دیکھا تو والدین کی بے بسی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔اولاد کے سکھ کے خیال اور دکھ کے منظر نے انہیں والدین کے احساسات سمجھا دیئے تھے مگر بہت دیر ہو چکی تھی کہ اپنے بیٹے کے لوٹ آنے کے منتظر،اپنے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہونے والے ان کے والدین تو منوں مٹی تلے جا سوئے تھے اور وقت گزرنے کے بعد جاگنے والا احساس کسی کام کا نہیں ہوتا کہ زندگی کے سکھ،دکھ زندگی تک ہوتے ہیں۔یہاں موت آئی اور سکھ،دکھ کا ناتا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا لیکن انہوں نے بھی سوچ لیا تھا کہ وہ پھر عقیل سے بات کریں گے۔یہاں تک کہ مومل سے بھی بات کر کے اسے سمجھائیں گے۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے کو کوئی روگ ملے۔جس درد دل کے ساتھ انہوں نے زندگی بسر کی تھی وہ اسی درد دل میں بیٹے کو ہرگز بھی مبتلا نہیں ہونے دیں گے۔انہوں نے سوچ لیا تھا کہ تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہرائے گی۔جیسے وہ کسی کے خواب سے نکل کر دیار غیر میں آ بسے تھے ان کا بیٹا ضد وانا میں محبت چھوڑ کر پاکستان نہیں جائے گا۔وہ اس کو ایسا کرنے نہیں دیں گے مگر یہی امید ان کے والدین کو بھی تھی اور اس لڑکی کو بھی تھی جو ان کو دیکھ کر جیتی تھی مگر انہوں نے سب کی امیدیں توڑ دی تھیں تو کیا ان کا بیٹا بھی ان کے نقش قدم پر چلنے والا تھا۔جیسے وہ نارسائی و بے وفائی کی آگ میں جلتے محبت کو روتا چھوڑ آئے تھے ،مومل کے انکار کو انا اور ضد کا مسئلہ بنا کر کیا ان کا بیٹا بھی محبت کو خیر باد کہہ کر پاکستان میں جا بسے گا۔یہ سوال ایسا تھا کہ ان کے دن کا چین اور رات کا آرام کہیں کھو گیا تھا۔وہ سکون کو ترس گئے تھے۔

☆......☆......☆

''تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے نوائم۔۔۔مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہی ہو۔''مومل جو کچھ دن سے اس کی بے رخی محسوس کر رہی تھی اس کی برداشت جواب دے گئی اور وہ قدرے ناراضگی سے سوال کر رہی تھی۔

''ضروری تو نہیں ہے جب تمہارا بات کا موڈ ہو تب میرا بھی موڈ ہو اور میں تم سے بات کرنے لگوں۔''نوائم نے ناول سائیڈ پر رکھتے

ہوئے سرد لہجے میں کہا تھا جبکہ مومل کو کہاں ایسے جواب کی امید تھی۔ وہ حیرت سے بت بن کر رہ گئی تھی۔

''لوگوں کو اپنے موڈ کے تابع چلانے کی کوشش ترک کر دو مومل احمد کہ ہر انسان کا اپنا مزاج ہوتا ہے اور میں ہر گز بھی تمہارے موڈ کی تابع نہیں ہوں۔'' نوائم اس کی حیرت محسوس کرنے کے باوجود تلخی سے بولتی چلی گئی اور مومل میں اتنی برداشت نہیں تھی کہ وہ نوائم کی اتنی تلخ باتیں سن سکتی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''تم پر عبیر سے ہمدردی کا بھوت کچھ زیادہ ہی سوار ہو گیا ہے مگر یہ مت بھولو کہ میں اپنی پسند سے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کا پورا حق رکھتی ہوں اور میں عبیر کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتی۔ بہتر ہو گا کہ تم عبیر کے لئے ہماری دوستی خراب نہ کرو۔'' وہ نوائم کو تیکھے چتونوں سے گھورتے ہوئے تلخی لوٹا گئی تھی۔

''میں ایسا کچھ کر بھی نہیں رہی۔ بہتر ہو گا کہ تم فضول میں اپنا دماغ مت چلاؤ۔'' نوائم قدرے غصہ سے بولی تھی۔

''تم ایسا کر رہی ہو نوائم مگر یہ یاد رکھنا میں نے اختیار رکھتے ہوئے بھی صرف پاپا کے لئے، ان کا مان رکھنے کے لئے عبیر سے شادی سے انکار نہیں کیا تھا۔''

''انکار نہیں کیا تھا مگر جیسے ہی موقع ملا تم نے اپنا اختیار استعمال کر لیا۔ پہلے تم سے تمہاری رائے پوچھی ہی نہیں گئی تھی صرف اپنی پسند اور فیصلہ سے آگاہ کیا گیا تھا۔۔۔ جیسے ہی تمہاری رائے پوچھی گئی تم نے اختلاف میں رائے دے دی۔'' وہ مومل کی بات درمیان سے ہی منقطع کرتے ہوئے سخت ترشی سے بولی تھی۔

''میں نے اختلاف میں رائے صرف اس لئے دی کہ میں سچ میں پاکستان جانا نہیں چاہتی۔ اس بار میرے انکار کی وجہ عبیر نہیں ہے۔ مجھے وہ لاکھ ناپسند ہے مگر میں نے اس کی وجہ سے انکار نہیں کیا۔ آخر کسی ایسے انسان کا پرپوزل ہوتا، جو مجھے پسند ہوتا تب بھی میں انکار کر دیتی۔ اپنے دماغ میں بٹھا لو انکار کی وجہ عبیر عباسی نہیں پاکستان شفٹ ہو جانے کی شرط ہے اور میں اس پسماندہ ملک میں کبھی بھی نہیں رہنا چاہتی جہاں چند ہفتوں میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔'' مومل اپنے صاف گو انداز میں نوائم کی غلط فہمی کا پردہ چاک کر گئی تھی وہ آگے کچھ بول ہی نہیں پائی تھی کہ وہ جب پاکستان گئی تھی واپسی پر اس کے پاس ہزار باتیں تھیں جس میں ایک بھی تعریفی کلمہ نہ تھا جو اس نے ملک پاکستان کی شان میں ادا کیا ہو۔

''پاکستان اتنا برا بھی ملک نہیں ہے مومل۔۔۔ پلیز شادی کے لئے ہاں کر دو، عبیر تم سے بہت محبت کرتا ہے۔'' اسے سمجھ نہیں آیا تھا کہ کیسے اس کٹھور دل مومل کو قائل کرے۔

''تم ایک ہفتہ بعد جا تو رہی ہو پاکستان۔ خود لگ جائے گا پتہ کہ کتنا اچھا ملک ہے اور جہاں تک تمہارے لاڈلے بھائی کی بات ہے، وہ مجھے نہیں پسند۔۔۔ مجھے اس سے شادی کرنی ہی نہیں ہے۔ میں انکار کا حوصلہ نہیں کر پائی تھی۔ میں تو کبیر انکل کی شکر گزار ہوں کہ انہوں

نے از خود میرا مسئلہ حل کر دیا اور دادو نے میری مرضی پوچھی تو میں نے فیصلہ کا اختیار انہیں اور پاپا کو دے کر اپنی مرضی بھی بتا دی۔'' وہ اب قدرے سکون سے بولی تھی کہ وہ تو اب تک کتنی ہی بار دل ہی دل میں کبیر عباسی کا شکریہ ادا کرتی انہیں دعائیں دے گئی تھی کہ نہ وہ پاکستان جانے کا فیصلہ کرتے نہ ہی شادی سے انکار ہوتا۔ عقیل احمد کی رائے جاننے کے بعد ہی اس نے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ وہ پاکستان نہیں جانا چاہتی اور عقیل احمد جو خود بیٹی کو پاکستان نہیں بھیجنا چاہتے تھے۔ بیٹی کے انکار نے ان کے فیصلہ کو اور مضبوط کر دیا تھا۔ نوائم نے موول کے بے حد حسین چہرے کو دیکھا تھا جس پر اطمینان کی لہریں سفر کر رہی تھیں۔ نوائم کا دل درد سے بھر گیا تھا۔ اسے موول بہت سنگدل لگی اور عبیر سے کچھ اور ہمدردی ہو گئی تھی۔

''مجھے عبیر پر بے حد ترس آ رہا ہے کہ اس نے تم جیسی سنگدل لڑکی سے محبت کی۔۔۔ اور مجھے ڈر لگ رہا ہے موول کہ تم جو اتنی سنگدلی سے ایک دل کو توڑ رہی ہو، کہیں خسارہ صرف عبیر کے نہیں تمہارے حصے میں بھی نہ آ جائیں کہ محبت کو ٹھکرانے والے، سچے پرخلوص محبت سے سجے دل کو توڑنے والے مجھے تو نہیں لگتا کہ خوش رہتے ہوں گے۔۔۔ مجھے اس وقت سے ڈر محسوس ہو رہا ہے جب تمہیں پچھتاوے گھیر لیں گے۔۔۔ میری دعا تو یہی ہے کہ ایسا نہ ہو اور میں یہ بھی دعا کروں گی کہ تم محبت کو سمجھنے کے قابل ہو جاؤ۔'' نوائم کی آنکھوں میں نمی چھلکنے لگی تھی۔

''تم مجھے دعا دے رہی کہ بددعا، تمہارے لئے میری مرضی، میری خوشی کیا بالکل بھی معنی نہیں رکھتی۔'' وہ نوائم کو ناراضگی سے دیکھ رہی تھی۔

''رکھتی ہے تمہاری خوشی معنی جب ہی تو میں تمہاری فکر کرتی، تمہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں لیکن ہمیشہ ناکام ہو جاتی ہوں۔'' نوائم کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے اور موول نے لب بھینچ لئے تھے۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ تم روز روز مجھے ایک اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتیں ہماری دوستی میں بگاڑ پیدا کر رہی ہو جو میں سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔۔۔ جذبات محسوسات کا نام ہیں۔۔۔ اور جذبوں کو ریاضی کے اصول اور فارمولے کے تحت نہیں سمجھا جا سکتا۔'' وہ نوائم کو روتا دیکھ کر قدرے دھیمی پڑ گئی تھی اور یوں بولی تھی کہ نوائم کے پاس آگے سے کچھ کہنے کا جواز ہی نہیں بچا تھا کیونکہ موول نے غلط نہیں کہا تھا۔ اگر عبیر اس کے لئے محبت کے اور وہ خود عبیر کے لئے ناپسندیدگی کے جذبات رکھتی تھی تو ان جذبات کو سمجھانے سے بدلا تو نہیں جا سکتا تھا۔ نوائم نے بس ایک نظر موول کو دیکھا تھا اور دل میں ٹھان لی تھی کہ وہ آئندہ اس موضوع پر موول سے بات نہیں کرے گی مگر اب دیکھنا یہ تھا کہ آخر یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا تھا۔

☆......☆......☆

نتاشہ محمود کی تو رات کی نیند، دن کا چین، بھوک پیاس سب اڑ گئے تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کریں تو کیا کریں۔ بات ایسی تھی ہی نہیں کہ وہ دنیا سے چھپا لیتیں۔۔۔ اور دنیا سے پہلے تو انہوں نے اپنے شوہر کا سامنا کرنا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ بیٹی نے جو کارنامہ سر انجام دیا تھا اس کا شوہر کو بتائیں تو کیسے بتائیں۔

''عریم! تم نے مجھے کس منجدھار میں پھنسا دیا ہے۔۔۔ گرم دودھ نہ اگلنے کا ہے نہ نگلنے کا۔۔۔ میں کروں تو کیا کروں میرے اللہ۔۔۔'' وہ سر ہاتھوں میں گرائے مضطرب سی بیٹھی تھیں۔ آنسو بڑی خاموشی سے ان کی تکلیف کے گواہ بن کر رخسار بھگوتے جا رہے تھے۔ بیٹی کا کارنامہ علم میں آئے آج پورا ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ محمود خان واپس کراچی آچکے تھے اور عریم نے جو کچھ انہیں بتایا تھا وہ ہرگز بھی شوہر کو بتانے کے لائق نہیں تھا۔ وہ شوہر کے غصہ سے بھی واقف تھیں۔ وہ جو بات بے بات غصہ کرتے تھے، اتنی بڑی بات پر چپ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ اتنی گہری سوچ میں تھیں کہ محمود خان کی آمد سے یکسر انجان رہی تھیں اور وہ بیوی کو روتے دیکھ کر پریشانی سے محسوس کرنے لگے اور اس کا اظہار سوال بن کر ہوا تھا۔

''کیا بات ہے نتاشہ۔ میں کچھ دن سے محسوس کر رہا ہوں جیسے تم بہت پریشان ہو۔ کیا بات تمہیں ڈسٹرب کر رہی ہے۔'' وہ چونک کر شوہر کو دیکھنے لگی تھیں۔

''نہیں محمود، پریشانی کوئی نہیں ہے۔ آج کل طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔'' وہ آنسو گڑتے ہوئے بولی تھیں۔

''ہمارا ساتھ کئی برس پرانا ہے نتاشہ، اور میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ طبیعت کا بہانہ کر کے مجھے ٹال تو سکتی ہو لیکن اپنی پریشانی بانٹ کر اپنی پریشانی کو دور نہیں کر سکتیں۔ بہت خوب۔'' وہ اپنے مخصوص سرد انداز میں کہتے انہیں گڑبڑانے پر مجبور کر گئے تھے۔

''میں شائستہ کی وجہ سے پریشان ہوں کیونکہ وہ نعمانہ کی نند کے رشتہ کو لے کر پریشان ہے۔ نعمانہ کی نند کی عمر ڈھلتی جا رہی ہے اور اب تک کوئی مناسب رشتہ نہیں ملا۔'' کل ہی ان کی بہن سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی اس لئے جیسے ہی یاد آیا تھا، وہ ذکر کر کے محمود خان کی چبھتی نظروں سے فی الحال محفوظ ہوگئی تھیں اور انہوں نے یوں سر جھٹکا تھا گویا کوئی بات ہی نہ ہو۔

''پریشان ہونے سے اگر تمہاری بہن کی بیٹی کی نند شادی شدہ ہو جائے گی تو شوق سے پریشان ہوتی رہو۔ اس بات پر تمہارے پریشان ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا تو بہتر ہوگا کہ رونے دھونے کا پروگرام ملتوی کر کے سو جاؤ۔'' وہ ایک تیز نظر بیوی کے سرخ چہرے پر ڈالتے جو رونے کی چغلی رکھا رہا تھا سونے کے لئے لیٹ گئے تھے اور نتاشہ نے نظر اٹھا کر اس سنگدل انسان کو دیکھا تک نہ تھا جو کہنے کو ان کا ہمسفر تھا، جو کہتا تھا کہ ان کی رگ رگ سے واقف ہے مگر وہ شخص کبھی سمجھ ہی نہیں سکا تھا کبھی بھی نہیں۔۔۔ اس شخص کے ساتھ، اس کے دھوپ چھاؤں سے مزاج میں انہوں نے کیسی سلگتی ہوئی بے رنگ زندگی گزاری تھی بس وہی جانتی تھیں اور بیٹی کے کارنامے کے بعد انہیں لگتا تھا کہ جو ستم رہ گیا تھا وہ بھی محمود خان کے تیر سے باہر آجائے گا کہ انہوں نے تو اپنے طور پر بیٹی کی اچھی تربیت کی تھی مگر جانے کہاں کمی رہی تھی کہ ان کی بیٹی انتہائی قدم اٹھا گئی تھی اور بیٹی کے اس قدم کا نتاشہ کو خوب اندازہ تھا۔ الزام انہیں ہی ملنا تھا، ان کی تربیت پر انگلی اٹھنی تھی اور سب سے پہلی انگلی ان کے شوہر محمود خان کی ہوگی۔ یہ انہیں معلوم تھا۔ وہ آنسو گڑتے ہوئے اٹھی تھیں اور محمود خان کے پہلو میں دراز ہوگئی تھیں مگر نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اس مسئلہ کا حل ڈھونڈنے کو کروٹیں بدل رہی تھیں اور محمود خان سکون کی نیند سو

رہے تھے۔ یہ جانے بغیر کہ یہ سکون محض چند دنوں کا ہے اس لیے جتنی پرسکون نیندیں لینی ہیں، بس لے لیں پھر تو انہوں نے نیند کو ترس جانا ہے۔ ویسے ہی جیسے کسی کی آنکھوں کے خواب ہی نہیں نیند تک چرا کر بے سکون کر ڈالا تھا۔ وقت اپنی چال چکا تھا۔ تڑپانے والوں کے تڑپنے کا وقت ہوا چاہتا تھا کہ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ نتاشہ نے ایک نظر شوہر کے پرسکون چہرے پر ڈالی تھی اور کروٹ بدل لی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی تھیں اور صبح ہوتے ہی لئے ہوئے فیصلہ پر عمل کرتے ہوئے بیٹی کو شاہ زیب اور کزئی کے بارے میں تفصیل بتانے کو کہا تھا کہ کون ہے، کہاں رہتا ہے کہ انہوں نے اس سے ملنے اور مل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر بیٹی خود کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی۔

''احمق لڑکی، تمہیں یہ تک نہیں پتہ کہ وہ بدبخت انسان رہتا کہاں ہے، اس کی فیملی تک کا نہیں پتہ۔۔۔ عشق نے تمہیں اس قدر اندھا کر دیا تھا'' نتاشہ کا دل کیا تھا کہ بیٹی کو جان سے مار دیں۔ وہ نرم خو ماں کا آتشی روپ دیکھ کر سسکنے لگی تھی اور اس نے ماں کو آفس کا نام بتایا تھا اور وہ قدرے سکون محسوس کرتیں اور کزئی انٹرپرائزز کا ایڈریس لینے کا کہتیں خود اپنی چادر لینے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ جس نمبر پر عریم نے دو دن پہلے کال کی تھی اور اسے شاہ زیب کے ایکسیڈنٹ کا پتہ لگا تھا اس نے اسی نمبر پر کال کر کے ایڈریس بھی لیا اور ماں کے حوالے کرتے ہوئے ساتھ جانے کا پوچھا تھا جواب میں نتاشہ نے محض ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ وہ اپنے آپ میں چور بنتی نظر چراتی مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور دعا کرنے لگی تھی کہ اس کی ماما کی بات شاہ زیب سے ہو جائے۔ راستہ میں انہیں خیال آیا تھا کہ اگر شاہ زیب کے ایکسیڈنٹ کی خبر درست ہے تو انہیں آفس کے بجائے شاہ زیب کے گھر جانا چاہئے اور یہ خیال آتے ہی انہوں نے پرچے پر درج نمبر ڈائل کیا تھا۔

''کیا میں شاہ زیب اور کزئی سے بات کر سکتی ہوں۔'' آپریٹر سے نہایت شائستگی سے کہا تھا اور اس نے وہی کہا تھا جو عریم سے کہا تھا۔

''سر شاہ زیب تو آج کل آفس نہیں آ رہے کیونکہ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہیں۔ آپ مجھے اپنے بارے میں بتا دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ آپ کس سلسلے میں ملنا چاہتی ہیں تو میں آپ کا میسج فارورڈ کر دوں گی۔'' آپریٹر پیشہ ورانہ انداز میں کہتی چلی گئی تھی۔

''شاہ زیب میرے کالج فرینڈ ہیں ان کا نمبر آف تھا اس لئے آفس کے نمبر پر کال کی۔۔۔ ایکسیڈنٹ کا جان کر بہت افسوس ہوا ہے مگر آپ مجھے ہاسپٹل کا نام بتا دیں تو میں ان کی عیادت کو چلی جاؤں گی۔'' وہ جھوٹ بولتی روانی سے بول گئی تھیں اور آپریٹر نے کچھ کہے بناء بڑی خاموشی سے ہاسپٹل کا نام اور وارڈ نمبر انہیں لکھوایا تھا اور وہ شکریہ کے ساتھ رابطہ منقطع کر گئی تھیں۔ ڈرائیور کو ''آغا خان'' ہاسپٹل چلنے کا کہتیں دل ہی دل میں رب سے مناجات کرنے لگی تھیں کہ وہ زندگی میں جس دوراہے پر کھڑی تھیں۔ ایک دعا کا ہی سہارا تھا جس کے ذریعے وہ اس کٹھن وقت کو عزت سے گزار سکتی تھیں لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کی بہت دل سے مانگی دعا بے کار جائے گی کہ قسمت کے اندھیرے چار سو پھیل گئے تھے اور جس قدر تاریک اندھیرا تھا اس کے لئے دعا کی نہیں دعاؤں کی ضرورت تھی۔

☆......☆......☆

''پریشان ہونا مسئلہ کا حل نہیں ہوتا آبدار۔'' وہ جس وقت آفس سے گھر آیا اس کی پہلی نظر لان میں کسی کی کرسی پر تنہا بیٹھی آبدار پر پڑی تھی اور وہ چلتا ہوا اس کے سامنے آن رکا تھا مگر وہ اپنی سوچوں میں اس قدر غرق تھی کہ وہ ابسام کی موجودگی کو محسوس نہیں کر پائی تھی۔ اس نے آبدار کو گلا کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس بخشا تھا اور وہ ابسام کی موجودگی سے واقف ہوتی ایک سیکنڈ میں اپنے آنسو رگڑ گئی تھی اور وہ اسے روتا دیکھ چکا تھا۔ اس کے آنسو صاف کرنے پر ایک گہری سانس خارج کرتا اس کے عین سامنے پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے نہایت نرمی سے بولا تھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ میرے اپنے مشکل میں ہیں۔ تایا جان اتنے بیمار ہیں اور شاہ زیب بھیا۔۔'' اس نے کہتے کہتے ناراضگی سے ابسام حیدر کی طرف دیکھا اور وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا جو شکوے کر رہی تھیں۔ اس سے اس بات پر خفا لگی تھیں کہ اس نے کیوں شاہ زیب کے ایکسیڈنٹ کا بتایا نہیں۔ وہ یکدم ہی نظر چرا گیا تھا کہ وہ فی الحال اپنی مرضی کرنے سے قاصر تھا اور آئیکت نے اس سے کہا تھا کہ وہ آبدار کو کچھ نہ بتائے اس لئے وہ اسے شاہ زیب کے ایکسیڈنٹ سے لاعلم رکھے ہوئے تھا مگر اب یہ سوچ رہا تھا کہ اسے پتہ چلا تو کیسے؟

''شاہ زیب بھیا کا اتنا بڑا ایکسیڈنٹ ہوا ہے وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں اور میں اتنے برے وقت میں اپنے بھیا کے پاس نہ تھی۔ میں اب بھی ان کے ساتھ نہیں ہوں۔ میں بہت الجھ گئی ہوں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے کہ میں نے یہاں آ کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے لئے اپنوں کی زندگی، ان کا مان اور خوشیاں سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔'' وہ بری طرح رونے لگی تھی۔ وہ اس سے بہت جان کر بھی نہیں پوچھ پایا تھا کہ اس کی جان کو کیوں اور کس سے خطرہ تھا۔

''آپ کو شاہ زیب کے ایکسیڈنٹ کا کیسے پتہ چلا؟'' وہ اس کے رونے سے پریشان ہوتا دھیمے سے سوال کر گیا تھا۔

''آئیکت نے اپنے طور پر تو مجھ سے سب کچھ چھپا لیا تھا مگر ان کی پریشانی انجانے میں مجھ پر اس وقت عیاں ہو گئی جب وہ تایا جان کی جگہ شاہ زیب بھیا کا نام لے گئے کہ وہ شاہ زیب بھیا کی بیماری کی وجہ سے پریشان ہیں۔'' وہ تفصیل سے آگاہ کر گئی تھی اس نے ایک سرد سانس کھینچی تھی کہ اس نے تو پہلے ہی آئیکت سے کہا تھا وہ آبدار کو شاہ زیب کے ایکسیڈنٹ کا بتا دے کہ وہ زیادہ دن آبدار سے یہ بات پوشیدہ نہیں رکھ پائے گا اور وہی ہوا تھا جو ابسام نے کہا تھا۔

''میں ہاسپٹل گیا تھا۔ انکل کی طبیعت اب کافی بہتر ہے اور ڈسچارج ہو کر وہ گھر چلے گئے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔'' اس نے خود کو کمپوز کر کے روتی ہوئی لڑکی کی ڈھارس بندھانی چاہی تھی اور وہ تایا کی طرف سے تو کچھ حد تک آئیکت سے بات کر کے بھی مطمئن ہوئی تھی جس کا اس نے اظہار بھی کیا تھا اور ابسام نے گڑبڑانے کی بجائے نرمی سے ہر بات اس کے گوش گزار کر دی تھی۔

''چھوٹے موٹے زخم کافی حد تک ٹھیک ہو گئے ہیں اور مزید کچھ دن میں بہتری آ جائے گی۔ شاہ زیب کی بیک بون بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اس لئے اسے ابھی ہاسپٹل سے ڈسچارج نہیں کیا گیا۔ کچھ ٹیسٹ ہونے ہیں آپ بس یہ دعا کریں کہ تمام ٹیسٹ کلیئر آئیں اور شاہ

زیب ایک بار پھر اپنے پیروں پر چلنے لگے۔'' ابسام اس بات سے انجان کہ آئیکت نے اسے کیا بتایا تھا تمام بات کہہ کر اسے انگشت بدنداں کر گیا تھا کہ آئیکت نے اسے یہ سب نہیں بتایا تھا فقط اتنا کہا تھا کہ ایکسیڈنٹ بہت معمولی تھا۔ٹانگ میں فریکچر ہوا ہے کچھ دن میں شاہ زیب کو ڈسچارج کر دیا جائے گا اور وہ اس کے چہرے کے تاثرات سے ہی سمجھ گیا تھا کہ آئیکت سے پہلے اسے تمام تفصیل سے آگاہ کر گیا ہے۔اب چونکہ تیر کمان سے نکل گیا تھا اس لئے وہ اسے تسلی و تشفی دینے لگا تھا اس کے علاوہ وہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا اور وہ بھی تو صبر کرنے کے علاوہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔آنسو بہاتی محض اس کے دلاسوں پر سر ہلاتی رہی تھی۔

''میں آپ سے کچھ جاننا چاہتا ہوں آبدار۔'' وہ چونک کر ابسام کو دیکھنے لگی تھی۔اتنی دیر میں اس نے پہلی بار اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔نگاہ سوالی بن کر ٹھہر گئی تھی کہ یہ چہرہ محبوب کا چہرہ تھا۔نگاہ پلٹ آئی جبکہ وہ اس کی نظر خود پر محسوس کرتا جز بز ہو کر رہ گیا تھا اور ہلکے سے کھنکارا تھا۔وہ نظر جھکا گئی۔نظر اٹھتی تھی تو ٹھہر جانے کو مچل جاتی تھی اور جھکتی تھی تو اٹھنے سے انکاری ہو جاتی تھی۔یہ محبت کی جانے کون سی منزل تھی جس پر اس کے قدم کبھی لڑکھڑا جاتے تھے تو کبھی آگے بڑھنے کے متمنی ہو جاتے تھے اور کبھی آگے بڑھنے سے انکاری چوکھٹ پکڑ لینے کے شائق۔۔۔

''آپ کیا جاننا چاہ رہے ہیں؟'' اس کے لب میکانکی انداز میں ہلے تھے۔

''مجھے لگتا ہے کہ بات وہ نہیں ہے جو آئیکت نے مجھے بتا کر آپ کو اپنے گھر میں رکھنے کی درخواست کی تھی۔میں بس اصل بات جاننا چاہتا ہوں کہ مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کے یہاں ہونے کی وجہ وہ نہیں ہے جو آئیکت نے بتائی تھی۔'' وہ حیرانگی محسوس کرنے کے باوجود اپنی بات پوری کی تھی۔وہ اس کے ڈائریکٹ پوچھنے پر خفیف و جز بز ہو کر رہ گئی تھی جو احساس اس کے لئے محسوس کرنے لگی تھی اس احساس کا تقاضا تھا کہ وہ اس سے کچھ بھی نہ چھپاتی اس سے حال دل تو کہہ نہیں سکتی تھی کم از کم اپنی حالات زار اور مجبوریوں کی داستان تو کہہ ہی دیتی مگر وہ ایسا کرنے سے قاصر تھی اس لئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''میں نہیں جانتی کہ آپ کو آئیکت نے کیا بتایا ہے مگر میں اس میں تردید و اضافہ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔امید ہے آپ میری اس مجبوری کو سمجھتے ہوئے اور سوال ڈائریکٹ آئیکت سے کریں گے کہ میں آپ کو جواب دینے سے قاصر ہوں۔'' وہ اس کی جانب دیکھے بغیر دھیمے لہجے میں شائستگی سے کہتی اس کا جواب سنے بغیر، ردعمل دیکھے بغیر لان عبور کر گئی تھی اور وہ ایک گہری سانس کھینچتا تجسس کو کئی گنا بڑھتا محسوس کرتا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔وہ آج آفس میں کافی تھک گیا تھا اسی لئے وہ اپنے وقت سے کوئی گھنٹہ قبل گھر آ گیا تھا۔اس کا ارادہ آرام کرنے کا تھا لیکن آبدار کو اداس بلبل کی مانند لان میں براجمان دیکھ کر وہ اپنی تھکن یکسر فراموش کئے اس کے پاس آن ٹھہرا تھا اور اس کا صاف پہلو بچا کر جانے پر وہ تجسس کے ساتھ اپنے سر کو دکھتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔اس نے ملازمہ کو چائے کے لئے کہا تھا اور خود شاور لینے چلا گیا تھا اور چائے گھونٹ گھونٹ پیتا وہ آئیکت سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فضہ حیدر کو یہ بات پتہ

لگے کہ آئیکت نے آبدار کو ان کے گھر چھوڑنے کے لئے کوئی فرضی کہانی تشکیل دی تھی کہ ایسا ہو جاتا تو وہ ماں کی ناراضگی وغصہ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔فضہ حیدر جتنی نرم خو تھیں اسی قدر سخت بھی تھیں اور کچھ عرصہ قبل انہوں نے جن شکوک وشبہات کا اظہار کر کے آبدار کو جلد از جلد اس گھر سے رخصت کر دینے کی بات کی تھی وہ تو ابھی تک آئیکت سے کہہ ہی نہیں سکا تھا مگر جو شکوک وشبہات خود اس کو لاحق ہوتے جا رہے تھے ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ آئیکت سے دوٹوک بات کر لے۔

''مجھے آئیکت سے بات کرنے کے لئے مناسب موقع ڈھونڈنا ہوگا۔'' چائے کا خالی مگ ٹیبل پر منتقل کیا تھا اور سونے کے ارادے سے آنکھیں بند کرنے سے قبل اس نے آخری فیصلہ کیا تھا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆......☆

نتاشہ محمود کے قدم آگے بڑھ رہے تھے اور ذہن مناسب الفاظ میں بات کرنے کے لئے لفظ چن رہا تھا اور جس وقت انہوں نے ریسیپشن سے مکمل معلومات حاصل کرنے کے بعد پرائیویٹ روم کے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھا تھا کب کے رکے آنسو پلکوں کی دہلیز سے بے وفائی کرتے رخساروں پر لڑھکتے چلے آئے تھے۔انہوں نے دروازہ دھکیلا اور آنسو رگڑتیں خود کو کمپوز کرتیں کمرے میں داخل ہو گئیں۔شاہ زیب جو آنکھیں موندے لیٹا تھا آہٹ پر اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور اس کی آنکھوں میں نتاشہ محمود خان کو اپنے سامنے دیکھ کر واضح حیرت در آئی تھی۔

''شاہ زیب اورکزئی۔۔۔ایم آئی رائٹ۔۔۔'' وہ اس نوجوان کو دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے پر کئی خراشیں پڑی ہوئی تھیں۔آنکھیں سوجی ہوئی تھیں مگر اس لاغر حالت میں بھی وہ اس کے حسن وجاہت کو پا گئی تھیں اور اس کی آنکھوں میں موجود حیرت کو نظر انداز کر کے بولی تھیں۔اس نے محض اثبات میں گردن کو ہلکے سے جنبش دی تھی۔

''میں تمہاری آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمق پا گئی ہوں۔تمہاری آنکھیں صاف کہہ رہی ہیں کہ تم مجھے بھی جانتے ہو اور میرے آنے کے مقصد سے بھی واقف ہو۔۔۔باوجود اس کے کہ میں اپنا تعارف کروانا چاہتی ہوں۔'' وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولی تھیں اور وہ خود کو کمپوز کر چکا تھا کہ اس کے جسم نے ابھی کام کرنا چھوڑا تھا۔وہ اپنے پیروں پر چلنے سے قاصر تھا مگر اس کا ذہن آج بھی اچھے سے کام کر رہا تھا اسی لئے وہ بڑی سہولت سے خود کو کمپوز کر چکا تھا۔وہ ان سے بھی بالمشافہ ملا تو نہ تھا مگر ایک دو بار اس نے نتاشہ محمود کو عریم کے ساتھ دیکھا تھا۔اس لئے ان کے تعارف سے قبل وہ جانتا تھا کہ وہ عریم محمود کی والدہ ہیں اور وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں کہ وہ ان کے بنا جانے بھی ان کے آنے کا مقصد جان چکا تھا۔

''میں عریم کی ماما ہوں۔'' انہوں نے گویا شک کی تصدیق کی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اچھا ہے آج ان تک عریم کا باپ نہیں آیا کہ وہ جس طرح بے بس یہاں پڑا تھا اس حالت میں اس شخص کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا جسے گھٹنوں پر لانے کے لئے اس نے اپنی عادات و

فطرت کے خلاف کام کیئے تھے۔

''معذرت چاہتا ہوں محترمہ، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔۔۔اور جس نام کا حوالہ آپ دے رہی ہیں مجھے نہیں یاد پڑتا کہ یہ نام میں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی سنا بھی ہے۔'' وہ اتنے سکون سے بولا تھا کہ نتاشہ محمود پوری جان سے لرز گئی تھیں۔ آنکھوں میں بے یقینی سی در آئی تھی اور وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلکشی سے مسکرا دیا تھا اور ان کی جان پر بن آئی تھی۔ ان کے لفظ کھو سے گئے تھے۔ سمجھ نہیں آیا تھا کہ جو نام پہچاننے سے قاصر تھا اس تک اپنی آمد کا مقصد کیسے اپنے منہ سے کہیں۔ ان کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو چمکنے لگے تھے۔ جنہیں دیکھتا وہ نظر چرا گیا تھا کہ وہ درد دینے کا ارادہ باندھے ہوا تھا دوا کیسے بن سکتا تھا، مرہم کیسے رکھ سکتا تھا اس لئے خود پر بے حسی طاری کر گیا تھا۔

''تمہاری ایکسیڈنٹ سے پہلے عریم سے بات ہوئی ہے۔ وہ تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا چکی ہے۔ اس لئے انجان مت بنو۔ تم نے نکاح کیا ہے میری بیٹی عریم سے۔۔۔'' وہ بمشکل آنسو پیتیں اس کے سرہانے آ کھڑی ہوئی تھیں اور دھیمے لہجے میں بولی تھیں۔ ان کا انداز سرگوشی کے مشابہ تھا۔ یعنی وہ اس بات کی فی الحال کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دینا چاہتی تھیں۔

''میں کسی عریم کو نہیں جانتا۔'' وہ اس بے بس عورت کے سرخ چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا تھا اور انہوں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''خدا کے لئے ایسا مت کرو، جان کر انجان نہ بنو، تم نے عریم سے نکاح کیا ہے۔ وہ پریگننٹ ہے۔ یوں پہچاننے سے انکاری مت بنو۔ میری بیٹی کی زندگی بھر کی نیک نامی کا سوال ہے۔ میرے خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ نکاح نامہ۔۔۔'' وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے سسکتے ہوئے بول رہی تھیں۔ اس نے بے بسی سی محسوس کر کے آنکھیں میچ لی تھیں کہ یہ منظر ہرگز بھی ایسا نہ تھا کہ وہ دیکھ پاتا مگر وہ بہت کچھ بولتی جا رہی تھیں۔ اس نے خود کو مضبوط اور مضبوط سے بھی زیادہ بے حس بنا کر ان کی بات کو مکمل ہونے سے قبل ہی کاٹ دیا تھا۔

''کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ میں ہی آپ کی بیٹی کا خفیہ شوہر ہوں اور وہ میرے ہی بچے کی ماں بننے والی ہے۔ لائیے، دیجئے ثبوت۔۔۔'' وہ سرد لہجہ میں کہتا انہیں برزخ میں اتار گیا تھا۔

''عریم نے تم سے محبت کی ہے، تمہاری محبت میں اپنا سب کچھ تم پر قربان کر دیا۔۔۔اور تم اس لڑکی کو پہچاننے سے انکاری ہو۔'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر گزریں اور وہ ان کے دبے دبے انداز میں مشتعل ہونے پر ہنس دیا تھا۔

''مجبوری ہے مسز محمود کہ میں چاہ کر بھی پہچان کے مرحلے میں داخل نہیں ہو سکتا۔'' وہ سرد لہجہ میں گویا پھنکارا تھا اور وہ اس نوجوان کو دیکھنے لگی تھیں جو خود لاچار ہوا پڑا تھا اور ان کی بے بسی پر ترس کھانے کو تیار نہ تھا۔ انہیں اس شخص سے نفرت محسوس ہوئی تھی اپنی بیٹی کے انتخاب پر افسوس ہوا تھا۔ اگر اس وقت ان کی بیٹی ان کے سامنے ہوتی تو وہ اس سے پوچھتیں یہی ہے وہ شخص جس کی محبت میں اس نے ماں باپ کی عزت داؤ پر لگا دی تھی۔ یہی تھی اس کی محبت جس پر اسے مان تھا کہ وہ خود مشکل میں ہے مگر جیسے ہی کچھ سنبھلے گا اس کو سہارہ دینے آ

جائے گا۔ وہ خود اس کے آنے کا سو فیصد یقین رکھے بیٹھی تھی۔ وہ ہوتی سامنے تو اس سے پوچھتیں کہ تم جس کی منتظر ہو، جس پر تمہیں مان ہے وہ شخص محبت کے ہجّوں سے بھی واقف نہیں۔ وہ مان کیا رکھے گا جو پہچاننے سے ہی انکاری ہے۔

''کیوں کر رہے ہو تم ایسا آخر؟ میری بیٹی نے تمہارا بگاڑا کیا ہے؟'' وہ خود کو اس کے سامنے کمزور نہیں ثابت کرنا چاہتی تھیں مگر وہ بہت کمزور ثابت ہو رہی تھیں کہ ان کی طاقت تو ان کی بیٹی کے فقط ایک اقدام نے چھین لی تھی۔ ان کی ہر سانس کو آزار بنا دیا تھا اور کسی کے آگے سوالی بنا دیا تھا۔ وہ اس شخص کی منتیں کر رہی تھیں اس سے اپنی بیٹی کا قصور پوچھتیں اسے یہ سب کرنے سے باز رہنے کی گویا التجا کرتیں عزت سے رخصت کروانے کے لئے باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ گئی تھیں۔ وہ بے بسی سے لب بھینچے ساکت بستر پر پڑا تھا اور وہ اپنے ہی جڑے ہاتھوں پر سر ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔

''خدا کے لئے مت کرو ایسا، نکاح کیا ہے عریم سے۔۔۔ تو اسے عزت سے رخصت کروا لو ورنہ میری بیٹی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔ ایک ماں تم سے اپنی بیٹی کا وقار مانگتی ہے۔ مجھے خالی ہاتھ مت لوٹاؤ تمہیں تمہاری ماں کا واسطہ۔۔۔ اس ماں کے پھیلے ہاتھوں کی لاج رکھ لو'' نتاشہ محمود نے اپنی انا اس شخص کے قدموں میں رکھ دی تھی وہ صرف عزت و ناموس کے لئے سوالی تھیں کسی بھکارن کی طرح اس کے سامنے کاسہ بلند کئے ہوئے تھیں۔ اس کا گداز دل کچھ اور گداز ہو چلا تھا۔ اس کے اندر کی اچھائی اسے اکسا رہی تھی کہ وہ اس بلکتی ہوئی ماں کو سرخرو کر دے۔ اس کے پھیلے ہاتھوں کی لاج رکھ لے مگر یہ جو انتقام کی راہیں ہوتی ہیں بڑی ظالم ہوتی ہیں کمبخت۔۔۔ جب تک سب کچھ فنا نہ کر دیں منزل تک نہیں پہنچتیں۔ اس نے خود کو اپنے عہد یاد دلائے تھے۔ اپنے انتقام کی آگ کو اپنے اندر سلگایا تھا اور اس نے اپنے اندر کی اچھائی کو پہلے اس آگ میں بھسم کر ڈالا تھا کہ وہ اپنی اچھائی کو جلا کر ہی محمود خان کو مٹی میں ملا سکتا تھا۔ اس کے اونچے شملہ کو، وقار سے بلند سر اور فخر سے تنی ناک کو زمین پر رگڑوا سکتا تھا۔ اس نے بالکل ایسا ہی کیا تھا۔ اپنے اندر سے ابھرتیں اچھی نیک سوچوں کو باہر آنے نہیں دیا تھا۔ وہ صرف برائی کا مرقع بن کر ان کے سامنے یوں ظاہر ہوا تھا کہ انہیں اپنے پیروں پر کھڑا رہنا مشکل لگنے لگا تھا۔

''مسز محمود! بہتر ہو گا کہ آپ جہاں سے آئی ہیں، واپس چلی جائیں کہ میں عریم کو نہیں جانتا۔'' وہ سنگدلی و بے حسی کی انتہا پر تھا۔ انسانیت کے درجے سے بہت نیچے آ گیا تھا۔

''تم مجھ سے تو کہہ سکتے ہو کہ تم عریم کو نہیں جانتے۔ کیا عریم سے بھی کہہ سکو گے کہ تم اس کو نہیں جانتے۔'' وہ اذیت میں گھری ایک سوال کر گئی تھیں جس کا اس کے پاس جواب نہیں تھا کہ یہ حقیقت تھی کہ وہ ان کو جھٹلا سکتا تھا مگر عریم کو نہیں۔

''تمہاری آنکھوں میں، تمہارے چہرے پر غلاظت نہیں محسوس ہو رہی مجھے۔ تمہاری آنکھیں تمہاری اچھائی کی گواہ ہیں۔۔۔ جو صاف کہہ رہی ہیں کہ میری بیٹی عریم محمود خان نے ان ہی آنکھوں سے دھوکا کھایا۔ ان آنکھوں کی پاکیزگی میں گھر کر تمہیں اپنا سب کچھ سونپ گئی۔ تم اب اس محبت کو جھٹلاؤ۔۔۔ اپنے اندر کی اچھائی کو غلاظت ثابت کرنا چاہو تو میں تم سے اس سب کی وجہ جاننا چاہوں گی کہ میں

یہاں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر آئی ہوں۔تم ہی میری پہلی و آخری امید ہو،تم ہی میرے خاندان کی عزت کو چوراہے پر نیلام کرنے کی نوبت تک لائے ہو اور تم ہی میرے خاندان کی عزت کو نیلام ہونے سے بچا سکتے ہو۔اس لئے ڈرامہ بند کر کے صرف اتنا بتاؤ کہ اگر تم عریم کو آج پہچاننے سے انکاری ہو تو اس کی کیا وجہ ہے۔کیوں کیا تم نے نکاح، اگر برے ہو تو نکاح کا تردد کیوں کیا۔'' وہ زندگی کے جس مقام پر کھڑی تھیں نہایت حقیقت پسند بن گئی تھیں۔خود اذیتی سے وہ بھی کہہ گئی تھیں جو شاہ زیب کو دیکھ کر محسوس کیا تھا اور وہ تک کہہ ڈالا تھا جو کبھی کہنا تو درکار سوچا تک نہ تھا اور اس نے بھی کچھ نہیں چھپایا تھا سب کچھ کہہ ڈالا تھا جسے سن کر وہ کسی بے جان مجسمے کی مانند زمین پر گری تھیں لیکن کاش وہ کوئی مجسمہ ہی ہوتیں جو زمین پر گر کر ٹوٹ جاتا مگر وہ مجسمہ نہ تھیں جیتا جاگتا وجود تھیں۔وہ بیٹی کی تڑپ پر تڑپتیں، اس کا حق، اس کی پہچان، اس کا مان حاصل کرنے کو یہاں تک چل کر آئی تھیں اور جو کچھ ان کے کانوں نے سنا تھا ان کا اپنا مان بکھر گیا تھا، جینے کی تمنا ریت کی مانند زمین پر پھسلتی چلی گئی تھی مگر جینے کی آرزو چھوڑ دینے سے زندگی ختم تھوڑی نہ ہوتی ہے۔سانس چل رہی تھی اور وہ روتے روتے تھکنے لگی تھیں تو اپنے آنسو خود صاف کرتیں زمین سے کھڑی ہو گئی تھیں۔اپنے پیروں پر تو کھڑی ہو گئی تھیں مگر نظروں میں اب بھی کھڑی نہیں ہو سکتی تھیں۔ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان سے جینے کا احساس چھین لینے والے اس نوجوان کی جانب دیکھتیں مگر وہ آج اپنے حوصلہ کو اپنی برداشت سے زیادہ جواں رکھے ہوئے تھیں۔انہوں نے بستر پر چت لیٹے اس نوجوان کو دیکھا جس کا چہرہ داستان سناتے خود داستان ہو گیا تھا۔ضبط سے لہو رنگ چہرہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا اور ان کے لب ہلے تھے۔

''تم نے جو بھی کہا، جو بھی بتایا، میں اس کو نہیں جھٹلاؤں گی۔بس اتنا کہوں گی کہ اس سب میں میری بیٹی بے قصور ہے اس سے عزت سے جینے کا حق مت چھینو۔'' ہاتھ خود بہ خود اس کے سامنے جڑ گئے تھے۔

''یہ مت بھولیں مسز محمود کہ سزا صرف سزاوار کو نہیں بے قصور کو بھی ملتی ہے کہ سزا جن کا مقدر بن جاتی ہے ان کا مقدر کچھ بے قصور لوگوں سے اس طرح جڑا ہوتا ہے کہ سزا ان بے قصوروں کا بھی مقدر بن جاتی ہے کہ سزا کے حقدار سے زیادہ سزا کی اذیت تو بے قصور لوگ ہی جھیلتے ہیں۔'' وہ اذیت سے بولا تھا اور انہوں نے اپنے لب بھینچ لئے تھے۔

''سزاوار تو محمود خان تھا مسز محمود لیکن سزا تمام عمر میری پھپھو نے جھیلی۔۔۔سزا میرے دادا، دادی کا مقدر ہو گئی۔سزا تو محمود خان کو ملنی تھی مگر اس سزا کو میرے خاندان نے جھیلا۔۔۔مکافات عمل شروع ہو گیا ہے مسز محمود، جا کر اس محمود خان کو بتا دینا کہ کئی برس پہلے جو اس نے بویا تھا وہ کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔سزا اس کے اور اس کے گھرانے کا مقدر ہونے کو ہے۔میرا پیغام پہنچا دینا مسز محمود۔'' وہ چپ کر گیا تھا اور ان کے وہاں ٹھہرے رہنے کا ہر جواز ختم ہو گیا تھا۔وہ ناکام و نامراد لوٹی تھیں اس نامرادی میں ان کے ٹوٹ جانے کی کرچیاں بھی تھیں۔اس نامرادی میں ان کے خوابوں کا بین بھی شامل تھا۔بے بسی بھی تھی اور نفرت بھی تھی اور وہ خود کو بہت مجبور اور لاچار محسوس کر رہی تھیں۔آئیکت جو چاچا کو گھر بھیجنے کے بعد پندرہ منٹ قبل ہی اس کی دوائیں لے کر آیا تھا کمرے میں داخل ہونے کو تھا کہ اسے ٹھہر جانا پڑا تھا کہ شاہ زیب

کے بیڈ کے پاس ایک حسین عورت کھڑی رو رہی تھی۔ وہ حیرانگی کے عالم میں اندر چلا آیا تھا۔ وہ عورت اس کو دیکھ کر چپ ہو گئی تھیں مگر اسی وقت شاہ زیب نے داستان سنانی شروع کی تھی اور وہ لب بھینچے کھڑا تھا اور کچھ دیر میں اسے اس عورت کا پتہ چلا تھا کہ وہ اس شخص کی بیوی تھی جس کی وجہ سے ان لوگوں نے ایک اذیت ناک زندگی بسر کی تھی مگر وہ عورت اتنی بے بس ولا چار دکھائی دیتی تھی کہ آئیکت اس سے نفرت محسوس نہیں کر پایا تھا۔ اسے ہمدردی محسوس ہوئی تھی جو اس کی اگلی بات سے کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ وہ حیرت سے شاہ زیب کو دیکھ رہا تھا۔ اسے کہاں شاہ زیب سے ایسی امید تھی۔ وہ عورت جا چکی تھی مگر آئیکت اب بھی حیرت میں ڈوبا کھڑا تھا اور جیسے ہی بے یقینی سے باہر آیا تھا وہ شاہ زیب کے سامنے سوالیہ انداز میں آ کھڑا ہوا تھا مگر شاہ زیب نے اس کے کسی سوال کا جواب دینے سے معذرت کر لی تھی اور وہ شاہ زیب کی حالت کے پیش نظر محض ایک نظر اس کے زرد چہرے پر ڈالتا کمرے سے باہر نکل گیا تھا جبکہ شاہ زیب کا رہا سہا سکون بھی غارت ہو گیا تھا۔ جس بے بسی کے عالم میں اس نے عریم کی ماں کو اپنے سامنے ہاتھ جوڑتے دیکھا تھا اس کے بعد اسے عریم کی حالت کا اندازہ لگانے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس وقت عریم کی کیا حالت ہو گی۔ جو لڑکی ایک دن کال نہ کرنے پر مضطرب ہو جاتی تھی اس کے اتنے مشکل وقت میں گدھے کے سر سے سینگ کی مانند غائب ہو جانے پر کیسے کیسے نہ تڑپ رہی ہو گی۔ یہ خیال اسے بے چین کرنے کو کافی تھا اسے یکدم ہی لگا تھا جیسے دل لگی، دل کی لگی بن گئی ہے مگر وہ خود کو جھٹلا گیا تھا۔

''سوری عریم۔۔۔'' اس نے سوچ کو بھٹکنے سے بچانے کو زیر لب کہا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔

☆......☆......☆

''دادو! مجھے آپ سے بے حد ضروری بات کرنی ہے۔'' نوائم اپنی دادی کے کمرے میں تھی اس نے انہیں دوائی کھلائی اور ان کے ہاتھ سے گلاس لیتے ہوئے دھیمے سے بولی۔ وہ یکدم مسکرا دی تھیں کہ وہ کافی دیر سے محسوس کر رہی تھیں کہ نوائم ان سے بات کرنا چاہ رہی ہے وہ بالآخر بول پڑی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے اسے اجازت دے گئی تھیں۔ انہیں اپنی تینوں پوتیوں میں نوائم زیادہ عزیز تھی۔ ایک تو وہ بڑے بیٹے کی بیٹی تھی ان کی سب سے بڑی پوتی اور اس کی نرم فرمانبردارانہ طبیعت بھی اسے ہر دل عزیز بناتی تھی کہ نرم خوئی اور مخلص سادہ طبیعت انسان کو لوگوں کے قریب کر دیتی ہے۔ وہ بھی سب کی چہیتی تھی، سب کے دل کے قریب تھی۔ اس نے دادی کے مسکرانے پر خجالت سی محسوس کی تھی اور وہ پوتی کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے عین سامنے بٹھا گئی تھیں۔

''کیا بات ہے نوائم؟'' نرمی سے پوچھا گیا تو اس کی ہمت بندھ گئی تھی۔

''دادو، میں مومل اور عبیر کی شادی کے حوالے سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔'' وہ قدرے جھجک کر بولنے کے بعد دادی کے تاثرات دیکھنے لگی تھی مگر ان کے چہرے پر اس کی بات سن کر کسی قسم کی ناگواری نہیں چھلکی تھی اس لئے وہ مزید ہمت باندھتے ہوئے تمام تر بات دادی کے گوش گزار کر گئی تھی۔ اس نے مومل کی ناپسندیدگی بھی نہیں چھپائی تھی اور عبیر کے جذبات بھی بیان کر دیئے تھے اور حاجرہ بیگم بری طرح

الجھ گئی تھیں۔

''دادو، میں نے آپ کو ہر بات صرف اس لئے بتائی کہ میں نہیں چاہتی کہ عبیر کے ساتھ کوئی زیادتی ہو۔'' وہ دادی کا پرسوچ انداز دیکھ کر بولی تھی۔

''مجھے بتانے کے پیچھے تمہارا اصل مقصد کیا ہے؟'' وہ پوتی کو سوالیہ نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ گڑبڑائی ضرور مگر بولے بنا بھی نہیں رہی تھی۔

''دادو، مومل حماقت کر رہی ہے۔ اس نے شادی سے انکار کے لئے پاکستان جانے کو بس اپنے فیور میں یوز کر کے منع کر دیا ہے۔ آپ اگر چاہیں تو مومل کا ہر اختلاف اپنی موت آپ مر سکتا ہے اگر آپ ہر حال میں عبیر کے لئے ہاں کر دیں گی تو مومل انکار نہیں کر پائے گی۔ پلیز دادو، آپ کر دیں نہ اقرار۔۔۔'' وہ دھیمے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بہت مناسب الفاظ میں بولتی یکدم دادی کا ہاتھ تھام کر ملتجی ہو گئی تھی۔

وہ پوتی کے انداز پر مسکرا دی تھیں۔

''عبیر مجھے ہر لحاظ سے مومل کے لئے پرفیکٹ لگا تھا تب ہی کبیر بیٹے نے جب رشتہ کی بات کی تو اسے مثبت جواب دیا گیا تھا لیکن پاکستان جانے کے فیصلہ نے جواب میں ردوبدل کر دی۔ مجھے تو پاکستان پر بھی اعتراض نہیں مگر عقیل نہیں راضی۔۔۔ اور جب مومل اپنی پسند سب کے سامنے کہہ چکی ہے تو اس کے بعد تو بالکل ہی گنجائش نہیں نکلتی کہ عقیل کو پہلے سمجھانا ممکن تھا مگر بیٹی کی سوچ سامنے آنے کے بعد نہیں۔''

حاجرہ بیگم نہایت صاف گوئی سے بولی تھیں اور یہ تو نوائم بھی مانتی تھی تب ہی تو اس نے دادی سے بات کی تھی کہ وہی آخری امید تھیں۔

''دادو، چاچو آپ کی بات سے انکار ہی تو نہیں کریں گے آپ کہہ دیں کہ آپ کو نہیں اعتراض۔۔۔ سچ دادو، عبیر بہت اچھا ہے وہ مومل سے بہت محبت کرتا ہے۔ مومل اس کے ساتھ اچھا نہیں کر رہی اس کا دل ٹوٹ جائے گا دادو۔۔۔'' نوائم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیا کہے کہ اس کی دادی قائل ہو جائیں۔

''عبیر کی خوشی کے لیے مومل کی خوشی و مرضی بھی تو نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔'' وہ پوتی کی بے چینی محسوس کرنے کے باوجود بولی تھیں۔

''جی دادو، تب ہی میں نے عبیر کو سمجھانے کی کوشش کی مگر دادو محبت کب کچھ سمجھتی ہے۔ عبیر بھی کچھ نہیں سمجھنا چاہتا۔۔۔ اور دادو مومل فضول میں عبیر سے بلا واسطے کا بیر باندھے بیٹھی ہے۔ وہ ضد میں ایسا کر رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا دادو تو میں کبھی آپ سے نہ کہتی کہ مومل کی مرضی کو اہمیت نہ دیں اور عبیر کی خوشی رکھ لیں کیونکہ دادو مرضی کو تو اچھے رویے سے بدلا جا سکتا ہے مگر خوشی ایک بار روٹھ جائے، ساتھ چھوڑ دے تو پھر کبھی ملا نہیں کرتی۔''

نوائم نے عبیر کی محبت کو جس شدت سے محسوس کیا تھا اس کا اثر تھا کہ بولتے ہوئے اس کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔

''عبیر نے تمہیں اپنا حمایتی بنا کر بھیجا ہے۔'' وہ پوتی کا کان کھینچ گئی تھیں۔

''نہیں دادو، عبیر نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے دونوں کے جذبات محسوس کیئے اور مجھے لگا کہ عبیر ایک مثبت جذبے کی آبیاری کر رہا ہے اور مومل ایک منفی جذبے کو پروان چڑھا رہی ہے اس لیئے ساتھ عبیر کا دینا چاہیئے کہ وہ مثبت جذبوں کا داعی ہے۔'' وہ ترنت بولی تھی اور حاجرہ بیگم ہنس دی تھیں۔

''میں عقیل سے بات کروں گی اور مومل کو بھی سمجھاؤں گی۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ منفی جذبوں کی حمایت نہیں کرنی چاہیئے۔'' وہ پوتی کی ہمدرد فطرت سے کافی متاثر ہوئی تھیں۔

''دادو، آپ مومل کے سامنے کچھ ظاہر مت کیجیئے گا ورنہ وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔'' وہ دادی کو راضی دیکھ کر جلدی سے بولی تھی۔

''اچھا بھئی میں تمہاری دوست کو کچھ نہیں بتاؤں گی اور یہ تو بالکل نہیں بتاؤں گی کہ اس کے خلاف سازش کی سرغنہ تم ہو۔'' وہ شرارت سے بولی تھیں اور نوائم دادی کے انداز پر ہنس دی تھی۔

''دادو، آپ کو تو عبیر اور مومل کی شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے نا۔۔۔'' وہ نہ جانے کیا جاننا چاہ رہی تھی۔

''عبیر اس لائق ہے کہ اس کے رشتے کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا جائے۔ تم پریشان نہ ہو مجھے پہلے بھی اعتراض نہ تھا اور اب تو میری پوری کوشش ہو گی کہ مومل کی شادی عبیر سے ہو جائے۔'' وہ صاف گوئی سے بولتیں نوائم کو پرسکون کر گئی تھیں۔

''بہت شکریہ دادو۔'' وہ دادی سے لپٹ گئی تو وہ پوتی کے بچگانہ انداز پر مسکراتیں آگے کا لائحہ عمل سوچنے لگی تھیں کہ جو کچھ نوائم نے اسے بتایا تھا اس سے تو مومل ہی غلط لگ رہی تھی مگر وہ کوئی فیصلہ لینے سے قبل ہر بات کا جائزہ لینا چاہتی تھیں کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی پوتی کے ساتھ ناانصافی ہو اس لیئے وہ مومل سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔

☆......☆......☆

نتاشہ محمود جس وقت شاہ زیب اور کرنزئی سے ملنے گئی تھیں ایک دکھ، ایک ذلت ان کے وجود سے لپٹی ہوئی تھی اور اب وہ شاہ زیب اور کرنزئی سے مل کر واپس آئی تھیں تو دکھ اور ذلت دوگنی ہو چکی تھی۔ انہیں اپنی ذات تنکے سے بھی ہلکی لگ رہی تھی۔ دل کر رہا تھا کہ وہ یوں چیخ چیخ کر روئیں۔۔۔ کچھ یوں بین کریں کہ ان کے آنسوؤں میں ان کی ذات بہہ جائے۔ ہر چیخ کے ساتھ ذلت مٹ جائے مگر وہ جانتی تھیں ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ جسم پر لگی گندگی کو تو صاف کیا جا سکتا ہے مگر روح اگر پراگندہ ہو جائے تو اسے کوئی طاقت صاف نہیں کر سکتی اور آج ان کے جسم پر نہیں روح پر داغ لگے تھے۔ آج وہ اندر سے مر گئی تھیں اور کس کی وجہ سے۔۔۔؟

اس شخص کی وجہ سے جس نے تاحیات ان کے جسم کو اذیت دی تھی، روح کو کچوکے لگائے تھے اور آج ان کے جسم سے آخری سکھ کی بوند بھی نچوڑ لی تھی۔ انہیں بے روح کر ڈالا تھا۔ انہیں یاد تھا کہ جب وہ برسوں قبل محمود خان سے نکاح کے بندھن میں کتنے ہی ارمانوں کے ساتھ بندھی تھیں۔ نکاح کے دو بولوں کے ساتھ ان کے کورے من میں محمود خان سما گئے تھے۔ جب وہ سیج سجائے اس شخص کی منتظر تھیں جو

اب سب کچھ تھا ان کے لئے۔۔۔مگر ان کی امیدوں کا محل مسمار ہو گیا تھا۔ارمان آنکھوں میں چبھنے لگے تھے۔محمود خان کی قربت میں وہ احساس نہ تھا جو عورت کو مکمل کر دیتا ہے۔وہ جانے کیسی تپش تھی محمود خان کے ہر انداز میں، ان کے چھونے میں کہ نتاشہ خود کو بے جان ہوتا محسوس کر رہی تھیں انہیں جان کنی کے مرحلے کا گمان گزر رہا تھا اور زندگی ایک ڈگر پر چل پڑی تھی۔محمود خان ایک حاکمیت پسند انسان تھے اور صرف حاکمیت پسندی کا شکار ہوتے تو بھی نتاشہ خود کو زندہ تصور کر لیتیں مگر محمود خان تو ایک شکی مزاج مرد تھے۔شادی کی پہلی رات جو کچھ محمود خان نے ان سے پوچھا تھا انہیں اپنے ہونے پر شرمندگی ہو رہی تھی۔جس لڑکی نے تمام عمر خود کو سینت، سینت کر رکھا تھا، جس نے کبھی نگاہ اٹھا کر کسی مرد کو نہ دیکھا، جس کے کردار کی گواہی ایک دنیا دیتی تھی اس لڑکی کا شوہر اس سے کردار کی پاکیزگی کا ثبوت مانگ رہا تھا۔نتاشہ قسمت کے اس وار پر انگشت بدنداں تھیں۔انہوں نے سرد چہرے والے محمود خان کو بھیگتی آنکھوں سے دیکھا تھا اور خدا اور اس کی کتاب کو گواہ بنا کر اپنے کردار کی پاکیزگی کا ثبوت دیا تھا، قسم اٹھائی تھی اور محمود خان نے جس کا اعتبار نہ کیا تھا تمام عمر ان پر کڑی نگاہ رکھی تھی۔دھیرے دھیرے بے اعتنائی کو اتنا بڑھایا تھا کہ وہ سجنا سنورنا چھوڑ گئی تھیں کہ وہ اس گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں جہاں لڑکیوں کو شوہر کے گھر جا کر شوہر کے لئے سجنے سنورنے کی تربیت دی جاتی ہے اور وہ جو کتنے ارمان لے کر آئی تھیں اور جس کے لئے سنگھار کرتی تھیں جب وہی شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا تو وہ دھیرے دھیرے سب ترک کر گئی تھیں۔تمام زرق برق لباس الماری کی زینت بنے رہ گئے تھے اور وہ جو اس شخص کو اعتبار سونپتے خاک ہو گئی تھیں، اپنی خوشی، اپنی مرضی تک تیاگ دی تھی، آج اس شخص کا ایک نیا روپ سامنے آیا تھا کہ ان کی روح تک بلبلا اٹھی تھی۔وہ سوچ رہی تھیں کہ انہوں نے قفس سی زندگی ایک ایسے شخص کے لئے گزاری تھی جو اس قابل ہی نہ تھا جس نے اپنے کردار کی بدصورتی سے واقفیت کے باعث ان کے کردار کو نشانہ بنائے رکھا۔انہیں اپنے کردہ گناہوں کی سزا دی تھی اور وہ ناکردہ گناہوں کی سزا جھیل کر آج زندگی کے اس موڑ پر کھڑی تھیں کہ اصل گناہگار سے سوال تک کرنے کی خود میں ہمت نہیں پا رہی تھیں۔آنسو آنکھوں سے قطرہ قطرہ گر رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھیں کہ انہوں نے اپنی جوانی، اپنے ارمان، اپنی شوخی، اپنی آزادی جس کے لئے تیاگ دی وہ اس لائق کب تھا۔۔۔وہ تمام عمر جس کو اپنے کردار کی گواہی دیتی رہیں، اپنے کردار کی پاکیزگی کا ثبوت دینے کو تمام عمر جو انہوں نے کلفتیں سہیں اپنے کردار کو ثابت کرتیں اپنی ذات کو پانی بنتا محسوس کرتی رہیں آج لگا تھا پتہ کہ ان سے ان کے کردار کی گواہی مانگنے والے محمود خان کا اپنا کوئی کردار ہی نہ تھا۔انہیں ہر وہ شب یاد آ رہی تھی جو انہوں نے محمود خان کو اپنی پارسائی کے ثبوت فراہم کرتے بسر کی تھی۔انہیں ہر وہ دن رلا رہا تھا جو انہوں نے محمود خان کی مرضی سے گزارا تھا۔ہر وہ صبح ان پر رو رہی تھی جو انہوں نے محمود خان کو اپنے کردار، اچھائی کے ثبوت میں طلوع ہوتے دیکھی تھی جس شخص کو وہ تمام عمر اپنے ایک ایک لمحہ کا حساب دیتی رہی تھیں آج اس سے حساب کا دن آن پہنچا تھا اور ان کا دل کر رہا تھا کہ وہ اس شخص کا سامنا ہونے سے قبل کہیں غائب ہو جائیں کہ جس نے تاحیات انہیں اپنے کردار کی بدصورتی کے سبب کانٹوں پر گھسیٹا تھا وہ اس شخص سے اب کوئی سوال نہیں کرنا چاہتی تھیں۔کوئی جواب نہیں دینا چاہتی تھیں کہ انہوں نے ماں باپ کی تربیت کی لاج

رکھنے کو۔۔۔اپنا گھر بسانے کو جو ذلتیں سہی تھیں سہ گئی تھیں اب ان ذلتوں کے سبب یعنی محمود خان سے ٹکرانا نہیں چاہتی تھیں کہ وہ قدرت کے انصاف پر ہی مطمئن تھیں۔انہیں تمام عمر ذلیل کرنے والا،انہیں چھوٹا ثابت کرنے والا آج خود بہت چھوٹا ہو گیا تھا۔وہ قدرت کے اس انصاف پر جہاں مطمئن تھیں تو قدرے خوفزدہ بھی تھیں۔انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے سسکی لی تھی۔

''یا اللہ۔تو میرے حال سے واقف ہے۔تو جانتا ہے میں نے تیری رضا کے لئے،شوہر کی رضا کی خاطر خود کو خاک کر لیا۔تمام عمر سسک سسک کر گزاری مگر شکوہ بلند نہ کیا۔تیرا انصاف بہت عظیم ہے میرے مولا۔مگر تجھ سے التجا ہے تو اپنے انصاف سے میری بیٹی کی زندگی کو محفوظ کر دے۔اسے ذلت سے بچالے۔اس کے باپ کے کئے کی سزا،اسے نہ دے۔تجھے میرے صبر کا واسطہ ہے میرے اللہ۔میری بیٹی کی عزت رکھ لینا۔'' وہ اٹھی تھیں اور وضو کر کے نماز ادا کرنے لگی تھیں اور دعا کو ہاتھ اٹھے تھے تو بیٹی کے لئے خیر مانگتے چلے گئے تھے۔ان کی دلی آرزو تھی کہ ان کے شوہر کے کئے کی سزا ان کی بیٹی کا نصیب نہ بنے۔وہ سرسجدے میں گرائے بری طرح بلک رہی تھیں جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوئے۔انہیں اس حالت میں دیکھ کر فطری طور پر پریشان ضرور ہوئے مگر کچھ ہی سیکنڈز میں خود کو کمپوز کر گئے تھے اور ہنکارا بھرتے آگے بڑھ گئے تھے۔انہوں نے اس منظر میں آج کچھ نیا ضرور محسوس کیا تھا۔مگر یہ منظر پرانا تھا وہ اس منظر کو طویل برسوں سے دیکھتے آرہے تھے کہ نتاشہ یوں ہی سجدوں میں گڑگڑایا کرتی تھیں اور وہ انہیں ایسا کرتے جب بھی دیکھ لیتے تھے ان کے دل میں شک اور بڑھ جاتا تھا۔یہ منظر انہیں کبھی مثبت سوچ کی طرف نہیں لے جا پایا تھا کیونکہ ان کے دل میں جو چور تھا وہ انہیں منفی سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔وہ جب بھی انہیں سجدے میں گڑگڑاتا دیکھتے تو یہی لگتا تھا کہ وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی ہیں۔ان کے سامنے پارسا بنتی ہیں اور تنہائی میں اپنے گناہوں کی رب سے معافی طلب کرتی ہیں۔وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اپنے رب کی محبت میں اسے سجدے کرتی تھیں،اپنے لئے عافیت طلب کرتی تھیں۔شوہر کے دل بدل جانے کی دعائیں مانگا کرتی تھیں اور محمود خان کا دل تو کیا بدلنا تھا ان کے مقدر کی سیاہی نے تمام عمران کی زندگی کو سیاہ کر دیا تھا اور ان کے مقدر کی سیاہی اب ان کی بیٹی کا مقدر بننے کو تھی اور آج وہ رب سے اس سیاہی کو روشنی میں بدلنے کی التجائیں کر رہی تھیں اور وہ بیڈ پر نیم دراز نفرت سے ان کے جھکے وجود کو دیکھ رہے تھے۔رو رو کر دل کچھ ہلکا ہوا تھا تو انہوں نے سر اٹھایا تھا۔آنسو صاف کئے تھے اور مصلہ سمیٹتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔آج ان کی آنکھوں میں محبت نہیں اتری تھی،احترام بھی دور دور تک نہ تھا یہاں تک کہ نفرت نے بھی جگہ نہیں بنائی تھیں ایک سرد سا تاثر ان کی آنکھوں میں اترا تھا اور وہ نگاہ جھکاتیں مصلہ کو اس کی جگہ پر رکھنے لگی تھیں۔محمود خان بے طرح چونک گئے تھے کہ آج انہوں نے لمحہ بھر میں نتاشہ کی آنکھوں میں جو تاثر محسوس کیا تھا وہ اس قدر انجانا و اجنبی تھا کہ وہ بری طرح الجھ کر رہ گئے تھے مگر سوال نہیں کر سکتے تھے۔کچھ پوچھنے کو نہیں تھا کہ وہ یہ تو پوچھ نہیں سکتے تھے کہ ''نتاشہ،تمہاری آنکھوں میں ہمیشہ میرے لئے ایک نرم سا تاثر رہا ہے اور آج بہت سرد تاثرات محسوس کئے ہیں۔اس تبدیلی کی وجہ۔۔۔'' وہ وجہ نہیں پوچھ سکتے تھے کیونکہ اپنی ذات کے زعم میں رہنے والے خود کو،اپنوں سے بہت قریبی رشتوں سے بہت دور کر لیتے ہیں اور اس دوری کو طے کرنا اتنا آسان بھی

نہیں ہوتا۔ یہ بات آج انہوں نے شدت سے محسوس کی تھی۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھے اور وہ مصلہ اس کی مخصوص جگہ پر رکھتیں بستر سے کچھ دور آن ٹھہری تھیں اور دھیمے سے بولی تھیں۔

''عریم، فارس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' ان کا انداز غیر معمولی تھا وہ جو سوچ بچار میں تھے یکدم غصہ سے بھڑک اٹھے تھے۔

''دماغ درست ہے تمہارا۔ کیا بکواس کر رہی ہو۔'' وہ نہایت ناگواری سے بیوی کے ستے ہوئے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔

''میرا دماغ درست ہے مگر آپ کی بیٹی کا نہیں۔ اس نے فارس سے صاف شادی سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کسی شاہ زیب اورکزئی کے ساتھ کمیٹڈ ہے اور اسی کے ساتھ۔۔۔'' وہ جو شوہر کی طرف دیکھ رہی تھیں ''اورکزئی'' کے نام پر ان کے چہرے کے تاثرات میں جو یکدم تبدیلی آئی تھی وہ انہیں اندر تک کاٹ گیا تھا ان کے باقی الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے مگر محمود خان لمحہ کے ہزارویں حصہ میں خود کو سنبھال گئے تھے اور نہایت ناپسندیدگی سے بیوی کو دیکھتے ان پر غصہ ہونے لگے تھے۔ ان کی تربیت کو برا بھلا کہتے چلے گئے تھے اور انہوں نے ہر الزام کو ہمیشہ کی طرح اپنی ذات پر سہا تھا اور ایک سوچ ذہن میں چکرانے لگی تھی۔

''محمود خان! ابھی صرف لڑکے کا نام سن کر آپ کی یہ حالت ہے۔ بیٹی کے کارنامے سے واقفیت کے بعد کیا حال ہوگا۔'' وہ خود اذیتی کا شکار ہونے لگی تھیں اور وہ بہت کچھ کہہ گئے تھے کہ وہ ان کی بات کے درمیان بہت سرد لہجہ میں بول پڑی تھیں۔

''آپ عریم کی فارس سے شادی اسی ہفتہ تو کیا کبھی بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ جس لڑکے سے محبت کرتی ہے اس سے نکاح کر چکی ہے۔'' وہ جو بیوی کی تربیت کو نشانہ بناتے سخت سست سنا رہے تھے اور اسی ہفتہ فارس سے شادی کا فیصلہ سنا گئے تھے۔ اس کے جواب میں نتاشہ نے جو کچھ کہا تھا وہ سن کر انہیں لگا تھا کہ کمرے کی چھت ان پر آ گری ہے وہ ششدر ہو کر بیوی کو دیکھ رہے تھے جو پرسکون تھیں اور ان کا یہ سکون محمود خان کو آگ ہی تو لگا گیا تھا۔

''میں تمہیں اور تمہاری بیٹی کو جان سے مار دوں گا۔'' وہ غصے سے کف اڑا رہے تھے۔

''جو آپ کو مناسب لگے آپ کیجئے گا محمود خان، مگر یہ مت بھولیے کہ عریم میری ہی نہیں آپ کی بھی بیٹی ہے اور اولاد کی تربیت اگر مائیں کرتی ہیں تو اولاد کی فطرت باپ کی عادات و فطرت کا عکس بھی ہوا کرتی ہے۔'' وہ ان کے پل پل بڑھتے اشتعال کو صاف محسوس کر لینے کے باوجود نہایت پرسکون تھیں جو پہاڑ پے در پے ان پر ٹوٹے تھے انہوں نے ان کے حوصلوں کو مضبوط کر دیا تھا اور وہ ایک مضبوط چٹان کی مانند ان کے سامنے موجود تھیں۔ ان کی اتنی بڑی بات وہ کہاں برداشت کر پائے تھے۔

''چٹاخ! بکواس کرتی ہو۔ بیٹی کی اچھی پرورش نہ کر سکیں۔ اسے نیک تربیت نہ دے سکیں تو اَب میرے منہ لگ رہی ہو۔ میں تمہارا منہ توڑ جواب دوں گا نتاشہ۔'' وہ غصہ سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔

''ہاں۔ میں بیٹی کی اچھی تربیت نہ کر سکی۔ اس پر جو اعتماد کیا آج وہ میرے منہ کو آ گیا ہے۔ مگر یہ مت بھولیں محمود کہ آج میں بھی اتنی

ہی تکلیف میں ہوں جتنی آپ محسوس کر رہے ہیں۔اور آپ صرف نکاح کا سن کر خود پر قابو نہیں رکھ پا رہے اور میں تو اس حقیقت سے بھی واقف ہوں جس نے میری رات کی نیند، دن کا چین حرام کر دیا ہے۔'' وہ اپنے گال سے ہاتھ ہٹاتیں زمین پر گرتی چلی گئی تھیں۔کمرے میں یکدم خاموشی چھا گئی تھی اور اس خاموشی میں نتاشہ کی سسکیاں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔'' محمود خان کو لگا تھا کہ ان کی آواز گہرے کنویں سے برآمد ہوئی ہے۔وہ یکدم بیوی کی جانب دیکھنے سے گریزاں ہو گئے تھے۔یکدم خوف لاحق ہوا تھا کہ وہ جانے کیا انکشاف کر دے۔وہ اس سوچ سے تڑپ اٹھے تھے کہ کہیں ان کی بیوی کو ان کے ماضی کے گناہ تو نہیں معلوم ہو گئے اور یہ سوچ ایسی تھی کہ وہ اندر تک کانپ گئے تھے۔کیا وقت آیا تھا کہ گناہ کرتے خوف تھا نہ لمحہ بھر کو ان کی سوچ ہی کانپی تھی اور آج برسوں بعد اس گناہ کے خیال نے ہی انہیں کپکپانے پر مجبور کر دیا تھا،خوف سے لرزا دیا تھا مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی بیوی بے شک سب کچھ جان گئی ہے مگر اس وقت بات وہ ان کے نہیں ان کی بیٹی کے کارنامے کی کر رہی ہیں اور وہ جو کانپتے دل کے ساتھ بیوی کے جواب کے منتظر تھے۔جواب ملا تھا تو وہ پورے وجود کے ساتھ ڈھے گئے تھے۔اپنے ہی پیروں پر کھڑا رہنا دشوار کن ہو گیا تھا۔وہ پتھرائی آنکھوں سے بیوی کو دیکھ رہے تھے جو انکشاف کے بعد بلک رہی تھی اور وہ اب تک بیوی کے منہ سے نکلے الفاظ کے زیر اثر ساکت بے جان ہوئے کھڑے تھے۔

''عریم نے اس شخص سے نکاح کر لیا تھا اور وہ پریگننٹ ہے۔'' محمود خان کو ایسا لگا تھا کہ وہ بہرے ہو گئے ہیں کچھ اور مزید سننے سے بالکل ہی محروم۔۔۔ان کے لفظ کھو سے گئے تھے اور زبان بالکل بے جان ہو چکی تھی۔انہیں لگا تھا جیسے وہ گونگے ہو گئے ہیں مزید ایک لفظ نہیں بول پائیں گے مگر وہ اپنے ہی بارے میں غلط خیال کر رہے تھے۔وہ بہرے نہیں ہوئے تھے وہ بیوی کی آواز کو بخوبی سن پا رہے تھے اور جس کا نتیجہ تھا کہ ان کا دوسرا خیال بھی غلط ثابت ہوا تھا۔وہ گونگے نہیں ہوئے تھے چلا اٹھے تھے۔انہوں نے نیچے کارپٹ پر کسی فقیرنی کی طرح بیٹھی اپنی بیوی کو بازو سے پکڑ کر اپنے مدمقابل کھڑا کر لیا تھا۔

''بد بخت عورت اپنے منہ سے کتنے فخر کے ساتھ اپنی آوارہ بیٹی کے کارنامے مجھے سنا رہی ہو۔۔۔میں تمہیں اور تمہاری لاڈلی کو زندہ دفن کر دوں گا۔اپنی عزت کو نیلام نہیں کرنے دوں گا۔سمجھیں تم۔'' وہ نتاشہ پر بری طرح بگڑ رہے تھے اور ان کی برداشت نے جواب دے دیا تھا۔

''دوسروں کی عزت نیلام کرنے والوں کو اپنی عزت کی کتنی فکر ہے۔مگر یہ مت بھولیں محمود، انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔'' وہ بیوی کا بازو میکانکی انداز میں اپنی مضبوط جارحانہ گرفت سے آزاد کر گئے تھے اور ساکت نگاہ سے بیوی کو دیکھ رہے تھے۔لگتا تھا کہ آج وہ انہیں قطرہ قطرہ کر کے زہر دینے کا ارادہ باندھے ہوئے تھیں۔محمود خان کا ہر عضو کان بن گیا تھا اور ان کا دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ذہن میں ماضی گردش کر رہا تھا اور سوچ دماغ میں چکرانے لگی تھی کہ آگے کیا انکشاف ہوگا۔کیا ان کی بیوی ان کے کالے کرتوتوں سے واقف ہو گئی ہیں۔جیسے ہی دماغ میں خطرے کا سائرن بجا تھا جسم کا ہر عضو نہیں نہیں کی گردان کرنے لگا مگر آج وہ جو سوچ رہے تھے ویسا نہیں ہو رہا تھا۔

وقت اپنی چال چل گیا تھا اور وہ مکافات عمل کے زیر اثر خود کو محسوس کرنے لگے تھے۔

''آپ بھول گئے تھے اپنا ماضی، اس میں کیے کالے کرتوت مگر اللہ نہیں بھولا۔ وہ نہیں بھولے جن پر آپ نے ظلم کیا۔ مکافات عمل شروع ہو چکا ہے محمود، اور آپ کے کیئے کی سزا آپ کی بیٹی بھگتے گی۔ ہاں آپ کی بیٹی جسے آپ آج اپنی بیٹی کہنے کے بھی روادار نہیں۔ اگر آج وہ اس مقام پر ہے تو اس سب کی وجہ آپ ہیں کہ میری بیٹی کو صرف مہرہ بنایا گیا ہے آپ سے انتقام لینے کے لئے۔۔۔ اور محمود جو ذلت آپ کے سبب کچھ برس قبل ایک لڑکی نے سہی تھی وہ آپ کی بیٹی کا مقدر ہونے کو ہے۔ جو ذلت آپ کے سبب ایک خاندان نے برداشت کی تھی ویسی ہی ذلت آپ کا نصیب بننے جا رہی ہے۔ آپ کے کیئے کی سزا ملے گی ہماری بیٹی کو۔ وہ شاہ زیب اور کزئی نکاح سے مکر گیا ہے۔ وہ عریم کے بچے کو اپنا نام دینے کا روادار نہیں ہے اور سبب آپ ہیں محمود، صرف آپ کہ شاہ زیب اور کزئی اور کوئی نہیں آبشار اور کزئی کا بھتیجا ہے۔'' وہ ان کا گریبان مٹھیوں میں جکڑے بلکتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور وہ نظر اٹھانے کے بھی قابل نہیں رہے تھے۔ گناہ کر کے نظر اٹھا کر جیئے تھے۔ مگر اپنے گناہ کو اس عورت کے منہ سے سن کر جوان کی بیوی تھی جس کو تمام عمر کٹہرے میں کھڑا رکھا تھا آج اس کے سامنے چھوٹا ہو جانے پر وہ اندر سے مر گئے تھے۔ گناہ نے زندہ رکھا تھا مگر گناہ کے منظر عام پر آ جانے پر سانس گھٹنے لگی تھی اور وہ ''آبشار اور کزئی'' کا نام سن کر اپنی پوری جان سے لرز گئے تھے۔ جس کی ہستی کو مٹا کر وہ نام فراموش کر گئے تھے آج وہ بیوی کے منہ سے سن کر کیا کچھ یاد نہیں آ گیا تھا۔

نتاشہ ایک جھٹکے سے ان کا گریبان آزاد کرتیں زمین پر گھٹنوں کے بل گرتی چلی گئی تھیں اور وہ بری طرح لڑکھڑا گئے تھے۔ ہاں، وہ لڑکھڑا ہی تو گئے تھے اور کچھ یوں لڑکھڑائے تھے کہ کسی کی پوری زندگی عذاب ہو گئی تھی۔ زندگی بے سہارہ و محتاج ہو کر رہ گئی تھی کسی کی پوری زندگی انہوں نے بیساکھی بنا دی تھی۔ ان کا دل کر رہا تھا کہ وہ اس منظر سے غائب ہو جائیں مگر وہ ابھی یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ منظر تو کچھ نہیں وہ منظر جو انہیں ذلت و رسوائی کے گہرے گڑھے میں اتارے گا وہ اس منظر سے بھی ہزار خواہش کے باوجود بھی غائب نہ ہو پائیں گے کہ ناپسندیدہ مناظر سے غائب ہو جانا اتنا ہی آسان ہوتا، ذلت آمیز مناظر سے غائب ہو جانا اگر اتنا ہی آسان ہوتا تو برسوں قبل آبشار اور کزئی ناپسندیدہ منظر سے روپوش ہو جاتی۔ ذلت کے منظر سے یوں غائب ہوتی۔ آج ذلت محمود خان کا مقدر نہ بنتی لیکن آبشار اور کزئی کے لئے اگر محمود خان نے ہر فرار کا راستہ مسدود کیا تھا تو آج وہ بھی مقدر کی اس بند گلی میں آن کھڑے ہوئے تھے جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نکلتا ہی نہ تھا کہ دوسروں کے لئے گڑھے کھودنے والے ایک نہ ایک دن مقدر کے ہاتھ ضرور لگتے ہیں اور جب ہاتھ آتے ہیں تو کئی اندھے گڑھے ان کا نصیب بن جاتے ہیں اور وہ کھڑے کھڑے اپنے مقدر کو سیاہ ہوتا محسوس کر رہے تھے مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا مقدر تو سیاہ تب ہی ہو گیا تھا جب کسی کے انہوں نے پر کاٹ ڈالے تھے۔ آج ان کا مقدر سیاہ نہیں ہوا تھا آج ان کی بینائی لوٹ آئی تھی اور وہ روشنی و سیاہی کا فرق سمجھ گئے تھے۔ نتاشہ خاموش نہیں رہی تھیں انہوں نے بیٹی سے ہوئی ہر ایک بات ان کے گوش گزار کی تھی اور شاہ زیب اور کزئی سے ملاقات کا احوال بھی سنا ڈالا تھا۔

''میں وہاں گئی تو اپنی بیٹی کے وقار کی بھیک مانگنے تھی، مگر لوٹ کر آئی ہوں تو ٹوٹے مان کی کرچیاں میری آنکھوں میں چبھ رہی ہیں۔ میرا وقار، میری عزت، میرا مان سب ٹوٹ کر بکھر گیا۔ میں بالکل تہی دست رہ گئی صرف آپ کی وجہ سے۔ میں شاہ زیب اور کرنزئی سے نظر تک ملانے کے قابل نہیں رہی، میں اس سے بھیک تک نہ مانگ سکی، نہ کہہ سکی کہ میرے شوہر کے گناہ کی سزا میری بیٹی کو نہ دے، میری معصوم بیٹی کو انتقام کی بھینٹ نہ چڑھائے۔'' نتاشہ نے سب ہی کچھ کہہ ڈالا تھا۔ محمود خان پر جو اچھائی و پارسائی کا نقاب چڑھا تھا وہ اتر گیا تھا اور وہ اپنی بیوی کو سن ضرور رہے تھے ان کی طرف دیکھ نہیں رہے تھے کہ آج ان کا گناہ ان کی بیوی سے چھپا نہیں رہا تھا۔ وہ نگاہ ملاتے بھی تو کیسے۔ ان کا دل کیا تھا کہ وہ بیوی کی طرح بین کریں، چیخیں، چلائیں مگر ان کی آواز اپنے ہی حلق میں گھٹ گئی تھی اور کانوں میں فریاد کناں الفاظ شور کرنے لگے تھے، سسکیوں کی دھمک وہ صاف سن رہے تھے، آہوں، کراہوں کی بازگشت ان پر گھیرا تنگ کر رہی تھی اور ذہن ماضی میں گردش کرنے لگا تھا۔ اسی ماضی میں جس میں گناہ تھے، وہی ماضی جس میں ان کی انا کا پرچم کچھ یوں بلند رہا تھا کہ کسی کی پوری زیست پستی میں گرتی چلی گئی تھی، جس ماضی کی طرف انہوں نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، جس ماضی کے خیال نے ایک لمحہ کو انہیں بے چین نہ کیا تھا آج یوں سامنے آیا تھا کہ اضطراب و اذیت ان سے لپٹ گئے تھے اور وہ یہ سوچ کر ہلکان ہو رہے تھے کہ بیوی ان کے ماضی سے آشنا ہوئی تھی تو سانس لینا دشوار لگنے لگا تھا۔ اگر یہ آشنائی بیٹی تک سفر کر جائے تو وہ کیا کریں گے، کیسے سانس لیں گے، اور بیٹی تک سفر کرنے کے بجائے زمانے تک پہنچ گیا تو وہ جو تمام عمر سر اٹھا کر چلے تھے کیسے کسی سے نظر ملا پائیں گے۔ ماضی کے پنّے ان کے سامنے کھل گئے تھے اور وہ کسی اور کے سامنے کھلنے سے ہراساں تھے۔ وہ شخص جو گناہ کرتے خوف کا شکار نہ تھا، گناہ کے سامنے آ جانے کے خیال سے ہی ہراساں ہو چکا تھا۔

''تم عریم کو کچھ مت بتانا نتاشہ۔'' ان کی آواز گہری کھائی سے نکلی تھی اور نتاشہ کے کانوں تک کا سفر کر گئی تھی۔ نتاشہ نے رونا بھول کر اپنے شوہر کو دیکھا تھا اور ان کے دیکھنے میں ایسا کیا تھا کہ محمود خان نظر چرا گئے تھے۔

''میرے بتانے نہ بتانے سے کیا ہوگا۔ شاہ زیب جو پلاننگ کیے ہوئے ہے اس پر جب عمل کرے گا تو عریم اس سے سوال کرے گی اور وہ عریم کو وہی جواب دے گا جو اس نے مجھے دیا ہے۔'' وہ شوہر کے نظر چرا لینے پر خوش نہیں ہوئی تھیں کہ شوہر کے مسخ چہرے، اور بگڑے کردار نے ان کی ہستی ہلا ڈالی تھی وہ ان کے شکستہ انداز پر خوش نہیں ہو سکتی تھیں کہ وہ اس شخص کی عزت تھیں جو دوسروں کی عزت پامال کرنے کا سزاوار تھا۔ وہ اس سے نفرت کرنا چاہتی تھیں مگر اپنے ذہن و دل کو بلینک ہوتا محسوس کر رہی تھیں۔ نتاشہ کی حد درجہ صاف گوئی پر وہ بلبلا اٹھے تھے۔

''نن۔ نہیں۔ مم۔ میں۔ میں۔ بات کروں گا شاہ زیب اور کرنزئی سے۔'' آج ایک جملہ بولنا اس شخص کے لئے دشوار تھا جو بہترین مقرر رہا تھا جس کے سامنے کبھی کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا بیوی کی کیا اوقات تھی اور آج وہ بیوی کے سامنے ایک مکمل جملہ روانی سے بول نہیں پا رہا

تھا۔ان کا لڑکھڑاتا لہجہ، اضطراب جھلکاتی آنکھیں، بے چینی و ہراس کا تاثر دیتا چہرہ دیکھ کر نتاشہ کچھ نہیں بولی تھیں کہ جانتی تھیں کہ اب ان کے بولنے کا کوئی فائدہ ہی نہیں رہا مگر وہ اپنی سوچ پر بند نہیں باندھ سکی تھیں۔ذہن میں ''بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے'' گردش کر رہا تھا اور وہ منظر سے ہٹ گئی تھیں جبکہ وہ کھڑے کھڑے شاہ زیب اور کرزئی سے ملنے اسے سمجھانے کی پلاننگ کرنے لگے تھے۔یہ یکسر بھلائے کہ برسوں قبل انہیں بھی تو آبشار کے بھائیوں نے بہت سمجھانے کی کوشش کی تھی، ان کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑے تھے مگر وہ نہیں سمجھے تھے، جب وہ جڑے ہاتھ پیروں کو نظرانداز کر گئے تھے تو کیا شاہ زیب اور کرزئی ایسا نہیں کرسکتا۔۔۔کیا وہ سمجھ جائے گا، کیا اسے سمجھ جانا چاہئے۔ وہ اس سب سے بالاتر صبح ہونے کا شدت سے انتظار کرنے لگے تھے کہ شاہ زیب اور کرزئی سے مل کر افہام وتفہیم کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کر لیں مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کچھ راتیں زندگی میں ایسی بھی آتی ہیں جن کی کوئی سحر نہیں ہوتی، سورج طلوع تو ہوتا ہے مگر ذلت و بدنامی کی ضیاع لے کر۔۔۔اور جس سے بچنا اتنا آسان نہیں ہوتا کہ ہوتا تو آبشار اور کرزئی اس ذلت سے بچ گئی ہوتیں۔

❁ ❁

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

''آئیکت! بتایئے مجھے کہ آپ نے کیا بول کر مجھے اپنے دوست کے گھر چھوڑا تھا۔'' آبدار کی طرف سے اسے میسج ملا تھا کہ وہ جیسے ہی فرصت ملے، اس سے آ کر ملے۔ اس نے ابسام کو تو ٹال دیا تھا کہ وہ کوشش کرے گا آنا ممکن نہیں کہ آفس اور ہاسپٹل کے چکروں نے اسے گھن چکر بنایا ہوا ہے مگر وہ آبدار کی طرف سے بھی مضطرب ہو گیا تھا اس لئے پیغام ملنے کے اگلے دن وہ ابسام کے گھر چلا آیا تھا۔ آبدار نے پہلے اس سے سب کی خیریت معلوم کی تھی اور آئیکت نے اسے باپ اور شاہ زیب کی طرف سے بھرپور انداز سے تسلی کچھ یوں دی تھی کہ وہ مطمئن ہو گئی تھی اور خیر خیریت کے بعد اس نے اصل موضوع چھیڑ دیا تھا جس کے کرنے کو اسے بلا بھیجا تھا جبکہ وہ بے یقینی سے آبدار کو دیکھنے لگا تھا کہ اس نے غیر متوقع بات کر ڈالی تھی۔

''یہ کیوں پوچھ رہی ہو آبی... کہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں تو اس وقت اس سوال کا کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا۔'' وہ الجھ ضرور گیا تھا مگر ظاہر نہیں کیا تھا۔

''آپ بے شک پہلے بتا چکے ہیں مگر جھوٹ کا پلندہ، اس لیے بہتر ہو گا کہ اب صرف سچ بولیں۔'' وہ ناگواری سے بولتی آئیکت کو غصہ دلا گئی تھی۔

''تمہیں میں جھوٹا لگتا ہوں۔'' وہ خشمگیں نگاہوں سے آبدار کو دیکھ رہا تھا۔

''میں ایسا کچھ نہیں کہہ رہی۔ بہتر ہو گا غصہ کرنے کے بجائے مجھے میرے سوال کا جواب دے دیں۔''

وہ آئیکت کے غصے سے متاثر ہوئے بغیر دھیمے سے اپنی بات پر زور دے کر بولی تھی۔

''میں تمہیں جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔'' وہ کڑے لہجے میں بولا تھا۔

''جواب تو آپ کو دینا ہو گا آئیکت کہ آپ نے مجھ سے غلط بیانی کی... ابسام سے جھوٹ بولا۔''

''کیا غلط بیانی کی ہے میں نے آبدار؟'' وہ غصہ میں آ گیا تھا مگر خود پر کنٹرول کرنے پر مجبور تھا کہ وہ اس وقت اپنے نہیں ابسام کے گھر پر موجود تھا اور وہ کوئی تماشا نہیں لگانا چاہتا تھا۔

''آپ نے ابسام کو کچھ اور کہہ کر مجھے ان کے گھر چھوڑا اور مجھے کچھ اور بتایا۔ یہ سب غلط بیانی و جھوٹ کے زمرے میں نہیں آتا۔'' وہ دونوں لان موجود تھے۔ آئیکت کھڑا ہوا تھا اور وہ کین کی کرسی دھکیلتی عین اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

''ہاں، میں نے ابسام سے جھوٹ بولا کیونکہ سچ بتانے لائق نہیں تھا۔'' وہ اس سے جواب طلبی کر رہی تھی شدید غصہ میں تھی کہ آئیکت نے اس کا بازو دبوچ کر نہایت سرد لہجہ میں کہا تھا اور آبدار کا سارا غصہ تمام تر طنطنہ جھاگ کی مانند بیٹھتا چلا گیا تھا۔ وہ نظر چراتی دو قدم پیچھے ہو گئی تھی۔

''تم مجھ سے نظر چرا رہی ہو جبکہ میں سب جانتا ہوں۔ سب جاننے کے باوجود تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم شرمندہ ہو، ابسام یا اس کی فیملی سے تمہیں نظر چرانی پڑے، تمہاری بے عزتی ہو، اس لیے میں نے ابسام سے جھوٹ بولا کہ حقیقت بتانے لائق نہیں ہے۔'' اس کے نظر چرانے کو وہ صاف محسوس کر گیا تھا اس کے باوجود تلخی سے بولتا چلا گیا تھا جھوٹ کے اسباب سے اسے آگاہ کیا تھا جس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''تم سے ابسام نے کچھ کہا ہے؟'' وہ مزید کچھ کہنے کے بجائے سادہ سا سوال کر گیا تھا اس نے آنسو پونچھتے ہوئے دھیمے سے بتا دیا تھا۔

''ابسام مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں انہیں اصل بات بتا دوں، میں الجھ ضرور گئی تھی مگر ظاہر کیے بنا ابسام کو ٹال گئی تھی۔'' وہ ابسام سے ہوئی بات کا تمام لب لباب اس کے سامنے تفصیل سے رکھ گئی تھی جسے سن کر آئیکت فطری طور پر مضطرب ہو گیا تھا۔

''تم پریشان نہ ہو، میں ابسام سے بات کر کے اسے سمجھا دوں گا۔'' وہ اپنی پریشانی بھلائے اسے تسلی دے رہا تھا جبکہ وہ اچھے سے جانتا تھا کہ وہ اس موضوع پر ابسام سے بات نہیں کر سکتا کیونکہ وہ جھوٹ بول چکا تھا جس کا اعتراف اگر وہ کرتا تو اسے آبدار کے بارے سب بتانا پڑتا اور ایسا کرنا ہوتا تو وہ ہرگز بھی جھوٹ کا سہارہ نہ لیتا۔

''میں جانتی ہوں، ابسام کو سمجھانا آسان ہوتا تو آپ پہلے ہی سمجھا لیتے، جھوٹ کا سہارہ لینے کی آپ کو ضرورت ہی نہ پڑتی، میری شرم ناک حقیقت آپ دوست سے کہہ ہی نہیں سکتے۔'' اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی تھی۔

''بکواس مت کرو آپی اور خود اذیتی سے نکل آؤ۔ خود کو اس جرم کی سزا مت دو جو تم سے سرزد نہیں ہوا۔'' وہ آبدار کو روتا دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر دکھ سے بولا تھا اور اس کے رونے میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''جس سے سرزد ہوا ہے اسے کہاں ڈھونڈوں میں آئیکت۔ اس کی تلاش میں دربدر ہو گئی ہوں مگر اس شخص کا نشاں نہیں ملتا جس کے سبب میں بے نشاں ہوں۔'' وہ اس کے کاندھے سے لگی سسک رہی تھی۔

''محمود خان کا پتہ چل گیا ہے آپی۔'' وہ دھیمے سے بولا تھا اور وہ ایک جھٹکے سے اس کے کاندھے سے سر اٹھا کر حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھنے لگی تھی۔ اور آئیکت نے اسے تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا تھا شاہ زیب کے کارنامے کی بابت اسے بتاتا چلا گیا تھا جسے سن کر وہ دکھ و حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔

''میں نے تمہیں یہاں اسی وعدے کے ساتھ چھوڑا تھا کہ میں محمود خان کو تلاش کر کے اس سے بات کروں گا اور وہ شخص مجھے مل گیا تھا مگر میں اس سے رابطہ نہیں کر پایا تھا سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس سے بات کروں تو کیسے ... کہ اچانک بابا کی طبیعت بگڑ گئی اور شاہ زیب کا ایکسیڈنٹ، تو میں نے محمود خان کو ذہن سے یکسر ہی نکال دیا اور اس دن ہاسپٹل میں جو کچھ میرے علم میں آیا وہ بہت تکلیف دہ ہے آبدار، کہ میں اتنی گہرائی سے کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ مجھے تو صحیح معنوں میں کچھ خبر ہی نہ تھی۔ جانتا تو شاہ زیب تھا جس کے سبب اس نے انتقام کی راہ

چنی۔'' وہ دونوں کین کی کرسیوں پر آ بیٹھے تھے اور وہ بہت مدھم لہجہ میں اس سے مخاطب تھا جو بڑی توجہ سے اسے سن رہی تھی۔

''شاہ زیب بھیا نے بہت غلط کیا ہے آئیکت، وہ لڑکی کیوں اپنے باپ کے جرم کی سزا سہے، اس کے ساتھ شاہ زیب بھیا بہت غلط کر رہے ہیں۔ آپ انہیں سمجھائیں کہ وہ ایسا نہ کریں کہ عزت تو سب لڑکیوں کی سانجھی ہوتی ہے۔'' وہ آئیکت کی بات کے درمیان لاچارگی سے بول پڑی تھی۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں نے شاہ زیب کو سمجھایا مگر وہ کچھ سننے و ماننے کو بالکل بھی تیار نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ محمود خان پر جب خود پڑے گی تو اسے عزت کے مطالب سمجھ آئیں گے... اور سچ کہوں تو آبی مجھے شاہ کی بات درست لگتی ہے اس کا فیصلہ درست لگتا ہے۔'' وہ آئیکت کو ناگواری سے دیکھنے لگی تھی۔

''واٹ ربش آئیکت! آپ مرد ہیں نا اس لیے اتنی آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ شاہ زیب بھیا کا فیصلہ درست ہے... مگر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مرد کے ظلم کا شکار بس عورت ہی ہوتی رہے۔ پہلے آبشار اور کرزئی محمود خان کی ہوس کا شکار ہوئی جس کا جیتا جاگتا ثبوت ہوں میں...'' وہ لحظہ بھر کو رکی تھی اور آئیکت اسے دیکھنے لگا تھا جو لب پر لب جمائے ضبط کے کڑے مرحلوں سے گزر رہی تھی۔

''انتقام کی راہ بہت غلط چنی ہے شاہ زیب بھیا نے کہ ظالم تو محمود خاں ہے، سزا بھی اسے ملنی چاہیے، اس کی بیٹی کو نہیں، برسوں قبل آبشار اور کرزئی کے ساتھ ظلم ہوا تھا، آج شاہ زیب بھیا اس لڑکی پر ظلم کر رہے ہیں۔ اگر ظالم محمود خان تھا تو شاہ زیب بھیا بھی تو ظالم بن گئے ہیں۔ آبشار کی اولاد کو محمود خان نے اپنا نام نہ دے کر بے نشان چھوڑ دیا تھا اور اب یہی شاہ زیب بھیا کرنے جا رہے ہیں۔ وہ بہت غلط کر رہے ہیں۔ انہیں سمجھائیں آئیکت کہ وہ محمود خان کی طرح ظالم نہ بنیں۔'' وہ بری طرح سسک رہی تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر کیسے وہ شاہ زیب کو اس سب سے باز رکھے۔

''شاہ زیب میں مانتا ہوں غلط کر رہا ہے مگر یہ یاد رکھو کہ شاہ زیب کی نہ نیت خراب ہے نہ اس کے کردار میں کوئی جھول ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ہرگز بھی محمود خان سے ہزار ہا نفرتوں کے باوجود اس کی بیٹی سے نکاح نہ کرتا۔ وہ جو کر رہا ہے صرف محمود خان کو سبق سکھانے کے لیے، اس سے انتقام لینے کے لیے کر رہا ہے اور میں شاہ زیب کے طریقے کے خلاف ہونے کے باوجود اس کے ساتھ ہوں۔''

وہ ہرگز بھی آبدار کی طرح جذباتی نہیں ہوا تھا اور اس نے جو کچھ کہا تھا وہ آبدار کو مزید پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔

''نکاح کر لینا کافی نہیں ہے آئیکت کہ جب شاہ زیب بھیا نکاح سامنے لانے کو ہی نہیں راضی، اپنے بچے کو نام دینے سے صاف انکاری ہیں۔ ایسے میں نکاح کی کتنی اہمیت رہ جاتی ہے۔ اپنے عزائم و انتقام کے لیے شاہ زیب بھیا شریعت کی آڑ لے کر شریعت اور شرعی قوانین کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ محمود خان نے جو کیا وہی سب شاہ زیب بھیا بھی کر رہے ہیں۔ تو کیا فرق ہے ان دونوں میں۔ بس یہ فرق کہ ایک نے ہوس کے لیے عورت کا استحصال کیا اور دوسرا اس استحصال کے بدلہ کے لیے شریعت کا جھنڈا لہرا کر دوسری عورت کا استحصال کرنے

جا رہا ہے۔شاہ زیب بھیا انتقام کی آگ میں جلتے اس قدر راندھے ہو گئے کہ اپنی جائز اولاد پر ناجائز کا دھبہ لگانے جا رہے ہیں۔۔۔اور اب ان کا ساتھ دے رہے ہیں یہ تو سوچیں کہ محمود خان نے تو صریح گناہ کیا تھا۔۔۔اور شاہ زیب بھیا اپنے ایک جائز اور شرعی فعل کو گناہ بنانے جا رہے ہیں۔آبشار اورکزئی اگر مظلوم تھی اس کے بچے کو اس کے باپ کا نام نہیں ملا تھا تو اتنا غلط نہ تھا کہ آبشار اورکزئی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی لیکن وہ لڑکی اس نے تو شاہ زیب بھیا سے محبت کی، بھروسہ کیا، یہی ہے اس کی محبت کا صلہ، بھروسہ کا انجام کہ وہ دنیا سے منہ چھپائے، اپنے بچے کے باپ سے، شرعی و قانونی باپ سے اپنے بچے کو اپنا نام دینے کے لیے بھیک مانگے۔مت دیں غلط کا ساتھ آئیکت کہ محمود خان سے بڑا گناہ کرنے جا رہے ہیں شاہ زیب بھیا، ان کا ساتھ دینے کے بجائے انہیں سمجھائیں کہ وہ ایسا نہ کریں۔خدا کے عذاب سے ڈریں کہ ایک پاکباز عورت کا دامن داغدار کر دینا اگر گناہ ہے تو پاکباز عورت کے دامن پر کیچڑ اچھالنا بھی گناہ ہے اور گناہ کا ساتھ دینے والا بھی گناہگار ہوتا ہے۔'' وہ روتے ہوئے جو کچھ کہنا چاہتی تھی کہہ گئی تھی اور اس کی باتیں تلخ ضرور تھیں مگر حقیقت پر مبنی تھیں۔آئیکت کا دل کانپ اٹھا تھا وہ آگے سے کچھ کہتا کہ وہ وہاں ٹھہری نہ تھی اور تقریباً بھاگتے ہوئے وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔اس کے وہاں ٹھہرنے کا جواز ہی ختم ہو گیا تھا۔وہ جانے کے ارادے سے مڑا تھا کہ کب سے ان کی باتیں سنتا ابسام حیدر یکدم آئیکت کے سامنے آ گیا تھا ابسام کے چہرے پر خفگی و بیگانگی تھی جو صاف بتا رہی تھی کہ وہ ان کی باتیں سن چکا ہے۔آئیکت یکدم ہی نظریں چرا گیا تھا۔

''نظریں مجرم چراتے ہیں آئیکت اورکزئی۔'' وہ مدھم لہجے میں بولا تھا۔

''میں تمہارا مجرم ہی تو ہوں ابسام، تم سے جھوٹ بولا، تمہیں دھوکا دیا، نظر ملانے کے قابل ہی نہیں رہا۔'' آئیکت مجرمانہ انداز میں بولا تھا۔

''جھوٹ نہیں بولا تم نے آئیکت، میری دوستی کے منہ پر تھپڑ لگایا ہے، میری دوستی پر بھروسہ نہیں کر سکے تم، تف ہے ہماری دوستی پر آئیکت۔'' وہ نہایت غصہ سے بولا تھا۔

''ایسے مت کہو ابسام۔۔۔ایک تمہاری دوستی پر ہی تو بھروسہ ہے۔۔۔اور یہ تم پر بھروسہ ہی تھا کہ میں نے آبدار کو تمہارے گھر چھوڑا۔'' وہ ابسام کی بات قطع کر کے اس کی بات کی نفی میں زور دے کر بولا تھا۔

''بھروسہ ہوتا تمہیں مجھ پر، میری دوستی پر آئیکت تو ہرگز بھی جھوٹ کا سہارا نہ لیتے تم، بھروسہ کرنے کا دعویٰ کیا محض اور بھروسہ۔۔۔یہ تھا تمہارا میری دوستی پر یقین کہ تم نے مجھ سے غلط بیانی کی، جھوٹ بول کر آبدار کو میرے گھر چھوڑا۔بھروسہ ہوتا نا آئیکت تو تم سچائی کے ساتھ آبدار کو اپنے گھر میں رکھنے کی مجھ سے بات کرتے۔تم نے آدھا ادھورا بھروسہ کیا اور یاد رکھنا ادھورا پن ہمیشہ تکلیف دیتا ہے اور آج تمہارا ادھورا اعتماد میری دوستی کے مان کو کرچی کرچی کر گیا ہے۔بہت تکلیف پہنچی ہے مجھے تمہارے عمل سے آئیکت۔اور اس کے لیے میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔'' ابسام حیدر نہایت دکھی نظر آ رہا تھا۔آئیکت کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ کیسے ابسام کو سمجھائے کہ جھوٹ بولا ضرور اس نے مگر اس کی نیت غلط نہ تھی۔آبدار کا مسئلہ ہی اتنا حساس اور نازک تھا کہ وہ خود سے کہتے ڈرتا تھا، ذلت محسوس کرتا تھا، دوست

سے کیسے سب کہتا کہ اپنے منہ سے اپنی بربادی کی داستان بیان کرنا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا جتنا ابسام سمجھ کر اس پر لعن طعن کر رہا تھا۔

''میں چاہوں بھی تو اپنی صفائی نہیں دے سکتا ہوں ابسام، بہر حال غلطی مجھ سے ہوئی ہے اور میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔'' وہ جاتے ہوئے ابسام کی پشت دیکھتے ہوئے بولا تھا اور اس کے اٹھتے قدم تھم گئے تھے۔ اس نے پلٹ کر آئیکت کی جانب دیکھا تھا۔

''جو بات خود سے کہتے مار دیتی ہے وہ بات تم سے کیسے کہتا ابسام، کچھ حقیقتیں اس قدر تلخ ہوتی ہیں کہ انسان کا جسم زندہ رہتا ہے مگر تلخیاں روح میں شگاف یوں پیدا کرتی ہیں کہ روح مردہ ہو جاتی ہے، اور اس واقعہ کے بعد ہمارے خاندان کے ایک ایک فرد نے زندگی کو محض گزارا ہے، جیا نہیں ہے، کہ جس زندگی میں سے عزت نکل جاتی ہے وہ زندگی صرف نظر آتی ہے محسوس نہیں ہوتی ابسام۔'' آئیکت کی آنکھیں بے حد سرخ ہو گئی تھیں اس کا لہجہ بری طرح کانپ رہا تھا ابسام کو یکدم اپنی جذباتیت پر افسوس ہوا تھا۔

''آئی ایم سوری آئیکت۔ مجھے بے حد شرمندگی ہے کہ میں نے حقیقت اور اسباب کو محسوس کرنے کے بجائے جذباتیت کا ثبوت دیا۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔'' وہ آگے بڑھ کر آئیکت کے کاندھے پر ہاتھ رکھ گیا تھا۔

''شرمندہ تو میں تم سے ہوں ابسام، نظر تک ملانے کے قابل نہیں رہا۔'' آئیکت احساس ذلت کو سوا ہوتا محسوس کر رہا تھا۔

''بکواس مت کرو، میں اور تم الگ نہیں ہیں آئیکت، تمہارا دکھ میرا بھی دکھ ہے۔ باخدا آج جو مجھے پتہ لگا تم وہ سب بتا کر آبدار کو یہاں چھوڑتے میں تب بھی انکار نہ کرتا۔ تم میرے دوست ہو اور تمہارے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔ یہ مت بھولنا کہ تمہاری عزت میری بھی عزت ہے۔ تم اگر مجھ پر بھروسہ کرتے ہو تو میں اس بھروسے کی لاج رکھوں گا انشاء اللہ۔'' وہ آئیکت کے زرد پڑ جانے والے چہرے کو دیکھتے ہوئے نہایت سچائی سے بول رہا تھا۔ آئیکت نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر ہمت نہ ہو پائی تو لب بھینچ گیا تھا اور ابسام اس کے کچھ نہ کہنے پر بھی سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

''تم فکر مت کرو میں آبدار پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دوں گا کہ میں سب کچھ جان گیا ہوں۔'' ابسام کے بولنے کی دیر تھی کہ آئیکت اس کو تشکر بھری نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

''میں تا حیات تمہارا احسان مند رہوں گا۔ زندگی کبھی مجھ پر مہربان ہوئی اور مجھے اس قابل کیا کہ میں تمہارے کام آ سکوں تو اس احسان کے بدلے نہیں، مگر تمہارے خلوص کے جواب میں، میں ضرور تمہارے لیے مددگار ثابت ہوں گا۔'' وہ ابسام کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر گرمجوشی سے دباتا یکدم پلٹ کر باہر کی جانب بڑھتا چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

''ماما، پلیز بتائیے نا، شاہ سے آپ کی کیا بات ہوئی؟'' وہ کل شام سے کمرہ میں بند تھیں اس لیے عریم چاہ کر بھی بات نہیں کر پائی تھی۔ ناشتہ کی ٹیبل پر بھی وہ غائب تھیں اور اسے یہ تک نہیں پتہ چلا تھا کہ محمود خان کب آفس گئے۔ گیارہ بجے کے قریب اسے ناشتہ، چائے

کے مگ، کے ساتھ لاؤنج میں نظر آئی تھیں اور وہ جو کل شام سے بے چین تھی اس نے اس موقع کو غنیمت جانا تھا اور تمہید باندھے بغیر ڈائریکٹ اپنے مطلب کی بات کر گئی تھی وہ جو ہزار سوچوں کے گرداب میں پھنسی ہوئی تھیں چونک کر بیٹی کو دیکھا تھا اس کے خوبصورت چہرے پر کتنی ہی بے چینی تھی۔ زندگی و موت کی سی کشمکش محسوس ہوئی تھی۔

''اگر لاعلمی ہے تو حالت مرنے والوں کی سی ہے۔۔۔ اگر جو آگاہی کے در کھل گئے تو جانے کیا حال ہوگا۔ اگلی سانس لے بھی پائے گی کہ نہیں۔'' انہوں نے بیٹی کی دگرگوں حالت کو دیکھ کر بے بسی سے سوچا تھا۔

''میری شاہ زیب اور کزئی سے ملاقات نہیں ہوسکی وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کر کچھ دیر قبل ہی گھر جا چکا تھا اور میری اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ میں اس کے گھر جاتی۔ میرے اندر کسی کا بھی سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں رہا۔'' ان کا لہجہ ٹوٹا بکھرا تھا وہ بیٹی کو اصل بات بتا نہیں سکتی تھیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس سے زیادہ دن یہ سب چھپا نہیں رہے گا اس کے باوجود جھوٹ کا سہارا لیا تھا اور وہ تو جیسے ماں کی بات سن کر ہی ادھ موئی ہوگئی تھی صوفہ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتی چلی گئی تھی۔

''تم رو نہیں عرمی، حوصلہ رکھو۔ زندگی جب امتحان لے نہ تو ہمت نہیں ہارتے۔ اپنی مسخ شدہ حالت سے ایک نیا وجود تراشتے ہیں۔ تمہیں بھی ایسا کرنا ہوگا ورنہ زندگی کے اس امتحان میں فیل ہو جاؤ گی اور تم فیل ہوگئیں نا عرمی، تو تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اس لئے تم نے اپنا مان، اپنا وقار، اپنی عزت بچانے کے لیے خود سے کوشش کرنی ہوگی۔ سن رہی ہو نا میری بات، تمہیں اپنے بچاؤ کے لیے خود ہاتھ پیر مارنے ہوں گے۔'' وہ اپنے آنسو صاف کرتیں عجیب پراسرار لہجہ میں بول رہی تھیں وہ رونا بھول کر ماں کو دیکھ رہی تھی جن کی آنکھیں بے حد سرخ تھیں، چہرے پر تفکرات کی لکیریں کچھ یوں پھیلی تھیں کہ اسے آج پہلی دفعہ اپنی ماں بوڑھی لگی تھی اور وہ صوفہ سے اٹھ کر ماں کے قدموں میں آ بیٹھی تھی۔

''ماما! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے۔ میں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی مگر شاہ کی محبت نے مجھے اندھا کر دیا، مجھے آپ کی تربیت، پاپا کا وقار کچھ نظر نہ آیا، مجھے شاہ کے علاوہ کچھ بھی نظر نہیں آیا ماما، اور میں بس وہی کرتی چلی گئی جو شاہ نے کہا، جیسا شاہ نے چاہا اور شاہ کی چاہ پوری کر کے آج میں آپ کی اور پاپا کی مجرم بن گئی ہوں۔ مجھے معاف کر دیں ماما، میں نے بہت غلط کیا ہے ماما، پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' وہ ماں کے پاؤں پکڑے روتے، بلکتے ہوئے معافی کی خواستگار تھی۔ وہ بیٹی پر غصہ ہونا چاہتی تھیں، نفرت کرنا چاہتی تھیں مگر ان کے تمام تر احساسات منجمد ہو گئے تھے کہ ان کی بیٹی تو خود مجبور تھی۔ وہ محض ایک مہرہ تھی، جو کسی بھی وقت پٹ سکتا تھا۔ کسی بھی وقت ذلت آمیز شکست اس کا مقدر ہوسکتی تھی... اور جو خود عذابوں میں گھرا ہوا تھا، جو خود کسی کے جرم کی سزا پانے جا رہا تھا، وہ اس سے کیا کہتیں، کیسے نفرت سے جھڑکتیں کہ ان کا غصہ تو ہمدردی کی پھوار سے جل تھل ہوا جا رہا تھا۔ انہوں نے نم پلکوں کے ساتھ بیٹی کو خود سے لگا لیا تھا۔

''یا اللہ! میری بیٹی بہت معصوم ہے۔ بس ذرا بھٹک گئی تھی اور اس کو اس کے بھٹکنے کی سزا نہ دینا یا رب۔ میری بیٹی کا ہر گناہ بخش دے،

ہر وہ لمحہ جو اس نے والدین کی نافرمانی میں گزارا میں اسے ہر وہ لمحہ معاف کرتی ہوں۔ میرے مولا، تو بھی معاف کر دے۔ میری بیٹی کو اس امتحان میں نہ ڈال جس کا بار اس کے ناتواں کاندھے اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے۔ معاف کر دے باری تعالیٰ۔ اور اس کی ہر پریشانی ہر کلفت کو اپنے کرم، مہربانی اور رحمت سے آسانی میں بدل دے۔'' وہ بیٹی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اپنے پروردگار سے مناجات کر رہی تھیں کہ وہ جانتی تھیں کہ جس دوراہے پر وہ اور ان کی بیٹی آن کھڑے ہوئے ہیں اس منجدھار سے ایک بس دعا کا سفینہ ہی ابھار سکتا ہے کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے اور وہ اس ہتھیار کو عجز وانکساری کے ساتھ استعمال کر رہی تھیں اور کہتے ہیں کہ ماں کی دعا عرش کو چھو لیتی ہے جا کر... بس اب دیکھنا یہ تھا کہ شدتوں سے گڑگڑا کر مانگی اس ماں کی دعا شرفِ قبولیت کی سند پا لینے والی تھی یا کڑا امتحان مقدر ہونے کو تھا۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھیں، جانتی تو عریم بھی کچھ نہ تھی اگر جانتی ہوتی کہ اللہ کے احکام کی روگردانی کی سزا جب دنیا میں ہی ملتی ہے تو بڑی سخت اور کبھی کبھی ذلت آمیز بھی ہوتی ہے تو وہ کبھی بھی شاہ سے فون پر باتیں نہ کرتی۔ کبھی اس سے چھپ چھپ کر ملاقاتیں نہ کرتی، کبھی شاہ کی باتوں میں نہ آتی۔ والدین کو دھوکا دے کر اس سے نکاح نہ کرتی مگر وہ یہ پہلے کیسے سمجھ سکتی تھی کہ وہ دوسروں کے تجربات سے فیضیاب ہونے والوں میں سے نہ تھی۔ وہ ٹھوکر کھا کر سنبھلنے والوں میں سے تھی۔ ٹھوکر لگ چکی تھی، ادراک ہونا باقی تھا اور سنبھلنا۔ ٹھوکر لگتی ہے تو انسان سنبھل ہی جاتا ہے اور جو نہیں سنبھلتا دوسری، تیسری ٹھوکر ان کی منتظر رہتی ہے۔

☆......☆......☆

''دادو! آپ کیا مجھ سے ناراض ہیں؟'' حاجرہ ابراہیم نے نوائم سے بات کے بعد سے جان کر مومل کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا اور جس کا نتیجہ تھا کہ وہ محض تیسرے دن ہی تشویش کے ساتھ سوال لیے ان کی خدمت میں حاضر ہو گئی تھی۔

تم نے ایسا کچھ کیا ہے جو میں ناراض ہوں گی۔'' وہ الٹا پوتی سے سوال کر گئی تھیں جس کے خوبصورت چہرے پر الجھن در آئی تھی جسے وہ صاف محسوس کر گئی تھیں کہ ان کی پوتی کو اپنے تاثرات چھپانے نہیں آتے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ جتنی خوبصورت ہے، اتنی ہی نخریلی بھی ہے اور پل پل بدلتے مزاج کے ساتھ بے حد موڈی ان کی پوتی منہ پھٹ ہونے کے ساتھ اپنے جذبات چھپانے کے معاملے میں بالکل کوری ہے اور نوائم کے ذکر سے قبل بھی جانتی تھیں کہ مومل، عبیر کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے کہ عبیر کو دیکھ کر اس کے منہ کے بنتے زاویے کئی بار انہوں نے براہ راست محسوس کیے تھے اور جب عبیر کا رشتہ آیا تھا تو صرف عبیر کی اچھائی پر نظر رکھ کر رشتہ قبول کر لیا گیا تھا کہ پوتی کی ناپسندیدگی کی اول تو ٹھوس وجہ ہی نہ تھی اور دوم یہ کہ وہ عبیر کو ہر لحاظ سے مومل کے قابل سمجھتی تھیں اور ان کا تجربہ کہتا تھا کہ مومل بے وقوفی کر رہی ہے اس لیے انہوں نے پوتی کی ناپسندیدگی کو کسی خاطر میں ہی لانے کی کوشش نہ کی تھی۔۔۔ اور جب پاکستان جانے کے مسئلے کو بنیاد بنا کر مومل نے رشتہ سے انکار کیا تھا تو وہ بہت چاہ کر بھی مومل کو عبیر کے معاملے میں راضی کرنے کے لیے خود کو آمادہ نہیں کر پائی تھیں مگر نوائم نے جس طرح جس شدت سے عبیر کے جذبات ان تک پہنچائے تھے اس کے بعد وہ مومل کو عبیر سے شادی کے لیے راضی کرنے کا فیصلہ کر

چکی تھیں کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ عبیر کے ساتھ زیادتی ہو۔ اس کی محبت ادھوری رہ جائے اور اس کی زندگی میں خلا آجائے۔ فیصلہ پر عمل درآمد کے لیے وہ موئل سے گزشتہ دو ایام سے کچھ کھچی کھچی سی تھیں اور موئل سے یہ کہاں برداشت ہوا تھا۔

''ایسے کیوں بول رہی ہیں دادو، اگر آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے تو صاف کہہ دیجئے پلیز۔ میں آپ سے سوری کرلوں گی۔'' وہ دھیمے مگر روہانسے لہجے میں بولی تھی۔

''مجھے تمہاری کوئی بات بری نہیں لگی ہے فضول میں وہم مت پالو۔ اور آخری بار چیک کرلو کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ پاکستان تو پہلے ہی پسند نہیں آیا تھا... اب کوئی چیز یہاں بھول کر جاؤ گی تو الزام پاکستان پر لگا بیٹھو گی کہ یہاں تو کچھ ہے ہی نہیں، غریب ملک ہے وغیرہ وغیرہ۔'' انہوں نے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدلا تھا اور وہ چونک کر دادی کو دیکھنے لگی تھی۔ ان کے چہرے پر ناراضگی کی ہلکی سی لکیر تھی یکدم اس کے ذہن میں کچھ کلک ہوا تھا۔

''آپ مجھ سے اس لیے تو ناراض نہیں ہیں کہ میں نے پاکستان میں ہمیشہ رہنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔'' وہ دھیمے سے پوچھ رہی تھی اور وہ پوتی کی ذہانت کی کچھ اور قائل ہو گئی تھیں کہ گھر میں تین لڑکیاں تھیں۔ نوائم، موئل اور کومل۔ تینوں میں موئل سب سے زیادہ ذہین تھی۔ یہ بات اس نے تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے بھی ثابت کی تھی اور اپنی روزمرہ زندگی میں بھی۔

''تمہیں اپنی پسند بتانے کا حق حاصل ہے اس لیے ناراضگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فضول میں دماغ مت چلاؤ۔ کہہ رہی ہوں نا میں ناراض نہیں ہوں۔ اب کیا لکھ کر دوں۔'' انہوں نے اب کے غصہ کا اظہار کیا تھا۔

''میں سمجھ گئی ہوں کہ یہی بات ہے مگر دادو، آپ نے خود مجھ سے میری پسند پوچھی تھی۔ میں نے بتا دی تو آپ ناراض ہو گئیں۔'' وہ آنکھوں میں آنسو لیے دادی کو دیکھ رہی تھی۔

''سچ بول رہی ہوں ناراض نہیں ہوں۔ بس امید نہیں تھی کہ تمہارا جواب میری مرضی و پسند کی مخالفت میں ہوگا اس لیے دکھ ہے اب تک۔'' وہ آزردگی سے بولتیں موئل کے اضطراب کو کئی گنا بڑھا گئی تھیں۔

''دادو، ایسی بات تھی نا تو آپ مجھ سے میری پسند پوچھتی ہی نہیں۔ میں آپ کی مرضی پر سر جھکا دیتی۔'' اس کی آنکھوں میں بے چینی کے ڈورے ہلکورے لینے لگے تھے۔

''کیا تمہیں عبیر ناپسند ہے؟'' وہ براہ راست اس سے سوال کر گئی تھیں اور وہ دادی کو دیکھنے لگی تھی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے دادو۔'' وہ دادی کو اپنی طرف جانچتی نگاہوں سے تکتا پا کر بے چارگی سے نگاہ چرا گئی تھی۔

''پھر کیسی بات ہے مومی، کیا دادو سے شیئر نہیں کرو گی۔'' وہ اس کا مومی ہاتھ اپنے بوڑھے ہاتھوں میں تھام گئی تھیں۔

''آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہو جائیں گی۔'' وہ کچھ کہتے ہوئے ڈر رہی تھی انہیں اپنی پوتی اس پل بے حد معصوم لگی تھی۔ موئل بے

حد شدت پسند لڑکی تھی۔ پسند، ناپسند ہر معاملے میں... اور جو لوگ اسے پسند تھے جن سے وہ محبت کرتی تھی ان کو کھونے سے بہت ڈرتی تھی۔اسے یہ خیال ہی پریشان کر دیتا تھا کہ کوئی اس سے ناراض نہ ہو جائے۔

''میں اپنی مومی سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔'' انہوں نے نرمی سے اس کے ہاتھ کو دبایا تھا جس سے اسے بولنے کا حوصلہ ہو گیا تھا۔

''دادو، مجھے عبیر بالکل بھی اچھا نہیں لگتا، میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ نظر جھکا کر منمناتے ہوئے لہجہ میں بولی تھی۔

''یہ بات تھی تو تم نے اس وقت مجھ سے کچھ کیوں نہیں کہا جب عبیر کا پرپوزل آیا اور منظور بھی کر لیا گیا۔کیا تمہیں ہم پر اعتبار نہیں تھا کہ اگر تم اپنی پسند کہو گی تو اسے اہمیت دیں گے۔'' وہ اسے ناراضگی سے دیکھ رہی تھیں جس نے ترنت نفی میں گردن ہلائی تھی۔

''میں انکار کرنا چاہتی تھی مگر جب پاپا نے کہا کہ انہیں اپنی بیٹی پر بھروسہ ہے وہ وہی فیصلہ لے گی جو وہ چاہیں گے،تو دادو، یہ سننے کے بعد میں کوئی دوسرا فیصلہ کیسے لے سکتی تھی۔'' وہ اب باقاعدہ رو رہی تھی اور انہیں اپنی پوتی پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا، وہ اس پر فخر محسوس کر رہی تھیں۔

''میں نے وہی فیصلہ لیا جو میرے پاپا کی خوشی و مان سے جڑا تھا... اور جب پاپا نے خود مخالفت کی تو میں نے ان کے اس فیصلہ کو بھی مان دیا مگر ساتھ اب میں نے اپنی پسند بھی بتا دی اور دادو، اگر پاپا اب بھی میری پسند نہ پوچھتے اور حق سے فیصلہ کرتے تو میں اب بھی چپ رہتی باوجود اس کے کہ میں عبیر کو پسند نہیں کرتی۔'' اس نے دھیرے سے اپنے آنسو صاف کر ڈالے تھے۔

''میں جانتی ہوں... مگر پھر بھی چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی عبیر سے ہو۔'' وہ پوتی کے چپ ہو جانے کے بعد بولی تھیں اور وہ بے یقینی سے دادی کو دیکھنے لگی تھی۔

''عبیر میں کوئی برائی نہیں ہے اور میں اسے ہر لحاظ سے اسے تمہارے لائق سمجھتی ہوں۔'' وہ مسکرائی تھیں۔

''باوجود اس کے دادو کہ وہ مجھے ناپسند ہے۔'' وہ دادی کو ناراضگی سے دیکھنے لگی تھی اور ان کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔

''ہاں تمہاری ناپسندیدگی کے باوجود... کیونکہ تم ابھی اپنا اچھا برا نہیں سمجھتیں... اور یاد رکھنا والدین کبھی بھی اولاد کا برا نہیں چاہتے۔ہم اگر عبیر کو تمہارے لیے منتخب کر رہے ہیں تو کچھ سوچ کر ہی کر رہے ہیں۔'' وہ اس کا ہاتھ تھام گئی تھیں جس کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے تھے۔

''دادو، کیا میری ناپسندیدگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' آنکھیں بے اختیار چھلک پڑی تھیں۔

''پسند کا کیا ہے بیٹا چند دن میں بدل جاتی ہے اور نکاح کے دو بولوں میں تو بہت طاقت ہے... دو اجنبی یک جان ہو جاتے ہیں... آج اگر تم عبیر کو ناپسند کرتی بھی ہو تو مجھے پورا یقین ہے نکاح کے بعد تمہارے جذبات بدل جائیں گے۔'' وہ نہایت نرمی و حلاوت سے اس کا ہاتھ دھیرے دھیرے تھپکتے ہوئے بول رہی تھیں۔

''دادو، آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میری شادی عبیر سے ہی ہو... عبیر دنیا کا آخری مرد تو نہیں ہے۔'' وہ چاہ کر بھی ناگواری چھپا نہیں

پائی تھی وہ تلخ ہوگئی تھی اور وہ یکدم ہی ہنس دی تھیں۔

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ تمہاری دادی نے یہ بال دھوپ میں سفید کئے ہیں۔'' انہوں نے خفا ہو کر اور پیاری لگتی پوتی کی ناک کھینچی تھی۔

''چندا، تجربہ اور پرکھ کہتی ہے کہ دنیا میں ایک واحد عبیر عباسی ہی ہے جو میری پگلی، غصیلی، نہایت موڈی پوتی کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس کے نخرے اٹھا سکتا ہے، اسے بہت زیادہ خوش رکھ سکتا ہے۔'' وہ قدرے شرارت سے بولی تھیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو کر یکدم ہی جھکتا چلا گیا تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ اپنے جذبات پر قابو پانا بہت مشکل ہوتا ہے اور ایک ناپسندیدہ شخص کی رقابت قبول کرنا مشکل ترین امر ہے مگر جب تم اپنی ناپسندیدگی کو بھول کر غیر جانبداری سے فیصلہ کرو گی، ہم سب کی پسند کو سوچو گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شخص جو تمہیں ناپسند ہے وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ چاہے جانے کے احساس کو محسوس کرو گی تو ناپسندیدگی ختم ہو جائے گی کہ منفی جذبے کو مثبت جذبے سے فتح صرف احمق لوگ حاصل کرنے دیتے ہیں اور میں جانتی ہوں میری مومی احمق نہیں ہے۔'' وہ اس کے ہوا سے اڑتے بالوں کو نرمی سے کان کے پیچھے کرتے ہوئے کسی سہیلی کی طرح بول رہی تھیں۔ وہ کام جو ہزار کوششوں کے بعد بھی نہایت بے لوث کاوشوں کے بعد بھی نوائم نہیں کر پائی تھی وہ حاجرہ بیگم کر گئی تھیں کیونکہ یکدم مول کو دادی کی بات ٹھیک لگی تھی۔

''دادو، مگر میں پاکستان نہیں جانا چاہتی۔ بات عبیر کو ناپسند کرنے کی نہیں ہے، کسی اور کا بھی پرپوزل ہوتو میں پاکستان کبھی نہ جاؤں۔'' وہ دادی کے قائل کرنے پر اپنے جذبات تو بدل نہیں پائی تھی ہاں قائل ضرور ہوگئی تھی تب ہی اس نے اس سب واقعہ کی اصل وجہ ان کو یاد دلائی تھی۔

''بات صرف پسند اور محبت کی ہی ہوتی ہے مومی، اگر عبیر کے رشتہ کو دل سے قبول کر لوگی تو وہ جہاں رہے گا۔ جہاں رکھے گا تم بخوشی رہ لوگی، ہاں رشتہ ہی قبول نہ ہوگا تو اس میں بھی ہزار کیڑے نظر آئیں گے اور اس کا ساتھ کہیں اور جا کر رہنے پر بھی ہزار اعتراضات محسوس ہوں گے۔ بات صرف سوچ بدلنے کی ہے۔'' وہ اب کے گہری سنجیدگی سے بولی تھیں اور وہ دادی کو دیکھنے لگی تھی۔

''تمہاری پھپھو بھی پاکستان جانے کے نام سے اتنی ہی چڑتی تھیں جتنی تم... مگر جذبات بدلے تو سوچ بھی بدل گئی۔ اس ملک میں جہاں وہ چار گھنٹوں میں ہی پریشان ہوگئی تھی، واپسی کے لیے شور ڈال دیا تھا۔ حیدر سے محبت کیا ہوئی اس میں جا بسی۔ یاد رکھنا جگہ اہم نہیں ہوتی لوگ اہم ہوتے ہیں، اور جب ہم کسی کو چاہنے لگتے ہیں یا کسی کی چاہت کو محسوس کرنے لگتے ہیں تو ہمیں صرف اس کا ساتھ چاہیے ہوتا ہے اور ہر وہ جگہ ہمیں اچھی لگنے لگتی ہے جہاں اس مہربان شخص کا ساتھ، ساتھ ہوتا ہے۔'' وہ نرمی سے بولتی جا رہی تھیں اور وہ سر جھکائے لب کچلتی مضطرب سی ان کے سامنے تھی۔

''میں جانتی ہوں عبیر کے لیے ابھی تمہارے جذبات کچھ خاص نہیں ہیں... مگر اپنی دادی کے لیے تو ہیں نا...''

وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی تھی وہ اس کے دیکھنے پر مسکرائی تھیں اور سوالیہ نگاہ سے دیکھنے لگی تھیں جس پر اس نے محض اثبات میں سر

ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

''تم عبیر کے لیے عبیر سے شادی نہ کرو اپنی دادو کی خوشی کے لیے اس کا ساتھ قبول کر لو یہ بات بھلا کر کہ وہ تمہیں کہاں، کس حال میں رکھے گا... کہ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ تمہیں بہت سکھ میں رکھے گا... کہ جن سے محبت ہوتی ہے انہیں دکھ نہیں دیا جاتا... اور عبیر تم سے محبت کرتا ہے یہی بات میرے اطمینان کے لیے کافی ہے۔'' وہ اس کے لئے ہر راہ جیسے بند کر گئی تھیں۔ پاکستان جانے کے موضوع پر جو اس کے لئے بچاؤ کا ایک روزن کھلا تھا وہ بھی آج انہوں نے بند کر ڈالا تھا۔

''دادو! مجھے آپ لوگوں کے فیصلہ پر پہلے بھی کوئی اعتراض نہ تھا... آج بھی نہیں ہے کیونکہ میرے لیے میری مرضی، میری خوشی سے زیادہ آپ سب کی مرضی وخوشی اہمیت رکھتی ہے اور آپ سب کی یہی مرضی ہے کہ میں عبیر سے شادی کروں تو دادو، آپ کبیر انکل کو ہاں کر دیں، ان سے کہہ دیں کہ مجھے پاکستان جانے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ دھیمے مگر فرمانبردارانہ لہجہ میں بولتی ان کے سامنے سے اٹھی تھی اور کمرے سے نکلتی چلی گئی تھی۔ اس کے انداز کی شکست نے انہیں مضطرب ضرور کیا تھا مگر وہ جو کرنے جا رہی تھیں اس پر مطمئن تھیں۔ انہیں اس کا مستقبل خوش آئند و محفوظ نظر آ رہا تھا اس لئے دل ہی دل میں مناجات کرتیں وہ پر سکون سی سونے کی تیاری کرنے لگی تھیں۔

☆......☆......☆

''آئیکت! مجھے سمجھانے میں اپنا وقت ضائع نہ کرو کیونکہ میں سمجھ کی حدود سے باہر نکل آیا ہوں۔ میں جو کر رہا ہوں وہ درست کر رہا ہوں۔'' وہ آج کچھ گھنٹوں پہلے ہی ہاسپٹل سے ڈسچارج ہو کر گھر آیا تھا۔ ڈاکٹرز اس کی جانب سے کافی مطمئن تھے کہ اس نے اپنی قوت ارادی کے ذریعے ڈاکٹرز کی امید اور توقع سے زیادہ جلدی ریکور کیا تھا اور ڈاکٹرز کو اس کی ریکوری کے باعث لگنے لگا تھا کہ وہ چند ماہ میں پھر اپنے پیروں پر چلنے لگے گا، کل سے ایک فزیوتھراپسٹ آنے والا تھا۔ ڈاکٹرز حیران تھے۔ شاہ زیب اس قدر مطمئن تھا کہ وہ جلد از جلد بستر چھوڑنا چاہتا تھا وہ اس لاچار سی حالت میں کم از کم اپنے دشمن محمود خان کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا جب دو دن قبل نتاشہ محمود اس سے آ کر ملی تھیں تو اسے اپنی حالت پر غصہ آیا تھا اور اس کے بعد ہی اس میں حیرت انگیز ریکوری دیکھنے میں آئی تھی کہ اُس نے اپنی بیماری کو سر پر سوار نہیں کیا تھا اور نتاشہ محمود سے ملنے کے بعد اس میں ول پاور اور اسٹرانگ ہو گئی تھی کہ وہ محمود خان کا سامنا اس حالت میں نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''تم درست نہیں کر رہے شاہ زیب، یہ تو سوچو کہ محمود خان کے کیے کسی بھی عمل میں اس کی بیٹی کا کیا قصور، تم اس کو کیوں کانٹوں پر گھسیٹ رہے ہو، کیوں اس کے لیے ذلت بھری دلدل تیار کر رہے ہو۔'' آئیکت اسے سمجھانے میں ناکام ہوا جا رہا تھا تب ہی اب اس نے جذباتیت کا سہارا لیا تھا۔

''ذلت بھری دلدل تو محمود خان نے بوا کے لیے تیار کی تھی جس میں ہم سب پور پور دھنس گئے تھے۔ اب وہی دلدل محمود خان کا نصیب بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔'' وہ تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا وہ جو اٹھنے کی سکت نہیں رکھتا تھا اپنی ول پاور کے ذریعے وہ اٹھ بیٹھا

تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ پچھلے دس منٹ سے نیم دراز حالت میں بیٹھا تھا اور پچھلے سات منٹ سے شدید تکلیف محسوس کرنے کے باوجود ضبط سے گزر رہا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ یہ ضبط ہی اسے جلد از جلد صحت یاب کرے گا کہ اس نے دوائیوں اور علاج کے ساتھ ساتھ سب کچھ اپنی ول پاور کے ذریعے ہی نارمل کرنا تھا۔ آئیکت نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا اس کے تاثرات ہی سب کچھ فنا کر دینے والے تھے وہ اس کے پاس بیڈ پر آن ٹکا تھا۔

''محمود خان کو تو میں بھی کسی بھی قسم کی رعایت دینے پر تیار نہیں ہوں۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو بیچ چوراہے پر کھڑا کر کے اسے سنگسار کر دیتا مگر اس سے جو نفرت ہے، اس کے لیے جو انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے اس میں اس کی بیٹی کو جھونک دینا غیر اخلاقی اور انسانیت سے عاری عمل ہے۔ محمود خان کے کئے کی سزا اس کی بیٹی کو دینا انسانیت کی توہین ہے شاہ زیب۔'' وہ اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے یوں بولا تھا جیسے اسے قائل کر لے گا مگر دوسرے ہی لمحہ اس پر آشکار ہوا تھا شاہ زیب کو قائل کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے وہ جو اس سے معمولی معمولی باتوں میں بھی جیت نہیں پایا تھا یہ اتنی بڑی بات، اتنا بڑا کارنامہ جو اس نے بہت سوچ سمجھ کر سر انجام دیا تھا اس سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کم از کم آئیکت کی چند دلیلوں کے ذریعے نہیں لے سکتا تھا وہ اس کے چہرے، آنکھوں سے ''میں نہ مانوں'' کی ہٹ دھرم تحریر پڑھتا اس کے بیڈ سے اٹھ گیا تھا۔

''یاد رکھنا شاہ زیب، اگر ہماری بوا بے کس و لاچار تھیں تو وہ لڑکی بھی بے کس و لاچار ہے۔ بوا کے ساتھ ظلم ہوا تھا اور تم اس لڑکی کے ساتھ ظلم کرنے جا رہے ہو... بوا نے صرف عورت ہونے کی سزا سہی تھی اور وہ لڑکی صرف عورت ہونے کی نہیں تم پر بھروسہ کرنے کی بھی سزا سہے گی۔ یاد رکھنا تم کسی لڑکی کے جذبات، اس کی نسوانیت، اس کی انا، اس کے بھروسہ کو ذلیل و رسوا کرنے جا رہے ہو۔ تم محمود خان سے انتقام لیتے خود محمود خان بن گئے ہو۔ تم محمود خان کو ذلیل کرنے کی چاہ میں اپنے معیار، اپنے خاندانی وقار تک کو فراموش کر گئے ہو۔''

آئیکت پر گویا جوش خطابت سوار تھا اور شاہ زیب نے اسے چپ ہو جانے کا کہا تک نہیں تھا نہ اسے درمیان میں ٹوکا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے وہ آئیکت کو یوں دیکھ اور سن رہا تھا جیسے ٹیلی ویژن پر کوئی ڈرامہ دیکھا، سنا جاتا ہے۔

''محمود خان نے اگر اپنی اولاد کو نام نہیں دیا تھا تو کوئی غلط بھی نہیں کیا تھا کہ اس نے حرام کاری کی تھی... اور وہ نام دے بھی دیتا تو حرام ہرگز بھی حلال میں بدل نہیں سکتا تھا۔ سب نے جو محمود خان کے ہاتھ پاؤں جوڑے تھے تو صرف اس لیے کہ زمانے میں رسوائی سے بچ جائیں ورنہ جو گناہ، جو زیادتی اس نے بوا کے ساتھ کی تھی، اس کی کوئی تلافی نہیں تھی۔ ناجائز کو جائزہ بنایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ کسی قانون، کسی شریعت کی رو سے ایسا ممکن نہیں تھا شاہ زیب... اور تم اپنے ایک جائز عمل کو اپنی جائز اولاد کو بے رحم زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہتے ہو۔ تم یہ کیسے گوارا کر سکتے ہو کہ اور کزئی خاندان کا بچہ ناجائز کہلائے۔ تمہاری مردانگی کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ کوئی تمہارے خون کو گندا کہے، تمہاری جائز حلال اولاد کو کوئی ناجائز کہے۔ تمہاری غیرت، تمہارا ضمیر کیسے برداشت کر سکتا ہے۔'' آئیکت اور کزئی ڈائریکٹ اس کی غیرت

پر حملے کر رہا تھا اور وہ یوں بیٹھا تھا جیسے آئیکت اس کی غیرت کو نہیں للکار رہا، آئیکت اس سے مخاطب ہی نہیں، آئیکت نے کہتے ہوئے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا وہاں وہی نا سمجھ آنے والے تاثرات تھے، ایک گہری چپ تھی جو آئیکت کو احساس دلا رہی تھی کہ وہ پتھر سے سر پھوڑنے کی کوشش میں ہے۔اس نے لب بھینچتے ہوئے شاہ زیب کے چہرے سے نگاہ ہٹالی تھی۔

''محمود خان نے جو بویا تھا اس کے کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ چند برسوں بعد تمہیں بھی وہی سب کاٹنا ہوگا جو تم بو رہے ہو۔'' آئیکت تمسخر سے کہتا اب کے ٹھہرا نہ تھا شاہ زیب کے کمرے سے نکل گیا تھا اور وہ آئیکت کے جانے کے بعد آنکھیں موند گیا تھا اور جیسے ہی آنکھیں بند ہوئی تھیں دو بھیگی شکوہ کناں نگاہیں اس کے تصور میں چھم سے آ گئی تھیں۔

''سوری عریم۔'' اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولی تھیں اور بے بسی سے بڑبڑایا تھا۔

☆......☆......☆

''محمود! آپ نے کیا سوچا ہے۔کب کریں گے آپ شاہ زیب اور کرزئی سے بات۔'' محض تین دن گزرے تھے کہ نتاشہ شوہر کی غیر معمولی سنجیدگی و چپ سے گھبرا کر سوال کر بیٹھی تھیں اور وہ کچھ بھی جواب دیئے بغیر کمرے سے ہی نکل گئے تھے کہ وہ بیوی کے سامنے سے ہی کترانے لگے تھے۔ بیوی کو جواب کیا دیتے کہ ان کے پاس تو کوئی جواب ہے ہی نہیں... کہ وہ بیوی سے کیا کہتے کہ گناہ کے بعد ہر لمحہ بے خبری کا تھا اس لیے حیات آرام سے بسر ہوگئی تھی۔اب جو آگاہی کے در وا ہوئے تھے تو حیات کانٹوں اور پچھتاووں سے آزار بن گئی تھی کہ چاہتے بھی تو اس سے جان نہیں چھڑا سکتے تھے اور ہر آنے والا لمحہ سانس کھینچتا تھا مگر ابھی وہ جس دوراہے پر آن کھڑے ہوئے تھے وہاں رہ کر تو وہ اپنی موت کی آرزو تو کر سکتے تھے دعا نہیں کر سکتے تھے۔انہیں سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں، کیسے اس سب سے باہر نکلیں۔ ان کی عزت شاہ زیب اور کرزئی کے ہاتھ تھی اور وہ لاچار ہوا گھر میں پڑا تھا اور وہ جس گھر کا مکین تھا وہاں کم از کم محمود خان اپنی عزت کا سوال لے کر نہیں جا سکتے تھے کہ جنہیں ذلت کے گڑھے میں اتارا تھا ان سے اپنی عزت کی بھیک مانگنے کس منہ سے جاتے۔ان کی کوشش تھی کہ شاہ زیب اور کرزئی سے کسی طرح اور کرزئی ہاؤس کے باہر ملاقات ہو جائے مگر کیسے یہ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ شاہ زیب مکمل بیڈ ریسٹ پر تھا۔وہ آفس تو دور گھر سے نکلنے سے ہی قاصر تھا ایسے میں وہ شاہ زیب سے ملتے تو کہاں... اور کیسے؟ انہوں نے دکھتے سر کو ہاتھوں میں گرا لیا تھا تب ہی انہیں کچھ آہٹ سی محسوس ہوئی تھی انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تھا ٹیرس تک آنے والی آخری سیڑھی پر ان کی اکلوتی بیٹی عریم محمود کھڑی تھی وہ ان کی اکلوتی بیٹی ضرور تھی مگر لاڈلی نہیں تھی کہ جب انہوں نے صرف اپنی انا کی سربلندی اور مردانگی کے زعم میں اس خواب سی لڑکی کو جو کسی سبک ندی کی مانند تھی اس کی لہروں سے سکون و بے فکری کی ایک ایک بوند جذب کر کے اس کے حسن کو گرہن لگا کر اس کی ہر لہر کو طوفان کی نذر کر دیا تھا۔تب انہیں احساس نہیں تھا کہ وہ مردانگی کے زعم میں ایک عورت سے سر اٹھا کر چلنے کا حق ہی چھین چکے ہیں مگر جب شادی ہوئی تو پہلی دفعہ انہیں وہ عورت یاد آئی تھی جسے بھنور میں چھوڑ آئے تھے۔جانے کیسا احساس تھا جو ان کی رگ و پے میں اتر رہا تھا اور انہوں

نے کبھی خود سے آگے کچھ کب سوچا تھا وہ ہر احساس کو پس پشت ڈال کر ایک سخت گیر انسان بن گئے تھے ان کی زندگی کا ہر لمحہ بیوی کی کڑی نگرانی کرتے گزرا تھا وہ عورت جوان کی عزت تھی، جب اپنی پارسائی کی قسمیں اٹھاتی تو وہ احساس جو چبھن بن کر ٹیس دیتا تھا اس پر جانے کیوں پھوار سی پڑنے لگتی تھی۔ وہ اپنے اندر کی کمزوری چھپانے کو اپنی بیوی کو کمزور و کمتر ثابت کرتے چلے گئے۔ دھیرے دھیرے وہ احساس جو کچو کے لگا رہا تھا وہ کہیں جا سویا تھا مگر کب تک سویا رہتا۔ شادی کے دو سال بعد جب ان کے آنگن میں اولاد کی رحمت اتری تو وہ پہلے سے بڑھ کر بے چین ہو گئے اور شادی کے بعد جو بے چینی تھی، اس میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ وہ اکلوتی بیٹی کو لاڈلی بیٹی کے درجے تک لے جا ہی نہیں پائے۔ نہ جانے کون کون سے ڈر، وہمات، وسوسے ان کی جان کو آ لگے کہ وہ باپ کی مخصوص نرمی و بپتا کا احساس بھی فراموش کر گئے۔ بیوی کے بعد بیٹی بھی کڑی نظروں کی نگرانی میں آ گئی۔ بیٹی کو کسی قسم کی آزادی نہیں دی تھی۔ وہ اپنی سگی بیٹی سے صدیوں کے فاصلے پر تھے۔ وہ ان کی طرف جتنا ہمکتی تھی وہ اس سے اتنی ہی دوریاں بڑھاتے۔ اس کے دل میں اپنا محض خوف بٹھاتے رہے ان کی بیٹی ان سے دو جملے بھی مکمل بولنے کی ہمت نہیں کر پاتی تھی۔ اور انہیں لگتا تھا کہ یوں اپنی کمزوریوں، اپنے گناہوں کو پوشیدہ رکھنے کے لیے وہ جو طاقت اور ہراس کی بساط بچھا رہے ہیں اس میں کامیابی ان کا نصیب ہو گی مگر ان کی بیٹی جس کو انہوں نے ہزار ہا پابندیوں میں رکھا تھا وہ بساط ہی الٹ گئی تھی۔ وہ کسی اور کے ہاتھوں کا مہرہ یوں بنی تھی کہ اس کے باپ کے حصہ میں ملال، شکست اور پچھتاوے دبے پاؤں چلے آئے تھے۔ وہ ٹیرس کی لیفٹ سائیڈ پر کھڑے بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔ اس کا چہرہ وہی ازلی معصومیت لیے ہوئے تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر اضطراب تھا اور وہ چاہے تمام عمر بیٹی سے فاصلے پر رہے تھے۔ کبھی اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ ہمیشہ بیٹی کو ذرا چھینک آتی تھی تو تڑپ جاتے تھے اور آج ان کی بیٹی آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی ان کا کلیجہ پھٹ رہا تھا مگر وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔ نہ اس کے درد کا مداوا بن پا رہے تھے اور نہ ہی جس دوراہے پر بیٹی کے سبب آن کھڑے ہوئے تھے اسے دھتکار کر نفرت کر پانا ان کے اختیار میں تھا کہ زندگی بھر خود کو دھوکا دینے کے بعد آشکار ہوا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے فاصلے تو بڑھا سکتے ہیں مگر اس سے نفرت نہیں کر سکتے۔ وہ بیٹی پر سخت غصہ تھے، اس کو لعنت ملامت کرنا چاہتے تھے، اس سے جواب طلبی کرنا چاہتے تھے کہ کیوں اس نے ان کے بھروسے کو توڑا، کیوں ان کے خوف کی حد سے نکل گئی مگر وہ بیٹی سے جواب طلبی کرنے سے ڈرتے تھے۔ وہ اس لمحے سے ڈرتے تھے جب ان کی بیٹی ان سے جواب طلبی کرتی، ان سے ان کے کارنامے پر باز پرس کرتی۔ وہ کتنے مجبور و لاچار ہو گئے تھے کہ اپنے ایک گناہ کو چھپانے کے لیے حق رکھتے ہوئے بھی بیٹی سے باز پرس تک نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں اور وہ بیٹی کے چہرے سے نگاہ ہٹا گئے تھے۔ وہ خود کو کمپوز کرنے کی چاہ میں تھے کہ انہیں پھر بیٹی کی جانب متوجہ ہونا پڑا تھا۔ جو ٹیرس کی رائٹ سائیڈ پر کھڑی تھی اس کے کان سے اس کا قیمتی موبائل لگا تھا اور وہ سوچ رہے تھے کہ ان کی بیٹی کے موبائل میں لگی سم تو پری پیڈ تھی جس کا وہ ہر ماہ نہ صرف بل بھرتے تھے، ہر آنے اور جانے والی کال کا نمبر نوٹ کرتے تھے تو کیسے بے خبری میں وہ مارے گئے تھے۔ وہ یہ کب جانتے تھے کہ ان کی بیٹی پر ان کی کڑی نظر تھی۔ وہ ہر ماہ نمبرز چیک کر کے ہی بل بھرا کرتے تھے

نگران کی بیٹی کے ہاتھ میں جو موبائل تھا وہ ویسا ہی ضرور تھا جو انہوں نے اسے دلایا تھا مگر وہ موبائل وہی نہیں تھا کہ جب شاہ زیب نے اس کے نمبر پر پہلی بار کال کی تھی اس نے شاہ زیب کو بتا دیا تھا کہ اس کی سم پری پیڈ ہے۔اس کے بابا کو کہیں پتہ نہ لگ جائے اس لیے شاہ زیب نے اس کو سیم وہی موبائل گفٹ کر دیا تھا اور ایک سم بھی گفٹ کی تھی جس کا نمبر صرف شاہ زیب کو ہی معلوم تھا اور وہ کبھی بیٹی کے اس کارنامے سے واقف ہی نہ ہو سکے تھے کہ ان کی ڈرپوک سی بیٹی کو محبت نے کس قدر نڈر بنا دیا ہے۔ وہ ایک ہی ماڈل کے دو موبائل لئے ان کو دھوکا دے رہی ہے۔ یہ کارنامہ تو ان کی بیوی بھی نہیں جان سکی تھیں کہ جب انسان کو معلوم ہے کہ اللہ کی نگاہ سے کچھ پوشیدہ نہیں اس کے باوجود جب وہ گناہ سے باز نہیں آتا تو والدین یا لوگ کس گنتی میں آتے ہیں۔ جب خدا ہر جگہ موجود ہے یہ جاننے کے باوجود انسان خود کو گناہ سے نہیں بچا پاتا... تو والدین کو تو دھوکا دینا آنکھوں میں دھول جھونکنا بہت آسان ہوتا ہے۔ضمیر مطمئن ہو نہ ہو، نفس تو مطمئن رہتا ہے۔وہ دور سے بھی بیٹی کی بے چینی صاف محسوس کر رہے تھے جو بار بار نمبر ملاتی ''پلیز، پلیز، پلیز شاہ، پلیز، پک مائی کال۔'' کا ورد کرتی جا رہی تھی۔ شاہ زیب جس نے دو گھنٹہ قبل ہی اپنا نمبر آن کیا تھا، گھنٹہ بھر سے آتی عریم کی کال کو نظر انداز کرتا، انڈین مووی ''رئیس'' دیکھنے میں مشغول تھا۔وہ جو روز ہر گھنٹہ بعد نمبر ملاتی تھی صرف اس آس میں کہ شاید اب شاہ زیب کا نمبر آن مل جائے... اور شاید یقین میں بدلا تھا تو وہ گھنٹہ بھر سے خوار ہو رہی تھی۔لیکن شاہ زیب کو اس پر ترس نہیں آ کر دے رہا تھا۔ ہر جاتی بیل عریم کے دل کی رفتار کم کر رہی تھی۔موبائل باقاعدہ اس کے ہاتھ میں کانپ رہا تھا اور بیٹی کی حالت محمود خان کے وجود پر لرزہ طاری کر گئی تھی جبکہ عریم کی بڑبڑاہٹ آنسوؤں کی نمی میں گھلتی بتدریج مدھم پڑتی جا رہی تھی۔اس نے ٹوٹتی امید کے ساتھ ایک بار پھر کال ملائی تھی اور شاہ زیب نے ایک اچھی فلم دیکھنے کے بعد اپنے موڈ میں واضح تبدیلی محسوس کی تھی۔اس نے گنگناتے ہوئے ٹیلی ویژن آف کیا تھا اور بجتے ہوئے سیل کو ہاتھ میں اٹھا لیا تھا اور ڈیڑھ گھنٹہ بعد کوئی چالیسویں بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔

''ہیلو، شاہ زیب اور کزئی اسپیکنگ۔'' مہینوں بعد اس کی آواز سنی تھی۔آواز میں یکسر بیگانگی ایسی تھی کہ وہ پوری جان سے لرز چکی تھی۔سیل فون ہاتھ میں لرزا تھا۔

''ہے... ہیلو۔'' وہ سیل فون پر گرفت کرتے ہوئے بھیگے کانپتے لہجہ میں بمشکل ہیلو بولی تھی اور شاہ زیب کی تمام بے حسی، تمام تر خوشگواریت محض اس کے بھیگے کانپتے لہجہ میں فقط ایک ہیلو سے کہیں جا سوئی تھی کہ اس کے ہیلو میں جو اذیت تھی وہ شاہ زیب اورکزئی کے دل میں ترازو ہو گئی تھی۔اس سے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا مگر جو عزائم لیے وہ بیٹھا تھا، اس کا تقاضہ تھا کہ احساس کو مردہ کر دیا جائے۔خود پر بے حسی طاری رکھی جائے۔وہ بہر حال خود کو سنبھال گیا تھا۔

''شاہ، عریم بات کر رہی ہوں۔'' گہری خاموشی طویل ہونے لگی تھی کہ وہ خود کو سنبھال کر بولی تھی اور شاہ زیب کے اگلے جملے نے اس کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔وہ اگر بروقت ریلنگ نہ جکڑ لیتی تو زمین بوس ہو گئی ہوتی۔

''سوری، میں پہچانا نہیں۔کون بات کررہی ہیں آپ۔'' لہجہ میں وہی بیگانگی تھی جس میں اپنا تعارف کروایا تھا۔ بیگانگی نئی تھی مگر آواز تو نہیں۔اور وہ تو شاہ زیب کا غصہ، اس کی بیگانگی پہلے ہی سہ چکی تھی۔ نیا پن ضرور تھا مگر ایسا بھی نہ تھا کہ جس کی آواز کو لاکھوں میں پہچاننے کا دعویٰ کرتی تھی، اس کی آواز کال پر نہ پہچانتی۔اسی ذریعے پر جہاں اس کی تباہی نے پر پھیلائے تھے۔

''کیسی باتیں کررہے ہیں۔ مجھے پہچاننے سے انکاری ہیں۔میں ہوں شاہ، عریم۔'' وہ جانے کس بھرم میں بےقراری سے بولی تھی۔ فاصلہ پر کھڑے محمود خان کا ہر عضو سماعت بنا ہوا تھا۔توجہ کے تمام ارتکاز بیٹی کی جانب مبذول تھے۔

''کون عریم، میں تو کسی عریم کو نہیں جانتا۔'' وہ اس کی بےقراری پر بےقرار ضرور ہوا مگر جب بولا تو اس کی بےقراریوں کو کئی گنا بڑھا گیا تھا۔

''شاہ! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔آپ کیوں کررہے ہیں ایسی باتیں۔ یہاں میری جان پر بنی ہے اور آپ کو مذاق کی پڑی ہے۔نہ کریں خدا کے لیے ایسا۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔'' وہ ایک ہاتھ میں موبائل مضبوطی سے پکڑے کان سے لگائے ہوئے تھی جبکہ دوسرے ہاتھ سے ریلنگ تھامے وہ بری طرح بلکتے ہوئے بولی تھی۔اس کے رونے میں جو تڑپ اور بےبسی تھی شاہ زیب نے محض محسوس کی تھی اور اپنے احساس پر از خود قفل لگا دیئے تھے جبکہ محمود خان نے نہ صرف محسوس کی تھی، دیکھی تھی اور تڑپ اٹھے تھے۔وہ دیوار کے سہارے کھڑے تھے ورنہ بیٹی کی حالت انہیں اپنے ہی قدموں پر کب کھڑا رہنے دے رہی تھی۔

''میں جب آپ کو جانتا ہی نہیں ہوں مس عریم، تو مذاق کیوں کروں گا۔آپ رانگ نمبر پر اپنے دکھڑے نہ روئیں اور رائٹ نمبر ملا کر اپنا اور میرا ٹائم بچائیں۔ پلیز اٹس ریکویسٹ۔'' اسے لگا تھا کہ وہ اب اپنا مذاق بند کرے گا لیکن نہیں وہ تو جیسے بضد تھا۔اس کو پہچاننے سے انکاری تھا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا۔ بند کریں اپنی بکواس۔ یہاں میں اس قدر مصیبت میں ہوں اور آپ کو مذاق کی پڑی ہے۔آپ معاملے کی سنگینی کو تو سمجھیں شاہ۔ میں پریگنینٹ ہوں۔کب تک یہ بات چھپ سکتی ہے۔کیوں میری مصیبتوں کو بڑھا رہے ہیں۔اپنے گھر والوں کو لے آیئے۔نکاح نامہ لے آیئے۔ابھی صرف ماما کو لگا ہے پتہ، پاپا کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ابھی ماما ہی نکاح نامے کے بناء نکاح ماننے کو تیار نہیں۔ میں پاپا اور دنیا کو کیسے یقین دلاؤں گی کہ آپ نے مجھ سے نکاح کیا تھا۔کیوں آپ میری پاکیزہ محبت کو، میرے جائز قدم کو میرا گناہ، میری ذلت کی وجہ بنا دینا چاہتے ہیں۔ خدا کے لیے شاہ، بند کر دیں یہ سب۔ محبت کی ہے نا تو بس اب محبت کی لاج بھی رکھیں۔'' وہ بنا سانس لیے بولتی چلی گئی تھی۔ ہر لفظ اس کے دل کی آواز تھا، ہر لفظ میں گہری اذیت پنہاں تھی اور شاہ زیب کو تھا احساس کہ وہ ہر ایک بات سچ بول گئی ہے، وہ بڑی مصیبت میں ہے، ذلت کی اندھی کھائی اس کی گھات لگائے بیٹھی ہے اور وجہ اس کی اپنی ذات ہے مگر یہ اعتراف وہ کہاں کرسکتا تھا عریم سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ذلت اس کا مقدر ہو کر رہے گی کہ وہ اس کی زندگی میں شامل ہی ایک بڑی پلاننگ

کے ساتھ ہوا تھا۔اس کا مقصد ففٹی پرسنٹ پورا ہو چکا تھا اور جس دن محمود خان کی عزت کا جنازہ نکل جاتا، وہ شاہ زیب اور کزئی کے قدموں میں آن گرتا۔اس کا مقصد سو فیصدی مکمل ہو جانا تھا اور جب تک اسے اپنا مقصد حاصل نہ ہو جاتا وہ اس سے رابطہ نہ کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔آج کال بھی یہ سوچ کر ریسیو کی تھی کہ پتہ تو چلے کہ نتاشہ محمود نے اسے اور محمود خان کو کیا بتایا لیکن اسے بہت مایوسی ہوئی تھی کہ عریم کی گفتگو صاف بول رہی تھی کہ نتاشہ محمود نے بیٹی کو اب تک لاعلم رکھا ہے۔

''عریم محمود خان! میں نے تم سے محبت نہیں کی۔'' اسے جیسے ہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ اب بھی حقیقتوں سے انجان ہے تو وہ چوہے بلی کا کھیل ختم کرتا سامنے آ گیا تھا اور اس کا ایک فقط ایک جملہ عریم پر قیامت ڈھا گیا تھا۔اس کے ہاتھ میں موبائل لرز اٹھا تھا۔اسے اپنی سماعت پر دھوکا ہوا تھا۔اسے لگا تھا جیسے اس نے کچھ غلط سن لیا ہے مگر ایسا نہیں تھا یہ احساس شاہ زیب کے اگلے جملے سے بہ خوبی ہو گیا تھا۔

''میں نے تم سے محبت نہیں کی عریم محمود خان، صرف انتقام کی آگ سرد کرنے کے لیے تمہیں مہرہ بنایا تھا۔'' شاہ زیب اس پر کھل چکا تھا۔اپنی مکروہ سوچ اور اس کے اسباب سے عریم کو آگاہ کر رہا تھا جس کے آنسو ہی ٹھٹھر گئے تھے۔

''کک... کیسا انتقام... کیسا مہرہ۔آپ کیا بول رہے ہیں شاہ۔میں کچھ سمجھ نہیں پا رہی۔'' اس کی آواز گویا گہری کھائی سے برآمد ہوئی تھی۔

''میں تمہیں کچھ سمجھانا بھی نہیں چاہتا۔اگر اس سارے قصہ کو سمجھنا ہی ہے تو اپنے باپ سے رجوع کرو، اس سے صرف اتنا پوچھ لینا کہ آبشار اور کزئی کون ہے۔'' وہ سرد لہجہ میں بولا تھا اس نے آج کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ دیا تھا۔عریم پر واضح کر دیا تھا کہ ''محبت'' نہیں تھی۔رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔کانوں میں مگر اب تک شاہ زیب اور کزئی کے لفظوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔

''میں نے تم سے کبھی محبت کی ہی نہیں عریم محمود خان۔'' اس کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ گیا تھا۔وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گری تھی۔ساکت کھڑے محمود خان بیٹی کی طرف لپکے تھے۔

''شاہ! آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔محبت نہیں تھی تو محبت کا ڈرامہ کیوں...؟'' وہ بری طرح بلکتے ہوئے چیخ رہی تھی۔محمود خان کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ان کی بیٹی تڑپ رہی تھی اور وہ آگے بڑھ کر اسے سہارا دینے کے بھی قابل نہیں تھے۔انہیں برسوں بعد لگا تھا پتہ کہ خدا کی لاٹھی بڑی بے آواز ہوتی ہے۔دنیا مکافات عمل ہے انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بیٹی کی تڑپ اس کا بلکنا نظر انداز کیے وہاں سے جانے کو آگے بڑھے تھے کہ وہ سوال جس کی جواب طلبی سے وہ برسوں محفوظ رہے تھے آج ان کی بیٹی کے لبوں پر آن ٹھہرا تھا۔عریم محمود کو روتے ہوئے کسی دوسرے کی موجودگی کا جیسے احساس ہوا تھا اس نے روتے روتے سر اٹھایا تھا اور باپ کو دیکھ کر وہ اٹھی تھی اور ان کے عین سامنے آن رکی تھی۔

''آبشار اور کزئی کون ہے؟'' سوال تھا کہ برچھی جو محمود خان کے دل کے آر پار ہو گئی تھی۔انہوں نے نگاہ بیٹی کے متورم چہرے پر

اٹھائی تھی اور دوسرے ہی لمحہ جھک گئی تھی۔ برسوں بعد ان کا ماضی ان کے سامنے آ گیا تھا۔ ان کی بیٹی ان سے سوال کر رہی تھی اور وہ جواب کیا دیتے، کیسے اپنے جرم کا اعتراف کرتے، اپنے ہی منہ سے اپنے گناہ کا اعتراف، وہ بھی اس گناہ کا جس پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس گناہ کی تفصیل ان کی بیٹی جاننا چاہتی تھی اور وہ کیسے کرتے اعتراف۔ ایک آنسو پلکوں سے ٹوٹ کر گرا تھا۔ لب کانپے تھے اور انہوں نے بیٹی کے سامنے اعتراف جرم کی ہمت نہ پاتے ہوئے ایک قدم پیچھے لیا تھا اور وہ بیٹی کے سوالوں کو سوال بنا چھوڑ کر وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے۔ وہ راہِ فرار اختیار کر آئے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب وہ آگے قدم رکھیں گے بھی تو وہ انہیں پیچھے کی جانب ہی کھینچے گا۔ وہ گھر سے ہی نکل گئے تھے کہ بیٹی اور بیوی سے نظر ملانے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ ان کا ماضی پوری شان اور طمطراق سے ان کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا اور انسان مستقبل سے بچ کر تو بھاگ سکتا ہے کہ جو آیا نہیں اس کے آنے کا بھروسہ بھی نہیں ہوتا مگر وہ ماضی سے بچ کر نہیں بھاگ سکتے تھے کہ انہیں جو زندگی ملی تھی، جو وقت میسر آیا تھا، جو لمحے ملے تھے وہ انہوں نے ضائع نہیں کیے تھے۔ یہ الگ بات کہ وہ ضائع ہی ہو گئے تھے کہ ان لمحوں میں نیکی نہیں تھی۔ اللہ کا ڈر نہیں تھا۔ انسانیت نہیں تھی۔ صرف ''میں'' تھی، غرور تھا اور غرور و تکبر کا انجام ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے اور ان کا انجام ان کے سامنے آ گیا تھا۔ ان کے حال پر یکدم ماضی نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ انہیں اپنی گزشتہ زندگی کا ایک ایک پل یاد آ رہا تھا۔ وہ ماضی کے اوراق پلٹتے چلے گئے تھے۔

☆......☆......☆

عبیر حیرانگی سے باپ کو دیکھ رہا تھا اور وہ بیٹے کی بے یقینی محسوس کرتے یکدم ہی ہنس دیئے تھے۔

''آپ سچ بول رہے ہیں۔'' وہ ہنستے ہوئے باپ سے بے یقینی سے سوال کر رہا تھا۔

''ایک دم سچ میری جان۔'' وہ بیٹے کی آنکھوں میں دیکھتے مسکرائے تھے۔

''آئی کانٹ بلیواٹ پاپا۔ یہ معجزہ کیسے ہوگیا۔ مومل سچ میں مان گئی ہے۔ آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔'' وہ بے ربط ہوا تھا اور وہ قہقہہ لگا گئے تھے کہ حیران تو وہ بھی ہوئے تھے جب کچھ گھنٹہ قبل عقیل احمد نے کال کر کے کہا تھا کہ ان لوگوں کو رشتہ منظور ہے مگر بیٹے کی حیرانگی نے تو ان کی اتنے دن کی کلفت ہی مٹا ڈالی تھی وہ سرشار سے بیٹے کو تمام تفصیل سے آگاہ کر گئے تھے۔

''پاپا۔ یہ ایک دم کایا کیسے پلٹ گئی۔ مومل مان گئی ہے۔'' عبیر سے اپنی خوشی نہ بیان کی جا رہی تھی نہ سنبھالی جا رہی تھی۔

''میں نے تو تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ عقیل کی فیملی کو اس رشتے پر اعتراض نہیں ہے اس لئے مومل بھی مان جائے گی کہ مشرقی لڑکیاں وہی کرتی ہیں جو ان کے والدین کی مرضی ہوتی ہے۔'' کبیر عباسی اب کے سنجیدگی سے بولے تھے۔

''شادی یا منگنی کے لیے کب کا کہا ہے۔'' وہ خود کو کمپوز کرتا مسرور سا پوچھ رہا تھا۔

''شادی، جب تم پاکستان میں سیٹ ہو جاؤ گے تب تک مومل کی تعلیم بھی مکمل ہو جائے گی۔ رہ گئی منگنی تو وہ اسی ہفتہ پاکستان میں ہو

گی۔''انہوں نے بیٹے کی معلومات میں مزید اضافہ کیا تھا۔

''پاپا۔آپ منگنی کے بجائے نکاح کے لئے راضی کرلیں۔'' وہ تفصیل سن کر بولا تھا۔وہ یکدم قہقہہ لگا گئے تھے۔

''تمہیں ڈر ہے کہ کہیں مومل پھر کوئی ایشو نہ کھڑا کر دے۔'' وہ بیٹے کو شرارت سے دیکھ رہے تھے اور اس نے فوراً ہی اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔

''پاپا۔آپ کی ہونے والی بہو سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ وہ پوری آفت کی پرکالہ ہے۔ کچھ بھی گڑ بڑ کرسکتی ہے اور میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔ وہ میری زندگی ہے۔'' اس کے الفاظ کچھ کہہ رہے تھے اور مسکان کچھ... کہ مومل کے لئے اس کی آنکھوں سے بے پناہ چاہت ٹپک رہی تھی۔ کبیر عباسی نے بیٹے سے نکاح کی بات کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے اس کی خوشیوں کی دعا مانگی تھی اور وہ عبیر کے مسرور سے انداز ملاحظہ کرتے اسے سن رہے تھے جو مستقبل کے خواب سجا رہا تھا اور وہ بیٹے کی خوشی میں خوش تھے۔

☆......☆......☆

''مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا کہ تم نے عبیر سے شادی کے لیے رضامندی دے دی ہے۔'' نوائم اس کے سامنے کافی کا بھاپ اڑاتا ہوا مگ رکھتے ہوئے بولی تھی۔

''تمہیں تو سب سے پہلے یقین آنا چاہیے تھا کہ تمہاری دعائیں مستجاب ہوگئی ہیں۔'' مومل کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے بولی تھی۔

''تم اس رشتے سے یعنی خوش اب بھی نہیں ہو۔'' نوائم کو جہاں اس کے اقرار سے خوشی ہوئی تھی وہیں اس کے طنز نے صاف اس کے اقرار کی حقیقت اس پر عیاں کردی تھی۔

''ہاں۔ میں خوش نہیں ہوں، میں نے دادو کی وجہ سے اقرار کیا ہے... اور پلیز، تم اس ٹاپک کو بند کردو کہ میں اس سب سے عاجز آ چکی ہوں۔'' مومل کے ترش لہجے پر وہ لب بھینچ گئی تھی اور عبیر عباسی وہیں سے پلٹ گیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا اور اسے یہی لگا تھا کہ اب کے مومل نے اپنی خوشی سے رشتہ منظور کیا ہے اور وہ اپنے دل کو روک نہیں پایا تھا وہ مومل سے ملنے، اس کا شکریہ ادا کرنے، اس کی بدلی سوچ کا پس منظر جاننے کو آیا تھا۔ کیا پتہ تھا کہ ساری خوشی ہی کافور ہو جائے گی۔ مومل نے ایک جملہ سے اس کا سارا اطمینان رخصت کر دیا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر ایسی کیا برائی تھی اس میں جو مومل اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ اس کا دماغ اپنی اہانت پر سلگ اٹھا تھا، دل تکلیف سے بھر گیا تھا، دماغ کہہ رہا تھا بھاڑ میں جائے محبت مگر دل ہزار ہا تکلیف کے باوجود ''مومل، مومل'' کا راگ الاپ رہا تھا۔ اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ وہ اس رشتے سے انکار کردے جس پر مومل نہیں راضی۔ اسے کئی بار ٹھکرا چکی ہے مگر دل کہتا تھا، مومل کو سات خون معاف۔ وہ آتے ہوئے جتنا مسرور تھا، واپسی میں اتنا ہی دکھ اور شکست اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی مگر وہ ایک آس اور امید پر بازی کھیلنے جا رہا تھا۔ جو

بازی دل کی بازی تھی، جس میں اس نے خود فنا ہو کر محبت کو بچانا تھا... کہ اس بازی کو جیت کر ہی تو وہ اپنی محبت، مومل کو پا سکتا تھا اس کی جیت کی لگن ہی اسے جیت کے قریب کرنے والی تھی۔

''مومل، آج چاہے تم بے دلی سے، ناگواری سے میرا ساتھ قبول کر رہی ہو مگر ایک دن آئے گا جب میں دل کی بازی جیت لوں گا اور جیت میں جب تم مجھے ملو گی... تو پوچھوں گا تم سے کہ محبت ٹھکرائے جانے کے لائق ہے یا اعزاز کی مانند کسی تمغہ کی طرح سینے پر سجائے جانے کی مستحق ہے۔ میں تمہارے دل میں پیار کی شمع جلا کر رہوں گا۔ میری محبت تمہارا دل جیت کر رہے گی مومل'' وہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے دل ہی دل میں مومل کو مخاطب کئے محبت کی بازی کھیلنے کو تن من سے تیار تھا۔ ان سب کی پرسوں کی فلائٹ تھی۔ وہ سب پاکستان جا رہے تھے اور پاکستان جاتے ہوئے سب ہی مطمئن و خوش تھے۔ ایک مومل اداس تھی۔ وہ ناخوش تھی اور عبیر نے سوچ لیا تھا کہ وہ مومل کی اداسی کو مٹا کر ہی دم لے گا۔ اس کی ناخوشی کو خوشی میں بدل کر ہی سکون کا سانس لے گا۔

☆......☆......☆

''کیا سوچ رہی ہیں ماما؟'' ابسام ماں کو لان میں خاموش بیٹھا دیکھ کر ان تک چلا آیا تھا۔ وہ بیٹے کی آواز پر چونک اٹھی تھیں۔

''میں کچھ دنوں سے نوٹ کر رہی ہوں کہ کوا منڈیر پر بیٹھا کائیں کائیں کرتا رہتا ہے اور کوا کی کی کائیں کائیں مجھے کسی مہمان کے آنے کا پیام لگ رہی ہے۔'' وہ دیوار پر بیٹھے کوے سے نظریں ہٹاتے ہوئے دھیمے سے بولتیں بیٹے کو دیکھنے لگی تھیں۔ ابسام سے اپنی مسکراہٹ ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

''ماما، آپ بھی ناں، جانے کون سے فرسودہ زمانے کی توہمات کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہیں۔'' وہ ماں کو دیکھ کر مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولا تھا۔ فضہ حیدر کا منہ بن گیا تھا وہ بیٹے کو ناگواری سے دیکھنے لگی تھیں۔

''جیسے تم اور تمہارے جیسے جدید زمانے کے داعی فرسودہ توہمات کہتے ہیں یہ پرانی روایات ہیں، بزرگوں کی آزمودہ کہانیاں، ان کے تجربات کا نچوڑ... اور تجربہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوتا۔'' وہ ابسام کی ٹھیک ٹھاک قسم کی کھنچائی کر رہی تھیں۔

''یعنی آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ مہمان ضرور آئیں گے کہ کوا ان کے آنے کا سندیسہ لے کر آیا ہے۔ ویسے ماما، سندیسے لانے کا انتظام کبوتر نہیں کیا کرتے تھے۔'' وہ شرارت سے بولا تھا۔

''بکواس مت کرو ابسام، شرم تو نہیں آتی تمہیں اپنی ماما کا مذاق بناتے...'' وہ بیٹے کی شرارت محسوس کرتیں اسے ڈپٹ گئی تھیں۔

''سوری ماما، مذاق نہیں بنا رہا تھا میں۔ میں تو بس یہ کہہ رہا تھا کہ آپ اتنی پڑھی لکھی ہیں، ماڈرن زمانے کی خاتون ہیں، آپ کے منہ سے ایسی فرسودہ باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔'' وہ ماں کے خوبصورت چہرے کو احترام سے دیکھتا ہنوز شرارت کے موڈ میں تھا۔

''اب اچھی لگوں یا بری، فرسودہ لگوں کہ ماڈرن، بس جو بات ہے وہ تو ضرور ہی کہوں گی... اور جب جب یہ کوا بولتا ہے مجھے لگتا ہے

کہ کوئی مہمان آنے والا ہے۔'' فضہ حیدر نے گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔ ان کا وہ حساب تھا چٹ بھی میری، پٹ بھی میری۔ وہ ماں کے ''میں نہ مانوں'' والے تاثرات دیکھ کر ہنس دیا تھا۔

''کہیں آپ کا کوا یہ تو نہیں بول رہا کہ ڈنمارک سے مہمان آنے والے ہیں۔'' ابسام کی اپنی ماں سے قابل رشک انڈر اسٹینڈنگ تھی اس وقت بھی وہ ادب و احترام کے دائرے میں رہتے ہوئے دوستانہ انداز میں ماں کو تنگ کر رہا تھا۔

''کاش کہ ایسا ہو جائے، مجھے تو لگتا ہے میں اس حسرت کو لیے ہی اس دارِ فانی سے کوچ کر جاؤں گی... کہ میرے میکے والے میرے گھر آئیں۔'' وہ یکدم ہی اداس ہو گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے اور ابسام تو بری طرح دہل گیا تھا۔

''ناٹ فیئر ماما، ایسے بولتے ہیں۔ آپ میری جان نکال دیتی ہیں۔'' وہ ماں سے خفا ہوا تھا۔

''آئی ایم سوری ابسام بیٹا۔'' وہ خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولی تھیں اور اس نے ماں کو ہنوز ناراضگی سے دیکھا تھا۔

''آج کل اماں جان اور بھائی، بھابھی سب بہت یاد آ رہے ہیں۔ اگلے ماہ میری اور تمہارے پاپا کی شادی کی پچیسویں سالگرہ ہے۔ میرا کتنا دل تھا کہ میں اپنی شادی کی سالگرہ اپنوں کے ساتھ مناؤں۔'' وہ دھیمے دھیمے لہجے سے بول رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ ابسام لب بھینچے بیٹھا ہوا تھا کہ وہ ماں کو جانتا تھا وہ میکے کے ذکر پر یوں ہی جذباتی و آبدیدہ ہو جایا کرتی تھیں۔

''لیکن تمہارے پاپا نے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ آج کل بہت بزی ہیں وہ میرے ساتھ ڈنمارک نہیں جا سکتے۔ اب شادی کی سالگرہ تمہارے پاپا کے بغیر تو سیلیبریٹ نہیں ہو سکتی اس لئے دل مسوس کر رہ گئی۔'' وہ بچوں کی طرح بول رہی تھیں کہ میکے کے ذکر پر وہ بچی ہی تو بن جاتی تھیں۔ ان کا دل کرتا تھا کہ ان کے پنکھ ہوتے اور وہ اڑ کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جاتیں۔ اس آنگن میں جہاں بھائیوں کے ساتھ مل کر کتنی ہی شرارتیں کی تھیں، والدین کو ستایا تھا۔ وہ گھڑی جب وہ حیدر صاحب کے ساتھ رخصت ہو کر سسرال آئی تھیں، میکے کو پیچھے چھوڑ دیا تھا مگر میکے کی یاد بہت آگے نکل آئی تھی۔ سات سمندر کی دوریاں تھیں اور یادیں ہی ان کا سرمایہ... ان کا دل کرتا تھا وہ ہر لڑکی کی طرح ہر دوسرے دن میکے جائیں مگر یہ آرزو سدا آرزو ہی رہی تھی۔ وہ جب کسی پڑوسن یا حیدر صاحب کی رشتہ دار فیملی میں لڑکی کے گھر اس کے میکے والوں کو، ان کے بھائیوں کو دیکھتی تھیں تو کئی ایک حسرتیں ان سے آ لپٹتی تھیں۔ انہیں اپنا آنگن بڑا ہی سونا لگتا تھا۔ وہ بولائی بولائی پھرتی تھیں اور چند دن سے کوا کی آواز ان کے دل پر اثر کر رہی تھی کہ ان کی مرحومہ نانی جیسے ہی کسی کوا کو منڈیر پر بیٹھا دیکھتی تھیں تو مہمان کی آمد کے خیال سے تیاری شروع کر دیتی تھیں۔ جس طرح آج ان کا بیٹا ان کا مذاق بنا رہا تھا۔ وہ بھی بھائیوں کے ساتھ مل کر خوب ہی نانی کا ریکارڈ لگاتی تھیں۔ انہیں یاد تھا ان کے دونوں بھائی بڑے تھے اور عقیل احمد بچپن سے ہی غیر معمولی سنجیدہ طبیعت کا حامل تھے جبکہ عقیل احمد کو سنجیدگی کی ہجے بھی معلوم نہیں تھے، وہ بلا کے شرارتی تھے اور وہ عقیل احمد کے ساتھ مل کر ہی شرارت کرتی تھیں، کسی کی سائیکل سے ہوا نکال دینا تو کسی کی نقلیں اتارنا۔ وہ اور عقیل احمد ہر جگہ ساتھ پائے جاتے تھے اور جب پکڑے جاتے تھے تو عقیل احمد ان کی ڈھال بن جاتے

تھے۔انہیں آج بھی یاد تھا کہ وہ اور عقیل احمد نانی کو ستانے کے لئے کوا کی آوازیں نکالتے تھے۔اور جب کوئی مہمان نہیں آتا تھا تو نانی کو خوب تنگ کرتے تھے۔انہوں نے نانی کا اس بات پر ہمیشہ مذاق بنایا تھا کہ انہیں کبھی یقین نہیں آیا تھا کہ نانی ٹھیک کہتی ہیں۔کوا مہمان آنے کا پیام دیتا ہے لیکن آج عمر کے اس دور میں جب ان کا بیٹا جوان تھا، وہ دیوار پر چڑھے بیٹھے کوا کو بولتے دیکھ کر اپنی نانی کی طرح مہمانوں کی آمد کا پیش خیمہ سمجھنے لگی تھیں۔

''آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ آپ نانو کو کال کر دیں اور کہہ دیں کہ وہ سب پاکستان آ جائیں۔'' ابسام نے گھڑی پر نظر ڈالی تھی۔ حیدر صاحب کو گئے دو گھنٹے ہو گئے تھے اور ٹائم دیکھ کر یہی سوچ ابھری تھی کہ اب تک تو انہیں آ جانا چاہیے تھا۔ بیٹے کی بات پر وہ آزردگی سے مسکرا دی تھیں۔

''میں تو جب بھی اماں جان سے بات کرتی ہوں انہیں اپنے گھر آنے کا کہتی ہوں مگر اماں جان کی طبیعت ہی ٹھیک نہیں رہتی۔ ڈاکٹرز نے سفر سے منع کیا ہوا ہے۔رہ گئے بھائی صاحب اور چھوٹے بھیا، غم روزگار انہیں فرصت دے تو انہیں بہن کا خیال آئے۔میں ایک اکلوتی بہن ہوں، کبھی جو مجھ سے ملنے آ جائیں، کسی کو جیسے مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔'' وہ جذباتیت کا شکار ہو چکی تھیں۔وہ عمر کے اس دور میں تھیں کہ مجبوریوں کو، حالات کو سمجھتی تھیں مگر ماں، بھائیوں کے ذکر نے ان کی سمجھ کو گویا تالا لگا دیا تھا۔

''ماما۔آپ یہ زیادتی کر رہی ہیں۔بڑے و چھوٹے ماموں جان آپ سے بہت محبت کرتے ہیں ان کی محبت پر یوں شک کرنا، ان کی محبت کو پاکستان آپ سے ملنے آنے سے مشروط کرنا تو انتہائی غلط ہے۔'' وہ ماں کی حد درجے جذباتی طبیعت سے واقف دھیمے مگر قدرے شرارتی انداز میں بولا تھا۔

''کوئی زیادتی نہیں کر رہی، زیادہ حمایت کرو گے نا اپنے ماموں کی تو تمہیں وہیں ان کے پاس ڈنمارک بھیج دوں گی۔حد ہو گئی ہے ماں رو رہی ہے، اپنے بھائیوں کے لئے دکھی ہے اور میرے بیٹے کو شرارتیں سوجھ رہی ہیں۔'' بیٹے کی شرارت پر وہ حد درجے خفا ہوئیں۔اس کو غصہ و ناراضگی سے دیکھتیں جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔اسی وقت مین گیٹ کھلا تھا اور حیدر صاحب کی گاڑی دھیمی رفتار سے پورچ کی جانب بڑھ گئی تھی اور وہ اس وقت اتنی خفا تھیں کہ وہ شوہر کی آمد کا نوٹس لئے بغیر اندر کی طرف بڑھ گئی تھیں جبکہ وہ والہانہ انداز میں گاڑی کی طرف بڑھا تھا سب سے پہلے نانو سے ملا تھا پھر باری باری سب سے مل رہا تھا۔اس نے نوائم کو مسکرا کر دیکھا تھا اور موحل کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔اسی وقت عقیل احمد نے فضہ حیدر کا پوچھ لیا تھا اور اس نے ماں کے خفا ہو کر اپنے کمرے میں جانے کا بتایا تھا اور وہ سب فضہ حیدر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔آہٹ پر فضہ حیدر نے سر اٹھایا تھا اور جو چہرہ آنکھوں کے سامنے آیا تھا اسے دیکھ کر تو وہ بے یقین رہ گئی تھیں۔تب ہی حاجرہ بیگم نے بیٹی کو پکارا تھا۔

''فضہ۔'' اور وہ لپک کر ماں تک پہنچی تھیں اور ایک ایک سے ملتیں وہ زارو قطار رو رہی تھیں۔

''آپ سب نے تو جیسے اپنی فضہ کو ایک نئی پُر مسرت زندگی دے دی ہے۔''عقیل احمد نے چھوٹی بہن کی ناک کھینچی تھی اور وہ سوں سوں کرتی بولی تھیں۔ کمرے میں ہنسی اور قہقہے بکھر گئے تھے۔ تب ہی حیدر صاحب نے ابسام کو کہا تھا کہ وہ ان سب کو ان کے کمروں تک لے جائے۔ سفر سے آئے ہیں سب تھکے ہوئے ہوں گے۔ فضہ جیسے ایک دم ہی یہ سوچ کر پریشان ہوگئی تھیں کہ سب کہاں رہیں گے کہ انہوں نے تو کوئی انتظام ہی نہیں کیا تھا۔

''ماما، آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کو سرپرائز دیا گیا ہے ورنہ میں اور بابا جانتے تھے کہ نانو اپنی پوری فیملی کے ساتھ آرہی ہیں۔'' ابسام اپنی نانو کے برابر بیٹھا شرارت سے بولا تھا۔

''پھپھو۔ سرپرائز کیسا لگا۔''مومل ان کے گلے کا ہار بنتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''بہت اچھا۔ بہت زیادہ اچھا۔''وہ مومل کا ہاتھ تھامتیں رو پڑی تھیں۔

''محترمہ۔ رونے دھونے کا پروگرام کینسل کردو۔''عقیل احمد نے بہن کو خود سے لگاتے ہوئے دھیمے سے کہا تھا اور وہ ہنس دی تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا کہ آج ان کے اپنے نہیں زندگی چلی آئی ہو۔ ابسام اور حیدر صاحب نے ملازمہ کے ذریعے رازداری سے کمرے سیٹ کروا لئے تھے۔ آبدار نے ڈنر بھی تیار کروا دیا تھا۔ کچھ ڈشز خود اس نے بنائی تھیں اور کچھ ملازمہ سے بنوائی تھیں۔ فضہ اس کی سرگرمی سے ناواقف اس لئے تھیں کہ کل سے بخار تھا اور حیدر صاحب نے سختی سے کچن میں قدم رکھنے پر پابندی لگا دی تھی اس لئے وہ لاعلم رہی تھیں کہ کچن میں کیا کچھ خاص بن رہا ہے۔ سب کے فریش ہو کر آتے ہی ٹیبل پر کھانا لگا دیا گیا تھا۔ خوشگوار ماحول میں کھانے کا آغاز ہوا تھا۔ حیدر صاحب نے آبدار کا تعارف بیوی کی سہیلی کی بیٹی کی حیثیت سے کروایا تھا۔ حاجرہ بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دی تھیں اور اس کی نظر رہ رہ کر نوائم پر اٹھ رہی تھی۔ لائٹ گرین ٹراؤزر سوٹ میں ڈھلے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ خوبصورت متناسب سراپے والی نوائم اسے بالکل اچھی نہیں لگی تھی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ نوائم کو وہاں سے غائب کر دیتی مگر وہ اتنی با اختیار نہیں تھی۔ جانے کیوں اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی تھی۔ نوالہ حلق میں اٹکنے لگا تھا اور وہ کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ گئی تھی کہ مزید ضبط کا یارا نہیں رہا تھا۔ اس نے کمرے میں آکر ہی دم لیا تھا۔ آنسو بے اختیار ہو گئے تھے۔ آغاز میں یہ حال تھا تو انجام تک اس کا حال جانے کیا ہو جانا تھا۔

''میں آئیکت کو کہوں گی کہ وہ مجھے یہاں سے لے جائیں۔ چند دن یہاں رہی تو میرا دم ہی نکل جائے گا۔''اس نے آنسو رگڑتے ہوئے بے بسی سے سوچا تھا۔

مہمانوں کے آجانے سے گھر میں رونق سی لگ گئی تھی۔ فضہ حیدر چہک رہی تھیں۔ بات بے بات ہنستیں وہ بے حد مسرور تھیں۔ ابسام نے منڈیر پر کوا کی کائیں کائیں پر ماں کے فرمودات سب کے سامنے کہے تھے۔ محفل یکدم زعفران زار ہوگئی تھی۔ وہ بھائیوں کے ساتھ گزرے بچپن کی یادیں و شرارتیں یاد کر رہی تھیں۔ حیدر صاحب انہیں خوش دیکھ کر خوش و مطمئن تھے کہ وہ فضہ حیدر کو ہمیشہ سے اتنا ہی مسرور

دیکھنا چاہتے تھے اور دیر سے ہی سہی ان کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ ان کی بیوی اپنے گھر میں اپنے میکے والوں کو دیکھ کر مسرور تھیں اور وہ بیوی کی خوشی میں خوش تھے کہ انہوں نے فضہ ابراہیم سے محبت کی شادی کی تھی۔ ہمیشہ انہیں خوش رکھنے کے لئے جان و دل سے کوشاں رہے تھے اور آج انہیں سرپرائز دے کر وہ بیوی کا بہار کا سا سماں پیش کرتا وہ خوبصورت چہرہ دیکھ کر اپنے سرپرائز پر مسرور تھے۔ زندگی جیسے مسکرا اٹھی تھی۔

☆......☆......☆

کبیر عباسی برسوں بعد اس دہلیز پر چڑھے تھے جسے جوانی کے زعم میں بڑے کروفر سے چھوڑ گئے تھے۔ اب جب لوٹ کر آئے تھے تو کوئی ان کا منتظر ہی نہ تھا۔ عقیل احمد چاہتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ فضہ حیدر کے گھر چلیں مگر وہ راضی نہ ہوئے تھے اور وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے گھر آ گئے تھے۔ وہ گھر کیا تھا خالی مکان تھا۔ گھر کے مکین تو کب کے منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔ ان کی آنکھیں نم تھیں اور عبیر باپ کو آزردہ دیکھ کر دکھی ہو رہا تھا۔ تب ہی آہٹ ہوئی تھی۔ کبیر عباسی نے نو وارد کو دیکھا تھا۔ وہ تھوڑی سی دیر کے جائزہ کے بعد بالآخر انہیں پہچان گئے تھے۔ وہ چچا اقبال تھے ان کے ابو کے دوست، جو اس وقت بہت بزرگ ہو گئے تھے۔ لاٹھی ٹیکتے یہاں تک آئے تھے۔ کبیر عباسی چچا اقبال سے مل کر بہت روئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس چھوٹے سے صحن میں جو برسوں سے ویران پڑا تھا کئی جانے انجانے سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ کبیر عباسی کے والد دو ہی بھائی تھے بہن کوئی نہیں تھی۔ کبیر عباسی کے چچا اور ان کی اہلیہ بھی وفات پا گئی تھیں ان کا ایک ہی بیٹا تھا جو لاہور شہر میں مقیم تھا۔ کبیر عباسی کی والدہ کی ایک بہن تھی اور وہ بھی اس وقت دنیا میں نہ تھی البتہ ان کے بیٹے کا بیٹا یعنی پوتا ساتھ والے گھر میں مقیم تھا اور وہ ہجوم میں اپنی بیوی اور چار سالہ بیٹی کے ساتھ موجود تھا۔ امجد کے والد نے خالہ اور خالو کی وصیت کے مطابق ان کے گھر کو کرائے پر نہ دیا تھا۔ امجد کی بیوی ہی اکثر اس ویران پڑے گھر کی صفائی کر جاتی تھی۔ امجد نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا تھا۔ کبیر عباسی کو یکدم بہت اپنے کو دیکھ کر خوشی محسوس ہوئی تھی۔ عبیر کو بھی امجد سے مل کر اچھا لگا تھا۔ امجد کی بیوی نے فوراً ہی ان کے لئے کھانے کا انتظام کیا تھا اور جبکہ کبیر عباسی نے فریش ہونے کے بعد اپنے والدین کی قبور پر جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور تھا اور امجد انہیں قبرستان لے آیا تھا۔

جب تم مجھے ڈھونڈنے آؤ گے
تو میں یہیں کہیں ہو گا
راتوں اور دنوں کے درمیاں
پگڈنڈیوں کے آس پاس
گھاس کی پتیوں میں
یا کسی تازہ بنی ہوئی
قبر کی نرم بھربھری مٹی میں!!!

وہ قبرستان میں جیسے ہی داخل ہوئے تھے دل دھاڑیں مار مار کر رویا تھا... کہ جب وہ گھر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ان کے والدین کے لبوں پر صرف یہی ایک بات تھی کہ وہ جب لوٹ کر آئے گا تو بہت دیر ہو چکی ہوگی۔ چھوڑ کر تو زندہ ماں باپ کو جا رہا ہے مگر جب لوٹ کر آئے گا تو وہ منوں مٹی تلے سو رہے ہوں گے اور ان کے والدین کا کہا سچ ثابت ہو گیا تھا۔ وہ دونوں بیٹے کی راہ دیکھتے آگے پیچھے چل بسے تھے... اور برسوں بعد وہ ان کی قبر پر آیا تھا۔ قبر کی مٹی ہاتھ میں لئے کبیر عباسی بری طرح رو رہے تھے۔ باپ کو ندامت کے پچھتاوے کے آنسو بہاتے دیکھ کر عبیر عباسی کی آنکھ بھی نم ہو گئی تھی مگر اس نے باپ کو رونے دیا تھا۔ کبیر عباسی قبر کی مٹی ہاتھ میں لئے معافی طلب کر رہے تھے۔ سسک رہے تھے۔ ان کے آنسو قبر کی مٹی کو نم کرتے جا رہے تھے مگر ان کی ندامت، پچھتاوا سب بے سود تھا کہ ان کے والدین تو ان کی صورت کو ترستے، ان کی ایک جھلک دیکھنے کو بیتاب ہوتے۔ زندگی سے ناطہ توڑ گئے تھے اور ان کے لاشہ کو کاندھا دینے کو بھی ان کا اکلوتا بیٹا نہ آیا تھا... اور آج برسوں بعد تڑپ رہا تھا تو کس کام کا کہ بوڑھی آنکھیں تو راہ دیکھتے دیکھتے سو گئی تھیں۔ کبیر عباسی کا دل کر رہا تھا کہ وہ ایک بار اپنے والدین کا چہرہ دیکھ لیں۔ ایک بار ان سے معافی مانگ لیں مگر ایسا اب ممکن نہ تھا۔ وہ قبر پر ہاتھ پھیرتے بلک رہے تھے۔ افسوس کر رہے تھے کہ کاش وہ اپنے والدین کی زندگی میں واپس لوٹ کر آ جاتے لیکن ان کے نصیب کا ستارہ کچھ یوں سویا تھا کہ ان کے دو عظیم رشتے بھی ہمیشہ کے لیے سو گئے تھے اور وہ خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔ قبرستان آتے ہوئے وہ جتنے مضطرب اور افسردہ تھے۔ واپس جاتے ہوئے اضطراب اور افسردگی کئی گنا بڑھ گئے تھے۔ اور ان کی جان کو یہ ملال ان کے مرنے تک رہنا تھا۔ قبرستان سے واپسی پر انہیں کوئی شدت سے یاد آیا تھا اور وہ تڑپ اٹھے تھے۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وہ جانے کہاں، کس حال میں ہوگی۔ فضا میں یکدم نمی بڑھ گئی تھی۔ وہ بوڑھے نیم کے درخت تلے کھڑے ان لمحات کو سوچ رہے تھے جب اس گھر میں زندگی چہکا کرتی تھی۔ جب تصور میں ایک خوبصورت لڑکی ان کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ جوان کے جانے کی راہ میں آئی تھی، محبت کا کاسہ پھیلایا تھا مگر وہ ہر ایک محبت کو لات مار گئے تھے اور آج انہیں ہر ایک محبت یاد آ رہی تھی آج انہیں اپنی پہلی محبت آبشار اور کزئی یاد آ رہی تھی اور وہ بوڑھے نیم تلے کھڑے ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گئے تھے۔

☆......☆......☆

''کبیر۔'' وہ اس کے سلام کا جواب دیئے بناء جیسے ہی اسے نظرانداز کرتا آگے بڑھا تھا وہ اس کو پکارتی عین اس کے سامنے آ گئی تھی۔

''ناراض ہیں؟'' وہ دھیمے سے پوچھ رہی تھی اور اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھ کر کبیر عباسی کو اپنی تمام ناراضگی مٹتی ہوئی محسوس ہوئی تھی مگر دو دن کی پریشانی ایسی تھی کہ وہ صاف کہہ گیا تھا کہ وہ ناراض ہے اور آبشار اور کزئی اس کے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بے ساختہ ہنس دی تھی جس پر کبیر عباسی کی ناراضگی جیسے بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ وہ مصنوعی خفگی کا تاثر دیتا گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی اس سے قدرے فاصلے پر محتاط سے انداز میں بیٹھ گئی تھی۔

''دو دن سے کہاں غائب تھیں؟''

''امی جان کی طبیعت ناساز تھی۔''

''تم مجھے بتا تو سکتی تھیں۔''

''کیسے بتاتی، جانتے تو ہیں آپ گھر کے نمبر سے کال کر کے اپنی موت کو بلاوا دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔'' آبشار نے دھیمے سے اس کے تمام اعتراضات، اس کی تمام تر ناراضگی مٹا دی تھی۔

''ایسا کیسے چلے گا آبش، تم دو دو دن تک کے لئے غائب ہو جاتی ہو اور میں تمہاری فکر میں ہلکان ہوتا رہتا ہوں۔'' وہ آبشار کا حسین چہرہ دیکھتے ہوئے اپنی پریشانی کہہ رہا تھا۔

''میں خود پریشان تھی کبیر، لیکن میرے پاس اس سب کا کوئی حل نہیں ہے۔'' وہ اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کرتی سرخ پڑ گئی تھی اور دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

''میں تمہیں وقت ضرورت تو کال کر سکتا ہوں۔'' کبیر نے کہا اور وہ ناگواری سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''بابا جان کو یہ سب لگ گیا پتہ تو بے موت ماری جاؤں گی۔ آپ سے یوں یونیورسٹی میں ملنا، بات کرنا... جانتی ہوں غلط ہے۔''

''او پلیز آبش... اب تم اپنا لیکچر شروع مت کر دینا۔'' وہ اسے درمیان میں ٹوک گیا تھا اور وہ لب بھینچ گئی تھی۔ کبیر عباسی نے بات ہی بدل دی تھی۔ ان دونوں کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر سال بھر پہلے جب اس کا یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوا تھا وہ چند دنوں کے آمنے سامنے کے بعد اپنے کلاس فیلو کبیر عباسی کو دل دے بیٹھی تھی۔ کبیر عباسی کے جذبات بھی اس کے لیے یکسر بدل چکے تھے اس لئے وہ دونوں محبت میں گرفتار ہو چکے تھے اور وہ اندھی محبت میں گرفتار خاندان کی عزت و ناموس کا خیال گویا ذہن و دل سے نکال گئی تھی۔ ہر روز کبیر عباسی سے ملنا، نئے خواب سجانا، مستقبل کی پلاننگ کرنا، اس کے معمول کا حصہ بن گیا تھا۔ نہ اسے ایک پل کبیر کے بناء چین پڑتا تھا اور نہ ہی کبیر اس کو دیکھے بناء سکون پاتا تھا۔ کبیر اور آبشار کی فیملیز میں بہت فرق تھا۔ کبیر والدین کا اکلوتا سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتا تھا جبکہ آبشار کا تعلق اونچے روایتی گھرانے سے تھا۔

''آپ اپنے والدین کو رشتہ لے کر کب بھیجیں گے؟'' کلاس لے کر کینٹین کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھ لیا تھا جس پر کبیر نے ایک گہری سانس خارج کی تھی۔

''میں تو آج ہی بھیج دوں مگر ڈرتا ہوں تمہارے بابا جان انکار ہی نہ کر دیں۔'' وہ میز پر آمنے سامنے کرسیوں پر آن بیٹھے تھے۔

''آپ اپنے پیرینٹس کو بھیجیں تو میں امی جان سے بات کر لوں گی۔'' وہ خود بھی جانتی تھی کہ یہ بہت دشوار ہوگا مگر محبت اسے خوش گمانی کے گھوڑے پر سوار قسمت آزمانے کو دوڑائے جا رہی تھی۔

''آبش! میں اتنی جلدی کے حق میں نہیں ہوں۔ تمہیں کچھ سال انتظار کرنا ہوگا۔ مجھے اپنے پیروں پر تو کھڑا ہو لینے دو۔'' وہ کوک کے

سپ لیتے ہوئے بولا تھا۔

''میں زیادہ انتظار نہیں کرسکتی کبیر... کہ آج کل میرے دو ایک پر پوزلز آئے ہوئے ہیں۔ بابا جان کو، کوئی بھی رشتہ مناسب لگ گیا تو وہ ہاں کردیں گے اور یاد رکھیے گا میں صرف جب تک کچھ کرسکتی ہوں، جب تک بابا جان کوئی رشتہ منظور نہیں کر لیتے۔'' وہ دھیمے سے بولی تھی اور کبیر کے حلق میں سموسہ اٹک گیا تھا۔ وہ حیرانگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''بابا جان زبان کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک ہی اصول ہے جان جائے پر آن نہ جائے اس لئے آپ کو جو کرنا ہے وقت پر کرنا ہے کہ ذرا بھی دیر ہوئی تو معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ایک بار بابا جان نے کسی کو زبان دے دی تو میں انکار نہیں کر پاؤں گی۔'' وہ آج کھل کر ہر بات صاف گوئی سے کہہ گئی تھی۔

''مجھ سے محبت کرتی ہو اور شادی کسی اور سے کرلوگی۔'' وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ آبشار کی بات پر کیساری ایکٹ کرے، آگے سے کیا کہے... اس لئے وہ اس پر ہی الٹا خفا ہونے لگا تھا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہے۔ آپ سے محبت کرتی ہوں۔ اسٹینڈ بھی لے سکتی ہوں مگر یاد رکھیئے گا کہ میں اپنے بابا جان کی عزت داؤ پر لگا کر کوئی فیصلہ نہیں لوں گی۔ میں آپ کی محبت میں ہر قدم اٹھانے کو تیار ہوں مگر اپنے بابا جان کی پگڑی اچھال کر نہیں۔'' وہ اٹل لہجہ میں بولی تھی کہ وہ محبت تو کر بیٹھی تھی مگر اس کے والدین کی تربیت، عزت پر جان لٹانے کا عزم اس کے اندر آج بھی زندہ تھا۔

''آپ رشتہ بھیج دیں باقی میں سنبھال لوں گی۔ اگر بابا جان نے کوئی فیصلہ لے لیا تو میں مجبور ہو جاؤں گی کہ میرے لیے میری محبت اہم ہے لیکن میرے بابا جان کی عزت اہم ترین ہے۔ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو محبت کے لئے اپنا وقار، خاندان کی عظمت کو پستی میں گرا دیتی ہیں۔ میرے لیے میرا وقار، خاندانی عظمت محبت سے بڑھ کر ہے۔'' وہ دھیمے سے اپنا فیصلہ سناتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کبیر نے گھر میں ذکر کر دیا تھا۔ اس کے والدین کو اپنے سے اونچے گھرانے میں رشتہ لے جانے پر ہزار اعتراضات تھے مگر بیٹے کا منہ دیکھ کر رشتہ لے جانے پر راضی ہو گئے تھے اور کبیر کو اپنے چھوٹے سے گھر، آنگن اور نیم کے پیڑ تلے... ہر جگہ چلتی پھرتی، ہنستی مسکراتی آبشار اور کزئی نظر آنے لگی تھی۔ وہ جاگتی آنکھوں سے سپنے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آبشار کو بتا دیا تھا کہ آنے والی اتوار کو اس کے والدین اس کا رشتہ لے کر آئیں گے اور آبشار مطمئن ہو گئی تھی۔ اتوار میں چار دن تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ ماں سے آج ہی ذکر کر دے مگر اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ لفظ جوڑتی ہی رہی تھی۔ کئی بار صحن کے چکر لگا چکی تھی جہاں اس کی ماں تخت پر بیٹھی تھیں۔ اس کی بے چینی اور بے قراری کو اس کی بھابھی تابندہ بھانپ گئی تھی۔ نرمی و شرارت سے استفسار بھی کیا تھا مگر وہ مسکرا کر ٹال گئی تھی۔ وہ فطرتاً ہی الگ تھلگ رہنے والی، کم گو، گوشہ نشین ٹائپ لڑکی تھی اس لئے اپنے کام سے کام رکھتی، زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی تھی۔ اس کا زیادہ وقت اپنی پڑھائی پر ہی صرف ہوتا تھا۔ اس لئے اس کی اپنی دونوں بھابھیوں سے ہی خاص دوستی نہ تھی۔ آئیکت اس کے بڑے بھائی کا بیٹا تھا مگر وہ کافی کم گو سنجیدہ سا بچہ تھا۔ اس کے

برعکس ان کے چھوٹے بھائی کا بیٹا شاہ زیب ایک نہایت شرارتی بچہ تھا۔اس کی شرارتوں پر وہ بھی کھل سی جاتی تھی اس لئے اس کا اپنی پڑھائی سے ہٹ کر کسی اور جگہ وقت صرف ہوتا تھا تو وہ تھا شاہ زیب، جو اکثر اس کے پاس ہی پایا جاتا تھا۔ وہ پھپھو کا لاڈلا تھا۔ آبشار اگر اسے عزیز رکھتی تھی تو وہ بھی پھپھو کا دیوانہ تھا۔ وہ اس وقت بھی ننھے شاہ زیب کو گود میں اٹھائے اس کو کھچڑی کھلاتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ ماں سے کیا، کیسے بات کرے۔ وہ اسی شش و پنج میں تھی کہ ملازمہ چلی آئی تھی۔ وہ الجھ گئی تھی کہ ماں نے اسے یوں اچانک کیوں اپنے کمرے میں بلا بھیجا ہے۔ وہ سوچتے ہوئے ماں کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ انہوں نے تسبیح کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور اپنے مخصوص نرم ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بیٹی کا ہاتھ تھام کر وہ جو بول گئی تھیں اسے سن کر آبشار کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ وہ حیرانگی سے ماں کے پرنور چہرے کو دیکھ رہی تھی جو اسے اس کے رشتہ پکا ہو جانے کی تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔ وہ لڑکے کے بارے میں اسے بتا رہی تھیں۔ اس کے تو وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ ہفتہ قبل جو دور پرے کے رشتہ داروں میں سے اس کا رشتہ آیا تھا وہ منظور کر لیا گیا ہے۔اس کی ماں چار دن بعد آنے والے اتوار کو اس کی منگنی کی اطلاع دے رہی تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ ماں کو کیسے کبیر کے بارے میں بتائے۔ کیسے کہے کہ اسے کسی محمود خان سے شادی نہیں کرنی۔ وہ تو اپنے کلاس فیلو کبیر عباسی سے محبت کرتی ہے، اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑنے لگے تھے۔ لفظ ساتھ دینے کو تیار نہ تھے۔اس نے بہت حوصلہ کر کے ماں کو کبیر کے بارے میں بتانا شروع کیا تھا۔اس کی بات ادھوری تھی کہ نرم خو، نرم مزاج ماں، جس نے کبھی اونچی آواز میں بات نہ کی تھی وہ تھپڑ لگا گئی تھی۔ سختی سے اسے آئندہ اس طرح کی بات منہ سے نکالنے سے بھی منع کر گئی تھیں۔ وہ سسکتے ہوئے ماں کے قدموں میں آن بیٹھی تھی۔

''امی جان۔ خدا کے لئے آپ تو سمجھیں۔ میں کبیر سے بہت محبت کرتی ہوں۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔آپ ایک بار بابا جان سے بات کریں۔ایک بار کبیر سے مل لیں۔'' وہ زارو قطار رو رہی تھی۔

''اس دن کے لئے تمہیں جامعہ نہیں بھیجا تھا کہ تم اپنے لئے خود بر ڈھونڈو۔ بے غیرتی سے غیر لڑکے کا نام لو۔'' وہ بیٹی کے ہاتھ جھٹک گئی تھیں۔ اسے سخت سست سنا رہی تھیں۔ وہ بری طرح روتے ہوئے ''صرف ایک بار'' کی تکرار کیے جا رہی تھی۔

''ہوش کے ناخن لے آبشار، تیرا باپ تجھے جان سے مار دے گا۔ تیرے بھائیوں کو بیوی پسند کرنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی تو لڑکی ہو کر تجھے کیسے شوہر چننے کا اختیار مل سکتا ہے۔ ماں کے سر پر اس عمر میں خاک نہ ڈال۔ بند کر کے یہ فضول خرافات، اپنے کمرے میں جا۔'' وہ لاڈلی بیٹی کا رونا برداشت نہیں کر پائی تھیں اس لئے بے بسی سے بولی تھیں۔

''امی جان۔ شریعت لڑکی کو اپنی پسند کا شوہر منتخب کرنے کی اجازت دیتی ہے۔آپ مجھ سے میرا حق نہ چھینیں۔ بابا جان سے بات تو کریں۔'' وہ جانے کی بجائے ڈٹ گئی تھی اور ایک اور زوردار طمانچہ اس کی خیریت دریافت کر گیا تھا۔

''شریعت کی بات کرتی ہے۔کون سی کتاب میں لکھا ہے کہ یوں منہ اٹھا کر غیر مرد سے علیک سلیک کرو۔ محبت کے نام پر اس سے

ملو۔خواب دیکھواور ماں باپ کے منہ کو آجاؤ۔'' وہ سخت مشتعل تھیں۔آبشار کی بولتی بند ہوگئی تھی۔

''اسلام یہ نہیں کہتا کہ لڑکا،لڑکی گھر سے باہر نکل کر عشق معاشقے کے نام پر اپنی پسند کا بر ڈھونڈیں۔اسلام یہ کہتا ہے کہ لڑکی کی شادی سے قبل اس کی مرضی معلوم کی جائے۔لڑکی کو ایک نظر لڑکا دکھا دیا جائے۔اس کی مرضی معلوم کرلی جائے۔'' وہ سخت غصہ میں تھیں بیٹی کو بالکل بھی بخشنے کو تیار نہ تھیں۔

''آپ میری مرضی معلوم کررہی ہیں ناں تو مجھے انکار ہے اس شادی سے، مجھے نہیں کرنی کسی سے بھی شادی۔'' وہ سسک رہی تھی۔

اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ماں کو کیسے منائے؟

''شریعت کی بات نہ کر بار بار آبشار کہ جب تجھ سے ماں باپ کے چند محدود سے حق ادا نہیں ہورہے تو تو اس مالک کل کے حق کیسے ادا کر پائے گی۔مذہب کوئی مذاق نہیں ہے کہ چند اوراق پلٹے،اپنی مرضی کے حسب منشاء صفحہ پڑھے۔اپنی زندگی میں ہر وقت استعمال کیے اور بات ختم۔مذہب کی بات کررہی ہے تو جا پہلے دین کو سمجھ پھر آکر ماں سے بات کرنا۔صرف اپنے مطلب کی بات نہ کر... کہ اس بات کے بھی ہزار مطالب ہیں۔ہزار احتیاطیں ہیں۔یوں شریعت کو اپنے مقصد کے لئے استعمال نہ کر کہ اللہ ناراض ہوجائے... پانچ وقت کی نماز ٹھیک سے اس کے حق کے ساتھ ادا ہوتی نہیں اور بات کرتی ہے کہ شریعت نے لڑکا پسند کرنے کا حق دیا ہے۔یوں درس گاہ میں...''

ان کا تنفس بڑھ گیا تھا۔ان سے اپنی ہی بات مکمل نہیں کی گئی تھی۔وہ رونا دھونا بھول کر ماں تک پہنچی تھی۔انہیں کاندھوں سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا تھا۔جگ سے پانی نکال کر گلاس ان کے منہ سے لگا گئی تھی۔جن کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

''آج تو نے ماں کو بڑی تکلیف پہنچائی ہے آبشار۔'' وہ سسکی تھیں اور وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''ایسے تو نہ کہیں۔معاف کردیں مجھے۔'' وہ ماں کے ہاتھ تھامے رو رہی تھی۔

''جو تو مجھ سے کہہ گئی ہے تیرے باپ بھائیوں کو پتہ لگے گا تو جیتے جی مرجائیں گے۔بہن،بیٹیاں تو خاندان کی عزت کی رکھوالی ہوتی ہیں آبشار۔تیرے منہ سے غیر مرد کا نام سن کر تیرا باپ تو زندہ درگور ہوجائے گا۔محبت وعزت میں سے ایک چیز کا انتخاب کرلے۔'' وہ رو رہی تھیں اور آبشار کے آنسو ٹھٹھر گئے تھے۔

''باپ، بھائی اسی بہن بیٹی کی عزت کرتے ہیں، دل میں اعلیٰ مقام دیتے ہیں، محبت سے اس کا ذکر کرتے ہیں جو ان کی عزت کی حفاظت کرتی ہیں۔تُو ایک غیر مرد کا ان کے سامنے نام لے گی تو اپنا مقام کھودے گی اور ماں کی ایک بات یاد رکھنا۔عزت ومقام سے گر کر نہیں جیا جاتا، فیصلہ کرلے کہ محبت چاہیے کہ مقام۔''انہوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔کچھ لمحے کو رکی تھیں۔اُن کا سانس معمول سے ہٹ کر تیز چل رہا تھا اور وہ گم صم ہوکر رہ گئی تھی۔

''باپ کی نظر تجھ پر جب بھی اٹھتی ہے اس میں مان، فخر، اپنائیت، شفقت، ہر جذبہ ہوتا ہے۔وہ ہر وقت تیری ڈھال بننے کو تیار

رہتے ہیں۔ یوں کسی لڑکے کا نام لے گی تو سہارا کھو دے گی کہ باپ بیٹی کی مرضی و پسند کے لڑکے سے اپنی بیٹی کی شادی کر بھی دے تو اس کے دل میں بال آ جاتا ہے اور ذہن و دل میں اگر ایک بار بال آ جائے تو نکلتا نہیں ہے۔ اپنے لیے خسارے نہ چن آبشار'' وہ جیسے سسکی تھیں۔ بیٹی کو اس کا نفع، نقصان سمجھا رہی تھیں یکدم آبشار کے پھر آنسو گرنے لگے تھے۔

''مجھے معاف کر دینا امی جان۔ میں نے آپ کا دل دکھایا مگر میں وہی کروں گی جو ایک اچھی بیٹی کو کرنا چاہیے۔'' وہ فیصلہ لیتی دھیمے سے کہتی ماں کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ اس کی فطرت میں، اس کی سوچ میں بناوٹ تو پہلے ہی نہ تھی۔ ماں نے جو منظر کشی کی تھی وہ اس سے ڈر گئی تھی۔ محبت کو چھوڑنے کا فیصلہ کر گئی تھی اور وہ اپنے فیصلہ پر مطمئن تھی۔ وہ اگلے دن جامعہ نہیں گئی تھی مگر جانتی تھی کہ اس کی غیر حاضری کبیر عباسی پر گراں گزرے گی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کبیر عباسی کو منگنی کے بعد پتہ چلے اور بس اسی لئے وہ تیسرے دن جامعہ چلی آئی تھی۔ اس کی توقع کے عین مطابق کبیر عباسی بہت غصہ تھا اور ناراض بھی... اور وہ جو ہر بار نرمی سے اپنی محبت سے اس کی ناراضگی دور کر دیتی تھی اس بار اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا اور قسمت کا فیصلہ اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔ وہ تو جیسے جیتے جی ہی مر گیا تھا۔ وہ اس سے لڑ رہا تھا۔ رشتہ لانے پر زور دے رہا تھا۔ کبیر کا کہنا تھا کہ وہ آبشار کے والدین کے قدموں میں گر کر ان سے آبشار اپنی محبت مانگ لے گا مگر آبشار نے دل کی آواز پر لبیک نہیں کہا تھا۔

''ہماری قسمت کے راستے جدا ہیں۔ ہمیں الگ ہونا ہی پڑے گا کبیر اور میں رسوا ہو کر جدائی نہیں چاہتی۔ جب قسمت میں جدائی رقم ہے تو کیوں نہ ہنس کر محبت سے جدا ہو جائیں۔'' آبشار کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کبیر کے پاس ہزار دلائل تھے۔ کئی مشورے تھے مگر وہ سب کو نظر انداز کر گئی تھی۔ وہ رشتوں اور محبت میں سے رشتوں کا انتخاب کرتی محبت کو الوداع کہتی گھر آ گئی تھی۔ آبشار اور کزنی کی منگنی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ منگنی کی شام اس نے پہلی دفعہ محمود خان کو دیکھا تھا اس کی ظاہری شخصیت ہر لحاظ سے مکمل تھی اور محمود خان جس نے رشتہ کی بات جب چلی تھی تب آبشار اور کزنی کی تصویر دیکھی تھی اور وہ سامنے تھی تصویر سے زیادہ حسین۔ محمود خان کو اپنے چچا کی پسند دل و جان سے بھا گئی تھی۔ محمود خان جس کی والدہ اس کی پیدائش کے دن خالق حقیقی سے جا ملی تھیں۔ اس کے والد ایاز خان نے چہیتی بیوی کی موت کا اتنا اثر لیا تھا کہ بیوی کی وفات کے تیسرے سال ہی مالک حقیقی سے جا ملے تھے۔ محمود خان کی پرورش اس کے چچا، چچی نے کی تھی جو برسوں سے بے اولاد تھے۔ محمود خان کو بھتیجے سے بڑھ کر چاہا تھا، اس کا خیال رکھا تھا، اسے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ان کی سگی اولاد نہیں ہے۔ چند سال پہلے چچی جنہیں وہ مما کہتا تھا ان کی وفات پر اسے اصلیت پتہ چلی تھی۔ اسے دکھ ہوا تھا مگر اسے زیادہ فرق نہیں پڑا تھا کہ اس کے لیے تو وہ دونوں میاں بیوی ہی کل کائنات تھے۔ سرفراز خان نے اپنے دور پرے کے رشتہ داروں میں اس کا رشتہ ڈالا تھا اور جو منظور کر لیا گیا تھا۔ اس نے اپنے چچا جنہیں وہ پپا کہتا تھا کی پسند کو اوکے کر دیا تھا۔ وہ اپنی منگنی سے بے حد خوش تھا۔ دوسری جانب کبیر عباسی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر گزرے۔ اس نے باہر جانے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ آبشار یونیورسٹی آ رہی تھی اور اس سے یہ بھی

برداشت نہیں ہوا تھا۔اس نے آخری سمسٹر کی پرواہ کئے بناء یونیورسٹی چھوڑ دی تھی اور اس کی ان حرکتوں سے اس کے والدین ناواقف تھے۔ چھ ماہ کیسے گزرے پتہ ہی نہیں چلا تھا۔کبیر عباسی کے والدین پر قیامت تو تب ٹوٹی جب انہیں اس کے باہر جانے کا پتہ لگا تھا اور وہ ایک محبت کے دور جانے پر اتنا سنگدل ہوا تھا کہ اس نے والدین کی محبت کو بھی محسوس کرنا چھوڑ دیا تھا۔اس کے والدین اسے روک رہے تھے اور وہ ہر فریاد، ہر محبت کو ٹھکرا گیا تھا۔ایک دوست کے ذریعے آبشار اور کزئی کو اس کے باہر جانے کا پتہ چل گیا تھا اور وہ اس سے ملی تھی۔جس طرح ملی تھی یہ بھی ایک لمبی کہانی تھی۔وہ کبیر عباسی کو روکنے کی چاہ میں خود کو مشکل میں ڈال کر اس سے ملی تھی اور یہی اس کے حق میں غلط ہوا تھا۔

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

وہ جس کافی شاپ میں کبیر عباسی سے ملی تھی وہاں اسے محمود خان نے دیکھ لیا تھا۔ وہ روتی بلکتی آبشار کو ایک غیر مرد کے ساتھ دیکھ کر اشتعال کو چھونے لگا تھا۔ یہ بات اس کی غیرت پر تازیانے کی مانند تھی کہ وہ جس سے شادی کرنے والا تھا، اس کی ہونے والی بیوی یوں غیر مردوں سے ملتی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کبیر عباسی کے سامنے روتی ہوئی آبشار کا منہ تھپڑوں سے سرخ کر دے۔ اس کو گدی سے پکڑ کر کھینچتا ہوا اس کے گھر لے کر جائے اور اس کے غیرمند باپ بھائیوں کو دکھائے کہ وہ کتنے پارسا لوگ ہیں۔ ان کی پارسائی کیسے کھلے عام کافی شاپ پر دعوتِ نظارہ دے رہی ہے مگر وہ خود کو روک گیا تھا مگر اس دن اسے آبشار سے نفرت ہو گئی تھی۔ ہاں، اس لڑکی سے نفرت جس پر پڑنے والی پہلی نظر اسے اپنا اسیر کر گئی تھی۔ جسے پہلی دفعہ دیکھا تھا محبت محسوس کی تھی۔ اب اسی لڑکی سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آبشار سے شادی نہیں کرے گا مگر وہ اسے معاف بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ اگر شادی نہیں کرے گا تو اس کے راستے صاف ہو جائیں گے اور وہ یہ بالکل نہیں چاہتا تھا۔ اس کی انا و غیرت پر کاری ضرب لگی ہوئی تھی وہ آبشار کو سخت سے سخت سزا دینا چاہتا تھا۔ ایسی سزا کہ محبت جو نفرت میں تبدیل ہو گئی تھی اور جو نفرت شدتوں سے سلگ رہی تھی کسی طرح سرد ہو جائے۔ وہ جتنا سوچ رہا تھا اس کا غصہ بڑھ رہا تھا مگر کوئی حل نکل کر نہیں دے رہا تھا۔

''آبشار اور کزنئی! اگر تمہارے سبب آج میں بے چین ہوں تو تمہیں سکون سے رہنے نہیں دوں گا۔ تمہارا چین و سکون برباد کر دوں گا۔'' محمود خان نے نفرت سے آبشار کو دل ہی دل میں مخاطب کیا تھا جبکہ وہ محمود خان کی نفرت و عزائم سے انجان اپنے گھر والوں کے ساتھ مل کر شادی کی تیاریوں میں مگن تھی۔ آبشار کو اپنی محبت سے بچھڑنے کا دکھ تھا مگر وہ اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی البتہ اسے کسی کی بھی پرواہ کیئے بغیر کبیر عباسی کا ملک چھوڑ کر جانا دکھ سے دوچار کر گیا تھا۔ سال کیسے آنکھ میچے گزرا تھا اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا اور اس کی مہندی کی شام اپنے جلو میں کئی رنگ لئے چلی آئی تھی۔ زرد رنگ کے جوڑے میں اس کے چہرے کی شادابی خیرہ کن لگ رہی تھی۔ مہندی کی شام کی تصاویر دیکھ کر محمود خان دیکھتا ہی رہ گیا تھا اور اس نے جو عین شادی والے دن شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا اس فیصلہ میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ آبشار اور کزنئی کا حسن اتنا مکمل تھا کہ محمود خان کی نظر ٹھہر گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحہ وہ تمام تصاویر دور اچھال گیا تھا۔

''یہ حسن جس پر میں تمام تر حقوق حاصل کرنے جا رہا ہوں، یہ پہلے ہی اپنا خراج وصول کر چکا ہے۔ آبشار اور کزنئی کی زندگی میں پہلے ہی کوئی مرد آ چکا ہے اور میں کسی مرد کی اترن کو اپنے نکاح میں نہیں لے سکتا۔'' شادی سے انکار کے لئے اس کے پاس ہزار جواز تھے۔

''میں نکاح سے انکار کروں گا تو آبشار اور کزنئی کی راہ کا کانٹا ہی نکل جائے گا۔ وہ من کی چاہ حاصل کر لے گی اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گا'' وہ نکاح سے انکار کا فیصلہ از خود بدل گیا تھا۔ آبشار کا حسن اور وہ اسی شخص سے شادی نہ کر لے کا خیال ایسا تھا کہ شادی کرنے پر خود کو مجبور پا رہا تھا مگر اس کی مردانہ انا یہ گوارہ بھی نہیں کر پا رہی تھی کہ وہ ایسی عورت کو اپنے نکاح میں لے جو کسی اور کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس

نے سوچ لیا تھا کہ وہ آبشار اور کزئی کی غیر مرد سے تعلقات کی داستان کو یوں عین نکاح کی شام اچھالے گا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔اس کے عزائم پختہ تھے مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دولہا کی گاڑی حادثہ کا شکار ہوگئی تھی۔محمود خان پچھلی سیٹ پر تھا اس لئے وہ محفوظ رہا تھا مگر اس کے چچا جو ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے، شدید زخمی ہوئے تھے۔عین موقع پر ڈرائیور جاں بحق ہو گیا تھا جبکہ چچا ہسپتال میں ایڈمٹ تھے۔ان کے بچنے کی کوئی امید ہی نظر نہیں آ رہی تھی۔شادی ٹل گئی تھی۔سب چچا کی صحت یابی کے لئے دعا گو تھے اور کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ تین دن کی بے ہوشی کے بعد چچا ہوش میں آ گئے تھے۔محمود خان کو ان سے بے حد محبت تھی وہ اپنے عزائم کو بھلائے ان کی تیمارداری میں لگ چکا تھا۔تقریباً ہفتہ بعد وہ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوئے تھے۔آبشار اور کزئی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ایک بار چچا کو دیکھنے ہاسپٹل گئی تھی۔اسے وہاں دیکھ کر محمود خان سحرزدہ ہو کر رہ گیا تھا۔اس کا حسن بے حد مکمل تھا۔چاندنی سا سراپا اسے اپنی اور کھینچ رہا تھا اور نکاح سے انکار کا عزم کھوکھلا ہونے لگا تھا۔وہ نئی الجھن میں گرفتار ہو چکا تھا۔وہ آبشار کو سزا دینا چاہتا تھا اور آبشار اسے اپنی اور کھینچ رہی تھی۔

چند لمحے اس پر بڑے بھاری گزرے تھے وہ نئی الجھن میں گرفتار ہو چکا تھا مگر چچا کی بیماری نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔وہ ایک بار پھر آبشار اور کزئی کو بھول بیٹھا تھا۔یونہی پورے پندرہ دن گزر گئے تھے۔ایک دن آبشار اور کزئی اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ چچا کو دیکھنے محمود خان کے گھر بھی آئی تھی اور اسے اپنے گھر میں دیکھ کر محمود خان کے اندر پھر جنگ سی چل پڑی تھی۔لاؤنج سے گزرتے ہوئے وہ بڑی عجلت میں کسی سے ٹکرایا تھا۔آبشار اس غیر متوقع ٹکراؤ سے خود کو سنبھال نہیں پائی تھی بری طرح لڑکھڑائی تھی اور وہ اسے سنبھال گیا تھا۔خوشبو سا لچکدار سراپا اس کی بانہوں میں جھول گیا تھا۔یہ افتاد آبشار اور کزئی کے لئے پریشان کن تھی اور محمود خان اس کے حسین سراپے میں نظریں الجھا بیٹھا تھا۔وہ حصار توڑ کر بڑی تیزی میں وہاں سے نکلی تھی اور یہ تصادم محمود خان کی سوچ کا انداز بدل گیا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ میں تمہاری محبت نہیں ہوں آبشار اور کزئی۔تمہارے دل کا بے تاج بادشاہ کوئی اور ہے۔اور یہ میری توہین ہے کہ میں نے جسے سوچا، وہ کسی اور کو سوچتی ہے اور اس کی سزا تمہیں ملے گی آبشار۔دل تک نہیں جا سکتا، جسم تک رسائی ممکن ہے۔'' وہ نفرت سے ہنکارا بھرتے ہوئے مکروہ سوچ کے ساتھ مسکرایا تھا۔محمود خان نیا عزم کر چکا تھا۔اب اسے عمل پیرا ہونے کے لئے موقع کی تلاش تھی اور موقع اسے ٹھیک بائیس دن بعد میسر آیا تھا۔۔اس نے اور کزئی ہاؤس کال کر کے کہا تھا کہ چچا کی بہت طبیعت خراب ہے اور وہ آبشار سے ملنے کی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں۔جس وقت محمود خان نے اس پیغام کو ان تک پہنچایا تھا سوئے اتفاق اس وقت آبشار کے دونوں بھائی گھر پر موجود نہ تھے اور جلد آنا بھی ممکن نہ تھا۔آبشار کے والد نے فی الحال معذرت کر کے بیٹوں کی واپسی تک کے لئے بات مؤخر کر دی تھی مگر وہ بضد ہو گیا تھا لیکن اس کے اصرار کو آبشار کے والد نے چنداں اہمیت نہ دی تھی اور معذوری ظاہر کر کے معذرت کر لی تھی کیونکہ آبشار کے والد ہارٹ پیشنٹ تھے۔ان کے دونوں بیٹوں نے انہیں ڈرائیونگ سے منع کیا ہوا تھا۔کل رات سے انہیں بخار تھا اس لئے وہ معذرت کرنے پر

خود کو مجبور پا رہے تھے۔محمود خان نے نہ چاہتے ہوئے بھی رابطہ منقطع کیا تھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا تھا کہ اس نے آج کا دن منتخب ہی اس لئے کیا تھا کہ اس کے علم میں تھا کہ آبشار کے دونوں بھائی کاروبار کے سلسلے میں ایک کمپنی کے ساتھ میٹنگ میں مصروف تھے اور میٹنگ کی جگہ ان کے گھر سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کی ڈرائیو پر تھی۔اور یہ بات اس کے حق میں جاتی تھی اور یہی نہیں اس کے چچا بھی آج منظر سے غائب تھے وہ کافی عرصہ سے بیمار تھے گھر میں مقید ہو کر رہ گئے تھے اور ایک گھنٹہ قبل ہی دوست کی طرف اس کی بیٹی کی منگنی میں گئے تھے۔اس وقت شام کے چھ بج رہے تھے اور اس نے جو کرنا تھا گھنٹہ دو گھنٹہ میں ہی کرنا تھا۔وہ کچھ سوچ کر اور کزنی ہاؤس پہنچ گیا تھا۔اس کی شکل پر بارہ بج رہے تھے۔اس نے پریشانی سے ان دونوں میاں بیوی کو بتایا تھا کہ چچا کی طبیعت بہت خراب ہے اور چچا آبشار کو یاد کر رہے ہیں اس لئے وہ آبشار کو لینے آیا ہے۔روایتی سے لوگ تھے۔منگنی کے بھی حق میں نہ تھے مگر چچا کی ضد کے آگے چپ ہو رہے تھے اور چچا کے ہی بے حد اصرار پر انہوں نے ذہن و دل کی آمادگی نہ ہونے کے باوجود بیٹی کو اس کے ہونے والے سسرال جانے دیا تھا۔انہوں نے یہ تو سوچا بھی نہ تھا کہ ایک غیر شرعی رشتہ انہوں نے جو صرف محمود خان کے چچا کی محبت و اصرار پر باندھا تھا وہ ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔وہ دونوں میاں، بیوی ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے کہ محمود خان آبشار کو اپنے ساتھ ہاسپٹل لے جانے کی بات کر رہا تھا اور وہ بیٹی کو یوں اس کے منگیتر کے ساتھ بھیجنے کے حق میں نہ تھے۔آبشار کی ماں ساتھ چل پڑنے کو راضی ہو گئی تھیں۔وہ دونوں ماں بیٹی چادریں سنبھالیں محمود خان کے پیچھے چل پڑی تھیں اور وہ جو صرف آبشار کو لے جانے کے ارادے سے آیا تھا اس کی ماں کو ساتھ لے جانے پر مضطرب ہو چکا تھا۔اسے لگا تھا کہ اس کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔وہ ادھیڑ بن میں لگا تھا کہ ایسا کیا کرے کہ آبشار کی ماں گدھے کے سر سے سینگ کی طرح درمیان سے غائب ہو جائے اور وہ اپنے مکروہ عزائم میں کامیاب ہو جائے۔وہ کار چلاتا سوچ رہا تھا کہ اس کے دماغ میں ایک نئی ترکیب آئی تھی۔اس نے گاڑی ہاسپٹل کے سامنے روکی تھی۔دونوں ماں بیٹی کے ساتھ وہ ہاسپٹل کے اندرونی حصہ کی جانب بڑھنے لگا تھا کہ یکدم اس نے بہت دھیمی آواز میں آبشار کو پکارا تھا اور گاڑی میں چچا کی میڈیسن بھول آنے کا بتا کر گاڑی کی چابی اس کی جانب بڑھائی تھی۔وہ شش و پنج میں تھی کہ کیا کرے کہ اس کی ماں نے اشارہ کیا تھا وہ چابی لے کر واپسی کے راستے کی جانب مڑ گئی تھی اور وہ آبشار کی ماں کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا تھا۔اس نے انہیں کمرہ نمبر بتایا تھا اور خود ریسپشن پر معلومات لینے کے بہانے اس طرف بڑھ گیا تھا۔وہ اس کی چالاکیوں سے انجان آگے بڑھ گئی تھیں اور محمود خان بڑی تیزی سے باہر کی طرف بھاگا تھا کہ وہ اسے گاڑی میں مل جاتی تو اس کے لئے آسانی تھی۔اسے گاڑی میں بٹھانے میں اسے پھر کوئی پلاننگ کرنی پڑتی۔وہ محمود خان کی مکروہ سوچ سے انجان فرنٹ سیٹ پر بیٹھی دوائیوں کا شاپر ڈھونڈ رہی تھی۔وہاں کوئی شاپر ہوتا تو اسے ملتا۔وہ اس بات سے انجان کہ شاپر سرے سے ہے ہی نہیں۔ڈیش بورڈ کھنگال رہی تھی، چونکی تو اس وقت جب ڈرائیونگ ڈور کھلا اور اس سے محمود خان اندر آن بیٹھا اور معصومیت سے دریافت کیا تھا۔

''آپ کو ملا نہیں اب تک شاپر۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتی سیدھی ہی ہوئی تھی کہ کار اسٹارٹ ہو گئی تھی۔وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں ؟'' وہ متوحش نگاہ سے اسے دیکھتی استفسار کر رہی تھی مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا وہ گاڑی فل اسپیڈ میں دوڑا رہا تھا اور اس کی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔ گاڑی روکنے کا کہہ رہی تھی مگر وہ اس کی نہیں سن رہا تھا۔ اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ستانے لگا تھا۔ وہ فرنٹ ڈور اوپن کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی کہ وہ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتا دوسرے سے اس کی کلائی پر گرفت کر گیا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر ہی اپنے گھر کے سب سے قریبی ہاسپٹل گیا تھا۔ دس منٹ میں اس کی گاڑی اپنے گھر کے گیراج میں داخل ہوئی تھی وہ مزاحمت کر رہی تھی، روتی چیختی بھاگنے کو پر تول رہی تھی مگر اس کی ہر کوشش کو وہ ناکام بنا گیا تھا۔ اسے کھینچتا ہوا اپنے بیڈروم میں لے گیا تھا۔ وہ چوکیدار کو بھاری رقم دے کر پہلے ہی زبان بندی پر راضی کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ گھر کی اکلوتی ملازمہ کو وہ پروگرام ترتیب دینے کے ساتھ ہی چھٹی دے کر منظر سے غائب کر گیا تھا۔ آبشار بھاگنے کی ہر راہ کو مسدود پا رہی تھی۔

''آپ میرے ساتھ ایسے کیوں کر رہے ہیں۔ میں آپ کی ہونے والی بیوی ہوں'' وہ بری طرح سسک رہی تھی۔ اس کے نئے روپ کو ہضم ہی نہیں کر پا رہی تھی اور وہ اپنی محبت سے نفرت تک کی داستان اسے سنا گیا تھا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے اسے سن رہی تھی۔

''میں نے کبیر کو اپنے دل سے اسی دن نکال دیا تھا جس دن سے آپ سے منگنی ہوئی تھی'' وہ اس پر لعنت ملامت کر رہا تھا تب وہ سسکتے ہوئے بولی تھی۔

''پہلی محبت عمر کے فرق کی طرح ہوتی ہے گھٹنے سے ماورا، بڑھتی ہوئی'' وہ پھنکارا تھا۔

''آپ کو مجھ پر نہیں یقین تو مجھ سے شادی نہ کریں۔ مجھے یہاں اس طرح زبردستی لانے کا کیا مقصد ہے۔ امی جان مجھے ڈھونڈ رہی ہوں گی۔ خدا کے لئے ہاسپٹل واپس چلیں'' وہ غصہ ہونے لگی تھی کہ زبان روکتی مصالحت سے بولی تھی کہ وہ جس پوزیشن میں تھی وہ غصہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔۔۔ جس طرح وہ اسے یہاں تک لایا تھا وہ چیخ چیخ کر اس کے مقصد کو بیان کر رہا تھا اور وہ اسے اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ منتوں پر اتر آئی تھی۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے، بری طرح کھینچے جانے کے باعث اس کی چادر راستے میں ہی گر چکی تھی۔ وہ اپنے توبہ شکن نسوانی حسن کے ساتھ اس کے سامنے تھی اور وہ تو کافی دن سے گندے ارادے بنا رہا تھا۔ اس کا یوں سامنے ہونا اس کے اندر کے شیطان کو جگا رہا تھا۔

''تم دنیا میں واحد لڑکی تھیں جس کے لئے دل میں نرم گوشہ محسوس کیا، کچھ خواب سجائے'' وہ خود کو قابو کرتا دھاڑا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں باہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''مگر تم ایک عام سطحی لڑکی نکلیں۔ اور جب تم اس کبیر عباسی نامی شخص سے تنہائیوں میں مل سکتی ہو، اس کی تسکین کا ذریعہ بن سکتی ہو تو میری تسکین کا سبب کیوں نہیں بن سکتیں'' وہ جو سمجھ رہی تھی کہ وہ بولنے میں اس قدر مگن ہو چکا ہے کہ اس کی جانب سے غافل ہو چکا ہے۔ وہ نامحسوس طریقے سے باہر کی جانب بڑھتی دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ چند قدم کی دوری اور پھر وہ یہاں سے بھاگ سکتی تھی مگر وہ کہتے کہتے

اس کا بازو یوں جکڑ گیا تھا کہ خوف کے مارے اس کی چیخ تک حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔

''بتاؤ آبشار اور کزئی۔ جس مرد سے تم تنہائی میں ملتی رہیں اس سے کیا رشتہ تھا۔ کس حق سے اس سے ملیں۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کس رشتے سے کافی شاپ میں بیٹھی تھیں۔'' وہ بازو میں اس کی انگلیاں گھستی ہوئی محسوس کر رہی تھیں۔

''میں اتنی بری لڑکی نہیں ہوں۔ کبیر میرا کلاس فیلو تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔'' وہ اس کے کردار کی دھجیاں بکھیر رہا تھا اور وہ تڑپ کر چیخ اٹھی تھی۔ اس کا آخری جملہ محمود خان کی اس کے بازو پر گرفت کچھ اور بڑھانے کا سبب بنا تھا۔

''مگر میرے گھر والوں نے میری شادی کے لئے آپ کو منتخب کیا۔ میں نے کبیر سے شادی کا خیال دل سے نکال دیا۔ آپ سے منگنی کر لی۔''

''اگر کبیر سے شادی کا خیال ہی دل سے نکال دیا تھا تو ہماری منگنی کے بعد اس سے کیوں ملی تھیں۔ کون سے عہد و پیماں رہ گئے تھے۔'' وہ اس کی بات کے درمیان میں بدلحاظی سے چیخا تھا۔ وہ اس کے شفاف کردار کی دھجیاں اڑا رہا تھا اسے بری لڑکی ثابت کر رہا تھا۔

''لڑکی شادی سے پہلے باپ، بھائی کی عزت کی امین ہوتی ہے اور تم نے کبیر سے تعلق رکھ کر امانت میں خیانت کی اور میں تم جیسی لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتا... کہ شادی کے بعد لڑکی شوہر کی عزت کی امین ہوتی ہے۔ تم باپ کی عزت نہ رکھ سکیں، شوہر کی عزت کی رکھوالی کیا کرو گی۔'' وہ اسے دھتکار رہا تھا۔ نفرت بھرے جملے اس کی سماعتوں کی نظر کر رہا تھا۔

''آپ کو مجھ سے شادی نہیں کرنی تو نہ کریں۔ مگر مجھے ذلیل کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔'' آبشار کی برداشت جواب دے گئی تھی وہ مزید محمود خان کی بکواس برداشت نہیں کر سکی تھی اس کا ہاتھ بے اختیار اٹھا تھا اور محمود خان کے گال پر ثبت ہو گیا تھا۔ اسے آبشار سے ایسی کوئی امید نہ تھی۔ وہ بے یقین تھا اور جیسے ہی بے یقینی پر یقین کی مہر ثبت ہوئی تھی اس کا پہلے سے آسمان کو چھوتا غصہ ساتویں آسمان تک جا پہنچا تھا۔ اس کے اندر کا وحشی مرد اپنی تذلیل پر بلبلا کر جاگ گیا تھا۔

''حق حاصل کرنے کا شوق بھی نہیں ہے مجھے۔ یوں چھپ چھپ کر غیر مردوں کی تسکین کا سبب بننے والی عورت پر حق نہیں جمایا جاتا، تسلط قائم کیا جاتا ہے۔ عزت نہیں دی جاتی، ذلت سے نوازا جاتا ہے۔'' وہ دھاڑتے ہوئے اسے بیڈ پر دھکیل گیا تھا۔

''میں تمہیں سزا دینا چاہتا تھا مگر کوئی طاقت تھی جو مجھے روک رہی تھی۔ تب ہی میں وقت گزرنے کا احساس کئے بغیر سوالاً جواباً کا تم سے کھیل، کھیل رہا تھا۔ مگر تم نے میرے منہ پر طمانچہ لگا کر اس کھیل کو ختم کر دیا ہے۔''

محمود خان کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو رہا تھا اس نے شرٹ گریبان سے پکڑ کر کھینچی تھی اور دور اچھال دی تھی۔

''تم نے میری توہین کی ہے۔ میرے منہ پر طمانچہ مار کر میری تذلیل کی ہے۔ مرد کے منہ پر تھپڑ مارا ہے اور اس کی گونج مجھے تاحیات یاد رہے گی اور اس گونج سے اٹھنے والی تذلیل تمہارا بھی مقدر بنے گی۔'' محمود خان کے انداز میں اب ذرا بھی نرمی نہیں تھی۔ وہ اشتعال کی

حدوں کو چھوتا اس کی جانب پیش رفت کر چکا تھا۔ وہ فرار کی ہر راہ کو مسدود پا رہی تھی۔ منتیں کر رہی تھی لیکن محمود خان نے اس کی ہر مزاحمت کا اپنی مضبوط گرفت میں دم آخر کر دیا تھا۔ کمرہ آبشار اور کنزئی کی دردناک، فریاد کناں چیخوں سے گونج رہا تھا اور وہ اس کی ہر فریاد کو ٹھوکروں پر رکھ چکا تھا۔ وہ اس عورت کی عزت پامال کر رہا تھا جس سے محبت کا دعویٰ تھا۔ وہ عورت جو اُس سے ایک شرعی رشتے میں بندھنے جا رہی تھی مگر اس عورت کے لئے سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ آبشار اور کنزئی کی ہر مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ محمود خان اپنے مکروہ عزائم میں کامیاب ہو چکا تھا۔ آبشار اور کنزئی کی ماں پر کمرہ نمبر 32 میں جا کر حقیقتیں عیاں ہونے لگی تھیں۔ وہ حیران سی خالی کمرہ کو دیکھتیں نرس سے سوال کر گئی تھیں اور انہیں پتہ لگا تھا محمود خان کے چچا تو ہاسپٹل لائے ہی نہیں گئے۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھیں کہ یہ سب کیا ہے۔ وہ ریسیپشن سے معلومات لیتیں پارکنگ تک آئی تھیں وہاں محمود خان کی گاڑی نہیں تھی۔ وہ ہاسپٹل کے چکر کاٹنے لگی تھیں مگر تا حال وہ محمود خان اور آبشار اور کنزئی کو ڈھونڈنے میں ناکام رہی تھیں۔ وہ ریسیپشن پر پہنچی تھی اور فون کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ انہوں نے گھر کا نمبر ملایا تھا۔ شوہر کو روتے ہوئے بتایا تھا۔ وہ بھی گھبرا گئے تھے۔ جس وقت وہ محمود خان کے گھر پہنچے تھے سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ محمود خان کے چچا بھی واپس آ گئے تھے اور تمام صورتحال ان کے لئے بھی غیر معمولی و غیر یقینی تھی۔ وہ محمود خان کو تھپڑ لگا گئے تھے اس سے اتنی گری ہوئی حرکت کی وجہ دریافت کر رہے تھے۔ محمود خان پٹنے کے بعد بھی چپ تھا اور اس وقت چچا اس سے جواب طلبی کر رہے تھے اسی وقت آبشار کے والد وہاں پہنچے تھے۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ کیا ہوا ہے۔ محمود خان کے چچا کیوں اس قدر غصہ میں ہیں۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ آبشار کی والدہ بھی وہاں پہنچ گئی تھیں اور لپک کر محمود خان تک پہنچی تھیں۔

''میری بیٹی کہاں ہے؟'' وہ اس کا گریبان جکڑے سوال کر رہی تھیں۔ وہ نظر چرا کر رہ گیا تھا اور وہ کمرے کے چہار اطراف نگاہ دوڑانے لگی تھیں۔ کمرے کے کونے میں سکڑی سمٹی سی بیٹھی آبشار پر ان کی نگاہ پڑی تھی اور وہ بیٹی کی طرف لپکی تھیں۔ وہ ماں کو دیکھ کر ان کے سینے میں سماتی یوں بلک کر روئی تھی کہ ان کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ آبشار کے والد کی اتنی ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہ اس طرف نگاہ ہی کر لیتے کہ چچا کا بگڑنا، محمود خان کا خاموشی سے پٹنا، آبشار کا بلکنا، سب کچھ بہت الجھا ہوا تھا مگر پھر بھی صاف عیاں تھا۔ آبشار کے والد کی آنکھوں میں نمی اتری تھی۔ انہوں نے فقط ایک نگاہ اس شخص پر ڈالی تھی جس پر اعتبار کیا تھا اور وہ ان کے اعتبار کا خون کر چکا تھا۔ وہ محمود خان سے جواب دہی کرنا چاہتے تھے مگر قدم اٹھ نہیں سکے تھے۔ یکدم سینے میں درد کی لہر اٹھی تھی۔ وہ اپنے پورے قد سے زمین پر آ گرے تھے۔ وہ اتنی ذلت برداشت نہیں کر پائے تھے۔ حقیقت منکشف ہونے کے اگلے ہی لمحے ان کی سانس رک گئی تھی۔ اور کنزئی ہاؤس کے مکینوں پر دوہری قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ زندہ درگور ہوئی آبشار کو روتے یا مردہ باپ کا ماتم کرتے۔ زندگی نے یکدم اپنے معنی ہی بدل لئے تھے۔ آبشار ہاسپٹل میں تھی اور اس کے باپ کا جنازہ تیار رکھا تھا۔ آبشار کے بھائی محمود خان کو نیست و نابود کر دینا چاہتے تھے مگر باپ کے جنازے نے انہیں مہر بہ لب کر دیا تھا۔ چچا، محمود خان کے عمل سے سخت نادم تھے۔ وہ اسے نکاح پر مجبور کر رہے تھے مگر وہ نہ نادم تھا اور نہ ہی نکاح کے

لئے حامی بھری تھی۔ایک ماہ گزر گیا تھا۔آبشار ہاسپٹل سے گھر آ چکی تھی۔اس کی حالت دگر گوں تھی۔بس سانس رواں دواں تھی۔اس کے بھائی محمود خان سے ملے تھے۔لعنت ملامت کی تھی۔غصہ ونفرت کا اظہار کیا تھا مگر جو وہ کھو چکے تھے اس کے کوئی نعم البدل نہیں تھا۔اور وہ کیس کرنا تو چاہتے تھے مگر کر نہیں سکتے تھے کہ ابھی ذلت کی خبر صرف خود انہیں تھی پھر زمانے کو ہو جاتی۔وہ محمود خان کے چچا سے گزارش کر رہے تھے کہ وہ محمود خان کو نکاح کے لئے راضی کریں مگر وہ کوشش میں ناکامیاب ہو گئے تھے۔وقت تیزی سے گزرا تھا۔فقط ڈھائی ماہ بعد جو خبر اورکزئی پیلس میں پھیلی تھی وہ ان سب کے ہوش اڑا گئی تھی کہ وہ ڈھائی ماہ سے تو آبشار پر ہونے والے ظلم سے زمانے کو بے خبر رکھے ہوئے تھے مگر اب ایسا ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ پریگننٹ تھی۔دونوں بھائیوں کے ہوش اڑ گئے تھے۔وہ ایک بار پھر محمود خان کی دہلیز پر پہنچ گئے تھے۔ہاتھ جوڑے تھے، پاؤں پکڑے تھے، ان کی صرف اتنی سی التجا تھی کہ وہ آبشار سے نکاح کر لے۔اپنے بچے کو نام دے لیکن محمود خان راضی نہیں ہوا تھا۔چچا نے اس کے ہاتھ جوڑے تھے مگر وہ پھر بھی ٹس سے مس نہیں ہوا تھا۔اورکزئی ہاؤس کا ماحول یکدم مکدر ہو چکا تھا۔دونوں بھائیوں میں اختلافات ہو گئے تھے۔بڑے بھائی شوکت کا کہنا تھا کہ وہ بہن کا ساتھ دیں گے کہ جو ہوا اس میں اس کی بہن بے قصور ہے اور وہ اسے اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔چھوٹے بھائی جہانزیب کا کہنا تھا کہ آبشار کی وجہ سے ان کا باپ مر گیا۔ان کے خاندان کی عزت خاک میں مل گئی۔چند ماہ گزریں گے تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔وہ یہ تو چھپا گئے تھے کہ محمود خان ان کی بہن کو بے آبرو کر چکا ہے مگر وہ اس کے بچے کو دنیا کی نظر سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتے تھے۔مگر شوکت اورکزئی نے ہر حال میں بہن کو سپورٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

''یہ وقت بہت کڑا ہے جہانزیب، اور اس کڑے وقت میں، میں اپنی بہن کو بے سہارا نہیں کر سکتا۔اس سب میں اگر وہ خطاوار ہوتی تو میں اسے دھتکار دیتا۔مگر نہیں ہماری بہن بہت معصوم ہے اور ہم اس کے بھائی اگر آج اس کا ساتھ نہیں دیں گے تو پھر کون اس کا سہارا بنے گا۔'' شوکت اورکزئی نے چھوٹے بھائی کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی اور وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گئے تھے۔جہانزیب اورکزئی کو بڑے بھائی کی بات سمجھ آ گئی تھی کہ انہیں بھی تو اپنی بہن بے حد عزیز تھی اور جو ظلم اس کے ساتھ ہو گیا تھا وہ اس کے بعد اسے اکیلا نہیں کر سکتے تھے۔دونوں بھائیوں نے مل کر محمود خان کو نکاح کے لئے راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر وہ شخص اتنا پتھر دل تھا اس کا دل کچھ یوں سیاہ ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے گناہ کو ان کے لئے عمر بھر کی سزا بنا دیا تھا۔محمود خان کی سنگدلی پر وہ چپ کے چپ رہ گئے تھے کہ وہ لوگ اس بے حس انسان کو مجبور نہیں کر سکتے تھے۔وہ اپنا معاملہ اپنی بہن کی معصومیت لٹنے کا دردناک معاملہ اللہ پر چھوڑ گئے تھے کہ وہی سب سے بڑا منصف ہے۔آبشار کی جو کنڈیشن تھی وہ زیادہ دن عزیز و اقارب اور محلہ والوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی اس لئے شوکت اورکزئی کے فیصلے کی روشنی میں جہانزیب اورکزئی اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ آبشار کو لے کر دوسرے شہر منتقل ہو گئے تھے۔یہ فیصلہ اس لئے لیا گیا تھا کیونکہ جہانزیب کی بیوی امید سے تھی۔جہانزیب اورکزئی بیوی اور بہن کو لیے لاہور آ گیا تھا۔بہانہ یہی تھا کہ کام کے سلسلے میں وہ یہاں آ گئے ہیں۔اللہ نے آبشار اورکزئی کا پردہ زمانے بھر میں رکھنے کا از خود انتظام کر دیا تھا۔جہانزیب اورکزئی کو اللہ نے بیٹے کی نعمت سے ایک بار پھر

نوازا تھا۔کئی ماہ بعد جہانزیب اور کرزئی کے چہرے پر اطمینان چھلکا تھا وہ بہت خوش تھے۔ڈلیوری نارمل تھی۔ ماں اور بچہ دونوں مکمل صحت مند تھے۔ جہانزیب نے سب سے پہلے بھائی کو کال کی تھی اور انہیں بھی خوشخبری دی تھی۔شوکت اور کرزئی بھی خوش ہو گئے تھے انہوں نے بھائی کے بے حد اصرار پر لاہور آنے کی حامی بھر لی تھی مگر چند گھنٹوں بعد ہی بری خبر ان کے پاس پہنچ گئی تھی جسے سن کر ان سے رہا نہیں گیا تھا اور وہ پہلی فلائٹ سے لاہور پہنچ گئے تھے۔ ننھے بچے کو ایک دم ہی تیز بخار ہو گیا تھا اور ڈاکٹرز نے اپنے طور پر تو ٹریٹمنٹ کر دیا تھا لیکن وہ چند گھنٹوں کے بچے کو بچا نہیں پائے تھے۔خوشی بھرا ماحول یکدم ہی افسردہ ہو گیا تھا۔جس بچے کو چند گھنٹوں قبل بانہوں میں بھر کر جہانزیب اور اس کی بیوی رخسار نے زندگی کو محسوس کیا تھا وہ زندگی یکدم موت کی بانہوں میں چلی گئی تھی۔ جہانزیب کی بیوی کی حالت رو رو کر بری ہو گئی تھی۔ وہ بلکتی ہوئی بیوی کو سنبھالنے میں ناکام ہو رہا تھا مگر کیا کرتا کہ یہی مشیت ایزدی تھی۔شوکت اور کرزئی لاہور پہنچ گئے تھے۔چھوٹے بھائی کا اس مشکل وقت میں مضبوط سہارا ثابت ہوئے تھے۔ بھابھی کے سر پر ہاتھ رکھ کر صبر کی تلقین کر گئے تھے۔آبشار اور کرزئی جو حادثہ کے بعد ضرورتاً ہی بھائیوں کے سامنے آتی تھی، اس کی ڈلیوری اگلے ہفتے تک متوقع تھی۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی شاہ زیب کو کھانا کھلا رہی تھی۔ شوکت اور کرزئی کی بہن پر نظر پڑی تھی اور دوسرے ہی لمحہ اذیت و ملال کے ساتھ جُھک گئی تھی کہ اس کے ساتھ جو ہوا تھا اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔مگر وہ اس ملال میں گھرے رہتے تھے کہ ان کے ہوتے ہوئے ان کی بہن یوں کسی کی بربریت کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ ہارے ہوئے جھکے کاندھوں کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئے تھے اور یونہی سوچتے سوچتے ان کے ذہن کو یکدم کچھ کلک ہوا تھا اور وہ بیٹھے سے کھڑے ہو گئے تھے اور اگلے پانچ منٹوں میں وہ جہانزیب اور کرزئی کے کمرے میں موجود تھے اور وہ بھائی سے ذہن میں آئی بات کہہ گئے تھے۔

''بھائی صاحب۔رخسانہ کبھی نہیں مانے گی۔''

''بیوی کو منانا اتنا مشکل نہیں ہوتا۔تم پیار و حق سے منا سکتے ہو۔'' شوکت اور کرزئی چھوٹے بھائی کی بات کو کاٹ گئے تھے۔وہ حیرانگی سے بڑے بھائی کو دیکھنے لگا تھا۔

''اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔آبشار کو یہاں تمہارے ساتھ بھیج دیا تھا۔وقتی طور پر بات سب سے چھپی رہی تھی مگر یہ سوچ کر میری رات کی نیند اڑی ہوئی ہے کہ آگے معاملے کو کیسے پوشیدہ رکھیں گے۔تمہارے بیٹے کا دنیا میں آنا اور معمولی سے بخار سے موت کی لپیٹ میں آ جانا، یہ سب اللہ کی طرف سے بنے بنائے ہوئے راستے ہیں جہانزیب۔'' وہ چھوٹے بھائی کا ہاتھ تھامے نرمی سے بول رہے تھے۔وہ آبشار کے بچے کو نام دینے کا بول رہے تھے اور وہ شش و پنج میں تھے جبکہ بڑے بھائی کی بات پر ذہن و دل کو جھکتا بھی محسوس کر رہے تھے کہ اس اقدام سے خاندان کی عزت رہ سکتی تھی۔انہوں نے بیوی سے بات کی تھی اور توقع کے عین مطابق وہ بھڑک اٹھی تھی کہ اولاد کھونے کا صدمہ ہی ابھی کم نہ ہوا تھا اور دوسرے کی اولاد کو تاحیات اپنی اولاد سمجھ کر پالنا۔وہ صاف انکاری ہو گئی تھی۔

''یہ تم سے زیادہ میرے لئے مشکل ہے۔اس شخص کی اولاد کو نام دینا جو ہماری عزت و غیرت کی دھجیاں اڑا گیا۔'' وہ بیوی کے بار بار

کے انکار پر چیختے ہوئے لہجہ بولا تھا۔ رخسانہ اپنے لب بھینچ گئی تھی۔

''یہ سب میں اپنی بہن اور خاندان کی عزت کے لئے کرنے جا رہا ہوں۔ یہی ایک ذریعہ اور کزئی خاندان کی عزت بحال رکھ سکتا ہے۔'' جہانزیب اورکزئی ہارے ہوئے انداز میں بیڈ پر گرا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور اس کی بیوی کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''خدا کے لئے مان جاؤ۔ میری عزت رکھ لو۔'' وہ بیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ گیا تھا اور وہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ رخسانہ شوہر کے ہاتھوں پر سر ٹکائے بلک اٹھی تھی اور فیصلہ ہو گیا تھا۔ آبشار اورکزئی نے ایک بچی کو جنم دیا تھا جسے خاندان کی عزت کے لئے جہانزیب اورکزئی کی بیٹی بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا گیا تھا۔ بچی کو آبدار نام دیا گیا تھا اور پیدائش کے دو ماہ بعد وہ سب کراچی واپس آ گئے تھے۔ زندگی جیسے اپنے معمول پر آ گئی تھی۔ گھر کے مکینوں کے علاوہ گھر کے دو ملازم ایسے تھے جو اس راز سے واقف تھے کہ آبدار جہانزیب اورکزئی کی بیٹی نہیں ہے۔ اور اس راز کو راز ہی رکھنے کے لئے آبدار کی دیکھ بھال شروع سے جہانزیب اورکزئی کی بیوی نے کی تھی۔ رخسانہ کو وہ بچی بہت بری لگتی تھی۔ آبدار اس کی گود میں پل کر جوان ہوئی تھی مگر وہ اس کے لئے ذہن و دل میں نرم گوشہ محسوس نہیں کر پائی تھی۔ آبشار بھی اس پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ اورکزئی پیلس میں کوئی بھی آبدار کو ذہن و دل کی آمادگی کے ساتھ قبول نہیں کر پایا تھا۔ صرف مجبوری میں اسے عزت کا بھرم رکھنے کو برداشت کیا گیا تھا۔ آبدار کبھی ان نفرتوں کی حقیقت کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ وہ ماں کی طرف ہمکتی تھی مگر وہ جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی رخسانہ اس سے فاصلہ پر جا رہی تھی۔ آبدار حیران ہوتی تھی کہ گھر میں اس کے علاوہ دو لڑکیاں تھیں ان کے ساتھ ویسا سلوک نہیں ہوتا تھا جیسے اس کے ساتھ سب کرتے تھے۔ اس نے بچپن سے سب کی بے رخی، حقارت محسوس کی تھی۔ تابندہ واحد تھیں جو اس کے ساتھ کچھ نرمی سے پیش آتی تھیں اور ان کا بیٹا آئیکت وہ اس کے لئے محبت محسوس کرنے لگا تھا۔ شاہ زیب بچپن سے آبشار کے قریب تھا اور وہ جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا اس کے دل میں تجسس کی لہر دوڑنے لگی تھی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس کی پھپھو یوں الگ تھلگ کھوئی کھوئی سی چپ چاپ رہتی ہیں۔ خاندان وغیرہ میں شادی بیاہ میں بھی نہیں جاتیں۔ ان کی شادی کیوں نہیں ہوتی۔ شوکت اورکزئی نے چاہا کہ وہ شادی کر کے بہن کو رخصت کر دیں مگر آبشار اس کے لئے تیار نہ ہوتی تھی اور وہ لوگ بھی یہ سوچ کر چپ رہتے تھے کہ جن حقیقتوں پر قسمت نے پردہ ڈال دیا ہے وہ ہٹ کر انہیں بدنام نہ کر دے۔ شاہ زیب سولہ سال کا تھا جب اس نے ماں اور باپ کی گفتگو سنی تھی۔

''آبدار کے ساتھ اپنا رویہ نرم رکھا کرو۔ چاہے وہ تمہاری بیٹی نہیں ہے مگر دنیا کی نظر میں وہ ہماری ہی بیٹی ہے اور وہ بچی ہے ہزار سوال سوچتی ہے، پوچھتی ہے۔ اس کا بچپن ان الجھنوں کی نذر نہ کرو۔'' جہانزیب اورکزئی بیوی کے سخت رویے پر بیوی کو سمجھا رہے تھے اور بیٹا باہر کھڑا سن رہا تھا۔

''آپ بھول گئے ہیں جہانزیب کہ آبدار کس کی بیٹی ہے۔'' رخسانہ میاں کے سمجھانے پر غصہ ہوئی تھیں۔

''یہ تلخ حقیقت مر کر بھی نہیں بھول سکتا میں کہ آبدار اس بدبخت انسان کی بیٹی ہے جس نے میری بہن کی زندگی تباہ کر دی۔ جس کے

سبب میرا باپ مر گیا۔ میری ماں گھٹ گھٹ کر جیتی بالآخر مر گئی۔'' جہانزیب اور کزئی کے لہجہ میں ٹوٹے کانچ کی سی کھنک تھی جو باہر کھڑے شاہ زیب کے دل کے آر پار ہو گئی تھی۔ سولہ سال کا لڑکا اتنا بھی نا سمجھ نہیں ہوتا کہ وہ صاف الفاظ میں ہوئی بات کا مفہوم نہ سمجھ سکے۔ اور وہ جو نہیں سمجھ سکا تھا وہ ڈائریکٹ ماں باپ سے پوچھ گیا تھا اور یہ بات ان کے لیے ڈوب مرنے کا مقام تھی۔ جہانزیب اور کزئی سوال کرتے بیٹے سے کہتا تو کیا مگر وہ مجسم سوال بنا کھڑا تھا۔ باپ کے بھاری ہاتھ کا تھپڑ کھا کر بھی اس کے سوال کم نہ ہوئے تھے اور جذباتیت میں آکر رخسانہ نے تمام تر بات بیٹے کو بتا دی تھی اور اسی رات شاہ زیب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ محمود خان کا سراغ لگائے گا اور اسے کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ شاہ زیب کو جب سے پتہ لگا تھا اسے آبدار سے شدید نفرت ہو گئی تھی وہ جو پہلے بھی بہن کی طرف ذہن و دل کو جھکتا ہوا محسوس نہیں کرتا تھا کہ جب ماں باپ ہی اسے توجہ نہیں دیتے تھے تو وہ بھی آبدار سے دور ہی رہتا تھا۔ مومنہ سے وہ ہنسی مذاق بھی کر لیتا تھا مگر آبدار خود بھی شاہ زیب کے غصہ کے سبب اس سے دور ہی رہتی تھی کہ گھر میں جس طرح کا سب کا اس کے ساتھ رویہ تھا وہ اپنے ہی خول میں بند ہو گئی تھی۔ شاہ زیب نے حقیقت علم میں آنے کے بعد آبدار کو واضح انداز میں اگنور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کی تذلیل کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا اور اس وجہ سے آئیکت اور شاہ زیب میں دوریاں بننے لگی تھیں کہ آئیکت کو آبدار کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی کبھی وجہ نہیں سمجھ آسکی تھی۔ ایک دفعہ معمولی بات پر کہ آبدار سے شاہ زیب کی شرٹ جل گئی تھی وہ اس پر ہاتھ اٹھا گیا تھا اور یہ حرکت آئیکت کو ناگوار گزری تھی۔ دونوں میں کافی لڑائی ہو گئی تھی اور آئیکت کا آبدار کی حمایت کرنا اسے اس قدر برا لگا تھا کہ وہ ماں اور باپ کی نصیحت کہ جو بات پتہ چل گئی ہے وہ کسی سے ذکر تک نہیں کرے گا اور وہ جو وعدے کر گیا تھا اور پچھلے 9 سال سے جس پر ڈٹا ہوا تھا یکدم وہ وعدہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ غصہ میں آبدار کی حقیقت آئیکت سے کہہ گیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب آئیکت نے آبدار سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ لاؤنج میں صرف وہ دونوں ہی نہیں تھے۔ آبدار اور آمنہ بھی تھی۔ شاہ زیب کے حلق سے بات نکل کر فلک پر پہنچی۔ گھر کے بچے بچے کو تمام بات پتہ چل گئی تھی۔ شاہ زیب اس سے پوچھ رہا تھا کہ اب بھی لو گے آبدار کی سائیڈ... اب بھی کرو گے اس کی طرف داری، اب بھی کرو گے آبدار سے شادی اور آئیکت کا جواب صرف ''ہاں'' تھا۔ وہ آبدار سے محبت کرتا تھا لیکن آمنہ اور مومنہ جو پہلے بڑوں کے نقش قدم پر چلتیں آبدار سے کھنچی کھنچی رہتی تھیں۔ بچپن میں تو پھر دوستی تھی مگر بڑے ہوتے ہوتے فاصلے آ گئے تھے اور رہی سہی کسر حقیقت نے پوری کر دی تھی اور آبدار وہ بے قصور ہوتے ہوئے بھی خود کو مجرم سمجھنے لگی تھی۔ وہ مزید الگ تھلگ رہنے لگی تھی۔ خاص کر وہ شاہ زیب کے سامنے بہت کم آتی تھی کہ وہ اس کی آنکھوں میں نفرت برداشت نہیں کر پاتی تھی جبکہ شاہ زیب نے جس رات حقیقت علم میں آئی تھی، اس رات فیصلہ کیا تھا وہ اس پر عمل کرنے کو کوشاں تھا۔ وہ محمود خان کا سراغ لگا رہا تھا اور وہ محمود خان کے بارے میں بہت جلد جان گیا تھا کہ محمود خان کے چچا کی برسوں قبل ہی وفات ہو گئی تھی اور محمود خان نے اپنے کارنامے کی کسی کو خبر نہ ہونے دی تھی کہ وہ خود سے گناہ کا اعتراف کر نہیں سکتے تھے۔ ان کی شادی ان کے دوست کی بہن سے ہو گئی تھی مگر وہ بیوی پر کبھی بھروسہ نہیں کر سکے تھے۔ ان کی ایک ہی بیٹی تھی جس پر بھی وہ سخت نظر رکھتے تھے۔ شاہ

زیب نے محمود خان کے بارے میں معلومات حاصل کر کے اس کی اکلوتی بیٹی عریم سے چکر چلایا تھا اور اسے اپنے بس میں کر کے اس سے خاموشی سے نکاح کر لیا تھا اور اس کی ان حرکتوں وسازشوں سے اور کزئی ہاؤس کے مکین انجان تھے۔ دوسری جانب آئیکت تھا جو آبدار سے شادی کرنا چاہتا تھا جب آبدار کا پرپوزل آیا تھا اس نے اپنے دل کی بات سب کے سامنے کہہ دی تھی مگر کسی کو بھی آئیکت کی بات اچھی نہیں لگی تھی اور آناً فاناً آبدار کا رشتہ کہیں اور کر دیا گیا تھا اور یہ بات آئیکت کو گوارا نہ تھی۔ اس نے والدین کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا مگر وہ کسی بھی صورت میں آبدار کو کھونا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے آبدار سے کورٹ میرج کی بات کی تھی جس کے لئے وہ صاف انکاری ہو گئی تھی۔

''آبدار۔ میں تمہیں کسی قیمت پر نہیں کھونا چاہتا۔ تم مجھ سے کورٹ میرج کر لو۔ ہماری شادی ہو جائے گی تو گھر والے مان جائیں گے۔ ہمارے رشتہ کو قبول کر لیں گے۔'' وہ آبدار کو راضی کرنے کے لئے کوشاں تھا۔

''کبھی نہیں قبول کریں گے آئیکت۔ بچپن سے میں نے اس قصور کے لئے سزا جھیلی جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا تھا۔ آپ سے نکاح کرنے کا مطلب یہی ہے کہ جو تھوڑی بہت عزت اور وقعت ہے وہ بھی کھودوں اور یہ میں نہیں چاہتی۔'' اس کی آنکھوں میں اس کی کم مائیگی کا احساس آنسو بن کر بہنے لگا تھا۔

''تم مجھ پر بھروسہ کر کے دیکھو آبی، میں تمہارے حق کے لئے کچھ بھی کروں گا۔ میں محمود خان کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ اسے تمہارے سامنے لاؤں گا۔''

''اس سب کا کیا فائدہ ہوگا۔ جو ظلم انہوں نے پھپھو کے ساتھ کیا، جس کے سبب میں نے اور پھپھو نے تمام عمر کانٹوں پر جھیلتے ہوئے گزاری اس کو لوٹایا نہیں جا سکتا۔'' آبدار کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''لیکن ہاں۔ میں ایک بار اس شخص سے ملنا ضرور چاہتی ہوں۔ جو کہنے کو میرا باپ ہے، جس کی میں ناجائز اولاد ہوں۔'' آبدار کے الفاظ کانپ رہے تھے مگر وہ اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھی اور وہ لب بھینچے کھڑا تھا۔

''میں اس شخص سے مل کر اس کو بتانا چاہتی ہوں کہ جو دوسرے کی بہن بیٹیوں کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں ان کی بیٹیوں کو بھی کہیں سکون نہیں ملتا۔ میں اس کے گناہ کی پیداوار، تمام عمر میں تشنہ رہی ہوں، قابل نفرت رہی ہوں۔'' آبدار کے لہجہ میں بچپن کی محرومیاں بولنے لگی تھیں وہ نفرت و بے اعتنائی جو اس نے سہی تھی۔

''وہ شخص گناہ کر کے، پھپھو کی زندگی برباد کر کے بھی پرسکون زندگی گزار رہا ہے اور میں اس کا سکون برباد کر دینا چاہتی ہوں۔ میں اسے ایک بار بتانا چاہتی ہوں کہ میں ہی ہوں اس گناہ کی پیداوار جسے کر کے وہ بھول گیا۔'' آبدار نے اپنے آنسو صاف کئے تھے اور آئیکت کو دیکھنے لگی تھی۔

''کیا آپ ایک بار مجھے محمود خان سے ملوانے لے جا سکتے ہیں؟ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ دوسروں کو بے سکون کرنے والے کیسے ہوتے ہیں، کیسے سکون سے رہتے ہیں۔'' وہ پوچھ رہی تھی اور وہ صاف انکاری ہو گیا تھا۔

''یہ اب ممکن نہیں رہا۔ چند دن بعد تمہاری شادی ہے اور یہ شادی حقیقت چھپا کر کی جا رہی ہے۔''

''میں حقیقت چھپا کر شادی نہیں کرنا چاہتی کہ میں جانتی ہوں جس سے میری شادی ہو رہی ہے اسے جس دن میری حقیقت پتہ لگے گی وہ مجھے چھوڑ دے گا۔'' وہ آئیکت کی بات درمیان سے کاٹ گئی تھی۔

''جس بات پر برسوں سے پردہ پڑا ہے وہ سامنے نہیں آئے گی البتہ تم اس شخص کے ساتھ کبھی پرسکون زندگی نہیں گزار سکو گی۔ تم حقیقت آشکار ہو جانے کے ڈر میں مبتلا رہو گی اور میں نہیں چاہتا کہ تم کسی ڈر کے سائے تلے زندگی گزارو۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم مجھے ہر حال میں قبول ہو۔'' وہ آگے بڑھ کر آبدار کا ہاتھ تھام گیا تھا۔

''تمہارے حوالے کو لے کر ایک زمانہ تم پر انگلی اٹھا سکتا ہے آبی، لیکن میں نہیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم مجھے اپنی ہر خامی کے ساتھ قبول ہو۔'' وہ اسے اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔

''مجھے آپ پر بھروسہ ہے آئیکت مگر میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔'' وہ اپنا ہاتھ چھڑا گئی تھی۔

''فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے آبی۔ اگر تم چاہو تو شادی کر کے تمام عمر ڈر ڈر کر زندگی گزارو یا تم مجھ سے کورٹ میرج کر کے مجھ پر بھروسہ کرو کہ میں تمہارے جائز حق کے لئے سب سے لڑوں گا۔ تمہیں تمہارے حق دلا کر رہوں گا۔'' وہ آبدار کو الجھن میں ڈال گیا تھا کہ وہ کہہ ٹھیک رہا تھا کہ وہ اسے اس کی حقیقت کے ساتھ قبول کر رہا تھا اور جس سے اس کی شادی ہونے جا رہی تھی وہ حقیقت سے انجان تھا اور اس پر حقیقت نہ کھل جائے اسی ڈر کے سائے میں اس کی زندگی کیسی ادھوری گزرنے والی تھی اس کا آبدار کو ابھی سے اندازہ تھا کہ کچھ سوچ کر بولی تھی۔

''میں آپ سے شادی کر لوں گی آئیکت لیکن...''

''لیکن... کیا... آبی؟''

''پہلے آپ کو مجھے محمود خان تک لے جانا ہو گا۔''

''میں تمہاری بات کا مطب نہیں سمجھا آبی؟''

''میں محمود خان کی خوشگوار زندگی برباد کر دینا چاہتی ہوں۔ میں اس شخص سے ملنا چاہتی ہوں اس کی بیوی اور بیٹی کو اس کا مکروہ چہرہ دکھانا چاہتی ہوں۔''

''اس سب سے تمہیں کیا فائدہ ہو گا۔''

''سکون ملے گا آئیکت۔ وہ شخص جو معتبر بنا ہوا ہے اس کی بیوی اور بیٹی کو پتہ چلنا چاہئے کہ وہ اتنا بھی معتبر نہیں۔'' وہ اپنے آنسو صاف کر گئی تھی۔

''میں اسے بتانا چاہتی ہوں کہ نظروں میں گر کر نہیں جیا جاتا۔ اس تکلیف دہ زندگی کو اس پر آشکار کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس شخص کا سکون، نیک نامی چھین لینا چاہتی ہوں۔ بولیں آپ میری مدد کریں گے۔'' وہ آئیکت کو دیکھ رہی تھی۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں آبی۔ لیکن پہلے تمہیں مجھ سے کورٹ میرج کرنی ہوگی کہ ایسا نہیں کروگی تو چند دن بعد تمہاری شادی ہو جائے گی۔'' وہ کورٹ میرج کرنے کے لئے کسی طور پر راضی نہ تھی اس لئے وہ قدرے غصہ سے بولا تھا۔

''میں محمود خان کی بیٹی ہوں اور میں جہانزیب اور کرزئی کی بیٹی کی حیثیت سے آپ سے نکاح نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ اب کے صاف بولی تھی اور وہ حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''میں اپنے باپ کے نام کے ساتھ آپ کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہوں اس لئے آپ اگر سچ میں مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے محمود خان تک لے جائیں۔ میں اس شخص سے یہ منوانے میں کامیاب ہوگئی کہ میں اس کی بیٹی ہوں تو میں آپ سے شادی کرلوں گی۔'' وہ اپنے ذہن و دل کی ہر بات اس کے سامنے رکھ گئی تھی۔

''اس سب کے لئے بہت وقت چاہیے آبی۔ تم یہ مت بھولو کہ چند دن بعد تمہاری شادی ہے۔''

''میں نے سوچا ہوا ہے میں یہ شادی نہیں کروں گی اور رات ہی میں نے پاپا سے بھی کہہ دیا ہے کہ مجھے اس شادی کے لئے مجبور نہ کیا جائے ورنہ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔'' آئیکت کے لیے یہ بات کافی حیران کن تھی کہ وہ جہانزیب اور کرزئی سے یہ سب کہہ چکی ہے۔

''تم گھر سے نکل کر کہاں جاؤ گی۔ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ ایسا فیصلہ تم لے بھی کیسے سکتی ہو۔؟''

''جس طرح کی زندگی میں نے گزاری ہے آئیکت، میں اس سے بھی بڑا فیصلہ لے سکتی ہوں۔'' وہ آئیکت کو درمیان میں ہی ٹوک گئی تھی۔

''پھپھو کے ساتھ جو بھی ہوا اس سب میں میرا کیا قصور تھا۔ کچھ نہیں؟ مجھ سے ماں کی گود چھین لی گئی۔ میری ماں نے مجھے گود میں لینا تو دور، دودھ تک پلانا مناسب نہیں سمجھا۔'' وہ احساس کمتری میں گھر چکی تھی اس کے آنسو گر رہے تھے اور وہ چپ بیٹھا تھا۔

''مجھے خاندان کی عزت رکھنے کے لئے اپنا نام تو دے دیا مگر مجھے محبت نہیں دی۔ مجھے عزت نہیں دی گئی۔ مجھے صرف محمود خان کی بیٹی سمجھا گیا۔ مجھے دھتکارا گیا جبکہ میں آبشار اور کرزئی کی بھی تو بیٹی تھی۔ وہ عورت جتنی بے قصور تھی، اتنی ہی میں بھی معصوم تھی مگر میری معصومیت نفرت کی نذر کردی گئی۔'' وہ پہلی بار آئیکت کے سامنے اپنے ذہن و دل کی ہر بات شیئر کر رہی تھی۔ اس کے لفظ لفظ میں سچائی اور کرب تھا جسے وہ محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس کے حق کے لئے ہمیشہ لڑا تھا۔ اس لئے آج وہ سب اپنوں کا مجرم بن گیا تھا۔

''عزت کے لئے مجھے نام دے سکتے تھے تو انسانیت کے ناطے سے ہی مجھے ذرا سی عزت و محبت بھی دے سکتے تھے مگر مجھے اس قابل

نہیں سمجھا گیا۔'' وہ شدتوں سے رو رہی تھی۔ یکدم آئیکت اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ گیا تھا۔ لمحہ بھر کو وہ چپ ہو گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحہ پھر کہنے لگی تھی۔

''آپ نے شادی کے لئے میرا نام لیا تو مجھے میری حقیقت بتا دی گئی۔ مجھے دھتکارنے کی وجہ سے آگاہ کر دیا گیا اور میری شادی طے کر دی تاکہ وہ شخص بھی یوں ہی مجھے دھتکار دے لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔ میں گھر سے بھاگ جاؤں گی۔ میں محمود خان سے نام حاصل کیئے بنا کسی سے شادی نہیں کروں گی کہ میں نہیں چاہتی کہ میری آنے والی نسل بھی دھتکار اور ذلت کا نشان بنے۔ اس لئے مجھے اپنا نام ونشان ڈھونڈنا ہے یا پھر بے نام ونشان ہی مرجانا ہے۔'' وہ اپنے کاندھے سے اس کا ہاتھ ہٹاتی فاصلہ پر چلی گئی تھی اور اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ آئیکت نے اس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اسے محمود خان تک لے جانے کا وعدہ کر کے وہ اسے دوست کے گھر چھوڑ گیا تھا۔ وہ بھاگ جانے کا جہانزیب اور کرزئی سے پہلے ہی کہہ چکی تھی اس لئے جب اس کی غیر موجودگی کا پتہ چلا تھا تو وہ صرف سر پکڑ کر رہ گئے تھے۔ برسوں سے بنائی عزت محمود خان نے ملیامیٹ کر دی تھی اور رہی سہی کسر اس کی بیٹی نے پوری کر دی تھی۔ آبدار کے گھر سے فرار ہو جانے پر شاہ زیب کو یقین تھا کہ اس میں آئیکت اس کا معاون رہا ہے مگر اسے کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ اس نے آبدار سے وعدہ کیا تھا کہ وہ محمود خان سے ملے گا مگر اس نے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ وہ اس شخص سے ملنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی محبت سے مجبور ہو کر آبدار کا ساتھ دیا تھا کہ اس نے یہی سوچا ہوا تھا کہ وہ محمود خان سے رابطہ نہیں کرے گا کہ وہ آبدار کو اس کی وجہ نہیں سمجھا سکتا تھا۔ آبدار کو باپ کا نام چاہیئے تھا مگر وہ یہ کیوں نہیں سمجھ رہی تھی کہ محمود خان کو ایسا کرنا ہوتا تو وہ برسوں پہلے کرتا۔ جب اس کا باپ جیسا چچا اس کے پاؤں پکڑ گیا تھا تب وہ کرتا، آئیکت اس شخص سے نہیں مل سکتا تھا کہ برسوں سے یہ بات پوشیدہ تھی کہ آبدار جہانزیب اور کرزئی کی بیٹی نہیں ہے اور محمود خان سے ملنے کا مطلب تھا کہ وہ برسوں پہلے عزت رکھنے کے لئے اٹھائے گئے قدم پر پانی پھیر دے۔ برسوں بعد راز سے دنیا کے سامنے پردہ ہٹا دے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا مگر آبدار سمجھنے کی پوزیشن میں نہ تھی اس لئے دوست سے جھوٹ بول کر وہ اسے دوست کے گھر چھوڑ گیا تھا اس نے یہی سوچا تھا کہ وہ کچھ عرصہ بعد محمود خان سے نہ مل پانے کی معذوری ظاہر کر دے گا اور آبدار مجبور ہو جائے گی اور وہ اس سے نکاح کر لے گا مگر اس سب سے پہلے ہی ابسام کو شک پڑ گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ آئیکت نے اس سے جھوٹ بولا ہے اور آئیکت نے دوست کے سامنے اعتراف کر لیا تھا اور اسے آبدار کی حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ دوسری جانب شاہ زیب اپنا کھیل کھیل چکا تھا۔ محمود خان جو گناہ کر کے بھی تمام عمر سر اٹھا کر جیا تھا، بیوی اور بیٹی کے سامنے اس کا اصل چہرہ آ گیا تھا کہ گناہ کو سات پردوں میں ملفوف کر کے بھی رکھا جائے تو وہ عیاں ہو کر ہی رہتا ہے اور محمود خان کا مکافات عمل شروع ہو چکا تھا۔ اس نے جو ماضی میں بویا تھا وہی کاٹ رہا تھا۔ اس نے محض اپنی انا و غیرت کے نام پر ایک باعصمت لڑکی کے پاکدامن پر کیچڑ اچھالی تھی اور اسے بے آبرو کر دیا تھا۔ اپنی اولاد کو نام دینے سے صاف منکر ہو گیا تھا۔ ویسے ہی اس کی بیٹی کے ساتھ ہونے جا رہا تھا اب خود اس پر پڑی تھی تو سارے کس بل نکل گئے تھے اور اللہ یاد آ گیا تھا۔ اپنی بیٹی کو بلکتے

دیکھا تھا تو آبشار کے باپ کی وہ نگاہ یاد آ گئی تھی جس میں نمی چھپی تھی، کیسا کرب تھا وہ آج محسوس ہوا تھا۔ بیٹی کی عمر بھر کی نیک نامی داؤ پر لگی تھی تو یاد آیا تھا کہ آبشار کے بھائی کیسے اپنی بہن کی عزت کے لٹیرے کے ساتھ محض بہن کی نیک نامی بچانے کو کہ وہ سر اٹھا کر چلے، کیسے اس کے سامنے جھک گئے تھے اور وہ ہر فریاد کو ٹھکرا گیا تھا۔ اس نے تو پالنے والے چچا کے جڑے ہاتھوں کی بھی لاج نہ رکھی تھی۔ اس صدمہ نے چچا کو فقط چار ماہ میں ہی قبر میں اتار دیا تھا اور وہ پھر بھی نہیں سنبھلا تھا کہ وہ طاقت کے زعم میں تھا مگر آج شاہ زیب اورکزئی نے اس کی طاقت سلب کر لی تھی۔ اس کی عزت داؤ پر لگی تھی تو عزت کے معنی و مطالب سمجھ آ گئے تھے۔ وہ جس گھر کی دہلیز پر برسوں قبل چال بازی میں چڑھا تھا اس گھر کی بیٹی کو بے آبرو کرنے کے خیال سے دہلیز عبور کی تھی، آج وہی دہلیز اپنی بیٹی کی آبرو سلامت رکھنے کے لئے پار کی تھی۔ برسوں قبل سر اٹھا ہوا تھا، نظر آسمان پر تھی۔ آج سر جھکا ہوا تھا، نظر زمین پر تھی۔ کل کی نظر میں ہوس تھی آج کی نظر میں مجبوری تھی۔ کل کے قدم بھرپور اور مضبوط تھے آج کے قدم لڑکھڑاہٹ کا شکار تھے۔ کل فتح کا یقین تھا آج شکست کا خوف تھا۔ کل کسی اور کی عزت سامنے تھی آج اپنی عزت پیشِ نظر تھی۔ کل اور آج میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ سوچ بھی، سوچ کا انداز بھی۔ شخص وہی تھا مگر انداز بدل گیا تھا کہ کل کسی اور کی بیٹی تھی۔ آج اپنی بیٹی تھی اور کچھ لوگوں کے لئے صرف اپنی بہن، بیٹیوں کی عزت، عزت ہوتی ہے اور وہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے کی بیٹی کو بے آبرو کرتے خوف خدا نہیں ستایا تھا اور اپنی بیٹی کی بے آبروئی کے خیال نے ہی خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اورکزئی خاندان کو اس کا نام نہیں بھولا ہو گا اس لئے اس نے چوکیدار کو اپنا غلط نام بتا کر شاہ زیب اورکزئی سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ آج کل شاہ زیب کی عیادت کرنے والے صبح و شام آ ہی رہے تھے اس لئے چوکیدار نے انٹر کام پر اطلاع دی تھی اور اسے جواب ملتے ہی اندر جانے دیا تھا۔ ملازمہ ڈرائنگ روم میں چھوڑ گئی تھی۔ دس منٹ بعد قدموں کی چاپ ابھری تھی شوکت اورکزئی اور جہانزیب اورکزئی آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے۔ رخ موڑے کھڑے شخص نے جیسے ہی ان کی طرف منہ موڑا تھا وہ دونوں ہی ساکت رہ گئے تھے۔ گو کہ محمود خان کو اس کی بھرپور منہ زور جوانی میں دیکھا تھا اور جن حالات سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ نڈھال و شکستہ سا اسے پہچاننا مشکل تھا لیکن کچھ چہرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو آنکھوں میں یوں ٹھہر جاتے ہیں کہ انہیں پہچاننا مشکل ثابت نہیں ہوتا اور وہ اس چہرے کو کیسے بھول سکتے تھے۔ جس کے سبب ان کی خوشیاں روٹھ گئی تھیں، عزت رہی تھی نہ باپ کا سایہ۔ وہ دونوں بھائی محمود خان کو پہچان گئے تھے۔ جہانزیب اورکزئی غصے سے ان کی طرف لپکے تھے۔ ہمیشہ کے معاملہ فہم شوکت اورکزئی بھائی کا ہاتھ تھام گئے تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں چھوٹے بھائی کو ہوش سے کام لینے کی تنبیہ کر گئے تھے۔

”تم یہاں کیوں آئے ہو محمود خان؟“ جہانزیب اورکزئی کا بس چلتا تو وہ محمود خان کو جان سے مار دیتے مگر وہ کل بھی ہوش پر جوش کو حاوی نہیں کر پائے تھے اور آج بھی یہی صورتحال تھی۔

”کل آپ لوگ میرے آگے اپنی عزت کے سوالی تھے۔ آج میں بھکاری بن کر آیا ہوں۔“ محمود خان کے لب کانپے تھے۔ وہ دونوں

بھائی متحیر رہ گئے تھے اور محمود خان نے یہاں آنے کی وجہ اور اپنی مجبوری صاف کہہ سنائی تھی۔ داستان ختم ہونے تک جہانزیب اورکزئی کے لبوں پر تمسخر اڑاتی مسکراہٹ آن دھمکی تھی۔

''دوسروں کی عزت کا لٹیرا آج خود عزت کا سوالی ہے۔'' جہانزیب اورکزئی صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ جمائے بیٹھے تھے۔ وہ بیٹے کے کارنامے سے جیسے مطمئن تھے مگر شوکت اورکزئی وہ ہنوز کھڑے ہوئے تھے ان کے چہرے پر حزن و ملال کی گہری چھاپ تھی جبکہ محمود خان ڈرائنگ روم کے وسط میں کسی ہارے ہوئے انسان کی طرح کھڑے تھے۔ ان کا سر اور کاندھے جھکے ہوئے تھے اور جہانزیب اورکزئی آج خوب لعن طعن کر رہے تھے۔ محمود خان کو ان کی اصلیت بتا رہے تھے اور وہ مہر بہ لب تھے کہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں رہے تھے محمود خان فیصلہ کے منتظر تھے۔

''میں شاہ زیب اورکزئی سے ملنا چاہتا ہوں۔'' جہانزیب اورکزئی نے آئینہ محمود خان کے سامنے رکھ دیا تھا جس میں انہیں اپنی مکروہ شکل اور کالے کرتوت صاف نظر آ رہے تھے مگر برداشت نہیں کر پائے تھے۔ جہانزیب اورکزئی کو چپ کروانے کی پوزیشن میں نہ تھے اس لئے دھیمے سے کہا تھا۔ لہجہ میں لجاجت کی چھاپ سی تھی۔

''شاہ زیب کچھ بیمار ہے۔ آرام کر رہا ہے۔ ایک دو دن میں آنا پھر دیکھتے ہیں کہ وہ تم سے بات کر سکتا ہے کہ نہیں۔'' وہ محمود خان کے مقابل آتے ہوئے بولے تھے۔ محمود خان نے ایک ملتجی نظر جہانزیب اورکزئی کے چہرے پر ڈالی تھی۔

''کبھی ہم نے بھی تمہاری دہلیز پار کی تھی، التجائیں کی تھیں، پاؤں پکڑے تھے مگر تم گناہ کا اعتراف کرنے کے باوجود اس گناہ میں جکڑے خود کو فرعون سمجھ رہے تھے۔'' شوکت اورکزئی، محمود خان کی بے بس نگاہ کو محسوس کرتے طنز سے بولے تھے مگر ان کہ لہجہ میں برسوں کی تھکن سمٹ آئی تھی۔

''برسوں ہم نے تمہارے گناہ کی سزا جبر مسلسل کی مانند جھیلی ہے محمود خان۔'' وہ غصہ سے کف اڑاتے ساکت کھڑے محمود خان کا گریبان مٹھیوں میں جکڑ گئے تھے۔

''تم نے ہماری عزت تار تار کی ہم تمہارے قدموں میں گرے، گڑگڑائے کہ ہماری بچی کے سر سے عزت کی چادر چھین لی ہے۔ اسے اپنا نام دے دو۔ معاشرہ میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل نہیں چھوڑا مگر ایک روزن کھول دو جہاں سے ہماری بچی سانس لے سکے۔ خود کو زندہ تصور کر سکے۔'' جہانزیب اورکزئی ان کا گریبان جکڑے بول رہے تھے۔ وہ سخت اشتعال میں تھے مگر لہجہ کی نمی ان کی برسوں کی اذیت کی گواہ بن چکی تھی۔ شوکت اورکزئی ایک لفظ نہیں بولے تھے۔ گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھے تھے۔

''مگر تم انکاری ہو گئے۔ میری بہن کو اجاڑ کر اپنی دنیا بسا لی۔ عمر بھر زندگی کے کاسے سے خوشیاں کشید کرتے رہے۔ آج اپنی عزت پر بات آئی تو بھکاری بن کر آ گئے۔'' جہانزیب اورکزئی ایک جھٹکے سے محمود خان کا گریبان مضبوط گرفت سے آزاد کرتے دھاڑے تھے۔

''اب آئے تمہیں عزت کے مطالب سمجھ محمود خان۔کل تم نے ہماری عزت ٹھوکروں پر رکھی، اپنے نفس کی غلامی کرتے ہماری عزت تار تار کر دی تو آج تمہارا نفس کا زرد کتا کیوں سو گیا ہے۔اسے جگاؤ اور بتاؤ کہ دنیا مکافات عمل ہے۔جو تم نے بویا وہ کاٹنے کا وقت آ گیا ہے۔'' جہانزیب اورکزئی کی آواز بہت بلند تھی آئیکت دوڑتا ہوا وہاں آیا تھا کمرے کی صورتحال بڑی گھمبیر سی تھی۔ایک طرف بیٹھا باپ چیختا ہوا چچا اور اجنبی شخص۔جس کے ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

''آپ سب کا گناہگار تو میں ہوں، میں زانی ہوں میں آبشار کا مجرم ہوں۔'' آئیکت جو اس شش و پنج میں تھا کہ یہ اجنبی کون ہے اس اجنبی کے منہ سے سننے والے اگلے جملے نے اس کے ہر سوال کا جواب دے ڈالا تھا۔اس کے لبوں سے سرسراتا ہوا ''محمود خان'' نکلا تھا وہ اس شخص کو دیکھ رہا تھا اس کے تصور میں تو کوئی بہت مغرور، اٹھی نظریں، بلند سر والی شخصیت تھی جس کے ہر انداز سے اپنی بڑائی جھلکتی ہو مگر وہ جس شخص کو دیکھ رہا تھا وہ تو بہت ہارا ہوا لگ رہا تھا۔جھکی نظریں، ٹوٹے کاندھے، ہاتھ جوڑے کھڑے محمود خان کو دیکھ کر وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہی تھا وہ شخص جس نے اورکزئی خاندان کی عزت ملیا میٹ کر دی تھی اور وہ لوگ اپنی عزت کے بچے کھچے بھرم کی خاطر اس کے سامنے جھکے تھے اور جو خود کو اس قدر بلند سمجھ رہا تھا، جو ذرا بھی اپنے گناہ پر نادم نہ تھا، جسے خوف خدا نہ تھا، جواں و مردانگی کے زعم میں تھا آج کیسے جھکا جا رہا تھا۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے... کل جھکانے والا آج خود پورا پورا جھکا ہوا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں۔'' محمود خان کے آنسو اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں پر گرے تھے۔

''معافی کی بات نہ کرنا محمود خان۔'' شوکت اورکزئی کی چپ ٹوٹی تھی۔وہ محمود خان کے مدمقابل آ گئے تھے۔

''تم پر بھروسہ کیا، رشتہ جوڑا اور تم نے بھروسے کی لاج نہ رکھی۔انسانیت و شرافت سے گری ہوئی حرکت کی۔ہم نے عزت کے لئے تمہیں معافی مانگنے کا موقع فراہم کیا۔تم اپنے گناہ پر ڈٹ گئے تو آج برسوں بعد معافی کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔چلے جاؤ یہاں سے۔'' شوکت اورکزئی چند جملے بول کر ہی بری طرح ہانپ گئے تھے۔آگے بڑھ کر آئیکت باپ کو تھام گیا تھا۔

''دفع ہو جاؤ محمود خان۔'' جہانزیب اورکزئی دھاڑے تھے۔شوکت اورکزئی کی طبیعت بگڑ گئی تھی وہ انہیں لے کر ہاسپٹل دوڑے تھے اور وہ ناچار جس طرح آئے تھے اسی طرح لوٹ گئے تھے۔کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرانے والی تھی برسوں قبل محمود خان کی اورکزئی ہاؤس میں آمد اس گھر کے سربراہ کی موت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی تو کیا آج بھی ایسا ہی ہونے والا تھا۔

☆......☆......☆

''عقیل انکل کا فون تھا وہ ہمیں فضہ آنٹی کے گھر بلا رہے ہیں۔'' انہیں پاکستان آئے دو دن ہو گئے تھے وہ صبح و شام قبرستان کا چکر کاٹ رہے تھے اور ماضی کو یاد کر رہے تھے اور ان کی حالت دیکھ کر عبیر کو ہول اٹھنے لگے تھے۔

''اوہوں! میری بھی بات ہوئی تھی شکیل سے مگر میں نے معذرت کر لی تھی۔تم جانا چاہو تو چلے جاؤ۔'' وہ دھیمے سے بولے تھے اور وہ

باپ کے قدموں میں آن بیٹھا تھا۔

''پاپا! ماضی میں جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ آپ اب آگے مستقبل پر نظر رکھیں۔'' وہ باپ کے لئے اداس تھا۔

''مستقبل پر ہی تو ہمیشہ نظر رکھی۔ ایک خوشی کیا روٹھی ہر خوشی کو خود پر حرام کر لیا۔ آگے بڑھتا رہا پیچھے مڑ کر ہی نہیں دیکھا۔'' انہیں اپنے فیصلہ پر دکھ تھا کہ آبشار اور کنزئی نے راہ کیا بدلی تھی وہ پرانی ہر راہ کو ہی چھوڑ گیا تھا۔ محبت کیا روٹھی تھی خود کو روبوٹ بنا لیا تھا۔ جس پر جذبے اثر انداز ہی نہیں ہوتے تھے۔ وہ محبت کا سوگ مناتا مشین بن گیا تھا جس کا ایک ہی مقصد تھا دولت کے انبار لگانا اور دولت اکٹھی کرنے کے بعد احساس ہوا تھا اصل دولت تو قبر میں دفن ہے۔ وہ والدین کو کھو چکے تھے۔ احساس زیاں ایسا تھا کہ ماضی پر ندامت ہونے لگی تھی مگر وہ اب پچھتاوے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

''آپ نے ماضی میں جو غلطی کی تھی وہ اب نہ کریں پاپا۔ جو زندگی میں نہیں رہے ان کے بجائے جو زندگی میں ہیں ان کی پرواہ کریں۔'' وہ باپ کے ہوتے ہوئے باپ کی کمی کا شکار ہو رہا تھا۔ اسی جانب توجہ دلائی تھی وہ بیٹے کو دیکھنے لگے تھے کہ ایک وہ تھے کہ محبوبہ کیا زندگی سے گئی تھی ماں باپ کو ہی چھوڑ کر دیار غیر میں جا بسے تھے اور ایک ان کا بیٹا تھا جو ان کے لئے اپنی محبت چھوڑنے کو تیار نہ تھا اور ان کے لئے پاکستان آ گیا تھا۔ انہوں نے خود کو کمپوز کیا تھا۔

''عقیل کو کال کر کے کہہ دو کہ ہم لوگ آ رہے ہیں۔'' وہ باپ کی بات پر یکدم بے حد خوش ہو گیا تھا اور وہ بیٹے کی خوشی میں خوش ہو گئے تھے کہ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب اپنی ذات سے اپنے بیٹے کو تکلیف نہیں پہنچنے دیں گے۔ گاڑی کچھ جانے پہچانے راستوں پر دوڑ رہی تھی اور ان کا ذہن پھر ماضی میں الجھنے لگا تھا۔ شدت سے انہیں آبشار اور کنزئی یاد آئی تھی۔

''جو قسمت سے دور چلے جاتے ہیں، یادیں کیوں مقدر کر جاتے ہیں۔'' وہ اذیت سے سوچ رہے تھے۔

''آج نہ جانے آبشار کہاں ہوگی، میں اسے یاد بھی ہوں گا کہ نہیں۔'' ایک اور تکلیف دہ سوچ ذہن میں ابھری تھی۔

''میں چاہے تمہیں بھول گیا ہوں گا آبشار، مگر تم مجھے آج بھی یاد ہو اور تاحیات رہو گی۔'' انہوں نے بھاگتے دوڑتے مناظر سے نگاہ ہٹا کر سر سیٹ کی پشت سے لگا کر آنکھیں موند لیں۔

☆......☆......☆

''میں اس رشتہ سے بہت خوش ہوں اماں۔'' فضہ حیدر کو جیسے ہی مومل اور عبیر کی شادی کا پتہ لگا تھا انہوں نے حمایت کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''پھپھو! اس رشتے سے سب خوش ہیں بس ایک اپنی مومی جانے کیوں ناخوش ہے۔'' نوائم نے شرارت سے برے برے منہ بناتی مومل کو دیکھتے ہوئے چھیڑا تھا۔

''مومی! کیوں چندا، کیا تمہیں عبیر پسند نہیں ہے؟'' فضہ حیدر نے فوراً بھتیجی سے پوچھ لیا تھا اور وہ بری طرح گھبرا گئی تھی۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے پھپھو۔ یہ تو نوائم کو ہی بکواس کرنے کی عادت ہے۔'' اس کے گڑبڑائے انداز پر نوائم ہی نہیں حاجرہ بیگم بھی ہنس دی تھیں۔ مومل مزید سوالات سے بچنے کو فضہ حیدر کے کمرے سے ہی نکل گئی تھی اور وہ جواب طلب نگاہوں سے نوائم کو دیکھنے لگی تھیں اور وہ کچھ کہتی کہ حاجرہ بیگم نے ازخود ساری بات بیٹی کے گوش گزار کر دی تھی۔

''اماں! آپ کو نہیں لگتا کہ یہ مومل کے ساتھ زیادتی ہے۔'' فضہ تمام تر تفصیل سن کر بولی تھیں۔

''تمہاری ماں نے بال دھوپ میں سفید نہیں کیئے۔ فیصلہ لیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی لیا ہے۔'' حاجرہ بیگم بے حد مطمئن تھیں۔

''پھپھو! عبیر اپنی مومل سے بہت محبت کرتا ہے پتہ نہیں کیوں مومی اس کو ناپسند کرتی ہے۔'' نوائم نے بھی بات میں حصہ ڈالا تھا۔

''مومی، عبیر کو ناپسند کرتی ہے لیکن تم تو ابسام کو ناپسند نہیں کرتیں ناں۔'' فضہ حیدر نے اپنے مخصوص بے تکلف انداز میں بات مومل سے یکدم اپنی ہونے والی بہو پر موڑ دی تھی۔ ان کے اتنے صاف الفاظ پر نوائم سرخ پڑ گئی تھی اور لب کچلتی اٹھی تھی اور فضہ کے روکنے کے باوجود کمرے سے نکل گئی تھی۔

''ارے نوائم، رکو بیٹا۔ میں تو بس یونہی تمہیں تنگ کر رہی تھی۔'' فضہ حیدر نے ہنستے ہوئے کہا تھا مگر نوائم ٹھہری نہیں تھی اور اماں کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ پھر وہ تھیں اور ان کی ہزار باتیں تھیں۔ جب سے وہ سب آئے تھے فضہ حیدر بہت خوش تھیں۔ بات بے بات ہنستیں وہ جیسے برسوں کی تشنگی کو آسودگی میں بدل رہی تھیں اور وہ سب ان کی خوشی میں خوش تھے اور شادی کی سالگرہ کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان سب نے گرینڈ فنکشن پلان کیا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

''شاہ زیب اور کزنی سے میری بات نہیں ہوئی۔'' وہ کافی دیر سے بیوی کو شش و پنج میں مبتلا کچھ پوچھنے کی الجھن میں گرفتار محسوس کرتے ازخود بول پڑے تھے کہ وہ جان گئے تھے کہ وہ اتنی دیر سے کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں۔

''اس کی فیملی... نے کیا کہا'' وہ اٹک اٹک کر بولی تھیں۔ جان کر شوہر کے چہرے کی طرف نظر نہیں کی تھی کہ جس شخص کو تاعمر اونچی گردن کے ساتھ دیکھا تھا اس کے جھکے کاندھے ان کو مضطرب کر رہے تھے۔

''وہی جو انہیں کہنا چاہیئے تھا۔ وہ برسوں بعد اپنی ذلت کا بدلہ میری عزت کا جنازہ نکال کر ہی لیں گے۔'' محمود خان کی تو دنیا بدل گئی تھی۔ شکست یوں قدموں سے آن لپٹی تھی کہ لہجہ کا انداز ہی بدل گیا تھا۔

''آپ بات تو کرتے محمود، میری بیٹی تو بے قصور ہے وہ کیوں سزا کی مستحق قرار دی جا رہی ہے۔'' ان کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''میں بات کرنے ہی تو گیا تھا مگر میرا ماضی اس قابل نہیں تھا کہ بامراد ہو کر لوٹتا۔ میرے کالے کرتوت میری بیٹی کا بخت سیاہ کر گئے

ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑے اس پر چہرہ ٹکائے رودیئے تھے۔

''تم خود بتاؤ نتاشہ، جس گھر کی بیٹی کی عزت میری ہوس کا شکار ہوئی اس گھر کے مکینوں کا دل میری بیٹی کی عزت کے لئے کیونکر فراخ ہوسکتا ہے۔'' وہ شوہر کو لب بھینچے نم آنکھوں سے روتا دیکھ رہی تھیں کہ انہوں نے بیوی کی جانب دیکھا تھا اور شہر کی بے بس نگاہ انہیں بے بس کرگئی تھی کب کے رکے آنسو بہنے لگے تھے۔

''میں نے فقط اپنی مردانگی کے زعم میں اس عورت کو داغدار کردیا جو مجھ سے ایک شرعی رشتہ میں بندھنے جارہی تھی۔'' محمود خان کا نرم لہجہ محو پرواز تھا اور وہ ڈورناب پر ہاتھ رکھے رکھے ہی کانپ گئی تھی۔ شاہ زیب نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے باپ سے پوچھے کہ شاہ زیب اور کرزئی نے اس کے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ اسی شب اس نے باپ سے سوال بھی کیا تھا مگر جواب ندرد۔ اور آج جواب اس کی سماعتوں میں اتر رہا تھا۔ جواب کیا تھا کوئی سیسہ تھا اس کے کانوں میں انڈیلا جارہا تھا۔ وہ گرنے سے بچنے کو دیوار کا سہارا لے گئی تھی۔

''مجھے اپنی منگیتر کو ایک غیر مرد کے ساتھ دیکھنا اتنا برا لگا کہ میں نے اس لڑکی کے سارے خواب چھین لئے، اسے کسی اور کے تو کیا سر اٹھا کر چلنے کے بھی قابل نہیں چھوڑا۔'' محمود خان اعتراف کررہے تھے۔ اپنے منہ سے اپنے گناہ کا اعتراف کررہے تھے اور اس اعتراف میں ان کی بیوی ہی نہیں بیٹی بھی شامل تھی۔

''چچا نے مجھ پر کیسی لعنت ملامت کی تھی، میرے پاؤں تک پکڑے کہ میں آبشار سے نکاح کرلوں مگر میں نہیں مانا۔'' انہوں نے ان تکلیف دہ ساعتوں کو سوچا تھا اس وقت ضمیر سویا ہوا تھا صرف نفس جاگا ہوا تھا اس لئے ہر اچھی بات صرف سماعت تک پہنچی تھی اور وہی باتیں آج سماعت سے دل تک پہنچ رہی تھیں کیونکہ اب نفس سو گیا تھا اور ضمیر جاگ گیا تھا۔

''مرد کے لئے عورت جب تک کشش رکھتی ہے جب تک وہ اس کی پہنچ سے دور ہوتی ہے اور آبشار میرے لئے ہر کشش کھو چکی تھی کہ میں جبراً ہی سہی مگر اس تک رسائی حاصل کرچکا تھا۔'' وہ پرت در پرت کھل رہے تھے۔ نتاشہ نظر جھکائے بیٹھیں لب چبا رہی تھیں ان کی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ محمود خان سے کہہ دیں کہ وہ چپ کرجائیں۔ ان میں اتنی برداشت نہیں کہ وہ شوہر کے منہ سے اس کے کارنامے سن سکیں مگر قسمت نے انہیں یوں لا پٹخا تھا کہ وہ برداشت کے کڑے مرحلے باآسانی طے کرنے لگی تھیں۔

''اسی لئے وہ ہر ایک کشش کھو چکی تھی اور جس عورت میں کشش ہی باقی نہیں بچی تھی اس سے نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اسی لئے میں نکاح کے لیے راضی ہی نہیں ہوا۔'' باپ کی آواز میں کوئی زہر تھا جو اسے اپنے کانوں میں گھلتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ نمکین پانی اس کی آنکھوں سے گر رہا تھا وہ دیوار کے سہارے بمشکل کھڑی تھی کہ اس کے پاپا اس پر سختی کرتے تھے۔ وہ ان سے جھجک محسوس کرتی تھی، ان سے ڈرتی تھی مگر انہیں ہی آئیڈیلائز کرتی تھی۔ اس کی خیال میں دنیا میں اگر سب سے اچھا کوئی تھا تو وہ صرف اس کا باپ تھا۔ اس کے پاپا اس کے آئیڈیل تھے اور آج وہ بت پاش پاش ہوچکا تھا۔ اسے اپنے باپ سے جن سے اسے شدید محبت تھی آج کراہیت محسوس ہورہی تھی۔ وہ

لبوں پر ہاتھ جمائے اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش میں تھی۔

''میں اپنی ذات کے زعم میں بڑے کروفر کے ساتھ ایک لڑکی کو بے عصمت کر کے زندگی میں آگے بڑھ گیا، کبھی مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ میری ہوس کے ہاتھوں لٹی عورت کس حال میں ہے۔ زندہ بھی ہے کہ مرگئی۔'' خود پر پڑی تھی تو سارے خیال زندہ ہوگئے تھے۔

''پاپا کسی کے زندہ وہ مرے کا خیال اب آیا ہے آپ کو جب آپ کی اپنی بیٹی کی عزت و زندگی کے لالے پڑے ہیں۔'' وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی اذیت سے سوچ رہی تھی اشک تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''جس جہانزیب اور کرزئی نے آج مجھے لعن طعن کر کے دھتکار دیا ہے، کل وہی میرے قدموں میں گرا تھا صرف اپنی بہن کی عصمت کے لئے۔ اس نے مجھ سے فریاد کی تھی کہ میں اپنے گناہ کو اپنا نام دے دوں لیکن میں اس کے لئے بھی راضی نہیں ہوا۔ اپنی اولاد کو بھی دھتکار دیا کیونکہ میں ایسا کر سکتا تھا نا شہ۔'' وہ چہرہ اٹھا کر بیوی کو دیکھنے لگے تھے ان کی آنکھوں میں کرب و اذیت ناچ رہے تھے اور وہ نظر ہی چرا گئی تھیں۔

''رات کی تاریکی میں ہوس کی پیداوار اولاد کو دھتکارا جا سکتا ہے اس لئے میں دھتکارا گیا لیکن وہ اولاد جو عزت سے معاشرے میں آپ کی پہچان کا سبب بنتی ہے اسے نہیں دھتکارا جا سکتا۔ میں عریم کو نہیں دھتکار سکتا اس لئے آج اس کے لئے دھتکار سہہ کر بھی مجھے کاسہ پھیلاتے کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ میں بار بار اس دہلیز پر جاؤں گا، اپنی بیٹی کے لئے عزت بھری زندگی کا سوال کروں گا۔ میرے ماضی کی پرچھائیاں میری بیٹی کی زندگی اس کا حال و مستقبل تباہ نہیں کر پائیں گی۔'' وہ بیوی کے ہاتھوں پر چہرہ ٹکائے رو رہے تھے۔ رو تو وہ بھی رہی تھی اور باپ کے لفظوں میں چھپا اس کے لئے محبت کا بیکراں سمندر بھی اسے خوش نہیں کر سکا تھا کہ وہ اپنے ہونے پر نادم تھی۔ اسے محمود خان کی بیٹی ہونے پر ندامت تھی۔ وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بلک اٹھی تھی۔

''پاپا! اندھیرا تقسیم کرنے والوں کے نصیب میں اجالے نہیں ہوتے۔'' وہ کرب و اذیت کا شکار تھی۔ اسے شاہ زیب سے کئی گلے تھے۔ وہ اسکے بدلے رویے پر حیران و پریشان تھی اور اب اسے وہ حق بجانب لگ رہا تھا۔

''آپ نے اچھا کیا شاہ کہ مجھے مہرہ بنایا کیونکہ میں اسی لائق ہوں۔ محمود خان کی بیٹی تو اس سے زیادہ کی سزاوار ہے۔'' اس کے کرب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ شدتوں سے رو رہی تھی۔

☆......☆......☆

''آئیکت! میں اب یہاں نہیں رہ سکتی ہوں آپ میرے لئے کوئی اور انتظام کر دیں۔'' وہ کئی دن بعد آئیکت سے بات کر رہی تھی اور اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا کیونکہ جب سے ڈنمارک سے مہمان آئے تھے اسے بہت عجیب لگتا تھا اور وہ یہی سب اس سے کہہ رہی تھی جو سن کر پریشان ہو گیا تھا مگر فی الحال وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ خود بہت پریشان تھا۔ شوکت اور کرزئی کی بیماری نے تو اس کے

ہاتھ پاؤں پھلائے ہوئے تھے۔ اللہ اللہ کر کے ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی کہ محمود خان کی اچانک آمد نے پھر بگاڑ دی تھی۔ وہ ڈسچارج ہو کر گھر تو آ گئے تھے مگر ڈاکٹرز نے انتہائی نگہداشت کے لئے کہا تھا اور ہر صدمے سے دور رکھنے کی تاکید الگ کر دی تھی۔ ایسے میں وہ اسے گھر واپسی کا بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔

''زندگی بہت کٹھن ہو گئی ہے آبی! پے در پے ہونے والی مشکلات نے میرے سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت ہی مفلوج کر دی ہے۔'' آبدار اس پر واپسی کے لئے زور ڈال رہی تھی اور وہ اسے سمجھانے لگا تھا کہ فی الحال واپسی ممکن ہی نہیں۔

''آپ یہ بھی تو سوچیں آخر میں کب تک غیروں کے در پر پڑی رہوں گی۔'' آبدار کے آنسو گرنے لگے تھے اور مجبور ہو کر اس نے اور کزئی ہاؤس میں محمود خان کی آمد کا بتا دیا تھا۔

''تھوڑا صبر کر لو آبی۔ بس کچھ دن تک وہ حالات خود پیدا ہو جائیں گے کہ وہ سب ہو جائے جو تم چاہتی ہو۔'' اس کا اشارہ اس وعدے کی جانب تھا کہ وہ اسے اس کا مقام دلائے گا۔

''آپ سب نے کیا کہا محمود خان سے... اور شاہ زیب بھیا وہ کیا بولے۔'' وہ آنسو گرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''شاہ زیب تو ان سے ملا ہی نہیں یہاں تک کہ وہ ابھی ان کی آمد سے بھی انجان ہے۔'' اس نے دھیمے سے بتایا تھا کہ شوکت اور کزئی کی طبیعت کے باعث جہانزیب اور کزئی نے فی الحال اس موضوع پر بات ہی نہیں کی تھی اور آئیکت کو بھی منع کر دیا تھا۔

''شاہ زیب بھیا غلط کر رہے ہیں آئیکت۔ ایک مرد کے جرم کی سزا عورت کو دینا کہاں کا انصاف ہے۔'' وہ محمود خان کے لئے تو دل میں کوئی جذبہ نہیں رکھتی تھی مگر عریم بحیثیت عورت اس کی تمام تر ہمدردیوں کا سبب بنی ہوئی تھی۔

''شاہ زیب کے قدم کی میں نے بھی حمایت نہیں کی کبھی...''

''مگر مخالفت بھی تو نہیں کی...'' وہ آئیکت کی بات درمیان سے ہی اچک گئی تھی۔

''ہاں نہیں کی اور جب سے محمود خان کو نادم دیکھا ہے تو میں تب سے شاہ زیب کے ساتھ ہی ہو گیا ہوں۔'' وہ برا مانے بغیر اعتراف کر گیا تھا۔

''آ... ئی... کت۔''

''محمود خان جیسے اپنی انا کے زعم میں رہنے والے جب تک نہیں جھکتے تب تک خود بات ان پر نہ آئے۔ برسوں اسے خیال بھی نہیں گزرا کہ وہ ماضی میں کتنی گھناؤنی حرکت کر چکا ہے۔ اسے معافی کا خیال نہیں آیا آبدار، اور آج جب اس کی عزت چوک پر نیلام ہونے کو ہے تو اسے احساس جرم ستانے لگا ہے۔ وہ نادم ہے اپنے کئے پر، معافی کا خواستگار ہے۔ اُسے اتنا ہی جرم کا احساس تھا تو وہ تب کہاں تھا جب اس کی بیٹی پر کوئی حرف نہیں آیا تھا۔ اپنی عزت پر بنی بات تو وہ نادم ہو چلا ہے۔'' آئیکت غصہ سے بول رہا تھا اور وہ لب چبانے لگی تھی

کہ آئیکت کے لفظ لفظ میں سچائی تھی جس سے آبدار تو کیا کوئی بھی منکر نہیں ہو سکتا تھا۔

''محمود خان کی بیٹی کی عزت تک بات نہ آتی تو وہ آج بھی نادم نہ ہوتا آبدار... اور ایسے لوگوں کو جن کے لئے دوسروں کی عزت معنی نہیں رکھتی اسی طرح لائن پر لایا جاتا ہے۔کل تک مجھے شاہ زیب کے عمل پر اعتراض تھا مگر اب میں مکمل طور پر شاہ زیب کے ساتھ ہوں۔''

آئیکت صاف بول گیا تھا آبدار اختلاف ہوا تھا مگر بول نہیں پائی تھی کیونکہ اس نے موقع ہی نہیں دیا تھا۔

''میں آپ کی ہر بات تسلیم کرتی ہوں لیکن یہ اس لڑکی کے ساتھ ظلم ہونے جا رہا ہے۔کیسے سمجھاؤں میں آپ کو اور شاہ زیب بھیا کو کیسے روکوں کہ وہ یہ ظلم نہ کریں۔'' وہ بے دلی سے موبائل بیڈ پر ڈالتی بری طرح رو رہی تھی۔

☆......☆......☆

''تم میرے ہاتھوں کسی دن قتل ہو جاؤ گی نوائم۔'' مومل جیسے اس کی منتظر ہی تھی اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ شروع ہو گئی تھی۔

''اف توبہ ہے تم سے تو مومی، بالکل لڑاکا بیویوں کی طرح شروع ہو جاتی ہو۔'' وہ جو خود شرم سے لال پیلی ہوئی بھاگ کر آئی تھی اس کو غصہ میں دیکھ کر وہ فضہ حیدر کی شرارت ہی بھول بیٹھی تھی اور شرارتی نگاہوں سے مومل کے تپے تپے چہرے کو دیکھنے لگی تھی۔

''تمہاری کتنی بیویاں ہیں جو تمہیں ایکسپیرئنس ہے کہ میں لڑاکا بیویوں کی طرح شروع ہوتی ہوں۔'' وہ نوائم کے جملے پر تپ کر بولی تھی اور کمرہ نوائم کی ہنسی سے مہک اٹھا تھا۔

''تم پوری پاگل ہو مومی۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی تھی اور وہ ہنستے ہوئے اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ مومل اپنا غصہ بھول کر اس کے ساتھ ساتھ ہنس دی تھی۔

''تمہیں پھپھو کے سامنے بکواس کرنے کی کیا ضرورت تھی آخر۔'' مومل ناراضگی سے پوچھ رہی تھی۔

''میرا دل چاہ رہا تھا ناں۔'' نوائم اس کی ناراضگی کی پرواہ کئے بناء مزے سے بولی تھی۔

''میرے ہاتھوں پٹ جاؤ گی نوائم۔'' مومل اسے تکیہ مارتی تنبیہ کر گئی تھی۔

''یار تم اتنی اچھی لڑکی ہو۔پہلے ہر وقت شور ڈالے رہتی تھیں اور اب جیسے عبیر سے بات کیا طے ہوئی ہے تمہارے مزاج ہی نہیں ملتے ہیں اس لئے تمہاری ٹانگ کھینچتی رہی ہوں تاکہ ہمیں ہماری جنگلی بلی جیسی مومل میسر ہو جائے۔'' نوائم اب کے سنجیدگی سے بولی تھی اور وہ یکدم چپ ہو گئی تھی اسے نوائم کے خلوص اور محبت پر رتی برابر شک نہیں تھا۔

''تھینکس نوائم۔'' مومل مسکرائی تھی مگر اب کے نوائم نہیں مسکرا پائی تھی۔

''تمہارے لئے ہم سب بہت اچھا کرنے جا رہے ہیں۔ہم سب جو بھی کر رہے ہیں تمہاری دائمی خوشیوں کے لئے مگر تم خوش نہیں ہو اس لئے یہ خوشی کے پل اداس کر رہے ہیں۔'' نوائم گہری سنجیدگی سے بولی تھی۔

''میں خوش ہونا چاہتی ہوں نوائم۔مگر یہ رشتہ مجھے کوئی خوشی نہیں دیتا۔عبیر کے نام سے مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔بے نام سی اُداسی مجھ سے آلپٹتی ہے۔'' وہ گہری یاسیت میں گھر چکی تھی۔

''مجھے رشتہ ایکسیپٹ کرنے میں وقت تو لگے گا ہی نوائم،مگر تم فکر مت کرو،سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ جانے خود کو یقین دلا رہی تھی کہ نوائم کو مگر وہ ایسا کر رہی تھی کیونکہ وہ چاہے اس رشتے سے ناخوش تھی،اس کی ایک فیصد بھی مرضی نہ تھی لیکن وہ اپنوں کے لئے جو فیصلہ لے گئی تھی تو انہیں احساس نہیں دلانا چاہتی تھی کہ یہ مجبوری کا سودا ہوا ہے کیونکہ اسے سب بہت عزیز تھے۔سب کی خوشی بہت معنی رکھتی تھی۔ نوائم نے مومل کے خوبصورت چہرے کی جانب دیکھا تھا۔وہ آج نوائم کی تسلی کے لئے جو کچھ کہہ گئی تھی وہ خوش آئند تھا۔اس بات کی نوید کہ وہ ایک دن عبیر کو دل سے قبول کر لے گی۔وہ دونوں باتوں میں لگی ہوئی تھیں کہ ملازمہ نے مہمان آنے کی اطلاع کے ساتھ کہا تھا کہ ان دونوں کو بیگم صاحبہ ڈرائنگ روم میں بلا رہی ہیں۔مہمانوں کی آمد پر انہیں بلانے پر وہ الجھ گئی تھیں۔

''پھپھو ہمیں اپنے مہمانوں سے کیوں ملوانا چاہتی ہیں۔'' مومل کی زبان میں سب سے پہلے کھجلی ہوئی تھی۔

''یہ تو جا کر ہی لگے گا پتہ۔'' نوائم اٹھتے ہوئے بولی تھی اور جس وقت وہ ڈرائنگ روم میں پہنچی تھیں ملازمہ مہمانوں کی خاطر تواضع کر رہی تھی۔عبیر کو دیکھ کر مومل کا منہ بن گیا تھا۔کچھ دیر قبل کی اپنی کہی بات اُسے جیسے خود ہی بھول گئی تھی جبکہ عبیر کی آنکھیں اسے دیکھ کر ہی جگمگا اٹھی تھیں۔ڈرائنگ روم کی فضا بہت خوشگوار تھی۔باتوں ہی باتوں میں وہ منگنی کی ڈیٹ بھی فائنل کر گئے تھے۔اس ویک تو فضہ حیدر کی شادی کی سالگرہ تھی،اگلے ہفتہ کی تاریخ مقرر کر لی گئی تھی۔کبیر عباسی بیٹے کے اشاروں کو فی الحال نظرانداز کر گئے تھے کہ وہ نکاح کی بات کرنے کا کہہ رہا تھا اور کبیر عباسی کو مناسب نہیں لگا تھا کہ ایک بات جو فکسڈ ہونے جا رہی تھی اس میں نئی بات کا اضافہ کرتے وہ بھی اس صورت میں کہ نکاح کی بات کو عقیل احمد پہلے بھی ٹال گئے تھے۔وہ بیٹے کو بعد میں منا لینے کا سوچ رہے تھے کہ دھیمی سی آواز پر چونک اٹھے تھے۔نگاہ کیا اٹھی تھی،آنکھوں کے سامنے دن میں ستارے رقصاں ہو گئے تھے۔سامنے وہ لڑکی کھڑی تھی یا ماضی کی کوئی بھولی بسری یاد۔وہ بے چین ہو گئے تھے۔وہ لڑکی فضہ حیدر کے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ان کی نگاہ رہ رہ کر اٹھ رہی تھی،مگر پوچھنے کی ہمت نہیں تھی... اور پوچھتے بھی کیا۔یکدم فضہ حیدر نے ازخود اس کا تعارف کروایا تھا۔

''یہ آبدار اورکزئی ہے میری دوست کی بیٹی۔''

اور وہ تو تعارف پر بھی بے چین ہی ہوئے تھے۔اس لڑکی کی شکل تو آبشار اورکزئی سے مل ہی رہی تھی اوپر سے سرنیم وہ تو جیسے نیم جاں ہو چلے تھے مگر محفل کا تقاضہ تھا وہ مہر بہ لب تھے۔وہ لڑکی چند منٹ بیٹھ کر ان سب کے درمیان سے اٹھ گئی تھی مگر ان کا چین وقرار بھی تو لوٹ لے گئی تھی اور قرار تو آبدار کو بھی ایک پل کا نہ تھا۔ابسام حیدر کے گھر میں رہنا اسے سبکی کا احساس دلاتا تھا۔مہمانوں کی آمد کے بعد تو ایک ایک لمحہ اس گھر میں اس پر بھاری ہوا جا رہا تھا... اور نوائم اس احساس کو اور سوا کر رہی تھی کہ وہ اس لڑکے کی منگیتر تھی جس سے وہ محبت کر بیٹھی تھی۔یکطرفہ محبت تو پہلے ہی اس کی جان کو آئی ہوئی تھی... اوپر سے رقیب سر پر آن بیٹھا تھا... ایسے میں فرار ہی اسے مناسب لگتی تھی لیکن وہ

تو اپنی تمام تر کشتیاں جلا آئی تھی۔ پلٹنے کا راستہ ہی نہیں تھا۔ وہ آج کل بہت پریشان تھی سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ کہاں جائے۔ اس کے لئے جیسے کوئی پناہ گاہ ہی نہیں رہی تھی۔ کام کے دوران آبدار کی آنکھیں مستقل بھیگ رہی تھیں اور کبیر عباسی سب کے درمیان گھرے بیٹھے کسی طرح آبدار سے ایک بار بات کر لینے کی خواہش کو سر اٹھاتا محسوس کر رہے تھے۔

کھانا لگنے کی اطلاع پر وہ ہاتھ دھونے اٹھے تھے اور ان کا سامنا آبدار سے ہو گیا تھا۔ وہ آگے بڑھنے کو تھی کہ کبیر عباسی اسے آواز دے گئے تھے۔ وہ ان کی بات کی منتظر تھی اور وہ آواز تو دے گئے تھے مگر کیا کیسے پوچھیں یہ سمجھ ہی نہیں پائے تھے۔

''تمہاری شکل میری کسی عزیزہ سے ملتی ہے۔'' انہوں نے طویل ہوتی خاموشی کو مناسب بہانے سے توڑا تھا اور وہ تو دھک سے رہ گئی تھی۔ اس نے بچپن سے یہی سنا تھا کہ وہ اپنی پھپھو سے بہت مشابہت رکھتی ہے اور اس بات میں کوئی مبالغہ بھی نہ تھا۔ پتہ تو اب چلا تھا کہ اس نے تو رنگ وروپ چرایا ہی ماں سے تھا۔ اتنی مشابہت اسی باعث تھی کہ وہ آبشار اور کرنزئی کی بیٹی تھی۔

''ایک لمبی مدت کے بعد پاکستان آیا ہوں۔ کچھ شناسا چہرے مٹی کی نذر ہو گئے تو کچھ راستے کی دھول ہو گئے۔ ہر اجنبی چہرہ پر اپنوں گا گماں لگتا ہے۔'' وہ اس کے گڑبڑانے پر خود گڑبڑا گئے تھے اور دھیمے سے بولے تھے۔ مقصد اپنے دل کا چور چھپانا تھا کہ وہ اس سے ڈائریکٹ تو کیا ان ڈائریکٹلی بھی اس کی ماں کا نام پوچھنے کی خود میں ہمت نہیں پا رہے تھے جبکہ وہ بدقت تمام مسکراتی منظر سے ہی غائب ہو گئی تھی کہ وہ حقیقت سے خوفزدہ تھی۔ وہ شکستگی سی محسوس کرنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

''شاہ زیب صاحب کے لئے کال ہے۔'' وہ سب کھانے میں مشغول تھے جب ملازمہ کارڈلیس اٹھائے چلی آئی تھی۔ شاہ زیب نے ہاتھ بھی نہیں بڑھایا تھا کہ جہانزیب اور کرنزئی نے ملازمہ سے فون جھپٹا تھا اور لائن ہی کاٹ دی تھی۔

''شاہ زیب کے لئے جو بھی کال آئے پہلے مجھے بتایا جائے۔'' وہ سب جہانزیب اور کرنزئی کی حرکت پر ہی حیران تھے کہ ان کے حکم پر تو پریشان ہی ہو گئے تھے اور شاہ زیب باپ کو سوالیہ نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔

''کچھ دن قبل کسی عریم نامی لڑکی کا باپ تم سے ملنے آیا تھا۔'' وہ جو بھائی کی طبیعت کے پیش نظر اس معاملے کو اٹھانے میں ہچکچا رہے تھے، یکدم بات کرنے کا فیصلہ کر گئے تھے کیونکہ محمود خان کی شاہ زیب کے لئے کل بھی کال آ چکی تھی۔ وہ باپ کی بات پر چونک اٹھا تھا۔

''آپ مجھے اب بتا رہے ہیں، اسی وقت بتا دیتے تو میں مل لیتا۔'' شاہ زیب مضطرب ہو چکا تھا مگر ظاہر نہیں کیا تھا۔

''میں اور بھائی صاحب ملے تھے۔'' وہ انگشت بدنداں رہ گیا تھا۔

''اسی شام سے بھائی صاحب بیمار ہیں اس لئے میں نے تم سے ذکر نہیں کیا۔ کالز کا سلسلہ طول پکڑنے لگا تھا اس لئے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔'' وہ ڈائننگ ہال سے اٹھ کر لاؤنج میں چلے آئے تھے۔ آئیکت اس کی وہیل چیئر گھسیٹ کر ان کے پیچھے ہی لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ وہ باپ کی بات سن کر ایک گہری سانس کھینچ کر رہ گیا تھا۔

''اس شخص کا کہنا تھا کہ تم نے اس کی بیٹی سے شادی کی ہے۔ وہ لڑکی تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔'' آئیکت کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے وہ دھیمے سے بولے تھے۔

''وہ شخص جھوٹ بولتا ہے۔ میں نے...''

''بکواس کی تو میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں گا شاہ زیب۔'' جہانزیب اورکزئی اس کی بات کے درمیان چیخ اٹھے تھے۔

''مجھے صرف سچ سننا ہے۔'' وہ تنبیہ کر گئے تھے اور وہ باپ کے سامنے اعتراف کی منزل طے کر گیا تھا۔ اپنے مقصد اور اٹھائے قدم کی تمام تر تفصیل ان کے گوش گزار کر دی تھی۔

''چٹاخ۔'' شاہ زیب تو کیا آئیکت کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جہانزیب اورکزئی تفصیل سننے کے بعد بیٹے پر ہاتھ اٹھا لیں گے۔

''تم اتنا کیسے گر سکتے ہو شاہ زیب۔''

''یہ آپ کہہ رہے ہیں بابا، جو اس محمود خان کے ڈسے ہوئے ہیں۔'' وہ ذلت سی محسوس کرتا بولا تھا۔

''ہاں۔ میں کہہ رہا ہوں کیونکہ میں ہی تو سب سے زیادہ سمجھتا ہوں کہ بہن بیٹی کی عزت کیا معنی رکھتی ہے۔'' جہانزیب اورکزئی شکست خوردگی سے صوفے پر ڈھے گئے تھے۔

''میں نے تذلیل کا بدلہ لینے کے لئے ہی یہ سب کیا ہے۔'' شاہ زیب باپ کی شکست محسوس کرتا آزردگی سے بولا تھا۔

''غلط کیا ہے تم نے۔ جتنی معصوم آبشار اورکزئی تھی، اتنی ہی معصوم عریم محمود بھی ہے اور تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم اس کے باپ کا بدلہ لینے کے لئے اسے بے عزت کرو۔'' وہ خود کو سنبھال کر دوٹوک انداز میں بولے تھے۔ ان دونوں کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جہانزیب اورکزئی اس کے اقدام کی مخالفت کریں گے۔ شاہ زیب تو اسی گماں میں تھا کہ جہانزیب اورکزئی اس کا ساتھ دیں گے۔

''لیکن بابا یہ سب ناگزیر تھا۔ محمود خان سے انتقام کے لئے میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔'' شاہ زیب صاف گوئی سے کہہ گیا تھا۔

''وہی حد جاننا چاہتا ہوں میں شاہ زیب، مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تم نے نکاح کیا ہے یا اس بدبخت انسان سے انتقام میں اتنے اندھے ہو گئے تھے کہ اس کی روش اختیار کر بیٹھے۔'' وہ اشتعال کو چھوتے بھڑک کر بولے تھے اور شاہ زیب کا چہرہ اہانت کے احساس سے سلگ اٹھا تھا۔

''نہ میں محمود خان جیسا ہوس پرست ہوں، نہ ہی میں نے انتقام کی آگ میں اپنی اچھائی کو جلا کر نفس کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ہے۔'' شاہ زیب سرخ چہرے کے ساتھ بولا تھا اور وہ اب کے دھیمے پڑ گئے تھے۔

''نکاح نامہ کہاں ہے؟'' وہ بیٹے کو ضبط سے گزرتا محسوس کر کے پوچھ گئے تھے۔

''میرے پاس محفوظ ہے لیکن میں وہ کسی کو دوں گا نہیں جب تک... محمود خان کی عزت کا جنازہ نہیں نکل جاتا۔'' اس نے باپ کے تیور بھانپتے ہوئے صاف دوٹوک انداز میں کہا تھا۔

''تم چاہتے کیا ہو آخر۔'' بیٹے کے انداز انہیں ہولانے لگے تھے۔

''تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔محمود خان سے ناک سے لکیریں نہ کھنچوائیں تو میرا بھی نام شاہ زیب اورکزئی نہیں۔'' وہ صاف اپنے ارادے بتا گیا تھا۔

''بکواس بند کرو شاہ زیب، یہ تمہاری غیرت کیسے گوارہ کرسکتی ہے کہ تمہاری بیوی کے کردار پر انگلی اٹھے۔تمہاری جائز اولاد کو گندی ناجائز اولاد کہا جائے۔'' جہانزیب اورکزئی بیٹے کے ارادوں کی تفصیل پر بھڑک اٹھے تھے۔آئیکت تو محض تماشائی بنا ہوا تھا جبکہ باپ کی بات اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار پیدا کر گئی تھی۔

''محمود خان نے گناہ کیا تھا، اسے موقع دیا گیا مگر اس نے گناہ پر ڈٹے رہنا ہی مناسب سمجھا۔جس شام بھائی صاحب نے آبدار کی ولدیت کے خانے میں میرا نام لکھوایا تھا ہم نے اسی شام محمود خان کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔'' وہ صوفے پر واپس بیٹھ گئے تھے اور دھیرے دھیرے بولنے لگے تھے۔

''محمود خان نے آبشار کو منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا تھا مگر اللہ نے ایسا سبب بنایا کہ اس کا پردہ رہ گیا اور جس کی مدد اللہ نے کی تھی تم اس کا انتقام ایک لڑکی کے پاکدامن پر کیچڑ اچھال کر لینا چاہتے ہو۔تم محمود خان سے انتقام نہیں لے رہے۔خدا کے غضب کو آواز دے رہے ہو... اور یاد رکھنا خدا کی لاٹھی بڑی بے آواز ہوتی ہے۔'' ان کے خاندان نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔ان کے والدین کی اچھائی کی تو ایک دنیا معترف تھی۔ان کے والدین کی ہی نیک پرورش تھی کہ انہوں نے بہن کا ہر ممکن ساتھ دیا تھا۔بہن کی اور خاندان کی عزت رکھنے کے لئے جو کچھ کرسکتے تھے وہ کر گئے تھے۔اتنی ذلت کے بعد بھی وہ زمانے بھر میں سر اٹھا کر چلے تھے تو اللہ کی ہی خاص عنایت تھی... اور جب صبر کا وقت تھا صبر کا دامن نہیں چھوڑا تھا اور اب شکر کا وقت ہے تو وہ کیسے شکر سے بچ سکتے تھے۔کل اگر مظلوم تھے تو آج ظالم نہیں بن سکتے تھے۔جس طرح گردن جھکا کر، نظریں چرا کر محمود خان ان کے سامنے آیا تھا ان کا دل تو اسی لمحہ سجدہ ریز ہو گیا تھا کہ اگر انہوں نے اپنی بہن کا معاملہ اللہ پر چھوڑا تھا تو اللہ نے انصاف کیا تھا اور وہ اپنے بیٹے کو کیسے ظلم کی اجازت دے سکتے تھے۔ناانصافی کرتے دیکھ سکتے تھے۔

''عزت ایک بار چلی جائے تو پھر آتی ہی نہیں ہے شاہ زیب، اور جسے آنا ہی نہیں اس کے لئے انتقام کی راہ نہیں چنتے۔صبر کی راہ چنتے ہیں۔اگر سب اپنے اپنے وقت میں ظالم بن جائیں، اپنا انتقام خود لینے لگیں تو اس مالک سے کون ڈرے گا کہ انسان کا انصاف، اس کی ناانصافی بھی محدود اور اللہ ہی بہتر منصف ہے۔'' جہانزیب اورکزئی نم آنکھوں سے بیٹے کو دیکھنے لگے تھے جو لاجواب ہو گیا تھا۔آگے سے کچھ کہنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی تھی۔آئیکت کو بھی شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔

''تم نے اس لڑکی سے نکاح کیا ہے شاہ زیب، اب وہ عورت تمہاری عزت ہے، تمہاری غیرت ہے اور اپنی عزت کو خود نیلام نہیں کرتے۔وہ عورت تمہارے نکاح میں ہے اور جو عورت نکاح میں ہو اس کو تحفظ دیا کرتے ہیں اس کے سر سے عزت کی چادر نہیں کھینچا کرتے۔'' جہانزیب اورکزئی بیٹے کی شرمندگی محسوس کرکے ناصحانہ انداز میں بولے تھے اور اسے سوچوں کے حوالے کر کے وہاں سے نکلتے

چلے گئے تھے۔

''تم بابا کی سوچ، ان کے فیصلہ کی حمایت کرو گے؟'' وہ آئیکت سے پوچھ گیا تھا۔

''ہاں، کیونکہ تمہارا مقصد صرف محمود خان کو اس کے گناہ کا احساس دلا کر اسے عزت کے مطالب سمجھانا تھا اور وہ عزت و ذلت کا فرق بہ خوبی سمجھ گیا ہے تو ایسے میں اس کو ذلیل کرنے کو خود کو ذلیل کرنا کم عقلی ہو گی۔'' آئیکت گہری سانس کھینچ کر بولا تھا۔

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں کیونکہ پھپھو والا معاملہ زمانے کی نگاہ سے پوشیدہ ہے۔ہم تو صرف اپنی نگاہ میں گر کر جینے کی آرزو میں روز لڑتے رہے اور اب زندگی کی سب سے تلخ حقیقت زمانے پر آشکار ہو یہ ہم میں سے کوئی نہیں چاہتا۔'' شاہ زیب کے انداز میں شکستگی تھی۔

''تمہیں محمود خان سے بدلہ لینے کے لئے اس کی بیٹی سے نکاح نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' آئیکت نے خود کو کمپوز کر کے کہا تھا۔

''ہاں، مگر جب مجھے پھپھو پر گزری قیامت کا پتہ لگا تو میرا دل کرتا تھا کہ میں محمود خان سے جینے کا حق چھین لوں، اسے بھرے مجمع میں بے عزت کروں۔'' شاہ زیب کا چہرہ تپ اٹھا تھا۔

''اسے بے عزت کرنے کو تم نے زندگی بھر کے لیے ایک طوق اپنے گلے میں ڈال لیا ہے۔'' آئیکت نے ترنت سے کہا تھا۔

''مجھے محمود خان کو ذلیل کرنے کے لئے صرف یہی مناسب لگا کہ میں اس کی بیٹی کو اس کے لئے عبرت کا نشان بنا دوں۔'' وہ لحظہ بھر کو رکا تھا آئیکت کچھ کہنے لگا تھا کہ وہ مزید بول اٹھا تھا۔

''مگر ماں کی تربیت آڑے آ گئی۔ میں محمود خان نہیں بن سکا۔اپنے اندر کی اچھائی کو میں نے مرنے نہیں دیا اور نکاح کر لیا۔''

''یہ ہی تو تم نے غلط کیا ہے۔خود سوچو آبدار کو جب اس گھر کے مکین اپنی تمام تر اچھائیوں کے باوجود قبول نہ کر سکے، محمود خان کی بیٹی کو بہو کی حیثیت سے قبول کر لیں گے؟'' آئیکت اس کی بات کاٹ گیا تھا۔

''مجھے جو مناسب لگا میں نے کر لیا۔اب بابا کا جو فیصلہ ہو گا وہی کروں گا۔اگر بابا کہیں گے تو میں عریم کو طلاق دے دوں گا۔'' اس نے کہا تھا اور آئیکت دہل کر رہ گیا تھا۔

''یہ تو سراسر ظلم ہے شاہ زیب۔'' اس نے ناگواری دکھائی تھی۔

''ظلم ہی تو نہیں کرنا چاہا تب ہی تو ذلیل کرنے کی چاہ میں عزت سے نواز گیا۔اب اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔'' شاہ زیب کے انداز میں کوئی نرمی نہ تھی۔

''اگر تمہارا ایسا نے کا ارادہ ہی نہیں تھا تو تمہیں آخری حد تک نہیں جانا چاہیے تھا۔'' آئیکت کے لہجہ میں ناگواری سی تھی۔ وہ نافہم انداز میں آئیکت کو دیکھنے لگا تھا۔

''یہ مت بھولو کہ تم باپ بننے والے ہو۔'' آئیکت نے گویا آخری حد کی وضاحت کی تھی۔شاہ زیب کا چہرہ تپ اٹھا تھا۔

''تم اس معاملے سے دور رہو، میں بہتر سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے کیا نہیں۔'' اس نے آئیکت کو لتاڑ کر رکھ دیا تھا مگر وہ بھی کہاں دھیما پڑا تھا۔

''آبدار اس سب میں بالکل بے قصور تھی مگر اسے تمام عمر سزا ملی۔۔۔ اور اسی سزا کو اب تم اس لڑکی کا بھی نصیب بنا دینا چاہتے ہو کیونکہ تم بااختیار ہو۔'' آئیکت کے کانوں میں آبدار کی باتیں گونج رہی تھی وہ اس کے سامنے تو شاہ زیب کی حمایت کر آیا تھا مگر خود شاہ زیب کے سامنے اس کی مزید حمایت نہیں کر پایا تھا کہ اسے شاہ زیب غلط لگ رہا تھا اور اس کے واضح اختلاف پر شاہ زیب کا چہرہ بے حد سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے ناگواری سے آئیکت کو دیکھا تھا۔

''آئیکت۔ تم اپنی بکواس بند کرلو۔''

''ہمارے بڑوں نے آبشار پھپھو کو تو سپورٹ کیا، ہر طرح سے اپنی عزت رکھی لیکن اس بچی کی زندگی میں محرومیاں بھر دیں جو بے قصور تھی۔ محمود خان نے اگر پھپھو پر ظلم کیا تھا۔۔۔ اور ظلم کا ثبوت بن کر آبدار اگر دنیا میں آ ہی گئی تھی تو آبدار کے ساتھ اتنا ناروا سلوک کیا معنی رکھتا ہے۔'' آئیکت جو ہمیشہ سے آبدار کا سپورٹر رہا تھا آج پھر اس کی حمایت میں بول رہا تھا۔

''تمہیں آبدار سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟'' شاہ زیب تپ کر بولا تھا۔

''ہر کوشش صرف اپنی عزت کے قائم رہنے تک کے لئے تھی۔ جب اختیار ملا تو کم ظرف ہو گئے۔ آبدار کی محرومی اس کی تشنگی کے سب ذمہ دار ہیں اور تم نے جو قدم اٹھایا ہے ایسی ہی ذلت آمیز زندگی اب اس لڑکی کا بھی نصیب بننے جا رہی ہے جو کہنے کو تمہاری بیوی ہے۔'' وہ شاہ زیب کو بولنے کا موقع دیئے بغیر بولے جا رہا تھا۔ ''تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے اس لئے چچا جان اس عورت کو قبول کرنے کو تیار ہیں مگر اس گھر میں اس کی حیثیت صرف محمود خان کی بیٹی کی ہی رہے گی۔ جیسے آبدار کو صرف دھتکار اور نفرت ملی اس لڑکی کو بھی یہی سب ملے گا۔۔۔ کہ ظرف بڑا نہیں ہو سکتا اور تم اس کے حق کے لئے کچھ کرو گے بھی نہیں کہ تم بھی تو اسے صرف محمود خان کی بیٹی سمجھتے ہو۔'' آئیکت غصہ سے کہتا اس کی سنے بغیر اسے زلزلوں کے حوالے کر کے وہاں سے نکل گیا تھا۔

❁ ❁

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

''پاپا! سب ٹھیک تو ہے؟ میں نوٹ کر رہا ہوں آپ جب سے فضہ آنٹی کے گھر سے آئے ہیں، کچھ پریشان ہیں۔'' وہ باپ کے سامنے کافی کا بھاپ اڑاتا ہوا مگ رکھتے ہوئے بولا تھا۔ کبیر عباسی بے طرح چونک اٹھے تھے۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' انہوں نے بیٹے کو ٹالنے کی کوشش کی تھی۔

''پاپا! آپ مجھے اپنا شریک غم بنالیں۔ کہہ دینے سے غم ہلکے ہو جاتے ہیں۔'' وہ متحیر نگاہ سے بیٹے کے خوبرو چہرے کو دیکھنے لگے تھے۔ اس کے چہرے پر باپ کے لیے فکر نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔

''کچھ دکھ عمر کے فرق کی طرح ہوتے ہیں۔ ایسے دکھ بانٹنے سے بھی ہلکے نہیں ہوتے۔'' وہ اذیت سے کہتے کافی کا مگ اٹھا گئے تھے۔ پہلا سپ لیا تھا۔

''اف! توبہ۔ کبیر۔ آپ کیسے کافی پی لیتے ہیں۔ مجھے تو یہ زہر سے بھی زیادہ کڑوی اور بری لگتی ہے۔'' وہ پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی یاد کو جگا بیٹھے تھے۔ جامعہ کی کینٹین میں سوفٹ ڈرنک کے علاوہ وہ اپنے لیے کافی اور آبشار کے لیے چائے منگوایا کرتے تھے کیونکہ آبشار کو کافی سخت ناپسند تھی۔

''بول تو ایسے رہی ہو کہ کافی زہر سے بھی زیادہ کڑوی اور بری لگتی ہے جیسے زہر کا مزہ تم چکھ چکی ہو۔'' اس لمحہ کی تمام تر تازگی ان کے ذہن و دل میں تازہ ہو چکی تھی۔

عبیر نے نوٹ کیا تھا کہ وہ وہاں ہو کر بھی موجود نہ تھے۔

''اللہ نہ کرے کہ مجھے کبھی بھی زہر کا ذائقہ چکھنا پڑے۔'' وہ ڈر کر بولی تھی اور وہ ہنس دیئے تھے۔ وہ شگفتہ سی لرزتی آواز ہی نہیں انہیں اپنا قہقہہ بھی برسوں بعد کانوں میں گونجتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ منظر سے بالکل کٹ چکے تھے۔ عبیر نے باپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا وہ چونک کر بیٹے کو دیکھتے بدقت تمام مسکرا دیئے تھے۔

''پاپا! کیا آپ آبدار کو جانتے ہیں؟'' وہ خود کو کمپوز کر بھی نہیں پائے تھے کہ اس نے ایسا سوال کر ڈالا تھا کہ وہ بے یقین رہ گئے تھے۔

''آپ جب آبدار سے بات کر رہے تھے۔ وہ میں نے سن لی تھیں۔'' اس نے ان کی بے یقینی کو بھانپتے ہوئے ان کی مشکل حل کی تھی اور وہ کچھ سوچ کر بیٹے کو سب بتانے کا فیصلہ کرتے اگلے ہی لمحہ اسے ماضی سے بھی آگاہ کرتے چلے گئے تھے۔

''آبشار سے ہٹ کر نہ کبھی کچھ چاہا نہ ہی کچھ سوچا۔ آبشار نے ہی نہیں، امی اور ابو نے بھی میرے باہر جانے کی بے حد مخالفت کی تھی مگر میں نے کسی کی بھی نہ سنی اور ڈنمارک آ گیا۔ یہاں وقت بہت کٹھن تھا۔ پھر میری ملاقات تمہاری ماما سے ہوئی، مارتھا کو مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے شادی کی آفر کی جو میں نے قبول کر لی کہ دیارِ غیر میں مجھے رہنے کے لئے سہارے کی ضرورت تھی جو مارتھا کی شکل میں

مجھے میسر آ گیا تھا۔ زندگی کی کٹھنائیاں یکدم آسودگی اور خوشحالی میں بدل گئی۔ زندگی ایک ڈگر پر چل پڑی جہاں دماغ اور خواہشات زندہ تھیں مگر دل اور زندگی مر گئی تھی۔۔۔ ابو کا جب خط آیا تھا امی کی طبیعت کی ناسازی کا بتا کر فوراً پاکستان پہنچنے کا کہا تھا تب میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تھا اور میرے فیصلہ کے آگے مارتھا آ گئی تھی۔ ان دنوں وہ امید سے تھی اس لئے میں اسے اکیلا چھوڑ کر پاکستان نہیں جا سکا کیونکہ مارتھا نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر میں پاکستان گیا تو وہ ابارشن کروا لے گی اور یہ میں گوارا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ آبشار کے زندگی سے جانے کے بعد یہی تو وہ واحد خوشی تھی جس نے مجھے حقیقی معنوں میں مسرت سں سرشار کر دیا تھا اور میں اس مسرت کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا۔ میں پاکستان نہیں گیا۔ تمہاری پیدائش کے ساتویں دن مجھے ابو کا پھر خط ملا تھا۔ انہوں نے امی کی وفات کا بتایا تھا۔ ماں کی محرومیوں، ان کی دروازے پر جمی نگاہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی بیماری کا بتایا تھا۔ امی کی وفات کا سن کر دل کو دھچکا سا لگا۔ میں نے ایک بار پھر پاکستان جانے کا فیصلہ کیا لیکن مارتھا نہیں مانی تھی۔ اس نے ڈائیورس کا مطالبہ کر دیا تھا اور تمہیں ساتھ لے جانے کا فیصلہ سنا دیا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی ایک ہی شرط تھی کہ میں پاکستان جانا تو دور وہاں جانے کا سوچوں بھی نہیں اور میں خود غرض ہو گیا تھا۔ مارتھا کے ذریعے جو آسائشات میسر آئی تھیں، نہ میں انہیں کھونا چاہتا تھا اور نہ ہی تمہیں۔۔۔ اس لئے فیصلہ ہو گیا تھا۔ میں نے ایک پیپر سائن کر کے مارتھا کو دے دیا تھا جس پر یہی لکھا تھا کہ میں پاکستان نہیں جاؤں گا۔ اگر میں پاکستان گیا تو وہ ڈائیورس لے لے گی اور بچہ اس کے پاس رہے گا۔ میں جو کبھی مہینے میں کال کر لیتا تھا وہ سلسلہ بھی مارتھا نے ختم کروا دیا کہ اسے دھڑکا لگ گیا تھا کہ میں اگر پاکستان میں موجود اپنے باپ سے رابطے میں رہوں گا تو ایک دن پاکستان چلا جاؤں گا اور وہ یہ گوارا ہی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے مجھ سے بے حد محبت تھی، اس نے تمام عمر میرا ساتھ نبھایا تھا۔ میری سرد مہری سے بھی سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اس کو میں نے کہا تھا کہ ہمارا بیٹا میرے مذہب پر چلے گا۔ اسے اعتراض نہیں ہوا تھا۔ وہ خود عیسائی تھی اس نے مذہب اسلام کی طرف آنے کی نہ کوشش کی اور ہی میں نے اسے دعوت اسلام دی۔ میرے نصیب میں یہ سعادت بھی نہیں تھی ورنہ جس طرح اس نے تم پر اپنا مذہب لاگو کرنے کی کوشش نہ کی تھی، اگر میں کوشش کرتا، نرمی سے اسے اسلام کے بارے میں بتاتا تو یہ عین ممکن تھا کہ وہ اسلام قبول کر لیتی، لیکن ایک دن اس نے خود ہی مجھ سے کہا کہ وہ اسلام قبول کرنا چاہتی ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی جب مارتھا نے اسلام قبول کیا اس کی خواہش پر میں نے اُسے ماریہ نام دیا تھا مگر اس کے بعد وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہی۔ قبول اسلام کے پہلے سال ہی مالک حقیقی سے جا ملی۔ ماریہ کی موت کے تیسرے مہینے میں نے پاکستان کال کی تھی مگر میری کال ریسیو نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے بہت کوشش کی تھی مگر ہر بار بیل جاتی رہتی تھی مگر کال ریسیو نہیں ہوتی تھی اور ایک دن وہاں امجد نے کال ریسیو کی اور اس نے مجھے ابو کی وفات کا بتایا تھا۔ اس دن کے بعد میں نے پھر پاکستان کال ہی نہیں کی۔ پاکستان جانے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا کہ جو میرے منتظر تھے جب وہی نہیں رہے تھے تو میں پاکستان جا کر کرتا بھی کیا اور اب جب سے واپس لوٹا ہوں، احساس ندامت و شکستگی قدموں سے آن لپٹے ہیں۔ پچھتاووں نے گھیر لیا ہے کہ میں نے اتنی دیر کیوں کر دی ہے آنے میں۔ میں اتنی دیر میں کیوں

آیا کہ منتظر والدین کی نگاہیں ان کی امیدوں کی طرح ہی سو گئیں۔" اس نے باپ کی طرف دیکھا تھا جو ماضی کے اوراق پلٹتے بہت آزردہ نظر آ رہے تھے ان کی آنکھوں سے آنسو گالوں تک چھلک آئے تھے۔ وہ بہت کچھ کہہ دینے کے بعد چپ کر گئے تھے۔ جیسے لمبی مسافت طے کرنے کے بعد جب منزل کے قریب آنے کی امید بندھتی ہے اس وقت لگے پتہ کہ جس راستے سے منزل کی طرف جا رہے ہیں، منزل اس راستے سے نصیب ہی نہیں ہونی کہ غلط راستے کا انتخاب کیا گیا ہے۔ جو حالت اس وقت مسافر کی ہوتی ہے وہ بھی اسی حالت کے زیر اثر تھے۔ شکستہ و نڈھال۔۔۔ سفر ختم ہو گیا تھا مگر منزل نہیں ملی تھی کہ اپنے لیے خود غرضی میں جو فیصلہ لیے تھے وہ فیصلے انہیں منزل سے دور کر گئے تھے۔ ان کی منزل قبر میں اتر گئی تھی اب وہ لاکھ سر پٹختے منزل سے انہیں دور ہی رہنا تھا کہ واپس پلٹنے کی بھی ایک مدت ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے بعد ندامت اور پچھتاوا بے سود ہوتا ہے۔

"آبشار اور کزنی! ان سے پھر آپ کا رابطہ نہیں ہوا۔" وہ تمام واقعات تفصیل سے جاننے کے بعد دھیمے سے پوچھ گیا تھا۔

"جس وقت آبشار نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے خلاف نہیں جا سکتی، اس دن تمام رابطے ختم ہو گئے تھے۔ اس دوپہر کے بعد میں نے جامعہ بھی چھوڑ دی تھی۔ فون پر تو آبشار سے پہلے ہی رابطہ نہیں تھا اسے میں نے اپنے گھر کا نمبر دیا ہوا تھا مگر اس کا نمبر میرے پاس نہیں تھا۔" وہ جیسے پھر ماضی میں اترنے لگے تھے اور بیٹے کو آخری ملاقات کی تفصیل بھی بتا گئے تھے کہ کیسے آبشار نے کال کی تھی اور وہ کافی شاپ میں ملے تھے۔ اس نے کتنی منتیں کی تھیں کہ وہ پاکستان سے نہ جائے۔ بوڑھے ماں باپ کا سہارا بنے، زندگی کے سفر میں ایک اچھی شریک حیات کے ساتھ آگے بڑھ جائے مگر اس نے آبشار کی کوئی بات نہیں مانی تھی۔ وہ زندگی کے سفر میں ایک شریک حیات کے ساتھ آگے تو بڑھ گیا تھا۔ بس بوڑھے ماں باپ پیچھے رہ گئے تھے۔ اس زمانے میں لینڈ لائن بہت شاذ و نادر ہی گھرانوں میں تھا۔ آبشار اسے گھر کا نمبر نہیں دیتی تھی وہ بے حد محتاط پسند تھی۔ وہ کہتی تھی کہ آپ سے محبت تو کرنے لگی ہوں مگر محبت کے نام پر کبھی کچھ ایسا نہیں کر سکتی جس سے میرے باپ کا سر جھک جائے۔ مگر اس نے آخری ملاقات میں اس وعدے کے ساتھ گھر کا نمبر دے دیا تھا کہ کبیر کبھی رابطہ نہیں کرے گا۔" وہ تفصیل سے آگاہ کرتے ایک بار پھر خاموش ہو چکے تھے۔

"آبدار کو دیکھ کر آپ کیوں چونک گئے تھے؟" بات یہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں جا پہنچی تھی۔

"آبدار کی شکل آبشار سے بے حد ملتی ہے۔ آبدار کو دیکھ کر مجھے لگا جیسے برسوں بعد میرے سامنے آبشار آن کھڑی ہوئی ہے۔" وہ تھکے تھکے سے انداز میں بولے تھے۔

"آبشار آنٹی سے آپ کو لگتا ہے کہ آبدار کا کوئی رشتہ ہے۔ مطلب وہ آبشار آنٹی کی بیٹی ہے۔" وہ دھیمے سے مگر صاف لہجہ میں بولا تھا۔

"مماثلت سے تو یہی لگتا ہے کہ جیسے بہت گہرا رشتہ ہے۔ بیٹی کا کہہ نہیں سکتا کہ سر نیم نے مجھے کنفیوز کر دیا ہے۔" وہ ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولے تھے۔

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر وہ آبشار آنٹی کی بیٹی ہے تو اس کے نام کے ساتھ ''اور کزئی'' نہیں لگا ہونا چاہیئے۔''اس نے باپ کی بات بڑھائی تھی۔

''آبداران کی بھتیجی یا بھانجی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' وہ باپ کے پژمردہ چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔

''بھانجی نہیں ہو سکتی کہ آبشار دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔'' وہ بیٹے کی بات کے درمیان میں بولے تھے۔

''جب آپ پاکستان سے گئے اس وقت تک آبشار آنٹی کی شادی ہوگئی تھی؟''اس نے نیا سوال کیا تھا اور وہ نفی میں گردن ہلا گئے تھے۔

''صرف منگنی ہوئی تھی۔ کافی شاپ میں آبشار نے بتایا تھا۔'' وہ منظر تازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیسے روتے ہوئے اس کی منتیں کر رہی تھی۔

''جب تم نے اپنی راہیں الگ کر لی ہیں تو ہمیں فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ میں کہاں، کس حال میں رہتا ہوں۔'' اپنا ہی سنگدلانہ لہجہ کانوں میں گونج اٹھا تھا۔

''میں نے آپ سے بہت محبت کی ہے کبیر، لیکن میں آپ کی محبت میں اپنوں کو تکلیف نہیں دے سکتی۔ میری مجبوری کو سمجھیں اور اپنے لئے کوئی غلط فیصلہ نہ لیں۔'' آبشار اور کزئی کا نمناک لہجہ انہیں بے چین کر گیا تھا مگر وہ نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ کر آ گئے تھے۔ کافی شاپ سے ہی نہیں اس ملک سے ہی دور چلے گئے تھے۔

''آبشار نے مجھ سے کہا تھا کہ میرا فیصلہ غلط ہے اور مجھے احساس تھا مگر میرا احساس جیسے مر گیا تھا، بس اپنے احساس کو ہی دفن کرتا ملک چھوڑ گیا اور پلٹ کر ہی نہیں آیا۔'' وہ آبشار کی باتیں سوچتے بھیگے لہجے میں بولے تھے۔

''آپ جاننا چاہتے ہیں کہ آبدار کون ہے۔'' وہ باپ کی آزردگی محسوس کر رہا تھا مگر اس کی سوئی آبدار پر اٹکی ہوئی تھی۔

''نہیں جاننا چاہتا کہ میں اس راستے پر نہیں جانا چاہتا جو کبھی میرا تھا ہی نہیں۔'' وہ خود کو کمپوز کرتے بیٹے کو دیکھنے لگے تھے۔

''آبشار انٹی آ گر آپ کے سامنے آ گئیں تب۔۔۔'' وہ پوچھ رہا تھا۔

''وہ سامنے نہ آئے اسی لیے تو اس ملک کو ہی چھوڑ گیا تھا۔ ان راستوں سے دور چلا گیا تھا جہاں وہ ملی تھی یا جہاں مل سکتی تھی۔'' وہ پھر شکست و ریخت کے مرحلے سے گزرنے لگے تھے۔

''میں نے واپس ڈنمارک جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔'' وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ باپ کے فیصلہ پر ساکت رہ گیا تھا۔

''مگر ہم تو پاکستان میں قیام کے ارادے سے آئے تھے۔'' عبیر کے لب میکانکی انداز میں ہلے تھے۔

''ارادوں کا کیا ہے، ٹوٹ ہی جاتے ہیں۔'' کبیر عباسی کے انداز میں برسوں کی تھکن تھی۔

''آپ کو نہیں لگتا کہ آپ ایک بار پھر غلط فیصلہ کرنے جا رہے ہیں۔'' عبیر، باپ کو بے حد مایوس اور آزردہ دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا کہ اسے اپنے باپ سے بے حد محبت تھی۔

''ماضی میں راستے بدل لینے کا فیصلہ غلط تھا کیونکہ جدا تو آبشار ہوئی تھی اور اس کے راستے بدلنے کا سزا میں نے اپنے والدین کو دی تھی۔'' پچھتاوے پھر ان سے آن لپٹے تھے۔

''مگر آج راستے بدل لینا ہی مناسب ہے کہ آبدار کو دیکھ کر لگا ہے کہ آبشار بھی مجھ آن ٹکرائے گی اور جو قسمت سے مجھ سے دور جا چکی ہے اس سے سرراہ ملنا صرف تباہی کا سبب بنے گا، ماضی کی راکھ اڑے گی اور جب ماضی کی راکھ اڑتی ہے تو حال و مستقبل سیاہ ہو جاتے ہیں۔۔۔اور میں نہیں چاہتا کہ میرے سبب آبشار کی زندگی میں کوئی بھونچال آئے۔'' وہ اپنے لئے فیصلہ پر مطمئن تھے۔ان کی بات عبیر کے دل کو لگی تھی۔

''عقیل انکل وغیرہ سے کیا کہیں گے؟'' وہ ایک نیا سوال کر گیا۔

''ان سب کو مطمئن کرنا اتنا دشوار نہیں ہوگا۔ یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ تم یہاں کے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں ہو سکتے۔'' وہ جیسے آبدار کے سامنے کے بعد ہی تمام تر پلاننگ کر چکے تھے۔عبیر نے منگنی کا پوچھ لیا تھا جو تقریباً 12 دن بعد متوقع تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ عقیل سے بات کروں اور اس سے کہوں کہ خاموشی سے مول کے ہاتھ میں تمہارے نام کی انگوٹھی ڈال دی جائے، تقریب کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں ایک دو دن میں ہی ڈنمارک واپس چلے جانا چاہتا ہوں۔'' وہ اپنا فیصلہ سناتے بیٹے کو دیکھنے لگے کہ جیسے جاننا چاہتے ہوں کہ وہ کیا کہتا ہے۔

''ٹھیک ہے پاپا! جیسے آپ کی مرضی۔'' وہ مسکرا کر بولا تھا اور وہ مطمئن ہو گئے کہ ان کا بیٹا ان کی نیکی کا ثمر ان کے والدین کی دعاؤں کا سبب تھا کہ وہ اپنے باپ کی طرح ایک بے حس و برا بیٹا نہیں تھا۔ وہ تو ایک محبت کرنے والا فرمانبردار بیٹا تھا۔وہ بیٹے کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگے۔

''امی کو بچے بہت پسند تھے۔وہ اکثر مجھ سے کہتی تھیں کہ وہ میری شادی جلد از جلد کر دیں گی تا کہ ان کے آنگن میں ان کے پوتے و پوتیوں کی چہکاریں گل مچائیں مگر میری بے حسی و سنگدلی نے اس آنگن کو ہی سونا کر دیا۔'' وہ بیٹے کے چہرے کو محبت سے دیکھتے ماں کی باتیں یاد کر کے آبدیدہ ہو گئے تھے اور وہ مضطرب ہو گیا تھا کہ اس نے باپ کو بچپن سے ہی بے حد خاموش اور اپنے آپ میں گم پایا تھا۔وہ اکثر دکھی بھی محسوس ہوتے تھے مگر ان کے تمام دکھ جیسے پاکستان آ کر تازہ ہو گئے تھے۔وہ اذیت میں تھے اور اب بیٹے کے سامنے جیسے بیان کر گئے تھے۔وہ باپ کو آبدیدہ پا کر دکھی تھا۔

''کاش میں آپ کے لئے کچھ کر پاتا۔جس محبت سے دوری کے سبب آپ ایسے ہو گئے اسے آپ کے جیون میں لا سکتا۔'' عبیر باپ کے نم چہرے کو دیکھ کر بے بسی سے سوچتا وہاں سے نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

''آبدار! تم اتنی ہی کم گو ہو یا تمہیں ہم لوگ پسند نہیں آئے اس لئے بات نہیں کرتی ہو۔'' فضہ حیدر دونوں بھابھیوں کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہوئی تھیں، مومل اور نوائم کو بھی ساتھ چلنے کا کہا تھا مگر مومل نے جانے سے منع کر دیا تھا اس لئے نوائم بھی نہیں گئی تھی۔ مومل کو کوکنگ کا بے حد شوق تھا وہ آبدار کے منع کرنے کے باوجود کچن میں گھس گئی تھی اور کام کے دوران وہ نوائم سے اپنے مخصوص انداز میں الجھتی رہی تھی۔ ان دونوں کی نوک جھونک آبدار کو بے حد بھلی لگ رہی تھی کہ ان کے ہر انداز سے اپنائیت جھلک رہی تھی۔ سلاد بناتے ہوئے مومل یکدم کھیر کی گارنشنگ کے لئے بادام پستے کاٹتی آبدار کو مخاطب کر گئی تھی جو بری طرح چونکی ہی نہیں تھی مومل کے جملے پر گڑبڑا بھی گئی تھی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ کنفیوز سی بولی تھی۔

''مومی! تم بھی حد کرتی ہو۔'' وہ آبدار کے سرخ چہرے کو دیکھ کر مومل کو ڈپٹ گئی تھی۔

''میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا ہے۔ میں نے آبدار کو بولتے ہی نہیں دیکھا۔'' مومل کھیرے کا ٹکڑا منہ میں رکھ گئی تھی۔

''اب ہر کوئی تمہاری طرح بولنے کی مشین جو نہیں ہوتا۔'' ابسام کی آواز پر وہ تینوں ہی چونک گئی تھیں۔ نوائم مسکرانے لگی تھی جبکہ آبدار رخ ہی موڑ گئی تھی۔

''میں اتنا بھی نہیں بولتی ہوں۔'' مومل منہ بنا کر بولی تھی اور ابسام ہنس دیا تھا۔

''میں نے تمہاری زبان کو کبھی چپ نہیں دیکھا اور تم کہہ رہی کہ میں اتنا بھی نہیں بولتی۔ بی بی اتنی عاجزی اس کے سامنے ظاہر کرنا جو تمہیں جانتا نہ ہو۔'' ابسام ہنستے ہوئے بے تکلفی سے بولا تھا۔ نوائم کی بے ساختہ ہنسی فضا میں آزاد ہوئی تھی جبکہ مومل تو بے طرح کنفیوژ ہوتی سرخ پڑ گئی تھی۔ آبدار وہاں سے بھاگنے کا سوچنے لگی تھی کہ وہ خود کو مس فٹ محسوس کر رہی تھی۔

''آپ نے ٹھیک کہا ہے ابسام! اور میں تو بے چارے عبیر کی حالت کا سوچ کر ہی پریشان ہو جاتی ہوں۔ یہ تو شادی کے کچھ عرصہ میں ہی عبیر کو بہرا کر دے گی۔'' ان تینوں میں کافی دوستی تھی۔ وہ بے تکلفی سے ہنسی مذاق کر لیا کرتے تھے۔ نوائم منگنی کے بعد کچھ محتاط ہو گئی تھی مگر اس وقت بے ساختگی میں ابسام کی حمایت میں بات آگے بڑھا گئی تھی اور اس کے لہجہ میں موجود بے تکلفی۔۔۔ آبدار کے دل کے آر پار ہو گئی تھی۔ آبدار نے نگاہ اٹھائی تھی ابسام حیدر معمولی سے فاصلے پر کھڑا نوائم کی بات پر ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس منظر نے آنسو بھر دیئے تھے۔ وہ محض ایک نگاہ ڈال کر نگاہ چرا گئی تھی۔ مومل اس سے الجھ رہی تھی۔ نوائم بھی آگے سے ٹکڑے لگا رہی تھی۔ ابسام کے اونچے ہوتے قہقہے۔۔۔ چھری اس کے ہاتھ کو زخمی کر گئی تھی مگر اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ تو کبھی کبھی مسکرانے والے ابسام حیدر کے اونچے قہقہے محسوس کر رہی تھی، اپنا درد محسوس نہیں ہوا تھا۔ خون بڑی تیزی سے گر رہا تھا۔ مومل منہ بنا کر ناراضگی کے اظہار کے لئے رخ موڑ کر سلاد کی جانب متوجہ ہو گئی تھی تب ہی اس کی نظر آبدار کی جانب اٹھی تھی اور اس کے ہاتھ سے بہتے خون کو دیکھ کر وہ اس کی طرف لپکی تھی۔

''او مائی گاڈ۔ یہ کیا کر لیا ہے تم نے آبدار۔ کتنا خون بہہ رہا ہے۔'' وہ اس کے ہاتھ سے چھری لیتے ہوئے بولی تھی وہ دونوں بھی فوراً

متوجہ ہوئے تھے۔ ابسام نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں سی بنی ہوئی تھیں۔ وہ عجیب سے احساسات میں گھر کر رہ گیا تھا تب ہی مومل نے ابسام کو احساس دلایا تھا کہ آبدار کے بہت خون بہہ رہا ہے۔ وہ اپنی کیفیت سے نکلتا کیبنٹ کی طرف بڑھا تھا۔ فضہ حیدر نے ایسی ہی کسی صورتحال کے لئے فسٹ ایڈ باکس کچن میں بھی رکھا ہوا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں مومل۔ معمولی سا کٹ لگ گیا ہے۔'' وہ ہاتھ چھڑاتی آگے بڑھی تھی اور نل کھول دیا تھا۔ جلن کا احساس تھا۔ اس نے کچھ دیر میں نل واپس بند کیا تھا مگر خون ہنوز بہہ رہا تھا۔ وہ بادام کی جگہ اپنی انگلی پر چھری پھیر گئی تھی۔ کٹ گہرا تھا جب ہی خون رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ابسام نے محض ایک نظر اس کے سرخ آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو دیکھا تھا۔ آبدار نے منع کرنا چاہا تھا مگر نوائم اسے ڈپٹ گئی تھی اور احتیاط کے ساتھ اس نے کاٹن کی مدد سے زخم پر پایوڈین لگا کر بینڈ تیج کر دی تھی۔ اس دوران گاہے بگاہے ابسام کی نظر آبدار پر اٹھتی رہی تھی۔ آبدار پہلے بھی ابسام کو چونکا دیتی تھی مگر آج کل وہ جو محسوس کر رہا تھا وہ بہت تکلیف دہ تھا۔ آبدار کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھنا ہر گز بھی معمولی بات نہ تھی۔ وہ بے چین ہو چکا تھا کہ وہ دوست کی امانت تھی۔ وہ پہلے بھی کافی کچھ محسوس کر گیا تھا مگر نوائم کے آنے کے بعد جس میں شدت آ گئی تھی، وہ جس نظر سے نوائم کو دیکھتی تھی وہ اسے بہت کچھ سمجھا رہے تھے اور آج اس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی۔۔۔ اور نمی کے پیچھے جھلملاتا عکس۔ وہ بڑی تیزی سے کچن سے نکل گیا تھا۔ مومل نے آبدار کو گلاس میں ٹھنڈا پانی ڈال کر دیا تھا۔ وہ شرمندہ ہوئی جا رہی تھی۔

''میری توبہ جو آئندہ تم سے کہا کہ تم بولتی کیوں نہیں ہو۔'' مومل مذاق کر رہی تھی اور وہ روتی ہوئی آنکھوں سے مسکرا دی تھی۔

''سوری! آپ لوگوں کو پریشان کر دیا۔'' آبدار نے آنسو رگڑے تھے۔

''ہاں، پریشان تو کر دیا ہے بٹ چلو معاف کر سکتی ہوں اگر تم مجھ سے دوستی کر لو تو۔'' مومل کا اپنا ہی غیر سنجیدہ لاابالی سا انداز تھا۔ آبدار کو یہ پرخلوص سی لڑکی بے حد اچھی لگی تھی۔ اچھی تو نوائم بھی لگی تھی مگر وہ ابسام کی منگیتر تھی۔ اس شخص کی منگیتر جس سے اسے محبت تھی۔ اس لئے اسے نوائم بری لگتی تھی۔ آبدار کی تو خود ہی الگ تھلگ رہنے والی عادت تھی۔ وہ کم گو بھی تھی، اسی لئے ان دونوں سے زیادہ بات نہیں ہوتی تھی لیکن مومل کو کہاں اس کی خاموشی برداشت ہوتی تھی۔ وہ آج اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ دوستی کا ہاتھ بڑھا گئی تھی جسے آبدار نے بخوشی قبول کر لیا تھا۔

''آپ کچھ برا گمان نہ کریں میں سچ میں کم بولتی ہوں۔'' اس نے مومل سے کہا تھا جس پر نوائم ہنس دی تھی۔

''یہ مومی، خود بہت بولتی ہے ناں، اس لئے اسے خاموشی سے ایک قسم کی چڑ ہے۔'' نوائم نے مومل چھیڑا تھا اس نے نوائم کو گھورنے پر اکتفا کیا تھا جبکہ آبدار کی نگاہ اس کے حسین چہرے پر ٹک گئی تھی۔

''ابسام اور اس کی فیملی جتنی اچھی ہے۔ وہ اتنی ہی اچھی پرخلوص لڑکی کو ڈیزرو کرتے ہیں۔'' آبدار نے سوچا۔ کومل بھوک محسوس کرتی اسی طرف آ گئی تھی تو آبدار کچن سے نکل گئی کیونکہ مومل چھوٹی بہن کی طرف متوجہ ہو گئی تھی اور نوائم بھی کچن سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''ابسام نوائم کو ہی ڈیزرو کرتے ہیں۔ میرے جیسی لڑکی، جو کسی کے گناہ کا ثبوت بن کر دنیا میں آئی، عزت بچانے کے لئے جسے تحفظ تو دے دیا گیا مگر محبت کے دو بول نہیں بول سکے۔۔۔ جن سے اچھا برا کچھ تو رشتہ تھا، جب انہوں نے مجھے قبول نہیں کیا۔۔۔ تو ابسام اور ان کی فیملی کیسے قبول کر سکتی ہے۔ میرے جیسے بچے جو کسی کے گناہ کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ ان کے لئے محبت نہیں بنی ہوتی۔ عزت نہیں ہوتی نصیب میں۔ میں سراب کے پیچھے بھاگنا چاہتی ہوں جب کہ جانتی بھی ہوں کہ ابسام میرے کسی صورت نہیں ہو سکتے۔ میری حقیقت انہیں میرا ہونے نہیں دے گی۔'' وہ کھڑکی میں کھڑی سوچ رہی تھی۔ لان کا منظر سامنے تھا۔ کین کی کرسیاں جو خاموش پڑی تھیں یکدم آباد ہو گئی تھیں۔ وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے لان میں آئے تھے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ مومل کے ہاتھ میں ٹرے تھی جو اس نے ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ سموسہ لینے کو ابسام اور نوائم نے بیک وقت ہاتھ بڑھایا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ٹکرائی تھیں، وہ دور سے بھی ابسام کی آنکھوں کی مسکراہٹ اور نوائم کی آنکھوں کی حیا، چہرے پر پھیلتی سرخی کو دیکھ چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پھر آنسو جمع ہونے لگے تھے۔ یہ منظر اس کے لئے نہیں تھا، اس منظر میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ اس منظر سے ہی نگاہ چرا گئی تھی۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''ابسام! میں جانتی ہوں آپ میرے نہیں ہو سکتے مگر خود کو آپ سے محبت کرنے سے باز نہیں رکھ پا رہی۔ نوائم سے حسد کرنے سے نہیں روک پا رہی۔'' اس نے سسکتے ہوئے دل ہی دل میں ابسام کو مخاطب کیا تھا۔

''کاش ابسام آپ میرے ہو سکتے۔ کاش محبت کی یہ بازی میں جیت جاؤں۔ میں آپ کو پا لوں مگر مجھے لگتا ہے کہ میری بدنصیبی مجھے آپ کا ہونے نہیں دے گی، محبت کی بازی میں ہار جاؤں گی۔'' وہ نیچے کارپٹ پر آ بیٹھی تھی۔ سر بیڈ پر ٹکا دیا تھا۔ وہ سسکتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

ہم اس طور سے ہاریں گے

مقابل، جیت کے روئے گا

''میں تو اتنی حرماں نصیب ہوں کہ کبھی آپ سے کہہ بھی نہیں سکتی کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں کیونکہ میں آپ کے لائق نہیں ہوں ابسام۔'' وہ شدتوں سے رو دی تھی۔ مومل جس نے اسے کھڑکی میں کھڑا دیکھ لیا تھا اسے اشارہ بھی کیا تھا مگر وہ اس کے اشارے کے پہنچنے سے قبل ہی کھڑکی سے ہٹ گئی تھی اور مومل اسے بلانے کے لئے اس کے کمرے تک چلی آئی تھی۔ کمرے میں گونجتی اس کی سسکیوں نے مومل کو مضطرب کر ڈالا تھا۔ مومل جس طرح آئی تھی اسی طرح خاموشی سے پلٹ گئی مگر اپنے ساتھ آبدار کا راز بھی لے گئی تھی۔ اس کے کانوں میں آبدار کی آواز گونج رہی تھی۔

''ابسام! میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ آپ کو نوائم کے ساتھ دیکھ کر میرا دل کانپنے لگتا ہے۔ آپ میرے نہیں ہو سکتے تھے تو کیوں آپ میرے دل میں محبت بن کر اتر گئے۔'' مومل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آبدار کے دل کا کرب، اس کی سسکیاں مومل کے دل میں اتر گئی تھیں۔

''آئی لو یو ابسام!'' اس کی نظر ابسام حیدر پر تھی کان میں آبدار کی آواز شور ڈال رہی تھی۔ مومل کی کسی بات پر ہنستی نوائم نے اسے جلدی آنے کا اشارہ کیا تھا۔

''آئی ہیٹ یو نوائم۔ تم بہت بری ہو۔ تم نے میری محبت مجھ سے چھین لی ہے۔ صرف تمہاری وجہ سے ابسام میرے نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ تم سے ایک بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔'' وہ نوائم کے بے ریا چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ چہرہ اس لائق تھا کہ اس سے نفرت کی جاتی لیکن آبدار کو اس سے نفرت ہوگئی تھی کہ اس کی محبت نے اسے نفرت کرنا بھی سکھا دیا تھا۔ مومل خود کو کمپوز نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کے کانوں میں آبدار کی آواز گونج رہی تھی۔ آنکھیں نوائم کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

''وہاں کیوں جم گئی ہو، آ بھی جاؤ۔۔۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' نوائم نے اسے آواز لگائی تھی مومل خود کو بمشکل کمپوز کرتی ان تینوں کے درمیان آن بیٹھی تھی، مگر اس کی کیفیت کھوئی کھوئی سی تھی جسے ان تینوں نے ہی محسوس کیا تھا۔

''کیا ہوا ہے مومی، ایک دم چپ کیوں ہوگئی ہو۔'' ابسام کو اس کی فکر ہوئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں، بس سر میں درد ہو رہا ہے۔'' مومل نے بات بنائی تھی۔

''تم تو آبدار کو بلانے گئی تھیں ناں۔'' نوائم نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تھا جو بے حد سرخ ہو رہا تھا، نوائم کو ایکدم کچھ انہونی کا سا احساس ہوا تھا کہ مومل کو اپنے جذبات چھپانے نہیں آتے تھے۔ اس کا چہرہ کھلی کتاب بن جاتا تھا اور وہ اس وقت چہرے سے ہی مضطرب لگ رہی تھی۔

''آبدار واش روم میں تھی میں اسے آنے کا کہہ کر آگئی۔'' اس نے چہرہ جھکا کر کہا تھا اور چائے کے گھونٹ لینے لگی تھی۔ وہ سب باتوں میں لگ گئے تھے۔ مومل بھی ان کا ساتھ دینے کی پوری کوشش کر رہی تھی مگر نوائم بری طرح الجھ چکی تھی۔ وہ ابسام کی موجودگی میں اس سے کچھ پوچھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس لئے مومل کی غائب دماغی کو محسوس کرتی بعد میں پوچھنے کا سوچنے لگی تھی۔ مومل کے انداز نے چونکایا تو ابسام کو بھی تھا مگر اس نے ظاہر نہیں کیا پر الجھ وہ بھی گیا تھا۔ مومل ان دونوں کو الجھنوں کے حوالے کرتی کومل کی کسی بات پر ہنسی تھی اور اس کی کھوکھلی ہنسی نوائم کو گڑبڑ ہونے کا شدت سے احساس دلا گئی تھی۔

☆......☆......☆

''شاہ زیب اور کزئی! میں آپ سے آج ہر حال میں ملنا چاہتی ہوں۔'' مستقل بیل بج رہی تھی مگر وہ نظر انداز کرنے میں تو ماہر تھا۔ اس نے توجہ ہی نہیں دی اور جیسے ہی سلسلہ طول پکڑنے لگا اس نے نمبر ہی آف کر دیا تھا۔ دو گھنٹہ بعد نمبر آن کیا تھا کہ پھر عریم کی کال آنے لگی تھی۔ اس نے کچھ سوچ کر ریسیو کی تھی۔ وہ ہیلو بھی نہیں بول پایا تھا جبکہ ارادہ اسے خوب سنانے کا تھا اور وہ سلام دعا کے بغیر گہری سنجیدگی سے کہہ گئی تھی۔

''وجہ جان سکتا ہوں۔'' وہ اس کی غیر معمولی سنجیدگی سے ہرگز بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔

''وجہ جانتے ہیں آپ، اس لئے جان کر انجان نہ بنیں۔'' وہ ہنوز سنجیدہ تھی۔

''انجان تو تم بن رہی ہو عریم۔ جب میں تمہیں تمام بات بتا چکا ہوں تو اس کے بعد ملنے کا کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا۔'' اس کے لہجے میں پھنکار تھی۔ عریم لیکن متاثر ہوئے بغیر بول پڑی تھی۔

''میں سب کچھ جان گئی ہوں شاہ، اسی لئے آپ سے آخری بار ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ دھیمے لہجہ میں بولی تھی اور وہ ایک دم الرٹ ہو گیا تھا۔

''کیا جان گئی ہو؟'' وہ اس کے لہجہ کی لڑکھڑاہٹ سے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا جان گئی ہے مگر انجان بن کر پوچھ گیا تھا۔

''وہی سب جس کی وجہ سے آپ نے مجھے مہرہ بنایا۔ میرے سچے جذبات کی توہین کی، مجھے صرف استعمال کیا۔۔۔'' اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ باپ جو اس کا فخر تھا آج اس کے سبب اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ کچھ کہتے وہ اندر سے مر رہی تھی۔

''جب سب جان گئی ہو تو ملنا کیوں چاہتی ہو۔ تمہارا اصل مجرم تو تمہارا باپ ہے۔ اس سے نمٹ لو۔'' وہ اس کے لہجہ کی لڑکھڑاہٹ و نمی محسوس کرنے کے باوجود گہرے طنز سے بولا تھا۔

''میرا باپ میرا نہیں آبشار اور کرزئی کا مجرم ہے شاہ زیب اور کرزئی۔'' وہ چیخ اٹھی تھی اور وہ لب بھینچ گیا تھا۔

''یاد رکھنا شاہ زیب اور کرزئی۔ جتنے محمود خان آبشار اور کرزئی کے مجرم ہیں، اتنے ہی آپ بھی میرے مجرم ہیں۔'' وہ لب پر لب جماتی سسکی کو آزاد ہونے سے روک گئی تھی کہ وہ اب اس شخص کے سامنے کمزور پڑنا تو دور رونا تک نہیں چاہتی تھی جبکہ اس کے صاف کہنے پر وہ چپ کا چپ رہ گیا تھا کیونکہ وہ غلط بھی تو نہیں بولی تھی۔ وہ شاہ زیب کے جواب کی منتظر تھی مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا تو اس نے اپنا مطالبہ دہرایا تھا اور اس کے انکار پر وہ غصہ میں آ گئی تھی۔

''آپ کا میں کالج کے گیٹ پر انتظار کروں گی۔ آپ نہیں آئے تو میں اور کرزئی ہاؤس آ جاؤں گی۔'' وہ عریم کی بات پر اشتعال میں آ گیا تھا۔

''تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟''

''دھمکی دینے کی میری اوقات نہیں ہے شاہ زیب صاحب۔ میں تو صرف آپ کو مطلع کر رہی ہوں۔'' وہ اس کی بات کے درمیان میں بول پڑی تھی اور اس نے غصہ سے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ پروگرام طے کیا تھا اور رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''میں تمہاری کسی دھمکی سے ڈرا نہیں ہوں عریم۔ میں خود بھی ایک بار ملنا چاہتا تھا۔'' اس نے وضاحت کرنا چاہی تھی مگر اس نے سنی نہیں تھی کیونکہ وہ اگر اپنی انا دکھانا چاہتا تھا تو وہ بھی اپنی عزت نفس کو بچانا چاہتی تھی۔ اس نے ملنے پر رضامندی دھمکی سے متاثر ہو کر نہیں ظاہر کی تھی۔ وہ الجھ گیا تھا۔ وہ وجہ نہیں سمجھ پایا تھا اس لئے اس نے تجسس کی وجہ سے حامی بھر لی تھی۔ کچھ بھی تھا وہ تلخی سے مسکرا دی تھی۔

☆......☆......☆

''تم نے شاہ سے بات کی۔'' شوکت اورکزئی نے چھوٹے بھائی سے پوچھا تھا اور جہانزیب اورکزئی نے تمام تفصیل سے انہیں آگاہ کر دیا تھا۔

''رخصتی کی تیاری کرو جہانزیب۔'' وہ بھائی کو دیکھنے لگے تھے انہوں نے شوکت اورکزئی کو اپنے فیصلہ سے آگاہ نہیں کیا تھا صرف شاہ زیب کے کارنامے کی تفصیل بتائی تھی۔ وہ بڑے بھائی کی مرضی جاننا چاہتے تھے اور ان کے ایک جملے نے ان کے ارادے کو ان کی مرضی کو کھول کر سامنے رکھ دیا تھا۔

''بھائی صاحب! اس شخص کی بیٹی کو ہم کیسے بہو بنا سکتے ہیں۔'' وہ بیٹے کے سامنے چاہے خود کو مضبوط ظاہر کر گئے تھے مگر شوکت اورکزئی کے سامنے وہ ہارنے لگے تھے اپنی بے بسی چھپا نہیں پائے تھے۔

''نکاح ہو چکا ہے، رشتہ بن چکا ہے اب اعتراض معنی نہیں رکھتا۔'' وہ بھی بے بسی کی انتہا پر تھے ان کی لاچارگی محسوس کرتے جہانزیب اورکزئی چپ کے چپ رہ گئے تھے۔

''آبشار کی بے رنگ زندگی نے مجھے ہمیشہ بے سکون رکھا ہے جہانزیب، ہم سب نے عزت کے بنا کیسے زندگی گزری ہے۔۔۔ میں گزار بھی چکا، آبشار کو گزارتے بھی دیکھ چکا مگر جب ہمارا پردہ اللہ نے رکھا تو ہم کون ہوتے ہیں کسی کو سرعام برہنہ کرنے والے۔'' ان کا لہجہ بوجھل تھا۔ جہانزیب اورکزئی کا سر جھک گیا تھا۔

''بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔۔۔ اور جیسے میری بہن کی عزت ویسے ہی اس شخص کی بیٹی کی عزت۔ اگر اس شخص نے ہماری بہن کو بے عزت کیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کی بیٹی کو بے عزت کریں۔ اس کے سر سے عزت کی چادر چھین لیں۔ یہ مجھے بھی گوارا نہیں ہوگا جہانزیب، اس لیے تم رخصتی کی تیاری کرو۔ جب اللہ ہمارا بھرم رکھ سکتا ہے تو ہم کیوں کسی کو بے پردہ ہونے سے نہیں بچا سکتے۔'' شوکت اورکزئی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''آپ پریشان نہ ہوں، شاہ زیب وہی کرے گا جو آپ کا حکم ہوگا۔'' جہانزیب اورکزئی خود کو کمپوز کرتے بڑے بھائی سے بولے تھے۔

''میں بس یہی چاہتا ہوں کہ اس بچی کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔۔۔''

''لیکن محمود خان کی بیٹی کو بحیثیت بہو قبول کرنا بھی بہت مشکل ہے۔۔۔'' جہانزیب بڑے بھائی کی بات کاٹ کر بولے تھے۔

''ہاں، لیکن یہ بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا کہ شاہ زیب اس لڑکی کو طلاق دے دے۔'' شوکت اورکزئی خود کو سنبھال کر بولے تھے۔

''یہی مناسب ہوگا کیونکہ آبدار کو ہمارے ذہن و دل آج تک قبول نہیں کر سکے، اس لڑکی کو بھی ذہن و دل قبول کرنے میں ناکام رہیں گے۔ ذہنی اذیت سے ہمارے دکھوں میں اضافہ ہو اس سے بہتر یہ ہوگا کہ مناسب فیصلہ کر لیا جائے۔'' رخسانہ اورکزئی کی آواز پر وہ دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟'' جہانزیب بیوی کو دیکھنے لگے تھے۔

''تمام زندگی ڈر ڈر کے گزاری کہ کہیں آبشار پر گزری قیامت کی زمانے کو خبر نہ ہو جائے اور اب وہ شخص جو ہماری بربادی کا ذمہ دار ہے اس کی بیٹی کو بہو بنالیا جائے تو ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔'' رخسانہ اورکزئی کا لہجہ بے لچک تھا۔

''خاندان کی عزت کے لیے میں نے آبدار کو جیسے برداشت کیا میں ہی جانتی ہوں مگر میں ایک اور آبدار کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تھیں۔

''رخسانہ! بہتر یہی ہوگا کہ تم خاموش رہو۔ میں اور بھائی صاحب مل کر کوئی حل نکال لیں گے۔'' جہانزیب اورکزئی بیوی کو ڈپٹ گئے تھے۔

''میں جانتی ہوں بھائی صاحب کا کیا فیصلہ ہوگا۔ جس نے کبھی کسی چیونٹی کو بھی نقصان نہیں پہنچایا وہ ایک لڑکی کو نقصان پہنچانے کا سوچیں گے بھی نہیں۔ لیکن محمود خان کی بیٹی کو میں بہو کی صورت تسلیم نہیں کروں گی۔ آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں بس یہ یاد رکھیے گا کہ آبدار کو میں نے خاندان کی عزت کے لئے برداشت کیا لیکن اس لڑکی کو نہیں کروں گی۔ شاہ زیب کو اسے طلاق دینی ہوگی۔'' رخسانہ شدید غصے میں تھیں کہ جس طرح ڈر ڈر کے تمام عمر گزاری تھی وہ اذیت انہیں بھولتی نہیں تھی۔ شوکت اورکزئی صوفہ سے کھڑے ہو گئے تھے۔

''محمود خان سے رشتہ داری کا سوچا بھی نہیں جا سکتا مگر اس لڑکی پر ظلم ہو یہ بھی مجھے گوارا نہیں۔'' شوکت اورکزئی دھیمے لہجہ میں فیصلہ سنا گئے تھے۔ جہانزیب اورکزئی حیرانگی سے بھائی کو دیکھ رہے تھے۔ شوکت اورکزئی سے اتنے سخت فیصلہ کی امید ہی کب تھی۔

''لیکن بھائی صاحب۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہ شوکت اورکزئی نے ہاتھ کے اشارے سے روک گئے تھے۔

''شاہ زیب کی شادی آمنہ سے ہوگی۔ رہ گئی بات اس لڑکی کی تو شاہ زیب کا جو فلیٹ ہے وہ اس لڑکی کو وہاں رکھ سکتا ہے۔ طلاق دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' انہوں نے کچھ اور واضح انداز میں اپنا فیصلہ ان دونوں میاں بیوی کے سامنے رکھا تھا۔

''شاہ زیب کبھی نہیں مانے گا۔ مجھے آپ کا فیصلہ مناسب نہیں لگ رہا۔'' زندگی میں پہلی بار جہانزیب اورکزئی کو اپنے بڑے بھائی کے فیصلہ پر اختلاف ہوا تھا۔

''مجھے بھائی صاحب کا فیصلہ ایک دم مناسب لگا ہے۔'' رخسانہ فوراً بولی تھیں اور وہ حیرت سے بیوی کو دیکھنے لگے تھے۔

''شاہ زیب جو حماقت کر گیا ہے اس کا ساتھ اتنا ہی دیں گے جتنا ممکن ہوگا۔ عزت داغدار کرنے والے شخص کو، اس کی اولاد کو سر پر نہیں بٹھا سکتے یہ تم شاہ زیب کو سمجھا دینا۔'' شوکت اورکزئی نکلتے چلے گئے تھے۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جہانزیب۔ بھائی صاحب نے ہمیشہ درست فیصلہ کیا ہے۔ ان کا یہ فیصلہ بھی درست ہی ہے۔'' رخسانہ تو یہ سوچ کر پریشان تھیں کہ کہیں شوکت اورکزئی اس لڑکی کو رخصت کرا کے گھر نہ لے آئیں مگر ان کی یہ مشکل دور ہو گئی تھی۔

''یہ مجھے نامناسب لگ رہا ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ ہی نہیں آمنہ پر بھی ظلم ہے۔'' جہانزیب اورکزئی بھائی کے فیصلہ کے مخالف

سمت میں جا رہے تھے ان کا ارادہ تو اس لڑکی کو رخصت کر کے گھر لانے کا تھا۔ ان کا تو آبدار کے ساتھ بھی کافی بہتر رویہ رہا تھا مگر اس کو دیکھ کر ذلت کا احساس یوں تازہ ہوتا تھا کہ وہ باقی سب کے ساتھ ناروا سلوک میں شامل ہو جاتے تھے۔ ان سب کا یہی حال تھا۔ آبدار سے انہیں کوئی بیر نہ تھا مگر اس ذلت کا احساس تھا کہ وہ آبدار کے ساتھ نارمل سلوک نہیں کر سکتے تھے۔ کبھی دھتکار دیتے تھے تو کبھی گلے لگا لیتے تھے۔

''دو بیویاں رکھنا اب اتنا بھی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ بھائی صاحب کا فیصلہ درست ہے وہ لڑکی یہاں آئے گی تو ہماری اذیتوں میں اضافہ کا باعث بنے گی اس لیے یہی بہتر ہے کہ شاہ زیب اسے الگ رکھے اور آمنہ ہماری بہو بن جائے۔ ویسے بھی میں نے آمنہ کو ہی اپنی بہو کے روپ میں دیکھا ہے۔'' رخسانہ جیٹھ کے فیصلہ کی حمایت میں تھیں وہ آگے سے چپ کر گئے تھے کہ شاہ زیب کی مرضی بھی تو معلوم کرنی تھی اور جب اسے سب کا فیصلہ پتہ چلا تھا تو وہ انکاری ہو گیا تھا۔

''مجھے آمنہ سے شادی نہیں کرنی ہے۔''

''آمنہ سے شادی نہیں کرنی ہے تو کان کھول کر سن لو اپنی بربادی کے ذمہ دار اس منحوس انسان کی بیٹی کو میں اپنی بہو کسی طور پر تسلیم نہیں کروں گی۔'' رخسانہ اور کزئی بیٹے کی بات کے درمیان میں پھنکاری تھیں اس نے لب بھینچ لئے تھے۔

''میں آپ لوگوں کو مجبور کر بھی نہیں رہا۔ مجھے آپ سب کا فیصلہ منظور ہے۔ میں عریم کو اور کزئی ہاؤس کبھی لے کر نہیں آؤں گا۔'' اسے تایا کے دوسرے فیصلے سے اختلاف تھا مگر یہ فیصلہ اسے بھی پسند آیا تھا ورنہ وہ تو یہی سوچ بیٹھا تھا کہ اسے عریم کو طلاق دینے کے لئے مجبور کیا جائے گا اور وہ طلاق دینے کے لئے بھی راضی تھا مگر تایا نے اسے دوسری راہ دکھا دی تھی۔ رخسانہ آگے سے کچھ بولنے لگی تھیں کہ وہ بیوی کو روک گئے تھے۔

''آمنہ سے شادی کا فیصلہ بعد کی بات ہے۔ یہ بتاؤ کہ اس لڑکی سے کب بات کر کے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو گے۔'' وہ بیٹے کو دیکھنے لگے تھے اور اس نے انہیں یہ نہیں کہا تھا کہ وہ چند گھنٹے بعد اس سے ملنے جا رہا ہے۔ وہ جلد بات کرنے کا کہہ گیا تھا۔

''تم اس لڑکی سے جو بھی بات کرو مگر اس کے باپ سے نہ تم ملو گے نہ ہی وہ کبھی تمہارے گھر آئے گا۔ تم اس لڑکی کو سمجھا دینا کہ وہ تمہارے ساتھ زندگی اسی صورت میں شروع کر سکتی ہے جب اپنے باپ کو چھوڑ دے گی ورنہ طلاق کے لیے تیار رہے۔'' رخسانہ اور کزئی کے انداز میں ذرہ برابر نرمی نہیں تھی۔

''رخسانہ! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ خود بیٹی کی ماں ہو کر ایسے فیصلے لے بھی کیسے سکتی ہو؟'' وہ ماں کی بات سن کر چپ رہا تھا کیونکہ وہ خود یہی سب سوچنے لگا تھا مگر باپ کا ری ایکشن اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

''ایسا فیصلہ نہ لوں تو پھر کیا فیصلہ لوں جہانزیب؟'' وہ شوہر سے الٹا پوچھنے لگی تھیں۔

''شاہ زیب اس شخص سے رابطہ نہیں رکھے گا یہ بات تو طے ہے لیکن اس کی بیٹی کو اس بات کا پابند کرنا کہ وہ اپنے باپ سے ہر تعلق توڑ

دے بالکل غلط ہے۔'' تابندہ اورکزئی جو اکثر معاملات سے دور رہتی تھیں بالآخر بول ہی پڑی تھیں۔

''آپ تو رہنے ہی دیں بھابھی بیگم ساری عمر آپ کو آبدار سے ہمدردی ہوتی رہی۔اب اس لڑکی سے بھی ہمدردی کے جذبات جاگنے لگے ہیں جو اس شخص کی بیٹی ہے جو ہماری بربادی کا ذمہ دار ہے۔'' رخسانہ اورکزئی کے انداز میں حقارت و بدتمیزی کا عنصر شامل تھا۔

''یہ تم بھابھی بیگم سے کس انداز میں بات کر رہی ہو۔'' جہانزیب اورکزئی نے بیوی کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''معذرت چاہتی ہوں لیکن بھابھی بیگم کی شہ پر ہی وہ آبدار من مانیاں کرتی رہی۔۔۔اور ہمارے سروں پر خاک ڈال کر بھاگ گئی۔'' رخسانہ اورکزئی کو تابندہ اورکزئی کا آبدار کے ساتھ نرمی و محبت سے پیش آنا کبھی پسند نہیں رہا تھا۔

''اس کے تو خون میں ہی وفا نہیں، اس کے ناپاک وجود کو عزت دی، نام دیا اور وہ ہماری عزت خاک میں ملا گئی۔۔۔اور یہ ہمارا بیٹا اسے دنیا میں کوئی اور لڑکی نہیں ملی جو اس شخص کی بیٹی سے نکاح کر بیٹھا جس کے سبب ہم سب نے ابنارمل زندگی گزاری۔۔۔'' وہ غصہ میں بول رہی تھیں مگر ان کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ موت کا سناٹا تھا جس کو رخسانہ اورکزئی کی آواز چیرتی جا رہی تھی۔

''اس واقعہ سے قبل کتنی پرسکون تھی زندگی۔سکون سے آتے جاتے تھے۔آبشار پر قیامت کیا گزری، ڈر زندگی کا حصہ بن گیا۔لوگوں کے سامنے سے خوف آنے لگا۔اس گھر کی بچیوں کو جا بے جا پابندیوں میں رکھا۔ایک ابنارمل زندگی گزاری ہم نے مگر آبدار کو عزت دی لیکن اسے عزت راس نہیں آئی۔ گندا خون تھا اس نے ثابت کیا، گھر سے بھاگ گئی۔ جو ذلت باپ نے دی تھی اس ذلت میں اضافہ کر گئی تھی اور رہی سہی کسر وہ لڑکی آ کر پورا کرے گی تو ایسا کسی صورت نہیں ہوگا۔'' رخسانہ اب باقاعدہ رو رہی تھیں کسی کی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ انہیں چپ کروا دے کہ ان کا لفظ لفظ سچا تھا۔اذیت انہوں نے ہی نہیں ان سب نے بھی برداشت کی تھی۔

''آپ کہہ رہی ہیں کہ یہ ظلم ہے کہ وہ لڑکی اپنے باپ کو چھوڑ دے تو اس لڑکی کو اپنے باپ کا اتنا ہی خیال تھا تو کیوں بھاگ کر شاہ زیب سے نکاح کیا۔ میں شاہ زیب کو صحیح نہیں کہوں گی لیکن وہ لڑکی جو خاندان کی عزت کی امین تھی اس نے کیسے گھر سے قدم نکالا اور شادی کر لی۔ باپ کو دھوکا دے کر نکاح کر سکتی ہے تو باپ کو چھوڑ بھی سکتی ہے۔اس جیسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔آبشار کو ساری عمر ہم نے سپورٹ کیا، کیوں اس لئے نا کہ اس پر ظلم ہوا تھا مگر اس لڑکی پر کوئی ظلم نہیں ہوا اس نے یہ زندگی خود منتخب کی ہے۔تم نے سن لیا شاہ زیب، وہ تمہارے ساتھ زندگی شروع کرے گی مگر اپنے باپ کو چھوڑ کر اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔'' رخسانہ نہایت ٹھوس لہجہ میں فیصلہ سناتیں سب کو خاص شاہ زیب کو حیران چھوڑ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

''ابسام بھیا تمہیں کیسے لگتے ہیں؟'' تکیہ درست کرتے ہاتھ تھم گئے تھے وہ حیرانگی سے مومل کو دیکھنے لگی تھی۔

''اس وقت یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟'' وہ تکیہ برابر کرتی لیٹ گئی تھی۔ مومل نے اپنا سوال دہرا دیا تھا اور وہ الجھ گئی تھی۔ مومل جواب کی

منتظر تھی اس لئے وہ بول پڑی تھی۔

''جیسے ہیں ویسے ہی لگتے ہیں۔''

''پلیز نوائم۔ بی سیریئس پلیز ٹھیک سے جو پوچھ رہی ہوں وہ بتاؤ۔'' وہ ناگواری سے اسے ٹوک گئی تھی نوائم کی الجھن پل پل بڑھ رہی تھی۔

''شاید نہیں یقیناً ہم پہلے بھی اس موضوع پر گفتگو کر چکے ہیں اور میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ ابسام بڑوں کی پسند ہیں اور میں اس رشتہ کے لئے کوئی قلبی جذبات نہ رکھنے کے باوجود اس رشتہ سے مطمئن ہوں کیونکہ میرے بڑے خوش و مطمئن ہیں۔'' نوائم الجھنوں کو پس پشت رکھتی گہری سنجیدگی سے کہہ گئی تھی۔

''اگر یہ منگنی ختم ہو جائے تو یعنی تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' وہ نوائم کو دیکھتے ہوئے پراسرار لہجہ میں بولی تھی۔

''تم یہ اپنی جاسوسی حرکتیں متروک کر دو اور شرافت سے بک دو کہ کیا بات ہے۔'' نوائم بری طرح چڑ کر بولی تھی۔

''میں نے تم سے ایک سادہ سا سوال پوچھا ہے کہ منگنی سے دلی وابستگی ہے یا صرف بڑوں کے احترام میں تم ہاں کر گئی ہو کیونکہ ایسا ہے تو تمہیں منگنی ختم ہو جانے سے بھی فرق نہیں پڑنا چاہئے۔'' وہ کھل کر کہہ نہیں سکتی تھی۔ نوائم سے بہت زیادہ بے تکلفی تھی باوجود اس کے وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ آبدار اور کزنی ابسام سے محبت کرتی ہے۔۔۔ اسے خود محبت پر کبھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہوتا یقین تو وہ عمیر عباسی کی محبت کو سمجھ چکی ہوتی مگر جس طرح آبدار رو رہی تھی، اس کا رونا اس کے الفاظ مومل کے دل میں ترازو ہو گئے تھے وہ بہت بے کل سی تھی مگر اپنی بے کلی نوائم سے کہہ نہیں پا رہی تھی کہ وہ ابسام کی منگیتر تھی۔

''رشتہ سے جڑے ہونے کا احساس ہی میرے لیے بہت خوش کن ہے مومی۔ مجھے یہ بات اپنے آپ میں معتبر کرتی ہے کہ میں ابسام سے ایک رشتہ میں جڑی ہوں اور رشتہ ختم ہوگا تو مجھے دکھ ہوگا باوجود اس کے میں ابسام کے لیے وہ جذبہ محسوس نہیں کرتی جسے زمانہ محبت کہتا ہے مگر میرے لئے ہمارا رشتہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔'' نوائم ایک سادہ مزاج کی سیدھی سادی لڑکی تھی جھوٹی سچی باتیں اسے نہیں آتی تھیں وہ ہر بات ویسے کہہ گئی تھی جیسے کہ تھی۔ مومل چپ کی چپ رہ گئی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ وہ بات کیسے بھول گئی تھی کہ نوائم کے لیے اگر کچھ معنی رکھتا ہے تو وہ ہیں رشتے اور یہ رشتوں کا ہی احساس ہی تو تھا جو اس نے ایسا گھر والوں کی ایماء پر ایک لفظ کہے بنا ابسام سے منگنی کر لی تھی اور رشتوں کا احساس اسے دلانے کی کوشش کرتی وہ اسے عمیر سے شادی کرنے پر اکساتی رہتی تھی۔ جس لڑکی کے لئے رشتے اس قدر معنی رکھتے تھے اس سے یہ کہنا کہ منگنی ختم ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا یہ مومل کی حماقت ہی تو تھی۔

''اب تم مجھے بتاؤ گی کہ یہ سب پوچھ کیوں رہی تھیں؟'' نوائم اس کی خاموشی کو محسوس کرتی دھیمے سے پوچھ گئی تھی۔

''مجھے لگتا ہے کہ ابسام بھیا تمہیں پسند نہیں کرتے انہوں نے بھی صرف بڑوں کا فیصلہ پر سر جھکایا ہے۔'' اسے اب ان باتوں کو چھیڑنے کا کوئی ٹھوس جواز تو پیش کرنا ہی تھا اس لئے کچھ سوچ کر بولی تھی۔

''تمہیں ٹھیک لگتا ہے کیونکہ یہی سچ بھی ہے۔'' نوائم اپنی ازلی سادگی سے بولی تھی۔

''تمہارا دل نہیں کرتا تمہیں کوئی چاہے، تم سے محبت کا اظہار کرے اور تم تو ایک رشتے میں بندھی ہو اور ابسام بھیا خشک مزاجی کی انتہا پر رہتے ہیں۔ تمہیں نہیں لگتا کہ ان کے ساتھ تمہاری زندگی روکھی پھیکی سی گزرے گی۔'' وہ جو لیٹ چکی تھی مومل کی بات پر واپس اٹھ بیٹھی تھی۔

''ہاں! دل تو چاہتا ہے جیسے عبیر تمہیں چاہتا ہے، تمہارے لئے دیوانہ ہوا پھرتا ہے۔ میرے لئے بھی کوئی دیوانہ ہو، میری جستجو کرے مگر ابسام ایسے نہیں ہیں ان کا ایک اپنا ہی الگ مزاج ہے۔'' نوائم کے سرخ چہرے پر ننھی ننھی خواہشیں چمک رہی تھیں کہ چاہے جانے کی تمنا تو عورت کے دل میں ازل سے پنپتی رہتی ہے۔

''حیدر انکل اور پھپھو کو دیکھا ہے، کتنا ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر تو مجھے محبت پر اعتبار آنے لگتا ہے۔'' مومل خواب کی سی کیفیت میں بولی تھی۔ نوائم اس کی بات کو آگے بڑھا گئی تھی۔ ان لوگوں کے لئے حیدر اور فضہ کے درمیان کی اہم آہنگی اور محبت ہمیشہ سے متاثر کن رہی تھی۔

''تم ایسی زندگی گزار سکتی ہو اگر تم عبیر کی محبت کو سمجھو۔'' وہ جو فضہ اور حیدر صاحب کی زندگی پر رشک کر رہی تھی نوائم کی بات پر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''تم غلط سوچتی ہو نوائم کہ میں محبت سے خائف ہو یا انکاری ہوں۔ ایسا نہیں ہے میں محبت جیسے آفاقی جذبے پر ایمان رکھتی ہوں مگر یہ بھی سچ ہے کہ عبیر کے لئے میں کبھی محبت کو محسوس نہیں کر پائی۔'' مومل کے لہجہ میں بے چینی سی در آئی تھی وہ خود حیران تھی کہ ایسا کیوں تھا وہ عبیر کی بے پناہ چاہت کو کیوں محسوس نہیں کر پاتی تھی۔

''جب انسان کو بنا مانگے، بنا چاہت کے کوئی چیز میسر آ جاتی ہے تو انسان کو قدر نہیں ہوتی، تمہیں عبیر کی بے پناہ محبت کا ابھی احساس نہیں ہے وہ اگر کبھی تم سے دور چلا گیا نا تب تمہیں احساس ہوگا کہ اس کی محبت تو تمہارے لیے آکسیجن کا درجہ رکھتی تھی۔'' نوائم سنجیدگی سے بولی تھی کیونکہ اسے ہمیشہ یہی لگتا تھا کہ عبیر سے محبت مومل کو بھی ہے مگر اسے خود اس بات کا ادراک نہیں ہے اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ ادراک ہونے تک بہت دیر ہو جائے اس لئے جو مومل محسوس کرنے سے قاصر تھی وہ نوائم محسوس کرتی اس کوشش میں رہتی تھی کہ وہ محبت اس سے دور نہ جائے۔ نوائم کی بات پر اس کے اندر ایک ہلچل سی مچ گئی تھی مگر وہ اس ہلچل کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ نوائم تو اپنی سنا کر لیٹ گئی تھی اور کچھ دیر میں سو بھی گئی تھی مگر مومل بہت بے چین ہو چکی تھی۔ وہ کبھی آبدار کا سوچتی تو کبھی اسے نوائم کی بات یاد آنے لگتی۔

''نوائم بھی پاگل ہے، کچھ بھی کہہ دیتی ہے۔ عبیر کے کہیں جانے سے مجھے کیا فرق پڑے گا۔ کونسا مجھے اس سے محبت ہے۔ میرا بس چلے تو میں خود اسے اپنی زندگی سے غائب کر دوں مگر وہ تو میری زندگی میں گھسا ہی چلا آ رہا ہے۔ منگنی ہونے کو ہے ایک دن شادی بھی ہو جائے گی۔'' وہ کبھی مثبت، کبھی منفی سوچتی خود سے الجھتی نوائم کو کوستی، کبھی عبیر پر بگڑتی بالآخر سو ہی گئی تھی یہ جانے بغیر کہ نوائم کی بات درست

تھی۔۔۔سو فیصد درست۔

☆......☆......☆

''کیا بات کرنا چاہتی تھیں تم مجھ سے، جس کے لئے فوری ملنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔'' تقریباً ڈیڑھ دو ماہ بعد وہ دونوں آمنے سامنے تھے۔شاہ زیب ابھی مکمل طور پر اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔لفٹ کی مدد سے حاشر اسے وہیل چیئر پر بٹھا کر اس کے اپارٹمنٹ میں چھوڑ گیا تھا اور طے کردہ پروگرام کے تحت عریم کو کالج کے گیٹ سے حاشر نے پک کر لیا تھا اور وہ اسے شاہ زیب کے اپارٹمنٹ پر چھوڑ کر جا چکا تھا۔وہ اب آمنے سامنے تھے۔اسے وہیل چیئر پر دیکھ کر اس کے اندر کوئی جذبہ نہیں ابھرا تھا وہ جو اس کے ساتھ کر چکا تھا اس کے بعد وہ خود کو بہت مضبوط اور کسی حد تک بے حس بنا چکی تھی اور وہ اس کے زرد چہرے کو دیکھ کر مضطرب ہو چکا تھا مگر اسے اضطراب کو اپنی بے کلی کو وہ ہمیشہ کی طرح بے حسی میں ڈھال گیا تھا اور روکھے لہجے میں بولا تھا۔

''آپ جو کارنامہ سرانجام دے چکے ہیں اس کے بعد آپ سے ملنا بے حد ضروری ہو گیا تھا شاہ صاحب۔'' وہ اس کے روکھے لہجہ میں استفسار کرنے پر بے حد ترشی سے بولی تھی اور وہ اسے دیکھنے لگا۔وہ چہرہ سے ہی بیمار لگ رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں شاہ زیب کے لئے بے حد سرد تاثر تھا۔۔۔

''تو کیا محبت نہیں رہی تھی۔۔۔؟''

''میں تم پر تمام حقیقت واضح کر چکا۔۔۔ایسے میں تمہیں میرے کارنامے پر نہیں اپنے باپ کے کارنامے پر نظر رکھتے ہوئے مجھ تک جوابدہی کے بجائے اپنے باپ سے جواب دہی کرنا چاہیے تھی۔'' نازک مزاجی تو شاہ زیب پر ختم تھی وہ کہاں اس کا طنزیہ لہجہ برداشت کر پایا تھا اس سے زیادہ ترشی سے بولا تھا۔

''میرے مجرم میرے پاپا نہیں ہیں شاہ، میرے مجرم تو آپ ہیں۔۔۔''اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس کے سامنے بالکل نہیں روئے گی مگر آنسو بھل بھل بہنے لگے تھے۔

''میرے بابا تو آبشار اور کرنزئی کے مجرم ہیں، میرے قتل کی سازش تو آپ نے کی ہے، میری محبت کا تماشا بنایا ہے، میرے جذبات سے کھیلا ہے، نکاح کے نام پر میری نسوانیت کی توہین کی ہے، آپ ہیں میرے مجرم شاہ۔'' وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے بولتی چلی گئی تھی اور وہ لب بھینچے بیٹھا تھا۔وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی کہ محمود خان اس کی پھپھو آبشار اور کرنزئی کا مجرم تھا اور وہ خود بھی تو انتقام کی چاہ میں عریم محمود کا مجرم بن گیا تھا۔

''اپنا لیکچر بند کر لو۔'' وہ حد سے بڑھنے لگی تھی اسے آئینہ دکھا رہی تھی اس کی مکروہ شکل جیسے ہی آئینہ کی شفاف سطح پر ابھرنے لگی تھی وہ چیخ پڑا تھا اور وہ چلتی ہوئی عین اس کی وہیل چیئر کے سامنے چند قدم کی دوری پر آن ٹھہری تھی۔

''آپ کو نہیں اندازہ شاہ، میں نے آپ سے کتنی محبت کی ہے۔'' وہ بہتی آنکھوں سے اس کے سرد چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''نہ مجھے اندازہ ہے، نہ میں اندازے لگانا چاہتا ہوں۔'' وہ کچھ اس قدر کٹھور انداز میں بولا تھا کہ عریم کو اپنے شکوے بے معنی اور محبت سب سے بڑا جرم لگنے لگی تھی۔

''آپ کیوں اندازہ لگانا چاہیں گے؟ آپ کے لئے تو میں صرف ایک مہرہ تھی۔۔۔ چال چلی۔۔۔ بازی ہاتھ لگی اور مہرہ پٹ گیا۔'' وہ خود کو سنبھال کر سخت لہجہ میں بولی تھی اور وہ بے اختیار ہنس دیا تھا۔ اس کی ہنسی عریم کا مذاق اڑا رہی تھی اور وہ لب بھینچے خاموش کھڑی تھی۔

''جب سب کچھ تم سمجھ چکی ہو تو پھر آج یہاں ملنے کا کیا مطلب نکلتا ہے۔ کیوں اپنا اور میرا وقت ضائع کر رہی ہو عریم محمود۔۔۔'' وہ سنگدلی کی انتہاؤں پر تھا۔

''عریم محمود نہیں شاہ، عریم شاہ زیب اورکزئی کہیے۔'' وہ اس کی بات اچک کر بولی تھی اور وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیسا کرب تھا شاہ زیب اورکزئی نظر چرا گیا تھا۔

''نکاح کیا ہے آپ نے مجھ سے۔ میں ماں بننے والی ہوں اور آپ محمود خان سے انتقام لینے کے لئے ہمارے جائز رشتہ کو داغدار کر دینا چاہتے ہیں۔ جو ماضی میں محمود خان نے کیا وہ سب دہرا کر آپ محمود خان سے نہیں اپنی بیوی سے، اپنی اولاد سے بدلہ لے رہے ہیں۔۔۔ اور کس بات کا بدلہ شاہ، محبت کا بدلہ، محبت ہی تو کی بس آپ سے۔۔۔ بس اعتبار ہی تو کیا آپ پر۔۔۔ اس کی اتنی بڑی سزا کہ آپ مجھ سے سر اٹھا کر چلنے کا فخر تک چھین لینا چاہتے ہیں۔ محمود خان نے جو کیا اس کی سزا مجھے کیوں شاہ۔۔۔ مجھے کیوں۔۔۔'' وہ بلکتے ہوئے زمین پر گرتی چلی گئی تھی۔

''میں نے ایسا نہیں چاہا تھا مگر محمود خان سے بدلہ لینے کا مجھے کوئی دوسرا راستہ دکھائی ہی نہیں دیا اس لئے میں نے یہ راہ چنی۔ میں جانتا ہوں میں نے غلط کیا تھا۔، میں مجرم ہوں تمہارا۔ تم چاہو تو مجھے گالی دو، مجھے بیچ چوراہے پر کھڑا کر کے کوڑے مارو، میرے منہ پر تھوک دو عریم۔۔۔ مگر میں یہی کہوں گا کہ میں مجبور تھا۔ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ میری نیت میں مگر کوئی کھوٹ نہ تھا۔ ایسا ہوتا تو میں نکاح کا سہارا نہ لیتا۔'' وہ اس کی وہیل چیئر سے ایک انچ کے فاصلے پر بیٹھی سسک رہی تھی اور وہ نہایت بے چارگی سے بولتا چلا گیا تھا۔

''آپ پاپا سے صاف کہہ چکے ہیں کہ آپ ہمارے بچے کو اپنا نام نہیں دیں گے۔ آپ کی نیت صاف ہے تو کیوں آپ ایک جائز اولاد پر ناجائز کا ٹھپہ لگا دینا چاہتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ ماضی میں محمود خان نے اپنی ناجائز اولاد کو اپنا نام نہیں دیا تھا۔ آپ یہ بدلہ محمود خان سے لینا چاہتے ہیں یا اپنی اولاد سے۔۔۔؟'' وہ حلق کے بل چلائی تھی اسے شاہ زیب کی سوچ پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ کتنے آرام سے کہہ رہا تھا کہ وہ یہ سب کرنے پر مجبور تھا۔ کیا دوسروں کو مجبور کر دینے والے خود مجبور ہو سکتے ہیں۔۔۔؟

''میں نے محمود خان کو اسی اذیت سے گزارنے کو کیا جو بھی کیا، جس اذیت سے ہم برسوں گزرے۔ تمہارا وہ باپ جو گناہ کر کے بھی

دودھ کا دھلا رہا، جس نے ایک عورت کی زندگی تباہ کر کے خود خوشگوار زندگی گزاری، کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا اس عورت پر کیا بیتی۔ جب خود اپنی بیٹی پر بات آئی تو اسے اپنی ماضی کی غلطیاں یاد آ گئیں۔ وہ اور کزنی خاندان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ اگر اسے اپنی غلطی کا احساس خود سے ہوتا عریم تو باخدا میں اسے معاف کر دیتا مگر یوں تمہاری بدنامی کے ڈر سے وہ جو ہم تک معافی کی چاہ میں آیا ہے تو ہم اسے معاف نہیں کریں گے۔'' شاہ زیب اور کزنی کا انداز بے لچک تھا۔

''اسے خود سے اپنے گناہ کا احساس نہیں ہوا عریم اس لئے میں نے جو کیا میں خود کو حق بجانب سمجھتا ہوں۔ اب تم چاہے مجھے گالی دو یا کوسو، میں تمہیں نہیں روکوں گا۔'' وہ اس کو دیکھنے لگی تھی۔ جس انسان کے چہرے کو جب دیکھتی تھی، محبت رقص کرنے لگتی تھی آج اس کا ذہن ماؤف تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ساکت ہو جانے کو تھی۔ محبت کی اتنی بڑی سزا اسے ملی تھی کہ وہ تڑپ اٹھی تھی مگر اسے آہ بھرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔

''مجھے صرف اس بات کا جواب دیں کہ اس سب میں میرا کیا قصور تھا؟'' وہ پھر سسکی تھی۔

''تمہارا صرف اتنا قصور ہے کہ تم محمود خان کی بیٹی ہو۔'' وہ ترنت بے حسی سے بولا تھا۔

''جیسے برسوں آبشار اور کزنی کے ساتھ ساتھ اس سے وابستہ ہر ایک شخص سسک سسک کر جیا ہے ویسے ہی محمود خان کی جلائی آگ جس میں صرف خود وہ نہیں اس سے وابستہ ہر ایک انسان جلے گا۔'' وہ رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی تھی وہ اسے بہت شدت پسند لگتا تھا۔ وہ اسے سخت مزاج بھی لگتا تھا مگر آج اس کی گفتگو عروج پر تھی وہ اسے ایسی چٹان لگ رہا تھا جس سے ٹکرا کر اس کے وجود کو ریزہ ریزہ ہو جانا تھا۔ وہ نظر اس کے چہرے سے ہٹا گئی تھی کہ اس کے دل میں موجود محبت اب بھی زندہ تھی اور وہ اس شخص سے اب بھی نفرت نہیں کر پا رہی تھی۔

''تم گھر جاؤ عریم۔ بس یہ یاد رکھنا میں محمود خان کی نفرت میں اس سے انتقام لینے کو چاہے کسی بھی حد تک چلا جاؤں مگر میں نے تمہیں اپنا نام دیا ہے، تمہاری عزت میری عزت ہے، تم پر ایک حرف نہیں آئے گا۔'' وہ جو مرنے کو تھی وہ یکدم اسے زندگی کی نوید دے گیا تھا وہ بہت حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''میں نے تم سے محبت نہیں کی، صرف محبت کو مہرہ بنا کر تم تک رسائی حاصل کی تاکہ تمہارے ذریعے محمود خان کا غرور توڑ سکوں۔۔۔ اور میں اس میں ابھی مکمل کامیاب نہیں ہوا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا۔ اس کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی تک سنسنی دوڑ گئی تھی۔ وہ جو کچھ دیر پہلے زندگی محسوس کرنے لگی تھی وہ قطرہ قطرہ کر کے اس کے جسم سے زندگی نچوڑنے لگا تھا وہ اسے اپنے گھر والوں کے فیصلہ کو اپنے فیصلہ کی صورت سنا گیا تھا وہ اسے بتا گیا تھا کہ وہ اسی ہفتہ اسے رخصت کروا کر لے آئے گا مگر اس نے واضح کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اپنی تمام کشتیاں جلا کر آئے گی۔

''یہ مجھ پر ظلم ہے شاہ۔ میں اپنے پیرنٹس کو نہیں چھوڑنا چاہتی۔ میرے پاپا جیسے بھی ہیں میں ان سے محبت کرتی ہوں۔'' وہ اس کے

سنگدلانہ فیصلہ پر تڑپ اٹھی تھی۔اس نے احتجاج بلند کرنا چاہا تھا مگر نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔شاہ زیب نے اس کے سامنے چوائس رکھ دی تھی۔

''ایک ہفتہ ہے تمہارے پاس۔تم سوچ لو کہ تمہیں والدین چاہئیں یا شوہر۔کہ یاد رکھنا جس دن تمہیں رخصت کروا کر لاؤں گا۔اس دن کے بعد اپنے والدین کی صورت کو ترس جاؤ گی اور اگر والدین کا ساتھ چاہیے تو تم تب تک میرے نکاح میں رہو گی جب تک میری اولاد دنیا میں نہیں آجاتی میرا بچہ مجھے دے کر تم آزاد ہو جانا۔میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔'' وہ جیسے سارے فیصلے کر چکا تھا۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ زیب اور کرزئی کو دیکھ رہی تھی۔کیا کوئی اتنا بھی سنگدل ہو سکتا ہے؟

''مم۔۔۔مجھے۔۔۔طلا۔۔۔طلاق۔۔۔نہیں۔۔۔نہیں چاہئے۔'' وہ بے ربط ہوئی تھی۔

''میں نے یہ نہیں کہا عریم کہ میں تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔میں نے تمہیں چوائس دی ہے۔فیصلہ کا اختیار تمہارے پاس ہے۔'' وہ اس کے پر کتر کر بول رہا تھا کہ جاؤ اڑ جاؤ۔وہ اس کی ہر سانس کو آزار بنا کر بول رہا تھا جاؤ اپنی من چاہی زندگی جی لو۔

''یاد رکھنا عریم میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو ہر بات کا الزام عورت کے سر پر ڈال کر خود بری الزمہ ہو جاتے ہیں۔تم نے جس طرح مجھ سے نکاح کیا میں عام سی سوچ والا مرد ہوتا تو تمہیں اس بات کے لئے زیر عتاب لاسکتا تھا تمہیں ٹیز کر سکتا تھا مگر میں مانتا ہوں کہ اس حد تک تمہیں لانے والا میں ہوں۔تم نے جو کیا میری محبت میں کیا۔میں تمہیں کسی بات کا نہ الزام دے رہا ہوں نہ اس کی سزا۔تمہیں جو سزا مل رہی ہے، آگے ملے گی تو صرف اس لئے کہ تم محمود خان کی بیٹی ہو۔'' وہ صاف گوئی کی انتہا پر تھا وہ عریم کے کردار کو جانچ کر مطمئن تھا اس نے جو بازی کھیلی تھی بہت سوچ سمجھ کر کھیلی تھی۔

''آپ، آپ نے مجھ سے کبھی محبت نہیں کی؟'' وجانے کیا کہہ رہا تھا کہ وہ یکدم بول پڑی تھی اس کو یکدم ہی چپ لگ گئی تھی۔

''پلیز شاہ، بتایئے ناں، آپ نے جو کیا انتقام کے لیے کیا، تو کیا محبت کا صرف ڈرامہ تھا۔محبت درحقیقت تھی ہی نہیں۔'' وہ ایک انچ کا فاصلہ طے کر گئی تھی۔اس نے شاہ زیب کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔

''میں نے محبت نہیں کی عریم، مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا تھا۔

''شاہ، آپ کر سکتے ہی ایسی سنگدلی کا مظاہرہ کیونکہ آپ کے دل کو ابھی چوٹ نہیں لگی۔'' وہ اس کے سامنے یوں کھڑی تھی جیسے زندگی لٹا بیٹھی ہو اور یہی کہا جاتا کہ وہ زندگی گنوا بیٹھی ہے تو کون سا غلط ہوتا۔وہ جس انسان سے محبت کرتی تھی وہ محبت و اعتبار کے لائق نہ تھا اس سنگدل انسان کی بے مروتی کے آگے وہ شیشہ سی لڑکی اپنے اعتبار کی دھجیوں کے ساتھ ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔

''تقریر اچھی کر لیتی ہو۔'' وہ دھیمے سے ہنسا تھا وہ جانے عریم کا مذاق اڑا رہا تھا یا اپنا۔۔۔وہ جس کی ایک ہنسی پر قربان ہو جاتی تھی وہی ہنسی آج اسے اپنا مذاق اڑاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔اس کا دل کیا تھا کہ وہ شاہ زیب کی ہنسی پر بند باندھ دے لیکن کمبخت دل میں جو اس

سنگدل پتھر کے لئے محبت تھی وہ اسے ''ماشاءاللہ'' کہنے اور اس کی ہنسی کی عمر دراز ہونے کی دعا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''اور آپ بے حسی کا مظاہرہ اچھا کر لیتے ہیں۔'' وہ رخ موڑ کر بولی تھی۔

''میں کتنا بے حس ہوں، کس قدر سنگدل ہوں یہ ابھی صرف ٹریلر ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ میں کس حد تک جا سکتا تھا۔۔۔اور گیا نہیں اور جا سکتا ہوں۔۔۔۔اور جاؤں گا۔'' وہ سرد لہجہ میں بولا تھا۔ اس کا لہجہ ہر لطیف جذبے سے عاری تھا۔

''سوچ تو آپ بھی نہیں سکتے شاہ کہ میں نے آپ سے کتنی محبت کی، آپ کی محبت میں کس حد تک چلی گئی اور۔۔۔''

''تم کس حد تک گئیں یہ بات پرانی ہوئی ڈیئر، اب مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ تم میری محبت میں کس حد تک جا سکتی ہو۔ یہ میری سنگدگی اور تمہاری محبت کا مقابلہ ہے۔ بولو بازی لگانے کو تیار ہو۔'' وہ اس کی طرف پھر سے رخ موڑ گئی تھی اس نے چیلنج دینے والے انداز میں کہتے ہوئے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہ زیب اور کرزئی کے حسین چہرے پر نہ سمجھ آنے والے تاثرات تھے۔ آنکھوں میں چیلنج کی ایک عجیب لہر دوڑ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں واضح لکھا تھا وہ سب ختم کر دے گا۔ ضد و انتقام کی راہ میں فنا ہونا پڑا تو ہو جائے گا۔

''عشق کی بازی لگانے کو تیار ہوں شاہ۔۔۔لیکن۔۔۔'' وہ وہیل چیئر کے سامنے آن بیٹھی تھی اور اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی جب عریم نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ لڑکی جو ایک فاصلے سے ملتی تھی، نکاح کے بعد جب فاصلے مٹائے تھے تب اس کی خوشی تو کیا رضا تک شامل نہ تھی، وہ اس پر کتنا خفا ہوئی تھی اور اس نے خفگی مٹانے کے بجائے اپنے عمل کو اپنا حق جتا کر اسے تھپڑ دے مارا تھا اور وہ تب بھی کتنی بے یقین تھی۔۔۔ اور وہ جو کسی ذو معنی بات پر آگے سے کچھ کہنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔ جو فاصلے مٹنے کے بعد بھی ایک حد میں فاصلے پر رہی تھی۔ وہ آج آگے بڑھ کر خود اس کا ہاتھ تھام گئی تھی۔ وہ حیران نہ ہوتا تو حیرت کو بھی حیرت ہوتی۔ اس وقت تو اس کی حیرانگی بجا تھی۔ وہ حیرت میں ڈوب کر اسے دیکھتا ''لیکن'' پر اٹک چکا تھا۔ وہ یکدم اس کو دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔ ہاتھ اب بھی اس نے کسی صحیفہ کی مانند ہتھیلی میں مقید کیا ہوا تھا۔

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی

جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو پیا تیری

شاہ زیب کا ہاتھ عریم کی ہتھیلی میں قید تھا اس کے لب دھیمے سے ہلے تھے آنکھوں میں جذبے تمام تر سچائیوں کے ساتھ آن موجود ہوئے تھے۔ وہ اس کا چیلنج قبول کر گئی تھی۔ وہ آگے سے کچھ نہیں بولا تھا کہ اسے عریم کے جذبوں کی صداقت پر ایمان کی حد تک یقین تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔

''وقت سے پہلے کچھ نہ کہو عریم۔ زندگی اتنی میٹھی نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو'' وہ عریم کے حصار میں بندھنے لگا تھا۔ اس کے جذبے اسے اپنی طرف مائل کرنے لگے تھے اس لئے اس نے بے کلی اور خجالت کو غصہ کی چادر میں ڈھانپ دیا تھا۔

''محبت بھی اتنا کمزور جذبہ نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں شاہ۔آپ نے چاہے محبت کو انتقام کا مہرہ بنایا مگر میرے جذبے صادق ہیں۔ محبت سے پلٹنے کا میرے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرے صرف دل پر نہیں میرے تو روم روم میں آپ نقش ہو چکے۔آپ حرف غلط نہیں ہیں کہ میں مٹا ڈالوں۔آپ نے چاہے محبت نہیں کی مگر میں نے تو کی ہے۔جس محبت کے لئے میں نے اپنے والدین کے لئے رسوائی چن لی،اس محبت میں،میں بہت آگے جا چکی۔ واپس نہیں پلٹ سکتی شاہ۔کیونکہ محبت میرے لے منہ کا ذائقہ بدلنے کا نام نہیں ہے۔آپ دل سے ہو کر روح میں اتر گئے۔نکاح کے دو بولوں سے مجھ پر حق حاصل کر چکے،ایسے میں،مجھے کہیں نہیں جانا شاہ۔مجھے ہر بازی منظور ہے۔ جیتوں گی تو آپ کو پاؤں گی،ہاروں گی تو آپ کی رہوں گی۔''اس کی آنکھوں سے آنسو سیپ کے موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔اس کے لفظ،اس کی آنکھیں اس کے جذبوں کی صداقت کی امین بنی ہوئی تھیں۔شاہ زیب اسے دیکھ رہا تھا جو جس وقت آئی تھی اس کو دیکھ کر وہ ڈر گیا تھا کہ شکل سے ہی صدیوں کی بیمار لگ رہی تھی اور وہ اب اس سے جینے کا حق چھین لینے کے باوجود۔۔۔اسے تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔اسے خدشہ لاحق ہوا تھا کہ کہیں وہ ڈوب ہی نہ جائے اس لئے اس نے عریم کے حسین چہرے سے نگاہ ہٹالی تھی۔زردی میں گھلتی سرخی کو وہ تا دیر دیکھ نہیں پایا تھا اور اس نے حاشر کو کال کر دی تھی تاکہ وہ عریم کو اس کے گھر ڈراپ کر دے۔آگے جانے ان کی زندگی میں کیا ہونے والا تھا۔وہ ایک دوسرے کا چیلنج تو قبول کر چکے تھے۔ایک نفرت کا داعی تھا تو دوسری محبت کی پیامبر بنی ہوئی تھی۔ایک انتقام کی راہ پر چلتا فنا کے راستے پر جا رہا تھا تو دوسری اس انتقام کی بھینٹ چڑھنے کو بہ خوشی راضی تھی۔عریم جا چکی تھی وہ اب روم میں اکیلا رہ گیا تھا۔اس نے سگریٹ سلگا لی تھی۔وہ آگے کا لائحہ عمل تیار کر رہا تھا کہ اس نے کیسے عریم کو رخصت کروا کر لانا تھا۔وہ گھر والوں کا بھی سوچ رہا تھا کہ ان سب کو کیسے قابو کرنا ہے۔ماں جو اتنے غصہ میں ہے انہیں رام کرنا ہے۔وہ کوئی تیسری سگریٹ سلگا رہا تھا جب آئیکت چلا آیا تھا۔آئیکت سے اس کے تعلقات کبھی بھی اس قدر خوشگوار نہیں رہے تھے کہ وہ اس سے اپنے ذاتی معاملات ڈسکس کرتا مگر حالات نے انہیں قریب کر دیا تھا۔

ہم کو دل نے نہیں حالات نے نزدیک کیا
دھوپ میں دور سے ہر شخص شجر لگتا ہے

وہ آئیکت کو ہر بات پہلے بھی بتا چکا تھا اب اپنی نئی پلاننگ سے بھی اسے آگاہ کر رہا تھا۔حیرانی آئیکت کو بھی تھی کہ وہ اس پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے مگر وہ شاہ زیب کے ساتھ ہی مل کر بڑا ہوا تھا۔وہ شاہ زیب کو اچھے سے جانتا تھا۔اس کے علم میں تھا کہ شاہ زیب دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن ہے۔اس نے حیرت کو پس پشت ڈال کر شاہ زیب کے طے کردہ پروگرام پر اپنی رائے دی تھی۔ جہاں شاہ زیب کو مناسب لگا تھا وہاں اس نے تبدیلی کرتے ہوئے آئیکت کی بات رکھ لی تھی۔اس سارے پروگرام کو ترتیب دیتے ہوئے آئیکت کے پاس ابسام کی کال آنے لگی تھی اور ابسام کالنگ دیکھ کر اس کا ذہن آبدار کی طرف چلا گیا تھا۔اس نے شاہ زیب کو دیکھا تھا اور یک دم ہی

نئ بات ذہن میں آ گئی تھی مگر شاہ زیب سے کہتے ہوئے اسے جھجک بھی تھی۔ ڈر لگ رہا تھا کہ آبدار کے گھر سے غائب ہونے کے بعد شاہ زیب کو اسی پر شک تھا اب وہ خود سے یہ قبول کرتا کہ اس کا شک درست تھا تو ان کے بہتر ہوئے تعلقات واپس خراب ہو سکتے تھے۔ وہ پرسوچ انداز میں بیٹھا تھا۔ شاہ زیب اسے ٹوک گیا تھا۔ اس نے گھر چلنے کا کہا تھا۔ اسے آبدار کا خیال آیا تھا۔ آبدار سے کی کمٹمنٹ یاد آئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ وہ آبدار سے جو عہد کر چکا تھا وہ پورا کرنا اس وقت ناممکن تھا۔ وہ تو بس آبدار کو بہلانے کے لئے، اس کی شادی کو روکنے کے لئے وہ کر گیا تھا مگر اب وہ جھوٹا عہد، جس کے پورا کرنے کی اس کی استطاعت ہی نہ تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ شاہ زیب کے ذریعے پورا کروا سکتا ہے۔ آبدار کا خیال ایسا تھا کہ وہ اس کی بھلائی کے خیال سے، اس کے جانے کے خیال سے، شاہ زیب سے بات کرنے کا فیصلہ کر گیا تھا۔

''شاہ، میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ بتانا چاہتا ہوں۔'' وہ جو وہیل چیئر کو آگے بڑھا رہا تھا یکدم رک کر آئیکت کو دیکھنے لگا تھا۔

''ہاں بولو کیا بات کرنی ہے۔ کیا بتانا ہے۔'' وہ آئیکت کو دیکھنے لگا تھا۔ آئیکت کے چہرے پر کشمکش تھی وہ اسے بے حد پریشان لگ رہا تھا۔

''تم مجھ سے بلا جھجک کہہ سکتے ہو۔'' وہ اس کی ہچکچاہٹ محسوس کرتا دھیمے سے بول گیا تھا۔

''مجھے تمہاری ناراضگی، غصے کا ڈر ہے شاہ اور میں نہیں چاہتا کہ برسوں بعد جو ہمارے تعلقات میں اپنا پن لوٹ کر آیا ہے۔ وہ پھر کہیں گم ہو جائے۔'' آئیکت نے صاف گوئی کی انتہا کر دی تھی۔

''تم مجھ سے از خود ایک فاصلے پر چلے گئے تھے آئیکت، ورنہ تم میرے لئے ہمیشہ سے خود مجھ سے بھی بڑھ کر اہم و عزیز رہے ہو۔'' شاہ زیب جیسا سخت مزاج قدرے سنگدلانہ مزاج رکھنے والا انسان اگر ایسی بات کر رہا تھا تو یہ آئیکت کی خوش نصیبی تھی۔ وہ آگے سے کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔

''تم نے آبدار کے لئے مجھ سے ہی نہیں گھر کے ہر فرد سے دوریاں بنا لیں۔۔۔ اور کیا فائدہ ہوا وہ لڑکی تمہاری ناک کے نیچے سے اپنے یار کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی۔'' وہ دھیمے سے کہتا آخر میں نفرت سے پھنکارا تھا۔ آبدار کے لئے اس کے اندر ویسے ہی شدید نفرت بھری ہوئی تھی۔ آئیکت جیسے محسوس کرتا تشش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ بات کرے یا نہ کرے۔ پھر کچھ سوچ کر وہ شاہ زیب کو بتانے کا فیصلہ کر گیا تھا کہ وہ جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن تو یہ بات کھل ہی جانی تھی۔ جب بات پوشیدہ رہنی ہی نہیں تھی تو وہ موقع کو گنوا کر کم عقلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆......☆

''آپ دونوں یہاں سر جوڑ کر کون سے مذاکرات کر رہے ہیں۔'' وہ کچھ دیر قبل ہی رات کے کھانے سے فراغت کے بعد معمول کے مطابق نیوز سن رہا تھا جب آبدار نے آ کر اس سے موبائل فون مانگ لیا تھا کہ اسے آئیکت سے بات کرنی ہے۔ آبدار کو وہ موبائل فون

دیتا وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے اسٹڈی میں آ گیا تھا۔اسے حیدر صاحب سے آفس کے ایک مسئلہ کو ڈسکس کرنا تھا مگر وہ وہاں ماں کو دیکھ کر چونکا تھا اور شرارت سے بول گیا تھا۔

''تمہاری ماما کو یہ پریشانی لاحق ہوگئی ہے کہ جب آبدار یہاں چھپ کر رہ رہی ہے تو ایسے میں وہ پارٹی میں شریک ہوگی تو کسی نے اسے پہچان لیا تو نیا مسئلہ کھڑا ہوگا۔'' حیدر صاحب جو بیٹے کو بلانے کا سوچ رہے تھے اس کے خود چلے آنے پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے دھیمے سے کہہ گئے تھے۔

''ماما کہہ تو ٹھیک ہی رہی ہیں۔'' ابسام پل بھر کی خاموشی کے بعد بولا تھا۔

''مگر سمجھ نہیں آ رہا کہ آبدار کو کیا کہہ کر گھر میں چھوڑا جائے کہ تم تو جانتے ہو اماں وغیرہ سب ہی موجود ہیں اور آبدار اپنے نیک اطوار کے باعث اماں کی گڈ لسٹ میں بھی آ چکی ہے اس لئے بہانہ تو کوئی نہیں سنیں گی۔'' فضہ حیدر دھیمے سے بولی تھیں کہ ان کے گھر والے تقریباً کوئی دس دن سے تو آئے ہوئے تھے آبدار ان سب کو ہی اچھی لگی تھی۔کم گو سی بے حد حسین آبدار جو صرف اپنے کام سے کام رکھتی تھی وہ حاجرہ بیگم کو اچھی لگنے لگی تھی۔وہ سب آبدار کو فضہ حیدر کی دوست کی بیٹی کی حیثیت سے جانتے تھے اسی لحاظ سے اہمیت بھی دے رہے تھے۔

''آپ ایسا کریں آبدار سے بات کریں۔انہیں سمجھا دیں کہ وہ عین وقت پر بیماری کا بہانہ کر دیں۔'' ابسام حیدر نے ایک حل پیش کیا تھا۔

''میں اماں کو اچھے سے جانتی ہوں وہ بیماری کی حالت میں آبدار کو کبھی اکیلے چھوڑ جانے کے بارے میں سوچیں گی بھی نہیں۔'' وہ بیٹے کا حل مسترد کر گئی تھیں۔

''تم ایسا کرو کہ آئیکت سے بات کرو، اس کو اگر آبدار کے پارٹی میں شرکت کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا تو ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہے اور اسے اعتراض ہوگا تو وہ از خود کوئی مناسب حل بھی پیش کر دے گا۔'' حیدر صاحب نے بحث سمیٹ دی تھی۔وہ آگے سے کچھ کہے بغیر اسٹڈی سے نکل آیا تھا آفس کا مسئلہ اس نے آفس میں ہی ڈسکس کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ آبدار اس کے سامنے آ گئی۔

''ہوگئی آپ کی بات۔۔۔'' اس نے سیل فون لیتے ہوئے پوچھا تھا۔''آئیکت شاید بے حد مصروف ہیں انہوں نے کال ریسیو ہی نہیں کی۔'' اس نے دھیمے سے جواب دیا تھا۔

''آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں۔سب خیریت تو ہے۔'' اس کے چہرے پر نظر پڑی تھی وہ چہرے سے ہی پریشان لگ رہی تھی اس لئے ابسام دھیمے لہجے میں نرمی سے پوچھ گیا تھا۔

''انکل آنٹی کی ویڈنگ اینورسری قریب آ رہی ہے۔میں یہ سوچ کر پریشان ہوں کہ میں شرکت نہیں کر سکتی اور آپ کی نانو وغیرہ کو شرکت نہ کرنے کا کیا جواز پیش کروں گی۔'' وہ بڑی سہولت سے اپنی پریشانی اس سے کہہ گئی تھی۔

''آپ آئیکت سے اسی سلسلے میں بات کرنا چاہتی تھیں۔'' وہ ایک گہری سانس بھر کر بولا تھا۔ وہ دونوں مومل کی موجودگی سے انجان بات کر رہے تھے جبکہ مومل لاؤنج میں داخلی دیوار سے ٹیک لگائے ہر عضو کو کان بنائے ان دونوں کی جانب متوجہ تھی۔

''جی، میں چاہ رہی تھی کہ آئیکت سے میری بات ہو جائے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ یہاں آپ لوگوں پر بوجھ بن کر رہتے کتنے ہی ماہ ہو گئے ہیں۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو کسی قسم کی پریشانی ہو، اس سے پہلے ہی مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے۔'' وہ آزردگی سے بولی تھی اور مومل کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

''آپ ایسا کچھ مت کہیں آبدار، آپ میرے دوست کی کزن ہیں، آپ ہم پر بوجھ نہیں ہیں یہ گھر آپ کا بھی ہے۔ آپ جب تک رہنا چاہیں یہاں رہ سکتی ہیں۔'' وہ ترنت سادگی سے بولا تھا اس بات سے انجان کہ مومل ان کی باتیں سن رہی ہے اور وہ دوست کی کزن پر بری طرح ٹھٹک چکی تھی۔

''یہ میرا گھر ہے نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ یہ عارضی ٹھکانہ ایک نہ ایک دن میں نے چھوڑ کر جانا ہے۔ اس لئے میں آپ سب لوگوں کے لئے مشکل ثابت ہونے سے قبل ہی یہاں سے چلی جانا چاہتی ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے تھے۔ وہ اس گھر کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر وہ یہاں رہنے کا حق نہیں رکھتی تھی وہ مہمان تھی اور مہمانوں کو ایک دن رخصت ہونا ہی پڑتا ہے۔

''آپ اس طرح مت بولیں آبدار۔ یقین رکھیں ہمیں آپ کے یہاں رہنے سے کوئی تکلیف نہیں ہے۔'' وہ اس کے لہجہ میں نمی محسوس کرتا بے چارگی سے بولا تھا۔ نظر اس کے چہرے پر پڑی تھی جو ضبط سے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ وہ جذبہ جو کسی کے لئے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا وہ جذبہ آبدار کے لئے محسوس کرنے لگا تھا مگر لب پر اظہار نہیں لا سکتا تھا۔

''آئیکت آپکی بہت مانتے ہیں آپ پلیز ان سے کہیں وہ مجھے یہاں سے لے جائیں۔ آپ آئیکت سے کہہ دیں کہ آپ مجھے اپنے گھر میں مزید نہیں رکھ سکتے۔'' وہ اسے امید بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں آئیکت سے ایسے نہیں کہہ سکتا۔'' وہ قدرے ناگواری سے بولا تھا۔

''پلیز، میری خاطر کہہ دیں ابسام۔ میں یہاں مزید نہیں رہنا چاہتی۔ اگر چند دن اور یہاں رہی تو میں مر جاؤں گی۔'' اس کا لہجہ شدت غم سے لرز رہا تھا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ نوائم کے وجود سے خائف تھی۔ وہ نوائم کو ابسام کے آس پاس دیکھ کر شدید تکلیف سے دوچار تھی اور اسی ضمن میں وہ یہاں مزید رہنے سے خائف تھی۔ وہ روتی ہوئی وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی جبکہ ابسام وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ مومل بے حد الجھ چکی تھی۔ وہ اس مسٹری کو سولو کرنے کا مصمم ارادہ کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

آج کی رات آبدار پر ہی نہیں ابسام پر بھی بھاری تھی۔ وہ رو رہی تھی اور ابسام اس کی آنکھوں میں آج اپنا واضح عکس دیکھ لینے کے بعد سکون سے سو نہیں پا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتا اور چھم سے آبدار کا سراپا آنکھوں میں آسماتا۔ وہ بے کل ہوتا بستر سے نکل آیا تھا۔

''آبدار! آپ خود تو سراب کے پیچھے بھاگ ہی رہی ہیں۔ مجھے بھی گھسیٹ رہی ہیں۔ میں آپ کی محبت کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آپ اپنے اور میرے لیے خدارا خسارہ نہ چنیے۔''اس نے پھٹتے سر کو انگلیوں سے دباتے ہوئے آبدار کو مخاطب کرتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

ابھی وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت سے واپسی کا کوئی راستہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ محبت تو ایک دائرہ کی مانند ہے چلتے جاؤ، چلتے جاؤ اور گھوم پھر کر ایک ہی مقام پر آ کر ٹھہر جاؤ اور یہ جو مقام محبت ہوتا ہے یہ کبھی سفر نہیں کرتا۔ انسان اس کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو کر خوب بھٹکتا ہے اور جب اس کو لگتا ہے کہ اس کا سفر تمام ہوا تو وہ دائرہ کی نئی سمت پر کھڑے ہونے کے باوجود پرانی سمت کے سحر میں ہی گرفتار ہوتا ہے کہ محبت کے حصار سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے اور محبت کا خسارہ بھی نفع کی مانند ہوتا ہے۔

''ابسام! بہت محبت کرنے لگی ہوں آپ سے۔ جب سے آپ کی منگیتر آئی ہے۔ اس کا آپ کے آس پاس ہونے کا خیال ہی مجھے مضطرب کر دیتا ہے۔ میرے سینے میں میرا سانس گھٹنے لگتا ہے۔ کبھی جو آپ اس کے ہو گئے تو میرا دم سچ میں گھٹ جائے گا۔ کیوں مجھے آپ سے محبت ہو گئی۔'' وہ کمرے میں چکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں میری محبت کے نصیب میں صرف خسارے درج ہیں مگر خود کو آپ سے محبت کرنے سے روک نہیں سکتی۔ مگر میں اب مزید یہاں رہ بھی نہیں سکتی۔ میں نہیں چاہتی کہ نوائم پر رشک کرتی میں اس سے نفرت کے لئے خود کو مجبور پاتی۔ اس کو کچھ کہہ بیٹھوں۔ اور آپ جو میری محبت سمجھنے سے قاصر ہیں، مجھ سے کم از کم ہمدردی تو رکھتے ہیں۔ یکدم خود کو مجھ سے نفرت پر مجبور نہ پانے لگیں اس لئے میرا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔'' وہ ابسام کو دل ہی دل میں مخاطب کر کے اپنی سوچ بیان کرتی مصمم ارادہ باندھ رہی تھی۔ وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ جلد ہی اس کو یہاں سے واپسی کا اذن ملنے والا ہے مگر اذن رخصت ملنے پر بھی وہ تڑپ ہی جائے گی۔

☆......☆......☆

کبیر عباسی نے عقیل احمد سے بات کی تھی انہیں سادگی سے منگنی کرنے اعتراض ہوا تھا مگر سب نے جب مل بیٹھ کر ان کی بات پر غور کیا تھا تو کسی کو اعتراض نہیں ہوا تھا۔ کبیر عباسی نے ان لوگوں کو واپسی کا بھی بتا دیا تھا۔ اس پر بھی ان میں سے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ عقیل صاحب اتنا ہی بولے تھے۔

''عبیر جو چاہے فیصلہ کرے میں نے اسے بیٹی دینے کا سوچ لیا ہے۔ مجھے اس پر بھروسہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ چاہے پاکستان میں رہے یا ڈنمارک میں وہ میری بیٹی کو بے حد خوش رکھے گا۔'' عقیل صاحب کے بھروسہ پر کبیر عباسی بے حد مطمئن ہو گئے تھے۔ اگلے دن ہی مومل کے ہاتھ میں عبیر عباسی کے نام کی انگوٹھی سج گئی تھی وہ چپ تھی۔ وہ اپنے جذبوں کو سمجھنے سے قاصر تھی مگر عبیر بے حد خوش تھا۔ عبیر نے مومل کے ہاتھ میں انگوٹھی خود پہنائی تھی۔ اس کے ہر انداز سے مومل کے لئے چاہت ٹپک رہی تھی اور وہ سب اپنے فیصلہ پر خود کو مطمئن پا رہے تھے۔ انگوٹھی پہنانے کی رسم کے بعد کھانا لگ گیا تھا۔ کبیر عباسی کی نظر پھر رہ رہ کر آبدار پر اٹھ رہی تھی۔ عبیر، باپ کی بے کلی کو محسوس کر گیا

تھا۔اس نے آبدار سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اوراس کی خوش قسمتی کہ وہ جو مول کی تلاش میں لان تک آیا تھا اس کی نظر ٹیرس کو جاتی سیڑھیوں پر بیٹھی آبدار پر پڑی تھی اور وہ اس تک چلا آیا تھا۔

''آپ یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہیں۔'' وہ جو کسی گہری سوچ میں تھی چونک اٹھی تھی سامنے ہی عبیر عباسی کھڑا مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بولی کچھ نہیں تھی وہ۔۔۔ یہ نہیں کہہ پائی تھی کہ اس نے کچھ دیر قبل نوائم اور ابسام کو ساتھ تصاویر بنواتے دیکھا تھا اور یہ اس سے برداشت نہیں ہوا تھا اس لئے وہ یہاں آن بیٹھی تھی۔

''یقیناً آپ کو اپنے گھر والے یاد آرہے ہیں۔'' اس نے دوستانہ انداز میں کہا تھا وہ اسے دیکھنے لگی تھی اسے یکدم عبیر سے گھبراہٹ محسوس ہوئی تھی۔ وہ فضول میں فری ہونے کی کوشش کررہا تھا۔

''نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' اسے چاہے عبیر کا بات کرنا برا لگ رہا تھا مگر اسے اپنی خاموشی خود بری لگی تھی اس لئے وہ جواب دے گئی تھی۔

''ویسے آپ نے کبھی بتایا نہیں آپ کے گھر میں کون کون ہے۔'' وہ بے تکلفی سے بولا تھا اس نے لب بھینچ لئے تھے۔

''آپ کو شاید میرا آپ سے بات کرنا اچھا نہیں لگا۔ بس میری کوئی بہن نہیں ہے آپ کو دیکھا تو لگا جیسے مجھے بہن مل گئی اس لئے میں آپ سے بات کرنے آن پہنچا مگر آپ کو برا لگا ہے اس لئے معافی چاہتا ہوں۔'' مول اسے ڈرامہ باز کہا کرتی تھی اور وہ اس وقت اسے سن لیتی تو خود اسے اپنی بات پر ایمان آجاتا۔ عبیر کچھ یوں بولا تھا کہ آبدار شرمندہ ہوگئی تھی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے آپ کا بات کرنا برا نہیں لگا۔'' وہ رشتوں کی ترسی ہوئی تھی اس کے بہن کہنے پر وہ فوراً ہی نرم پڑتی جذبات کی رو میں بہنے لگی تھی اور وہ لوہا گرم دیکھ کر مزید اپنائیت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ اسے اپنی بہن بنا گیا تھا۔

''آپ نے بتایا نہیں آپ کے گھر میں کون کون ہے، آپ کی ماما کیا کرتی ہیں۔'' وہ جذباتی مظاہرہ کرنے کے بعد اپنے مطلب کی بات پر آگیا تھا جبکہ وہ اس موضوع پر آکر چپ ہوگئی تھی وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کا کوئی نہیں ہے۔ جنہیں اپنا سمجھا تھا ان سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس کا تو اپنی پیدا کرنے والی ماں سے بھی شاید کوئی رشتہ نہ تھا۔ وہ ایکدم خاموش ہوگئی تھی۔

''مجھے شاید آنٹی بلا رہی ہیں۔'' وہ بڑی تیزی میں وہاں سے نکل گئی تھی اور وہ جو گھر والوں کے ذکر پر ہی اس کی پریشانی کو بھانپ گیا تھا اس کے یوں جانے پر عبیر کے ذہن میں کئی سوال جنم لے چکے تھے۔ وہ پلٹا تھا تو نظر غصہ سے اسے ہی دیکھتی مول پر پڑی تھی۔ چونکہ باقاعدہ کوئی تقریب نہیں ہوئی تھی اس لئے مول نے کوئی خاص تیاری نہ کی تھی کہ ویسے بھی اسے بننے سنورنے کا شوق نہ تھا۔ وہ اس وقت مہندی گرین کلر کے سوٹ میں لائٹ سے میک اپ کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھی۔

''اتنی ظالم نظروں سے کیوں دیکھ رہی ہے میری اکلوتی منگیتر صاحبہ۔'' مول اس کے سامنے ہوا اور اس کی رگ ظرافت نہ پھڑ کے، وہ

اسے تنگ نہ کرے ایسا تو اس عہد میں ممکن ہی نہ تھا۔

''تم آبدار سے کیا بات کر رہے تھے۔'' وہ غصہ سے پوچھ گئی تھی۔

''اللہ اللہ، مجھے پتہ ہوتا کہ تم رشتہ میں بندھنے کے ساتھ ہی میرے لئے پوزیسو ہو جاؤ گی تو قسم سے میں یہ منگنی کب کی کروا چکا ہوتا۔'' وہ آنکھوں میں شوخی لئے اسے دیکھ رہا تھا اس کے ہر انداز سے شرارت عیاں تھی۔

''بکواس مت کرو۔'' وہ یکدم ہی جھینپ گئی تھی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ وہ عبیر کی کسی بات پر حیا سے سرخ پڑ گئی ہو۔ وہ آنکھوں میں شوق کا ایک جہاں آباد کئے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' جذبات سے چور لہجہ میں بولا تھا۔

''تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔'' وہ بری طرح چڑ کر جانے لگی تھی۔

''میں آبدار سے ان کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ ان کی فیملی میں کون کون ہے وغیرہ۔'' اس کو خفا ہو کر جاتے دیکھ کر وہ ترنت سچ بول گیا تھا وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''کیوں۔ تمہیں کیوں اس میں اتنی دلچسپی محسوس ہو رہی رہے۔'' وہ ابرو چڑھا کر بولی تھی۔

''دلچسپی تو واقعی ہو رہی ہے وہ ہے بھی تو کتنی حسین۔'' وہ شرارت سے اسے چھیڑنے لگا تھا کہ وہ فاصلہ طے کرتی اس کے عین سامنے آن رکی تھی۔

''میں سب کچھ معاف کر سکتی ہوں عبیر لیکن بے وفائی نہیں۔ ہرجائی پن نہیں۔ یاد رکھنا۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا وہ تو جیسے مرنے مارنے پر تل آئی تھی۔

''میں تو صرف مذاق کر رہا تھا۔'' وہ مومل کو سنجیدہ ہوتے دیکھ کر خود بھی مذاق برطرف کر گیا تھا۔

''مجھے ایسا مذاق، مذاق میں بھی پسند نہیں ہے۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی عبیر، نہ ہی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی تو تم سے جھوٹ بول سکتی تھی کہ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں مگر میں نے جھوٹ نہیں کہا۔ مجھے بے ایمانی پسند نہیں ہے اور میں بے وفائی نہ کرتی ہوں نہ ہی برداشت کر سکتی ہوں اس لئے آئندہ مذاق میں بھی ایسا کچھ مت کہنا کہ ہمارے رشتہ پر اثر پڑے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی تھی۔

''تم بھی یہ یاد رکھنا کہ عبیر عباسی اپنے ساتھ تو بے وفائی کر سکتا ہے مگر مومل احمد کے ساتھ نہیں۔ تم میری محبت، میری زندگی ہو۔ میں تمہیں دھوکہ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔'' وہ مومل سے زیادہ گہری سنجیدگی سے کہہ گیا تھا اور وہ جاتی کہ وہ آبدار سے بات کرنے کی وجہ بیان کر گیا تھا۔ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''پاپا کو آبدار میں آبشار آنٹی کی مشابہت لگی ہے بس اس لئے میں آبدار سے بات کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ جواب دیئے بغیر ہی چلی گئی۔''

وہ مومل کو باپ سے ہوئی ہر بات بتا گیا تھا۔

''تم آبدار سے بات کرنا، کیا پتہ پاپا کا شک درست ہو۔'' اس نے مومل سے کچھ نہیں چھپایا تھا وہ ہی اس کی مددگار ثابت ہو سکتی تھی اور وہ مومل سے محبت کرتا تھا ایک رشتہ میں بندھ چکا تھا اس لئے اسے اپنی اور اپنے باپ کی کوئی بھی بات اس سے شیئر کرنا ہرگز بھی معیوب نہیں لگا تھا۔

''آبدار تو مجھے بھی ایک عجیب پہیلی لگتی ہے۔'' وہ دھیمے سے بولی تھی۔ مومل تو اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے راز سے واقف ہو چکی تھی اس راز محبت سے جو اس نے ابھی تک اپنے محبوب سے بھی نہیں کہا تھا اور تو اور مومل پر یہ عقدہ بھی کھل گیا تھا کہ آبدار اس کی پھپھو کی دوست کی بیٹی نہیں ابسام کے دوست کی کزن ہے۔ بس ابھی اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ اس کی پھپھو نے جھوٹ کیوں کہا تھا۔ آبدار کے اس گھر میں رہنے کے پیچھے کیا راز تھا۔ وہ تو خود تجسس میں تھی اور اس کے تجسس میں عمیر عباسی نے گرانقدر اضافہ کر ڈالا تھا۔

''تم نے اس پہیلی کو بوجھنا ہے مومل۔ میں تو چاہوں بھی تو آبدار سے زیادہ بات نہیں کر سکتا۔ آبدار کو بھی برا لگے گا اور تم بھی شک کا شکار ہو گی اس لئے تم ہی آبدار سے دوستی کر کے مسئلہ کا حل نکال لو۔'' وہ زیادہ دیر سنجیدہ رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

''مجھے کوئی ضرورت نہیں پڑی شک کا شکار ہونے کی۔'' وہ اسے گھورتی آگے بڑھ گئی تھی اور وہ ہنستا ہوا اس کے ہمقدم ہو گیا تھا۔ سرگوشی میں اس کی تعریف کی تھی اور وہ سرخ پڑتی تیز قدم اٹھاتی اندر بڑھ گئی تھی۔ عمیر عباسی آج بے حد خوش تھا اور آبدار والا معاملہ مومل سے کہہ کر اس کی ذمہ داری لگانے کے بعد کافی مطمئن ہو گیا تھا مگر مومل کو شامل کرنے کی بات اس نے فی الحال باپ سے پوشیدہ رکھنے کا سوچا تھا۔ وہ مومل کی طرف سے ملنے والی اطلاعات کے بعد باپ کو بتانے کا سوچتا خود کو کسی حد تک پرسکون محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

''تم بتاتی کیوں نہیں ہو عرمی۔ تمہاری شاہ زیب اور کزئی سے آخر کیا بات ہوئی؟'' نتاشہ کے علم میں تھا وہ شاہ زیب سے ملنے جا رہی ہے انہوں نے ہی ڈرائیور کو کہا تھا اور ڈرائیور نے عریم کو کالج کے گیٹ پر اتار دیا تھا جہاں سے حاشر نے اسے پک کر لیا تھا اور واپسی میں وہ گھر تک ڈراپ کر گیا تھا۔ اسے واپس آئے تقریباً سات گھنٹے ہو گئے تھے اور وہ ہنوز چپ تھی اس لئے وہ خود ہی پوچھ گئی تھیں کہ ہرگز رتا دن انہیں مضطرب کر رہا تھا۔

''ماما۔ کچھ بتانے کے لئے بچا ہی نہیں ہے۔'' اس کے آنسو گرنے لگے تھے اور وہ مزید پریشان ہو گئی تھیں۔

''کیا شاہ زیب نے رخصتی سے انکار کر دیا ہے؟'' وہ ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھ رہی تھیں اور اس نے شاہ زیب سے ہوئی ہر بات ماں کے گوش گزار کر دی تھی۔

''تم شاہ زیب کو کال کر کے کہہ دو وہ تمہیں رخصت کر کے لے جائے۔ ہمیں اس کی ہر شرط منظور ہے۔'' وہ ماں کو حیرانگی سے دیکھنے لگی تھی۔

''ماما۔شاہ کی شرط کیسے مان سکتے ہیں۔شاہ کا غصہ بہت خطرناک ہے ماما۔وہ مجھے پھر کبھی آپ سے ملنے نہیں دیں گے۔''اسے کہاں امید تھی کہ نتاشہ اتنی آرام سے شاہ زیب کی شرط مان لیں گی۔

''عزت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا عریم۔تم پہلے ہی اپنی اور خاندان کی عزت روند چکی ہو۔مزید تماشہ مت بنواؤ۔شاہ زیب سے کہہ دو کہ وہ آ کر تمہیں لے جائے۔''وہ آنسو ضبط کرتے ہوئے بے بسی سے بولی تھیں۔

''ماما۔۔۔آپ مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگی ہیں کہ چاہتی ہیں کہ میں ہمیشہ کے لئے آپ کی نگاہ سے دور ہو جاؤں۔''وہ سسکنے لگی تھی۔

''ماں اپنی اولاد سے کبھی نفرت نہیں کر سکتی،تم پر غصہ ہے مجھے مگر تم سے نفرت نہیں ہو رہی۔اور میں شاہ زیب کی شرط تم سے جان چھڑانے کے لئے نہیں،تمہاری عزت کے لئے ماننا چاہتی ہوں۔''وہ اب باقاعدہ روتے ہوئے بول رہی تھیں۔

''بیٹیوں کا ایک مضبوط قدم ماں باپ کا سر فخر سے بلند کر دیتا ہے اور ایک کمزور قدم ماں باپ کا سر نیچا کروا دیتا ہے۔۔۔اور ہمارا سر تمہارے ایک کمزور قدم نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جھکا دیا ہے۔ہم چاہیں بھی تو سر نہیں اٹھا سکتے۔''نتاشہ دکھ سے بول رہی تھیں اور وہ ندامت سے سر جھکا گئی تھی کچھ بولنے لائق ہی نہیں رہی تھی۔

''شاہ زیب کے حکم کے آگے اب ہم کٹھ پتلیاں ہیں وہ جیسے چاہے ہمیں نچائے۔۔۔ہم اپنی عزت کا بھرم قائم رکھنے کے لئے اس کے حکم کے آگے ناچیں گے اور اس کے لئے تم نے ہمیں مجبور کیا ہے عریم۔تم ہمارا غرور تھیں،تم نے وہ توڑ ڈالا۔''وہ بری طرح رو رہی تھیں۔

''ماما۔مجھے معاف کر دیں پلیز۔۔۔میں شاہ کی محبت میں اندھی ہو گئی تھی۔''وہ ماں کے پیر پکڑے بری طرح رو رہی تھی۔

''محبت کچھ بھی نہیں ہوتی،یہ محض ایک دھوکا ہے اور تم اس دھوکے میں آ کر ہمارے سروں پر خاک مل گئی ہو۔''وہ ہچکیوں سے روتیں بیٹی کو پرے دھکیل گئی تھیں۔

''اگر تم شاہ زیب کی باتوں میں نہ آتیں تو میں آج اتنی مجبور نہ ہوتی۔میری پرورش میں میری تربیت میں کیا کمی رہ گئی تھی کہ تم اتنی اندھی ہو گئیں کہ چھپ کر نکاح کر بیٹھیں اور آج مجھے کہتی ہو کہ معاف کر دوں۔تو کیسے کروں معاف۔تم باپ بیٹی نے مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا ہے۔''نتاشہ دکھ سے بول رہی تھیں کب سے ان دونوں ماں بیٹی کی بات سنتے محمود خان کی نظر بیوی سے ٹکرائی تھی اور وہ اندر چلے آئے تھے۔کچھ دیر خاموشی کے بعد نتاشہ نے شاہ زیب اور کرنزئی کی شرط ان کے سامنے رکھ دی تھی اور وہ چپ کے چپ رہ گئے تھے۔ان کا ماضی یکدم ہی یوں عیاں ہوا تھا کہ وہ بیٹی کے قدم پر اسے لعن طعن کرنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔اور سر جھکا کر نڈھال سے انداز میں وہی فیصلہ لے گئے تھے جو ان کی اہلیہ نے لیا تھا۔

''پاپا۔مجھے معاف کر دیں۔''وہ روتی ہوئی باپ کے سامنے ہاتھ جوڑ گئی تھی۔

''معاف تو تم مجھے کر دو کہ آج تم جس مقام پر ہو سب میں ہوں۔میرا داغدار ماضی میری بیٹی کا حال تباہ کر گیا ہے۔''ان کی آنکھوں

سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''آپ اس کی تباہی کا سبب نہیں ہیں۔ یہ اپنی تباہی کی آپ ذمہ دار ہے۔'' نتاشہ کی مداخلت پر وہ باپ بیٹی انہیں دیکھنے لگے تھے۔

''شاہ زیب اور کزئی انتقام کی راہ پر چلتا آپ کی بیٹی کو اٹھا کر لے جاتا تو آپ سبب ہوتے محمود، جبکہ یہ اس کے ساتھ خود اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اس نے اپنے لئے خسارے خود چنے ہیں۔'' نتاشہ بے رحمی کی حد تک سچ سے کام لے رہی تھیں۔ کیونکہ انہیں تمام حالات اور واقعات میں اپنی بیٹی بے قصور نہیں لگ رہی تھی۔

''شاہ زیب آپ کی بیٹی کو مہرہ بنا کر داغدار کرتا تو ہاں میں کہتی میری بیٹی معصوم بے قصور ہے۔ اسے اپنے باپ کے کیئے کی سزا مل رہی ہے۔ جب یہ خود چل کر شاہ زیب اور کزئی کے پاس گئی، اس سے نکاح کیا تو کس بنیاد پر اسے بے قصور کہوں۔ یہ ہماری عزت کی امین تھی اور اس نے ہمارے سروں پر خاک مل دی۔ میں اس کے لیے اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بیٹیاں اتنے کمزور کردار کی ہوں تو ماؤں پر بھی حرف آتا ہے۔ اس نے میری تربیت کو گالی دی ہے اور میں اس کے لئے اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' نتاشہ نے شوہر کی ہر غلط بات، ہر غلط رویہ صرف اپنے گھر کو بچانے کے لئے ماں کی تربیت کی لاج رکھنے کے لئے برداشت کیا تھا۔ وہ ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں جہاں کردار و عزت کو ہر شے پر فوقیت دی جاتی تھی۔ ان کی ماں کی تربیت تھی کہ شوہر کی گالی بھی ہنس کر سہنا اف نہ کرنا۔۔۔اور انہوں نے کردارکشی تک برداشت کر لی تھی۔ چادر اور چاردیواری کے لئے۔۔۔اور ان کی بیٹی محبت کے حصول کے لیے چاردیواری عبور کر گئی تھی۔ ان کی تربیت کو گالی بنا دیا تھا۔ ایسے میں وہ اسے معاف نہیں کر سکتی تھیں۔

''ماما۔۔!''

''کچھ مت کہو۔ شاہ زیب کے ساتھ رخصت ہونے کی تیاری کرو۔'' وہ بیٹی کو ٹوک گئی تھیں۔ محمود خان بیوی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''شاہ زیب کو آج ہی کال کر کے کہہ دو وہ آ کر مجھ سے ملے، جو شرط رکھنی ہے رکھے مگر تمہیں رخصت کرا کے لے جائے۔'' وہ بیٹی سے کہتیں نکلتی چلی گئی تھیں۔ عریم کو لگا تھا کہ وہ ایک غلط قدم کے باعث بے سائبان ہو گئی ہے۔ ماں کی دعا، باپ کا دست شفقت اس سے چھن گیا ہے۔ اس لئے کہ اسے محبت ہو گئی تھی۔ وہ بھی اس شخص سے جسے محبت تھی ہی نہیں، وہ قسمت کی اس ستم ظریفی پر ساکت رہ گئی تھی۔ اس نے محبت پانے کے لئے والدین کو چھوڑا تھا اور محبت اس کے حصار سے دور جا چکی تھی۔

☆......☆......☆

''آبدار گھر سے بھاگی نہیں ہے۔ اسے میں نے ابسام کے گھر چھوڑا ہوا ہے۔'' وہ انجام کی پرواہ کیے بغیر کہنے لگا تھا اور وہ پہلے ہی جملے پر آئیکت کو گھورنے لگا تھا اور وہ کچھ کہتا کہ اس نے ٹوک دیا تھا۔

''میں جو کہنا چاہتا ہوں، بتانا چاہتا ہوں پہلے وہ خاموشی سے سن لو اس کے بعد جو کہنا، جو سزا دینی ہو دے دینا۔'' آئیکت کی بات پر

اس نے لب بھینچ لئے تھے اور آئیکت کہتا چلا گیا تھا۔

''میں آبی سے شدید محبت کرتا ہوں، گھر میں جب نے شادی کے لئے آبی کا نام لیا تو وہ مجھے اس کی حقیقت پتہ چلی مگر محبت حقیقتوں سے مبرا شے کا نام ہے۔ مجھے آبی کے بے نام ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اس کے لئے اسٹینڈ لیا۔ مجھے سب کی مخالفت کی امید تھی مگر اماں جان کی حمایت کی سو فیصدی امید تھی مگر جب اماں جان کی مخالفت سامنے آئی تو میری آس بکھر گئی۔ جب آبی کی شادی طے ہوئی تو میں نے اسے مجبور کیا کہ وہ میری محبت کے لئے مجھ سے نکاح کر لے مگر آبی نے منع کر دیا'' وہ داستان حیات بیان کرتے کرتے ٹھہر گیا تھا۔ اس نے ان لمحوں کی اذیت کو محسوس کیا تھا جب سب آبی کے خلاف تھے اور وہ اکیلا اسے ڈیفینڈ کرتا ہار رہا تھا، شکست کو قریب دیکھ کر اس نے آبدار کی منت کی تھی اور وہ انکاری ہوگئی تھی۔

''آبی نے صاف کہہ دیا کہ وہ گھر والوں کی رضامندی کے بغیر مجھ سے نکاح نہیں کرے گی۔۔۔ اور وہ جس سے شادی ہونی تھی اس سے بھی اپنی حقیقت پوشیدہ رکھ کر شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تب میں نے اسے ابسام کے گھر چھوڑنے کی بات کی تھی، اس سے کہا تھا کہ میں اسے اس کی پہچان تک پہنچنے میں مدد کروں گا۔ آبی اس سب کے لئے راضی نہیں تھی مگر وہ اپنی شادی سے خوفزدہ تھی۔ اسے ڈر تھا کہ جب اس کے شوہر کو اس کی اصلیت پتہ چلے گی تو وہ اسے چھوڑ دے گا... اور بالفرض چھوڑے گا نہیں تو جیسی نفرت آمیز زندگی اس نے ہمارے گھر میں گزاری تھی وہ ہی زندگی شوہر کے گھر میں مقدر ہو جائے گی۔ اس لئے اسے ابسام کے گھر رکھنے میں اپنی بھلائی نظر آئی، سب یہی سمجھے کہ وہ اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی مگر ایسا نہیں تھا۔ آبی اتنی ہی معصوم ہے جتنی آبشار پھپھو۔'' آئیکت تمام تر حالات اور واقعات شاہ زیب کے سامنے رکھ گیا تھا۔

''یہ ساری تفصیل مجھے بتانے کا کیا مقصد ہے؟'' شاہ زیب خلاف توقع تفصیل سننے کے بعد غصہ میں نہیں آیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تم محمود خان کو آبدار کو اپنے گھر میں رکھنے کے لئے مجبور کرو۔'' اس نے بتانے کے پیچھے چھپے فیصلہ سے آگاہ کیا تھا اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کس شرط پر وہ ابسام کے گھر رکنے پر راضی ہوئی تھی۔

''آبی مجھ سے جب تک نکاح نہیں کرے گی جب تک وہ اپنی پہچان اپنے باپ کا نام حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتی اس لئے شاہ، تم محمود خان سے بات کرو۔ اس وقت وہ مجبور ہے اس کی عزت داؤ پر لگی ہے وہ تمہاری ہر بات مان لے گا۔ تم محمود خان کو مجبور کر دو شاہ، ایک تم ہی ہو جو میری مدد کر سکتے ہو۔ تمہاری مدد کے بغیر میں اپنی محبت پانے یں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بولو شاہ، کرو گے میری مدد۔'' وہ مزید تفصیلات سے آگاہ کرتا منتیں کرنے لگا تھا۔

''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے آئیکت، جس بات پر پردہ پڑا ہے، تم اسے اچھالنا چاہتے ہو۔'' شاہ زیب ناگواری سے بولا تھا۔

''آبدار چاہے بابا کی بیٹی نہیں ہے مگر اس کے نام کے آگے جہانزیب اورکزئی لگا ہے اور آبدار کو پہچان دلانے کا مطلب ہے برسوں

سے جو عیب زمانے کی نظر سے پوشیدہ ہے اسے عیاں کر دیا جائے۔ کون جانتا ہے کہ آبشار اورکزئی کا ریپ ہوا تھا جس کا ثبوت ہے آبدار۔۔۔اورتم محبت محبت کا راگ الاپتے اپنی پھپھو پر ہوئے ظلم کا ڈھنڈورا پیٹ دینا چاہتے ہو، کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو۔'' شاہ زیب بہت طیش میں آ گیا تھا۔ آئیکت لب بھینچے کھڑا تھا کہ شاہ زیب ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس پہلو پر وہ خود بھی سوچ چکا تھا مگر وہ بے بس تھا۔

''بابا اور تایا ابا نے جو برسوں سے قربانیاں دیں، ماما جس اذیت سے گزریں، پھپھو نے جو عذاب سہا تم اس سب کو ناکارہ کر دینا چاہتے ہو۔ تو سن لو آئیکت میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ مجھے خاندان کی عزت بہت عزیز ہے۔ میں اپنی ماں کی قربانی کو رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ میں پھپھو کے ہراس میں اضافہ تمہیں کسی قیمت پر نہیں کرنے دوں گا۔'' شاہ زیب کو آبشار سے قلبی لگاؤ تھا وہ سخت اشتعال میں آ کر اسے وارننگ دے رہا تھا۔

''میں یہ کب کہہ رہا ہوں شاہ کہ زمانے کو خبر کرنی ہے۔ صرف آبی کی سیٹفکیشن کے لئے۔۔۔محمود خان۔۔۔''

''آبدار کیا چاہتی ہے میں یہ نہیں جانتا۔۔۔میں اس کی سیٹفکیشن کے لئے اپنا گھر برباد نہیں کر سکتا۔ اورتم بھی آنکھوں پر سے محبت کی پٹی اتار کر دیکھو تو سمجھ آئے گا کہ تم کیا مطالبہ کر رہے ہو۔'' شاہ زیب نے اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔

''اورتم آئیکت یہ بات بھی اپنے ذہن و دل سے نکال دو کہ تمہاری آبدار سے شادی ممکن ہے۔'' وہ تلخی و اشتعال سے کہہ رہا تھا کہ آئیکت نے اس کی بولتی بند کر دی تھی۔

''جب تم محمود خان کی بیٹی سے شادی کر سکتے ہو تو میں کیوں نہیں۔'' آئیکت کے لفظ تھے کہ برچھی جو شاہ زیب کے دل کے آر پار ہو گئے تھے۔

''تم محمود خان سے انتقام لینے کو اس کی بیٹی سے شادی کر سکتے ہو تو میں آبدار سے محبت کی خاطر بھی شادی نہیں کر سکتا تو کیوں؟'' وہ اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر مزید بولا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ آبدار کو اگر اس کی پہچان ملی تو چاچی کی قربانی رائیگاں چلی جائے گی۔ پھپھو کی بدنامی ہو گی۔۔۔جو راز کوئی نہیں جانتا سب کے علم میں آ جائے گا مگر یہ بات تم نے اور سب گھر والوں نے اس وقت کیوں نہیں سوچی جب میں نے شادی کے لئے آبدار کا نام لیا۔ تب بھی اس کے نام کے آگے جہانزیب اورکزئی ہی لگا تھا۔'' آئیکت بنا کسی لحاظ سے بولتا جا رہا تھا اس کی باتیں کڑوی ضرور تھیں مگر حقیقت پر مبنی تھیں کچھ دیر قبل شاہ زیب بول رہا تھا اور وہ سننے پر مجبور تھا اور اب آئیکت کو چپ کروانا جیسے شاہ زیب کے بس میں نہیں رہا تھا۔

''آبدار کو خاندان کی عزت بچانے کے لئے نام تو دیا گیا ہے، زمانے سے تو اپنا عیب چھپا لیا گیا مگر وہ معصوم آبدار جو بے قصور تھی، اسے زندگی گزارنے کے لئے بھی محبت اور اپنائیت نہیں دی گئی، میرا شادی کے لئے آبدار کا نام لینا سب کو ناگوار گزرا، سب بھول گئے کہ اس کے نام کے آگے اورکزئی لگا ہے، وہ زمانے کے لئے اورکزئی خاندان کی بیٹی ہے۔ مگر یہ بات اورکزئی خاندان خود ہی نہیں مانتا جب ہی اس

کے ساتھ بچپن سے ناروا سلوک کیا گیا۔ اسے دھتکارا گیا۔ اس کی شخصیت کو مسخ کیا گیا، مجھ سے اس کی شادی نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ناجائز ہے، تو آپ لوگوں کو کیا حق پہنچتا تھا کسی اور کو دھوکہ دے کر ایک ناجائز لڑکی کی ایک شریف خاندان کے لڑکے سے شادی کرنے کا؟''

برسوں کا غبار وہ نکال رہا تھا شاہ زیب ندامت کے زیر اثر خود کو محسوس کر رہا تھا کیونکہ جب سے اسے پتہ لگا تھا کہ آبدار اس کی بہن نہیں ہے وہ محمود خان کی بربریت و ہوس کا ثبوت ہے تب سے وہ اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ اس سب میں آبدار کا تو کوئی قصور نہیں تھا، وہ اپنی مرضی سے اس دنیا میں نہیں آئی تھی اور جیسے آئی تھی اس میں اس کا کیا دخل تھا۔۔۔؟ کچھ نہیں، تو پھر وہ کیوں آبدار سے نفرت کرنے لگا تھا۔۔۔؟ اور جب آئیکت نے شادی کے لئے آبدار کا نام لیا تھا تو اس نے بھی تو مخالفت کی تھی۔ جیسے وہ ابھی آئیکت کو یاد دلا رہا تھا کہ آبدار کے نام کے آگے اس کے بابا کا نام لگا ہے تو یہ بات اس وقت کیوں بھول گئی تھی۔۔۔ آئیکت کی مخالفت کی بجائے حمایت کیوں نہیں کی تھی، جب آبدار کی شادی آئیکت سے نہیں ہو سکتی تھی تو پھر کسی اور کا کیا قصور تھا جو وہ دھوکہ دے کر، لاعلم رکھ کر آبدار کا نکاح پڑھوانے جا رہے تھے۔ اور جب وہ آبدار کو جہانزیب اور کرنزئی کی بیٹی مانتے ہی نہیں تھے تو وہ اگر اپنی پہچان حاصل کرنا چاہتی تھی تو وہ اسے روکنے کا بھی کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔ وہ لوگ کس قدر منافقت سے کام لے رہے تھے۔ اپنی عزت رکھنے کو نام تو دے دیا تھا مگر اس عزت کو بچائے رکھنے کے لئے ایک ناجائز لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتے تھے۔ پھر نام کیوں دیا تھا۔ یہ منافقت کیوں کی تھی۔ باہر سے گھر کو خوبصورت بنا کر اندر مکان کی آبیاری کیوں کی تھی۔ عزت رکھنے کو ہی نام دے دیا تھا تو ظرف کیوں بڑا نہیں کر لیا تھا۔ آج یہ سوال شاہ زیب اور کرنزئی کو مضطرب کر رہا تھا۔ اسے اپنا سابقہ ہر عمل سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اسے جہانزیب اور کرنزئی کی بیٹی مانتا تھا تو اسے آئیکت سے اس کی شادی پر معترض نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اور اگر وہ آبدار کو جہانزیب اور کرنزئی کی بیٹی مانتا ہی نہیں تھا تو وہ اگر اپنی پہچان چاہتی تھی تو وہ کیوں مخالفت پر اتر آیا تھا۔

''میں آبدار سے ملنا چاہتا ہوں۔'' کمرے میں موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا اور اس سناٹے کو شاہ زیب کی سرد آواز نے چیر کر رکھ دیا تھا اور وہ حیرانگی سے شاہ زیب کو دیکھنے لگا تھا۔

''میں نے تمہاری بات، تمہارا مؤقف سن لیا ہے مگر میں آبدار سے بات کیئے بنا کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا تھا اور آئیکت نے کل ہی آبدار کو یہاں اپارٹمنٹ پر لانے کی حامی بھر لی تھی۔ وہ شاہ زیب کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر رہا تھا جبکہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''آئیکت، گھر چلنے کے بجائے ہاسپٹل چلو، میں ڈاکٹر سے پوچھ لینا چاہتا ہوں کہ اس وہیل چیئر پر مجھے کب تک رہنا پڑے گا۔'' وہ گاڑی میں بیٹھ کر بولا تھا۔ شاہ زیب نے اپنی قوت ارادی سے بہت جلد امپروو کیا تھا اور اس نے چلنے کی بھی کوشش کی تھی مگر اس کے معالج نے اسے اتنی جلدی اپنے پیروں پر کھڑا ہو جانے پر اسے سمجھایا تھا۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ اگر اپنی شعوری کوشش اور مضبوط قوت ارادی کے

باعث چلنے بھی لگا تو آگے جا کر زندگی میں اسے دشواری پیش آسکتی ہے کیونکہ زخم بھرنے کے لئے ایک مناسب وقت درکار ہوتا ہے اور ڈاکٹر کی ہدایت کے پیش نظر ہی وہ عجلت سے باہر نکل آیا تھا۔فزیوتھراپسٹ روز آتا تھا وہ آدھ گھنٹہ اس کے ساتھ اس کی ہدایت کی روشنی میں پیر اٹھاتا تھا۔باقی وقت وہیل چیئر ہی اس کا سہارا تھی۔مگر اب وہ اس وہیل چیئر سے چھٹکارا چاہتا تھا۔آئیکت نے اس کے بے حد سرخ چہرے کو دیکھا تھا اور کچھ کہے بنا بڑی خاموشی سے گاڑی ہاسپٹل کے راستے پر ڈال دی تھی وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ خاموش تھے مگر ان کے ذہن بہت کچھ سوچ رہے تھے۔

☆......☆......☆

''تم کافی بہت مزے دار بناتی ہو۔'' گھونٹ بھرتے ہی نوائم خوشدلی سے توصیفی انداز میں بولی تھی اور آبدار آگے سے کچھ کہنا تو دور مسکرائی تک نہیں تھی۔مومل اسے دیکھنے لگی تھی وہ لڑکی جو ہر وقت گم صم سی رہتی تھی یکدم ہی کس قدر مضطرب نظر آنے لگی تھی وہ اس کے دل کی حالت سے انجان نہ تھی اس لئے وہ محسوس کر گئی تھی کہ اسے نوائم کا تعریف کرنا اچھا نہیں لگا اور وہ مومل کے چہرے پر نظر جمائے یہ سوچ رہی تھی کہ محبت کیا اتنا منفی جذبہ ہے کہ ایک شخص کی محبت نفرت کرنا بھی سکھا دے۔مومل جسے منفیت کے زمرے میں لا رہی تھی یہ تو محبت کا وہ روپ تھا جہاں سے محبوب کو ہوا بھی چھو کر گزرے تو ہوا سے بھی خدا واسطے کا بیر ہو جاتا ہے اور نوائم تو وہ تھی جو اس کے دل کے مکین سے ایک رشتہ میں بندھی تھی تو وہ اس سے بیر کیوں نہ باندھتی۔یہ بات مومل نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اسے ابھی محبت نہیں ہوئی تھی۔اسے کبھی عبیر کی محبت محسوس نہیں ہوئی تھی۔جس دن اسے محبت ہو جانی تھی اسی دن اسے پتہ لگ جاتا تھا کہ یہ منفی جذبہ نہیں یہ محبت کی شدت کا ایک پہلو تھا۔

''لگتا ہے آپی کو تمہارا تعریف کرنا اچھا نہیں لگا۔'' سوچتے سوچتے مومل کی زبان پھسلی تھی۔آبدار بری طرح گڑبڑا گئی تھی۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ مومل کو دیکھنے لگی تھی جس پر وہ ہنس دی تھی۔

''میں تو مذاق کر رہی تھی۔'' مومل نے آبدار کی گڑبڑاہٹ کو محسوس کرتے ہوئے بات کو مذاق کہہ کر ختم کر دیا تھا۔نوائم اسے گھورتی آبدار کو مسکرا کر دیکھنے لگی تھی۔

''آبدار، آپ پریشان نہ ہوں اسے تو بکواس کرنے کی عادت ہے۔'' نوائم نے مومل کی بات کا اثر ختم کرنے کو کہا تھا وہ آبدار کو دیکھ رہی تھی اور آبدار بدقت تمام مسکرا دی تھی۔اسی وقت کومل چلی آئی تھی۔

''آبدار آپی، آپ کو ابسام بھیا بلا رہے ہیں۔'' وہ تینوں ہی بیک وقت چونک اٹھی تھیں۔آبدار نے کسی قدر چونک کر سوالیہ نگاہ سے کومل کو دیکھا تھا۔

''آپ کے لئے آپ کے کزن کی کال آرہی ہے اسی لئے ابسام بھیا آپ کو بلا رہے ہیں۔'' وہ دھیمے سے کہتی نوائم کے برابر بیٹھ گئی تھی۔آبدار چائے کا مگ ٹیبل پر منتقل کرتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ابسام وہیں چلا آیا تھا اور موبائل آبدار کی طرف بڑھایا تھا۔

''آپی کے کسی بھی کزن کی کال آپکے پاس کیوں آئی، آپی کا اپنا سیل فون کہاں ہے؟'' مومل کی بات پر وہ دونوں ہی گڑبڑا گئے تھے۔

''آبدار کا سیل فون خراب ہو گیا تھا۔ بس اس لئے تم ہر وقت جمیز بونڈ کی نانی نہ بنا کرو۔'' ابسام نے بروقت خود کو سنبھالتے ہوئے نہ صرف بہانہ تراشا تھا مومل کو مطمئن کرنے کو اسے گھورتے ہوئے ڈپٹ دیا تھا تا کہ اس کی توجہ بٹ جائے۔ ابسام کا انداز ایسا تھا کہ مومل کے لئے آگے سے کچھ کہنے کا جواب نہیں بچا تھا۔ آبدار بڑی تیزی میں وہاں سے نکل گئی تھی۔ کومل نے اسے بیٹھے کو کہا تھا مگر وہ مصروفیت کا بہانہ کر کے وہاں ٹھہرا نہ تھا۔

''تم بھی حد کرتی ہو مومی، کیا ضرورت تھی منہ اٹھا کر ایسے بولنے کی۔'' نوائم اس پر خفا ہوئی تھی۔

''مجھے کوئی بڑی گڑبڑ لگتی ہے۔ آبدار اب مجھے معصوم کم پر اسرار پہیلی زیادہ لگنے لگی ہے۔'' مومل جو کچھ جان گئی تھی وہ اس سے چھپائے رکھنا محال ہو رہا تھا کہ وہ جب تک نوائم کو نہیں بتا دیتی تھی اسے سکون کہاں ملنا تھا۔ اپنے کمرے کی طرف بڑھتا ابسام کچھ یاد آنے پر واپس لاؤنج کی طرف آیا تھا اور مومل کی بات نے اسے ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اف، تم تو چپ ہی رہو مومی۔'' نوائم چڑ کر بولی تھی مومل فطرتاً تجسس پسند تھی اور ایک بات کے پیچھے پڑ جاتی تھی تو اس کی کھال اتارے بنا اسے چین نہیں ملتا تھا اور وہ سب اس کی عادت سے نالاں تھے۔

''جیمز بونڈ کی نانی۔'' کومل مزے سے بول کر ہنسی تھی اور وہ چھوٹی بہن کو گھورنے لگی تھی۔

''مجھے کروا لو چپ مگر میں بھی سراغ لگا کر رہوں گی اور دیکھنا اس بار میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔'' مومل ناراضگی سے بائیکاٹ والے انداز میں بولی تھی۔ ابسام کو پریشانی نے آگھیرا تھا۔ وہ آبدار کو محتاط رہنے کی صلاح دینے کا سوچتا واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا یہ جانے بغیر کہ اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔۔۔ اور وہ لوگ آبدار پارٹی میں شرکت کرے گی یا نہیں، کی الجھن سے باہر آجائیں گے۔ وہ مومل کی بات کو سوچتا متفکر ہو رہا تھا اور مومل ان دونوں کو گھورتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

''یہ لڑکی خود بھی پاگل ہے ہم سب کو بھی کرے گی۔'' نوائم بڑبڑائی تھی کہ اس کا یوں ناراض ہو کر جانا نوائم کے لیے ایک آزمائش ہی تو تھا پہلے اسے منانا پڑتا پھر اس کی جاسوسی بکواس بھی سننی تھی۔

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

''آپ نے شاہ زیب بھیا کو سب کچھ بتا دیا؟'' آئیکت نے اس کی خیر خیریت دریافت کر کے تفصیل کہنا شروع کی تھی کہ وہ حیرت و صدمے کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ چیخ اٹھی تھی۔

''ہاں میں نے بتا دیا ہے اور شاہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے اس لئے تم تیاری کر لو۔ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔'' آئیکت نے اس کی حیرانگی کو کسی خاطر میں نہ لاتے ہوئے بقیہ تفصیلات سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ہدایت بھی دے ڈالی تھی۔

''شاہ زیب بھیا کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔'' وہ انکاری ہوئی تھی۔

''ہمت کرو آبی۔ جو اسٹیپ ہم لوگوں نے لیا ہے اس کے بعد میں اپنے حوصلہ سے ہی سب کا سامنا کرنا ہو گا۔'' آئیکت نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے اسے اپنی بے پناہ محبت کا، اپنے ساتھ کا یقین اسے سونپا تھا۔

''میں جانتی ہوں آئیکت کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ مجھے آپ کی محبت پر اتنا ہی یقین ہے جتنا میں شام و سحر کے آنے پر یقین رکھتی ہوں۔ مگر آپ تو میرے ساتھ ہیں لیکن میرا دل میرے ساتھ نہیں رہا۔ مجھے آپ کے ساتھ سے دور کرنے پر تلا ہے۔'' آئیکت اسے سمجھا رہا تھا اور وہ اس کی سنے بناء دل ہی دل میں اسے مخاطب کیے آنسو بہا رہی تھی۔ آئیکت نے چند ایک ہدایات دے کر اسے لینے آنے کا وقت مقرر کیا تھا اور رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''میں یہاں آنے سے خوفزدہ تھی۔ یہ عارضی جنت مجھے خوف میں مبتلا کر رہی تھی اور آج مجھے یہاں سے واپسی کا عندیہ ملا ہے تو میں بے چین ہو گئی ہوں۔ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی، اس عارضی جنت کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔'' وہ موبائل بیڈ پر اچھالتی چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بلک رہی تھی۔

''اس گھر کے مکین میرے نہیں ہیں۔ ابسام بھی میرے نہیں ہو سکتے پھر بھی میرا دل کہتا ہے کہ ابسام مجھے روک لیں۔ اس گھر کے مکین مجھے اپنا لیں۔ مجھے روک لیں۔۔۔ کاش۔۔۔ یہ معجزہ ہو جائے۔'' وہ سسکتے ہوئے سوچ رہی تھی تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''میں مکان میں رہتی رہی۔ اس مکان کے مکین کبھی میرے نہیں تھے۔ وہ جائے پناہ مجھے گھر کبھی نہیں لگی صرف مکان لگی۔ میرے لئے میری پہلی و آخری جائے پناہ مکان تھی اور یہ جگہ جہاں سے میرا کوئی تعلق نہیں، کوئی رشتہ نہیں، دل ایسے اس جگہ سے مانوس ہوا ہے کہ یہ چار دیواری جو میری نہیں، مجھے گھر لگتی ہے اور میں یہ گھر چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔'' وہ سوچوں میں اس قدر مستغرق تھی کہ دروازے پر ہوئی دستک سے انجان رہی تھی مگر یکدم پے در پے ہونے والی دستک نے اس کی سوچ کو منتشر کر دیا تھا۔ اس نے اپنے آنسو رگڑے تھے اور وہ جو اس وقت کسی کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھی اس نے تمام حوصلے مجتمع کر کے دروازہ کھول دیا تھا۔ ابسام کی اس کے چہرے پر نظر پڑی تھی جو متورم تھا، آنکھیں اور ناک بے حد سرخ ہو رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے آبدار؟ سب ٹھیک تو ہے؟'' وہ متفکر سا پوچھ رہا تھا۔ وہ جواب دیئے بغیر پلٹ گئی تھی اور بیڈ پر پڑا موبائل اٹھا کر جب تک مڑی تھی وہ اندر چلا آیا تھا۔

''مجھے بتایئے پلیز۔ آئیکت سے کیا بات ہوئی؟ آپ اتنی پریشان کیوں ہیں۔'' وہ اس کی طرف موبائل بڑھا رہی تھی جسے لیتے ہوئے وہ فکرمندی سے دوبارہ پوچھ رہا تھا۔

''آئیکت مجھے لینے آرہے ہیں۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ ہمیشہ کے لئے۔'' وہ مرے مرے لہجے میں بولتی سسک اٹھی تھی۔

''یہ تو بہت خوشی کی بات ہے آبدار کہ آپ اپنے گھر جا رہی ہیں۔ ایسے میں یوں رونا اچھی بات تو نہیں ہے۔'' وہ اس کے رونے سے مضطرب ہوا تھا اور دھیمے سے بولا تھا۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ آئیکت نے اس سے تو کچھ نہیں کہا تھا۔ دو دن قبل ہی تو آئیکت سے بات ہوئی تھی تب وہ آبدار کو لے کر پریشان تھا اس کے ابسام کے گھر رہنے پر شرمندگی کا اظہار کر رہا تھا۔ ایک دم کایا کیسے پلٹ گئی تھی جو بات بہت ناممکن سی تھی۔ کسی قسم کی آسانی و مشکل کے حل کی توقع ہی عبث تھی ایسے میں آئیکت کا اسے لینے آنا ایک معمہ ہی تو تھا۔

''ابسام، میں یہاں آنا نہیں چاہتی تھی۔'' اس کے لب ہلے تھے۔

''میں جانتا ہوں آبدار۔۔۔'' وہ کہنے لگا تھا کہ وہ بول پڑی تھی۔

''مگر آپ یہ نہیں جانتے کہ میں اب یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔'' اس نے نمناک آنکھوں سے ابسام کی جانب دیکھا تھا وہ بے ساختہ ہی نظر چرا گیا تھا۔

''مجھ سے پوچھیں گے نہیں کہ میں کیوں نہیں جانا چاہتی؟'' وہ اس کا نظر چرانا صاف محسوس کرتی دھیمے سے چند قدم اس کی طرف بڑھی تھی۔ اب ان کے درمیان فاصلہ محض چند قدموں کا ہی رہ گیا تھا اور وہ بڑی تیزی سے جانے کے لئے مڑ گیا تھا مگر جا نہیں سکا تھا۔ وہ ابسام کا ہاتھ تھام گئی تھی۔ یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ آبدار ایسا بھی کچھ کر سکتی ہے۔ اس نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے نہایت ناگواری سے اس کی جانب دیکھا تھا کیونکہ اسے آبدار کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری تھی۔

''ابسام! آپ مجھے روک لیں پلیز۔۔۔ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔'' گویا اس نے ابسام کی ناگواری کو محسوس ہی نہیں کیا تھا اور وہ اس کی حرکت سے ہی نہیں سنبھلا تھا کہ غیر متوقع جملہ اس کی سماعتوں میں اترا تھا۔

''آپ یہاں مہمان تھیں آبدار، اور مہمان کو ایک نہ ایک دن اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔ اس لئے آئیکت آپ کو لینے آرہا ہے تو آپ با خوشی اس کے ساتھ چلی جایئے۔'' وہ اس کی ان کہی باتوں کو کئی بار محسوس کر چکا تھا اور وہ ان کہی باتیں اسے گفتگو میں ڈھلتی محسوس ہونے لگیں تو اس نے پہلے ہی موڑ پر حد بندی لگانا چاہی تھی مگر اس نے کہاں پرواہ کی تھی۔

''مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے ابسام! میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے روک لیں پلیز۔۔۔'' وہ دوری مٹاتی ایک انچ

کے فاصلے پر آن ٹھہری تھی۔ ابسام کو اس سے اتنی بے باکی کی توقع نہیں تھی باوجود اس کے کہ اس نے بارہا اس کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت محسوس کی تھی مگر وہ محبت جو آنکھوں میں محسوس ہوتی تھی لب پر آن ٹھہری تھی تو وہ مزید مضطرب ہو گیا تھا۔

''خدا کے لیے آبدار ایسی باتیں مت کریں۔'' اس نے آبدار کو لمحہ بہ لمحہ اظہار کی منزلیں طے کرتا دیکھ کر بند باندھنے کو باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ گیا تھا۔

''بہت مجبور ہو گئی ہوں ابسام! میری محبت نے مجھے آپ کے سامنے مجبور کر دیا ہے۔ خدا کے لئے میری محبت کو نہ ٹھکرائیں۔'' وہ سسکنے لگی تھی اس کے لہجے سے محبت ہی نہیں بے چارگی بھی صاف عیاں تھی۔

''میں نوائم کو پسند کرتا ہوں۔ میرا اس سے ایک رشتہ جڑا ہوا ہے۔ ہماری بہت جلد شادی ہونے والی ہے۔ آپ بھی آئیکت کی پابند ہیں اس لئے اپنی مشکلات کو مت بڑھائیں۔ اور جانے کی تیاری کر لیں۔'' اس کا دل آبدار کے آنسوؤں میں ڈوب رہا تھا۔ اس کی بے چارگی اسے تڑپا رہی تھی مگر وہ یہ کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ آبدار کے جذبوں کی حوصلہ افزائی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس نے آبدار کو بہت کچھ باور کروایا تھا۔

''میں آئیکت کی پابند ضرور ہوں مگر میرا دل آپ کا ہو گیا ہے اور میں آئیکت سے بھی کہہ دوں گی۔'' ابسام کا صاف کہہ دینا اس کے دل پر کاری ضرب لگا گیا تھا مگر وہ خود کو کمپوز کر کے بولی تھی اور ابسام کو سناٹوں کی زد پر لے گئی تھی۔

''آپ آئیکت سے کیا کہہ دیں گی؟'' وہ آنکھوں میں حیرت اور الجھنیں لیے اس کی نم آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔

''بس یہی کہ مجھے ان سے نہیں آپ سے شادی کرنی ہے۔ مجھے ان سے نہیں آپ سے محبت ہے۔'' وہ بے خوفی سے بولتی چلی گئی تھی۔

''خدا کے لئے چپ کر جائیں آبدار۔ میری زندگی بھر کی نیک نامی کو سوالیہ نشان مت بنائیں۔'' وہ دبے دبے انداز میں غرایا تھا۔ اسے کسی کے آجانے کا خدشہ بھی تھا یہ وہم بھی ستا رہا تھا کہ کافی دیر سے وہ آبدار کے کمرے میں تھا کوئی دیکھ لے تو کیا سوچے گا اور وہ جس نے عمر کا طویل عرصہ محتاط انداز میں گزارا تھا آج اس قدر غیر محتاط ہو گئی تھی کہ اسے جیسے کسی کی پرواہ بھی نہیں رہی تھی مگر ابسام کو تھی پرواہ تب ہی وہ غرایا تھا۔

''یاد رکھیئے گا آبدار۔ مجھے آپ سے محبت نہیں ہے نہ ہی ہماری شادی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ نے یہ سب بکواس آئیکت یا کسی کے بھی سامنے کی، میرا کوئی بھی عمل میری نیکی پر سوالیہ نشان آیا تو میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' آبدار جواب میں کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اس نے انگلی اٹھا کر سخت لہجہ میں اسے تنبیہ کی تھی۔

''آپ کے لئے صرف آپ کی نیک نامی اہم ہے ابسام۔ میرے دل کا کچھ خیال نہیں ہے جو آپ کی محبت میں سلگ رہا ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

''ایسے دل کو آگ لگا دیں آبدار جو رشتوں کا تقدس پامال کرنے پر تل جائے۔'' وہ درشتگی سے کہتا غصیلی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میرے لئے میری نیک نامی ہی سب کچھ ہے۔آئیکت نے مجھ پر بھروسہ کیا، آپ کو یہاں میرے گھر چھوڑا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے اس ''دل'' کی وجہ سے میرے دوست کا مجھ پر سے، دوستی پر سے ہی اعتبار اٹھ جائے۔اس لئے بہتر ہوگا کہ ''دل'' سے نہیں دماغ سے سوچیں۔'' وہ اپنا موٴقف سخت انداز میں اس کے سامنے رکھ گیا تھا۔

''آپ پر نام نہیں آئے گا ابسام۔ میں آئیکت سے کہہ دوں گی کہ اس سب میں آپ کا نہیں میرا قصور ہے۔آپ نہیں میں غلط ہوں۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے جلدی جلدی بولی تھی۔

''آپ کا مجھ پر احسان ہوگا کہ آپ کسی سے کچھ نہ بولیں۔'' اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے تھے وہ لب بھینچ گئی تھی۔

''محبت جرم تو نہیں ہے ابسام جو آپ اس طرح کر رہے ہیں۔ میری بے بسی کا اندازہ لگایئے کہ کیسے اپنی عزت، انا، اپنا وقار اپنے ہی قدموں تلے روند کر آپ سے اظہار کی منزل طے کی ہے۔'' وہ جانے کے لئے بڑھا تھا اور وہ پھر اس کے سامنے آ گئی تھی۔

''غلط کیا ہے آپ نے، آپ کو اپنی انا اور وقار کی حفاظت کرنی چاہیے تھی۔ محبت جرم بے شک نہیں ہے مگر اس طرح جرم بن جاتی ہے جس صورتحال میں آپ گرفتار ہیں۔اس لئے میرے لیے مشکلات کا سامان نہ کریں۔'' وہ سخت انداز میں بہت کچھ باور کرواتا اسے ایک حد میں رہنے کا کہتا کمرے سے نکل گیا تھا۔ وہ شدتوں سے روتی پیکنگ کرنے لگی تھی۔ ابسام کی آئیکت سے بات ہوئی تھی۔آئیکت نے تمام بات اس کے محل وقوع کے ساتھ ابسام کے گوش گزار کر دی تھی۔آئیکت، آبدار سے بات کرنے کے تقریباً آٹھ گھنٹے بعد اسے لینے آ گیا تھا۔ وہ ابسام کے ننھیالی رشتہ داروں سے ملا تھا۔اس کی نانو نے بہت محبت سے اسے دعائیں دی تھیں۔ فضہ حیدر نے آتے رہنے پر بے حد محبت سے اصرار کیا تھا۔ وہ کومل و مومل سے بھی ملی تھی، نوائم مسکرا کر ملی تھی مگر وہ باقی سب سے تو اچھے سے ملی تھی مگر نوائم کو مسکرا کر تک نہیں دیکھا تھا۔نوائم اس سے کچھ کہہ رہی تھی مگر آبدار بڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔نوائم کو آبدار کی اس حرکت پر حیرت ہوئی تھی۔ مومل جو سب جانتی تھی وہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گئی تھی۔

''محبت انسان کو خوار کرتی ہے، سنا تھا مگر اب مجھے اس کا یقین بھی آ گیا ہے۔'' مومل بڑبڑائی تھی۔نوائم حیرت سے نکل کر اسے چونک کر دیکھنے لگی تھی۔

''تم پاگل ہوگئی ہو مومل۔ جب دیکھو منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی رہتی ہو۔'' اس نے آبدار کی حرکت سے دل میں در آنے والی ناگواری و جھنجلاہٹ کا اثر مومل پر نکالا تھا اور وہ ہنس دی تھی۔آبدار چلتی ہوئی لان میں آئی تھی۔آئیکت اور ابسام بات کر رہے تھے اس کو دیکھ کر چپ کر گئے تھے۔آبدار نے ایک نظر خود سے گریزاں کھڑے ابسام پر ڈالی تھی۔سرخ و سپید رنگت، سلیقہ سے بنا ہوا ہیئر اسٹائل، تیکھے نین نقش، لانبا قد، متناسب سراپا۔ وہ کافی ہینڈسم اور گڈ لکنگ تھا۔کسی بھی لڑکی کا اس پر دل آ سکتا تھا۔اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

''اس شخص کو میں بہت چاہتی ہوں۔۔۔ مگر پا نہیں سکتی۔۔۔ میرے ہاتھ کی لکیروں میں محبت کی نارسائی رقم ہے۔ میں دنیا میں نفرت و حقارت سمیٹنے کے لئے آئی ہوں'' وہ خود ترسی کا شکار ہونے لگی تھی۔ دلگرفتگی سے سوچتے ہوئے آگے بڑھی تھی۔ ہر اٹھتا قدم کہتا تھا کہ کوئی پیچھے سے آواز دے کر روک لے مگر قدم آگے کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔ کان صدا کے منتظر تھے مگر ایک آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔

''میں آپ کی منتظر رہوں گی ابسام، صرف ایک بار آواز دیں گے تو میں لوٹ آؤں گی۔ میرا دل آپ پر یوں مہربان ہے کہ میری ''انا'' بھی سو گئی ہے۔ مجھے صرف آپ چاہیے ہو۔ آپ کا ساتھ درکار ہے۔ محبت کرتی ہوں آپ سے اور آپ کی محبت پانے کے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لیجئے گا۔'' آئیکت گاڑی میں سامان رکھوا رہا تھا اور وہ آئیکت کی طرف بڑھ رہا تھا کہ وہ اس سے ذرا فاصلے پر رک کر گہری سنجیدگی سے بولتی چلی گئی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر آبدار کو دیکھا تھا۔ وہ حسین تھی، کم عمر تھی کسی کا بھی خواب ہو سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابسام کی محبت روشن تھی اور وہ نظر چرا گیا تھا کیونکہ محبت لاکھ حسین جذبہ سہی مگر وہ اس جذبے کا خیر مقدم کرنے کی پوزیشن میں ہی نہ تھا۔

''آپ کا انتظار رائیگاں جائے گا آبدار۔ اس لئے خوابوں کی دنیا سے نکل کر تلخ حقیقتوں کا سامنا کرنا سیکھیں۔ میں فقط ایک سراب ہوں۔ میرا پیچھا نہ کریں۔ سراب کے پیچھے بھاگنے سے کبھی کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا تھا۔

''میں کچھ حاصل کرنا چاہتی ہی نہیں ہوں ابسام۔ میری محبت ہی میری زندگی کا حاصل ہے۔ بس میری اک یہی خواہش ہے کہ آپ میری محبت کو تسلیم کر لیں۔ مجھ سے محبت نہ کریں مگر میری محبت کو محسوس کر لیں۔ صرف ایک بار۔۔۔'' وہ آنکھوں میں آنسو لئے جذباتی ہونے لگی تھی۔

''آئیکت آپ سے بہت محبت کرتا ہے، آپ اس کی محبت کو محسوس کریں اور اس سے شادی کر لیں۔ اپنی خواہشوں کی سمت درست کر لیں آبدار۔'' وہ گہری سنجیدگی سے اسے بتا رہا تھا، جتا رہا تھا کہ وہ آئیکت کی پابند ہے۔

''میں آئیکت کی محبت کو محسوس کر سکتی ہوں مگر آئیکت سے محبت نہیں کر سکتی کیونکہ میری محبت تو آپ ہیں ابسام۔'' ایک آنسو رخسار پر لڑھک آیا تھا۔

''میں بھی آپ کی محبت محسوس تو کر سکتا ہوں لیکن آپ سے محبت نہیں کر سکتا کیونکہ میں نوائم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت جلد آپ کو ہماری شادی کی خبر ملے گی۔'' اس کے دل میں نوائم کے لئے کچھ نہیں تھا صرف رشتہ کا احساس اور پاس تھا مگر آج وہ اس لڑکی کو زندگی میں آئیکت کے ساتھ آگے بڑھ جانے کا صاف کہہ کر بھی ناکام تھا اسے سمجھانے میں اس لئے اس نے جھوٹ کا سہارا لیا تھا اور آبدار سکتہ میں آ گئی تھی۔

''میں نوائم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔'' ایک ہی گونج تھی۔ آنسو گرنے لگے تھے وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھی اور وہ آگے بڑھ گیا تھا آئیکت سے ہاتھ ملانے لگا تھا۔ اس نے ایک نظر ابسام حیدر کے گھر پر ڈالی تھی۔ اس نے جہاں ایک عمر گزاری تھی۔ وہ گھر نہیں لگا تھا اور یہ گھر اسے جنت کا گماں لگتا تھا۔ اس نے عمارت کو بھیگی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ دل سے صدا ابھری تھی۔ ''کاش، یہ گھر اس کا نصیب ہوتا، یہ

گلشن اس کے وجود سے آباد ہوتا۔ اس نے آئیکت کے ساتھ کھڑے ابسام کو دیکھا تھا۔

''کاش، میں آپ کے نام کے ساتھ اس گھر میں آتی، اس گھر کو ہم مل کر گلشن بناتے۔ ہماری زندگی میں محبت اور ملن کی بہاریں رقص کرتیں۔ مگر میں بدقسمت اپنے نصیب میں محبت لکھوا کر ہی نہیں لائی۔'' ابسام کے چہرے کو دیکھ کر سوچا تھا اور آنسو گرتی کھلے فرنٹ ڈور سے کار میں بیٹھ گئی تھی۔ ابسام سے پھر جلد ملنے کا کہہ کر آئیکت نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔

''تم رو کیوں رہی ہو آپی؟'' وہ اس کے متورم چہرے کو دیکھ کر مضطرب تو پہلے ہی ہوا تھا مگر اُس کے روتے چہرے کو دیکھ کر اضطراب بڑھنے لگا تھا۔

''گھر چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے آئیکت۔ اور میں تو اس دن بھی بہت روئی تھی جس دن خالی مکان چھوڑا تھا۔'' وہ دھیمے سے نم لہجہ میں بولی تھی۔ آئیکت چپ کا چپ رہ گیا تھا۔

''جس دن اورکزئی ہاؤس چھوڑا تھا تب بہت روئی تھی جبکہ وہ گھر کبھی میرا تھا ہی نہیں۔ اُس گھر کا کوئی فرد میرا نہ تھا اور آج حیدر کاٹیج چھوڑتے ہوئے تو اندر سے خالی ہوگئی ہوں۔ اس گھر میں، میں نے رشتوں کو جانا، محبت اور اپنے پن کا مزہ محسوس کیا۔ پہلی دفعہ گھر کی اہمیت، اپنوں کی اہمیت کا ادراک ہوا تو ایسے میں خود بتایئے۔ مجھے دکھی نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ ایک کرب سے بول رہی تھی۔ وہ تو اس کے ہر دکھ کا امین تھا اس کے دکھ کو محسوس کرتا تڑپ اٹھا تھا۔

''آپی! زندگی کی مشکلات آسانیوں میں بدلنے والی ہیں۔ بس تھوڑا اور حوصلہ پھر ہم ایک نئی زندگی حق اور مان کے ساتھ رشتوں کے خلوص کے ساتھ شروع کریں گے۔'' اس نے بہت دل سے کہا تھا۔ وہ آئیکت کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ شخص اس کے لئے اتنا ہی مخلص تھا۔

''کیا میں آئیکت کو دھوکہ دے پاؤں گی؟ کبھی بتا پاؤں گی کہ مجھے ان سے نہیں، ابسام سے محبت ہے۔'' اس نے بے بسی سے سوچا تھا۔ آئیکت اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ اسے شاہ زیب سے سامنے کے لئے ہمت دیتا بہت کچھ ساتھ ہی سمجھا بھی رہا تھا اور وہ چپ تھی بالکل چپ۔ کیونکہ وہ اپنا دل، اپنا قلبی سکون سب کچھ ابسام حیدر کی دہلیز پر چھوڑ آئی تھی۔ کانوں میں آئیکت کی آواز نہیں پڑ رہی تھی۔ صرف ابسام کی باتوں کی بازگشت تھی اور ایک جملہ بار بار اس کے کان میں گونجتا اسے کرب میں مبتلا کر رہا تھا۔

''میں نوائم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ میں نوائم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔ میں نوائم سے محبت کرتا ہوں۔۔۔'' اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے مگر کچھ آوازیں تو سماعتوں کے اندر گھس کر بیٹھ جاتی ہیں جن کی بازگشت تمام عمر تعاقب کرتی ہے۔

''میں تو پہلے سے ہی واقف تھی کہ ابسام کسی سے ایک بندھن میں بندھ چکے ہیں تو جب میں پہلے سے سب جانتی تھی تو واضح اعتراف کے بعد یہ تکلیف کیوں محسوس ہو رہی ہے، دل کیوں یہ خواب دکھا رہا ہے کہ وہ مجھے تنگ کر رہے تھے۔ وہ نوائم سے محبت نہیں کرتے۔ میں کیوں وہ سننا چاہتی ہوں، جیسا کچھ ہے ہی نہیں۔ میں کیوں فرض کر لینا چاہتی ہوں کہ ابسام کو نوائم سے محبت نہیں ہے۔ میں

کیوں خود کو دھوکہ میں رکھنا چاہتی ہوں۔'' وہ کرب کی شدتوں سے گزرتی سوچ رہی تھی۔قطرہ قطرہ آنسو رخسار بھگو رہے تھے۔آئیکت لب بھینچے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔شاہ زیب اور کزئی کا اپارٹمنٹ قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا اور وہ ابھی تک حیدر ہاؤس میں سفر کر رہی تھی۔ فضہ حیدر کی محبت، حیدر صاحب کی شفقت، ابسام حیدر کا عزت دیتا رویہ، بیگانگی سے مزین آنکھیں، روک لینے کی خواہش میں رہ رہ کر ابسام کی طرف اٹھنے والی اس کی اپنی نظر، ابسام حیدر کے ننھیالی رشتہ داروں کا خلوص، حیدر کاٹیج میں گزرا ایک ایک لمحہ اسے یاد آ رہا تھا۔

یہ گھر میرا گلشن ہے، گلشن کا خدا حافظ

اللہ نگہبان، نشیمن کا خدا حافظ

اس کے لب پر سسکی آ کر دم توڑ گئی تھی۔گاڑی اپارٹمنٹ کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔وہ گاڑی سے باہر آئی تھی۔اس کے قدم اپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے وہ منظر تھا جب اس نے حیدر کاٹیج سے واپسی کے لئے قدم بڑھائے تھے اور پلٹ کر ابسام کو آس بھری نگاہوں سے یوں دیکھا تھا کہ وہ نظر چرا گیا تھا۔اس کے لب کچھ کہنے کی چاہ میں کانپے تھے مگر ابسام یوں نظر چرائے کھڑا تھا کہ وہ کانپتے لبوں سے کچھ کہہ بھی نہیں پائی تھی۔

جانا بھی نہ چاہے دل

جانا بھی ضروری ہو

کانپتے ہونٹوں پر

ہر بات ادھوری ہو

ایسے میں کہوں کیسے

ساجن کا خدا حافظ

''ابسام! آپ کا گھر میرا نہیں تھا اس لئے وہاں سے آج چلی آئی ہوں۔جس گھر میں بسنے کے خواب آنکھوں میں بسائے تھے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گھر چھوڑ آئی ہوں۔جس گھر کو گلشن بنانے کے خواب میری جاگتی آنکھوں نے سجائے اس گھر کو آج خدا حافظ کہہ دیا ہے۔آپ کی بے رحمی کے سبب ابسام، کہ آپ چاہتے تو روک سکتے تھے مگر سارا مسئلہ ہی یہی تھا کہ آپ کے گھر میں رہنا میں چاہتی تھی آپ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔محبت میں نے کی تھی آپ نے نہیں کی اس لئے میں آپ کے گھر کو خدا حافظ کہہ آئی ہوں مگر آپ تو میری محبت ہیں اور گھر میں آنے کا جیسے راستہ ہوتا ہے گھر سے جانے کے لئے بھی دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے مگر دل میں آنے کا ایک ہی راستہ ہے جو کسی کے قدم رکھنے کے بعد مقفل ہو جاتا ہے۔واپسی کا ہر راستہ بند ہو جاتا ہے ابسام۔ایسے میں، میں آپ کو تو خدا حافظ کہہ سکتی ہوں مگر اپنے دل سے آپ کو نکال کر اپنی محبت کو خدا حافظ نہیں کہہ سکتی۔'' وہ آگے کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہی تھی اور مڑ مڑ کر یوں دیکھ رہی تھی جیسے ابھی پیچھے

سے ابسام کا چہرہ نمودار ہوگا اور وہ اسے آواز دے گا اور زندگی کی ہر خلش مٹ جائے گی مگر ہر نگاہ لوٹ کر آ رہی تھی اور قدموں سے بے بسی یوں لپٹ لپٹ گئی تھی کہ قدم واضح طور پر لڑکھڑاہٹ کا شکار ہو رہے تھے۔

نظروں کا یہ عالم ہے
ہٹ ہٹ کے پلٹتی ہیں
نظروں سے گلے مل کر
قدموں سے لپٹتی ہے
الجھا ہوا دامن ہے
دامن کا خدا حافظ

اس کی آنکھوں کے سامنے گزشتہ لمحات کی اسکرین سی چل رہی تھی۔ قدم آگے اٹھ رہے تھے، ذہن پیچھے بھٹک رہا تھا۔ وہ بری طرح لڑکھڑائی تھی۔ گرتی کہ دو مہربان ہاتھ اسے سنبھال گئے تھے۔ نظر اٹھی تھی سامنے آئیکت کا مسکراتا چہرہ تھا۔ وہ اس کے ہاتھ اپنے کاندھے سے ہٹاتی ہوئی سیدھی ہوگئی تھی۔ آئیکت کو اس کے انداز الجھن میں ڈال رہے تھے مگر وہ چپ تھا۔

”کاش! یہ سنبھالنے والے ہاتھ ابسام حیدر کے ہوتے۔ تب زندگی کتنی حسین ہوتی۔“ اس نے حسرت سے سوچا تھا اور دل سے ایک آہ آزاد ہوئی تھی۔

”ابسام حیدر! آپ بہت ظالم ہو، کتنی آسانی سے کہہ دیا آپ نے کہ آپ نوائم سے محبت کرتے ہیں اس سے جلد شادی کرنے والے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ میرا دل کانچ سا ہے ٹوٹ جائے گا۔ آپ کی بیگانگی آپ کی نارسائی مجھے کانچ سے پتھر بنا رہی ہے۔ میرا دل آپ کے لئے یوں موم ہوا ہے کہ میں آئیکت کی طرف سے سخت ہوئی جا رہی ہوں۔ یہ محبت مجھ سے میرا پہلا و آخری ساتھ، میرا سہارا، آئیکت کی دوستی، خلوص، سب چھین کر رہے گی۔“ اس نے آئیکت کے متفکر چہرے کو دیکھ کر کرب ناک اذیت سے سوچا اور آئیکت کی آواز پر چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اسے خود کو سنبھالنے کا کہہ رہا تھا۔ کمپوز کر کے شاہ زیب کے سامنے جانے کی ہدایت کر رہا تھا اور وہ نظر چرا کر محض اثبات میں گردن ہلاتی گزشتہ لمحات کی ڈور کو الجھا چھوڑ کر آنے والے لمحات کا سوچنے لگی تھی کہ اس کے لئے محبت سے بڑھ کر بھی کئی مسائل تھے۔

☆......☆......☆

”موِل! تمہیں بتانا ہے یا نہیں؟“ نوائم کے ہزار سوالوں کے جواب میں اس کی ایک خاموشی تھی اور نوائم کی برداشت ختم ہوگئی تھی اس لئے قدرے درشتگی سے غصہ میں پوچھ گئی تھی۔

”بتانے کو کچھ ہے ہی نہیں تو کیا بتاؤں؟“ وہ مصروف سے انداز میں بولی تھی۔

''سن لو تم مومی! جب بعد میں کچھ بتانا چاہو گی تب میں بھی نہیں سنوں گی۔'' نوائم سختی سے کہتی بیڈ سے اٹھ گئی تھی۔

''آبدار مجھے کچھ مشکوک سی لگی تھی۔'' نوائم پلٹ کر اسے دیکھنے لگی تھی جو اپنے کپڑوں پر استری کر رہی تھی اور ایک جملہ بول کر یوں بن گئی تھی جیسے کمرے میں موجود ہی نہ ہو۔

''مطلب کیا ہے تمہاری بات کا؟'' نوائم نے استری کا پلگ ہی نکال دیا تھا کہ وہ اب پہلے سے زیادہ متجسس ہو چکی تھی۔

''آبدار کے بارے میں جو بتایا گیا مجھے لگتا ہے حقیقت اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔'' وہ کپڑے ہینگ کرتے ہوئے بولی تھی۔

''کھل کر بات کرو مومی۔ کیوں فضول میں تجسس پھیلا رہی ہو۔'' نوائم بری طرح زچ ہو چکی تھی۔

''آبدار جو نظر آتی تھی درحقیقت وہ تھی نہیں۔ یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے۔ اس بات میں حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔'' مومل گہری سنجیدگی سے بولی تھی۔

''تمہیں ایسا وہم ہوا کیوں؟'' وہ دونوں بیڈ پر آ کر آمنے سامنے بیٹھی تھیں۔

''پھپھو نے کہا تھا کہ وہ ان کے دوست کی بیٹی ہے اور گزرے دنوں میں ان کی دوست کی کی کال تک نہیں آئی۔'' مومل کی بات پر نوائم بھی سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

''ہاں۔ تم کہہ تو بالکل ٹھیک رہی ہو۔'' نوائم کا انداز پرسوچ تھا۔

''پھپھو کی دوست کی کال آئی نہیں۔ مطلب آبدار کی مما کی کال نہیں آئی اور آبدار کے لئے اس کے کزن کی کال آئی اور وہ اسے آ کر لے بھی گیا۔'' مومل جیسے کڑی سے کڑی ملا رہی تھی۔

''یہ بات تو مجھے بھی عجیب لگتی ہے۔ آبدار کو اس کے پیرنٹس لینے کیوں نہیں آئے؟'' نوائم جلدی سے بولی۔

''یہی ساری باتیں مجھے متجسس کر گئی ہیں۔'' وہ نوائم کو اور بھی کچھ بول رہی تھی۔

''مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ اگر آبدار پھپھو کی دوست کی بیٹی نہیں تھی تو کون تھی؟ اور پھپھو کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ مومل کی بات کے درمیان حیرانگی سے بولی تھی۔

''یہی سب تو مجھے بھی حیران کر رہا ہے اور میں اس گتھی کو سلجھانا چاہتی ہوں۔'' مومل ترنت سے بولی تھی۔

''بہتر ہو گا تم اپنی مشکوک حرکتوں کو ترک کر دو اور مجھ سے تو ذکر کیا ہے، باقی کسی کے سامنے اپنا منہ بند رکھنا۔'' نوائم چڑ کر بولی تھی۔

''منہ بند رکھوں گی مگر دماغ اور آنکھیں کھلی رکھوں گی۔'' مومل آنکھ دبا کر کہتی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی تھی۔

''تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ بے چارے عبیر کے حال پر رحم فرمائے۔'' وہ مومل کو گھورتی اپنا موبائل اٹھا کر کینڈی کرش اسٹارٹ کر گئی تھی جبکہ مومل کے ذہن میں عبیر کا نام سن کر جھماکا سا ہوا تھا۔

''منگنی کی شام پتہ ہے عبیر نے مجھ سے کیا کہا تھا؟'' مومل کے انداز میں پراسراریت کی گہری چھاپ تھی اور نوائم کی توجہ گیم سے ایک سیکنڈ میں ہٹ کر مومل پر جا لگی تھی۔ مومل نے اسے عبیر سے ہوئی تمام بات بتا دی تھی۔

''اس بار تمہیں تجسس میں ڈالنے کا سہرا عبیر کو جاتا ہے۔'' نوائم تفصیل سن کر مزے سے بولی تھی۔

''کچھ ہاتھ تو عبیر کا بھی ہے۔'' وہ سو فیصد نہیں مگر تھوڑا بہت نوائم کی بات سے اتفاق کر گئی تھی۔

''میں نے عبیر کے کہنے کے بعد آبدار سے اس کی فیملی کے بارے میں پوچھنا چاہا تھا مگر وہ مصروفیت کا بہانہ کر کے اڑن چھو ہو گئی تھی۔'' مومل کو اٹل تشویش اسی دن ہوئی تھی جب وہ آبدار سے اس کی فیملی کا پوچھ رہی تھی اور وہ بہانہ کر کے یہ جا وہ جا ہوتی مومل کے لئے ہزار سوال چھوڑ گئی تھی۔

''میری مانو تو اس سب میں نہ الجھو اور پھپھو کی ویڈنگ اینورسری پر دھیان دو۔'' نوائم کی فطرت میں تجسس کی کمی تھی۔ وہ دوسروں کی زندگی میں مداخلت کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ مومل اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اس کی وجہ سے وہ انٹرسٹ لے لیتی تھی مگر کچھ ہی دیر میں اس کا انٹرسٹ ڈاؤن بھی ہو جاتا تھا۔ اس لئے وہ موضوع ہی بدل گئی تھی۔

''آج پھپھو سے بات کریں گے تا کہ شاپنگ پر جایا جا سکے۔'' مومل کسی بحث کے بغیر موضوع بدلنے پر ارادہ ظاہر کر گئی تھی۔

''تم پھپھو کو کیا گفٹ دو گی؟'' نوائم نے پوچھا تھا اور وہ نوائم کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرنے لگی تھی۔ مومل کا ارادہ ایسا گفٹ لینے کا تھا جو اس کی اور نوائم کی طرف سے ہوتا۔ نوائم خود کیسا گفٹ لے، مومل سے مشورہ کرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

آبدار کو اپنے سامنے دیکھ کر شاہ زیب کا خون کھول اٹھا تھا۔ اس کا دل کیا تھا کہ اس لڑکی کو جان سے مار دے جس کی وجہ سے ان سب کا سر جھک گیا تھا مگر وہ خود پر ضبط کے پہرے بٹھا گیا تھا۔ اس نے ڈرتے، جھجکتے شاہ زیب پر سلامتی بھیجی تھی۔ شاہ زیب نے دل پر پتھر رکھ کر آبدار کے سلام کا جواب دیا تھا۔

''میں نے گھر چھوڑنے کا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔'' آئیکت بھی آ گیا تھا۔ کافی دیر کی خاموشی کے بعد آئیکت نے بات کا آغاز کیا تھا۔ کچھ آئیکت بولا تھا جس کے جواب میں شاہ زیب نے اپنے غصے کا اظہار کیا تھا تب وہ روتے ہوئے بولی تھی۔

''تم اب کچھ بھی کہو آبدار، چاہے کتنی ہی صفایاں پیش کرو، خود پر تم گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا تمغہ سجا چکی ہو اور تمہاری اس حرکت کے باعث اور کزئی خاندان نے جو ذلالت برداشت کی ہے وہ نہ ہمیں بھول سکتی ہے نہ ہم معاف کر سکتے ہیں۔'' شاہ زیب بے لچک انداز میں بولا تھا۔

''بھگوڑی کہلانے کا مجھے بھی کوئی شوق نہیں تھا۔ آپ کو میرا اٹھایا قدم نظر آ رہا ہے۔ اس کے پیچھے چھپے اسباب کیوں نظر انداز کر رہے

ہیں آپ۔'' وہ انجام کی پرواہ کیئے بنا تلخی سے بول گئی تھی۔شاہ زیب کا گرم خون مزید کھول اٹھا تھا۔

'' بکواس بند کرلو آبدار۔اپنے کارنامے کو ہم سب پر مت تھوپو۔'' وہ درشتگی سے دھاڑا تھا۔

'' میں اپنا کارنامہ کسی پر تھوپ نہیں رہی۔مگر آپ یہ نہ بھولیں کہ میں نے یہ انتہائی قدم آپ سب کے مجبور کرنے پر اٹھایا۔'' وہ شاہ زیب کے غصہ سے ہرگز بھی خائف نہ ہوئی تھی۔شاہ زیب کو مشتعل ہوتے دیکھ کر آئیکت نے مداخلت کی تھی۔

'' آبدار۔'' وہ اسے ٹوک گیا تھا کچھ کہتا کہ وہ بول پڑی تھی۔

'' مجھے کہہ لینے دیں آئیکت۔'' وہ مدھم نہیں پڑی تھی اور چلتی ہوئی شاہ زیب کی وہیل چیئر سے کچھ فاصلے پر آن ٹھہری تھی۔

'' میں گھر سے کسی کی محبت میں نہیں اپنی بقاء کے لئے بھاگی تھی اور میں اپنے اقدام پر نادم نہیں ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی تھی۔شاہ زیب نے لب اور مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔آئیکت کو اس پر غصہ آنے لگا تھا وہ راستہ بھر اس کو سمجھاتا آیا تھا کہ وہ چپ رہے گی، شاہ زیب سے بحث نہیں کرے گی۔ایسی کوئی بات نہ کہے گی جو شاہ زیب کے اشتعال کا باعث بنے مگر وہ اس کے سمجھائے ہوئے کا الٹ کر کے اسے دکھا رہی تھی۔وہ شاہ زیب کے چہرے پر اشتعال کی سرخی دوڑتا دیکھ کر آنے والے وقت کا سوچتا ہول رہا تھا۔

'' تائی اماں، جنہوں نے مجھے ہمیشہ محبت دی، مما کو ان کے برے رویے کا احساس دلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہیں مگر میری اور آئیکت کی شادی کی بات چلی تو تائی اماں نے حقارت ونفرت سے مجھے ٹھکرا دیا۔جب تائی اماں مجھے اپنی بہو بنانے کے لائق نہیں سمجھتی تھیں تو میں کسی بھی گھرانے کی بہو بننے کے لائق نہیں ہوں۔یہی سوچ کر میں گھر سے بھاگ گئی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ جب میرے سسرال والوں کو میری اصلیت کا علم ہو تو وہ ٹھکرا دیں۔میرا شوہر مجھے بے عزت کر کے مجھے اپنے گھر سے نکال دے۔بعد کی ذلتوں سے بچنے کے لئے میں نے خود اپنے لیے ایک ذلت کا انتخاب کیا، گھر سے بھاگی ہوئی عورت کا خطاب، اور اپنے قدم پر نادم نہیں ہوں۔'' وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور وہ دونوں بالکل چپ تھے۔شاہ زیب کے چہرے پر اشتعال کی سرخی کی جگہ ندامت کی سرخی چھلکنے لگی تھی۔

'' مجھے آئیکت سے شادی نہیں کرنی ہے۔میں گھر سے آئیکت کی محبت میں فرار نہیں ہوئی۔میں اپنی پہچان کے حصول کے لئے دربدر ہوئی ہوں۔آپ میرے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو محمود خان تک پہنچنے میں میری مدد کریں۔'' وہ روتے ہوئے شاہ زیب کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ گئی تھی۔

'' یہ ممکن نہیں ہے آبدار۔تم اپنی پہچان حاصل نہیں کرسکتیں۔تمہاری پہچان اور کزئی خاندان ہے۔'' وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا تھا۔

'' میری پہچان اور کزئی خاندان ہوتا تو میری شادی آئیکت سے کرنے میں کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔'' وہ ترنت بولی تھی۔شاہ زیب لب پر لب جما گیا تھا اور خود کو کمپوز کر کے جو بول گیا تھا اسے سن کر وہ دونوں ہی حیران رہ گئے تھے۔وہ آبدار سے زیادہ بے یقینی سے شاہ زیب کو دیکھ رہا تھا۔

''میں تمہارا اور آئیکت کا نکاح پڑھوا دیتا ہوں۔'' وہ بے یقینی سے نکلتی خود اذیتی سے ہنستی چلی گئی تھی۔

''میں آئیکت سے شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔'' آئیکت کی نگاہیں آبدار کے سرخ چہرے پر آن ٹھہری تھیں۔

''میں نے آئیکت سے شادی کرنے کا فیصلہ اسی دن ترک کر دیا تھا جس دن مجھے اورکزئی خاندان نے ٹھکرا دیا تھا۔ اب آئیکت اورکزئی اس دنیا کا آخری مرد بھی ہوگا تو میں آئیکت سے کم از کم شادی نہیں کروں گی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بول رہی تھی اور آئیکت خود کو ہوا میں معلق سمجھنے لگا تھا۔ جس لڑکی کے لئے اس نے اتنی محبت اور خلوص سے اتنا کچھ کیا وہ کس قدر خودغرضی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''تم کیا بکواس کر رہی ہو، میں سمجھ نہیں پا رہا۔ اگر تمہیں آئیکت سے شادی کرنی ہی نہیں تھی تو آئیکت کی مدد سے گھر سے فرار کیوں ہوگئی تھیں۔'' شاہ زیب بری طرح الجھ کر بول رہا تھا۔

''میں نے آئیکت سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں آئیکت سے اورکزئی خاندان کے خلاف جا کر شادی نہیں کروں گی۔ آئیکت نے بہت چاہا کہ میں کورٹ میرج کرلوں مگر میں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ میں نے آئیکت پر صاف واضح کر دیا تھا کہ میں ان سے کورٹ میرج نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں، اورکزئی خاندان مجھے کبھی قبول نہیں کرے گا اس لئے میں خود بھی ذلالت بھری زندگی نہیں گزارنا چاہتی، اس لئے میں آئیکت سے یوں چند گواہان کی موجودگی میں نکاح نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ اب کھل کر بولی تھی۔ آئیکت یکدم دھیما پڑ گیا تھا کہ یہ سب وہ اس کی مدد لینے سے پہلے ہی صاف کہہ گئی تھی۔ ایسے میں پھر وہ اسے خودغرض کیسے کہہ سکتا تھا۔ خودغرضی تو خود اس نے دکھائی تھی۔ آبدار اس سے کورٹ میرج کے لئے تیار نہ تھی۔ اس لئے اس کی شرائط کو مان کر اسے اپنے دوست ابسام حیدر کے گھر رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ چند ماہ گزریں گے تو اس کا ابسام حیدر کے گھر رہنا محال ہو جائے گا۔ وہ جب اپنے لئے ہر دروازہ کو بند پائے گی تو اس سے نکاح کے لئے راضی ہو جائے گی۔ وہ اتنی خودغرضی کے لیے اپنی محبت کے آگے مجبور ہو گیا تھا مگر اپنی خودغرضانہ سوچ کے باوجود بھی آج آبدار کا صاف کہنا کہ آئیکت اورکزئی دنیا کا آخری مرد بھی ہوگا تو وہ اس سے شادی نہ کرے گی، اسے تکلیف واہانت کے احساس سے سلگا کر رکھ گیا تھا۔ اپنی خودغرضی کے باوجود اسے آبدار کی خودغرضی بری طرح کھلی تھی۔ شاہ زیب اس کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا تھا۔

''آبدار ٹھیک کہہ رہی ہے، میں نے تو آبدار کا ایک امید پر ساتھ دیا کہ چاہے اس کے دل میں میرے لئے کوئی فیلنگز ہوں یا نہ ہوں، میرے دل میں صرف اس کے لئے محبت بستی ہے۔ میں نے تو بس ایک جوا اس امید پر کھیلا کہ شاید میں اپنی محبت کو جیت سکوں۔'' وہ ہارے ہوئے انداز میں بولا تھا۔

''میں آپ سے شرمندہ ہوں آئیکت، کہ میں آپ کے احسانوں تلے دبی ہوں مگر جس طرح کی حقارت بھری زندگی گزاری ہے وہی میرا مقدر ہے۔ میں نہیں چاہتی، میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا آج بھی یہی کہوں گی کہ آپ میرے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو محمود خان تک رسائی حاصل کرنے میں میری مدد کریں۔'' وہ شرمندہ سی اپنی بات دہرا گئی تھی۔ آئیکت آگے سے کچھ نہیں بولا تھا۔

''تم محمود خان تک پہنچ کر کیا کرنا چاہتی ہو؟'' شاہ زیب کی سرسراتی آواز پر وہ آئیکت کے چہرے سے نگاہ ہٹاتی شاہ زیب کو دیکھنے لگی تھی۔

''تم اپنی پہچان حاصل کر کے اورکزئی خاندان کی برسوں سے بنی عزت کو تہہ خاک کر دینا چاہتی ہو۔۔۔''

''میں ایسا کچھ نہیں چاہتی۔۔۔''

''تم ایسا ہی چاہتی ہو ورنہ تم یہ جانتے ہوئے بھی کہ آبشار پھپھو پر بیتی داستان کی کسی کو خبر نہیں، تم دنیا کی نظر میں اورکزئی خاندان کی بیٹی ہو، کبھی اپنی پہچان کے حصول کے لئے کوشش نہ کرتیں کہ جس دن تم اپنی کوشش میں کامیاب ہوگی اس دن اورکزئی خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔'' شاہ زیب کا لہجہ نہایت سخت تھا وہ آبدار کو ناگواری سے دیکھ رہا تھا۔

''میں اپنی پہچان دنیا کے لئے نہیں خود اپنے لیے حاصل کرنا چاہتی ہوں کیونکہ دوسروں کی نگاہ سے گر کر تو جی لیا جاتا ہے مگر اپنی نگاہ سے گر کر نہیں جیا جاتا۔'' وہ خود ترسی سے اذیت ناک لہجہ میں بولتی ان دونوں کو ہی متحیر کر گئی تھی۔

''اورکزئی خاندان کی میں احسان مند ہوں کہ میں نے چاہے گھر میں سب کے کیسے ہی رویے کیوں نہ برداشت کئے لیکن میں ہمیشہ سر اٹھا کر چلی۔'' وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے روتے ہوئے کہتی جا رہی تھی۔

''میرا مقام آج بھی دنیا کے سامنے بلند ہے کہ میں ایک باعزت گھرانے کی بیٹی ہوں مگر میرا مقام میری نظروں سے گر گیا ہے کہ میری اصلیت مجھے سانس نہیں لینے دیتی۔ میں محمود خان سے ملنا چاہتی ہوں، اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ نفس کی غلامی کر کے وہ کیسے پرسکون رہے جبکہ میرا تو سارا سکون غارت ہو گیا ہے۔'' وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے بلک رہی تھی۔

''مجھے صرف محمود خان تک پہنچا دیں، میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں شاہ زیب بھیا، کہ اورکزئی خاندان کی عزت پر حرف نہیں آئے گا۔'' وہ آنسو رگڑتے ہوئے شاہ زیب کو دیکھنے لگی تھی۔

''اورکزئی خاندان کی عزت پر حرف اس دن نہیں آیا تھا جب آبشار اورکزئی کسی کی ہوس کا شکار ہوئی تھی۔ اس دن اورکزئی خاندان کی عزت پر حرف آ گیا تھا جب آبدار اورکزئی گھر سے فرار ہوئی تھی۔'' شاہ زیب صاف گوئی کی انتہا پر تھا اور وہ ساکت رہ گئی تھی۔ ''چاہے تم کسی بھی سبب گھر سے فرار ہوئیں، تم نے ثابت کر دیا کہ جوتوں کو سر پر نہیں رکھا جاتا۔'' شاہ زیب نفرت سے پھنکارا تھا۔ اس کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ لب کانپنے لگے تھے۔

''تمہیں اورکزئی خاندان نے نام دیا، عزت دی، تم گھر سے بھاگ گئیں، ہم کسی سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہے اور وجہ کی بات کرتی ہو آبدار، گناہ کرنے کی بھی کوئی وجہ ہوتی ہے؟'' وہ بھگو بھگو کر اسے مار رہا تھا اور اس کی نگاہیں جھکتی چلی گئی تھیں۔

''ہم نے تمہیں ٹھکرایا تو تم نے کیسا بدلہ لیا، ہمارے سروں پر خاک مل کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ جہاں جاؤ گی

اور کزئی خاندان کی بیٹی ہی کہلاؤ گی ۔تم نے ہم سے کس بات کا بدلہ لیا، اس بات کا کہ تمہیں ساری عمر سر اٹھا کر چلنے میں مدد کی، نام دیا، پہچان دی۔۔۔اور تم ایک سراب کے پیچھے، جھوٹی پہچان کے لئے اور کزئی خاندان کی ذات پر بٹہ لگا گئیں، دہلیز پار کرتے تمہیں ہمارے احسانات یاد نہ آئے؟'' وہ آئیکت کی بھی کھری کھوٹی سن چکا تھا، آبدار کے تیور بھی ملاحظہ کر لیے تھے اس لیے اب کے وہ کھل کر میدان میں اترا تھا اور وہ دونوں بغلیں جھانکنے لگے تھے۔

''آبدار کو گھر سے بھاگ جانے پر میں نے مجبور کیا تھا۔'' آئیکت نے مداخلت کی تھی۔

''تم تو اپنی بکواس بند ہی رکھو آئیکت ۔کہ میں جان گیا ہوں کہ تم مدد نہ کرتے تو بھی آبدار نے یہ انتہائی قدم اٹھانا ہی تھا۔اس کے خون میں ہی مروت اور وفا نہیں اور تم۔۔۔تم نے خود اور کزئی خاندان کا حصہ ہوتے ہوئے اسے برباد کر دیا۔محبت کا راگ الاپتے ہوئے ہم سے عزت کی چادر چھین لی جبکہ اگر خاندان کی عزت اور محبت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کا مرحلہ آ ہی گیا تھا تو تمہیں عزت کو چن لینا چاہیے تھا کہ عزت کا نعم البدل کچھ نہیں ہوتا، جبکہ محبت کب، کس سے ہو جائے، پچھلا ساتھی کب ذہن سے نکل کر دل کی سرزمین خالی کر جائے یہ محبت کو بھی نہیں پتہ ہوتا۔'' شاہ زیب اور کزئی کے انداز میں کوئی لچک نہ تھی اور وہ دونوں ہی اپنے آپ سے بھی شرمندہ ہوئے نظر چرائے اپنی اپنی جگہ موجود تھے۔

''تم سے چاہے کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو خاندان کی عزت کے لیے تمہیں بہو بنا لیا جاتا، کہ ہمارے لئے کچھ معنی رکھتا ہے تو وہ ہے اور کزئی خاندان کی عزت، ساکھ۔'' شاہ زیب کا لہجہ یکسر بدل چکا تھا اس کے لہجہ میں ایسا کچھ تھا کہ وہ رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی تھی جبکہ آئیکت بھی حیرانگی سے نکل کر مکمل شاہ زیب کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔'' آبشار پھپھو نہیں چاہتی تھیں کہ تمہاری اور آئیکت کی شادی ہو۔'' وہ کوئی بم تھا جو ان دونوں کی سماعتوں پر پھٹا تھا جبکہ وہ تفصیل کہتا چلا گیا تھا۔

''آئیکت نے جب شادی کے لئے تمہارا نام لیا سب ہی کو اعتراض تھا، جس کا بھی جو ردعمل تھا وہ سب تم دونوں کے سامنے تھا مگر تایا ابو کا یہی کہنا تھا جو تم نے کہا کہ تمہارے نام کے آگے اور کزئی خاندان کا نام لگا ہے۔اس لیے جیسے اب تک عزت کے لئے خون کے گھونٹ پیئے یہ کڑوا گھونٹ بھی امرت سمجھ کر پی لیا جائے۔۔۔اور ایسا ہی ہوتا کہ تایا ابو کے فیصلے کے آگے آبشار پھپھو آ گئیں۔'' وہ ہارے ہوئے انداز میں تفصیل بتا رہا تھا اور آئیکت حیران تھا کہ وہ اس سب سے لاعلم کیسے رہ گیا تھا؟

''آبشار پھپھو کا کہنا تھا کہ انہوں نے زندگی کے بائیس سال تمہیں برداشت کیا کہ وہ ان کی مجبوری تھی، ورنہ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ تمہیں اپنی نگاہ سے بہت دور کر دیتیں۔'' وہ تفصیل بتا رہا تھا اور آبدار کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔جن کی نگاہ میں رہنے کا دل فیصلہ کرے، اور وہ ہمیں دھتکار دیں تو دل جس کرب سے گزرتا ہے وہ اس وقت اسی کرب میں خود کو گھرتا ہوا محسوس کر رہی تھی کہ اسے بچپن سے یہی پتہ تھا کہ آبشار اس کی پھپھو ہیں مگر آبشار جس طرح اسے نفرت آنکھوں میں بھر کر دیکھتی تھیں آبدار نفرت کی وجہ سمجھے بنا ہمیشہ یہ خواہش کرتی تھی کہ کاش

اس کی پھپھو کی نگاہ میں نفرت کی جگہ محبت سما جائے۔۔۔مگر زندگی کے طویل سال اس کاش میں گزر گئے تھے اور جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ اس کی ماں آبشار اور کرنزئی ہے، خواہش نے زور پکڑ لیا تھا۔جس وقت اس نے گھر چھوڑا تھا وہ آخری بار آبشار کے روم میں چپکے سے گئی تھی آبشار کے چہرے کو محبت وحسرت سے تادیر دیکھتی رہی تھی۔وہ آبشار کو ابسام کے گھر میں شدت سے یاد کرتی رہی تھی۔قلبی تعلق تو پیدائش کے ساتھ ہی جڑ گیا تھا اور جب سے رشتہ کی حقیقت علم میں آئی تھی قلب کو بے چینی لاحق ہوئی تھی۔آبشار اور کرنزئی جسے آبدار پھپھو کہتی تھی، ماں کہنے کی حسرت اب آبدار کے لبوں پر مچلتی تھی اور اب شاہ زیب اسے کیسے دردناک انکشافات کی مار مار رہا تھا۔آبدار کو لگا تھا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔

''لیکن وہ چاہ کر بھی تمہیں اپنی نظر سے دور نہ کرسکیں اور اب تمہاری شادی کے ذریعے ان کی برسوں پرانی خواہش کو کامیاب دیکھنے کی امید سی بندھی ہے۔تو وہ آئیکت سے تمہاری شادی کر کے اپنی خواہش سے دست بردار نہیں ہوسکتیں۔''

آبدار کا چہرہ خطرناک حد تک سفید پڑ چکا تھا۔آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں اس کی حالت دیکھ کر آئیکت کا دل دکھ سے بھر چکا تھا جبکہ شاہ زیب اس پر ترس کھانے کے بالکل بھی موڈ میں نہ تھا۔

'' آبشار پھپھو کے سختی سے انکار پر تمہاری آناً فاناً شادی طے کر دی تھی۔۔۔اور تم نے ہمارے احسانات کا یوں بدلہ دیا کہ گھر سے ہی چلی گئیں۔لڑکے والوں کے سامنے جو ہمیں ذلالت اٹھانا پڑی اس سب کی صرف تم ہی نہیں آئیکت بھی ذمہ دار ہے۔تم دونوں نے اپنے اپنے مفادات کے لئے اور کرنزئی خاندان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور اس کے لئے ہم لوگ تم دونوں کو ہرگز بھی معاف نہیں کریں گے۔'' شاہ زیب تمام تفصیل بتا کر چپ کر گیا تھا۔

''میں آبشار پھپھو کے فیصلے سے انجان کیسے رہا؟'' آئیکت کے لبوں سے سرسراتا ہوا نکلا تھا۔

''تم بھول رہے ہو کہ تم ان دنوں بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے۔'' شاہ زیب کی بات اسے بہت کچھ یاد دلا گئی تھی۔وہ یہ کیسے بھول گیا تھا کہ وہ ملک سے باہر تھا اس لئے ہی تو وہ آبدار کے رشتہ طے ہو جانے کے بارے میں بھی کافی تاخیر سے آگاہ ہوا تھا۔آبدار کا دل چاہا تھا کہ وہ آئیکت کی طرح پوچھ لے کہ وہ تو اسی گھر میں رہتے ہوئے بھی ہر بات سے انجان ہی تھی اس کی کیا وجہ تھی؟ مگر وہ آبشار اور کرنزئی کے فیصلہ کا سن کر ہی اتنی دکھی تھی کہ کچھ پوچھنے کا حوصلہ ہی ہار بیٹھی تھی۔

''میں تو خیر پاکستان سے باہر تھا مگر یہ آپی تو گھر پر ہی تھی یہ کیوں ہر بات سے انجان رہی۔'' آئیکت نے اس کے دل کی بات لب سے کہہ دی تھی۔

''تم یہ سوال کر بھی کیسے سکتے ہو؟'' شاہ زیب کی بات پر آئیکت اسے حیرت سے دیکھنے لگا تھا۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا؟'' آئیکت کے لب ہلے تھے۔

''تم اچھے سے جانتے ہو ہمارے گھر کے معاملات کے بارے میں۔۔۔ بابا اور تایا ابا کی کیا بات ہوتی ہے کبھی ہم لوگوں کے علم میں نہیں آتی۔'' جوان کے ساتھ معاملات رہے تھے وہ دونوں بھائی اکثریوں میٹنگ کرتے تھے کہ بچوں کو کسی بات کا علم نہیں ہوتا تھا۔

''مجھے آبشار پھپھو نے سب بتایا تھا۔'' وہ دونوں اسے سوالیہ نگاہ سے دیکھنے لگے تھے اور وہ دونوں کی نگاہ کے سوال کے جواب میں بولا تھا اور وہ دونوں چپ کے چپ رہ گئے تھے کہ اورکزئی خاندان میں ذہن و دل کی بات اگر آبشار کسی سے کرتی تھیں تو وہ ان کا بھتیجا شاہ زیب اورکزئی تھا۔ ایسے میں اگر وہ سب لاعلم تھے اور شاہ زیب آگاہ تھا تو حیرت اور اچنبھے والی کوئی بات نہ تھی۔ یکدم ہی کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی تھی اور اس خاموشی میں آبدار کی مدھم آواز شگاف ڈال گئی تھی۔

''شاہ زیب بھیا۔ آپ مجھے محمود خان کے گھر پہنچا دیں۔ ان سے کیا، کیسے بات کرنی ہے، یہ میرا فیصلہ ہوگا۔ بس مجھ پر اتنا یقین رکھیے گا کہ جس بات پر برسوں سے پردہ ہے وہ دنیا کے سامنے عیاں نہ ہوگی۔'' آبدار کی سنجیدگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ شاہ زیب تادیر گہری سوچ میں رہا تھا کہ یکدم کسی فیصلہ پر پہنچ گیا تھا۔

''تم جا کر آرام کرلو میں کچھ کرتا ہوں۔'' شاہ زیب فی الحال ان دونوں کو اپنے پروگرام سے آگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے فیصلہ کر لینے کے باوجود کچھ نہیں بولا تھا۔ آئیکت کچھ کہنے لگا تھا مگر شاہ زیب نے موقع نہیں دیا تھا اور آبدار کو لاک کر کے وہ دونوں وہاں سے چلے گئے تھے۔ شاہ زیب نے اسے کچن میں کیا کچھ موجود ہے تفصیل بتا دی تھی۔ جاتے ہوئے آئیکت خاموش تھا۔ بے حد خاموش۔

☆......☆......☆

''شاہ زیب۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' پہلے شاہ زیب کی کال اسے اندر تک سرشار کر دیتی تھی اور اب یہ عالم تھا کہ شاہ زیب کی کال پر اس کا دل وسوسوں اور خدشات میں گھر جاتا تھا اور اس کے نمبر پر شاہ زیب کی کال آ رہی تھی۔ وہ یکدم ہی مضطرب ہو گئی تھی اور دل کیا تھا کہ وہ اس کی کال ریسیو نہ کرے مگر وہ کال ریسیو کر گئی تھی اور جو کچھ وہ بولا تھا اسے سن کر تو عریم کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے تھے۔

''اگر بہری ہو گئی ہو تو بھی یہ نہ بھولو کہ مجھے بات دہرانا ہرگز بھی پسند نہیں ہے۔'' وہ نہایت درشتگی سے کہتا عریم کو بے سکون کر گیا تھا۔

''شاہ۔'' وہ منمنائی تھی۔

''تم اپنے باپ سے بات کرو، میں آدھ گھنٹہ تک تمہیں کال کرتا ہوں۔ یہ یاد رکھنا ''ناں'' سننے کے موڈ میں، میں کبھی نہیں ہوتا۔'' وہ صرف اپنی سناتا رابطہ منقطع کر گیا تھا وہ ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔ شاہ زیب تو ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی آزمائش بنتا جا رہا تھا۔ اس کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ شاہ زیب کا فیصلہ کیسے ان تک پہنچائے مگر گزرتے وقت کا احساس ایسا تھا کہ وہ کمرے سے نکلی تھی۔ ڈائریکٹ باپ سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی وہ ماں کے پاس آن ٹھہری تھی۔ وہ بیٹی کے زرد متفکر چہرے کو دیکھ کر ہی ہول اٹھی تھیں کہ بیٹی کا چہرہ دیکھ کر کسی زمانے میں راحت محسوس ہوتی تھی اب تو بیٹی کے چہرے پر نظر پڑتی تھی تو دل دہل جاتا تھا کہ اب نجانے وہ کس طوفان کی خبر کے ساتھ

ان کے سامنے آئی ہے۔

''ماما! وہ شاہ کی کال آئی تھی۔'' وہ نہایت شرمندگی سے نظر چرا کر بولنے لگی تھی اور ان کا دل آنے والے طوفان کا سوچ کر ہی دہل گیا تھا۔ اس نے ماں کے چہرے کی طرف نظر کی تھی، ان کا چہرہ کسی انہونی کے خیال سے ہی زرد پڑ چکا تھا اور ماں کی شکل دیکھ کر اس کا دل کیا تھا کہ چلّو بھر پانی میں ڈوب مرے۔

''اب کیا حکم نامہ جاری ہوا ہے۔ بتا دو ہم تو حکم کے غلام ہیں۔ جو آرڈر ملے گا، سرِ تسلیم خم ہے۔'' وہ ہارے ہوئے انداز میں بولی تھیں اور وہ ہچکچاتے ہوئے تمام بات ماں کے سامنے رکھ گئی تھی۔ نتاشہ کو لگا تھا کہ جیسے وہ عرش سے فرش پر آن گری ہیں۔ یہ بات ہی ان کے لئے سوہانِ روح تھی کہ ان کے شوہر کی ایک ناجائز اولاد بھی ہے۔ ان کی نفس پرستی کا شاخسانہ۔۔۔ اور ان کا داماد چاہتا تھا کہ وہ لڑکی جو اُن کے شوہر کی ہوس کا ثبوت تھی وہ ان کے گھر رہے، ان کی آنکھوں کے سامنے۔ یہ بات سن کر ہی انہیں لگا تھا کہ ان کا دل دھڑکنا بند کر دے گا مگر پے در پے ہونے والے واقعات نے انہیں سخت جاں بنا ڈالا تھا۔

''میں تمہارے پاپا سے کرتی ہوں بات۔'' وہ دھیمے سے کہتی ہوئیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''ماما! شاہ نے کہا ہے کہ انکار ہوا تو وہ مجھے ڈائیورس کر دیں گے۔'' ان کے اٹھتے قدم بیٹی کی نمناک، خوف اور خدشات سے لبریز آواز پر تھم سے گئے تھے۔

''تم اس سے کہہ دو کہ ہماری طرف سے ہاں ہے کہ ہم انکار کا حق نہیں رکھتے۔'' وہ سرسراتے لہجے میں بولی تھیں اور شوہر تک داماد کا نیا مطالبہ پہنچا دیا تھا۔

''میں شاہ زیب سے بات کرتا ہوں۔ یہ ناممکن ہے۔'' وہ رگوں کو چیرتی اذیت کا شکار ہوتے گہرے ملال کے ساتھ بولے تھے۔

''ناممکن تو خدا کی نافرمانی بھی نہیں ہوتی۔ جب خدا کے واضح احکامات کے باوجود آپ جو کر گئے اس کے بعد یہ سب ہو رہا ہے یہ ناممکنات میں سے ہے محمود۔ کہ رب کے نافرمانوں کے لئے تو اس سے زیادہ ذلت مقدر ہوتی ہے۔ ابھی تو بس شروعات ہے۔ یہ سوچیں کہ اختتام تک ذلت کی حد کیا ہو گی۔ اس ذلت کا کوئی انت ہو گا بھی کہ نہیں۔'' نتاشہ کے آنسو خشک ہو گئے تھے وہ بیوی کے چہرے کو دیکھنے لگے تھے ان کے خوبصورت چہرے پر موت کا سا سناٹا پھیلا تھا۔ وہ بیوی کے چہرے سے نگاہ ہٹا گئے تھے۔

''نتاشہ! مجھے معاف۔۔۔''

''معافی کا قصہ نہ ہی چھیڑیں تو بہتر ہو گا۔ جو قیامت منتظر ہے اس کا سوچیں کہ آپ نے اس سے کیسے نبرد آزمائی کرنی ہے۔'' وہ شوہر کی بات کے درمیان گہری سنجیدگی سے بولی تھیں اور کمرے سے نکل گئی تھیں۔ محمود خان ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ انہوں نے کہاں سوچا تھا کہ عمر کے اس دور میں ان کی نام نہاد عزت یوں برباد ہو جائے گی۔

شاہ زیب نے نئی شرط یہی رکھی تھی کہ آبدار ان کے گھر رہے گی اور یہ بات ان کے لئے سوہان روح تھی۔ وہ گناہ جسے وہ کئی برس پہلے کر کے بھول گئے تھے، وہ گناہ ان کی سزا بن کر کئی برس بعد چل کر ان تک آ رہا تھا۔ وہ بیوی اور بیٹی کی نگاہ سے گر گئے تھے۔ خود سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہے تھے اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وہ لڑکی جو اُن کے گناہ کا ثبوت تھی جب وہ چل کر ان تک آئے گی تو وہ اس سے کیا کہیں گے، اس کا سامنا کیسے کریں گے۔ ان کا دل رک رک کر چل رہا تھا مگر وہ جان گئے تھے کہ دنیا مکافات عمل ہے وہ جو کچھ کر گئے تھے اس کی سزا دنیا میں ہی وصول کر کے جائیں گے۔ ذلت و رسوائی کا اژدھا انہیں نگلنے کو تھا۔ جس لڑکی کی عزت تار تار کی تھی اس کو تو فراموش کر گئے تھے، اپنے گناہ کے بیج کو اپنا نام نہ دیا تھا۔ وہ جب صاحب اقتدار تھے، جب وہ بااختیار تھے، جو چاہتے تھے وہ کر گئے تھے۔ خدا اور رسول ﷺ کی نافرمانی کرتے بھی دل نہیں کانپا تھا۔ اور آج جب ان کا گناہ پل کر جوان ہو گیا تھا اور ان تک چل کر آ رہا تھا تو دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

''یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ میں زانی ہوں۔ گناہگار ہوں۔ بخش دے میرے مولا۔'' وہ زمین پر گھٹنوں کے بل گرے تھے اور ہچکیوں سے رونے لگے تھے۔

انسان تا عمر نفس کی غلامی کرتا ہے۔ اللہ کو اپنا رب مان کر اس کے سامنے سربسجود بھی ہوتا ہے مگر دل میں، برائیوں کی، گناہوں کی، نفس کے شر کی اتنی محبت بسی ہوتی ہے کہ رب کا اقرار کر کے بھی منافقوں کی طرح زندگی گزارتا ہے اور جب نفس کے زرد کتے کا پیچھا کرتے کرتے گناہ میں لتھڑ کر سرپٹ دوڑتے منہ کے بل زمین پر آ گرتا ہے تو آسمان والے رب کی مہربانیاں یاد آنے لگتی ہیں، اس کے کرم کی بھیک مانگنے لگتا ہے مگر انسان ہمیشہ یہ بھول جاتا ہے کہ اللہ رحمٰن و رحیم ہے تو المنتقم (مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے والا) اور المذل (ذلت دینے والا) بھی اللہ ہی ہے اور قرآن پاک میں جہاں اللہ کی رحمتوں کا ذکر ہے، صبر و شکر کرنے والوں کے لئے جنت کی بشارت ہے تو اللہ کے نافرمانوں کے لئے بھی سزائیں تجویز ہیں۔ نیکی کا صلہ جنت اور بدی کا صلہ دوزخ۔۔۔ اور زانی کے لئے قرآن پاک میں واضح طور پر سزا بیان کر دی گئی ہے تو محمود خان کس خوش فہمی میں زندہ تھے کہ گناہ کر کے، اللہ کی نافرمانی کر کے بچ نکلیں گے تو اب جیسے جیسے ان پر زندگی کا دائرہ تنگ ہو رہا تھا انہیں احساس ہوتا جا رہا تھا کہ خدا کی لاٹھی بڑی بے آواز ہوتی ہے۔

آ جاؤ گے حالات کی زد پر جو کسی دن
ہو جائے گا معلوم، خدا ہے کہ نہیں ہے

☆......☆......☆

''آپ نے محمود خان سے ایسا کیا کہا ہے کہ وہ مجھے اپنے گھر پر رکھنے کے لئے راضی ہو گئے؟'' شاہ زیب کچھ دیر قبل ہی اپنے اپارٹمنٹ پر واپس آیا تھا۔ آئیکت اسے چھوڑ کر ضروری سامان لینے چلا گیا تھا۔ اس نے آئیکت کو اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا اور وہ چپ

رہا تھا کہ اسے اب کچھ یاد تھا تو صرف آبدار کا ایک جملہ۔آئیکت دنیا کا آخری مرد بھی ہوگا تو میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔اور اس ایک جملے نے آئیکت کو فنا کر ڈالا تھا۔اس کی محبت کی توہین کی تھی۔ وہ آبدار کے وجود سے ہی خائف ہو چکا تھا۔اس کے سامنے سے کترا رہا تھا اس لئے شاہ زیب کو چھوڑ کر وہ سامان لانے کے بہانے باہر کے باہر سے ہی چلا گیا تھا۔ویسے بھی اندر آ کر کیا ملنا تھا، فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ آبدار کو اس سے شادی نہیں کرنی۔ وہ محمود خان کے گھر جا رہی ہے۔سارے فیصلے آبدار کے تھے اور جب وہ فیصلہ لے چکی تھی تو آئیکت اس کے کسی فیصلہ کو بدلنا چاہتا ہی نہ تھا۔شاہ زیب نے آبدار سے کہا تھا کہ وہ محمود خان کے گھر جانے کی تیاری کر لے اور اسے کہاں امید تھی کہ محمود خان جس نے اسے اپنا نام دینے سے انکار کر دیا تھا اب ایک دم، ایک بار کہنے پر اسے اپنے گھر رکھ لینے کا عندیہ جاری کر دیا تھا۔

''محمود خان ایک معزول بادشاہ ہے آبدار۔ جب تک وہ صاحب اقتدار تھا جو چاہا کر لیا، اب اس کے اقتدار کے دن گئے۔اب وہ صرف وہ کرے گا جو میں چاہوں گا۔'' شاہ زیب کا لہجہ آنچ دیتا ہوا تھا۔آبدار جس نے بہت مشکل سے خود کو شاہ زیب کے معاملے میں مداخلت سے روکا ہوا تھا سارے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔

''آپ کو نہیں لگتا کہ آپ غلط کر رہے ہیں۔'' وہ دھیمے سے پوچھ گئی تھی جبکہ وہ آبدار کی بات نہیں سمجھا تھا سوالیہ نگاہ سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''محمود خان سے بدلہ لینے کے لئے آپ نے جو کچھ کیا اس بارے میں بات کر رہی ہوں۔'' وہ سوالیہ نگاہ کے جواب میں سنجیدگی سے بولی تھی۔

''تمہیں یہ سب آئیکت نے بتایا ہے؟'' اسے آئیکت سے یہ امید نہ تھی کہ وہ آبدار کو سب کچھ بتا دے گا اس لئے وہ قدرے برہمی سے پوچھ گیا تھا۔

''جی۔اور مجھے لگتا ہے کہ آپ غلط کر رہے ہیں۔گناہ گار ہے تو محمود خان ہے اور سزا آپ نے اس کی بیٹی کا مقدر کر دی ہے۔'' آبدار نے اعتراف کرتے ہوئے کہ آئیکت اسے سب کچھ بتا چکا ہے اپنا مؤقف اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستا ہے۔سنا تو ہوگا تم نے۔'' وہ اپنے مخصوص لاپرواہ قدرے بے حس انداز میں بولا تھا۔

''مگر آپ غلط کر رہے ہیں شاہ زیب بھیا۔'' وہ ترنت سے بولی تھی۔

''میں جانتا ہوں کہ کیا صحیح کر رہا ہوں کیا غلط۔تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو بس اتنا یاد رکھنا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ محمود خان کو سبق سکھانے کے لئے کر رہا ہوں اور محمود خان کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے ہر حد تک جا سکتا ہوں۔'' وہ بالکل بھی دھیما نہیں پڑا تھا۔

''یہ دنیا مکافات عمل ہے شاہ زیب بھیا اور آج جس طرح آپ محمود خان سے بدلہ لے رہے ہیں۔اس کو انجام تک پہنچانا چاہتے ہیں، ہر حد تک جانے کیلئے تیار ہیں تو یہ مت بھولیے گا کہ یہ وقت کل آپ پر بھی آ سکتا ہے۔'' وہ شاہ زیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولی تھی۔شاہ زیب نے لب بھینچ لئے تھے۔

''آبشار اورکزئی کا بھتیجا اپنی پھپھو کو انصاف دلانا چاہتا ہے تو کل کو عریم محمود کا بیٹا یا بھتیجا آپ تک بھی انصاف کی چاہ میں بدلہ لینے کو پہنچ سکتا ہے۔خدا کی لاٹھی بڑی بے آواز ہوتی ہے۔کل اگر محمود خان ظالم تھے تو آج آپ ظلم کما رہے ہیں۔جب محمود خان آپ کی نگاہ میں سزا کا حقدار ہے تو کسی کو تو آپ بھی سزاوار لگیں گے۔کوئی تو آپ کا گریبان پکڑ کر پوچھے گا کہ آپ نے عریم محمود کے ساتھ یہ سب کیوں کیا۔'' آبدار کی آنکھیں لہو چھلکا رہی تھیں۔شاہ زیب کی بولتی بند ہوگئی تھی۔وہ لب بھینچے بیٹھا تھا۔

''میں عریم کو بہت اذیت دے رہا ہوں اس کے لئے میں خود سے بھی شرمندہ ہوں مگر میں بہت مجبور ہوں۔'' وہ کافی دیر کی تکلیف دہ خاموشی کے بعد کہہ اٹھا تھا۔

''جس بات پر وقت نے دھول ڈال دی تھی اسے اڑانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔خود مجبور ہو کر کسی اور کو مجبور کرنا کہاں کی عقلمندی ہے۔'' وہ آنسو رگڑتے ہوئے بولتی صوفہ پر ٹک گئی تھی۔

''آبشار پھپھو کی اذیتوں کا میں گواہ ہوں، ان کا راز دار و غمگسار ہوں۔مجھے لگا کہ مجھے آبشار پھپھو کے مجرم کو سزا دلانا چاہیے۔جس قدر بے سکون تا حیات پھپھو رہیں، اسی طرح تمام عمر وہ محمود خان بھی بے سکون رہے، میں لیکن سمجھ نہیں پا رہا تھا آبدار کہ میں ایسا کیا کروں کہ محمود خان اذیتوں میں گرفتار ہو جائے۔'' شاہ زیب کافی گہرا شخص تھا ذہن و دل کی بات یوں کسی سے نہیں کرتا تھا مگر اس دن آئیکت سے بھی کہتا چلا گیا تھا اور آج آبدار کے سامنے بھی دل کھول کر رکھ دیا تھا۔وہ اسے حیرانگی سے سن رہی تھی۔

''میں ایک دن بہت اچانک محمود خان سے سر محفل ٹکرا گیا۔وہ بزنس پارٹی تھی۔محمود خان کا پرسکون چہرہ، کامیاب زندگی نے میری آنکھوں میں مرچیں سی بھر دی تھیں وہ شخص جس نے آبشار پھپھو کی زندگی برباد کر دی خود کتنی پرمسرت زندگی بسر کر رہا تھا۔میں نے اسی دن سوچ لیا تھا کہ اب تو مجھے کچھ کرنا ہی ہے۔تب ہی میں عریم سے ٹکرا گیا بلکہ سب کچھ پلان ہوتا چلا گیا۔'' وہ کہتے کہتے لحظہ بھر کو رکا تھا۔

''میری سوچ میں، میرے کردار میں کوئی عیب نہ تھا اس لئے میں نے عریم سے نکاح کیا۔میں جو کچھ کر رہا ہوں صرف محمود خان کو اذیت دینے کے لئے کر رہا ہوں ورنہ میرے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ میں عریم سے نکاح نہ کرتا یا اب تک طلاق دے چکا ہوتا۔میں خود کو عریم کا مجرم پاتا ہوں۔اس لڑکی کا مجرم جس نے مجھ پر اندھا اعتماد کیا، جو مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن میں یہ سب کرنے پر مجبور ہوں۔'' وہ چپ کر گیا تھا۔آبدار آگے سے کچھ نہیں بولی تھی کہ اسے شاہ زیب پر تو پہلے ہی یقین تھا کہ وہ کچھ غلط نہیں کر سکتا اب تو اس کی سوچ جان چکی تھی اس لئے وہ قدرے مطمئن ہوگئی تھی۔ایک امید سی بندھ گئی تھی کہ عریم محمود خان کی یہ محض آزمائش ہے چند سالوں تک ختم ہو جائے گی۔عریم کم از کم آبشار اورکزئی کی مانند سیاہ نصیب نہیں کہ جس کی جوانی و بڑھاپا سکتے، اذیتوں میں گرفتار گزر گئے تھے۔

''دل کو سکون دوسروں کی بے سکونی سے نہیں ملتا۔دل کو سکون تو دوسروں کو سکون دے کر ملتا ہے۔'' وہ دل گرفتگی سے سوچتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی اور اپنا سامان پیک کرنے لگی تھی۔وہ محمود خان کے گھر اب جانا نہیں چاہتی تھی۔وہ یہ سوچ کر مضطرب ہو رہی تھی کہ شاہ زیب نے جانے کیا کہہ کر انہیں راضی کیا ہے۔

''مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں جو ایک فیصلہ کر کے محمود خان تک جا رہی ہوں اس میں میرا سکون پوشیدہ ہے یا میرا رہا سہا سکون بھی مجھ سے جدا ہونے کو ہے۔'' وہ ہینڈ بیگ کاندھے پر ڈالتے ہوئے سفری بیگ اٹھائے سوچتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی اور آخری امید کے تحت اس نے ایک بار پھر شاہ زیب سے پوچھ لیا تھا۔

''بار بار پوچھ کر کیوں شرمندہ کر رہی ہو۔'' وہ چاہ کر بھی غصہ نہیں کر پایا تھا۔

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ میں محمود خان کی محض مجبوری بن کر جا رہی ہوں یا اس میں کچھ ہاتھ ندامت کا بھی ہے۔'' اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''تم صرف مجبوری بن کر جا رہی ہو کہ محمود خان ابھی ندامت کے تیر تک پہنچا ہی نہیں کہ ابھی وہ صرف اپنی عزت، اپنی بیٹی کے ہاتھوں مجبور ہے۔ وہ جو کر رہا ہے صرف اس لئے کہ اس کی بیٹی کی بدنامی نہ ہو۔ اور میرا تم سے وعدہ ہے آبدار، جس دن محمود خان اپنے کئے پر نادم ہوگا، جس دن اسے اپنا آپ آبشار اور کرزئی کا مجرم لگے گا اور وہ معافی کا طالب ہوگا میں اس دن اسے مجبور کرنا چھوڑ دوں گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا تھا۔ آبدار آگے سے کچھ کہنے بنا باہر کی طرف بڑھ گئی تھی کہ کافی دیر سے آئیکت اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

میرے عزیزو مجھے نہ روکو
دعائیں دے کر کرو روانہ
میں جسمِ نم پہ صلیب گریہ اٹھائے
گھر سے تلاش ہستی کو جا رہا ہوں
حریم جاں سے حریم ہستی تلک کا رستہ کٹھن تو ہوگا
مگر یہ رستہ تو کاٹنا ہے
کہ مجھ پہ کچھ تو کھلے میں کیا ہوں؟
اگر میں ہوں تو کہاں پڑا ہوں؟
میں کس لئے ہوں؟
اگر نہیں ہوں تو کیوں نہیں ہوں؟
میرے عزیزو میں لوٹ پایا تو
آگے سب کچھ بیاں کروں گا
یہ راز ہستی عیاں کروں گا

اگر نہ لوٹا تو شب ڈھلے گی
سسکی، روتی ہوئی صداؤں میں یاد رکھنا
میرے عزیزو مجھے دعاؤں میں یاد رکھنا

''تم میں سے کوئی میری اذیتوں کا حساب نہیں لگا سکتا۔جس اذیت سے اس سب میں، میں خود گزر رہا ہوں میں ہی جانتا ہوں۔ عریم کا ایک ایک آنسو مجھ پر قرض ہے اور میں جانے قرض اتار بھی پاؤں گا کہ نہیں۔'' اس نے آبدار سے کہا تھا کہ آئیکت پارکنگ میں اس کا منتظر ہے وہ اس کے ساتھ محمود خان کے گھر چلی جائے۔ وہ بڑی خاموشی سے منظر سے ہٹ گئی تھی اور آبدار کے جاتے ہی اس نے خود اذیتی سے سوچا تھا اور عریم کا نمبر ڈائل کیا تھا اور عریم کے ''ہیلو'' میں جو اذیت ناک خوف تھا وہ محسوس کرتا شاہ زیب اندر ہی اندر ختم ہوتا چلا گیا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو کمپوز کر کے عریم کو بتایا تھا کہ آبدار یہاں سے نکل چکی ہے، آدھ گھنٹہ تک پہنچ جائے گی۔لمحہ بھر کو خاموشی چھا گئی تھی کہ عریم کچھ بھی کہنے لائق ہی نہیں رہی تھی۔

''اور کوئی حکم ہے تو کہیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' وہ خاموشی کے بعد سرسراتی آواز میں بولی تھی۔شاہ زیب کا دل کیا تھا کہ موبائل دیوار پر دے مارے مگر وہ ضبط کر گیا تھا۔

''فی الحال جو حکم جاری ہو چکے ان کی تعمیل کر لو۔بس خود کو تیار رکھنا۔'' وہ ندامت میں گھر رہا تھا مگر جب بولا تھا تو اپنی مشہور زمانہ سفاکیت کے ساتھ بولا تھا۔عریم کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''میں آپ کو معاف نہیں کروں گی شاہ۔ اپنی محبت کی توہین کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' شاہ زیب نے رابطہ منقطع کر دیا تھا اور وہ سسکتے ہوئے خود کلامی کر رہی تھی۔

''میں جو تمہارے ساتھ کر رہا ہوں شاید تم تو کبھی نہ کبھی مجھے معاف کر دو گی عریم مگر اس سب کے لئے میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا۔'' شاہ زیب نے بے رحمی سے سوچا تھا کہ اسے شدت سے احساس تھا کہ اس وقت عریم رو رہی ہو گی۔

☆......☆......☆

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' آبدار جیسے ہی گاڑی تک پہنچی تھی وہ فرنٹ ڈور اوپن کرتا ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تھا۔ وہ اس کی خاموشی کو محسوس کرتی فرنٹ سیٹ پر آن بیٹھی تھی اور دھیمے سے اس پر سلامتی بھیجی تھی اور اس نے محض سلام کا جواب دے کر ڈرائیونگ پر توجہ مبذول کر لی تھی۔ آبدار کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی اور وہ سوال کر گئی تھی۔

''آئیکت اور کزنی اب اتنا گیا گزرا بھی نہیں کہ ہر ایرے غیرے سے ناراض ہوتا پھرے۔'' وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا تھا اور وہ کہاں آئیکت کے اس طرح کے لہجوں کی عادی تھی۔اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''میں آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔'' وہ سسکی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں مس آبدار، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے آپ کی بات، یا کسی بھی عمل نے بالکل بھی تکلیف نہیں پہنچائی۔'' اس کی سنجیدگی کا گراف نیچے نہیں آ رہا تھا بلندی کی طرف سفر کرتا آبدار کو مضطرب کر رہا تھا۔

''میں آپ سے شرمندہ ہوں، میں بہت غصہ میں، بہت تکلیف میں تھی اس لئے اس دن بہت کچھ جانے، انجانے میں کہتی چلی گئی۔'' وہ اس کی طرف پرامید نگاہ سے دیکھتی باقاعدہ رو رہی تھی اور اس کے ایک آنسو پر تڑپ اٹھنے والا آئیکت اسے روتے دیکھ کر بھی یوں ڈرائیونگ کر رہا تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔

''کچھ لوگ وہ نہیں ہوتے جو وہ ظاہر کرتے ہیں اور طویل مدت کے بعد جب ظاہر کا کالا پن ظاہر ہوتا ہے، باطن کی گندگی ظاہر ہوتی ہے تو ایسے لوگ برے نہیں لگتے۔ اپنا آپ برا لگتا ہے کہ کیسے دوغلے انسان کے لئے سچے جذبات ضائع کر دیئے۔ ایک دھوکہ کے لئے خود کو فریب دیتے رہے۔'' وہ محمود خان کے گھر کے باہر گاڑی روکے گہری سنجیدگی سے بولا تھا۔ کچھ کہنے کی چاہ میں آبدار کے لب پھڑ پھڑائے تھے۔

''آئیکت۔'' وہ کچھ کہہ ہی نہیں پائی تھی کہ وہ آج آئیکت کو خود سے دور، بہت دور محسوس کر رہی تھی۔ لفظ لب تلے آ کر دم توڑ گئے تھے، آواز نہ بن پائے تھے۔

''مجھے تم سے نہیں، خود سے نفرت محسوس ہو رہی ہے کہ میں تمہارے لئے مخلص تھا، میرے جذبات کھرے تھے۔ جو اس لائق ہی نہ تھی۔'' آئیکت اور کزئی کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے تھے اور آبدار آگے سے کچھ کہہ نہیں پائی تھی کیونکہ آئیکت کی نفرت بجا تھی۔ وہ اسی لائق تھی۔ دھوکہ دینے والا تو اس سے زیادہ کا حقدار ہوتا ہے اور آئیکت نے تو خیر اسے ابھی بھی کچھ کہا ہی نہیں تھا۔

''میں...''

''کچھ تکلیف دہ رشتے اگر بروقت ختم کر دیئے جائیں تو باقی ماندہ رشتوں کی عمر طویل ہو جاتی ہے۔'' وہ آبدار کو اب کے بولنے کا موقع دیئے بغیر گہری سنجیدگی سے بولا تھا وہ رونا بھول کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''میں تمہیں اپنی محبت سے آزاد کرتا ہوں آبدار۔ ہمارا ہر ایک رشتہ آج یہیں پر ختم ہوتا ہے۔ میرے دل کی سرزمین سے محبت بے دخل ہو گئی ہے۔ قلب کا ہر رشتہ دم توڑ چکا ہے۔ تم آج سے آزاد ہو۔'' آئیکت کی سنجیدگی میں ذرا برابر کمی واقع نہ ہوئی تھی اور وہ یکدم ہی پتھر ہو جانے والے آئیکت کو ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی۔

''ایسے کیوں بول رہے ہیں آئیکت۔ میری کوئی بات بری لگی ہے تو بولیے، بتایئے مجھے۔ مگر یوں نہ کیجئے آئیکت۔'' وہ آئیکت کے کاندھے پر ہاتھ رکھ گئی تھی جسے وہ بری طرح جھٹک گیا تھا۔

''میں آئیکت اور کزئی اگر دنیا کا آخری مرد بھی ہوا تو تم، آبدار، مجھ سے شادی نہیں کرو گی۔'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر ہذیانی انداز میں

بولا تھا اور وہ لب دانتوں تلے کچل گئی تھی۔

''میری وفاؤں کا، میرے ساتھ کا، میرے خلوص کا، میری دوستی کا یہی صلہ ہے کہ تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی۔تم مجھ سے شادی نہ کرتیں آبدار، مگر میری توہین کرنے کا، اپنے مفادات کے لئے مجھے سیڑھی بنانے کا تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔اور اس کے لئے میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' وہ اس کی نمناک آنکھوں میں قہر برساتی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔وہ سفید پڑ گئی تھی، لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا لہو نچوڑ لیا ہے۔

''تمہاری محبت میں، میں نے خاندان کی عزت داؤ پر لگائی، اپنی انا کو ضرب لگائی آبدار۔تم کہتی رہیں شادی نہیں کرو گی میں پھر بھی ایک امید لئے تم تک چلتا رہا۔مگر اپنی توہین، اپنی مردانگی کی توہین میں برداشت نہیں کر سکتا۔تم کیا اب میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ہاں، تم دنیا کی آخری عورت ہوئیں تب بھی نہیں آبدار۔کہ محبت اور انا میں، میں نے ہمیشہ محبت کو چنا مگر اب بات میری مردانگی پر آ گئی ہے اور میں محبت چھوڑتا ہوں۔لعنت ہے ایسی محبت پر جو ذلیل کر کے رکھ دے۔جاؤ آبدار، میری محبت سے تم آزاد ہو'' وہ گہری سنجیدگی سے ایک ایک لفظ پر زور ڈال کر بولا تھا۔

''میں نے انجانے میں آپ کو تکلیف پہنچائی ہے۔میرا مقصد وہ نہیں تھا آئیکت۔'' وہ اس کے بالکل اجنبی ہوتے چہرے کو دیکھ کر سسکی تھی۔

''مقصد کچھ بھی تھا تمہاری بات مجھ تک پہنچ گئی کہ ویسے بھی تمہیں مجھ سے شادی تو کرنی ہی نہیں۔مجھے صرف سیڑھی بنایا اور آج اس لئے اتنی صفائی دے رہی ہو نا تاکہ میں تمہارے ہاتھوں آگے بھی الو بنتا رہوں۔'' جب تک محبت تھی اسے آبدار کی ہر بات اچھی لگتی تھی۔اب محبت نے نفرت کا روپ دھارا تھا تو اسے آبدار کی ہر مثبت بات بھی منفی رنگ و روپ میں سجی بری لگ رہی تھی۔

''آپ مجھے اب اتنا بھی مجھے گھٹیا نہ سمجھیں آئیکت۔'' وہ سسک اُٹھی تھی۔

''اچھا پھر خود بتا دو کہ کتنا گھٹیا سمجھوں؟'' وہ آبدار کی بات کاٹ کر بولا تھا اور وہ پل پل حیران ہوتی اس کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''ہم کبھی اچھے دوست رہے ہیں۔آپ واحد ہیں آئیکت جس سے میں نے اپنا ہر دکھ بانٹا۔اور آج آپ مجھے میرے کہے کی سزا دینے کو نفرت سے دھتکار رہے ہیں۔ہر ایک رشتہ ختم کر رہے ہیں۔کیا دوستی کے رشتے یوں اتنی آسانی سے ٹوٹ جاتے ہیں۔کیا محبت اتنی آسانی سے ختم ہو جاتی ہے۔کیا آپ کو سچ میں مجھ سے نفرت ہو گئی ہے؟'' وہ اب باقاعدہ ہچکیوں سے روتے ہوئے بول رہی تھی۔آئیکت کے ذہن و دل میں کسی قسم کی ہلچل نہ ہوئی تھی تو کیا سچ میں آبدار کی محبت اس کے دل میں دم توڑ گئی تھی۔

''کچھ لوگ دوستی کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر محض دعویٰ۔ان کے دعویٰ میں ذرہ برابر سچائی نہیں ہوتی کہ دوستی دعویٰ سے نہیں چلتی۔محبت مفاد میں نہیں پنپتی۔دوستی کو چلانے کے لئے اخلاص اور محبت جیسا انمول احساس و جذبہ درکار رہتا ہے۔مگر یہ تم جیسے دوستی کو اپنے مفاد کے

لئے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے والوں کی سمجھ سے پرے کی چیز ہے۔ محبت کو سمجھنا آپ جیسے خود غرض، مطلب پرست لوگوں کے بس کی بات نہیں ہے مس آبدار۔'' وہ اسے بھگو بھگو کر جوتے مار رہا تھا اور وہ چپ تھی۔ بالکل چپ۔ وہ اسے خود غرض بول رہا تھا تو کیا غلط بولا تھا۔ اس کے آنسو ٹھہر گئے تھے۔

''محبت میں نے آپ سے سچ میں نہیں کی۔ مگر میں شادی آپ سے ہی کرتی۔ میں بس یہ چاہتی تھی کہ مجھے میرا مقام ملے۔'' وہ دھیمے لہجہ میں اپنی صفائی میں بولنے لگی تھی۔ وہ اس سے یہ نہیں بولی تھی کہ وہ ابسام حیدر سے محبت کرتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے سوچا تھا کہ وہ شادی اسی سے کرے گی کہ وہ اس کے احسانوں کو مانتی تھی اور آج وہ احسان نہیں جتا رہا تھا، اس کی ہر ایک بات کو نظر انداز کرنے والا اس کا ایک جملہ پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ یہ اس کی محبت کی موت تھی یا آبدار کی موت... وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے آئیکت سے اس سب کی امید نہیں تھی کہ آئیکت نے اس کا ساتھ اس وقت دیا تھا جب اسے ذلیل کر کے اسے اس کی اوقات بتائی جا رہی تھی اور اب وہی آئیکت اسے اس کی اوقات بتا رہا تھا۔ اس کی روح تک چھلنی ہوئی جا رہی تھی۔ محبت سے، دوستی سے وہ دست بردار ہو گیا تھا۔ اسے آج آئیکت بھی ٹھکرا رہا تھا۔ وہ آئیکت جو بچپن سے اس کا ہمدرد و غمگسار رہا تھا۔ اس کے آنسو بڑی روانی سے بہہ رہے تھے۔

''کچھ رستے کچھ انسانوں کے لئے نہیں بنے ہوتے مگر جب وہ چل پڑتا ہے تو پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں اور راستہ کاٹے نہیں کٹتا اور جب سفر تمام ہوتا ہے تو شکست لہولہو قدموں سے آن لپٹتی ہے اور انسان پھر کسی اور راستہ کی طرف بڑھنے کے قابل نہیں رہتا۔'' وہ سسکتے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ دو دن قبل ہی تو ابسام حیدر کی دہلیز عبور کرتے وہ تڑپ رہی تھی اور آج نئے سفر پر جاتے اس کا دل رو رہا تھا۔ اوپر سے آئیکت کی نفرت و بیگانگی... اس کی آنکھوں سے ساون ٹوٹ کر برس رہا تھا اور آئیکت کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ گاڑی سے باہر نکل گیا تھا وہ بھی ناچار گاڑی سے باہر آ گئی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پائی تھی وہ جب کھڑی تھی اور اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی اور بڑی تیزی میں گاڑی بڑھا لے گیا تھا۔ وہ وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

زندگی یہ بیتے گی جو تنہا نہیں
پھر کہاں مل پائیں گے یہ لمحے حسیں
عشق کس نے دیکھا ہے یوں گوشہ نشیں
ادھورے نہ رہ جائیں میرے خواب کہیں

آئیکت اسے تنہا کر کے، کوئی امید دیے بنا اس سے ہر ایک رشتہ، آدھا ادھورا تعلق ختم کر کے چلا تو آیا تھا مگر اب اسٹیئرنگ پر مکے برساتا خود پر لعنت ملامت کر رہا تھا۔

''آبدار تو پہلے ہی اتنی دکھی ہے اور میں بھی سب لوگوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ مجھے معاف کر دینا آبی۔ مگر میں مجبور تھا ورنہ میرے

لئے آج بھی میری انا نہیں، میری محبت معنی رکھتی ہے۔۔۔ اور تم میری محبت ہو۔ میری محبت کبھی نفرت نہیں بن سکتی۔ کبھی بھی نہیں آبی۔'' وہ آبدار کو دل ہی دل میں مخاطب کرتے ہوئے بول رہا تھا۔ اس کا دل تڑپ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ سب کیوں کر رہا تھا وہ یہ آبدار سے تو کیا خود سے بھی ذکر کرنے سے گریزاں تھا۔ آج اسے صحیح معنوں میں شدت سے رب یاد آ گیا تھا۔ جب دل پر چوٹ لگتی ہے، جب اپنے دھوکا دیتے ہیں ایسے میں سب سے زیادہ جو یاد آتا ہے، جو دل کے نزدیک محسوس ہوتا ہے، وہ شہ رگ سے قریب اللہ ہی تو ہے۔ اور آئیکت کو بھی اپنا رب دل کے قریب محسوس ہو رہا تھا۔

''یا اللہ۔ تو میری مجبوریوں سے واقف ہے۔ تو میرے حال، ماضی، مستقبل سے بھی واقف ہے۔ میں تیرا بے کس، لاچار بندہ، تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تو میرے حصہ کی بھی ہر ایک خوشی، تمام تر آسانیاں آبدار کا مقدر کر دے۔۔۔ اس کا دامن خوشیوں سے بھر دے۔ آبدار کو مشکلات سے نکال دے میرے مولا۔'' وہ دل سے آبدار کے لئے دعا گو تھا، اس کا روم روم آبدار کی بھلائی طلب کر رہا تھا۔۔۔ کہ آبدار سے وہ نفرت کا اظہار تو کرسکتا تھا مگر آبدار سے نفرت نہیں کرسکتا تھا۔ جن سے ایک بار محبت ہو جائے ان سے دل نفرت کر ہی نہیں پاتا۔۔۔ ان کی ہر ایک خطا معاف کرتا جاتا ہے۔۔۔ کسی قسم کا حساب نہیں رکھتا کہ جن سے دل جڑ جاتے ہیں۔۔۔ ان کی خطاؤں کا حساب نہیں رکھا جاتا۔۔۔ صرف درگزر کیا جاتا ہے دل کے لئے۔۔۔ محبت کے لئے۔۔۔!!

پتھر ذہن گلاب نئ ہوندے
کورے کاغذ کتاب نئ ہوندے
جے کر لائی یاری بلھیا
فیر یاراں نال حساب نئ ہوندے

☆......☆......☆

''آر یو سیئر یس۔۔۔؟'' وہ حیرانگی سے بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔

''یس۔ پاپا! ہنڈرڈ پرسینٹ۔'' ابسام کی سنجیدگی پر کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

''ایک دم تمہیں شادی کا خیال کیونکر آ گیا؟'' ان کی حیرت تھی کہ کم نہیں ہو رہی تھی۔ ابسام نے اپنے پاپا سے کہا تھا کہ وہ نوائم کے ڈنمارک جانے سے پہلے ہی شادی کر کے اسے پاکستان میں روک لینا چاہتا ہے اور یہ بات حیدر صاحب کے لئے خلاف توقع تھی اسی لحاظ سے حیرت تھی۔

''بس ویسے ہی پاپا، میں نے سوچا کہ منگنی کو کافی ٹائم ہو گیا ہے اس لئے اب بس شادی ہو جانی چاہیے۔'' وہ باپ سے کافی بے تکلف تھا۔ ہلکی سی ہنسی کے دوران بے تکلفی سے بولا تھا اور وہ بے اختیار قہقہہ لگا گئے تھے۔

''یعنی برخوردار کو محبت ہوگئی ہے۔'' وہ شادی کے اصرار پر کچھ اور ہی سوچنے لگے تھے۔ بیٹے کو شرارت سے چھیڑا تھا اور وہ یکدم ہی اپنے آپ میں چور بن کر رہ گیا تھا کہ وہ یہ سب نوائم کی محبت میں نہیں آبدار کی محبت سے بچنے کو کر رہا تھا۔ ابسام کو رہ رہ کر آبدار کی حسرت بھری نگاہیں، محبت بھرے جملے، لڑکھڑاتے قدم کچھ یوں یاد آرہے تھے کہ اس نے جو بات آبدار کو قدم پیچھے ہٹا لینے کی غرض سے بے اختیار کہہ دی تھی۔ اسے اب وہی ٹھیک لگ رہی تھی اس لئے اس نے حیدر صاحب کے سامنے اپنی مرضی رکھ دی تھی۔

''پاپا! ایسا کچھ نہیں ہے۔'' وہ صوفہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''بدلے بدلے سے ابسام حیدر نظر آتے ہیں۔'' حیدر صاحب ہنوز شرارت کے موڈ میں تھے۔ وہ اپنے پاپا کو دیکھنے لگا تھا۔ حیدر صاحب ایک زندہ دل انسان تھے اس وقت بھی وہ کافی موڈ میں لگ رہے تھے۔

''پاپا! پلیز مذاق نہ کریں آپ۔'' وہ قدرے جھنجلا کر بولا تھا۔

''نوائم ایک بہت اچھی لڑکی ہے اس سے تمہیں محبت ہوگئی ہے یا اس سے دوری کے خیال نے تمہیں بے چین کر ڈالا ہے تو اس میں قباحت تو کوئی نہیں ہے بلکہ یہ تو بے حد خوشی کی اطمینان بخش بات ہے۔'' وہ مستقل بیٹے کو تنگ کر رہے تھے اس کا دل کیا تھا کہ وہ کہہ دے کہ اسے نوائم سے کبھی محبت تھی ہی نہیں۔ رشتہ بڑوں کی رضا کا نتیجہ تھا۔ اس میں محبت کا عمل دخل نہ تھا۔ اسے نوائم اچھی لگتی تھی۔ اسے اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا کہ اس کی شادی نوائم سے ہو رہی ہے۔ وہ اس بات سے قدرے مطمئن تھا کیونکہ نوائم ہر لحاظ سے ایک مکمل لڑکی تھی۔ وہ کسی بھی انسان کی اچھی شریک حیات ثابت ہوسکتی تھی۔ اس نے جس وقت اپنی ماما کے پوچھنے پر رضامندی دی تھی اس نے یہی سوچا تھا کہ ابھی فی الحال اس کے دل میں نوائم کے لئے محبت نہ سہی مگر کچھ سالوں تک شادی سے پہلے یا شادی کے بعد اسے نوائم سے محبت ہو ہی جائے گی۔ مگر اب لگتا تھا کہ وہ اپنے حصہ کی محبت تو کر چکا اب اسے نوائم سے کبھی محبت نہ ہو پائے گی۔ اس کا دل دکھ سے بھرنے لگا تھا مگر اس کی مجبوری یہ تھی کہ حیدر صاحب اس سے بات کر رہے تھے، اسے تنگ کر رہے تھے اور وہ وہاں سے چلا جائے۔ وہ ایسا کر نہیں سکتا تھا اس لئے لبوں پر فہمائشی مسکراہٹ سجا گیا تھا۔

''پاپا پلیز۔ ہر ایک معمولی بات کو آپ محبت کا شاخسانہ سمجھنا چھوڑ دیں۔ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔'' وہ خود کو کمپوز کر کے چڑے ہوئے انداز میں کچھ یوں بولا تھا کہ حیدر صاحب بے ساختہ ہنس دیئے تھے۔

''بھئی، ہم تو سمجھتے ہیں جو کچھ بھی ہے سب محبت کی کارستانی ہے۔'' وہ کہاں سنجیدہ ہوئے تھے۔ اسی وقت فضہ حیدر اسٹڈی روم میں داخل ہوئی تھیں۔

''آپ دونوں باپ بیٹا آج کل میرے خلاف کسی سازش میں لگے ہیں جب دیکھو سر جوڑے بیٹھے ہوتے ہیں۔'' وہ تجسس کا شکار ہوتیں قدرے لڑاکا انداز میں بولی تھیں۔ حیدر صاحب کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔

''سازش میں نہیں تمہارا بیٹا کر رہا ہے۔ کہتا ہے ماما بوڑھی ہوگئی ہیں اس لئے اب اس کی شادی کر دینی چاہیے۔'' ان دونوں ماں بیٹے کا منہ کھل گیا تھا۔ ان کا صدمہ سے اور بیٹے کا حیرت سے۔

''ماما! میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہے۔ پاپا اپنی طرف سے بول رہے ہیں۔'' وہ ماں کی آنکھیں خود پر محسوس کرتا گھبرا کر بولا تھا اور وہ خشمگیں نگاہیں شوہر پر جما گئی تھیں۔

''تم نے شادی کی بات نہیں کی تھی ابھی کچھ دیر پہلے۔ بولو۔ اب مکر کیوں رہے ہو۔'' وہ ڈرنے کی کمال ایکٹنگ کرتے گھبرائے ہوئے انداز میں بولتے بیٹے کو دیکھنے لگے تھے۔

''ہاں! تو میں نے شادی کی بات کی تھی بس۔ یہ تو نہیں کہا تھا کہ ماما بوڑھی ہوگئی ہیں۔ یہ تو آپ نے خود کہا ناں کہ آپ کو لگنے لگا ہے کہ آپ کی اہلیہ اب بوڑھی ہوگئی ہیں۔'' وہ اب مزے سے میدان میں آچکا تھا اور وہ اب بری طرح گڑبڑا گئے تھے کہ بیوی کی خونخوار نگاہیں خود پر جو جمی محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے تو مذاق میں بات کہہ دی تھی اور وہ لگتا تھا گلے پڑنے والی تھی۔

''آپ کو میں بوڑھی لگنے لگی ہوں۔'' وہ صدماتی لہجہ میں پوچھ رہی تھیں۔ ماں کا لڑاکا انداز باپ کے گھبرائے ہوئے تیور۔ وہ اس منظر سے بخوبی حظ اٹھا رہا تھا۔

''ارے نہیں فضہ۔ بس میں تو یونہی مذاق میں بول گیا تھا۔ تمہیں تنگ کرنے کو، یہ تمہارا بدتمیز بیٹا مجھے خواہ مخواہ میں پھنسا رہا ہے۔'' وہ ترنت معصوم بنے تھے۔ ابسام کا بے ساختہ قہقہہ فضا میں بلند ہوا تھا۔ فضہ حیدر بھی ایک دم ہی ہنس دی تھیں۔

''تمہیں تو میں بعد میں دیکھ لوں گا۔'' انہوں نے بیٹے کو دھمکی لگائی تھی۔

''دیکھ تو آپ کو ماما لیں گی۔ ماما! پاپا کو آپ بوڑھی لگنے لگی ہیں، لگتا ہے کوئی دوسری پسند کر بیٹھے ہیں۔'' وہ اب مکمل شرارت کے موڈ میں تھا۔

''یار! یہ اب زیادہ ہوگئی ہے۔ ہم محبت کرنے والے میاں بیوی میں تم لڑائی کروانا چاہتے ہو۔'' وہ بیٹے کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر ہلکے پھلکے انداز میں بولے تھے کہ انہیں بیٹے کا یہ روپ ہمیشہ سے ہی پسند تھا کہ وہ دونوں میاں بیوی ہی شوخ مزاج کے تھے اور ان کا بیٹا نہایت سنجیدہ مزاج کا حامل تھا۔ فضہ حیدر تو برملا کہتی تھیں کہ وہ اپنے ماموں عقیل احمد پر گیا ہے وہ بھی اتنے ہی سنجیدہ مزاج تھے۔ سنجیدہ مزاج انسان اگر کبھی شرارت کرے تو وہ بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ بیٹے کو شرارت کے موڈ میں دیکھ کر ایک اطمینان سا محسوس کرنے لگے تھے۔

''ماما! آپ دیکھ رہی ہیں اپنے شوہر نامدار کو، کیسے میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔'' وہ ماں کا ہاتھ تھام کر آنکھیں گھما کر بولا تھا۔

''میں تو آپ دونوں کو ہی دیکھ رہی ہوں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے۔ درگت میری بنا رہے ہیں۔ یعنی کہ حد ہوگئی۔ میں فضہ حیدر جس کی عمر 53,52 سال ہوگی۔ بوڑھی۔ اوف۔ یہ سننے سے پہلے میں ڈنمارک کیوں نہ چلی گئی۔'' فضہ حیدر نے دہائی دی تھی اور کمرے

میں ان دونوں باپ بیٹے کا قہقہہ بکھر گیا تھا۔

''فضہ! ہم دونوں اس کی چالاکی میں آ رہے ہیں۔ یہ موضوع بدلنے کو ایسا کر رہا ہے۔ تم بوڑھی پر یوں اٹکیں کہ اس کی شادی والی بات فراموش ہوگئی۔'' وہ بیوی کے مسکراتے چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولے تھے اور انہوں نے بیٹے کا کان پکڑ لیا تھا۔

''یہ تمہارے پاپا کیا کہہ رہے ہیں؟''

''ماما! کہہ پاپا رہے ہیں، پوچھ مجھ سے رہی ہیں۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے۔'' وہ کان چھڑاتا ہوا شریر ہوا تھا۔ اور انہوں نے بیٹے کی خواہش بیوی کے سامنے رکھ دی تھی جسے سن کر تو وہ شاکڈ رہ گئی تھیں کہ انہیں ابسام سے کہاں امید تھی کہ وہ تو منگنی کے لئے اتنی مشکل سے راضی ہوا تھا اور کہاں اب خود شادی کی بات کرر ہا تھا۔ وہ ماں کی حیرت محسوس کرتا دھیمے سے اپنی بات کہہ گیا تھا۔ فضہ حیدر تو یکدم ہی بے حد خوش ہوگئی تھیں۔

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ میں تو خود یہی چاہ رہی تھی کہ نوائم کو کہیں نہ جانے دوں۔ اسے پاس رکھ لوں۔'' فضہ حیدر اپنے مخصوص انداز میں خوشی سے بول رہی تھیں۔ وہ دونوں ان کو خوش دیکھ کر مطمئن ہو گئے تھے۔

''میں آج ہی اماں اور بھائی سے بات کرتی ہوں۔'' فضہ حیدر مسرور سی کہتیں باہر نکل گئی تھیں اور وہ خود کو آزردگی میں گھرتا محسوس کرتے ہوئے اسٹڈی سے ہی نہیں گھر سے بھی نکل گیا تھا۔ اسے اپنا آپ بے حد خالی خالی لگ رہا تھا۔ وہ اپنی ہی کیفیت سمجھنے سے قاصر تھا۔

دل سنبھل تو جائے گا پھر سنبھلے نہیں
تم ہی کوئی رستہ دکھاؤ نا
بس یہی میں چاہوں
کوئی بات کرو
ہے سونا من تجھ بن آؤ نا
تورے نام کر دوں جو بھی ہے مجھ میں
بولے بولے دل تیرا نام مجھ میں

وہ سڑک پر یونہی بے مقصد گاڑی دوڑا رہا تھا۔ دو آنکھیں اسے دیکھ رہی تھیں، محبت سے، حسرت سے اور اس کا دل بے قابو ہونے لگا تھا۔ اس نے کہاں تصور کیا تھا کہ جسے وہ راہ بدلنے کی تلقین کرتا، اسے دکھانے کو خود زندگی میں آگے بڑھنے کا فیصلہ بھی کر چکا مگر دل سنبھل کر نہیں دے رہا تھا۔ اسے آج شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ جانے والا تو اس کے دل میں بسا تھا۔ اس نام کی مالا جپ رہا تھا جو مقدر میں ہی نہ تھی۔ اسے اپنا دل ویران ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ من کی دہلیز سوکھے پن کا شکار ہو رہی تھی۔ لب خاموش تھے۔ بالکل خاموش۔ اس نے موڑ

کا ٹا تھا۔اسٹیئرنگ پر گرفت یکدم کمزور پڑ گئی تھی۔کانوں میں آبدار کی نمناک آواز گونجنے لگی تھی۔

''محبت اگر مجھ سے پوچھتی نا کہ تمہارا دل کس کے نام کر دوں، تمہاری زندگی کا ہر احساس جذبوں کی سچائی کس کے نام کر دوں آبدار... تو میں محبت سے کہہ دیتی کہ میرا دل، میرے جذبِ محبت کا ہر احساس ابسام حیدر کی دہلیز پر رکھ آؤ میں دروازہ کھلنے کی آس میں تن من وار دوں گی۔'' آبدار اور کزنئی نے ابسام حیدر کی سیاہ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ابسام حیدر نے خود پر جمی آنکھوں میں دیکھا تھا آبدار اور کزنئی کی آنکھوں میں کیا کچھ نہیں تھا۔چاہت، یقین، اعتماد، پانے کی لگن، حاصل کرنے کی جستجو، جیت کا خوف، ہار جانے کی خوشی، جذبوں کی آماجگاہ بنی آبدار اور کزنئی کی آنکھوں میں ابسام حیدر تا دیر دیکھ نہ پایا تھا اس نے فوراً نظر چرائی تھی اور ابسام حیدر کو راہ فرار اختیار کرتے دیکھ کر وہ لپک کر بازو جکڑ گئی تھی۔

''ابسام! محبت نے تو مجھ سے بنا پوچھے ہی محبت کا ہر احساس آپ کو سونپ دیا ہے، آپ کی دہلیز پر رکھی ہے میری محبت ابسام، اور میں راہ تک رہی ہوں کہ کب آپ کا در دل میرے لئے وا ہو جائے اور آپ ہر لمحہ میرے انتظار کی گھڑی کو طول دے رہے ہیں۔'' وہ اس کا بازو جکڑے نمناک لہجہ میں بول رہی تھی اس کا لہجہ، اس کا انداز ابسام حیدر کو اپنی جانب کھینچ رہا تھا اور وہ بڑی سہولت سے اپنے بازو پر رکھے آبدار کے ہاتھ کو ہٹا گیا تھا۔

''مانا محبت میں نے کی ہے ابسام، تو محبت کے آداب بھی مجھے ہی بجالانے ہوں گے۔میں تو اپنی محبت کا کاسہ لیے آپ کے آگے سوالی ہوں، صرف ایک نظر کا سوال ہے، محبت سوالی ہے آپ کی دہلیز پر ابسام، کب تک اسے سوالی بنا رہنے دیں گے۔آپ کو مجھ پر رحم نہیں آتا، میری محبت پر تو کچھ ترس کھائیے کہ محبوب کی ایک نظر کو ترس رہی ہے۔'' آبدار ایک بار پھر اس کی راہ میں آ گئی تھی۔

''آپ کو کیوں نہیں سمجھ آتی آبدار، مجھے آپ سے محبت نہیں ہے۔میں آپ سے محبت نہیں کرتا، کیسے سمجھاؤں میں۔'' وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے چیخا تھا۔

''نہیں آتی مجھے سمجھ ابسام کہ محبت کوئی ریاضی کا فارمولا نہیں ہے کہ دو جمع دو چار ہی ہوں۔ہر دفعہ چار ابسام۔سیدھے طریقے سے چار، الٹے طریقے سے چار۔مان لو تو بھی چار۔نہ مانو تو بھی چار۔محبت تو جب جمع کرتی ہے تو دو اور دو ایک، ایک اور ایک بھی ایک، محبت ایک ابسام، محبوب بھی ایک، آئینہ میں جب خود کو دیکھتی ہوں تو آپ کو پاتی ہوں ابسام تو کیسے سمجھوں۔وہ جو آپ سمجھانا چاہتے ہیں، میری محبت کو ریاضی کے فارمولوں میں مت الجھائیں ابسام۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی جس کی آنکھوں میں پل پل حیرانی بڑھتی جا رہی تھی اور آبدار چیلنجنگ انداز میں اس کا بازو جکڑتی خود اعتمادی سے حال دل بیان کر گئی تھی۔

اس شرط پر کھیلوں گی پیا پیار کی بازی

جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو پیا تیری

ابسام حیدر اسے دیکھنے لگا تھا جو نہایت حسین تھی۔ کم عمر تھی، جس کی خاطر ہزاروں جان سے جانے کو تیار بیٹھے تھے اور وہ اس کی خاطر خوار ہو رہی تھی۔ کبھی سر اٹھا کر محبت کی طالب تو کبھی من مار کر، عزت نفس لٹا کر محبت کی طالب، اسے لگتا تھا کہ آبدار اور کزئی کے جسم میں لہو نہیں اس کی محبت لہو بن کر دوڑتی تھی اور یہ ماننے کے باوجود بھی وہ محبت کو ریاضی کے فارمولے سے تقسیم کرنا چاہ رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ محبت جمع، ضرب، تقسیم کے فارمولے کے بعد بھی محبت رہتی ہے۔ ہر دفعہ ایک نیا آنسر، نیا احساس، نئی ایک شدت اور وہ اس پاگل لڑکی کی شدتوں سے گزرتا ہارنے لگا تھا مگر وہ ہار مان نہیں سکتا تھا کہ اس کے قدموں میں کئی بیڑیاں تھیں۔ اس کی ہر راہ محبت کے متضاد راستوں پر جاتی تھی۔ وہ محبت کے مترادف راستوں پر چلنے کا ارادہ کر سکتا تھا مگر چل نہیں سکتا تھا کہ وہ مجبوریوں سے بندھا ہوا تھا۔ وہ ایک عہد سے جڑا تھا اور وہ محبت کے آگے سر تسلیم خم کر کے عہد نہیں توڑ سکتا تھا۔ وہ اعتبار کی مالا بکھیر کر اپنے لیے راحتیں نہیں چن سکتا تھا کہ اس کا ایک اقرار آبدار اور کزئی کو زندگی کی نوید دے سکتا تھا مگر عہد کی موت ہو جاتی۔ اعتبار کی قبر تیار ہو جاتی۔ کوئی آئندہ کسی پر اعتبار نہ کرتا اور وہ عہد شکن نہیں بن سکتا تھا۔ اس لئے اس کے قدموں میں محبت داسی کی مانند بیٹھی بین کرتی جاتی تھی اور وہ محبت سے ہزار فاصلے پر چلا جاتا تھا کہ کچھ محبتیں ہمارے لئے آسمان سے وحی کی مانند اترتی بھی آئیں تو وصل نصیب نہیں ہوتا کہ کچھ محبتیں محض سسکنے کے لئے، ترسنے کے لئے، اپنا آپ منوانے کی سعی سے جڑی ہوتی ہیں۔ اس نے نظر چرائی تھی، بازو پر رکھا اس کا ہاتھ ہٹایا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکلتا چلا گیا تھا اور آبدار اور کزئی کو لگا تھا کہ اس کی دنیا ویران ہو گئی، اس کی محبت کے خالی کاسہ میں اس کے آنسو بھرتے جا رہے تھے۔

تمہارے بعد سپنے بن رہی ہے
اداسی راکھ سے کیا چن رہی ہے
ذرا آہستہ بول اے یادِ یاراں
میری تنہائی سب کچھ سن رہی ہے
تمہارے کرب کی پر کیف لے پر
مری دھڑکن ابھی سر دھن رہی ہے

ابسام حیدر آخری ملاقات کے فسوں میں گرفتار تھا۔ آبدار کا چہرہ آنکھوں میں سموئے آبدار کی بے بسی، اپنی سنگدلی کو یاد کر رہا تھا۔ وہ یہ بھی فراموش کر چکا تھا کہ وہ ڈرائیونگ کر رہا ہے۔ اسپیڈ کب تیز ہو گئی تھی وہ لاعلم تھا۔ اسٹیرنگ پر کبھی گرفت کمزور پڑ رہی تھی کبھی مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ یکدم اس کی کار کے سامنے ایک ہیولہ سا نمودار ہوا تھا۔ وہ بہت کوشش کے بعد بھی گاڑی کو بریک لگانے سے قاصر رہا تھا۔ گاڑی نے اس نوجوان کو دور اچھال دیا تھا۔ اس کے حواس جو ماضی کی کسی بات پر الجھے تھے۔ آبدار کا نمناک لہجہ کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔ سارے لطیف و کثیف جذبات اڑن چھو ہو گئے تھے۔ وہ گاڑی سے نکل کر اس نوجوان تک پہنچا تھا جس کا خون سڑک پر پھیلتا جا رہا تھا۔ اس نے نبض چیک کی تھی۔ دل کو ڈھارس سی ملی تھی۔ اس نے نوجوان کو گاڑی میں ڈالا تھا اور گاڑی ہاسپٹل کے راستے پر ڈال دی تھی۔ ڈاکٹرز

ایکسیڈنٹ کا کیس لینے کو بالکل تیار نہ تھے۔اس نے حیدر صاحب کو کال کی تھی۔مختصر صورتحال بتائی تھی۔انہوں نے پریشان ہو جانے کے باوجود بیٹے کو تسلی دی تھی۔اپنے کانٹیکٹس کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ بیوی کو کچھ بتائے بناء گھر سے نکلے تھے۔پولیس ہاسپٹل پہنچ گئی تھی۔حیدر صاحب کے کانٹیکٹس کام آ گئے تھے۔اس نوجوان کا ٹریٹمنٹ شروع کر دیا گیا تھا۔حیدر صاحب نے فی الحال پولیس کیس بننے سے روکا تھا اور ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔بیٹے کو پریشان پا کر اسے تسلی دی تھی اور اس نوجوان کی صحت یابی کے لئے دعا گو ہو گئے تھے مگر وہ نوجوان سات گھنٹے گزرنے کے باوجود ہوش میں نہیں آیا تھا۔وہ دونوں باپ بیٹا کبھی اتنے گھنٹے وہ بھی بناء بتائے گھر سے باہر نہیں رہے تھے۔فضہ حیدر کی بار بار کال آ رہی تھی اور انہوں نے بیوی کو تمام بات کہہ دی تھی۔فضہ حیدر بہت پریشان ہو گئی تھیں۔عقیل اور عقیل احمد ڈرائیور کے ساتھ ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔فضہ حیدر کو ان کی بھابھیوں نے سنبھال لیا تھا۔وہ سب اس نوجوان کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے جس کے اپنوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔گیارہ گھنٹوں کی ڈاکٹرز کی محنت شاقہ کے بعد اس نوجوان کو رب کی رحمت سے دوسری زندگی مل گئی تھی۔وہ سب خدا کا شکر بجالائے تھے۔

❁ ❁

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے،بقیہ واقعات آئندہ ماہ،اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

آبدار یہاں چلی تو آئی تھی مگر ایک دم ہی اسے اپنا فیصلہ برا لگنے لگا تھا۔اس کا دل کیا تھا کہ وہ واپس چلی جائے مگر گیٹ پر موجود باوردی چوکیدار نے اسے روکا تھا۔کس سے ملنا ہے؟ جاننا چاہا تھا بے اختیار اس کے لبوں سے پھسل گیا تھا۔

''محمود خان کو جا کر بتایئے، آبدار آئی ہے۔'' وہ اپنے نام کے آگے اور کزئی لگاتے لگاتے رک گئی تھی۔اس کی آنکھ سے ایک بے صبرا آنسو نکل پڑا تھا۔چوکیدار نے آگے سے کچھ کہے بغیر انٹر کام پر اطلاع دی تھی اور اجازت ملتے ہی گیٹ کھول دیا تھا۔وہ اندر کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

''زندگی جانے کب تک مجھے یوں دربدر رکھے گی۔ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت میرا مقدر بنتی رہے گی۔'' وہ قدم آگے کی جانب بڑھاتی نہایت دکھ سے سوچتی جا رہی تھی۔تب ہی ایک دم ملازمہ اس کے سامنے آن رکی تھی۔وہ ملازمہ سے کچھ کہے بنا اس کی ہمراہ لاؤنج تک چلی آئی تھی۔اس نے لاؤنج میں نظریں دوڑائی تھیں۔ایک بے حد حسین عورت صوفہ پر بیٹھی تھی جس کے حسین چہرے پر ملال و اذیت کی داستان رقم تھی۔اس کا دل یکبارگی کانپ اٹھا تھا۔وہ اس عورت کی اذیت کو محسوس کرتی یہاں آنے کے فیصلہ پر پچھتاوے کا شکار ہونے لگی تھی کہ اس کی نظر لاؤنج کی داہنی طرف کھڑے شخص کی پشت پر پڑی تھی جو قدموں کی آواز پر نہ چاہتے ہوئے بھی رخ موڑ گیا تھا۔وہ اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو وضع قطع سے ایک شاندار انسان لگتا تھا۔جس کا ظاہر اتنا حسین تھا کہ کوئی بھی باآسانی دھوکا کھا سکتا تھا۔وہ پہلی بار اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس سے اس نے اپنی حقیقت جاننے کے لمحہ سے آج تک شدید نفرت کی تھی اور اس پر نظر پڑتے ہی نفرت کی شدت میں یوں اضافہ ہوا تھا کہ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ سامنے کھڑے انسان کو نیست و نابود کر دے۔اس کا گریبان پکڑ کر پوچھے کہ اس کا قصور کیا تھا۔کیوں اسے پیدا کر کے چھوڑ دیا۔اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگی تھیں۔ملازمہ اب تک چوکھٹ پر کھڑی تھی اس لحاظ سے لاؤنج میں چار نفوس تھے اور پھر بھی موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔

محمود خان اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے جس میں آبشار اور کزئی کی بہت زیادہ شباہت تھی۔اس پر نظر پڑتے ہی پورا ماضی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا تھا۔آبشار اور کزئی دنیا کی پہلی لڑکی تھی جس کے لئے دل سے محبت محسوس کی تھی اور اسے ایک غیر مرد کے ساتھ دیکھ کر یوں دل کرچی کرچی ہوا کہ وہ انسان سے حیوان بن گئے تھے۔اس لڑکی کی عزت روند ڈالی تھی جس کے لئے دل میں محبت تھی۔ان کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگی تھیں۔

''میں آبدار ہوں۔'' خاموشی میں آبدار کا لہجہ گونجا تھا۔نتاشہ کے ایک اشارے پر ملازمہ وہاں سے چلی گئی تھی۔

''میں آبشار اور کزئی ہوں۔میں اپنے خاندان کی عزت نیلام نہیں کر سکتی۔میں بری لڑکی نہیں ہوں۔میرا اعتبار کریں۔'' کانوں میں یکدم ہی ماضی کی آواز گونجی تھی اور گونج کے ساتھ ہی دردناک چیخوں کی بازگشت۔ان کا دل کیا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔

''میں ایک بے نشاں لڑکی ہوں۔ کیا آپ کو پتہ ہے میرا باپ کون ہے؟'' وہ تا دیر ماضی میں نہ رہ سکے تھے وہ آبدار کو ندامت بھری نظروں سے دیکھنے لگے تھے کہ اس کا سوال ان کو مرنے کی آرزو میں مبتلا کر گیا تھا۔

''خاموش کیوں ہیں آپ محمود خان۔ بتایئے میرا باپ کون ہے؟'' وہ بری طرح سسکتے ہوئے بولی تھی اور انہوں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے اس کے سامنے آکر باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ آواز نیچی رکھو۔ اس گھر کی عمارت میں صرف محمود خان کی عزت نہیں میری قربانیاں، میرا غرور، میری عزت بھی شامل ہے۔'' نتاشہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑیں رو رہی تھیں۔ اس کی آواز بلند ہوئی تھی اور وہ خوف سے کانپ اٹھی تھیں کہ گھر میں ملازم بھی تھے۔ وہ کس کو کیا کیا جواب دیتیں۔ آبدار نے اس عورت کو دیکھا تھا کتنی بے بس، لاچار لگ رہی تھی۔

''میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ میں یہاں کبھی نہ آتی مگر مجھے یہاں میری مجبوری لے آئی ہے۔ مجھے سہارہ دینے والوں نے یوں دھتکارا کہ میں یہاں چلی آئی کہ زمانہ مجھے دھتکارے اس سے قبل میں اس شخص کا گریبان تھام کر پوچھوں کہ ایک زندگی برباد کر کے ایک زندگی کو دنیا میں لاکر وہ خود کیسے سکون میں ہے۔'' آبدار بے تحاشہ رو رہی تھی۔

''تمہارا، تمہاری ماں کا مجرم سامنے ہے۔ اسے سنگسار کر دو مگر خدا کے لئے میری عزت رکھ لو۔ تمہیں اس شخص سے جو بدلہ لینا ہے لو۔۔ مگر ایسے کہ میں جو اپنی نظروں میں گر چکی ہوں۔ زمانے سے نہ نظر چراتی پھروں۔'' نتاشہ شدتوں سے رو رہی تھیں۔ ان کے شوہر کی ناجائز اولاد ان کے سامنے تھی اور وہ اس کی منت کر رہی تھیں کہ وہ ان کی عزت رکھ لیں۔ اور جو اس سب کا قصوروار تھا فاصلے پر چپ سادھے کھڑا تھا۔

''میں یہاں کسی کو بے عزت کرنے نہیں آئی۔ میں تو بس یہ دیکھنے آئی ہوں کہ دوسروں کا سکون چھین کر پرسکون رہنے والے کیسے ہوتے ہیں۔'' وہ نتاشہ کے سامنے سے ہٹ کر محمود خان کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔

''آپ کو گزشتہ زندگی کے ایک لمحہ میں بھی کبھی احساس نہیں ہوا کہ آپ کس گناہ کے مرتکب ہو چکے؟ کسی کی زندگی برباد کر چکے؟'' وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی اور وہ نظر ہی چرا گئے تھے۔

''جواب دیں مجھے محمود خان کہ کیا قصور تھا اس عورت کا، جسے آپ نے ہوس کا نشانہ بنایا۔ اور سسکنے، مرنے کو چھوڑ دیا۔'' وہ سفید پڑتے چلے گئے تھے اور وہ سوال پر سوال کرتی جا رہی تھی۔

''کیا قصور تھا میرا کہ میں دنیا میں بنا باپ کے نام کے آئی۔ میری کوئی شناخت نہیں ہے۔ میری ماں مجھے بیٹی کہتے شرمندہ ہے۔ میں اپنے باپ کو آج پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ میرے نام کے آگے پیچھے کچھ نہیں لگا۔ میں بے نام ونشاں ہوں۔ بتایئے کیا قصور ہے میرا؟'' وہ محمود خان کا گریبان مٹھیوں میں جکڑ گئی تھی۔

''کیا قصور ہے اس عورت کا جو آج شرمندہ نظر چرائے، ہاتھ جوڑے کھڑی ہے۔ زمانے سے خوفزدہ ہے۔ جواب دیں کیا قصور ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ عریم نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلے گی۔ اس میں ہمت نہیں تھی۔ اپنے باپ کی پوشیدہ اولاد سے ملنے کی۔ مگر وہ لاؤنج تک چلی آئی تھی۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کا دل کرچی کرچی ہوا تھا۔ اس کا فخر تہہ خاک ہو گیا تھا۔ باپ تو بیٹیوں کا فخر، ان کا مان ہوتے ہیں اور آج اسے اپنے باپ کی طرف دیکھتے بھی ندامت ہو رہی تھی کہ ان کی غیر قانونی بیٹی ان کا گریبان جکڑے کبھی اپنی ماں کا، کبھی اپنا، تو کبھی ان کی اہلیہ نتاشہ محمود کا قصور پوچھ رہی تھی۔ عریم کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''مجھے معاف کر دو۔ میں بھٹک گیا تھا۔ مجھ پر شیطان سوار ہو گیا تھا۔ میں آبشار اور کنزئی کا گناہگار ہوں۔ تمہارا مجرم ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔'' وہ گریبان آزاد کراتے ذرا فاصلے پر ہوتے آبدار کے سامنے ہاتھ جوڑ گئے تھے۔

''میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی محمود خان۔'' وہ حلق کے بل چلائی تھی۔

''یہ آپ کی بیٹی اُس کے ساتھ جو بھی ہو رہا ہے، آگے جو بھی ہوگا۔ آپ اُس سب کی وجہ ہیں۔'' وہ جیسے ہی مڑی تھی اس کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی تھی جسے دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ یہی عریم ہے۔

''میرے ساتھ جو کچھ ہوا، جو ہو رہا ہے، اس کی وجہ بھی آپ ہیں اور میں نے جو سسک سسک کر زندگی گزاری، نفرتوں کے سائے تلے، بیگانگی کی چھاؤں میں جو ذلت بھری زندگی گزاری۔ اس زندگی کا ایک لمحہ بھی میں آپ کو معاف نہیں کروں گی۔'' وہ سختی و نفرت سے کہتی اپنا بیگ اٹھا گئی تھی۔

''میں یہاں قیام کی نیت سے نہیں آئی۔ میں صرف ذلت کے گڑھے میں دوسروں کو اتار کر باعزت زندگی بسر کرنے والے محمود خان کو دیکھنے آئی تھی۔'' اس نے آنسو رگڑ کر حقارت و نفرت سے لبریز نگاہ محمود خان پر ڈالی تھی اور واپسی کے لئے قدم اٹھائے تھے۔

''رک جائیں آبدار۔'' نتاشہ خود کو سنبھال کر اس کو روکنے کے لئے آگے بڑھی تھیں۔

''میں آپ سے شرمندہ ہوں جبکہ آپ بھی جانتی ہیں کہ اس سب میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو اپنے ہونے پر بھی نادم ہوں۔'' آبدار کے رونے میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''باپ کا نام ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کا سبب باپ کا نام، دھوپ میں سایہ کی مانند باپ کا نام پہچان اور میں بناء پہچان کے دنیا میں آئی۔ مجھے اس عورت نے دھتکار دیا جس نے مجھے پیدا کیا۔'' آبدار کا نمناک لہجہ کمرے کی فضا کو سوگوار کر رہا تھا۔ محمود خان خود کو زمین میں گڑھتا محسوس کر رہے تھے۔ بیوی اور بیٹی سے نظر ملانے کے قابل نہ رہے تھے۔ اور اس لڑکی پر تو نظر اٹھتی ہی نہ تھی جو ان کے باطن کی آئینہ تھی۔ سب کو ان کی اصلیت بتا رہی تھی اور برائی جب کی جاتی ہے تب تو سر اٹھا رہتا ہے مگر جب برائی عیاں ہوتی ہے تو سر جھک جاتا ہے اور وہ بھی سر جھکائے ان سب سے شرمندہ، خود سے نادم ہوئے کھڑے تھے۔

''وہ عورت جو میری ماں ہے میرے ہونے پر شرمندہ ہے۔ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اس عورت پر جو بیتی اس ظلم کی یاد نے اسے یوں اذیت دی کہ وہ اپنی نو ماہ کی اذیت بھول گئی۔ جس اولاد کو نو ماہ کوکھ میں سینچا اس سے محبت نہ کر سکی، نفرت سے دھتکار گئی'' وہ دھیمے اذیت ناک لہجے میں کہتی محمود خان کے سامنے آن رکی تھی۔

''آبشار اور کرزئی نے مجھے پیدا کیا، پیدا کر کے بھول گئی۔ انہیں یہ یاد نہیں رہتا کہ میں نے ان کے وجود میں پل کر زندگی پائی ہے۔ انہیں صرف یہ یاد رہتا ہے کہ میں ان کی ان چاہی اولاد ہوں۔ محمود خان کی ہوس کا ثبوت۔۔۔ ان کی تذلیل کا جیتا جاگتا وجود جوان کے سامنے سانس لیتا ہے تو ان کا دل کرتا ہے کہ وہ اپنی سانسوں کو بند کر دیں۔ موت کی آرزو میں جیتی وہ عورت اپنی نسوانیت کے بت کے پاش ہونے کے بعد ہر ایک لمحہ میں پل پل مری ہے۔'' وہ خود نہیں رو رہی تھی ان دونوں کو بھی رلا رہی تھی اور محمود خان کی حالت وہ تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو کی ایک بوند نہیں۔ چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔

''آپ نے تو اپنی ہوس مٹا کر زندگی کو نئے رنگ میں محسوس کرنا سیکھا، ہر ایک لمحہ سے آسودگی، سکون سمیٹا۔ بے سکون تو وہ عورت رہی جس کو زندہ درگور کر دیا۔ اپنی خوبصورتی سے نفرت کرتی، اپنے جسم سے کراہیت محسوس کرتی، وہ ایک کمرے میں قید ہو گئی اور آپ دنیا کی رنگینیوں میں کھوئے رہے۔ پلٹ کر نہیں پوچھا کہ جس عورت سے جینے کا حق چھینا تھا وہ مری یا نہیں۔'' آبدار نے بچپن سے جو کرب سہا تھا، اپنی اصلیت سے واقف ہونے کے بعد اس کرب کے جو معنی سمجھ آئے تھے اس نے پل پل مر کر گزارے تھے اور وہ اذیتوں کے نشتر آج محمود خان کے وجود میں اتارتی جا رہی تھی۔

''آپ نے تو اس عورت کی دادرسی نہ کی۔ اس کے رشتوں کا جھکنا ٹھکرا دیا۔ اپنی اولاد کو اپنا نام دینے سے انکار کر دیا۔ اور کرزئی خاندان نے اپنی عزت کے لئے مجھے آپ کی ناجائز اولاد کو نام دیا۔ معاشرہ میں عزت و مقام دیا۔ آپ کے عیب کو ڈھانپ کر رکھا اور آپ کو کبھی اپنا عیب ہی نظر نہ آیا۔ زندگی کے کسی ایک لمحہ میں، میں بھی بے سکون نہ ہوئے۔ آپ جیسے مرد جو عورت کو محض جسم سمجھ کر اپنی طلب پوری کرتے ہیں ایسے مردوں کی عزت نہیں رکھنی چاہئے۔ چوک پر نیلام کرنی چاہئے آپ جیسے مردوں کی نام نہاد عزت تا کہ آپ جیسے مرد عورت کی تذلیل نہ کر سکیں۔'' وہ گھٹنوں کے بل زمین پر گری بین کر رہی تھی۔ محمود خان کا دل کر رہا تھا کہ اس لڑکی کو چپ کروا دیں۔ یکدم منظر سے غائب کر دیں مگر بساط الٹ چکی تھی۔ وہ جو گناہ کر کے بھی سر اٹھا کر جیئے تھے اب ان کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ وقت نے انہیں موقع دیا تھا اپنے گناہ کے کفارہ کا موقع جسے وہ ٹھکرا گئے تھے۔ برسوں قبل اگر وہ اور کرزئی خاندان کے جڑے ہاتھ دیکھ لیتے، جڑے ہاتھوں کی لاج رکھ لیتے۔ آبشار اور کرزئی سے نکاح کر لیتے تو شاید آج حالات مختلف ہوتے۔ وہ بیوی اور بیٹی کے سامنے نظر چرائے نہ کھڑے ہوتے۔ وہ لڑکی جوان کے گناہ کا ثبوت تھی وہ ان سے نفرت سے مخاطب نہ ہوتی۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر ذلیل نہ ہو رہے ہوتے۔

اور کرزئی خاندان نے ایک عزت رکھنے کے لئے بات پوشیدہ رکھی تھی اور یہ پوشیدگی ایسی تھی کہ محمود خان کا گناہ پوشیدہ رہا تھا اور ان کی

عزت بھی رہ گئی تھی اور اسی بات کا آبدار کو قلق تھا وہ یہی کہتی ایک آئینہ محمود خان کے سامنے رکھ گئی تھی کہ معاشرہ کی یہ سب سے تلخ حقیقت تھی کہ لڑکی پر ظلم ہوتا ہے اور گھر والے معاشرے میں عزت بنائے رکھنے کے لئے ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتے جتنی کوشش وہ عزت و بھرم رکھنے کے لئے کرتے ہیں اگر ظالم کا چہرہ بے نقاب کرنے میں صرف کریں تو ظلم کا گراف پستی کی طرف آ جائے۔ اگر اور کزئی خاندان چپ نہ سادھتا تو آبشار اور کزئی سسک سسک کر مجرموں کی مانند زندگی نہ گزارتی۔ ہر ایک سے گریزاں، شرمندہ سی زندگی۔۔۔ محمود خان پر کیس چلایا جاتا تو ان کے سارے کس بل اور مردانگی کے سارے جوہر کھل جاتے۔ ظالم نے پرسکون اور مظلوم نے بے سکون زندگی بسر کی تھی کہ ظلم کے خلاف آواز بلند نہ کی گئی تھی۔ معاشرے میں ایسی تلخ حقیقتیں موجود تھیں۔ میاں ظالم ہے عورت کو برداشت اور کمپرومائز کا سبق۔۔۔ طلاق ہو گئی عورت قصوروار سسک سسک کر مر جائے مگر مرد کا سفاک چہرہ عیاں نہ کرے۔ مرد بے آبرو کر دے اور عورت ایک کمرے میں مقید ہو جائے کہ کیس ہو گا تو ایک دنیا کو بے آبروئی کی داستان پتہ چلے گی اس لئے عورت کو چپ کا کلمہ پڑھا کر زندہ در گور کر دیا جاتا ہے۔ آبشار اور کزئی جس کو محمود خان نے بے آبرو کیا۔ محمود خان نے ایک باعزت، خوشگوار زندگی بسر کی۔ آبشار اور کزئی سے خوش رہنے کا، شادی کا حق ہی چھین لیا گیا۔ شادی ہو گی تو زمانہ کو محمود خان کے ظلم کا پتہ لگے گا اس لئے کبھی آبشار اور کزئی کی شادی کا ذکر تک نہ ہوا۔ مظلوم صبر کی چکی پیستا رہا۔ ظالم اناج سے پیٹ بھر کر غفلت کی نیند سوتا رہا۔ آج غفلت کے پردے یوں چاک ہو رہے تھے کہ محمود خان کو اپنا مکروہ چہرہ صاف نظر آنے لگا تھا۔

"میں زانی ہوں، گناہگار ہوں، معاف کر دو مجھے۔" محمود خان اپنے پورے قد کے ساتھ زمین بوس ہوئے تھے۔ زمین پر بیٹھے ہاتھ جوڑے سسک رہے تھے۔

"آپ کو معافی مانگنے کا خیال بڑی جلدی نہیں آ گیا۔" آبدار کسی ناگن کی طرح پھنکاری تھی۔ ان کے آنسو ٹھہر گئے تھے وہ سرخ آنکھوں سے آبدار کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"آپ کے گناہ کی عمر بائیس سال ہے محمود خان! اور معافی مانگنے کا اب خیال آیا ہے جب اپنے سر پر پڑی۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تھی وہ نظر ہی چرا گئے تھے۔

"اپنی بیٹی کے سر سے عزت کی چادر اترنے لگی تو پہنچ گئے اسی دہلیز پر فریاد لئے جس دہلیز کو کبھی کروفر سے روند ڈالا تھا۔" آبدار پھنکار رہی تھی ان دونوں ماں بیٹی کی حالت ہر گزرتے لمحہ کے ساتھ مرنے والوں جیسی ہو رہی تھی۔

"سوچا ہے آپ نے کہ اگر شاہ زیب اور کزئی نفرت اور انتقام میں آپ کی بیٹی کے ساتھ وہی سب کرتا جو آپ نے آبشار اور کزئی کے ساتھ کیا تھا تو آپ کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ آپ انا میں اتنے آگے بڑھے کہ ایک لڑکی کو بے آبرو کر دیا اور وہ شخص شاہ زیب اور کزئی وہ انتقام میں بھی اتنا آگے نہ بڑھ سکا کہ آپ کی بیٹی کو بے آبرو کر دیتا۔" آبدار آگے بڑھی تھی اس نے ضبط سے گزرتی پل پل مرتی

عریم کا بازو دبوچ کر اسے باپ کے سامنے کر دیا تھا۔

''سوچیں، اگر شاہ زیب اور کزئی آپ کی بیٹی سے نکاح نہ کرتا محسوس کریں محمود خان اس ذلت و کرب کو کہ جیسے آپ نے گناہ کا اعتراف کر کے بھی اس گناہ کو نام نہ دیا تھا۔ ویسے ہی اگر شاہ زیب اورکزئی کرے، مُکر جائے کہ اس نے آپ کی بیٹی سے نکاح کیا ہے اور عریم کے بچے کو اپنا نام نہ دے۔ طلاق کا طوق ماتھے پر سجا دے تو آپ کیا کریں گے۔ کیسے دنیا کا سامنا کریں گے۔ محسوس کریں اس کرب کو جو آپ کے سبب اورکزئی خاندان نے سہا، اور آپ بائیس برس غافل رہے۔ بیٹی کی عزت کی بات آئی تو معافی مانگنے پہنچ گئے۔ آپ کو معافی نہیں ملے گی۔ سنا آپ نے محمود خان۔ آپ کو۔۔۔ معافی۔۔۔ نہیں ملے گی۔''

اس نے عریم کا بازو چھوڑ دیا تھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھی۔ اس کا حسین چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ مستقل بولنے، ساتھ رونے سے اس کی آواز بے حد بھاری ہو گئی تھی باوجود اس کے وہ چپ نہ ہوئی تھی بولتی جا رہی تھی۔

''آپ کو گزشتہ زندگی کے پرسکون بائیس سال میں اگر ایک لمحہ کو بھی اپنے فعل پر ندامت ہوتی، اپنے قبیح فعل کا احساس ہوتا۔ آپ معافی کی آس میں اورکزئی ہاؤس کی دہلیز عبور کرتے تو آپ کو معافی مل جاتی۔ مگر یہ جو خود غرضی کی آڑ میں معافی کا ڈرامہ رچا رہے ہیں آپ تو آپ کو معافی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' آبدار نفرت سے پھنکارتی، حقارت سے دیکھتی بیگ اٹھائے باہر کی طرف بڑھی تھی۔ اب کے تو نتاشہ محمود نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہ کی تھی اور وہ تو کسی ساکت و بے جان مجسمہ کی مانند کھڑے تھے۔

''پاپا! روک لیں اس لڑکی کو۔۔۔ روک لیں پلیز۔'' عریم کے حواس جو معطل ہوئے پڑے تھے آبدار کے منظر سے دور جاتے ہی بیدار ہونے لگے تھے اور وہ چیخ پڑی تھی۔ محمود خان اب بھی چپ تھے۔ اپنی جگہ سے ہلے بھی نہ تھے۔

''پاپا روکیں اسے۔ وہ چلی گئی تو شاہ مجھے طلاق دے دیں گے۔ پاپا کچھ کریں پلیز۔ میں مر جاؤں گی۔'' عریم ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ نتاشہ نے آ کر بیٹی کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

''تم کس سے لگا رہی ہو امید۔ جس کے سبب ان حالوں کو پہنچ گئی ہو۔ یہ خود غرض انسان جو تمام عمر اپنے لئے، اپنی انا اور ''میں'' کے لئے جیتا رہا۔ اس سے لگا رہی ہو آس کہ یہ اس معصوم لڑکی کو روکے گا جو اس شخص کی رسوائی بن کر آئی تھی۔ آئینہ دکھا کر جا رہی ہے۔ اس کو روکنا ہوتا تو بائیس برس قبل ہی اپنا نام دے کر روک لیتے۔'' نتاشہ کو اپنے حوالے سے، اس شخص سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جو اس کا سائبان تھا۔ وہ دونوں عورتیں کھڑی یہ سوچ رہی تھیں کہ سائبان ایسے ہوتے ہیں جن کا اپنا کردار داغدار ہوتا ہے۔ پھٹی چادر سے بنا یہ سائبان ان دونوں کو کیا سائبانی دے سکتا تھا۔

''مما! شاہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ وہ لڑکی چلی گئی تو شاہ مجھے چھوڑ دیں گے۔'' عریم ماں سے لپٹ کر بے تحاشہ رو رہی تھی۔ وہ اب بھی بت بنے کھڑے تھے کہ بیوی نے ٹھیک کہا تھا کہ انہیں روکنا ہوتا تو وہ بائیس برس قبل ہی روک لیتے۔ اس وقت گناہ کر کے بھی گردن اکڑی

رہی تھی کہ گناہ سامنے آنے کا ڈر نہ تھا۔اور آج گردن جھک گئی تھی مگر گناہ زمانے کے سامنے آجانے کا ڈر ایسا تھا کہ وہ اس لڑکی کو روک نہیں سکتے تھے۔ ماضی میں نام اس لئے نہیں دے سکتے تھے کہ ذات کا زعم تھا۔مردانگی پر غرور تھا اور آج اس لئے نہیں دے سکتے تھے کہ زمانے کا سامنا کیسے کریں گے۔گناہ کرتے خوف خدا نہ تھا۔گناہ سامنے آنے پر بھی خوف خدا نہ تھا۔معاشرے کا خوف تھا۔نتاشہ اُس بے حس انسان پر سے نظریں ہٹا گئی تھیں۔عریم ان کے کاندھے سے لگی بری طرح بلکتی ان کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی گئی تھی۔

''عریم۔۔۔'' وہ بے ساختہ چیخی تھیں اور اُس بے حس بت میں یکدم سانس لوٹ آئی تھی۔وہ بیٹی کی طرف لپکے تھے۔بیٹی تو وہ بھی تھی جو کچھ دیر قبل یہاں سے بے آس و نامراد ہو کر لوٹی تھی اس کے لئے دل میں کسی غم کا احساس نہ تھا مگر سامنے بے ہوش پڑی بیٹی کے لئے دل میں ہر احساس تھا۔وہ جھک کر اس کا ہاتھ تھام گئے تھے۔

''محمود خان۔میری بیٹی کو کچھ بھی ہوا تو میں آپ کو معاف نہیں کروں گی۔'' نتاشہ بیٹی کے بے ہوش وجود کو دیکھ کر مضطرب ہوتیں بولی تھیں اور وہ جواباً کچھ کہے بغیر بیٹی کو لئے ہاسپٹل دوڑ گئے تھے۔

سن سانسوں کے سلطان پیا
تیرے ہاتھ میں میری جان پیا
میں تیرے بن ویران پیا
تو میرا گل جہاں پیا

مری ہستی، مان، سمان بھی تو
مرا زہد، ذکر، وجدان بھی تو
مرا کعبہ، تھل، مکران بھی تو
میرے سپنوں کا سلطان بھی تو

کبھی تیر ہوئی، تلوار ہوئی
ترے ہجر میں آ بیمار ہوئی
کب میں تیری سردار ہوئی
میں ضبط کی چیخ پکار ہوئی

مرا لوں لوں تجھے بلائے وے
مری جان وچھوڑا کھائے وے
ترا ہجر بے درد سجن
مری جان پہ بن بن آئے وے

مری ساری سکھیاں روٹھ گئیں
مری رو رو اکھیاں پھوٹ گئیں
تجھے ڈھونڈ تھکی نگری نگری
اب ساری آسیں ٹوٹ گئیں

کبھی میری عرضی مان پیا
میں چپ، گم صم، سنسان پیا
میں ازلوں سے ناداں پیا
تو میرا کل جہاں پیا

☆......☆......☆

''شکر ہے بیٹا تمہیں ہوش آ گیا ورنہ ہم سب تو پریشان ہی ہو گئے تھے۔'' فارس نقوی نے ایک یکسر اجنبی وانجان شخص کو حیرت سے دیکھا تھا۔اس کے جسم پر معمولی خراشیں تھیں۔گاڑی سے ٹکرا کر دور جا گرنے پر دماغ پر اندرونی چوٹ آئی تھی۔اس کا دماغ زیادہ کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا۔اس نے اس شخص کو پہچاننے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔نرس جو انجکشن لگانے کی تیاری میں تھی وہ مریض کے چہرے پر کشمکش دیکھ کر حیدر صاحب کو باہر جانے کا کہہ گئی تھی۔

''مریض کو فی الحال آرام کی ضرورت ہے آپ باہر چلے جائیں۔'' نرس نے حیدر صاحب کو مخاطب کیا تھا۔

''سسٹر۔میرا ان سے بات کرنا بے حد ضروری ہے۔میں ان سے بات کر کے ان کے گھر کا ایڈریس وفون نمبر لے لینا چاہتا ہوں۔'' نرس نے حیدر صاحب کی سنے بغیر باہر جانے پر زور دیا تھا تب وہ گہری سنجیدگی سے بولی تھی۔

''مطلب کیا ہے آپ کی بات کا۔یہ مریض آپ کا بیٹا نہیں ہے؟'' نرس حیران ہوئی تھی کہ اس کی ڈیوٹی آدھے گھنٹے پہلے ہی

اسٹارٹ ہوئی تھی۔اس لئے وہ پولیس کیس وغیرہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔حیدر صاحب نے مختصراً نرس کو تفصیل بتائی تھی۔

''میرے بیٹے کی گاڑی سے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ان کے گھر والے ان کے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے اس لئے میرا ان سے بات کرنا ضروری ہے۔'' نرس تفصیل سن کر چپ کر گئی تھی اور وہ اس نوجوان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔اس سے فون نمبر یا ایڈریس پوچھا تھا۔فارس نقوی ذہن پر زور ڈالنے لگا تھا مگر اسے کچھ یاد نہیں آ پایا تھا۔اس کے ذہن میں عجیب سی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔وہ سر تکیہ پر پٹخنے لگا تھا نرس کے اشارے پر حیدر صاحب بوجھل ذہن و دل کے ساتھ باہر نکل گئے تھے۔انہوں نے سب کو گھر بھیج دیا تھا۔اس وقت ہاسپٹل میں وہ اکیلے ہی تھے۔ پرائیویٹ روم سے نکل کر وہ کاریڈور میں آن بیٹھے تھے۔وہ اس نوجوان کی فیملی کو لے کر مضطرب تھے۔اسی پل عبیر اور کبیر عباسی وہاں چلے آئے تھے۔

''آپ لوگوں نے خواہ مخواہ میں زحمت کی۔وہ نوجوان اب کافی بہتر ہے۔'' حیدر صاحب کو شرمندگی کا سامنا تھا۔کبیر عباسی نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''بات زحمت کی نہیں، اپنائیت کی ہے۔جب تفصیل کا علم ہوا تو رہا ہی نہیں گیا۔'' کبیر عباسی سنجیدگی سے بولے تھے۔

''ابسام کہاں ہے؟ وہ خود تو ٹھیک ہے ناں؟'' عبیر عباسی نے دھیمے سے پوچھا تھا۔

''ہاں، وہ ٹھیک ہے، کچھ دیر قبل ہی میں نے سب کو گھر بھیج دیا ہے۔'' حیدر صاحب تھکے ہوئے انداز میں بولے تھے۔

''تم فکر نہ کرو حیدر، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ دونوں باپ بیٹا کافی دیر رکے تھے اس نوجوان سے ملنے بھی گئے تھے جو دواؤں کے زیر اثر سو رہا تھا۔

''اصل پریشانی والی بات یہ ہے کہ اس نوجوان کے گھر والوں کا ابھی تک پتہ نہیں چل سکا۔اس کی فیملی کا سوچ کر ہی میرا دل بیٹھ رہا ہے۔'' وہ دونوں حیدر صاحب کے ساتھ ٹھہرنا چاہتے تھے مگر حیدر صاحب نے نرمی سے قائل کر کے ان دونوں کو گھر جانے کے لئے راضی کر لیا تھا اور حیدر صاحب مصافحہ کرتے ہوئے بولے تھے۔

''ہاں۔یہ اصل پریشانی کی بات ہے مگر تم پریشان نہ ہو، اس لڑکے کو جیسے ہی ہوش آئے گا اس کی فیملی کا لگ جائے گا پتہ۔'' عبیر عباسی تسلی آمیز لہجہ میں کہتے آگے بڑھے تھے وہ بیٹے سے بات کرتے باہر کی طرف قدم بڑھا رہے تھے کہ ان کی نگاہ سامنے سے آتے ایک شخص پر پڑی تھی۔ یہ چہرہ انہیں جانا پہچانا سا لگا تھا مگر یاد کرنے پر بھی پہچان کا مرحلہ طے بھی نہ ہو پایا تھا کہ وہ شخص ان کی آنکھوں کے سامنے سے دیکھتے ہی دیکھتے دور ہو گیا تھا۔

''کیا ہوا پاپا؟'' عبیر ان کے رک جانے پر ٹھٹک گیا تھا۔

''ابھی جو آدمی یہاں سے گیا ہے کافی جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔'' کبیر عباسی اُلجھن بھرے انداز میں بولے تھے اور وہ ایک گہری سانس

کھینچ گیا تھا۔ جب سے وہ لوگ پاکستان آئے تھے یہی ہو رہا تھا وہ ہر دوسرے چہرے کو دیکھ کر یہی کہتے تھے کہ کافی جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔

''پاپا، آپ کافی ٹائم بعد اپنے ملک آئے ہیں ناں تو اس لئے آپ کو ایسا لگتا ہے۔'' عبیر دھیمے سے بولا تھا۔

''ہر ایک چہرے کو دیکھ کر نہیں لگتا عبیر۔ کچھ چہرے واقعی ماضی کو زندہ کر دیتے ہیں۔ یہ آدمی جو یہاں سے ابھی گیا ہے اس کو دیکھ کر یہی لگا کہ میں نے اس کو کہیں دیکھا ہے۔ جسے میں جانتا ہوں مگر شناسائی کی رمق ذہن میں نمودار نہیں ہو رہی۔'' کبیر عباسی کا لہجہ بوجھل تھا اور وہ عبیر کے سمجھنے سے قبل ہی اس راستے پر بڑھ گئے تھے جہاں سے وہ شخص گزر کر ان کی نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ وہ باپ کے پیچھے لپکا تھا۔

''پاپا، کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' وہ باپ کے ہم قدم ہوتے ہوئے پوچھ گیا تھا۔

''اگر ذہن کہتا ہے کہ اس شخص کو میں جانتا ہوں تو اس بات کی تصدیق کر لینے میں کوئی حرج تو نہیں۔'' کبیر عباسی چلتے ہوئے بولے تھے۔ ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے انہیں وہ شخص آئی سی یو کے باہر کھڑا نظر آیا تھا اس وقت وہ اکیلا نہ تھا اس سے انچ بھر کے فاصلے پر ایک خوبصورت عورت بھی کھڑی تھی جس کے چہرے پر خوف کی، انجانے لمحوں کی آہٹیں تھیں۔ مضطرب تو نہیں وہ شخص بھی کم نہ لگا تھا۔ کبیر عباسی آگے کی طرف بڑھے تھے۔ عبیر کچھ سوچ کر فاصلے پر ہی ٹھہر گیا تھا۔ کبیر عباسی اس آدمی کو مخاطب کرتے یا پکارتے اس سے قبل ہی آئی سی یو کا دروازہ کھلا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے ان سے کچھ کہا تھا اور آگے بڑھ گئی تھی۔ کبیر عباسی کا دل بھی دکھ سے بھر گیا تھا۔ ان کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ آگے بڑھیں اسی پل اس شخص کے ساتھ کھڑی عورت بول پڑی تھی۔

''اس سب کے ذمہ دار صرف آپ ہیں محمود۔ ہماری بیٹی آج جن حالوں کو پہنچی ہوئی ہے اس میں آپ کے کارناموں کا ہاتھ ہے۔ دوسروں کو تڑپانے والے کبھی سکون سے نہیں رہتے۔ دیکھ لیں آپ کا گناہ کیسے ہم ماں بیٹی کی ہر سانس کے لئے آزار بن گیا ہے۔'' وہ عورت بلک رہی تھی وہ لفظ ''محمود'' پر اٹک گئے تھے۔ یہ نام کیا تھا ماضی کی کوئی تلخ یاد تھی جو ذہن میں سرسرانے لگی تھی۔

''مجھے بھول جائیں کبیر۔ میں اپنوں کے خلاف نہیں جا سکتی۔ بابا کا مان نہیں توڑ سکتی۔ انہوں نے بڑے مان کے ساتھ میری منگنی کر دی ہے۔ اب سے آپ نہیں محمود خان ہی میرے لئے سب کچھ ہوں گے کہ بہت جلد میری محمود سے شادی ہونے والی ہے۔'' وہ عورت اپنے شوہر سے کیا کہہ رہی تھی وہ نہیں سن رہے تھے کہ وہ تو ماضی کی آواز کو سن رہے تھے۔ آبشار اور کزئی کا نمناک لہجہ سماعتوں میں زہر گھول رہا تھا۔ آبشار کے یہ جملے جب جب یاد آتے تھے تب تب وہ تڑپ جاتے تھے۔

''آپ نے ماضی میں کسی کی بیٹی کو زندہ مرقد میں اتار دیا تھا محمود۔ اب دیکھیں آپ کی بیٹی کی قبر تیار ہو رہی ہے۔ دوسروں کے لئے گڑھا کھودنے والے اب دیکھیں کہ دنیا مکافات عمل ہے۔ میری بیٹی کی معصومیت کو، میری بیٹی کی خوشیوں کو آپ کے گناہ کی نظر لگ گئی ہے۔ آبشار اور کزئی کی آہ لگ گئی ہے۔ میری بیٹی اپنی خوشیاں ہار گئی ہے۔'' وہ شوہر کا گریبان جکڑے بلک رہی تھیں ان کی آواز بہت زیادہ تیز نہ تھی تو اتنی مدھم بھی نہ تھی کہ کچھ فاصلے پر کھڑے کبیر عباسی کی سماعتوں کو محظوظ نہ کر پاتی۔ وہ تو ''محمود'' پر ہی چونک اٹھے تھے۔ ماضی میں

کھو سے گئے تھے کہ اس عورت نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ وہ آنکھیں کھولے اس عورت کو دیکھ رہے تھے جو اس آدمی کا گریبان تھامے لعن طعن کر رہی تھی اور وہ ''آبشار اور کرزئی'' پر اٹک گئے تھے۔ ان کا ہر عضو کان بن گیا تھا۔

''آپ رشتوں کی لاج نہ رکھ سکے۔ ایک معصوم کی زندگی برباد کر دی اور اپنی خوشیوں میں مگن ہو گئے مگر اب دیکھیں محمود کہ خدا کی لاٹھی کیسی بے آواز ہوتی ہے۔ محسوس کریں اس درد کو جو آبشار اور کرزئی نے سہا۔ جو اس کی بیٹی آبدار نے سہا۔ درد میں ہے آج آپ کی اپنی بیٹی تو محسوس کریں درد کیسا اذیت سے بھرپور ہوتا ہے۔'' نتاشہ بری طرح بلک رہی تھیں انہیں احساس نہیں تھا کہ وہ ہاسپٹل میں موجود ہیں انہیں تو صرف یہ پتہ تھا کہ ان کی بیٹی کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ ڈاکٹرز اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود اس بچے کو نہیں بچا پائے تھے جوان کی بیٹی کے وجود میں سانس لے رہا تھا۔ ایک زندگی دنیا میں آنے سے قبل ہی راہی عدم سدھار گئی تھی اور ان کی بیٹی زندگی و موت کی کشمکش میں تھی۔ ڈاکٹرز اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے تھے اور وہ اس سب کا ذمہ دار شوہر کو ٹھہراتیں جگہ کا خیال کیئے بناء، یہ دیکھے بناء کہ کچھ فاصلے پر کوئی موجود ہے اور وہ سن رہا ہے بولتی جا رہی تھیں تب ہی محمود خان کی نظر کبیر عباسی پر پڑی تھی۔ اب تک ان کا گریبان نتاشہ کی گرفت میں تھا اور خود ان کی نظر خود کو دیکھتے کبیر عباسی پر تھی۔ جیسے کبیر عباسی کو ان کو دیکھ کر لگا تھا کہ یہ چہرہ جانا پہچانا ہے۔ یہی کیفیت محمود خان کی بھی تھی۔ وہ اس شخص کو دیکھتے اپنا گریبان بیوی کی گرفت سے آزاد کروا گئے تھے۔ کبیر عباسی کا دل کیا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر محمود خان کا گریبان پکڑ لیں اور پوچھیں کہ آبشار کے ساتھ کیا کیا ہے، اس کی بیوی کیا بول رہی ہے مگر ان کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ جذباتیت پر عقل حاوی تھی۔ کبیر عباسی یہ سوچ رہے تھے کہ آبشار کے بارے میں کس حق سے، کس حوالے سے پوچھیں گے۔ ان کے قدم واپسی کا سوچنے لگے تھے۔ اسی پل نتاشہ کی نگاہ ان پر پڑی تھی۔ وہ خود کو کمپوز کرتیں رخ موڑ گئی تھیں اور بینچ پر پڑے اپنے پرس کو اٹھا کر انہوں نے سیل فون نکالا تھا اور کانٹیکٹ لسٹ اوپن کی تھی۔ تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔

''شاہ زیب اورکزئی اسپیکنگ۔'' ان کے کان میں شاہ زیب کا مغرور لہجہ گونجا تھا۔

''غرور انسان کو لے ڈوبتا ہے شاہ زیب اورکزئی۔'' وہ سرد لہجہ میں بولی تھیں۔ اجنبی نمبر سے کال، پھر سخت لہجہ، وہ بری طرح چونک اٹھا تھا جبکہ وہ جو گومگو کی سی کیفیت میں تھے۔ ٹھہریں کہ کوچ کر جائیں کی کشمکش میں پھنسے تھے۔ کسی نتیجے پر پہنچتے واپسی کے لئے پہلا قدم اٹھا گئے تھے تب ہی وہ عورت بول پڑی تھی اور نام نے ایک بار پھر کبیر عباسی کو چونکا کر ٹھہر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

''آپ کون بول رہی ہیں؟'' شاہ زیب اورکزئی بے حد ناگواری سے بولا تھا۔

''عریم کی بدنصیب ماں۔'' شاہ زیب اورکزئی کے اعصاب یکدم ڈھیلے پڑ گئے تھے اور ایک دم ہی اسے پریشانی نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اسے پہلا خیال عریم کا آیا تھا۔

''آپ نے کس لئے فون کیا ہے؟'' شاہ زیب اورکزئی کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے اور بے حسی کا چولا چڑھانے میں ملکہ حاصل تھا۔

''تم سے اتنے دوستانہ مراسم نہیں ہیں شاہ زیب اورکزئی کہ میں تمہاری خیریت دریافت کرنے کو تمہیں فون کروں۔صرف یہ بتانے کے لئے فون کیا ہے کہ تمہارا انتقام آدھا جیت چکا ہے۔عریم کا بچہ ضائع ہو گیا ہے۔'' نتاشہ کا سرد لہجہ شاہ زیب کو برزخ میں اتار گیا تھا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' وہ بے اختیار چیخا تھا۔

''تمہیں دکھ ہو رہا ہے یہ جان کر بڑی حیرت ہو رہی ہے مجھے۔'' نتاشہ کے انداز میں ذرا برابر نرمی نہیں آئی تھی۔اس نے بے ساختہ اپنے لب بھینچ لئے تھے۔

''ویسے تمہیں دکھ ہونا بھی چاہئے کہ جس بچے کو مہرہ بنا کر تم ہماری عزت کا جنازہ نکال سکتے تھے۔عریم کو مجبور کر سکتے تھے۔وہ مجبوری آج دم توڑ گئی ہے۔دکھ تو بنتا ہے شاہ زیب اورکزئی۔'' ایسا لگتا تھا کہ پے در پے پڑنے والی مصیبت نے نتاشہ کی دماغی حالت الٹ دی تھی۔

شاہ زیب کی اس وقت جو حالت تھی وہ غصہ تک نہیں کر پا رہا تھا۔کبیر عباسی وہاں باتیں سننے کے ارادے سے ٹھہرے تھے ان تک نتاشہ کی آواز نہیں پہنچ رہی تھی کہ وہ بہت مدھم لہجے میں بات کر رہی تھیں۔محمود خان اس شخص کو سن گن لیتا محسوس کر رہے تھے مگر وہ تو اس کے چہرے کو دیکھ ہی الجھن کا شکار تھے۔چلتے ہوئے اس کے عین سامنے جا رکے تھے۔کبیر عباسی نے چونک کر محمود خان کو دیکھا تھا۔اس شخص کو انہوں نے آبشار سے آخری ملاقات کی شام دیکھا تھا جب وہ آبشار سے ملے تھے اور آبشار روتے ہوئے ان کی منتیں کر رہی تھی کہ وہ ملک چھوڑ کر نہ جائیں اور وہ اپنے فیصلہ پر قائم تھے اسی پل آبشار چونک اٹھی تھی اور اس کے اشارے پر جب انہوں نے سامنے نظر کی تھی تو محمود خان سے ٹکرائی تھی۔ان دونوں کی پہلی و آخری ملاقات تھی۔محمود خان ایک غصیلی نگاہ ڈال کر وہاں سے نکل گئے تھے اور کبیر عباسی نے سوالیہ نگاہ سے آبشار کو دیکھا تھا اور وہ بتا گئی تھی کہ وہ محمود خان تھا اس کا منگیتر۔وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے اس پہلی ملاقات کو سوچ رہے تھے۔محمود خان کچھ کہتے یا کبیر عباسی جذبات سے مجبور ہو کر کچھ پوچھ لیتے کہ وہ بڑی تیزی میں پلٹ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے وہاں سے نکلتے چلے گئے تھے۔

''یہ کبیر تھا۔کبیر عباسی۔۔۔'' محمود خان جاتے ہوئے شخص کی پشت پر نگاہ ٹکائے بڑبڑائے تھے۔

''یہی تھا وہ انسان جس نے مجھ سے محبت کرنے کا حق چھین لیا۔مجھے نفرت کرنا سکھایا۔مجھ سے میری اچھائیاں چھین کر مجھے گناہ کی طرف مائل کر دیا۔'' وہ پل پل خود سے دور جاتے کبیر عباسی کو گھورتے ہوئے خود کلامی کر رہے تھے۔ان کی سوچ کی پرواز بلند ہو رہی تھی۔

''تمہارا آدھا انتقام تمہارے بچے کی موت کے ساتھ ختم ہوا شاہ زیب اورکزئی اور باقی انتقام محمود خان کی بیٹی کی موت کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔'' ان کے احساسات پتھر ہو گئے تھے وہ شاہ زیب اورکزئی سے یوں بات کر رہی تھیں جیسے کسی اور کے بارے میں تفصیل کہہ رہی ہوں۔مرنے والے سے یا جو مرنے کے قریب تھی اس سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔جبکہ وہ تو پہلے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھلا تھا کہ دوسرا جھٹکا۔۔۔وہ بلبلا اٹھا تھا۔

''عریم ٹھیک تو ہے؟'' شاہ زیب کے انداز میں بے تابی سی تھی۔وہ جو کہتا تھا کہ اسے اپنے جذبات قابو کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔وہ اس وقت اپنے جذبات قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔

''بتائیے پلیز۔ مسز محمود، عریم ٹھیک ہے؟'' وہ جو یہ سمجھتی تھیں کہ شاہ زیب اورکزئی ان کی بیٹی کے ساتھ مخلص نہیں صرف انتقام کی راہ سر د کر رہا ہے، محبت کے نام پر ان کی بیٹی کے جذبات سے کھیلتا ماضی دہرا رہا ہے، جس بے تابی سے اس نے عریم کا پوچھا تھا انہیں لگا تھا کہ بات محض انتقام کی نہیں تھی۔ شاہ زیب کی بے تابی ان کے ڈوبتے دل کو سہارا دے گئی تھی اور اب کے انہوں نے جان بوجھ کر آگے سے خاموشی اختیار کی تھی کہ خدشہ و یقین کے پیمانے بھی تو ماپنے تھے اور وہ پہلے سے زیادہ بے قراری سے عریم کا پوچھ گیا تھا۔

''ماما، شاہ برے نہیں ہیں۔ بس غصہ میں ہیں۔ میں ہی نہیں وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ غصہ اتر جائے گا نا تو وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ وہ میرے ساتھ کچھ غلط نہیں کر سکتے۔'' شاہ زیب کا بے قرار لہجہ یکدم انہیں بیٹی کی کہی باتیں یاد دلا گیا تھا۔ نتاشہ کے پتھر احساسات موم بن کر پگھلنے لگے تھے۔ ان کے سلگتے دل پر پھوار سی پڑی تھی۔

''ڈاکٹرز جواب دے چکے ہیں۔ عریم مر رہی ہے۔ میری بیٹی مر رہی ہے۔'' نتاشہ سکون سا محسوس کرنے کے باوجود روتے ہوئے تلخ حقیقتیں بتا گئی تھیں۔

''عریم کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں آ رہا ہوں۔'' شاہ زیب نے کہہ کر ہاسپٹل کی تفصیل پوچھی تھی اور وہ آنکھوں میں تشکر کے آنسو محسوس کرنے لگی تھیں۔

''ماما۔ آپ یقین کریں میرا، میں نے شاہ سے نکاح کیا ہے۔ نکاح سے پہلے چھونا تو دور کبھی انہوں نے میرا ہاتھ تک نہیں پکڑا۔ نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ مجھے یقین ہے کہ شاہ کو مجھ سے محبت ہے اور اگر آپ کو نہیں یقین تو بس اتنا تو میرا یقین کریں کہ وہ میری عزت کرتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں چاہیں گے میری بدنامی ہو۔ مجھے ایک بار شاہ سے ملنے دیں۔ وہ اپنے بچے کو نام ضرور دیں گے۔ وہ نکاح نامے کو جھٹلا ہی نہیں سکتے۔'' نتاشہ شوہر کو یکسر نظر انداز کیے، نرس کے روکنے کے باوجود آئی سی یو میں داخل ہوگئی تھیں جہاں ان کی بیٹی مسکن دواؤں کے زیر اثر سو رہی تھی۔ وہ بیٹی کے زرد چہرے کو دیکھ رہی تھیں اور کانوں میں بیٹی کی آواز سفر کرنے لگی تھی۔

''تم ٹھیک تھیں عریم، تمہارا یقین پہلے بھی جیت گیا تھا جب شاہ زیب اورکزئی نے نکاح کو تسلیم کر کے اپنے بچے کو نام دینے سے انکار نہیں کیا تھا۔ تمہارا یقین آج بھی جیت گیا ہے عریم۔ شاہ زیب تم سے محبت کرتا ہے۔'' وہ بیٹی کا نڈلز میں مقید ہاتھ تھام کر لبوں سے لگاتے ہوئے خود کلامی کر رہی تھیں۔

''تم جیت گئی ہو عریم۔ شاہ زیب آ رہا ہے۔ وہ بھی تم سے محبت کرتا ہے۔ آنکھیں کھولو عریم۔ تمہارا شاہ آ رہا ہے۔ اس کا استقبال نہیں کرو گی۔'' نتاشہ بیٹی کی پیشانی پر لب رکھتے ہوئے بڑبڑائی تھیں۔ وہ بے تحاشہ رو رہی تھیں۔ نرس نے بمشکل انہیں آئی سی یو سے باہر نکالا تھا۔ عریم اب بھی بے سدھ پڑی تھی۔ شاہ زیب اپنی بیماری، اپنی لاچاری بھلائے وہیل چیئر سے اٹھا تھا۔ بری طرح لڑکھڑا کر وہ منہ کے بل کارپٹ پر گر گیا تھا۔

''شاہ'' اس کا زمین بوس ہونا تھا کہ عریم کے ساکت وجود میں ہلچل ہوئی تھی وہ اسی بے رحم شخص کو پکار گئی تھی جس کے سبب ان حالوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ نرس بے اختیار ڈاکٹرز کو بلانے بھاگی تھی۔ شاہ زیب نے لب پر لب جما کر ہمت مجتمع کی تھی اور اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ایسی کوشش پہلے بھی کئی بار کر چکا تھا۔ کافی بار اسے کامیابی بھی ہوئی تھی۔ فزیو تھراپسٹ روز آ رہا تھا اور فزیو تھراپی کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ کچھ دنوں سے اپنے پاؤں پر چلنے لگا تھا مگر ڈاکٹرز کی ہدایت کے مطابق مستقل طور پر وہیل چیئر کو خیر باد نہیں کیا تھا مگر اس وقت وہ کوشش کر کے اٹھا تھا۔ اس کے قدم زمین پر جم نہیں پائے تھے۔ اس کے پیروں میں واضح کپکپاہٹ سی اتر آئی تھی مگر آج اس نے سوچ لیا تھا کہ وہیل چیئر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا ہے۔

یہ حوصلہ کیسے جھکے
یہ آروز کیسے رکے
منزل مشکل تو کیا
دھندلا ساحل تو کیا
تنہا یہ دل تو کیا
راہ پہ کانٹے بکھیریں اگر
اس پہ تو پھر بھی چلنا ہی ہے
شام چھپا لے سورج مگر
رات کو ایک دن ڈھلنا ہی ہے
رت یہ ٹل جائے گی
ہمت رنگ لائے گی
صبح پھر آئے گی

وہ اپنی ہمت کی بنیاد پر اٹھ کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر اس نے ہوش پر جوش کو قابض نہیں ہونے دیا تھا۔ وہیل چیئر سے اٹھا تھا۔ اپنے پیروں پر چل کر جا رہا تھا۔ اسی پر اکتفا کیا تھا۔ اپنی گاڑی کی چابی اور موبائل فون اٹھایا تھا۔ وائلٹ جیب میں رکھا تھا اور آئیکت سے بات کرتا اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ کچھ ہی دیر میں آئیکت نے آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس کی بیماری و معذوری میں آئیکت نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا قدم قدم پر اس کے ساتھ تھا۔ آئیکت اس سے ہاسپٹل جانے کی وجہ پوچھ رہا تھا اور اس نے عریم کے ہاسپٹل میں ہونے کا بتا دیا تھا۔ تب ہی اسے عریم کی ماں کا کہا ہوا تکلیف دہ انکشاف یاد آیا تھا۔ جس بچے کے آنے کی خبر نے اسے اتنا

حیران کیا تھا کہ وہ اپنا ایکسیڈنٹ کروا بیٹھا تھا مگر بعد میں ایک خوش کن احساس اس سے آن لپٹا تھا۔ کچھ بھی تھا اس نے عریم سے ذہن و دل کی آمادگی سے ایک پاکیزہ رشتہ قائم کیا تھا۔ وہ اظہار کچھ بھی کر رہا تھا مگر اس کی نیت پانی کی طرح شفاف تھی۔ عریم کے لئے اس کے جذبات بہت کھرے تھے۔ چاہے اس نے عریم کو انتقام کے لئے چنا تھا مگر زندگی میں پوری ایمانداری سے شریعت کے عین مطابق شامل کیا تھا۔ اسے اپنی خلوت کا حصہ نکاح کی بنیاد پر بنایا تھا اور اس کے خلوت کے لمحوں کی نشانی کی آمد پر وہ خوش تھا۔ اس خوشی کو بہت چاہ کر بھی عریم کے ساتھ بانٹ نہیں سکا تھا۔ اس بات کا اسے بے حد قلق بھی تھا اور اس کی خوشی کیسے ہاتھ سے ریت کی مانند پھسلتی چلی گئی تھی۔ اس کی اولاد جس کے آنے کے وہ دل ہی دل میں خواب سجا رہا تھا وہ موت کی آغوش میں جا چکی تھی اور وہ اس قدر بے بس تھا کہ اپنا دکھ کسی کے کاندھے پر سر رکھ کر بہا تک نہیں سکتا تھا۔

''مجھے معاف کر دینا عریم۔ اس دکھ کے لئے میں ہی کہیں نہ کہیں وجہ ہوں مگر مجھے آج میرے مرے ہوئے بچے کی، میری ادھوری رہ جانے والی باپتا کی قسم ہے، میں تمہارے ہر اس دکھ کا مداوا کروں گا جس کے سبب تم روئی ہو۔ تمہارے ہر آنسو کا حساب دوں گا۔ یہ میرے اپنے بچے سے وعدہ ہے۔'' وہ دکھ کی کیفیت میں مبتلا عریم سے دل ہی دل میں عہد و پیماں باندھ رہا تھا۔ آئیکت اس کے بولتے ہوئے یکدم چپ ہو جانے کو محسوس کر لینے کے باوجود اس کے چہرے کے پل پل بدلتے تاثرات کے باوجود چپ رہا تھا بالکل چپ۔ اور شاہ زیب اپنے اندر ہمتیں مجتمع کرتا عہد باندھ رہا تھا۔

ہو گی ہمیں جو رحمت عطا
دھوپ کٹے گی سائے تلے
اپنے خدا سے ہے یہ دعا
منزل لگا لے ہم کو گلے
جرات سو بار رہے
اونچا اقرار رہے
زندہ ہر پیار رہے

☆......☆......☆

''پاپا۔ مجھے بتائیے وہ شخص کون تھا۔ آپ اس قدر کیوں پریشان ہیں۔'' وہ باپ کے زرد چہرے کو دیکھ کر پریشان ہوتا پوچھ رہا تھا۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو عبیر۔ مجھ سے کچھ مت پوچھو۔'' وہ بے بسی سے بولے تھے۔ کچھ دن قبل ہی عبیر نے ابسام کی مدد سے اس کے ساتھ جا کر شوروم سے نئی گاڑی نکلوائی تھی۔ عبیر عباسی جو واپسی کا مصمم ارادہ باندھ گئے تھے انہیں گاڑی لینے پر اعتراض ہوا تھا مگر عبیر نے کہہ

دیا تھا کہ جاتے ہوئے گاڑی سیل کر دیں گے۔عبیر کی بات پر وہ چپ کر گئے تھے۔آج کل ان کی صحت اچھی نہیں تھی۔اس لئے وہ واپسی کے انتظامات کی ذمہ داری بیٹے پر ڈال گئے تھے۔عبیر نے بظاہر تو ان سے کہا ہوا تھا کہ وہ واپسی کی تیاری کر رہا ہے، وہ جبکہ خود نہ جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔اس نے پاکستان واپسی کے بعد جس طرح اپنے باپ کو تڑپتے دیکھا تھا اس کے بعد وہ اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ کبھی ڈنمارک واپس نہیں جائے گا کہ اس نے سوچ لیا تھا کہ موت برحق ہے اور جب کبیر عباسی کو موت گلے لگا لے گی تو انہیں دیارِ غیر میں نہیں ان کے پیرنٹس کے پہلو میں دفن کیا جائے گا کہ وہ جان گیا تھا کہ دوریاں انسان کو کیسے مضطرب کرتی ہیں اور اس نے ایسا باپ کی سوچ کی روشنی میں ہی سوچا تھا کہ کبیر عباسی پاکستان آئے ہی اسی لئے تھے انہوں نے بیٹے سے کہا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ جب انہیں موت آئے تو پاکستان میں اور ان کی قبر ان کے آبائی قبرستان میں بنائی جائے۔آبدار کو دیکھنے کے بعد وہ کچھ یوں مضطرب ہو گئے تھے کہ ایک بار پھر کمزوری کا مظاہرہ کرتے فرار حاصل کر لینا چاہتے تھے مگر اس بار ان کا بیٹا انہیں کمزور نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا اس لئے اس نے ہمیشہ کے لئے پاکستان میں قیام کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''پاپا۔وہ عورت کیا کہہ رہی تھی۔مجھے واضح طور پر کچھ نہ سنائی دیا نہ ہی کچھ سمجھ آیا۔مگر میں آبشار اور کزنئی پر چونک گیا ہوں۔آپ پلیز مجھے بتایئے وہ عورت آبشار آنٹی کی کون تھی؟'' وہ کافی دھیمی رفتار سے کار آگے بڑھا رہا تھا۔وجہ انجان جگہ تھی۔کراچی جیسے دوڑتے، بھاگتے شہر میں جہاں ہمہ وقت ٹریفک کا اژدہام رہتا تھا۔اس کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ احتیاط سے گاڑی چلائے اور یہ ہدایت کبیر عباسی کی تھی اور ایک دو بار کی ڈرائیونگ کے بعد اسے بھی یہی ٹھیک لگا تھا۔وہ بیٹے کی بات پر چونک کر اسے دیکھنے لگے تھے اس نے آبشار سے ایک احترام کا رشتہ از خود جوڑ لیا تھا۔

''میں نہیں جانتا اس عورت کا آبشار سے کیا تعلق ہے مگر وہ شخص کوئی اور نہیں محمود خان تھا۔آبشار کا منگیتر۔'' وہ دھیمے سے قدرے مضطرب انداز میں بولے تھے۔

''پاپا۔آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے اگر وہ آبشار آنٹی کے فیانسی ہوتے تو ان کی شادی آبشار آنٹی سے ہو چکی ہوتی۔اس عورت کی جگہ وہاں آبشار آنٹی موجود ہوتیں۔'' وہ الجھے ہوئے انداز میں ذہن کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے بولا تھا۔

''یہی بات تو مجھے بھی پریشان کر رہی ہے اور وہ عورت جو کچھ بول رہی تھی سب کچھ سن نہیں پایا۔نہ ہی زیادہ سمجھ آسکا۔لیکن بس اتنا ضرور لگا کہ آبشار کے ساتھ بہت کچھ غلط ہوا ہے۔کیا، کیسے۔میں نہیں سمجھ پا رہا اور کیسے حقیقت تک پہنچوں، نہیں آ رہی سمجھ۔'' کبیر عباسی کے لہجے سے ہی ان کی پریشانی مترشح تھی۔

''آپ کو آبشار آنٹی کا گھر تو یاد ہوگا ناں کہ کہاں تھا؟'' وہ باپ کی بات کا جواب دیئے بغیر ایک نیا سوال کر گیا تھا جس پر کبیر عباسی چونک اٹھے تھے۔

''کچھ مقام انسان کے لئے نہیں بنے ہوتے باوجود اس کے وہ مقام انسان کو ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔'' وہ تھکے تھکے سے انداز میں بولے تھے۔

''میں اورکزئی ہاؤس کبھی نہیں گیا۔ آبشار جتنی محتاط طبیعت لڑکی تھی اس نے تو مجھے کبھی اپنے گھر کا ایڈریس اور فون نمبر دینا ہی نہ تھا۔ وہ تو میں نے بہت مجبور کر کے آخری ملاقات میں اس سے ایڈریس اور فون نمبر لیا تھا جو آبشار نے اس وعدے کے ساتھ دیا تھا کہ میں کبھی اس کے گھر نہیں آؤں گا۔ کبھی اس کے گھر پر کال نہیں کروں گا۔'' وہ لمحہ بھر میں ماضی میں کھونے لگے تھے۔ آبشار کا ذکر کرتے آبشار کا من موہنا روشنیاں بکھیرتا چہرہ آنکھوں میں آن سمایا تھا۔

''میں نے آبشار سے کئے وعدے کی لاج رکھی اور وہی ایک دم، پل بھر میں سارے وعدے توڑ گئی۔ وفا کی راہ پر تنہا چلنے کو چھوڑ گئی۔ ایک بھی وعدہ تو اس نے پورا نہ کیا اور میں آج بھی اس سے کئے وعدے کا خود کو پابند مانتا ہوں۔ میں اورکزئی ہاؤس نہیں جا سکتا۔'' کبیر عباسی کا انداز خود کلامی کا سا تھا اور جملہ کے آخر تک وہ بیٹے کو دیکھنے لگے تھے۔

''پاپا۔ آپ نہیں جا سکتے مگر میں تو جا سکتا ہوں ناں۔'' وہ رفتار مزید دھیمی کر گیا تھا اس لئے بڑی سہولت سے باپ کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ کبیر عباسی کے لئے بیٹے کی بات نہایت غیر متوقع تھی۔

''پاپا۔ آپ جب سے پاکستان آئے ہیں، یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آبشار آنٹی کہاں ہیں، کیسی زندگی بسر کر رہی ہیں؟ اور آج جو کچھ آدھا ادھورا آپ جان آئے ہیں اس کے بعد اس خواہش میں شدت آ گئی ہے اس لئے یہی مناسب ہو گا کہ میں اورکزئی ہاؤس جاؤں اور آبشار آنٹی کا پتہ کروں۔'' ان کے بیٹے نے سچ ہی تو کہا تھا کہ وہ آبشار کے بارے میں جاننا چاہتے تھے مگر اس سے کئے عہد کے پابند تھے اس لئے کئی بار اورکزئی ہاؤس کا نمبر ملاتے آدھا نمبر ڈائل کر کے رہ گئے تھے اور اب ان کا بیٹا کیسی اچھی آفر کر رہا تھا کہ یہ تو انہیں خیال ہی نہ آیا تھا کہ اگر وہ خود آبشار سے کئے وعدے کے پابند ہونے کے سبب کال نہیں کر سکتے تھے۔ اورکزئی ہاؤس نہیں جا سکتے تھے تو اس سلسلے میں بیٹے کی مدد تو لے ہی سکتے تھے۔ بیٹے کی آفر ان کے دل کو لگی تھی۔

''اورکزئی ہاؤس جانا تو مناسب نہیں رہے گا۔ تم وہاں جا کر اپنا تعارف کیا کہہ کر کرواؤ گے۔ وہ لوگ تمہارے چہرے سے واقف ہو جائیں گے اس طرح کئی مسائل پیدا ہوں گے اس لئے کال کرنا مناسب رہے گا۔'' کبیر عباسی کا انداز پر سوچ تھا۔ وہ لفظ لفظ گہری سوچ کے ساتھ بولے تھے۔

''مگر تم کال پر اپنا تعارف کیا کرواؤ گے؟ آبشار کے بارے میں کیسے دریافت کرو گے؟'' کبیر عباسی بہت پریشان نظر آنے لگے تھے۔

''گھر پہنچ کر آپ مجھے نمبر دیجئے گا، میں کسی مناسب طریقے سے بات کر ہی لوں گا۔'' عبیر عباسی دھیمے سے بولتا کوئی بہانہ سوچنے لگا تھا۔

''نہیں۔ تم پہلے مجھے بتاؤ کہ کیا کیسے بات کرو گے۔ میں نہیں چاہتا کہ آبشار کے لئے کسی بھی قسم کا مسئلہ ہو۔ آبشار کی فیملی بہت سخت

تھی۔اس طرح تم کال کرکے اس کا پوچھو گے تو اس کے لئے مسائل ہوں گے کہ ویسے بھی وہ شادی کے بعد اپنے سسرال ہوتی ہوگی۔خواہ مخواہ میں اس کی شادی شدہ لائف ڈسٹرب ہوگی۔'' جس لڑکی سے کبیر عباسی نے بے پناہ محبت کی تھی، جس کے لئے آج بھی دل میں احترام تھا وہ اس کے لئے مسائل نہیں چاہتے تھے۔

''آبشار آنٹی کی کوئی دوست تھی؟'' وہ کچھ سوچ کر پوچھ گیا تھا۔

''آبشار کی کوئی ایسی دوست نہیں تھی جس سے گھر تک مراسم ہوں ورنہ تو آبشار کی کلاس کی ہر ایک لڑکی سے ہی اچھی سلام دعا تھی کیونکہ وہ ایک با اخلاق اور کافی بذلہ سنج لڑکی تھی۔'' وہ بتاتے ہوئے یونیورسٹی کے دنوں میں کھو سے گئے تھے۔

''یہ تو بہت پریشانی والی بات ہے کہ دوست کے بہانے سے ہی بات ہو سکتی تھی۔'' وہ گاڑی لاک کرتے ہوئے بولا تھا تب ہی انہیں ایک دم نائلہ یاد آ گئی تھی۔نائلہ ان کی کلاس میٹ تھی۔نائلہ سے آبشار کی کافی اچھی سلام دعا تھی۔آبشار نے ایک بار ان سے کہا تھا کہ نائلہ نے اسے اپنے گھر کا نمبر دیا ہے تاکہ آبشار اسے کال کر سکے مگر اس نے جب اپنی والدہ سے ذکر کیا تھا تو انہوں نے منع کر دیا تھا اور آبشار سے کہا تھا کہ وہ دوستی کو گھر تک نہ لائے۔ماں کی بات کو غنیمت سمجھے کہ اس کے باپ نے اسے مخلوط تعلیمی ادارے میں تعلیم کے حصول کی اجازت مرحمت فرما دی ہے اور یہ بات تو آبشار کے لئے بہت معنی رکھتی تھی کہ اس زمانے میں کہ جب اس کے خاندان کی لڑکیوں کو کالج تک جانے کی اجازت نہ ملتی تھی وہ مخلوط تعلیمی ادارے میں زیر تعلیم تھی اور ماں کی تربیت و نصیحتوں کا ہی اثر تھا کہ جب اسے کبیر عباسی سے محبت ہوئی تھی تو اس نے کبھی بھی اپنی حدود سے تجاوز نہیں کیا تھا۔نائلہ کا خیال آتے ہی انہوں نے بیٹے کو مختصراً نائلہ کے بارے میں بتایا تھا اور بیٹے سے کہا تھا کہ وہ کال پر نائلہ اعجاز کا بیٹا بن کر بات کرے۔وہ ساتھ کچھ اور بھی ہدایت دے رہے تھے کہ وہ باپ کا ہاتھ تھام گیا تھا۔

''پاپا۔ریلیکس۔آج یہ راہ اللہ نے دکھائی ہے۔اس لئے کچھ غلط نہیں ہوگا۔'' عبیر کے انداز میں نرمی تھی اور وہ مسکرا تک نہیں سکے تھے اور بیٹے کو نمبر بتا گئے تھے۔عبیر نے نمبر ڈائل کیا تھا۔آپریٹر کی آواز گونجی تھی۔

''ہم معذرت خواہ ہیں۔آپ کا ملایا ہوا نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔'' عبیر نے اسپیکر آن کیا تھا آواز ان دونوں کے کانوں میں پڑی تھی، کبیر عباسی کا دل بیٹھتا چلا گیا تھا۔

''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اتنے برسوں میں پوری کائنات کا نقشہ ہی بدل گیا ہے، نمبر کہاں وہی پرانا ہوگا۔'' ان کے انداز میں قدرے بے چارگی سی تھی۔

''پاپا۔آپ نمبر ٹھیک سے یاد کریں ہو سکتا ہے کوئی نمبر آگے پیچھے ہو گیا ہو۔میں دوبارہ نمبر ٹرائے کرتا ہوں۔'' عبیر نے ہمت نہیں ہاری تھی۔کبیر عباسی نے اللہ کا نام لے کر دوبارہ نمبر بتانا شروع کیا تھا۔0213 (کنٹری کوڈ کے بعد) ایک ایک کر کے انہوں نے پورے ساتھ ڈیجٹ بولے تھے۔آخری نمبر بولتے ہی انہیں لگا تھا کہ ان کا دل رک جائے گا مگر بیل جانے کی مخصوص ٹون ان دونوں کے ہی چہروں

پر مسرت کی لہر دوڑا گئی تھی۔ پہلے جب انہوں نے نمبر بتایا تھا تو عبیر نے 4 کی جگہ 6 دبا دیا تھا اور اس غلطی کا ان دونوں کو احساس نہیں ہوا تھا۔ دو تین بار ڈائل نمبر کو ریڈائل کرنے کے بعد اب جیسے ہی نمبر دوبارہ ڈائل کیا گیا تھا، بیل جانے لگی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مسرت کی جگہ اضطراب نے لے لی تھی۔

☆......☆......☆

"تم کیوں آئے ہو یہاں۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" شاہ زیب اور کزئی کو دیکھ کر وہ غصہ میں آ گئے تھے۔

"زبان سنبھال کر بات کریں محمود صاحب۔" شاہ زیب ضبط کرتے ہوئے ناگواری سے بولا تھا۔

"مجھے زبان سنبھال کر بات کرنے کو کہہ رہے ہو۔ اپنی حرکتیں نہیں دیکھیں آج تمہارے سبب میری بیٹی زندگی اور موت کی منجدھار میں پھنسی ہے۔" محمود خان اب ناگواری و دکھ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولے تھے۔ غصہ ان کی آنکھوں سے مترشح تھا اور وہ بے ساختہ قہقہہ لگا گیا تھا۔ ہاسپٹل کی خاموش فضا میں شاہ زیب اور کزئی کے قہقہہ کی گونج دور تک پھیل گئی تھی۔ نتاشہ جو سوگواری بینچ پر بیٹھیں بیٹی کی صحت یابی کے لئے دعا گو تھیں شاہ زیب کو دیکھ کر اٹھی تھیں مگر ان سے قبل ہی محمود خان تیر کی تیزی سے شاہ زیب کی طرف بڑھے تھے جس کے باعث وہ تھم سی گئی تھیں۔ انہیں ناپسندیدہ صورتحال کا اندازہ تھا۔ انہیں شوہر کے غصہ پر غصہ آیا تھا وہ ناگواری سے انہیں چپ کروانے کو آگے بڑھی تھیں کہ فضا میں شاہ زیب کا قہقہہ بکھر گیا تھا۔ نتاشہ نے لب بھینچ لئے تھے کہ انہیں ناپسندیدہ صورتحال کا اندازہ تھا۔ شاہ زیب سے مگر اتنی غیر سنجیدگی کی انہیں ہرگز بھی توقع نہ تھی۔ وہ ان دونوں کے درمیان کچھ فاصلے پر آن ٹھہری تھیں۔

"کیا حرکتیں ہیں میری، وضاحت کیجئے گا۔" شاہ زیب سینے پر ہاتھ باندھے چیلنجنگ انداز میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ محمود خان نے لب بھینچ لئے تھے۔

"جناب محترم، میری حرکتیں تو خیر آپ کی حرکتوں سے لاکھ درجے اچھی ہیں۔" شاہ زیب اب گہری سنجیدگی سے نہایت سرد لہجہ میں بولا تھا۔

"یہ جگہ لڑنے اور گڑے مردے اکھاڑنے کے لئے نہایت نامناسب ہے۔" شاہ زیب کو بولنے پر آمادہ دیکھ کر آئیکت نے اسے چپ ہو جانے کے لئے کہا تھا جس پر اس نے کچھ کہے بنا محض اس کو گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔ محمود خان کو حقارت سے دیکھتے ہوئے بولنے ہی کو تھا جب نتاشہ محمود نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے دھیمے سے کہا تھا۔

"یہ بات آپ مجھے نہیں اپنے شوہر کو بتائیں کہ یہ جگہ نامناسب ہے ورنہ میں بولنے پر آیا تو ان کی عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔" شاہ زیب زبان سنبھال کر بات کرتا بنا کسی لحاظ سے پھنکارا تھا۔

"تم کیا میری عزت کا جنازہ نکالو گے۔ یہ سوچو کہ میں چپ ہوں اس لئے تم لوگ باعزت زندگی گزار رہے ہو۔ جہاں میری چپ

ٹوٹی وہیں تم لوگوں کی ذلالت کے دن شروع۔" محمود خان کا وہ حساب تھا، رسی جل گئی بل نہ گیا۔ ان کی بات پر شاہ زیب کا خود پر سے اپنے غصے پر سے اختیار اٹھ گیا تھا۔

"تڑاخ! بکواس بند کرلو محمود خان ورنہ میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔" ان میں سے کسی کو امید نہ تھی کہ شاہ زیب ان پر ہاتھ اٹھا لے گا اور وہ تھپڑ سے سنبھلے ہی نہیں تھے کہ اس نے محمود خان کا گریبان مٹھیوں میں جکڑ لیا تھا۔

"شاہ زیب۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یہ مت بھولو کہ ہم اس وقت ہاسپٹل میں موجود ہیں۔" عموماً آئی سی یو کے باہر بھیڑ نہیں ہوتی اسی لئے ان لوگوں کے جھگڑے سے محظوظ ہونے والا کوئی نہ تھا۔ آئی سی یو سے نکل کر تیزی میں بڑھتی نرس نے ان لوگوں کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی اور وہاں سے گزر گئی تھی مگر شاہ زیب نے ساتھ کھڑے آئیکت کی ہی نہیں سنی تھی اس نے نرس کی کسی ہدایت کو کہاں کسی خاطر میں لانا تھا۔

"تم ہماری نہیں اپنی عزت کی وجہ سے چپ رہے تمام عمر۔ اگر تمہیں ہماری عزت کی اتنی ہی پرواہ ہوتی تو تم دھوکے سے، رشتوں کی آڑ میں اپنی ہوس کی آگ ٹھنڈی نہ کرتے۔" شاہ زیب پھنکارتے ہوئے ایک جھٹکے سے محمود خان کا گریبان مٹھیوں سے آزاد کر گیا تھا۔

"تم ایک بے غیرت، بے حیا، نفس پرست انسان مجھ سے عزت کا جنازہ نکالنے کی بات کر رہے ہو۔ غلط کیا تھا میں نے جو تم جیسے انسان کی بیٹی کو عزت کی چادر دی، نکاح کیا۔ تمہاری بیٹی کے سر سے عزت کی چادر نوچ پھینکتا تو میں دیکھتا کہ تم میرے سامنے کیسے کھڑے ہو پاتے۔" شاہ زیب حد درجے غصہ سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ محمود خان نے لب بھینچ لئے تھے۔ وہ آنکھوں میں شعلے لئے شاہ زیب کو گھور رہے تھے۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ کچھ تو خیال کرو۔ کیوں تماشا بنانے پر تل گئے ہو۔" آئیکت نے بے قابو ہوتے شاہ زیب کو بازو سے تھام کر درشتگی سے کہا تھا۔ نتاشہ کے تو ہاتھ پیر پھولنے لگے تھے۔ ان کی تو انہیں چپ کروانے کی ہمت نہیں ہو پا رہی تھی۔

"تماشہ تو اب میں لگاؤں گا۔ اس انسان کو خود پر بڑا زعم ہے۔ ہماری مصلحتوں کو ہماری کمزوری سمجھ کر اس نے تمام عمر سر اٹھا کر گزاری۔ میں نے بھی اسے بیچ چوراہے پر برہنہ نہ کیا تو میرا نام بھی شاہ زیب اور کزئی نہیں۔" شاہ زیب کا اشتعال کسی قدر کم نہ ہو پا رہا تھا۔ یہاں آتے ہوئے اس کے اندر کا اچھا انسان مکمل طور پر بیدار تھا۔ وہ اپنے بچے کی موت کا سن کر کچھ یوں سوگوار ہوا تھا کہ اس نے خود سے عہد باندھا تھا کہ وہ عریم سے اپنے تمام ناروا رویوں کی معافی مانگ لے گا مگر اس کی تمام نرمیوں کو محمود خان کے چند جملوں نے ہی تہہ خاک کر ڈالا تھا۔ وہ یکسر بھول چکا تھا کہ وہ یہاں آتے ہوئے خود سے کیا عہد باندھ آیا تھا... وہ فراموش کر چکا تھا۔ اسے صرف نفرت اور انتقام یاد تھا۔

"تم نے مجھے کمزور سمجھ کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے محمود خان، اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ میں کس حد تک جا سکتا

ہوں۔" اس نے کچھ بولنے کو منہ کھولتے محمود خان کو دیکھ کر اشتعال سے کہا تھا اور جیب سے سیل فون نکالا تھا۔

"میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ یہ تمام جھگڑے بعد کے لئے اٹھا رکھو" شاہ زیب اس سے قبل کہ کال کر پاتا وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے سسکی تھیں۔ اس نے لب بھینچ لئے تھے۔ اسی وقت آئی سی یو کا دروازہ کھلا تھا۔ نتاشہ فوراً ڈاکٹر کی طرف لپکی تھیں۔

"آپ کے پیشنٹ کو ہوش آ گیا ہے۔" ڈاکٹر پیشہ ورانہ انداز میں جلد ہی روم میں شفٹ کرنے کا بتاتے ہوئے وہاں سے نکلتی چلی گئی تھی۔

"شکر الحمدللہ۔" نتاشہ کے لب سے بے ساختہ رب کا شکر ادا ہوا تھا۔ دو موتی احساس تشکر سے آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔ لمحہ بھر کو شاہ زیب بھی پرسکون ہو گیا تھا کہ آج اگر عریم کو کچھ ہو جاتا تو وہ اس کے لئے کبھی خود کو معاف نہ کر پاتا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔

"مسز محمود۔ جس دن عریم کا ہسپتال سے ڈسچارج ہو گا اس کے اگلے گھنٹہ میں اسے لینے آ جاؤں گا۔" وہ اب کے محمود خان کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے نتاشہ محمود سے بولا تھا۔ وہ بے حد چونک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ آج جو کچھ محسوس کر چکی تھیں۔ اس کے بعد انہیں شاہ زیب کا غصہ تک برا نہیں لگ رہا تھا کہ ویسے بھی جس طرح کی گفتگو محمود خان کر چکے تھے اس کے بعد انہیں شاہ زیب حق پر ہی لگ رہا تھا۔ نتاشہ کچھ کہتیں کہ اس سے قبل ہی محمود خان بول پڑے تھے۔

"جاگتے میں خواب دیکھنا چھوڑ دو شاہ زیب اور کزئی۔" وہ اچھنبے سے محمود خان کو دیکھنے لگا تھا۔

"رخصتی کی تو بات بھی مت کرنا تمہیں بہت جلد خلع کا نوٹس مل جائے گا۔" محمود خان کا لہجہ درشت، آنکھوں میں نفرت تھی۔

"محمود! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ شاہ زیب کے کسی قسم کے ردعمل سے قبل ہی ناگواری سے کہتیں ناپسندیدگی سے شوہر کو دیکھنے لگی تھیں۔

"تم بیچ میں مت بولو نتاشہ۔" محمود خان بیوی کو بری طرح ڈپٹ گئے تھے۔

"ویسے خلع کا آپشن تو اس وقت بھی موجود تھا جس وقت آپ کے علم میں شاہ زیب سے اپنی بیٹی کی نکاح کی خبر آئی تھی۔" خاموش تماشائی بنے آئیکت نے غصیلے انداز میں دریافت کیا تھا۔

"یہ جگہ سوالاً جواباً کے کھیل کے لئے نامناسب ہے۔ آنا میرے گھر تسلی سے بیٹھ کر بات کریں گے۔" محمود خان کے اطمینان میں ذرا برابر فرق نہیں آیا تھا۔ اس کی نظر شاہ زیب پر پڑی اور شاہ زیب چپ چاپ گہری سوچ میں تھا۔ وہ بھی وہی سوچ رہا تھا جو آئیکت کہہ گیا تھا۔ تب ہی آئی سی یو کے باہر تک عریم کی چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ نتاشہ بے ساختہ آئی سی یو کی طرف دوڑی تھیں۔

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ نرس، کہہ دو کہ میرا بچہ نہیں مرا۔" عریم کو جیسے ہی ہوش آیا تھا نرس اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ نرس بہت باتونی تھی۔ عریم کو نئی زندگی کی مبارک باد دیتی اس کے مس کیرج پر افسوس کا اظہار کرنے لگی تھی۔ عریم جس کے حواس بھی ٹھیک طرح سے بیدار نہ ہوئے تھے وہ نرس کی بات پر حیران پریشان سی بے ساختہ چیختی چلی گئی تھی۔ ہیڈ نرس کچھ دیر قبل ہی وہاں سے گئی تھی۔ عریم کو روم میں

شفٹ کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں ۔اسی لئے آئی سی یو کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لئے اس کی آہ وزاری اچانک ان تک پہنچی تھی۔عریم کی آواز شاہ زیب کے کانوں میں گونجی تھی۔

''نہیں ۔میرا بچہ نہیں مرسکتا۔تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' عریم کی آواز کانوں میں پڑ رہی تھی اور ذہن کام کرنے لگا تھا اس نے لب اور مٹھیاں بھینچ کر کھڑے محمود خان کو دیکھا تھا اور ایک لمحہ میں ساری گتھی سلجھ گئی تھی۔اس کے ذہن میں سرسراہٹ سی ہونے لگی تھی وہ یہ سوچ رہا تھا کہ محمود خان نے آج سے پہلے خلع یا طلاق کی بات بچے کی وجہ سے نہ کی تھی اب ان کی راہ کی دیوار از خود ہٹ گی تھی اس لئے وہ خلع کی بات کر گئے تھے۔وہ محمود خان کو دیکھ کر تانے بانے بن رہا تھا کہ اس کے ذہن میں جھماکہ سا ہوا تھا۔

''مس کیرج ہوا ہے یا کروایا گیا ہے۔'' سوچ ذہن میں سانپ کی طرح رینگنے لگی تھی۔

''تم اتنا بھی گر سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔'' وہ جو اطمینان سے کھڑے تھے شاہ زیب ان کو مخاطب کر کے بولا تھا۔وہ اسے یوں دیکھنے لگے تھے جیسے کسی گہرے خیال سے جاگے ہوں۔

''تمہاری سوچ تمہاری ہی مانند بہت چھوٹی ہے۔تم میری سوچ کی گرد تک نہیں پا سکتے۔'' محمود خان کے اطمینان میں دراڑ نہیں پڑی تھی وہ کسی جابر حکمران کی مانند مکروہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے شاہ زیب کو دیکھ رہا تھا اور شاہ زیب کو یکدم اپنی کہی بات یاد آئی تھی۔وہ تو محمود خان کو معزول بادشاہ سمجھ بیٹھا تھا جس کے اقتدار کے ساتھ ہی پر کٹ گئے ہوں مگر اسے یکدم احساس ہوا تھا کہ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔

''میں تمہیں اپنے بچے کا قتل معاف نہیں کروں گا۔'' شاہ زیب پھنکارا تھا اور اب کے وہ ہنس دیئے تھے۔جیسے کچھ دیر قبل شاہ زیب نے ان کے کہے جملے کا جواب مذاق اڑاتی ہنسی میں دیا تھا یہی وہ کر رہے تھے۔شاہ زیب نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں ورنہ دل تو کیا تھا کہ وہ محمود خان کا منہ توڑ ڈالے۔

''رنگے ہاتھوں پکڑا جانے والا مجرم،تم لوگوں کے سر پر خاک ڈالتا با آسانی نکل گیا تھا۔تم اس جرم کی سزا دلاؤ گے جس پر میں تدبیر کا پردہ ڈال چکا ہوں۔'' وہ شاہ زیب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے خوفی سے بولے تھے۔

''تمہیں جانے دیا تھا کہ اس میں ہی ہماری عزت تھی،اب میں تمہیں سڑک پر نہ لایا تو میرا بھی نام شاہ زیب اورکزئی نہیں۔'' محمود خان کے مکروہ چہرے کو دیکھ کر وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے وارننگ دے گیا تھا۔

''وقت بتائے گا شاہ زیب اورکزئی کہ کون سڑک پر آتا ہے اور کون لاتا ہے۔'' وہ نہایت ناپسندیدہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھتے وہاں سے ہٹ گئے تھے اس نے لب بھینچتے ہوئے واپسی کے لئے قدم اٹھا دیئے تھے۔

''تم عریم سے ملو گے نہیں؟'' آئیکت اس کے ہمقدم ہوتے ہوئے بولا تھا۔

''اس کے خبیث باپ سے مل لیا،یہی کافی ہے۔'' شاہ زیب کا لہجہ نہایت ناگوار تھا۔یہاں آتے ہوئے وہ جس قدر مثبت سوچ رہا

تھا جاتے ہوئے اسی قدر منفی سوچ رہا تھا۔

''تمہیں عریم سے ملنا چاہیے تھا۔اس وقت اسے تمہاری ضرورت ہوگی۔'' آئیکت کا اپنا ہی دھیما انداز تھا۔شاہ زیب نے اسے بچے کی موت کا نہیں بتایا تھا۔ہسپتال جا کر اسے عریم کے چیخنے اور اس کے بعد شاہ زیب کی باتوں سے اس نے اندازہ لگایا تھا۔

''جس طرح کی بکواس وہ محمود خان کر رہا تھا اس کے بعد تمہیں لگتا ہے کہ میں عریم سے بات کر سکتا تھا۔'' شاہ زیب اسے کاٹ کھانے کو دوڑا تھا۔

''جن حالات سے عریم گزر رہی ہے، جو کچھ وہ سہہ چکی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اسے جذباتی سہارے کی ضرورت ہوگی۔'' وہ شاہ زیب کے غصہ کو نظرانداز کیے بولا تھا۔

''اس کے باپ کی بکواس کے بعد میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا کجا کہ اس کی ضرورتوں کو پورا کرتا پھرتا۔'' وہ آئیکت پر گھوری ڈالتا فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

''محمود خان کے کیے کی سزا تم اس لڑکی کو مت دو جو دوہرے عذاب میں مبتلا ہو چکی ہے۔تم چاہے انتقام کی آگ سرد کر رہے ہو مگر وہ تم سے محبت کرتی ہے۔تمہاری محبت میں آج اس مقام پر ہے۔اپنی اولاد کھو چکی ہے اور اس کے لیے تمہارے پاس دو حرف تسلی کے نہ تھے کہ تم اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔'' آئیکت ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے درشتگی سے بولا تھا۔

''میں اگر اپنی معذوری کے سبب تمہاری مدد لینے پر مجبور ہو رہا ہوں تو تم یوں مجھ پر احسان جتانے کو اپنی مرضی لاگو نہ کرو، میں اچھے سے جانتا ہوں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔تم میری ذاتیات میں بہتر ہے حد سے زیادہ مداخلت نہ کرو۔'' شاہ زیب کا دماغ خراب ہوا تھا جو زبان پر آیا تھا کہہ گیا تھا۔وہ کار اسٹارٹ کرنا بھول گیا تھا اور حیرانگی سے شاہ زیب کو دیکھنے لگا تھا۔وہ غصہ میں کتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ گیا تھا۔

''انتقام لینے کی چاہ میں تم اتنے اندھے نہ ہو جاؤ کہ تمہیں محبت و اپنائیت بھرے پرخلوص رشتے ہی نظر آنا بند ہو جائیں۔'' آئیکت نے گہری سنجیدگی سے کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

''جو مجھ پر بیت رہی ہے میں ہی جانتا ہوں آئیکت۔تم اس کے عشر عشیر تک بھی نہیں پہنچ سکتے، کہ میری تکلیف تم محسوس نہیں کر سکتے کہ جو تن لاگے وہی جانے۔اس لیے تم فلسفہ بول سکتے ہو، مجھ سے پوچھو کہ میں کس دوراہے پر کھڑا ہوں۔'' شاہ زیب چیخ ہی تو پڑا تھا۔

''تمہارے بن کہے بھی تمہاری تکلیف کو محسوس کر سکتا ہوں میں، تم کوئی غیر نہیں ہو شاہ، کہ تمہارے دکھ سے میں انجان رہوں۔'' وہ آئیکت کو حیرانگی سے دیکھنے لگا تھا۔آئیکت کے چہرے پر اس کے لیے فکر تھی۔آنکھوں میں اپنائیت و محبت تھی۔شاہ زیب کی آنکھوں میں لہو کے ساتھ پانی اترنے لگا تھا۔

☆...☆...☆

ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح
صرف ایک بار ملاقات کا موقع دے دے
اپنی آنکھوں میں چھپا رکھے ہیں جگنو میں نے
اپنی پلکوں پہ سجا رکھے ہیں آنسو میں نے
میری آنکھوں کو بھی برسات کا موقع دے دے

کبیر عباسی کھڑکی میں کھڑے تھے۔ذہن ودل کرب کا شکار تھے۔آنکھوں میں گئے دنوں کی ساعتیں سفر کر رہی تھیں۔انہیں ماضی کا وہ ایک ایک پل یاد آ رہا تھا جو آبشار کی ہمراہی میں گزرا تھا۔دل میں محبت کے وعدے سر اٹھا رکھے تھے۔اپنی وفائیں، آبشار کی جفائیں یاد آ رہی تھیں۔وہ محبت کا پہلا لمس انہیں اپنے دل پر آج بھی محسوس ہو رہا تھا جس نے ساتھ چلتے چلتے خواب دکھاتے دکھاتے یکدم راہ ہی بدل لی تھی۔

''آبشار'' دل سے آہ اور لب سے نام آزاد ہوا تھا۔

آج کی رات میرا درد محبت سن لے
کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کی شکایت سن لے
آج اظہار خیالات کا موقع دے دے
صرف اک بار ملاقات کا موقع دے دے

''میں نہیں جانتا آبشار،تم پر کیا گزری، میں تو تمہارے راہ مڑ جانے پر اپنی ہر راہ ہی چھوڑ گیا تھا۔اب لوٹا ہوں تو مجھ پر انکشاف ہوتا ہے کہ جس کے لئے تم مجھے بیچ راہ میں چھوڑ گئی تھیں، مجھے بھول گئی تھیں، وہ تمہارا کبھی تھا ہی نہیں۔تم اس کی کبھی ہوئیں نہیں۔جب تم محمود خان کے ساتھ زندگی کے سفر میں آگے بڑھی ہی نہ تھیں تو مجھے کیوں نہ آواز دے لی۔کیوں خود کو، مجھ کو سزا دی۔''وہ ماضی سے ہوتے حال میں سفر کرنے لگے تھے۔

بھولنا تھا تو یہ اقرار کیا ہی کیوں تھا
بے وفا تو نے مجھے پیار کیا ہی کیوں تھا
صرف دو چار سوالات کا موقع دے دے
صرف اک بار ملاقات کا موقع دے دے

کچھ گھنٹوں قبل جب وہ محمود خان کو دیکھ کر آدھی ادھوری سچائیوں کے ہمراہ آئے تھے تو ان کے بیٹے نے اور کزئی ہاؤس فون کیا تھا جو کسی مومنہ نامی لڑکی نے ریسیو کیا تھا۔وہ کچھ دیر قبل کے واقعات گویا خود سے دوہرانے لگے تھے۔

☆......☆......☆

''السلام علیکم، کیا میں آبشار آنٹی سے بات کرسکتا ہوں۔'' عبیر نے کال ریسیو ہوتے ہی کہا تھا۔

''آپ کون بات کر رہے ہیں اور پھپھو سے کیوں بات کرنا چاہتے ہیں۔'' مومنہ حیرانگی سے بولی تھی کہ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اس نے اپنی پھپھو کے لئے نہ کبھی کال آتے سنی تھی نہ کبھی کسی کو ان سے ملنے کو آتے دیکھا تھا۔ ایسے میں کسی کا فون کر کے یہ کہنا کہ وہ آبشار سے بات کرنا چاہتا ہے یہ بات مومنہ کے لئے نہایت تجسس کی بات تھی۔

''آپ ان سے کہہ دیں کہ ان کی یونیورسٹی فیلو نائلہ ان سے بات کرنا چاہتی ہیں۔'' عبیر اس لڑکی کے لہجہ میں تجسس محسوس کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا تھا جب کہ کبیر عباسی سانس روکے بیٹھے تھے۔

''جہاں تک مجھے پتہ ہے پھپھو کی کوئی دوست ہی نہیں ہیں۔'' وہ لڑکی ترنت سے بولی تھی۔

''دیکھئے مس میری والدہ آپ کی پھپھو کی یونیورٹی فرینڈ ہیں۔ آج کل میری والدہ کافی علیل ہیں اور وہ اپنی دوست آبشار سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ ہم پاکستان میں نہیں تھے تب ہی ایک طویل مدت تقریباً بائیس برس بعد فون کیا ہے اس لئے آپ پلیز آبشار آنٹی کو فون پر بلا دیں۔'' عبیر کافی سمجھ داری سے ایک کہانی ذہن میں مرتب کئے صفائی سے جھوٹ بولتا جا رہا تھا۔

''اوہو۔ آپ کی والدہ کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔'' وہ لڑکی دکھ سے بولی تھی۔ کبیر عباسی نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

''دیکھئے مس۔ آپ پلیز جلدی آبشار آنٹی کو لائن پر بلا دیں۔'' عبیر نے باپ کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے دھیمے سے ملتجی انداز میں کہا تھا۔

''میں مومنہ ہوں۔'' عبیر نے یکدم لب بھینچ لئے تھے جبکہ وہ ''مس، مس'' کی گردان سے چڑ کر اپنا نام بتا گئی تھی اور اپنا مزید تعارف کرواتی کہ عبیر بول پڑا تھا۔

''کیا آبشار آنٹی گھر پر نہیں ہیں؟'' مومنہ کچھ کہتے ہوئے رک گئی تھی۔

''پھپھو تو گھر پر ہی ہیں۔ وہ کہیں نہیں جاتیں۔'' عبیر کی بات کا اس نے ترنت جواب دیا تھا۔

''تو آپ پلیز انہیں کال پر بلا دیں۔'' وہ دونوں جتنے بے چین تھے وہ اتنا ہی ان کا صبر آزما رہی تھی۔

''یہ پھپھو کے وظیفہ کا ٹائم ہے۔ اس وقت تو وہ گھر کے کسی فرد سے کلام نہیں کرتیں۔ فون پر بات کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' مومنہ اور کزئی اب قدرے سنجیدگی سے بولی تھی ان دونوں کو کم از کم ایسا ہی لگا تھا۔

''او... پھر آبشار آنٹی سے کس وقت بات ہوسکتی ہے۔ آپ بتا دیجئے میں اسی وقت کال کرلوں گا۔'' وہ گہری مایوسی سے بولا تھا۔

''یہ تو میں آپ کو نہیں بتا سکتی کیونکہ پھپھو تو اکثر ہی وظائف وغیرہ میں ہی مصروف ہوتی ہیں۔ میں ان کو آپ کی کال کا بتا دوں گی وہ پھر خود کال بیک کرلیں گی۔'' مومنہ دھیمے لہجہ میں بولی تھی۔

''آپ پلیز میری کال کا آبشار آنٹی سے ذکر مت کیجئے گا۔'' عبیر جلدی سے بولا تھا۔

''کیوں نہ ذکر کروں۔انہیں بتاؤں گی نہیں تو وہ آپ کی ماما سے کیسے بات کریں گی۔'' مومنہ بری طرح حیران ہوتی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

''اصل میں میری ماما آبشار آنٹی کو سرپرائز دینا چاہتی ہیں۔آپ انہیں بتائیں گی تو سرپرائز تو ختم ہو جائے گا۔'' عبیر باتوں سے اندازہ لگا چکا تھا کہ فون پر کوئی کم عمر سی قدرے بے وقوف لڑکی ہے اس لئے وہ اب کے نرمی سے بولا تھا کہ اس کے ذہن میں نئی بات آ گئی تھی اور وہ اس لڑکی کی بیوقوفی کی حد تک باتونی طبیعت کو محسوس کر کے ہی ایسا سوچنے پر مجبور ہوا تھا۔

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پھر کیا کرنا چاہئے۔ بعد میں آپ کس وقت کال کریں گے۔'' مومنہ کے انداز میں بے چارگی تھی۔ اس وقت اورکزئی ہاؤس میں صرف تین لوگ موجود تھے۔شوکت اورکزئی جو اپنے کمرے میں ناسازی طبیعت کے باعث سو رہے تھے۔ آبشار جو ہمہ وقت اپنے کمرے میں رہتی تھیں اور خصوصاً عصر سے مغرب کے بعد تک کا وقت ان کی نماز وظائف کے لئے مخصوص تھا اس لئے وہ بھی اپنے کمرے میں تھیں۔ لے دے کر مومنہ ہی بچی تھی اس کی مما، تائی اور ان کی بیٹی آمنہ بازار گئے ہوئے تھے۔شاہ زیب اور آئیکت بھی گھر پر نہ تھے اسی لئے وہ اتنے سکون و بے خوفی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ وگرنہ ان کے ہاں فون گھر کا کوئی مرد ریسیو کرتا تھا یا دونوں خواتین ان لڑکیوں کو تو فون اٹھانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ وہ دور کے جس میں بچے بچے کے پاس سیل فون تھا۔انٹرنیٹ اور فیس بک آئی ڈیز تھیں۔اس گھر کی لڑکیوں کے پاس سیل فون اور کمپیوٹر تو دور کی بات گھر کے لینڈ لائن کے پاس پھٹکنے کی بھی اجازت نہ تھی۔مومنہ بہت باتونی تھی۔وہ پہلے گھر میں اکثر شور ڈال کر رکھتی تھی۔اسے روکا ٹوکا بھی نہیں جاتا تھا مگر جب سے آبدار گھر سے فرار ہوئی تھی گھر کی باقی لڑکیوں پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ روک ٹوک کی جانے لگی تھی مگر مومنہ اپنی عادت سے مجبور تھی اس لئے اکثر ڈانٹ ہی کھاتی تھی۔ جو لڑکی صرف اسکول، کالج کے لئے گھر سے نکلتی تھی اسے زمانے کی اتنی خبر نہ تھی۔اس کے اندر کی سادگی اور معصومیت ہی تھی جو وہ عبیر کے جھوٹ تک پہنچ نہیں پائی تھی۔

''میں کل دن میں دو بجے کال کر لوں گا۔'' عبیر دھیمے سے بولا تھا۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔مگر مجھے نہیں لگتا کہ تب آپ کی پھپھو سے بات ہو جائے گی۔'' وہ مایوسی سے بولتی ان دونوں کو ہی بیک وقت چونکا گئی تھی۔زندگی میں پہلی دفعہ اپنی پھپھو کے لئے کسی کی کال کا آنا اسے خوشی میں مبتلا کر گیا تھا۔اسی لئے اسے افسوس ہو رہا تھا۔

''کیوں۔بات کیوں نہیں ہو پائے گی۔'' عبیر نے حتی المقدور کوشش کی تھی اس کے انداز سے بے چینی ظاہر نہ ہو۔ جبکہ اسے ایسا کرنے کی ضرورت تو نہ تھی کہ دوسری جانب کون سا کوئی سمجھدار لہجوں کو سمجھنے والا انسان موجود تھا۔

''کچھ دیر پہلے بتایا تو تھا پھپھو اپنے کمرے میں رہتی ہیں۔ان کے وظائف کے ٹائمز سیٹ ہیں۔کوئی انہیں ڈسٹرب نہیں کر سکتا۔''

مومنہ کو اپنی پھپھو بہت اچھی لگتی تھیں مگر وہ ان سے بالکل بھی فرینک نہیں تھی کہ اتنا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ آبشار اپنے خول میں یوں سمٹی تھی کہ سب سے کٹ گئی تھی۔ عبیر نے مومنہ کی بات سن کر یکدم پینترا بدلا تھا اور مومنہ کی تعریف کرنے لگا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ بالکل اس کی چھوٹی بہن کی طرح ہے۔ اسے بات کر کے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ اپنی بہن سے بات کر رہا ہے۔ اس کی آواز اس کی بہن سے بہت مل رہی ہے۔ وہ اس طرح کی باتوں میں مومنہ کو لگا گیا تھا۔ مومنہ کے حسین چہرے پر شرمیلی مسکان پھیل گئی تھی اور وہ اس کا شکریہ ادا کرنے لگی تھی تب وہ اب اپنی اصل بات پر آیا تھا۔

''آبشار آنٹی کی تو محمود خان سے شادی ہوگئی تھی تو پھر وہ اور کزئی ہاؤس میں کیوں مقیم ہیں؟'' عبیر نے بہت سنبھل کر اسے باتوں میں لگانے کے بعد پوچھا تھا۔

''یہ تو میں نہیں بتا سکتی۔'' مومنہ گھبرا کر بولی تھی۔

''کیوں مومنہ بہن، کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔ تو ٹھیک ہے آپ میری ماما سے بات کر لیں۔'' اس نے باپ کے پل پل رنگ بدلتے چہرے کو دیکھ کر کہا تھا۔

''بات اعتبار کی نہیں ہے۔ یہ تو سب کو پتہ ہے کہ پھپھو کی محمود خان سے شادی نہیں ہوئی تھی۔ وجہ میں نہیں بتا سکتی۔'' وہ دونوں ہی اس لڑکی کے لہجہ میں گھبراہٹ محسوس کر گئے تھے۔

''چلیں ٹھیک ہے مومنہ۔ آپ نہ بتائیں، ماما آبشار آنٹی سے بات کریں گی تب وہ انہیں خود بتا دیں گی۔'' عبیر نے دھیمے سے کہا تھا۔ وہ بیٹے کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ وہ اس لڑکی سے پوچھے جبکہ اس نے بات سمیٹ دی تھی۔

''آپ کی ماما پھپھو سے ضرور بات کریں۔ میں آپ کی کال کا انتظار کروں گی۔'' مومنہ کی بات ان دونوں کے لئے ہی غیر متوقع تھی۔

''آپ کیوں چاہتی ہیں کہ میری ماما ضرور بات کریں۔'' وہ الجھ کر بولا تھا۔

''میں اپنی پھپھو سے بہت محبت کرتی ہوں اور میری پھپھو بہت دکھی ہیں۔ ان کے ساتھ ہوا بھی تو کتنا غلط۔ بس اسی لئے تو وہ تنہائی پسند ہوگئی ہیں۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے انہیں روتے ہی دیکھا ہے اور آج پہلی دفعہ ان کی کسی دوست کی کال آئی ہے تو مجھے بے حد اچھا لگا ہے۔ پھپھو کو بھی یقیناً آپ کی ماما سے بات کر کے اچھا لگے گا۔ اس لئے آپ کی ماما ضرور کال کریں۔'' مومنہ کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔ وہ کافی تفصیل سے بولی تھی۔ عبیر آگے سے کچھ کہتا یا پوچھتا مومنہ کو کسی کے آنے کی آہٹ سی محسوس ہوئی تھی اور اس نے فون بند کر دیا تھا۔ وہ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے تھے۔ کہانی مزید الجھ گئی تھی۔ فون گتھی سلجھانے کو کیا تھا جس میں مزید الجھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بیٹے کے سامنے سے اٹھ گئے تھے۔ ان کے کانوں میں اس لڑکی مومنہ کی آواز گونج رہی تھی۔

''پھپھو کی تو شادی ہی نہیں ہوئی، میری پھپھو بہت دکھی ہیں۔'' اپنے کمرے تک آتے ان کے کان میں کبھی محمود خان کی بیوی کی

باتیں گونجنے لگتیں تو کبھی اس لڑکی مومنہ کی۔ وہ بے طرح الجھن کا شکار ہو چکے تھے۔

''مجھے آبشار سے ملنا ہوگا۔'' انہوں نے کھڑکی کے سامنے سے ہٹتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔ ان کا اپنے ہی گھر میں دم گھٹنے لگا تھا۔

''اس گھر میں آبشار کو چلتے پھرتے دیکھنے کی کتنی آرزو تھی۔ آبشار نے میری آرزوؤں کا اپنے ایک انکار سے گلا گھونٹا تو میں یہ گھر ہی چھوڑ گیا تھا۔ بوڑھے ماں باپ کا بھی نہیں سوچا۔ اب تو یہ خالی مکان ہے جس میں سانس لینا بھی دشوار ہے۔ تمہارے ساتھ ایک گھر بنانا چاہتا تھا آبشار، اور میں گھر ہوتے ہوئے بھی بے گھر، ایک بنجارہ کی مانند تمام عمر بھٹکتا رہا اور تم۔۔۔ تمہارا بھی کوئی گھر نہیں ہے۔ میں تو اس بھرم میں جیا کہ تم محمود خان کے ساتھ خوش ہوگی۔ مگر اب پتہ لگا ہے کہ تم تنہائی کا عذاب جھیل رہی ہو۔ کس کے حصہ کی سزا کون کاٹ رہا ہے۔ یہ تک نہیں پتہ، نہ مجھے، نہ تمہیں۔ مجھے تم سے ملنا ہے آبشار۔۔۔ کہیں، کبھی۔۔۔ کسی موڑ پر آن ملو۔'' وہ گھر سے نکل آئے تھے۔ بے مقصد سڑک پر گاڑی دوڑاتے بے چینی سے سوچ رہے تھے۔ کبھی خود کو۔۔۔ تو کبھی آبشار کو مخاطب کرتے وہ گہری اذیت میں خود کو گھرا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

چمکتے چاند کو ٹوٹا ہوا تارا بنا ڈالا
مری آوارگی نے مجھ کو آوارہ بنا ڈالا
بڑا دلکش، بڑا رنگین ہے یہ شہر کہتے ہیں
یہاں پر ہیں ہزاروں گھر
گھروں میں لوگ رہتے ہیں
مجھے اس شہر میں گلیوں کا بنجارہ بنا ڈالا

''آبشار! ہم دونوں ہی مل کر ایک بہت حسین گھر بنائیں گے۔ جس کی اینٹوں میں تمہارا ایثار اور میری وفا کی مٹی شامل ہوگی۔'' ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا کی یاد سفر کرتی ان کے ذہن میں سرسرانے لگی تھی۔

''مجھے کبھی کبھی بہت ڈر لگتا ہے کبیر۔ اگر ہم اپنے خواب پورے نہ کر پائے، اگر کبھی ہم بچھڑ گئے، ہم اپنا گھر نہ بنا پائے تو کیا ہوگا۔ مجھے تو لگتا ہے میں تو مر ہی جاؤں گی۔'' کبیر عباسی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے ساحل کے کنارے پر کھڑے تھے۔ کانوں میں آبشار کے نم لہجہ کی سرگوشی سرا ٹھا رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے دور تک نیلا سمندر تھا اور پانی میں اترتا آبشار اور کزنئی کا حسین من موہنا چہرہ۔ انہیں لگا تھا کہ پانی میں عکس نہ ہو جیسے پوری آبشار اور کزنئی آن سمائی ہو۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا آبشار۔ مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہیں دھوکا نہیں دوں گا۔ تم میری محبت ہو، میری تمام وفائیں تمہارے لئے ہیں اور ہم اپنا گھر ضرور بنائیں گے۔'' انہوں نے عکس پر نظر جمائے اپنے الفاظ کو دہرایا تھا۔ خاموش فضا جس میں لہروں کا شور کبھی کبھی اٹھتا تھا

یکدم ان کی آواز دور تک پھیل گئی تھی۔

''آپ پر تو بھروسہ ہے مگر تقدیر کا بھروسہ نہیں ہے۔قسمت کب وار کرے، تقدیر کب ستم کرے انسان کب تقدیر کا مارا بن جائے۔ ہم انسانوں کو نہیں پتا ہوتا۔ میں اس لمحہ سے ڈرتی ہوں جب مجھ سے میرے خواب چھین لئے جائیں۔ مجھے اس گھر سے دور کر دیا جائے۔ جہاں آپ بستے ہیں، ہمارے خواب بستے ہیں۔'' سمندر کی لہریں شور کرنے لگی تھیں۔ آبشار کی آئی آواز ان لہروں میں کہیں گُم ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔

''تم ٹھیک کہتی تھیں آبشار، قسمت کب بازی لے جائے، انسان کو پتہ نہیں ہوتا اور میں بھی قسمت کے ہاتھوں شکست کھا گیا۔ گھر بنانے کا ارمان، ارمان ہی رہ گیا۔'' وہ گھٹنوں کے بل گیلی ریت پر گرے تھے۔ ان کی آواز کی بازگشت دور تک پھیلتی اس دل میں اتر گئی تھی جس کے لئے آزاد ہوئی تھی۔

میں اس دنیا کو اکثر دیکھ کر حیران ہوتا ہوں
نہ مجھ سے بن سکا چھوٹا سا گھر دن رات روتا ہوں
خدایا تو نے کیسے یہ جہاں بنا ڈالا
مرے مالک میرا دل کیوں تڑپتا ہے، سلگتا ہے
تری مرضی، تری مرضی پہ کس کا زور چلتا ہے
کسی کو گل کسی کو تو نے انگارہ بنا ڈالا
یہی آغاز تھا میرا، یہی انجام ہونا تھا
مجھے برباد ہونا تھا، مجھے ناکام ہونا تھا
مجھے تقدیر نے تقدیر کا مارا بنا ڈالا

سمندر کی لہروں میں تلاطم اور کبیر عباسی کے دل میں شور بپا تھا۔ زندگی بہت مدت ہوئی بچھڑ گئی تھی اور اب یوں شدت سے یاد آ رہی تھی کہ وہ زندگی کو تلاش کرنے کا خود سے عہد باندھ گئے تھے۔

☆......☆......☆

''نوائم! تم خواہ مخواہ میں پریشان ہو رہی ہو۔'' مومل عشاء کی نماز سے فارغ ہوئی تھی۔ مصلّہ اس کی جگہ پر رکھتے ہوئے وہ حسبِ عادت مختلف قرآنی آیات کا ورد کرتی بستر پر آئی تھی اور نوائم کو جاگتا پا کر دھیمے لہجے سے بول گئی تھی۔

''میں خواہ مخواہ میں پریشان نہیں ہو رہی ہوں مومی، یہ مت بھولو کہ ابسام کی کار سے کسی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ انہیں جیل بھی جانا پڑ

سکتا ہے۔'' نوائم کے لہجہ میں ایسا کچھ تھا کہ مومل بہت چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''یہ ڈنمارک نہیں ہے پاکستان ہے اس لئے تم پریشان نہ ہو۔ یہاں کیس کچھ لے دے کر ختم ہو جاتا ہے۔'' مومل بڑے آرام سے کہتی لیٹ گئی تھی۔

''تم ہمیشہ بکواس مت کیا کرو۔ یہاں میں اتنی پریشان ہوں اور تم تو یوں بی ہیو کر رہی ہو جیسے کچھ ہوا نہ ہو۔'' نوائم اسے بری طرح ڈپٹ کر یکدم ہی چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بلک اٹھی تھی۔ مومل مضطرب ہوتی اٹھ بیٹھی تھی۔

''نوائم، کیا ہوا ہے، تم اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہو۔'' وہ نوائم کے ہاتھ تھام گئی تھی۔

''مومی۔ مم۔ مجھے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے۔۔۔ ابسام سے محبت ہوگئی ہے۔'' وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے مومل کی طرف دیکھ کر اٹک اٹک کر بولتی مومل کے سر پر کوئی بم گرا گئی تھی۔ مومل اسے بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ لب کچلنے لگی تھی۔

''تمہیں یہ الہام کب ہوا؟'' مومل کو ایک دم ہی آبدار کی گریہ وزاری یاد آ گئی تھی۔ ابسام کا آبدار کے جانے کے بعد سے سوگوار سا پھرنا یاد آ گیا تھا۔ مومل اپنی ہی الجھنوں پر مضطرب ہوتی، ذہن کو دوسری طرف لگانے کو اپنے مخصوص انداز میں قدرے چڑ کر بولی تھی مگر اسے خود بھی احساس تھا کہ وہ اپنا مخصوص لاپرواہ چڑانے والا انداز قائم رکھنے میں ناکام رہی ہے۔

''جب سے ہم پاکستان آئے ہیں۔ مجھے ابسام سے بات کرنا ان کو دیکھنا، انہیں سوچنا بے حد اچھا لگنے لگا ہے۔'' وہ انگلیاں مروڑتی اعتراف کی منزل طے کر رہی تھی۔ مومل کا دل نہ جانے کیوں ڈوبتا جا رہا تھا۔

''منگنی کے بعد بھی مجھے کبھی ابسام کا خیال نہیں آیا۔ میں نے کبھی انہیں یا اپنے رشتے کو نہیں سوچا مگر یہاں آ کر ابسام سے مل کر ان کے ساتھ وقت گزار کر دل ان کو سوچنے لگا ہے۔ ان کے ساتھ کا متمنی ہونے لگا ہے۔'' نوائم خواب کی سی کیفیت میں بول رہی تھی۔ مومل اسے دیکھنے لگی تھی، نوائم کے حسین چہرے پہ محبت کی خوش رنگ تتلی محو رقص تھی۔ نوائم کا رنگ بکھیرتا چہرہ اسے حسین تر بنا گیا تھا۔ نوائم اپنے تمام جذبات، دلی کیفیت مومل پر آشکار کرتی جا رہی تھی۔ نوائم نے جب ابسام کو برتھ ڈے وش کی تھی اور گفٹ مانگنے پر پاکستان آنے کی بات کی تھی اور پاکستان آنے کے بعد ابسام سے کہا تھا۔

''کیسا لگا میرا سرپرائز؟'' نوائم کے انداز میں بے فکری تھی۔ اس نے پوچھنے کے ساتھ ساتھ ابسام کو اس کی سالگرہ کے تحفہ کے طور پر ایک قیمتی گھڑی دی تھی اور وہ محض ایک کزن کی حیثیت سے شرارت کر رہی تھی اور کیا پتہ تھا کہ دل لگی دیکھتے ہی دیکھتے دل کی لگی بن جائے گی۔ وہ مومل سے یہ سب بھی کہہ گئی تھی۔ اپنی شرارت، ابسام کے تاثرات بیان کرتی نوائم، مومل کو لمحہ بہ لمحہ مضطرب کر رہی تھی کہ نوائم کا ابسام کی محبت میں گرفتار ہونا ایک پریشان کن امر تھا کہ وہ آبدار کے دل کا حال بہ خوبی جانتی تھی اور ابسام کے دل کی حالت کو محسوس کر رہی تھی۔

خود وہ ہمیشہ محبت سے خائف، محبت سے انکاری رہی تھی مگر آبدار کا رونا ابسام کی محبت میں تڑپنا ایسا تھا کہ وہ محبت سے انکاری ہونے کے

باوجود محبت کو کہیں نہ کہیں محسوس کرنے لگی تھی۔عبیر کی لاکھ کوششیں اس کے دل کو نرم نہ کر پائی تھیں اور آبدار کا ایک آنسو اسے محبت کے وجود پر ایمان دلا گیا تھا۔اور یہی وجہ تھی کہ وہ آبدار کے جانے کے بعد ابسام کا چپ رہنا،گم صم ہو جانا، چونک جانا محسوس کر رہی تھی اور یہ تمام عوامل اسے محبت کا شاخسانہ لگ رہے تھے۔ وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ ابسام کو بھی آبدار سے محبت تھی اور اب نوائم اسے محبت کا مسافر ہو جانے کی اطلاع دیتی اس کا سکون غارت کر گئی تھی۔

''تم تو کہتی تھیں کہ تمہیں ابسام بھائی سے محبت نہیں ہے۔صرف بڑوں کی رضا سمجھ کر منگنی کی ہے۔'' مومل کو اپنی آواز کھائی سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

''رشتہ تھا،رشتہ کا احساس بھی تھا اور اب محبت بھی ہو گئی ہے۔'' وہ ترنت بولی تھی۔مومل آگے سے چپ رہی تھی۔

''میں شاید آج بھی اعتراف نہ کر پاتی مومی!مگر جب ابسام کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا۔مجھے لگا کہ ابسام مجھ سے دور چلے جائیں گے۔وہ شخص جو بن مانگنے میری زندگی میں شامل ہوا تھا اس کے دور جانے کا دھڑکا یوں دل کو لگا کہ میں خود سے اعتراف کر گئی۔میں ابسام کو کھونا نہیں چاہتی۔'' نوائم دھیمے دھیمے کہتی چلی گئی تھی اور بات کے اختتام تک اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''تم پریشان نہ ہو۔ابسام بھائی کو کچھ نہیں ہوگا۔حیدر انکل سب سنبھال لیں گے۔'' وہ نوائم کا ہاتھ تھام کر بولی تھی۔اس کے لئے نوائم بہت معنی رکھتی تھی۔اس کی خوشی معنی رکھتی تھی۔اسے ابسام اور نوائم میں سے کسی ایک کی خوشی چننے کے سخت مرحلے سے گزرنا پڑے تو وہ نوائم کے لئے موتیوں کا انتخاب کرتی۔وہ جو کچھ دنوں سے سوچ رہی تھی کہ وہ نوائم کو بتا دے گی کہ آبدار کو ابسام سے محبت ہے اور شاید ابسام بھی آبدار سے محبت کرتا ہے مگر آج نوائم کے دل کی بات جاننے کے بعد وہ اس راز کو راز ہی رکھنے کا فیصلہ کر گئی تھی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے مومی۔۔۔'' وہ آنکھوں میں آنسو لئے مومل کو دیکھ رہی تھی اور وہ جو ایک فیصلہ کر چکی تھی مطمئن ہو گئی تھی۔بے ساختہ اس کے انداز پر ہنس دی تھی۔

''تم یوں ابسام بھائی کی فکر میں دبلی ہوتیں اتنی کیوٹ لگ رہی ہو کہ دل کرتا ہے بھاگ کر جاؤں اور ابسام بھائی کو بلا کر لا کر تمہارا یہ حسین روپ انہیں دکھاؤں۔'' وہ اب نوائم کو چھیڑ رہی تھی اور وہ رونا بھول کر بری طرح جھینپ گئی تھی اور خجالت مٹانے کو مومل کو تکیہ مار گئی تھی۔

''تم ان کے سامنے یہ بکواس مت کرنا اچھا، میں نے تم سے دل کی بات اس لئے نہیں کہی کہ تم اشتہار لگاتی پھرو۔'' وہ سرخ پڑتی دھیمے لہجہ میں منمنائی تھی۔مومل ایک بار پھر ہنسنے لگی تھی۔

''محبت تو میں نے سنا تھا کہ انسان کو بہادر بناتی ہے تو پھر تم کیوں اتنی بزدل بن رہی ہو۔ابسام بھائی کو چیخ چیخ کر بتاؤ کہ تم ان سے محبت کرتی ہو،ان کے بغیر نہیں رہ سکتیں۔'' مومل اس کو چھیڑتے ہوئے مشورہ سے نواز رہی تھی۔

''محبت کے اظہار میں پہل ہمیشہ مرد کرے تو ہی اچھا لگتا ہے۔لڑکی اگر محبت کا اظہار کرے تو محبت کی چاشنی ماند پڑ جاتی ہے۔'' نوائم

کا اپنا ہی سادہ انداز تھا۔

''اف ۔نوائم ،تم بھی کہاں اٹھارہویں صدی کی باتیں کرنے لگی ہو۔محبت کے اظہار میں جنس کی کیا قید،جس کو محبت ہے صاف کہہ دے۔ یہ کیا کہ مرد پہل کرے۔اب محبت تمہیں ہوئی اظہار ابسام بھائی کریں یہ بات مجھے کچھ ہضم نہیں ہو رہی۔'' مومل کے لیے یہ باتیں کبھی معنی نہیں رکھتی تھیں اس لئے بڑے آرام سے کہتی چلی گئی تھی۔

''تمہاری اور میری سوچ میں بہت فرق ہے مومل، جو بات تمہیں بری نہیں لگ رہی ، وہ بات میرے لئے بے حد معنی رکھتی ہے۔'' نوائم تکیہ گود میں رکھے دھیمے غیر معمولی سنجیدہ انداز میں بول رہی تھی۔

''عورت کے جذبات پوشیدہ رہیں یہی ان کی اصل خوبصورتی ہے۔مرد لفظوں سے اقرار کرے،عمل سے ثابت کرے تو اچھا لگتا ہے مگر عورت اقرار کی منزل یوں بغیر کسی رشتہ کے طے نہیں کر سکتی۔ میں ابھی لفظوں سے،عمل سے اقرار نہیں کر سکتی کہ میں چاہتی ہوں کہ ابسام مجھ سے محبت کریں، میری محبت کو بن کہے محسوس کریں۔ میں ان سے شرعی رشتے میں بندھنے کے بعد اپنے رویے سے،اپنے عمل سے ان پر ظاہر کروں کہ مجھے ان سے محبت ہے۔یوں ایک دم عیاں کر دینے والی محبت کی مرد قدر نہیں کرتا۔'' نوائم محبت سے چور لہجہ میں بول رہی تھی مگر اس کے لفظ لفظ سے ابسام کی محبت ہی نہیں اپنی نسوانی انا اور عزت نفس کی محبت بھی صاف عیاں تھی۔اس کے لئے محبت معنی رکھتی تھی مگر اپنا وقار منواتی ہوئی محبت......!

''تمہیں بڑا پتہ ہے مردوں کی نیچر کا۔'' مومل اپنے حق کے لئے ،اپنی مرضی خوشی کے لئے صاف کہہ دینے والوں میں سے تھی اس لئے اسے نوائم کی فلاسفی کچھ خاص پسند نہیں آئی تھی۔

''پھپھو، حیدر انکل سے کس قدر شدید محبت کرتی ہیں مگر کبھی تم نے ان کے منہ سے سنا کہ انہیں حیدر انکل سے محبت ہے۔انہوں نے کبھی ''آئی لو یو'' کا راگ الاپا؟'' وہ اب مومل کو مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''بظاہر تو نہیں مگر حیدر انکل سے تو کہتی ہوں گی کہ وہ ان سے محبت کرتی ہیں۔'' مومل ترنت بولی تھی۔

''ہاں ،تو جب وقت آئے گا میں بھی ابسام سے کہہ دوں گی۔اس کا ابھی سے اشتہار لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' نوائم بھی اسی کی مانند ترنت بولی تھی اور وہ چڑ گئی تھی۔

''احمق لڑکی۔ جب پھپھو کو حیدر انکل سے محبت ہوئی تھی اس وقت انہوں نے حیدر انکل سے کہا ہوگا تب ہی تو انہوں نے پھپھو کا پرپوزل بھیجا تھا۔'' مومل اپنی طرف کا لیمپ آف کرتی تکیہ درست کر کے لیٹ گئی تھی۔

''سمجھ دار لڑکی۔ پہلے حیدر انکل نے اظہار کیا ہوگا اور میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ ابسام مجھ سے اظہار کریں۔'' نوائم بھی لیمپ آف کرتی لیٹ گئی تھی۔

''محبت تمہیں ہے، اظہار ابسام بھائی کریں۔ یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔'' وہ کروٹ لیتی نوائم کو دیکھنے لگی تھی۔

''تمہیں ابھی سمجھ نہیں آئے گی مومی، جب تمہیں عبیر سے محبت ہوگی تب تمہیں احساس ہوگا کہ ایک لڑکی کے لئے اپنے منہ سے اپنی محبت کا اظہار کرنا کس قدر کٹھن ہوتا ہے۔'' نوائم نے بحث کئے بغیر دھیمے سے کہا تھا۔

''مجھے کیوں عبیر سے محبت ہوگی۔'' وہ ناگواری سے کہتی احتجاجاً اٹھ بیٹھی تھی۔

''تم عبیر سے محبت کے خیال سے ہی کیوں چڑ جاتی ہو۔تمہاری عبیر سے منگنی ہوگئی ہے۔جلد ہی شادی ہو جائے گی اور پھر بھی تم محبت سے خائف ہو۔'' وہ مومل کو تاسف سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ عبیر کی فیلنگز کو پہلے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور جب سے خود محبت کی مسافر ہوئی تھی اس کے دل میں عبیر کے جذبات کے لئے قدر اور احترام مزید بڑھ گیا تھا۔

''شادی ہونے والی ہے تو کیا مطلب ہے۔ مجھے محبت بھی ہو جائے گی تو تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے نوائم، کہ میں محبت کے وجود سے انکاری نہیں رہی کبھی بھی۔۔۔مگر یہ بھی سچ ہے کہ مجھے عبیر سے محبت نہیں ہے کہ زبردستی رشتے جڑ جاتے ہیں تو ہمارا بھی رشتہ جڑ گیا ہے مگر دل کسی سے بھی زبردستی نہیں جڑ جاتا۔ دل کے رشتے زبردستی نہیں جوڑے جا سکتے۔ مجھے عبیر سے محبت نہیں ہے اور تم یا عبیر میرے دل میں محبت کو زبردستی ڈال نہیں سکتے۔'' مومل یکدم ہی بے حس نظر آنے لگی تھی۔نوائم بھی اسے حیرت سے دیکھنے لگی تھی۔اچھی بھلی حساس لڑکی عبیر کے معاملے میں یکدم ہی بے حس ہو جاتی تھی۔ایسا کیوں تھا نوائم کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

''اس کا مطلب تم رشتے کو سمجھوتے و مجبوری کی بنیاد پر گزارنے کا ارادہ باندھ چکی ہو۔''

''زندگی تو سمجھوتے کی بنیاد پر بھی گزر جاتی ہے۔'' وہ نوائم کی بات کاٹ کر بولی تھی۔نوائم اسے ناراضگی سے دیکھنے لگی تھی۔

''تم سب نے عبیر کو میری ضد، میری چڑ بنا دیا ہے۔تم سب کو لگتا ہے کہ عبیر میرے لیے پرفیکٹ ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اس لئے وہ ہی واحد ہے اب جس سے میری شادی ہو سکتی ہے۔'' یہ ایسا موضوع تھا جس پر وہ گھنٹوں تک منفی بول سکتی تھی۔ ہر بار نئی بحث کر سکتی تھی۔

''ہم میں سے کسی نے ایسا نہیں کہا۔'' نوائم بولنا چاہتی تھی۔

''کہا ہی نہیں ثابت بھی کر دیا ہے۔ میں رشتہ جڑنے سے قبل بھی یہی کہتی تھی کہ مجھے عبیر سے محبت نہیں۔آج بھی میں یہی بول رہی ہوں کہ مجھے عبیر سے محبت نہیں ہے اور محبت نہیں ہے تو کیوں نہیں ہے اس بات کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔تمہارے پاس ابسام بھائی سے محبت کرنے کا جواز نہیں ہے تو میرے پاس بھی عبیر سے محبت ''نہ'' کرنے کا جواز نہیں ہے۔'' مومل گہری سنجیدگی سے کہتی لیٹ گئی تھی۔

کمرے کی فضا میں تکلیف دہ خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ عبیر کی اچھائیوں کو تسلیم کرتی تھی، وہ مانتی تھی کہ وہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے، کسی بھی لڑکی کا آئیڈیل ہو سکتا ہے بس وہ اس کا آئیڈیل نہیں تھا۔عبیر کے جذبات اس کے دل پر اثر نہیں کرتے تھے اور جس طرح سب عبیر کو فیور کرتے اس کے پیچھے پڑے تھے وہ عبیر سے اس کی محبت سے بری طرح بدظن ہو چکی تھی۔ اسے عبیر سے نفرت محسوس ہوتی تھی کہ سب اس کی فکر میں

دبلے ہوتے اس سے اس کی مرضی، پسند کا حق ہی چھین چکے تھے۔ اسے نوائم سے ہی نہیں اپنی دادی اور پھپھو سے بھی کئی گلے ہو چکے تھے۔

''ہر وقت جسے دیکھو عبیر کے گن یوں گاتا ہے جیسے میں تو برائیوں کا مرقع ہوں۔ عبیر سے شادی نہ ہوئی تو مجھے کنوارہ ہی مرجانا ہے۔'' مومل غصہ سے کھول رہی تھی۔

''ایک بار شادی تو ہو جانے دو، پھر دیکھنا اس عبیر کے بچے کے میں کیسے دماغ ٹھکانے لگاؤں گی۔ ساری محبت بھول جائے گا۔ آیا کہیں کا مرزا۔'' اس نے غصہ سے کھولتے ہوئے خطرناک ارادے باندھے تھے۔ وہ بے چارہ تو اس کے خطرناک عزائم سے انجام رشتہ بندھ جانے پر بے حد خوش تھا۔ اپنی قسمت پر نازاں تھا۔ روز مومل کو اپنے گھر میں چلتا پھرتا محسوس کرتا تھا۔ خوابوں میں اس کے ساتھ سفر کرتا تھا۔ اس کے لئے تو سب کچھ مومل ہی تھی۔ اس کی کچی عمر کی محبت، وہ مومل کو بے پناہ چاہتا تھا۔ اس کے نخرے بھی اسے دل سے پسند تھے کہ محبوب کی تو بے پروائیاں بھی پرواہ کا ہی کوئی روپ لگتی ہیں۔ اس لئے اسے بھی مومل کا غصہ کرنا، نخرے دکھانا بے حد بھلا لگتا تھا۔ وہ آج جو کچھ ہوا تھا اس کے باعث پریشان تھا اس کے باوجود مومل کا خیال اس کے ذہن و دل کو پُرسکون کر گیا تھا۔ وہ اس کے لئے اچھے گماں کرتا، خواب دیکھ رہا تھا اور وہ اس سے بدگمان ہوتی، اس سے گن گن کر بدلے لینے کے ارادے باندھ رہی تھی۔ ایک محبت کا مسافر تھا تو دوسری اس سفر سے ہی خائف۔ بے حد بدگماں، ان کی زندگی جانے کیسے گزرنے والی تھی۔

☆......☆......☆

''محبت کرتے ہوناں تم بھی عریم سے۔'' آئیکت کا سوال کیا تھا کوئی انگارہ تھا جو اسے جلا کر رکھ گیا تھا۔

''گاڑی اسٹارٹ کرو۔'' وہ اپنی بات دہرا گیا تھا تب شاہ زیب چڑ کر بولا تھا مگر آئیکت اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

''نہیں کرتا ہوں میں اس سے محبت۔'' وہ چیخا تھا۔

''تم کرتے ہو اس سے محبت۔ تمہارا ہر انداز، تمہارا اس کے لئے پریشان ہونا، اس کی فکر میں دوڑے دوڑے جانا۔ ہر ایک بات چیخ چیخ کر اظہار کرتی ہے کہ تم عریم سے محبت کرتے ہو۔'' آئیکت اس کے غصہ سے متاثر ہوئے بنا اپنی بات پر، اپنے لفظ لفظ پر زور دے کر بولا تھا۔

''میں عریم سے محبت نہیں کرتا۔۔۔ میں تو اس سے عشق کرتا ہوں۔'' وہ ہارے ہوئے انداز میں اعتراف کر گیا تھا۔ آئیکت اس کو دیکھنے لگا تھا جس کے چہرے پر اس کی کہی بات کی سچائی کا عکس صاف محسوس کیا جا سکتا تھا۔

یہ عشق ایسی بھول ہے
جو دل کو قبول ہے
کانٹوں کا ہے لباس
یا صحرا کی دھول ہے

ویرانے میں مہکتا
سنہرا سا پھول ہے
یا جس خطا کی معافی نہ ہو
یہ وہ بھول ہے
جو بھی ہے مگر بھول
یہ ہم کو قبول ہے

''دل لگی، دل کی لگی بن گئی۔انتقام خود میرے لئے سزا بن گیا ہے آئیکت۔'' شاہ زیب کا انداز شکست سے چور تھا۔

''تم نے انتقام کی راہ ہی غلط چنی۔'' آئیکت اس کے ہارے ہوئے انداز کو دیکھتا گہری سنجیدگی سے بولا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آتا تھا میں کیا کروں، کیسے پھپھو کا انتقام لوں۔ پھر جب محمود خان کی بیٹی کو دیکھا تو بس یہی انتقام کی راہ سمجھ آئی کہ میں اس کے ساتھ وہی سب کروں جو ماضی میں اس کے باپ نے پھپھو کے ساتھ کیا تھا۔'' آئیکت ایک اشارے پر گاڑی اسٹارٹ کر گیا تھا۔ شاہ زیب دھیمے دھیمے بولنے لگا تھا۔

''مگر میں خود کو اس قبیح فعل کے لئے راضی نہ کر سکا۔اس لئے میں نے محبت کا جال بچھایا۔عریم سے مجھے نفرت محسوس ہوتی تھی اور میں اس سے محبت بھرے جملے بولا کرتا تھا۔'' وہ ان لمحوں کی اذیت میں خود کو گھرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔آئیکت اس کو ٹوکے بناء خاموشی سے ڈرائیونگ کرتا غور سے اس کو سن رہا تھا۔

''مگر وہ لڑکی میری سوچ سے بھی زیادہ معصوم تھی۔ائیرپیس سے ابھرتی اس کی مدھم آواز، میرے دل کے ساز بجا دیتی تھی مگر میں نے کبھی دل کی صدا پر لبیک نہیں کہا۔ میں اس لڑکی کو محمود خان کی بیٹی سمجھ کر اس پر گھیرا تنگ کرتا جا رہا تھا۔ جب مجھے لگا کہ وہ پوری طرح سے میری محبت میں گرفتار ہو گئی ہے تو میں نے اپنا رویہ بدل ڈالا۔'' وہ کہتے کہتے رکا تھا جیسے وہ ان گزرے لمحات کو محسوس کر رہا تھا۔اسے عریم وہاں نہ ہو کر بھی اپنے آس پاس خوشبو کی مانند محسوس ہونے لگی تھی۔اس کی خاموشی طول پکڑتی جا رہی تھی تب آئیکت نے ہلکے سے کھنکار کر اس کو متوجہ کیا تھا۔وہ آئیکت کو محض ایک نظر دیکھ کر پھر بولنے لگا تھا۔

''جیسے ہی میرا رویہ بدلا وہ بے چین ہو گئی۔ میں غصہ سے لائن کاٹ دیتا، وہ گھنٹوں کے حساب سے مجھے کال کرتی رہتی۔ایک کے بعد ایک میسج، روتے ہوئے مجھے منانا، اس کی ہر ادا، وفا کا ثبوت تھی۔'' پتلیوں پر عریم کا من موہنا چہرہ آن ٹھہرا تھا۔وہ لڑکی دھیرے دھیرے ہی تو آنکھوں کے راستے دل میں اتر گئی تھی اور اسے پتہ بھی نہیں چلا تھا۔

پلکوں سے چلتے چلتے
تیرے دل تک آ گئے
پوروں سے چنتے چنتے
لہو جگمگا گئے
نظروں نے اس نظر کو چھوا اور کہہ دیا
جو غم تیری طرف سے ملا وہ سہہ لیا
وہ سہہ لیا
یہ عشق ایسی بھول ہے
جو دل کو قبول ہے

''میں جو عریم کو محبت کی راہ پر لا کر چھوڑ دینا چاہتا تھا، خود محبت کا شکار ہو گیا۔اس کی چمکیلی محبت بھری نظر میرے دل کے آر پار ہو گئی۔ اس کے لرزتے لب من کو سلگا گئے۔ میں نے سوچا شاید یہ سب وقتی ہو اس لئے میں اسے اپارٹمنٹ پر لے کر آیا۔ وہ لڑکی جو گاڑی میں محتاط ہو کر بیٹھتی تھی، جو ریسٹورنٹ میں جھینپی جھینپی سی رہتی تھی، کبھی اپنا ہاتھ پکڑنے نہیں دیتی تھی وہ میرے غصہ کرنے پر میرے ناراض ہو جانے پر میرے اپارٹمنٹ چلی آئی تھی۔'' وہ لوگ شاہ زیب کے اپارٹمنٹ چلے آئے تھے اور اب آمنے سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔شاہ زیب اپنے سامنے بیٹھے آئیکت کو نہیں دیکھ رہا تھا کہ اسے تو سامنے عریم بیٹھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، جس نے سیاہ رنگ کا اسٹائلش سوٹ پہنا ہوا تھا۔ جس کی گوری رنگت سیاہ سوٹ میں دمک رہی تھی۔پلکیں حیا کے بار سے لرز رہی تھیں۔ وہ مضطرب سی لب کچل رہی تھی۔ منظر کس قدر حسین تھا۔حسن سامنے براجمان تھا دل میں بیک وقت محبت و نفرت کی آگ سلگ رہی تھی۔ نفرت کہہ رہی تھی کہ انتقام کی آگ کو سرد کر لے اور محبت کہتی تھی کہ محبت کا بھرم نہ ٹوٹنے پائے۔

''تمہیں میرے ساتھ یہاں آتے ہوئے ڈر نہیں لگا عرمی۔'' وہ جو بے حد کنفیوز سی انگلیاں مروڑ رہی تھی، شاہ زیب کی آواز پر چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''ڈر تو بہت لگ رہا تھا شاہ، مگر میرا دل تو آپ کا ہو چکا ہے اور جس سے محبت ہوتی ہے اس پر اعتبار خود بہ خود آ جاتا ہے۔ میں یہاں اپنے اعتبار کی روشنی میں اپنے شاہ کے ساتھ آئی ہوں۔'' وہ کم بولتی تھی مگر جب بولتی تھی شاہ زیب اور کزنئی کو لاجواب کر دیتی تھی۔اس کے تو دل میں چور تھا۔انتقام لینے کی دھن سر پر سوار تھی۔

''تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے عرمی، لیکن کہتے ہیں مرد و عورت کے درمیان تیسرا شیطان ہوتا ہے اور میں اگر بہک گیا تو۔۔۔

تمہاری عزت خراب ہو جائے گی۔'' وہ ندامت سے خود کو نکال کر سرد لہجہ میں بولا تھا اور عریم کو دیکھنے لگا تھا۔ اسے لگا تھا کہ وہ ڈر جائے گی اس کے چہرے کے تاثرات بدل جائیں گے مگر وہ تو بہت مطمئن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی اس کی ازلی معصومیت پھیلی تھی۔

''دل تو اللہ کا گھر ہے شاہ، اور جس دل کی گواہی پر میں یہاں تک آئی ہوں وہ میری ایک بھول، میری ہر ایک خطا، میرے ہر ایک گناہ کے باوجود میرے لئے باعثِ رسوائی نہیں بن سکتا۔'' وہ دھیمے سے بولی تھی۔ اس کو اعتراف تھا کہ اس کا یہاں آنا غلط تھا۔ وہ اپنے قدم کو غلط مان رہی تھی مگر اس قدم کو دل کی رضا سے یوں جوڑ گئی تھی کہ شرع تو اس پر حد بندی لگا سکتی تھی مگر شاہ زیب تو اس کے لفظوں کے جال میں پھنس گیا تھا تو وہ اس پر اعتبار جتا کر اسے اپنے آپ میں چھوٹا کر گئی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا اور اس کے پاس آن ٹھہرا تھا اس کے سمجھنے سے قبل وہ اسے بازو سے تھام کر اپنے مقابل کھڑا کر گیا تھا۔

''اگر میں تمہارے جسم تک رسائی حاصل کرنا چاہوں تو کیا تم مجھے روک پاؤ گی؟'' اس کی آنکھوں میں وحشت سی ناچنے لگی تھی۔

''آپ تو میرے دل تک رسائی حاصل کر چکے ہیں شاہ، جب میں آپ کو اپنا سب کچھ مان گئی ہوں تو آپ کو یہ سب کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں آپ ایسا کچھ کر ہی نہیں سکتے کہ جن سے محبت ہوا نہیں بے آبرو نہیں کیا جاتا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ شاہ زیب کی اس کے بازو پر گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔

''عریم نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ جن سے محبت ہو انہیں بے آبرو نہیں کیا جاتا اور میں نے انتقام کو سائیڈ پر رکھ کر نکاح کر لیا۔'' وہ گہری سوچ سے نکل کر اس شام کے منظر سے باہر آ تا نکاح کی وجوہ سے اسے آگاہ کر گیا تھا۔ شاہ زیب نے نکاح کے انتظامات کیے ہوئے تھے مگر وہ ڈبل مائنڈڈ تھا۔ اچھائی، نکاح پر اُکسا رہی تھی اور انتقام بربادی کی طرف مائل کر رہا تھا مگر عریم کی معصومیت، اس کی محبت نے شاہ زیب کو بربادی کی درمیانی راہ دکھائی تھی اور اس نے نکاح کر لیا تھا۔

''مگر میرا اختیار یہیں تک تھا آئیکت کہ میں عریم سے محبت کے لئے خود کو مجبور پاتا تھا مگر میں اسے اپنی نفرت سے بھی آزاد نہیں کر سکتا تھا اس لئے جو کچھ اس کے لئے محسوس کیا وہ اپنے دل میں چھپا کر وہ سب اس سے کہا جسے سن کر اگر اس کے دل میں مرنے کی چاہ نے جنم لیا ہو گا تو میں بھی کہتے ہوئے مرنے کی آرزو میں مبتلا ہو گیا۔ مگر میں مجبور تھا۔ میں محبت کرنے میں بے اختیار تھا، آگے بھی میں بہت مجبور ہوں مجھے پھپھو کے ایک ایک آنسو کا حساب لینا ہے۔ خود جل کر محمود خان کو راکھ کا ڈھیر بنانا ہے۔ میرے جلتے دل کے ساتھ عریم کے نصیب میں بھی جلنا لکھا ہے۔ میں جو کچھ کر چکا، کرنے والا ہوں وہ مجھ سے نفرت کرے گی۔ میں نے تو عشق کی بازی کھیلی ہے، شکست میرا نصیب ہے کہ محبت کی جیت میرے گلے آن لگے ناممکن ہے۔ مجھے تاعمر عریم سے روا رکھے سلوک پر ملال رہے گا۔ وہ مجھے معاف کر دے گی وہ مجھ سے اتنی ہی شدید محبت کرتی ہے مگر میں خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا کہ میرا عشق مجھے میری محبت کی توہین مجھے معاف کرنے نہیں دے گا۔''

آئیکت اس کے محسوسات کو اچھے سے سمجھ رہا تھا کہ محبت ایسی ہی جان لیوا ہوتی ہے۔

''تم عریم سے کہہ دو۔ اپنے احساسات و جذبات اس کے سامنے کھول کر رکھ دو۔ ضروری تو نہیں کہ تم اس کے خلاف جا کر سب کچھ کرو۔ تم اسے اپنے ساتھ لے کر بھی تو چل سکتے ہو۔'' آئیکت اسے دھیمے لہجہ میں اس بات کے لئے قائل کر لینا چاہتا تھا کہ وہ عریم کو سب بتا کر اس کو اپنا ہمنوا و غمگسار بنا لے۔

''میں نے یہ بھی کئی بار سوچا مگر محمود خان جس طرح کا انسان ہے ایسے میں، میں عریم کی ہمدردی حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ عریم اس تکلیف سے گزرے تاکہ محمود خان کو اس تکلیف کے معنی سمجھ آئیں۔ میں عریم کو اپنا ہمدرد بنا لوں گا تو وہ بات وہ مزہ نہیں رہے گا کہ دکھ سے گزرنے اور دکھ کا ڈرامہ کرنے میں فرق ہوتا ہے۔'' آئیکت کو اس کی بات درست اور فیصلہ راست لگا تھا کہ ابھی عریم جس تکلیف میں تھی اگر شاہ زیب اس کی ہمدردیاں حاصل کر لیتا تو یہ تکلیف ڈرامہ کا روپ دھار لیتی۔ یعنی وہ شاہ زیب کے ساتھ خوش ہوتی اور محمود خان پر ظاہر کر رہی ہوتی کہ وہ دکھی ہے۔ اسے شاہ زیب، محمود خان کے کئے کی سزا دے رہا ہے۔

''محمود خان کس قماش کا انسان ہے تم بھی بہ خوبی سمجھ گئے ہو۔ وہ یہ بات جان جاتا اور میرا انتقام دم توڑ دیتا۔ میں اتنا کر کے بھی اپنے ممکنہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکامیاب ہو جاتا۔'' وہ محمود خان کو اچھے سے سمجھ گیا تھا مگر وہ غلطی پر تھا کہ محمود خان اس کی سوچ سے زیادہ سفاک تھا۔

''مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا کہ محمود خان اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود بھی شرمندہ نہیں ہے۔ وہ کتنی آرام سے خلع کی بات کر گیا مگر اس نے یہ بات کرنے میں اتنی دیر کیوں کی۔ یہ بات بھی سوالیہ نشان کی مانند ہے۔'' آئیکت اٹھ کر چلا گیا تھا وہ گہری سوچ میں تھا۔ آئیکت کی تقریباً دس منٹ بعد واپسی ہوئی تھی۔ وہ دونوں کے لئے چائے بنا کر لایا تھا۔ شاہ زیب کے سامنے بھاپ اڑاتا چائے کا مگ رکھتے ہوئے بولا وہ چائے کے سپ لینے لگا تھا۔

''عریم پریگننٹ تھی۔ اس لئے محمود خان جھکنے پر، میری ماننے پر مجبور تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں عریم سے اپنے نکاح سے مکر جاؤں اس لئے وہ شرمندگی کا، میری ہر بات ماننے کا ڈرامہ کر رہا تھا کہ وہ بات کھلنے کے بعد بیوی و بیٹی کی نظر سے گر گیا تھا۔ اس کے پاس جھکنے کے علاوہ دوسرا کوئی آپشن نہ تھا۔'' شاہ زیب چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے غیر معمولی سنجیدگی سے بول رہا تھا۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔'' آئیکت چائے کا آخری گھونٹ بھرتا چائے کا خالی مگ ٹیبل پر منتقل کرتے ہوئے بولا تھا۔

''سمجھ تو خود میں بھی نہیں پایا تھا۔ میں محمود خان کی سانپ کی سی فطرت سمجھ نہ پایا۔ اگر مجھے ذرا بھی یہ خدشہ ہو جاتا کہ محمود خان اس حد تک گر سکتا ہے، وہ میرے بچے کی جان لے سکتا ہے تو میں عریم کو وہاں نہ چھوڑتا مگر افسوس، میں اس سانپ کو نہ پہچان سکا جس نے میرے بچے کو ڈس لیا۔ مجھ سے باپ بننے کا احساس چھین لیا۔ میری پہلی اولاد دنیا میں آنے سے قبل ہی مجھ سے بچھڑ گئی اور میں اس کے لئے محمود خان کو معاف نہیں کروں گا۔'' وہ شاہ زیب کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پہلے بھی بات کے دوران کئی جگہ پر اسے بہت دکھی لگا تھا اور اس وقت وہ بہت

دکھی، بہت تکلیف میں محسوس ہو رہا تھا۔

''تمہیں یقین ہے کہ جو تم سوچ رہے ہو ویسا ہی ہوا ہے۔تمہارا بچہ مرا نہیں، محمود خان کی چالبازی کی نظر ہوا ہے۔'' آئیکت قدرے بے یقین تھا کہ اس کا ماننا تھا کہ انسان کسی بہت اپنے کو تکلیف نہیں دے سکتا اور عریم تو محمود خان کی بیٹی تھی وہ اس کے ساتھ کیسے ایسے کر سکتے تھے۔

''جب انسان کے اندر اچھائی دم توڑ دیتی ہے تو انسان، دوسرے انسان کی سوچ سے زیادہ مکروہ فعل سرانجام دے سکتا ہے۔'' شاہ زیب کے لہجہ میں بے بسی و تکلیف بول رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔محمود خان کو یہی سب کرنا ہوتا تو وہ بہت پہلے ہی ابارشن کروا سکتا تھا۔یوں تمہاری مان کر، سب سے معافی نہ مانگتا۔وہ یہ سب کرتا اور کبھی بھی اورکزئی ہاؤس سر جھکا کر نہ آتا۔'' وہ شاہ زیب کی بات ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔محمود خان کا وہ گناہ جو برسوں سے اس کی بیوی اور بیٹی سے پوشیدہ تھا، وہ یوں عیاں ہوا کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کر نہیں پایا۔وہ ابارشن کی بات کر کے بیوی اور بیٹی کی نظر میں مزید گر جاتا اس لئے اس نے یہ خون کا گھونٹ پینا ہی مناسب سمجھا مگر آج جب عریم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا، اس کا ٹریٹمنٹ ہو رہا تھا تب محمود خان کے سازشی دماغ نے اسے یہ ترکیب سمجھائی تھی اور اس نے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ڈاکٹر صاف انکاری ہو گئی تھی۔اس کا کہنا تھا کہ ابارشن ان کی بیٹی کی زندگی کے لئے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے مگر وہ ڈاکٹر کو صاف کہہ گئے تھے کہ وہ یہ کام کر دے پھر چاہے اس سب میں ان کی بیٹی بھی مر جائے۔انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ڈاکٹر کو اتنے پیسے دے دیئے تھے کہ وہ اپنے ایمان کا سودا کر گئی تھی۔

''مجھے بس یہی سمجھ آیا ہے کہ وہ کسی موقع کی تلاش میں تھا آج موقع ملا تو وہ یہ وار کر گیا۔'' شاہ زیب گہری یاسیت سے بولا تھا۔

''مگر میں اس کے لئے محمود خان کو معاف نہیں کروں گا۔وہ اب پھپھو کا ہی نہیں میرا بھی مجرم ہے اور میں اسے اس کی سزا دے کر رہوں گا۔'' شاہ زیب جو سوچ، سمجھ رہا تھا اس شک کی تصدیق کے لئے وہ چھان بین کا ارادہ کرتا ایک عزم سے بولا تھا۔

''اگر تمہارا شک درست ہے تو اس سے پھر تو ہر بات کی امید کی جا سکتی ہے۔ایسے میں آبدار کا اس کے گھر رہنا، ہم لوگوں کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے کہ آبدار کی حقیقت کچھ بھی ہو زمانہ اسے اورکزئی خاندان کی بیٹی کی حیثیت سے ہی جانتا ہے۔'' آئیکت کو تمام صورتحال سمجھنے تک آبدار کی فکر ہو چلی تھی۔شاہ زیب بے طرح چونک اٹھا تھا۔

''تم کہہ تو ٹھیک رہے ہو۔جو شخص اپنی نام نہاد عزت رکھنے کو اپنی بیٹی کے ساتھ اتنا کچھ کر سکتا ہے تو اس سے ہم یہ امید کیسے لگا سکتے ہیں کہ وہ آبدار کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔'' شاہ زیب کو یکدم ہی آبدار کی بات مان کر اسے محمود خان کے گھر بھیجنے کا اپنا فیصلہ نہایت غلط اور غیر مناسب لگا تھا۔

''آئیکت۔جس قماش کا وہ انسان ہے اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنا گناہ چھپانے کو آبدار کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے بھی

دریغ نہ کرے۔'' شاہ زیب مضطرب نظر آ رہا تھا۔ آئیکت کے تو حواس ہی گم ہونے لگے تھے۔ اس کے چہرے پر فکر کے گہرے سائے پھیل گئے تھے۔

''میں ابھی جا کر آبدار کو واپس لے آتا ہوں۔'' آئیکت صوفہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ہاں، فوراً نکلو کہ ابھی محمود خان ہاسپٹل میں ہے۔ آبدار کو ساتھ لانے میں کسی بحث کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' وہ دونوں بڑی تیزی سے گاڑی تک پہنچے تھے۔ آئیکت کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ معمول سے کہیں زیادہ تیز ڈرائیونگ کرتا محمود خان کے گھر پہنچا تھا۔ چوکیدار نے انہیں گیٹ پر ہی روک لیا تھا اور بولا تھا کہ صاحب لوگ گھر پر نہیں ہیں تب آئیکت نے کہا تھا کہ ان کے گھر شام میں ایک مہمان لڑکی آئی تھی وہ اس سے ملنے آئے ہیں اور چوکیدار کی بات نے ان دونوں کے ہی پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔

''تم یقین سے کہہ رہے ہو کہ وہ لڑکی یہاں سے جا چکی ہے۔'' آئیکت کو اپنی آواز کانپتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ چوکیدار اپنی کہی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔ وہ دونوں مضطرب سے یہ سوچ رہے تھے کہ وہ اگر یہاں ٹھہری نہ تھی تو پھر وہ کہاں گئی۔

''ہم گھر چلتے ہیں، ہوسکتا ہے وہ گھر چلی گئی ہو۔'' آئیکت گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے نہایت پریشانی سے بولا تھا۔

''وہ گھر گئی ہوتی تو اب تک ہم تک اطلاع آ چکی ہوتی۔'' اس نے آئیکت کے اندازے کو فوراً رد کیا تھا اور کچھ گھنٹہ قبل جس نمبر سے اسے کال آئی تھی اس نمبر پر کال بیک کی تھی۔ نتاشہ محمود نے وہی سب کہا تھا جو چوکیدار نے کہا تھا۔

''عریم کی ماما کہہ رہی تھیں کہ وہ ان کے گھر بہت زیادہ دیر نہیں ٹھہری تھی۔ وہ محمود خان پر غصہ ہوتی، نفرت کا اظہار کرتی ان کے بہت روکنے پر بھی وہاں نہ ٹھہری تھی۔'' وہ آئیکت کو نتاشہ محمود سے ہوئی بات کی تفصیل بتا رہا تھا۔ وہ دونوں ہی بہت پریشان تھے کہ یہ سوال انہیں بے چین کر رہا تھا کہ آبدار آخر گئی کہاں۔ وہ اور کرنزئی ہاؤس پہنچ گئے تھے۔ آبدار وہاں نہیں آئی تھی۔ وہ اپارٹمنٹ پر بھی نہیں پہنچی تھی۔ آئیکت نے احتیاطاً ابسام کو کال ملائی تھی تا کہ اس سے پوچھ لے مگر وہ اس کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا اور اس کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔ اس نے حیدر کاٹیج جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

❁ ❁

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

''مما! مجھے میرا سیل فون لا دیں۔ مجھے شاہ سے بات کرنی ہے۔'' وہ رو رو کر تھک گئی تھی مگر آنسو تھے کہ بہتے ہی چلے جا رہے تھے۔ نتاشہ نے اسے صبر و حوصلہ سے کام لینے کی ہدایت کی تھی مگر جو قیامت اس پر ٹوٹی تھی اس سے نبرد آزمائی کو حوصلہ سے بڑھ کر حوصلہ کی ضرورت تھی اور وہ اتنا حوصلہ خود میں نہیں پا رہی تھی اس لئے اس نے اس سنگدل کی کمی کی شدت سے محسوس کرتے ہوئے اسے اپنے آس پاس دیکھنے کی اور اس کے کاندھے پر سر رکھ کر آنسو بہانے کے لئے اسے بلانے کی چاہ کی تھی اور ماں کو موبائل لا دینے کا کہا تھا۔انہوں نے بیٹی کے زرد متورم چہرے کو کتنے دکھ کے ساتھ دیکھا تھا اور اسے شاہ زیب کے آ کر چلے جانے کا بتا دیا تھا۔

''آپ نے انہیں بتایا کہ ہمارا بچہ نہیں رہا۔'' وہ آنکھوں میں نمی لئے ماں کو دیکھنے لگی تھی۔ یہ بات ہی اس کے لئے مرنے کے مترادف تھی کہ شاہ زیب آیا اور اس کی دلجوئی کرنا تو دور اس سے ملے بغیر ہی چلا گیا۔

''ہاں۔'' وہ بیٹی کے ہاتھ تھام کر بھیگے لہجے میں ایک لفظ ہی بول پائی تھیں کہ وہ بول پڑی تھی۔

''شاہ۔اتنی بڑی بات سن کر بھی... یوں اتنے آرام سے... مجھ سے ملے بغیر چلے گئے۔انہوں نے یہ تک نہ سوچا کہ اس وقت مجھے ان کے سہارے کی ضررت ہے۔'' اس کی آنکھوں میں ٹوٹے خوابوں اور بکھرے مان کی کرچیاں چبھنے لگی تھیں۔

''وہ تمہاری طبیعت کا ہی سن کر آیا تھا۔ بچے کا سن کر بہت افسردہ ہو گیا تھا۔ وہ ٹھہرتا کچھ دیر... ملتا تم سے... مگر اس کی کال آ گئی۔ وہ مجھ سے کہہ کر گیا ہے وہ جلد آئے گا۔تم سے ملنے۔'' وہ بیٹی کی ذہنی و قلبی کیفیت کو سمجھتیں نرمی سے کچھ سچ، کچھ جھوٹ بولتیں اس کی دلجوئی کر رہی تھیں۔

''مما۔شاہ میرا سہارا نہ بنتے۔بس دو حرف تسلی کے ہی بول جاتے۔اس تڑپتے دل کو سکون آ جاتا۔وہ پاپا کے کیئے کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہیں۔'' وہ بری طرح بلک رہی تھی۔ایک تو بچہ کھونے کا دکھ اوپر سے اس شخص کی بیگانگی جو اس کے لئے سب کچھ تھا وہ دوہری تکلیف و اذیت کا شکار تھی۔نتاشہ محمود آگے سے کچھ کہہ نہیں پائی تھیں کہ اس تکلیف دہ موضوع پر تو وہ بھی بے بس تھیں کہ ان کی بیٹی ہی نہیں، خود وہ بھی شدید اذیت کا شکار تھیں۔

''پاپا نے ماضی میں اگر کوئی گناہ کیا تھا تو اس کی سزا مجھے کیوں مل رہی ہے۔شاہ زیب میرے قدموں تلے سے کیوں زمین کھینچ رہے ہیں۔میری سانسوں کو میرے لئے کیوں آزار بنا رہے ہیں۔'' عریم کا رونا ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔وہ بیٹی کے ہاتھ نا محسوس انداز میں اپنی ہتھیلی سے آزاد کرتیں باہر نکل گئی تھیں۔

''شاہ۔میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میری محبت میرا سب سے بڑا ناقابل معافی جرم بن جائے گی۔آپ مجھ سے میرے باپ کے گناہوں کا بدلہ لے رہے ہیں یا خود سے محبت کرنے کی سزا دے رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کو، آپ کے عشق کو، دل سے، روح کی

گہرائیوں سے قبول کیا۔ نکاح کیا آپ سے۔ آپ کو تن و من کا مالک بنا کر ہر ایک اختیار سونپ دیا اور آپ مجھے یوں بیچ راہ میں تنہا کرتے جا رہے ہیں۔ میرے جسم سے روح نکال کر کہتے ہیں جیو عریم محمود! تو یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ یہ بے روح عریم، اب عریم شاہ زیب اور کزنی ہے۔ آپ محمود کی بیٹی کو نہیں اپنی بیوی کو سزا دے رہے ہیں۔ میرے اعتبار، میری وفاؤں کو مشق ستم بنا کر سمجھتے ہیں کہ انتقام کی آگ سرد پڑ جائے گی تو سرد آگ کے شعلے جو میرے سلگتے دل سے اُٹھ رہے ہیں ان کا حساب کون کرے گا؟ محمود خان کے کیے کی سزا تو مجھے دے رہے ہیں۔ مجھے بے قصور تختہ دار پر لٹکانے کی سزا آپ کو کون دے گا شاہ۔'' وہ بری طرح بلک رہی تھی۔ سوچ آواز بنتی تو کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔ پھر یکدم اس کی آواز خود کلامی میں ڈھل جاتی تھی اور کمرے میں موت کا سا سناٹا طاری ہو جاتا تھا۔

تنہائی کو سینے سے لگایا تیرے لئے
ہنستے ہوئے اس دل کو
رلایا تیرے لئے
ہر رشتہ سے خود ہاتھ
چھڑایا تیرے لئے
آنکھوں کو اک عمر
جگایا تیرے لئے
تیرے لئے
یہ عشق ایسی بھول ہے
جو دل کو قبول ہے

☆......☆......☆

''مجھے سمجھ نہیں آتا شاہ۔ آخر آبدار گئی تو کہاں گئی؟'' آئیکت کے ہر انداز سے آبدار کے لئے فکر صاف عیاں تھی۔ متفکر تو وہ بھی تھا۔

''مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ آبدار کہاں چلی گئی ہے۔'' وہ دکھتے ہوئے سر کی کنپٹیوں کو ہاتھ سے دھیمے دھیمے پریس کر رہا تھا۔ اس نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ حیدر کاٹیج جانا بے سود ہو گا وہ وہاں نہیں گئی ہو گی مگر آئیکت اپنی تسلی کو وہاں گیا تھا۔ اس نے ابسام سے باتوں میں ذکر کیا تھا مگر اس نے اپنی پریشانی یوں سامنے رکھی تھی کہ آئیکت بھی پریشان ہو گیا تھا اور وہ ابسام کو پریشان نہ ہونے کی تلقین کرتا خود جس پریشانی کے عالم میں گیا تھا اسی میں لوٹ آیا تھا۔

''تمہاری اس سے کوئی بات ہوئی تھی۔'' آئیکت چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

''نہیں تو... کیوں، تم کیوں پوچھ رہے ہو'' وہ الجھن کا شکار ہو گیا تھا جبکہ شاہ زیب اس کی گھبراہٹ محسوس کرتا دھیمے سے کہہ گیا تھا۔

''مجھے لگا شاید تم دونوں میں کوئی بات ہوئی ہے۔ تم مجھے آبدار سے کچھ خفا لگ رہے تھے۔'' آئیکت کی گڑبڑاہٹ میں اضافہ ہو گیا تھا۔

''ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ محض وہم ہے تمہارا۔ میں کیوں بھلا آپی سے ناراض ہوں گا۔'' اس نے گاڑی ہاسپٹل کی پارکنگ میں روک دی تھی۔ جب آبدار نہ محمود خان کے گھر پر تھی نہ ہی اور کزنی ہاؤس پہنچی تھی تو وہ دونوں اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ وہ محمود خان سے جا کر پوچھیں اسی لئے وہ ہاسپٹل دوبارہ چلے آئے تھے۔

''یہ میرا وہم نہیں ہے۔ بات تو ضرور ہے تم بتانا نہ چاہو تو وہ الگ بات ہے''۔ شاہ زیب گاڑی سے اتر گیا تھا۔

''تم سے آبدار نے جو کچھ کہا تھا۔ وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے برا لگا تھا۔ راستے میں، میں نے اسے کافی کچھ کہہ دیا تھا۔'' شاہ زیب کے بات ختم کر دینے پر وہ لامحالہ اس کے ہمقدم ہوتا تفصیل کہتا چلا گیا تھا۔ وہ جواباً کچھ نہیں بولا تھا۔ وہاں پہنچ کر انہیں پتہ لگا تھا کہ آدھ گھنٹہ قبل عریم کو ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا وہ دونوں گاڑی میں آ بیٹھے تھے۔

''تمہیں آبدار سے وہ سب نہیں کہنا چاہئے تھا کہ اس دنیا میں تم واحد تھے جس پر وہ بھروسہ کرتی تھی۔ ذہن و دل کی بات کر لیتی تھی۔ تم اس پر خفا ہوئے تو وہ خاموشی سے کہیں اور چلی گئی۔ کہاں۔ یہ اب تم ڈھونڈتے رہو۔'' شاہ زیب کا انداز بے لچک تھا۔

''آپی نے کس قدر بڑی بات کہہ دی تھی شاہ، میں بہت ہرٹ ہوا تھا۔ بس اس لئے ناراضگی و غصہ میں اس پر خفا ہو گیا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ یوں کہیں چلی جائے۔'' آئیکت بے بسی سے بولا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ آبدار کو کافی کچھ سنا گیا ہے مگر وہ تو بہت مجبور تھا اس نے جو کیا، آبدار کے لئے کیا۔ اس کی بھلائی کی نیت سے کیا تھا۔

''تم اسے کافی سنا گئے ہو اور مجھے لگتا ہے کہ وہ تمہارے رویے سے ہرٹ ہو کر ہی تم سے رابطہ کئے بغیر کہیں اور چلی گئی۔'' شاہ زیب بعض دفعہ بالکل ہی حد کر دیتا تھا۔ انتہائی بے مروتی و سنگدلی کا مظاہرہ کرتے اپنا تجزیہ پیش کرتا پہلے سے پریشان آئیکت کو مزید پریشان کر گیا تھا۔

''تم سارا قصور مجھ پر ڈال رہے ہو جبکہ میں نے تو آبدار کے اس خبیث شخص کے گھر جانے پر کتنی مخالفت کی تھی۔ اگر آبدار کو محمود خان کے گھر بھیجنا ہوتا تو میں بھی یہ کام کر سکتا تھا۔ اسے ابسام کے گھر نہ چھوڑتا۔ جو کام مجھے نامناسب لگا وہ تم کر بیٹھے کہ تم اپنے دماغ سے سوچتے ہو اور جو سوچ لو اس پر عمل کر کے رہتے ہو۔ میری سن لیتے تو آج یہ نوبت ہی نہ آتی۔'' آئیکت بھی مروت بالائے طاق رکھ کر بولتا چلا گیا تھا۔

''جس سختی سے آبدار نے تم سے شادی سے انکار کیا تھا میں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ آبدار ہر حال میں محمود خان تک پہنچنا چاہتی ہے اس لئے میں نے اس کی حمایت کر دی تا کہ آگے پریشانی سے ہم سب محفوظ رہیں مگر تم نے معاملہ بگاڑ دیا۔'' شاہ زیب اپنے فیصلہ پر بالکل بھی پچھتاوے کا شکار نہ تھا اور سارا الزام اس پر رکھ گیا تھا۔

''تم سارا الزام مجھ پر رکھ بھی کیسے سکتے ہو شاہ زیب۔ جبکہ میں آبی کے لئے کس قدر پریشان ہوں۔'' آئیکت کی آواز صدمے و دکھ سے بوجھل ہوگئی تھی۔

''میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا کہ تم اس وقت مجھ سے زیادہ پریشان ہو مگر مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی عار نہیں ہے کہ یہ پریشانی تم نے خود مول لی ہے۔'' شاہ زیب کی سنجیدگی میں ذرا برابر کمی نہ آئی تھی اس نے لب بھینچ لئے تھے۔

''آبدار، جس کے سر پر اپنے نام نہاد باپ سے ملنے کا خبط سوار تھا۔ وہ اسی خبط میں گھر سے فرار ہو جاتی مگر تم نے اس کی مدد کی تو وہ تم پر بھروسہ کر کے تمہارے دوست کے گھر جا کر ٹھہر گئی۔ واپسی پر صاف کہہ دیا اس نے تم سے شادی نہیں کرنی۔ وہ صرف محمود خان تک پہنچنا چاہتی ہے۔ اس بات کو تم نے انا کا مسئلہ بنا کر اس کو خوب سنائیں۔ وہ اتنی دلبرداشتہ ہوئی کہ جانے کہاں چلی گئی۔'' شاہ زیب گہرے، تجزیاتی انداز میں بول رہا تھا۔

''تم یہ ثابت کیوں کرنا چاہتے ہو کہ آبدار میرے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر کہیں گئی ہے۔'' آئیکت کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ وہ جو تفصیل سے کہتا جا رہا تھا اس کو چپ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

''اور کرزئی ہاؤس میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا یہ بات وہ اچھے سے جانتی ہے اور جس طرح گھر سے فرار ہوئی اس کے بعد اور کرزئی خاندان کے لئے وہ عضو معطل ہوگئی ہے۔ اس بات کا بھی اسے ادراک تھا۔ ایسے میں اگر وہ محمود خان کے رہنے کے ارادے سے نہیں گئی تھی تو وہ یقیناً تم سے ہی رابطہ کرتی کہ شروع سے تم ہی اس کے غم خوار رہے ہو مگر آج تم نے بھی انا کا پرچم لہرا کر اس سے محبت و دوستی کا مہربان ساتھ چھین لیا۔ تم اس پر غصہ کر رہے تھے۔ اس کے بعد تم یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہو کہ وہ تم کو مدد کے لئے پکارے گی۔ تم لڑکیوں کی انا نہیں جانتے۔ اپنی نسوانی انا و وقار کے لئے خود کو داؤ پر لگا دیتی ہیں۔'' شاہ زیب نے محسوس کیا تھا کہ آئیکت اس سے ناراض ہے اور وہ آئیکت سے بات کرنا چاہتی ہے مگر آئیکت نے اسے موقع ہی نہیں دیا تھا۔ شاہ زیب اس سے زیادہ سمجھدار و معاملہ فہم تھا۔ اس نے اپنی پھپھو کی کتھا ایک دوست کی طرح سنی تھی۔ وہ کافی حد تک لڑکیوں کی نفسیات سمجھنے لگا تھا۔ آبشار اور کرزئی سے ہی نہیں، عریم کے انداز سے بھی اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ دونوں کی نفسیات کو سمجھا تھا۔ جس وقت آبدار نے تمام تربات اپنی سوچ کے ساتھ اس کے گوش گزار کی تھی وہ اسی پل سمجھ گیا تھا کہ آئیکت کی محبت میں گھر کی دہلیز پار نہیں کی تھی کہ اس پر تو اپنا نام و نشان تلاش کرنے کی دھن سوار تھی۔ اسے تو شادی سے بچنا تھا اس لئے وہ آئیکت کی خدمات حاصل کر گئی تھی۔ آئیکت نے بھی نہیں سوچا تھا کہ جو اپنی کشتیاں جلا کر گھر کی دہلیز پار کر رہی ہے وہ کیوں نکاح کو راضی نہیں ہو رہی۔ وہ کیونکہ ایسا چاہتی ہی نہیں تھی۔ آئیکت سے شادی کا مطلب تھا تمام عمر سر جھکا کر، اپنی انا کو ذبح کر کے رہنا اور وہ یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ آئیکت کی فیملی نے اسے دھتکار دیا تھا اور وہ یہ چاہتی تھی کہ آئیکت کی فیملی ذہن و دل کی آمادگی کے ساتھ اسے قبول کرے، اسی لئے وہ نکاح کو راضی نہ ہوئی تھی۔ مطلب گھر سے نکلتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں کہیں نہ تھا کہ وہ آئیکت سے شادی کرے گی۔ وہ

آئیکت سے محبت تو کرتی ہی نہیں تھی۔ وہ آئیکت کو اپنا دوست، اپنا ہمدرد جانتی تھی اور آج آئیکت نے اس سے اس کا دوست چھین لیا تھا۔ جو بات آئیکت برسوں میں جان نہیں پایا تھا، مہینوں میں آبدار کا ساتھ نبھانے میں جان نہیں پایا تھا۔ وہ بات شاہ زیب چند گھنٹوں کی گفتگو میں جان گیا تھا۔ وہ شاہ زیب کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنا آپ نہایت احمق لگ رہا تھا۔ شاہ زیب اس سے آگے بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ سب جو اس نے آبدار سے گفتگو کے دوران اندازہ لگایا تھا۔

''تم اگر آبدار پر اپنی ناراضگی عیاں نہ کرتے تو وہ تم سے ہی رابطہ کرتی مگر اب وہ احمق لڑکی جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اس کے باپ نے کم ذلیل کیا تھا ناں ہمیں، جو بقیہ ذلالت یہ ہمارا نصیب بنا کر رہے گی۔'' شاہ زیب لب بھینچ گیا تھا۔ آئیکت آگے سے کچھ نہیں بولا تھا کہ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ آئیکت یہ بات بھی مان رہا تھا کہ شاہ زیب کا یہ اندازہ ہی تو ہے جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی باتوں میں اس قدر حقیقت چھپی تھی کہ وہ جھٹلا بھی تو نہیں پا رہا تھا۔ بات تو کہیں نہ کہیں درست ہی تھی کہ آبدار اس سے کچھ کہنا بھی تو چاہتی تھی مگر اس نے موقع ہی نہیں دیا تھا اور اب سوچ رہا تھا کہ وہ سن لیتا تو شاید وہ یہی بتاتی کہ وہ وہاں رہنے کے ارادے سے نہیں جا رہی، کسی اور ارادے سے جا رہی ہے۔ وہ یقیناً اسے آگاہ کرتی مگر اس نے آبدار کو کچھ بھی شیئر کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا اور جس طرح اسے سنائی تھیں تو ایسے میں شاہ زیب کا شک ہی درست تھا کہ جب اس کے واحد غمگسار نے آنکھیں پھیر لی تھیں تو وہ کس منہ سے، کس حق سے اس کی مدد طلب کرتی۔ اس کے اندر پچھتاوے سر اٹھا رہے تھے۔ اس سے ڈرائیونگ کرنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔

''تم مجھے غلط نہ سمجھو آئیکت کہ میرے الفاظ سخت، لہجہ تلخ ضرور ہے مگر میں بول تمہاری ہمدردی میں رہا ہوں کہ میں خود پچھتاوؤں سے گزر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ جس انسان سے امیدیں وابستہ ہوں وہ شخص امیدوں کا پیالہ ٹھوکروں پر رکھ دے تو انسان کیسے جان کنی کے سخت مرحلے سے گزرنے لگتا ہے۔'' شاہ زیب یکدم بے حد اداس نظر آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے عریم کا روشن چہرہ تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے تاریک ہو گیا تھا اور اس کا جملہ کانوں میں گونجا تھا۔

''شاہ زیب، آپ سے بہت امیدیں وابستہ تھیں میری، جو آپ نے توڑ ڈالی ہیں مگر صرف میری امیدیں نہیں میرا یقین، میرا مان، میرا وجود بھی ٹوٹ گیا ہے۔'' عریم کی آواز کانوں میں کیا گونجی تھی اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاہ، بعض اوقات ہم انا کے جال میں پھنسے تو کبھی مجبوریوں کے گرداب میں الجھے ایسے قول و فعل سے گزر جاتے ہیں کہ ہمارے پیارے جن سے ہمیں شدید محبت ہوتی ہے، جن کی آنکھ میں ایک آنسو برداشت نہیں ہوتا، ہم انہیں تکلیف دے کر ان کی پوری زندگی آنسو بنا دیتے ہیں۔'' آئیکت نے نہایت دکھ سے کہا تھا اسے تو پہلے بھی آبدار سے روا رکھے اپنے رویے پر افسوس تھا جو اب گہرے ملال میں ڈھل گیا تھا۔ اس نے گاڑی روکی تھی وہ دونوں باہر نکل آئے تھے۔ چوکیدار ان پر خفا ہونے لگا تھا۔ وہ سمجھا تھا وہ اس لڑکی کو ڈھونڈنے آئے ہیں۔

''میں نے بتایا صاحب، وہ لڑکی یہاں نہیں ہے۔ وہ یہاں سے جا چکی ہے۔تم لوگ کیوں بار بار پریشان کرنے کو آ رہا ہے۔''
چوکیدار کے انداز میں غصہ تھا۔

''تم اپنی بکواس بند کرو اور اپنے صاحب کو جا کر بولو کہ شاہ زیب اور کزئی ان سے ملنا چاہتا ہے۔'' چوکیدار جوان کو دیکھتے ہی شروع ہو گیا تھا شاہ زیب کو نہایت ناگوار گزرا تھا۔ وہ نہایت طیش میں آ کر چوکیدار کو خونخوار نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا تھا۔

''صاحب گھر پر نہیں ہے۔'' چوکیدار دھیمے لہجے میں بولا تھا۔شاہ زیب جو بہت غصہ میں تھا وہ اسے ایک تھپڑ مار گیا تھا۔

''بکواس کرتے ہو مجھ سے۔ مجھے شاہ زیب اور کزئی کو بیوقوف بنا رہے ہو'' وہ غصہ سے بے قابو ہوتا ایک اور تھپڑ لگا گیا تھا۔تیسرا تھپڑ مار پاتا کہ آئیکت نے اس کا بازو تھام لیا تھا۔

''پاگل ہو گئے ہو۔اپنا غصہ اس بے چارے پر کیوں نکال رہے ہو'' آئیکت کو اس بدنظمی پر سخت بے چینی ہوئی تھی۔ وہ شاہ زیب کے مقابلے میں کافی ٹھنڈا مزاج رکھتا تھا۔اسے یوں بات بے بات غصہ کرنا، ہاتھا پائی کرنا کبھی بھی مرغوب نہیں رہا تھا جبکہ شاہ زیب کی یہ بچپن کی عادت تھی جہاں اس کے مزاج کے خلاف بات ہوتی تھی وہ غصہ سے پاگل ہو جاتا تھا۔ مارنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔اس کے اسکول سے بھی کمپلین آیا کرتی تھی مگر اس کو جہانزیب اور کزئی نے بہت سمجھایا تھا۔ وہ خود پر کنٹرول بھی کرنے لگا تھا مگر فطرت بدل نہیں سکتا تھا اس لئے اکثر کنٹرول لوز کر دیتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔آبدار یہیں ہے اور اس نے بکواس کر دی کہ وہ جا چکی ہے۔اور اب کہتا ہے محمود خان گھر پر نہیں ہے۔محمود خان گھر پر نہیں ہے تو ہاسپٹل سے کیا اس کا باپ گھر آیا ہے۔'' وہ آئیکت کے قابو کرنے پر بھی چوکیدار کو ایک تھپڑ اور کھینچ کر لگا گیا تھا۔ وہ بے چارہ نوکر تھا برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

''صاحب۔ جھوٹ بولنا میری نہ عادت ہے نہ میری فطرت کا حصّہ۔ وہ لڑکی یہاں سے جا چکی ہے اور صاحب گھر پر نہیں ہے۔ ہاسپٹل سے بیگم صاحبہ اور چھوٹی بی بی ہی واپس آئی ہیں۔'' وہ اہانت سے سلگتے ہوئے بولا تھا۔آئیکت کو افسوس ہونے لگا تھا اس نے تاسف سے شاہ زیب کو دیکھا تھا جس نے کہیں کا غصہ اس بے چارے پر نکال دیا تھا۔شاہ زیب کا شرمندہ ہونے کا فی الحال بالکل بھی موڈ نہ تھا۔ اس نے آئیکت کی بات نظر انداز کر دی تھی۔ چوکیدار کی بات سنی تھی اور دھیمے سے کہا تھا کہ وہ اپنی مالکن کو اس کے آنے کا بتا دے۔اس نے بڑی سعادت مندی سے انٹرکام پر اطلاع پہنچا دی تھی اور اندر سے ملنے والے مثبت جواب کی روشنی میں دروازہ ان کے لئے کھول دیا تھا۔ وہ دونوں اندر کی طرف بڑھتے یہ سوچ رہے تھے کہ محمود خان کیوں ان ماں بیٹی کے ساتھ گھر نہیں آیا تھا؟ عریم کے ڈسچارج ہونے کے بعد وہاں رکنے کا کیا جواز تھا؟ اگر وہ وہیں تھا تو وہ دونوں بھی تو وہیں سے آ رہے تھے ان کی محمود خان سے ملاقات کیوں نہیں ہوئی تھی؟ مگر شاہ زیب اپنی اگلی سوچ پر مطمئن ہو گیا تھا کہ انہوں نے محمود خان کی تلاش کب کی تھی؟ وہ تو ریسپشن تک گئے تھے اور یہ معلوم چلنے پر کہ عریم کا

ڈسچارج ہو گیا ہے۔ وہ دونوں الٹے پیر وہاں سے نکل آئے تھے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہاں نتاشہ چلی آئی تھیں۔ شاہ زیب نے انہیں دیکھتے ہی آبدار کا پوچھا تھا۔

''میں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ لڑکی کچھ دیر بعد ہی چلی گئی تھی۔'' نتاشہ دھیمے سے بولی تھیں۔

''آبدار نہ یہاں ہے، نہ گھر پہنچی ہے۔ اس لئے ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ آپ جو جانتی ہیں وہ بتا دیں۔'' آئیکت کی بات انہیں پریشان کر گئی تھی۔

''جو بات تھی وہ میں بتا چکی ہوں۔'' نتاشہ کہنے لگی تھیں کہ شاہ زیب نے محمود خان کا پوچھ لیا تھا۔

''میری بہن کے بیٹے فارس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس لئے محمود ہاسپٹل میں ان کے ساتھ ہیں۔'' نتاشہ دھیمے لہجہ میں تفصیل سے آگاہ کر گئی تھیں۔ ابسام حیدر کی گاڑی سے جس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ نتاشہ محمود کا سگا بھانجا فارس نقوی تھا۔ وہی فارس نقوی جسے عریم سے بے تحاشہ محبت تھی۔ جو عریم کا منگیتر تھا۔ نام سن کر شاہ زیب نے لب بھینچ لئے تھے کہ اس نے فارس کا نام عریم کے منہ سے بہت بار سنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عریم کی منگنی فارس سے ہوئی تھی۔ اس نے عریم کو ایک بار فارس کے ساتھ دیکھا بھی تھا۔ وہ داماد کی کیفیت سے انجان تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھیں۔ جس وقت ڈاکٹرز نے کہا کہ عریم کو ڈسچارج کیا جا رہا ہے وہ پرائیویٹ روم میں واپس آئی تھیں اور سامان لے کر نکلتے ہوئے ان کی نظر اسٹریچر پر پڑی تھی اور اس پر لیٹے شخص کو دیکھ کر ان کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی تھی۔ وہ سامان ہاتھ سے چھوڑتیں لپکی تھیں۔

''فارس۔'' وارڈ بوائے رک گئے تھے۔ اسٹریچر کے پیچھے پیچھے چلتے حیدر صاحب بری طرح چونکے تھے۔ فارس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ اسے آئی سی یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کیا جا رہا تھا مگر اس وقت وہ بے ہوشی کی حالت میں تھا تب ہی اس نے اپنی خالہ کی موجودگی کو ان کی آواز کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اسی وقت حیدر صاحب ان کے سامنے آن ٹھہرے تھے کہ انہیں تو اس نوجوان کی فیملی کے بارے میں جاننا تھا۔ نتاشہ نے انہیں فارس سے اپنے رشتہ کا بتایا تھا۔ حیدر صاحب تمام واقعہ ان کے گوش گزار کرتے شرمندگی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ محمود خان بھی وہیں چلے آئے تھے جنہوں نے حیدر صاحب کو کافی سنائی تھیں اور وہ چپ رہے تھے کہ بہرحال ان کے بیٹے کی غلطی تھی۔ فارس تھا تو نتاشہ کا بھانجا مگر انہیں بے حد عزیز تھا۔ ایسے ہی انہوں نے بیٹی کی منگنی اس سے نہیں کی تھی۔ انہوں نے بیوی کو ہدایت کی تھی کہ عریم کو لے کر گھر چلی جائیں۔ وہ یہیں ہاسپٹل میں ہیں۔ نتاشہ نے بھی یہی مناسب سمجھا تھا کیونکہ فارس کا کوئی بھائی تو تھا نہیں۔ باپ بھی حیات نہ تھا۔ لے دے کر ایک ماں اور چار سال بڑی بہن نغمانہ تھی۔ جس کی شادی ہو چکی تھی۔ محمود خان نے بیوی کے جانے کے بعد سالی کو فون کیا تھا اور کچھ ہی دیر میں شائستہ نقوی ہاسپٹل پہنچ گئی تھیں۔ فارس نقوی کو جب ہوش آیا تھا تو اس نے بتایا تھا کہ اس کی گاڑی کچھ مسئلہ کر رہی تھی اور اسے ارجنٹ لی کہیں پہنچنا تھا اس لئے وہ اپنی بائیک پر گھر سے نکلا تھا اور دو موٹر سائیکل سوار اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ گن پوائنٹ پر اس کا موبائل، وائلٹ اور بائیک کی چابی تک چھین کر لے گئے تھے۔ وہ اس سب سے کچھ پریشان اور کچھ

خوفزدہ سا گلی سے نکل کر سڑک پر آیا تھا اور ابسام کی گاڑی سے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ ابسام بھی ہاسپٹل پہنچ گیا تھا۔ وہ شرمندہ تھا۔ معافی طلب کر رہا تھا۔ محمود خان بہت غصہ میں تھے اس پر کیس کرنے کو تیار تھے مگر شائستہ نقوی نے شائستگی سے معاملہ رفع دفع کر دیا تھا۔ محمود خان کو یہ بات پسند نہیں آئی تھی مگر وہ یہ کہہ کر بات ختم کر گئی تھیں کہ یہ بھلے مانس لوگ ہیں۔ اگر ابسام اسے زخمی حالت میں چھوڑ کر بھاگ جاتا تو وہ کیا کر لیتے جبکہ ان لوگوں نے کسی اپنے کی طرح ان کے بیٹے کا خیال رکھا ایسے میں پولیس کیس بنوانا اخلاقیات کے ضمرے میں ہرگز نہیں آئے گا۔ محمود خان اور شائستہ نقوی ہاسپٹل میں تھے۔ حیدر صاحب اور ابسام شرمندگی کا اظہار کرتے ہر طرح کی مدد کی آفر کرتے وہاں سے چلے گئے تھے۔ شائستہ نقوی نے اس بات پر رب کا شکر ادا کیا تھا کہ ان کے بیٹے کی جان سلامت تھی۔

نتاشہ محمود تفصیلات سے آگاہ کرتیں چُپ کر گئی تھیں اور ان دونوں کے پاس کچھ کہنے کا یا وہاں رکنے کا ہر جواز ہی ختم ہو گیا تھا۔

''میں خود حیران ہوئی کہ وہ لڑکی جب یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی تھی تو وہ یہاں آئی ہی کیوں تھی۔ صرف محمود کو آئینہ دکھانے جس میں محمود کی مکروہ شکل بہت واضح تھی۔'' وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ چائے یونہی رکھی تھی نتاشہ محمود نے اصرار کیا تھا کہ وہ لوگ چائے پیئیں مگر ان دونوں نے ہی چائے کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا اور ان دونوں کو جانے کو پر تولتے دیکھ کر گویا انہوں نے گفتگو کا پھر آغاز کرنا چاہا تھا۔ وہ شاہ زیب کی پریشانی محسوس کر رہی تھیں۔ وہ سمجھ سکتی تھیں کہ وہ آبدار کی غیر موجودگی کو لے کر کس قدر ڈسٹرب ہے لیکن ان کی بیٹی بھی تو بہت پریشان و مضطرب تھی۔ انہیں لگا تھا کہ وہ کسی بھی وجہ سے آیا ہے تو عریم کا ضرور پوچھے گا۔ اس سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کرے گا مگر وہ عریم کا ذکر تک لب پر لائے بنا وہاں سے جا رہا تھا۔ ایسے میں اگر وہ مضطرب ہوتیں یہ چاہ رہی تھیں کہ وہ عریم کا پوچھے۔ اس سے بات کرے تو یہ ان کی بے بسی کی انتہا تھی۔

''یہ یاد رکھیے گا مسز محمود کہ آپ کے شوہر کی مکروہ ترین شکل سے میں پہلے ہی واقف تھا۔ کچھ آگاہی آج ملی ہے۔ اور میں اپنے بچے کا قتل محمود خان کو مرتے دم تک معاف نہیں کروں گا۔'' وہ ان کی بات کو یکسر نظر انداز کر گیا تھا۔ یہ بات اس کے لئے بھی سوالیہ نشان کی مانند تھی کہ آبدار کو ٹھہرنا نہ تھا تو وہ یہاں آئی کیوں تھی اور چلی کہاں گئی تھی مگر وہ یہ نتاشہ محمود سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ جاتے جاتے ایک دھاکہ کرنا ضروری سمجھتے ہوئے ان کی سماعتوں میں زہر اتار گیا تھا۔

''یہ... یہ... تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔'' نتاشہ محمود بری طرح ہکلائی تھی۔

''سارے معنی و مطالب اپنے شوہر سے پوچھیئے گا۔ بس میری اتنی بات یاد رکھیے گا کہ اس سب میں آپ کا بھی ہاتھ ہوا تو آپ کا انجام بھی آپ کی سوچ سے زیادہ برا ہو گا۔'' شاہ زیب درشتگی سے کہتا باہر کی جانب بڑھا تھا اور وہ لپک کر اس کی راہ میں آ گئی تھیں۔

''ادھوری بات کر کے نہ جاؤ شاہ زیب۔ اس دل کو پہلے ہی روگ لگے ہیں۔ پورے دکھ نہیں سہارے جا رہے، آدھے ادھورے دکھ مار ڈالیں گے۔'' نتاشہ اس کے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کے زرد چہرے پر صدیوں کی ویرانی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسے اس عورت پر

بے تحاشہ رحم آیا تھا۔اسے یہ عورت اپنی پھپھو کا عکس لگی تھی۔شاہ زیب نظر چراتا دھیمے انداز میں اپنا شک کہہ گیا تھا۔

''محمود کو تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ وہ اپنی انا کے زعم میں کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔تمہارا یہ شک درست بھی ہوسکتا ہے شاہ زیب، مگر تم یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا میں نے تمام عمر جائز حلال قول وافعال میں بسر کی ہے۔ میرے لئے مجھ سے زیادہ اہمیت کوئی رکھتا ہے تو وہ میری بیٹی ہے۔اور میری بیٹی تم پر مرتی ہے۔تمہارے لئے وہ مجھے دھوکہ دیتی رہی ہے۔میری بیٹی کی تم خوشی ہو اور وہ بچہ میری بیٹی کی خوشی تھا اور محمود اتنے ظالم ہوسکتے ہیں کہ اپنی بیٹی سے اس کی خوشی چھین لیں۔ میں اس حد تک گزنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ مجھے گر ذرا بھی شک ہوتا کہ محمود ایسا بھی کرسکتے ہیں تو میں انہیں ایسا کرنے نہ دیتی'' نتاشہ زاروقطار رو رہی تھیں۔ جانے اپنی قسمت پر یا بیٹی کی قسمت پر۔آئیکت کچھ دیر قبل وہاں سے جاچکا تھا۔شاہ زیب سے بھی وہاں ٹھہرنا دشوار ہوگیا تھا۔اس کا دل کیا تھا کہ وہ اس بلکتی ہوئی عورت کو دوحرف تسلی کے بول دے لیکن وہ چاہ کر بھی ایسا کرہی نہیں پایا تھا۔اس نے جانے کے لئے قدم بڑھائے تھے۔ ڈرائنگ روم میں نتاشہ محمود کی سسکیوں کی گونج تھی کہ یکدم اس گونج میں ایک نحیف سی آنسوؤں میں ڈوبی آواز پھیل گئی تھی۔

''شاہ'' اور وہ پتھر کا ہوگیا تھا۔نہ جانا بس میں، نہ ہی مڑ کر دیکھنا اختیار میں... اور وہ چلتی ہوئی اس کے عین سامنے آن ٹھہری تھی۔ عریم کو ملازمہ کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ صاحب سے ملنے کوئی شاہ زیب اور کزئی آئے ہیں اور جس کا بستر سے اٹھنا محال تھا وہ اس کا نام سن کر وہاں تک چلی آئی تھی اور اس کی شکل دیکھ کر شاہ زیب کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔ زرد چہرہ، آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے، بکھرے بال۔ وہ عریم تو لگی ہی نہ تھی۔عریم کی حالت سے واقف نتاشہ اسے وہاں دیکھ کر رونا ہی بھول گئی تھیں۔ان کا دل چاہا تھا کہ وہ اسے ڈانٹیں کہ وہ کیوں بستر چھوڑ کر یہاں آئی۔ مگر وہ شاہ زیب کے عین سامنے جارکی تھی اور وہ کچھ سوچ کر اپنے آنسو صاف کرتیں وہاں سے نکل گئی تھیں۔کمرے میں گہری خاموشی ٹھہر گئی تھی۔ رگوں کو چیرتی خاموشی۔شاہ زیب لب بھینچے کھڑا تھا اور وہ کچھ کہہ نہ پانے کی الجھن سے الجھتی، خاموشی کو توڑ نہ پانے کے عذاب کو جھیلتی، بن کہے بڑی خوبصورتی سے خاموشی کا سینہ چاک کرگئی تھی۔ وہ ساکت کھڑے شاہ زیب کے سینے سے لگتی بری طرح بلک رہی تھی۔ اسے عریم سے ایسے کسی قدم کی توقع نہ تھی۔ان کے گزشتہ تقریباً سال سے زیادہ کے ساتھ میں یہ پہلی دفعہ تھا کہ عریم کی جانب سے پیش رفت ہوئی تھی۔ وہ اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی جو وہ کہہ نہیں پائی تھی۔ وہ اس کا فعل کہہ رہا تھا۔ وہ خاموشی کی زبان میں اس سے محوِ گفتگو تھی۔اس کی خاموشیاں طویل تھیں اور اس کے آنسو اس کی آواز بن گئے تھے۔آج خود اپنی رضا سے وہ شاہ زیب کے گلے لگی تھی جو لڑکی اس کی زندگی تھی اور وہ اس لڑکی کو دھتکار نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی پشت پر بازو پھیلا گیا تھا۔لب اس کے سر کو چوم گئے تھے۔ وہ اس کی بے اختیاری پر خود بھی بے اختیار ہو چلا تھا کہ محبت کا جواب وہ نفرت سے نہیں دے پایا تھا۔ وہ بھی اس لڑکی کو جو سینے میں دل بن کر دھڑکتی تھی، جسے محبت کے باوجود وہ بے حد اذیتیں دے رہا تھا مگر اس وقت ان دونوں کا دکھ سانجھا تھا اور وہ اس کے دکھ کو محسوس کرتا اس کو اپنے ساتھ کا خاموشی کی زبان میں یقین سونپ گیا تھا۔

خاموشیاں آواز ہیں
تم سننے تو آؤ کبھی
چھو کر تمہیں کھل جائیں گی
گھر ان کو بلاؤ کبھی
بے قرار ہے بات کرنے کو
کہنے دو ان کو ذرا
خاموشیاں، تیری میری، خاموشیاں
خاموشیاں، لپٹی ہوئیں، خاموشیاں
کیا اس گلی میں کبھی تیرا جانا ہوا
جہاں سے زمانے کو گزرے زمانہ ہوا
میرا سمے تو وہیں پہ ہے ٹھہرا ہوا
بتاؤں تمہیں کیا، میرے ساتھ کیا کیا ہوا
خاموشیاں ایک ساز ہیں
تم دھن کوئی لاؤ ذرا
خاموشیاں الفاظ ہیں
کبھی آ گنگنا لے ذرا
بے قرار ہے بات کرنے کو
کہنے دو ان کو ذرا

☆......☆......☆

''پاپا، آئی ایم سوری، میری لاپرواہی کی وجہ سے آپ سب کتنے پریشان ہوئے۔'' حیدر صاحب نے بیٹے کو دیکھا تھا وہ کسی قدر شرمندہ تھا۔

''یہ سب بھی زندگی کا حصہ ہے ابسام، تم پریشان نہ ہو، اللہ نے اس نوجوان کی زندگی کو سلامت رکھا۔ بس یہ اطمینان بخش بات ہے۔'' حیدر صاحب نرمی وسکون سے بولے تھے۔ وہ دونوں جس وقت گھر پہنچے وہ سب ان کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ حیدر صاحب کے یہ

بتانے پر کہ اس نوجوان کی والدہ نے پولیس کیس بنانے کے بجائے ابسام کو معاف کر دیا ہے وہ سب ہی بے حد مطمئن ہو گئے تھے کہ سب پر ہی ایک تلوار سی لٹک رہی تھی۔ فضہ حیدر کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ ابسام ندامت میں گھرتا ماں سے معافی مانگنے لگا تھا۔

''میں کتنا ڈر گئی تھی۔ یہ خیال ہی سوہان روح تھا کہ اگر اس نوجوان کو کچھ ہو گیا تو تمہیں سزا ہو جائے گی۔'' فضہ حیدر بیٹے کے کندھے سے لگیں بری طرح سسک رہی تھیں۔

''اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ ابسام نے جان کر یہ نہیں کیا تھا اور جو ہو گیا تھا اس پر شرمندہ تھا۔ اللہ نے کرم کر دیا ہے۔ تم پریشان نہ ہو اب۔ تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' مسز شکیل جو خود پریشان تھیں معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جانے پر اطمینان محسوس کرتیں اب نند کی دلجوئی کر رہی تھیں۔ ابسام اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ یہ سب اس نے کہاں سوچا تھا۔ اس کا کہاں اندازہ تھا کہ وہ آبدار کے خیال میں یوں ڈوبے گا کہ ایکسیڈنٹ کر بیٹھے گا۔ وہ لڑکی جو مختصر عرصہ ہی اس کے گھر رہی تھی اس کی آنکھوں میں محبت کی حسین تتلیاں اس نے کس قدر صاف محسوس کی تھیں۔ اس کا لب سے اظہار محبت کرنا، سب ایک خواب کی مانند تھا اور وہ آبدار کو شجر ممنوعہ گردانتے ہوئے اس کی محبت سے صاف منکر ہو گیا تھا۔ وہ آنکھوں میں ہزار شکوے لئے منظر سے غائب ہو گئی تھی اور جب سے غائب ہوئی تھی ہر جگہ بس وہی تھی۔ وہ آبدار کو سوچ رہا تھا۔ اس کی سوچ آبدار تک سفر کر رہی تھی کہ دروازہ پر دستک ہوئی تھی۔ اس نے خود کو سنبھال کر دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دی تھی اور نوائم کو دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ وہ اس کے لئے چائے لے کر آئی تھی۔

''نوائم۔ تم نے کیوں زحمت کی بوا کو کہہ دیتیں۔'' وہ دھیمے سے بولا تھا اور وہ مسکرا دی تھی۔

''زحمت والی تو کوئی بات نہیں ہے۔ پھپھو نے کہا تو میں لے آئی۔'' وہ ٹرے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی تھی اور وہ مگ اٹھاتے ہوئے اسے دیکھنے لگا تھا۔ وہ کافی خوش شکل و دراز قامت لڑکی تھی۔ جب وہ سب پاکستان آئے تھے تو اسے بے حد اچھا لگا تھا نوائم کی آمد پر۔ مگر اب جیسے سب کچھ بدل رہا تھا۔

''میں پتہ نہیں، نوائم کے ساتھ انصاف کر بھی پاؤں گا کہ نہیں۔ جس محبت و توجہ کی یہ حقدار ہو گی، وہ حق اسے دے پاؤں گا بھی کہ نہیں۔'' ابسام نے اذیت سے سوچا تھا اور وہ اس کے چہرے پر سوچ کے جال کو بنتا محسوس کرتی دھیمے سے بول گئی تھی۔

''آپ پریشان نہ ہوں ابسام، ہر کام میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔'' وہ نوائم کی آواز پر چونک اٹھا تھا وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ خود کو کمپوز کر گیا تھا۔

''شکریہ نوائم، تم سب اس بھری مشکل کی گھڑی میں ہمارے خاص ماما کے ساتھ نہ ہوتے ہوئے تو ماما نے جانے کیا کر لینا تھا۔'' ابسام آزردگی میں گھرا مشکور نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ فضہ حیدر کو ان سب نے مل کر سنبھال لیا تھا ورنہ تو انہوں نے جانے کیا کرنا تھا۔

''اپنے ہی تو وقت پر کام آتے ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے سے میلوں کے فاصلے پر ہیں، تب ہی ہمیشہ مشکل گھڑی میں بروقت کوئی

مدد کرنے سے ہمیشہ قاصر رہے مگر اس وقت آپ کے ساتھ ہونا، آپ کا سہارا بننا ہم سب کے لئے ہی خوشی کی بات ہے۔'' نوائم اپنے ازلی نرم لہجہ میں بولی تھی۔ ابسام مسکرا دیا تھا۔ اس کی ماما کو ہمیشہ ہی تو گلہ رہتا تھا کہ وہ سکھ و دکھ کی ہر گھڑی میں اکیلے پڑ جاتی ہیں۔ ان کا میکہ سات سمندر پار ہے مگر اب وہ خوش تھیں اور اپنے دکھ کو اپنوں کے ساتھ میں کم ہوتا محسوس کر رہی تھیں۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' وہ سوالیہ نگاہوں سے نوائم کو دیکھنے لگا تھا اور اس نے شاپنگ پر جانے کا کہہ دیا تھا کیونکہ اسے اور مومل کو فضہ حیدر اور حید رصاحب کے لئے گفٹ لینا تھا اور فضہ حیدر کے ساتھ جا کر سر پرائز ختم ہو جاتا اس لئے مومل اور اس نے ابسام کے ساتھ جانے کا سوچا تھا۔ ایک دم مشکل ایسے آئی کہ سب پلان دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ ایک دن چھوڑ کر اگلے دن ویڈنگ اینورسری تھی۔ ابسام نے کل انہیں ساتھ لے جانے کی حامی بھر لی تھی اور نوائم سے کہہ دیا تھا کہ وہ اور مومل کل پانچ بجے تک تیار رہے۔ وہ آفس سے آ کر انہیں لے جائے گا۔ نوائم اس کے کمرے سے نکل آئی تھی۔ ابسام سے بات تو وہ پہلے بھی کرتی تھی مگر آج بات کر کے وہ بہت خوش تھی۔ ابسام سے محبت کیا ہوئی تھی اس سے بات کرنا بھی بے حد اچھا لگنے لگا تھا اور وہ نوائم کے تبدیلی کا شکار محسوسات سے انجان اپنی ہی الجھنوں میں الجھا تھا۔ آبدار کا خیال ذہن و دل کی سرزمیں پر سر اٹھا رہا تھا اور وہ جانے انجانے اس لڑکی کو سوچ رہا تھا جس سے اس کی شادی ممکن نہیں یہ بات وہ اچھے سے جانتا تھا۔

☆......☆......☆

''شاہ۔ آپ اتنے ظالم کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کے سہارے کی ضرورت ہے اور آپ مجھے دو حرف تسلی کے کہے بنا ہاسپٹل سے چلے گئے۔'' اس کے رونے میں شدت آنے لگی تھی۔ شاہ زیب نے اس کے گھنیرے بالوں والے سر پر شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر لب رکھے تھے اور اسے خود سے الگ کر دیا تھا۔ اسے اپنے قدم پر کسی قسم کی شرمندگی نہ تھی۔ نہ وہ اپنے جذباتی قدم پر ذرا برابر خائف ہوئی تھی۔ اس کے رونے میں شدت آئی تھی اور وہ جو کچھ خاموشی کی زبان میں کہنے سے قاصر رہی تھی اس کے لب وہ شکوے کہتے چلے گئے تھے۔ شاہ زیب کی نظر بہت روتی ہوئی عریم کے متورم زرد چہرے کا طواف کر رہی تھی۔

''کچھ درد ایسے ہوتے ہیں عریم، جن کا مداوا لفظ نہیں کر سکتے۔'' شاہ زیب شکستگی سی اپنے اندر اترتی محسوس کر رہا تھا۔

''مداوے کی کوئی تو صورت ہوتی ہو گی شاہ۔'' عریم بلکی تھی اس نے لب و مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

''اولاد کھوئی ہے ہم نے عریم۔ اور اس درد کا مداوا ممکن نہیں ہے۔ یہ درد ایسا ہے جو آخری سانس تک بے چین رکھے گا۔'' شاہ زیب کی آنکھوں میں قطرہ قطرہ لہو جمع ہونے لگا تھا۔

''یہ کیوں ہو گیا شاہ۔ مجھے اپنا وجود بے حد خالی خالی لگ رہا ہے۔'' اس کے سسکنے میں شدت یوں آئی کہ شاہ زیب کی بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

''اس سب کے کہیں نہ کہیں آپ ذمہ دار ہیں شاہ۔ آپ کا انتقام ہمارے بچے کو ہم سے چھین لے گیا۔'' وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ قطرہ قطرہ آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رخسار بھگوتے جا رہے تھے۔

''تم اس سب کا ذمہ دار مجھے ٹھہرا رہی ہو عریم، کہنے تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ تم میری امانت کی حفاظت نہ کر سکیں۔'' شاہ زیب کے انداز میں غراہٹ تھی وہ رونا بھول کر شاہ زیب کو دیکھنے لگی تھی۔ کچھ دیر قبل تک اس کے چہرے پر نرمی تھی۔ آنکھوں میں دکھ تھا اور اب اس کے چہرے پر نفرت، آنکھوں میں غصہ کی لالی رنگ پکڑ رہی تھی۔

''ہمارا بچہ میرے انتقام کی نہیں تمہارے اس خبیث باپ کی فرعونیت کی نذر ہوا ہے۔ جو اپنے کسی عمل پر شرمندہ نہیں ہے بلکہ اس کے اندر کا شیطان آج بھی یوں طاقتور ہے کہ اس نے اپنی ہی بیٹی کی گود اجاڑ ڈالی۔'' شاہ زیب فاصلہ کو ختم کرتا گھٹنوں کے بل زمین پر عین عریم کے سامنے آن بیٹھا تھا اور اس کی نمناک آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دکھ و غصہ کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ بولتا چلا گیا تھا۔

''کہہ دیں شاہ، یہ جھوٹ ہے، پاپا میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ اس کا بازو دبوچ کر ٹھہر جانے والے آنسوؤں بھری نگاہ میں بے بسی و مزاحمت لئے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کاش۔ یہ جھوٹ ہوتا عریم مگر یہ تلخ سچائی ہے۔ تمہارے باپ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تمہارا ابارشن کروا دیا ہے۔ یہ تمہارے باپ کی سوچی سمجھی سازش ہے جسے ڈاکٹرز نے مس کیرج کا نام دے دیا ہے۔'' شاہ زیب کی آواز میں درد تھا یا غصہ سمجھ نہیں آ رہا تھا اور وہ اپنا ہاتھ کھینچ گئی تھی۔ بمشکل اٹھی تھی۔

''میں نے تم سے شادی تمہارے باپ کو اس کے گناہ کا احساس دلانے کے لئے کی۔ میں غصہ و انتقام میں بھی اتنا اندھا نہ ہوا کہ جس شخص نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اس کی بیٹی کو بے آبرو کرتا۔ میں نے غصہ پر عقل کو حاوی نہ ہونے دیا۔ نکاح کیا تم سے۔'' شاہ زیب اس کے سپید پڑتے چہرے کو دیکھ کر بول رہا تھا اور وہ شاید سن کر بھی سن نہیں رہی تھی۔

''ہم نے ایک ناجائز بچے کو بھی زندگی سے محروم نہ کیا۔ چاہتے تو کیا ہم لوگ ابارشن نہیں کروا سکتے تھے مگر ہمارے اندر خوفِ خدا موجود تھا۔ ہم نے محمود خان کے گناہ کو زندگی دی اور اس نے میری جائز اولاد کی زندگی چھین لی۔ ہم مجبور ہو کر بھی اللہ کے احکام کے خلاف نہ جا سکے اور اس نے اللہ کے ہر احکام کو بھلا ڈالا اور میں اس کے لئے تمہارے باپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا عریم، وہ میرے بچے کا قاتل ہے اور میں اسے اس کی سزا دوں گا۔'' اسے لگا تھا کہ عریم اس کی بات سمجھ نہیں رہی، وہ اس تک پہنچا تھا اور جو بات کہہ رہا تھا وہ درمیان میں روک کر اسے بازوؤں سے تھام کر سخت انداز میں اپنے عزائم کہہ گیا تھا۔

''آپ مجھے اپنے ہر قدم میں ساتھ پائیں گے۔'' اس کی آواز بہت مدھم تھی۔ شاہ زیب بمشکل ہی سن پایا تھا۔

''میں آپ کے ساتھ ہوں شاہ۔ میں اپنے بچے کا قتل معاف نہیں کروں گی۔'' وہ اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بازو چھوڑ کر عریم کو خود

سے لگا لیا تھا۔ کمرے میں عریم کی سسکیاں گونجنے لگی تھیں۔

''مجھے ابھی اسی وقت یہاں سے لے جائیں۔ میں اپنے بچے کے قاتل کے گھر میں ایک لمحہ مزید نہیں گزارنا چاہتی۔'' وہ شاہ زیب کے کاندھے سے لگی بہت روتے ہوئے بولی تھی۔ وہ کچھ کہتا کہ وہ اس سے الگ ہوئی تھی۔

''آپ ٹھہریں میں ماما کو جانے کا بتا کر آتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے آگے بڑھی تھی۔

''دکھی میں بھی ہوں، غصہ مجھے بھی ہے مگر فی الحال میں کچھ بھی کرنے سے قاصر ہوں'' وہ عریم کو جانے سے روکنے کے لئے بازو تھام گیا تھا اور دھیمے سے بولا تھا۔

''مجھے آپ سے بے حد گلے ہیں شاہ۔ میں آپ سے ناراض ہوں۔ آپ کے عمل سے مجھے شدید تکلیف پہنچی ہے مگر اس وقت ہمارا دکھ سانجھا ہے۔ میں آپ کے گزشتہ کسی عمل کو زیر بحث نہیں لانا چاہتی۔ اس وقت میں صرف یہ جانتی ہوں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا میرے باپ کی وجہ سے ہوا، اپنے باپ کا مکروہ چہرہ دیکھ لینے کے باوجود میں نے ان سے ایک لفظ نہیں کہا مگر اب وہ حد سے بڑھ گئے ہیں۔ انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ مجھ سے میری اولاد کو جدا کر دیں۔'' وہ بول رہی تھی اسی وقت کمرے میں قدموں کی چاپ ابھری تھی۔ آنے والے کوئی اور نہیں محمود خان تھے۔

''آپ اتنا کیسے گر سکتے ہیں پاپا'' وہ باپ کو دیکھتے ہی ان کی طرف بڑھی تھی وہ بالکل بھی بیٹی کی بات کا مطلب نہیں سمجھے اور وہ روتے ہوئے جو کچھ شاہ زیب کے ذریعے علم میں آیا تھا کہتی چلی گئی تھی۔ محمود خان کا چہرہ ذلت کے احساس سے سرخ ہو گیا تھا۔ نتاشہ محمود جو بیٹی و داماد کو بات کرنے کا موقع فراہم کرتیں وہاں سے چلی گئی تھیں ملازمہ کے ذریعے محمود خان کی واپسی کا علم ہوا تھا اس لئے وہ واپس چلی آئی تھیں۔ شاہ زیب سائیڈ پر کھڑا تھا اور عریم باپ کے سامنے کھڑی انہیں ان کا مکروہ چہرہ دکھا رہی تھی۔

''عریم بیٹا۔ تم میری بات سنو۔ یہ شاہ زیب مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ میں نے تمہارے بچے کی جان نہیں لی ہے۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔'' محمود خان لہجہ میں دنیا بھر کی بے چارگی سمو کر بولے تھے۔ شاہ زیب بے حد چونکنے والے انداز میں محمود خان کو دیکھنے لگا تھا اس کے چہرے پر اضطراب تھا اسے اس شخص سے گھن آئی تھی جو کتنا بڑا اداکار تھا۔ اپنے چہرے پر کس خوبصورتی سے نقاب چڑھائے ہوئے تھا۔ اس کی کمال کی اداکاری دیکھ کر شاہ زیب کو لگا تھا کہ عریم اس کی باتوں میں آ جائے گی۔ اس خیال نے ہی شاہ زیب کو بے چین کر ڈالا تھا۔

''میں نے ہمیشہ آپ کے ہر لفظ پر اعتبار کیا ہے پاپا۔ آپ میرا فخر، میرا مان تھے۔ مجھے ہر بیٹی کی طرح سب سے زیادہ آپ سے محبت تھی۔'' وہ کہنا شروع ہوئی تھی۔ محمود خان نے لب بھینچ لئے تھے۔

''میرا مان ٹوٹ گیا اس دن جب مجھے پتہ لگا کہ میرا باپ زانی ہے۔'' محمود خان اتنے دن سے کئی پیشیاں بھگت چکے تھے۔ کئی لوگوں

کے سامنے جواب دہ ہونا پڑا تھا۔شاہ زیب اور کرزئی اور اس کی فیملی کے سامنے اس وقت سر نہیں جھکایا تھا جب گناہ کے مرتکب ہوئے تھے مگر شاہ زیب نے جب کہا تھا کہ وہ نکاح سے مکر جائے گا تو وہ اور کرزئی خاندان کے سامنے سر جھکا گئے تھے۔بیوی جس کو ہمیشہ کٹہرے میں کھڑا رکھا تھا، اپنی گندی ذہنیت، گندے کردار کی روشنی میں تمام عمر بیوی پر شک کرتے انہیں اس جرم کی سزا دیتے گزاری تھی جوان سے سرزد نہیں ہوا تھا مگر جب بات کھلی تھی تو وہ بیوی سے نظریں چرانے پر مجبور ہو گئے تھے۔وہ لڑکی آبدار جوان کے گناہ کا ثبوت تھی وہ کچھ یوں آئی تھی، اس قدر رسوا کر گئی تھی کہ وہ بیوی و بیٹی سے شرمندہ تھے مگر یہ شرمندگی جانے کیسی تھی کہ وہ پھر غلط کر گئے تھے مگر اب وہ بیٹی جو اتنے دن سے خاموش تھی۔اب اس کے منہ کو بھی زبان لگ گئی تھی اور جس شرمندگی کے زیر اثر اب تک وہ رہے تھے اب شرمندگی اس سے سوا تھی۔اپنے کارنامے کو بیٹی کے لب سے سن کر ان کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا تھا۔

''میں ایک زانی کی بیٹی ہوں میرے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے مگر میں پھر بھی زندہ رہی۔اپنے باپ کے عمل کی سزا جھیل رہی تھی مگر پھر بھی نہ صرف زندہ رہی، اپنے باپ سے نفرت نہیں کر پائی۔آپ سے مجھے یہ جان کر بھی کہ آپ زانی ہیں مجھے آپ سے نفرت نہیں ہوئی کیونکہ مجھے آپ سے بہت محبت تھی پاپا اور میری محبت کا یہ صلہ ہے کہ میں جو آپ کے عمل کی سزا جھیل رہی تھی، اتنا ہی کافی نہ تھا جو آپ نے مجھ سے میرا بچہ بھی چھین لیا۔میری گود اجاڑ دی۔'' وہ آنکھوں میں غصہ کی چنگاریاں لئے محمود خان کو دیکھ رہی تھی۔

''بات جب تک ایک بیٹی کی تھی میں آپ سے محبت کرنے پر مجبور تھی مگر اب بات میری مامتا کی ہے اور ایک بیٹی اپنے باپ کی مکروہ شکل سامنے آ جانے کے بعد بھی باپ سے محبت کرنے پر مجبور ہو سکتی ہے مگر ایک ماں، اس انسان کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ نہیں رکھ سکتی۔جو اس کے بچے کا قاتل ہو۔چاہے وہ انسان اس کا اپنا باپ ہی کیوں نہ ہو۔میں آپ کو آپ کے اس عمل کے لئے معاف کر سکتی ہوں جس سے ایک بیٹی کا سر جھک گیا... مگر میں آپ کو اس عمل کے لئے چاہ کر بھی معاف نہیں کر سکتی جس کے سبب میری خوشیاں مجھ سے روٹھ گئیں۔میری کوکھ اجڑ گئی، بیٹی معاف کر سکتی ہے پاپا مگر ایک ماں معاف نہیں کر سکتی محمود خان، یہ بات یاد رکھیے گا۔'' وہ رو نہیں رہی تھی مگر وہ رلا ضرور رہی تھی۔اس کے انداز میں اتنی نفرت تھی کہ محمود خان کا سینہ شق ہونے لگا تھا۔اب تک تو وہ شاید مگر مچھ کے آنسو بہاتے رہے تھے مگر اس وقت ان کا دل رو رہا تھا۔آنکھیں بہہ رہی تھیں۔عریم جانے کے لئے آگے بڑھی تھی۔

''اس گھر میں آج میرا آخری دن ہے۔میری ماں مر جائے گی تو اس کی شکل دیکھنے کو تو اس گھر کی دہلیز پار کروں گی مگر آپ مریں گے تو میرا یہ اپنے بچے سے وعدہ ہے کہ آپ کی شکل آخری بار دیکھنے کو بھی اس گھر کی دہلیز کو پار نہیں کروں گی۔میں آج اس گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔میرا ہر سکھ، ہر دکھ آپ لوگوں سے آج جدا ہوا۔مروں گی تو وصیت کر کے مروں گی کہ میری شکل میرے باپ کو نہ دکھائی جائے جو زانی ہے، جو میرے بچے کا قاتل ہے۔'' اس کو آگے بڑھتے دیکھ کر نتاشہ محمود اس کی راہ میں آئی تھیں اور وہ ماں کو دیکھ کر ذرا نرم پڑی تھی مگر اپنا فیصلہ نہایت درشتگی سے سنا گئی تھی۔

''آپ سے اچھا تو یہ انسان ہے جس نے انتقام کی راہ بھی باعزت بنیادوں پر قائم کی اور ایک آپ ہیں جو گناہ پر نادم ہوئے نہ ہی گناہ کے سامنے آنے پر شرمندہ ہوئے۔آپ نے چار عورتوں کی زندگی برباد کر دی، آبشار اور کرنزئی، آبدار محمود خان (عریم وہ پہلی ہستی تھی جس نے آبدار کے ساتھ محمود خان کا نام جوڑا تھا) نتاشہ محمود اور میں عریم محمود جسے آپ کی بیٹی ہونے پر ندامت ہے۔آج کے بعد میرے لب پر کبھی آپ کا نام نہیں آئے گا۔'' وہ تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے جا رہی تھی۔نتاشہ محمود نے اسے مزید کچھ کہنے سے روکنا چاہا تھا مگر وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔

''آبدار جس طرح ولدیت کے خانے میں چاہ کر بھی کبھی آپ کا نام نہیں لکھ سکتی۔ٹھیک ویسے ہی میں بھی اپنی ولدیت کے خانے سے چاہ کر بھی آپ کا نام مٹا نہیں سکتی مگر میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آج کے بعد میرا حوالہ میرا باپ نہیں میرا شوہر ہوگا۔میری ولدیت کے خانے میں آپ کا نام کسی عضو معطل کی طرح لکھا و پڑھا جائے گا۔میرا ہر تعلق آج یہاں ختم ہوا۔'' وہ ایک نظر محمود خان پر ڈالتی آنسو پونچھتے ہوئے شاہ زیب تک آئی تھی۔

''چلیں شاہ۔مجھے یہاں سے لے چلیں اور میرا آپ سے وعدہ ہے کہ آپ اپنی پھپھو کا بدلہ لینے کو مجھے پر سولی پر بھی لٹکا دیں گے تو میں اف نہیں کروں گی کہ محمود خان جیسے باپ کی بیٹیوں کے نصیب میں عزت نہیں ہوتی صرف انتقام ہوتا ہے اور اس انتقام کی آگ میں چاہے ان بیٹیوں کے دل کرب سے گزرے یا جسم قربانی دے۔لمحہ لمحہ آزمائش کی نذر ہو یا رشتوں سے دھتکار ملے، ہم جیسوں کا یہی نصیب ہوتا ہے اور میں اپنے نصیب کی آگ میں جلنے کو تیار ہوں۔'' وہ شاہ زیب کے سامنے رک کر بولی تھی وہ آگے سے کچھ نہیں بولا تھا۔اس نے جانے کو قدم بڑھائے تھے۔عریم اس کے پیچھے چل دی تھی۔نتاشہ محمود بیٹی کو روکنا چاہتی تھیں مگر ہمت نہ ہوئی تھی۔انہیں اس کی پیدائش کے دن سے ہی پتہ تھا کہ ایک دن اسے رخصت ہو جانا ہے۔وقت کے ساتھ انہوں نے اسے رخصت کرنے کے کتنے خواب سجائے تھے اور آج وہ یوں رخصت ہوئی تھی کہ سارے خواب بکھر گئے تھے۔ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں آنکھوں میں چبھنے لگی تھیں۔محمود خان اب تک بیٹی کے لفظوں اور اس کی ایک آخری نظر کے حصار میں تھے۔کیا تھا اس نظر میں کہ ان جیسا سخت انسان تڑپ گیا تھا۔ان کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور وہ آج صحیح معنوں میں صرف بیوی، بیٹی کی ہی نہیں اپنی نگاہوں سے بھی گر گئے تھے۔

''عر... عریم۔'' لب کپکپائے تھے۔مگر وہ وہاں سے جا چکی تھی اور وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ زمین بوس ہوتے چلے گئے تھے۔

مرے تن میں کہیں کچھ سڑ گیا ہے
بدن پر مکھیاں چپکی ہوئی ہیں
لہو سے چیونٹیاں چمٹی ہوئی ہیں
رگوں میں کچھ مکوڑے رینگتے ہیں

دھڑکتا دل بھی نیلا پڑ گیا ہے
ہزاروں سانپ، بچھو کاٹتے ہیں
لہو جو جم گیا ہے، چاٹتے ہیں
مرے پہلو سے گزرتے ہوئے لوگ
ناک پر ہاتھ رکھ کے چلتے ہیں
مجھ سے ایسی سڑاند اٹھتی ہے
مرے تن میں کہیں کچھ سڑ گیا ہے
تعفن سا بدن میں پھیلتا ہے
مری سانسوں میں بدبو بھر گئی ہے
مرے اندر محبت مر گئی ہے

وہ زمین پر گرے پڑے تھے۔ آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ سماعتوں میں چیخوں کی آوازیں سانس لے رہی تھیں۔ بصارت اندھی ہو چکی تھی۔ اندھیرے میں انہیں ریشمی ملائم جسم نظر آ رہا تھا۔ سفید چاندنی سا بدن، جو دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرے میں سیاہ ہوتا گیا، سسکیاں بڑھتی گئیں۔ سانس گھٹنے لگی تھی۔ ان کے منہ سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ وہ خود کو ایک دائرے میں مقید پا رہے تھے۔ وہ سفید چاندی سا چمکتا جسم، رات کی سیاہی اوڑھے اپنے پنجے تیز کئے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دو آبشار۔'' فضا میں چیخ بلند ہوئی تھی۔ نتاشہ محمود جو شوہر کی طرف دیکھے بنا وہاں سے جا رہی تھیں، ڈرائنگ روم کی دہلیز تک پہنچی تھیں۔ چیخ نما آواز پر ان کے قدم تھم گئے تھے۔ وہ پلٹی تھیں۔ محمود خان نیچے کارپٹ پر گرے ہوئے تھے۔ انکے قدم اس شخص کی مدد کو بڑھنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ دائرہ کے باہر ان کی نگاہ بے بس انداز میں چکرا رہی تھی۔ دائرے کے داہنی سرے پر کھڑی آبشار اور کرزئی کی سسکیاں اب قہقہوں میں بدل گئی تھیں۔ دائرے کے باہر ایک فرد کا اضافہ ہوا تھا۔ وہ ان کی اہلیہ نتاشہ تھیں جن کی آنکھوں میں سوائے نفرت کے کچھ نہ تھا۔ وہ بیوی کو مدد کے لئے پکارنا چاہتے تھے مگر ہمت نہیں ہوئی تھی۔ یکدم دیکھتے ہی دیکھتے دائرہ کے کنارے مختلف چہروں سے بھر گئے تھے۔ بیٹی عریم جو لعن طعن کر رہی تھی۔ آبدار جو کہنے کو ان کا ہی خون تھی وہ ماں آبشار سے ذرا فاصلے پر ٹھہری ماں کے ساتھ ساتھ ان کی بے بسی پر قہقہے لگا رہی تھی۔ انہیں لگا تھا آج روزِ محشر ہے اور وہ برزخ میں اتارے جا رہے ہیں۔ وہ ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ اپنے بچاؤ کی تدبیر کر رہے تھے مگر ان کا ہر ایک رشتہ ان سے دور ہوتا جا رہا تھا اور دماغ پر سیاہ دبیر چادر تن گئی تھی۔ دماغ تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔

انہیں اپنے چار سو رات محسوس ہو رہی تھی اور وجود برہنہ ہوتا لگ رہا تھا۔رات کی سیاہ تاریکی ان کے جسم کو چھپانے میں ناکام ہوتی جا رہی تھی۔لب پر فریاد مچل رہی تھی اور وقت جانے پیچھے چلا گیا تھا۔ٹھہر گیا تھا... یا آگے بڑھ گیا تھا بس انہیں آبشار کی سسکیاں، آہیں، قہقہے سنائی دے رہے تھے اور آگے تھی گہری سیاہ، چپ کی مار مارتی، خاموشی کی زبان میں بہت کچھ کہتی رات!

رات پھر حاملہ ہے!
مجھے پھر ڈر ہے، اندھیرے جنے گی
اندھیرے خواب کھا جاتے ہیں میرے
روز بستر پہ آ جاتے ہیں میرے
رات بھر خون چوستے ہیں مرا
میری آنکھوں میں کود جاتے ہیں
دیر تک چیختے، چلاتے ہیں!
نئی صبح نہیں ہونے دیں گے
مجھے اچھا نہیں ہونے دیں گے......!
سوچتا ہوں کہ میں خنجر لے کر
رات کی کوکھ پھاڑ دیتا ہوں
ورنہ یہ رات مجھے مارے گی
روشنی تیرگی سے ہارے گی......!
مگر بے کار کی مشقت ہے
رت جگوں کی تو مجھ کو عادت ہے
یہ تو ہر روز کا ہی معاملہ ہے
رات پھر حاملہ ہے!!

☆......☆......☆

''پاپا پھر آپ نے کیا سوچا ہے۔دوبارہ کال کریں گے یا خود جائیں گے۔'' وہ باپ بیٹے ڈنر کے بعد معمول کے مطابق لاؤنج میں بیٹھے تھے۔عبیر کافی بنا کر لایا تھا اور بات کا آغاز کیا تھا۔

''کال سے مجھے نہیں لگتا کہ ہمیں خاطر خواہ نتائج حاصل ہوں گے اس لئے اور کزنی ہاؤس جا کر ہی حالات و واقعات کی اصل تصویر سامنے آئے گی۔'' کبیر عباسی کا انداز پرسوچ تھا۔

''مجھے بھی یہی لگتا ہے اور میں سمجھتا ہوں، وہاں آپ کا جانا مناسب نہیں ہوگا۔'' عبیر نے باپ کی حمایت میں بات آگے بڑھائی تھی۔

''یہی بات تو میرے وہاں جانے کی راہ میں رکاوٹ ہے عبیر، ورنہ جب سے یہ لگا ہے پتہ کہ آبشار کی شادی نہیں ہوئی، وہ مشکلات سے دو چار رہی ہے، دل کرتا ہے کہ اڑ کر اس تک پہنچ جاؤں۔ اس سے پوچھوں کہ وہ کیسی ہے؟ کیا کچھ اس پر بیت گیا۔'' وہ خالی مگ ٹیبل پر منتقل کرتے پرسوچ و متفکر قدرے آزردہ انداز میں بولے تھے۔

''پاپا، اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں مومل سے بات کروں۔'' وہ بے حد چونک کر بیٹے کو دیکھنے لگے تھے۔

''آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں ہے اور میں وہاں جا کر بھی خاطر خواہ معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہوں گا۔ اگر مومل کو اس سارے قصہ میں شامل کر لیا جائے تو مجھے پوری امید ہے کہ وہ اتنی انفارمیشن تو حاصل کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائے گی جس کی مدد سے ہم آگے کا لائحہ عمل تیار کر سکیں۔ یعنی آپ بذات خود آبشار آنٹی سے ملاقات کر سکیں۔'' عبیر کا انداز بہت ٹھہرا ہوا تھا۔

''تمہارا آئیڈیا بے حد مناسب ہے مگر مومل کو اس سارے قصے میں شامل کرنے کا مطلب ہے کہ سب اس معاملے سے آگاہ ہو جائیں۔'' وہ شش و پنج کا شکار تھے۔

''مومل کو ایک دن آپ کی بہو بننا ہے پاپا اس لیے اسے شادی کے بعد ان باتوں کا پتہ چلنا ہی ہے اور جو بات اسے کل پتہ چلے گی وہ ہمارے لئے سود مند ثابت نہ ہوگی ایسے میں اسے خود آگاہی فراہم کر کے اس کی خدمات حاصل کی جائیں تو یہ ہمارے حق میں اچھا ہوگا اور آپ اس بات سے بے فکر رہیں کہ مومل کسی سے بھی کچھ بھی ذکر کرے گی۔ اس میں کئی شخصی برائیاں ہیں مگر وہ بھروسہ کبھی نہیں توڑ سکتی۔ وہ ایک قابل اعتماد لڑکی ہے۔'' عبیر نے ہر بات تفصیل سے باپ کے سامنے رکھی تھی۔ آخر تک اس کے انداز سے مومل کے لئے محبت چھلکنے لگی تھی۔ وہ جو بیٹے کی بات پر ذہن و دل کو جھکتا ہوا محسوس کر رہے تھے اس کے آخری جملہ پر اتنی پریشان صورتحال کے باوجود مسکرا دیئے تھے۔ انہیں اچھا لگا تھا کہ ان کے بیٹے کو اس لڑکی پر مکمل اعتماد تھا جو اس کی محبت تھی اور کچھ سالوں میں اس کی بیوی بننے والی تھی۔ محبت ہو یا کوئی بھی رشتہ اعتماد سب سے لازمی ہوتا ہے۔

''ٹھیک ہے۔ تم مومل سے بات کرو اور کل کا ہی کوئی پروگرام ترتیب دے کر اور کزنی ہاؤس چلے جاؤ۔'' وہ دھیمے سے کہتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''ابسام سے بھی بات کر کے دیکھنا۔ مجھے آبدار کو دیکھ کر آبشار کا گمان ہوا تھا۔ وہ آبشار کی بیٹی نہ سہی اس کی بھتیجی ضرور ہوگی۔ ابسام کے ذریعے بھی ہمیں کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔'' وہ کچھ یاد آنے پر بولے تھے۔ وا ثبات میں سر ہلا گیا تھا۔ وہ بیٹے کی جانب سے

مثبت جواب سن کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔

''آبشار تم بن زندگی میں نے جی نہیں، محض گزاری ہے۔اس بھرم کے ساتھ کہ تم ایک خوشگوار زندگی جی رہی ہوگی۔میرا بھرم ٹوٹ گیا ہے اس لئے مجھے تمہارے حالات سے واقفیت حاصل کرنی ہے۔تم کو پانے کی لگن آج بھی دل میں موجود ہے۔تمہیں پانے کی آرزو آج بھی دل میں مچلتی ہے اور تمہیں میری زندگی میں اب آنا ہوگا۔میں تم تک جانے والے راستوں پر اب کے سفر ضرور کروں گا اور اب کے مجھے تمہاری کوئی قسم بھی روک نہ سکے گی۔'' وہ بستر پر نیم دراز مسلسل آبشار کو سوچ رہے تھے۔نئے ارادے باندھ رہے تھے۔آبشار تک جانے کے ... اسے اپنی منزل کی اور بلانے کے ... دل میں محبت آج بھی زندہ تھی۔بس قسمت آزمانی تھی۔وہ خیال ہی خیال میں آبشار کے تصور کو ذہن میں تازہ کئے اسے بلانے،اس تک جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

تمہیں آنا پڑے گا!
سن رہی ہو تم؟
بھلے تارے پگھل ٹوٹ کر گر جائیں دریا میں
سمندر آگ اگلے، یا زمین سب کچھ نگل جائے
تمہیں آنا پڑے گا!
تمہارے راستے میں چاہے دلدل ہو
اندھیرا ہو یا جنگل ہو
تمہارے پاؤں شل ہوں یا
تھکن سے چور بوجھل ہوں
تمہیں آنا پڑے گا
سن رہی ہو تم؟
ڈھلانیں ہوں، چڑھائی ہو یا کھائی ہو
قسم چاہے میری جاں تم نے کوئی بھی اٹھائی ہو
سفر میں دشت پھیلا ہو
سوا نیزے پہ سورج ہو
یا کوئی صور پھونکی جا رہی ہو

غور سے سن لو
تمہیں میں نے بلایا ہے
تمہیں آنا پڑے گا!
سن رہی ہو تم......؟

☆......☆......☆

آبشار اور کنزئی گہری نیند میں تھیں۔ انہیں لگا تھا جیسے انہیں کوئی پکار رہا ہے۔ برسوں بعد تقریباً دو دن پہلے بھی نیند میں یہی کیفیت ہوئی تھی اور وہ اٹھ بیٹھی تھیں۔ آج بھی یہی حال تھا۔ ان کی سانس تیز چل رہی تھی۔ کمرے میں خاموشی واندھیرا پھیلا تھا۔ انہوں نے لیمپ آن کر کے اندھیرے کو قدرے اجالے میں تبدیل کر دیا تھا جبکہ خاموشی میں اب تک اسی آواز کی بازگشت تھی جو اپنی نہ تھی تو اجنبی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''مجھے اب آواز نہ دیں کبیر۔ ہمارے راستے کبھی ایک نہ تھے اور اب تو صدیوں کے فاصلے درمیاں ہیں۔'' ان کے دل کی حالت عجیب ہونے لگی تھی۔ آواز آنا بند تو نیند کے ٹوٹتے ہی ہو گئی تھی، بازگشت تھی بس... اور جیسے ہی بازگشت بھی تھمی تھی دل سے ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ جس نام کو انہوں نے کئی برسوں سے لب سے ادا نہ کیا تھا، دل سے محسوس نہ کیا تھا آج وہ نام دل سے یوں آزاد ہوا تھا کہ وہ لب سے بھی ادا کر گئی تھیں۔ انہوں نے صرف کبیر عباسی سے محبت کی تھی مگر جس دن محمود خان سے ایک رشتہ میں بندھی تھیں اس دن وہ کبیر عباسی کو دل سے نکالنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ انہیں سوچنا ترک کر دیا تھا مگر انہیں اندازہ نہ تھا کہ محمود خان ان کے ساتھ اتنا برا سلوک کریں گے۔ ان کا جسم ہی نہیں روح تک داغدار کر ڈالیں گے۔ جس دن ان کا جسم ان کے لئے سزا بنا تھا، محمود خان کی ہوس کا شکار ہوا تھا اس دن انہوں نے کبیر عباسی کو دل کی سرزمین سے بے دخل کر دیا تھا۔ ان کی محبت پاکیزہ تھی اور وہ داغدار جسم کے ساتھ ایک پاکیزہ محبت کو سوچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی روح مر گئی تھی، جسم سزا پا لینے کے باوجود بھی زندہ تھا۔ کبھی کبھی انہیں لگتا تھا کہ کوئی یاد کر رہا ہے۔ آواز دے رہا ہے مگر وہ ایسے میں ہمیشہ گونگی، بہری بن جاتی تھیں۔ جب جب دل کو کسی کی یاد آئی تھی انہوں نے اپنا سارا دھیان عبادت میں لگا دیا تھا مگر آج وہ اٹھ کر وضو نہیں کر پائی تھیں۔ نفل نماز کی نیت نہیں باندھ پائی تھیں آج جیسے ان کی قسم ٹوٹ گئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کبیر عباسی کی یاد دل پر دستک دیتی، ان کا نام لب سے آزاد کروا گئی تھی۔

''مت یاد آئیں کبیر، میں آپ کو یاد کرنے کے بھی قابل نہیں رہی، میری محبت ہی مجھ سے نہیں بچھڑی، میرا جسم میرے لئے سزا بن گیا۔ میں ایک وحشی کے ہاتھوں عزت لٹا کر بھی برسوں سے زندہ ہوں مگر اپنے داغدار وجود کے ساتھ، آپ کا سامنا مجھے مار ڈالے گا۔ مت یاد آئیں کبیر میں اپنی بے رنگ و بے ثمر، زندگی کی عادی ہو گئی ہوں۔ میرے سوئے خوابوں کو مت جگائیں۔ میں، میرا جسم آپ کے قابل

ہی نہیں رہا۔ میں آپ کو سوچنے کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی۔'' وہ گھٹنوں میں سر دیئے بری طرح بلک رہی تھیں۔ وہ کبیر عباسی کے ساتھ گزارے ایام کو سوچنا چاہتی تھیں لیکن محمود خان کے عمل کا خیال ایسا تھا کہ وہ چیخنے لگی تھیں۔ اپنے جسم کو نوچنے لگی تھیں۔ انہیں آج پھر ہسٹریا کا دورہ پڑا تھا۔ وہ کبھی چیخنے لگتیں تو کبھی بے ہنگم قہقہے کمرے کی خاموش فضا کو چیرنے لگتے تھے۔ وہ کبھی چادر کو اپنے گرد لپیٹ لیتی تھیں تو کبھی اتار پھینکتی تھیں۔ زور زور سے رونے لگتی تھیں۔ ان کی حرکات و سکنات کہیں سے بھی نارمل نہ تھیں۔ وہ اپنے جسم پر ہاتھ پھیرتیں اور ایک دم ہاتھ دور کر کے جھاڑنے لگتی تھیں یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جسم پر کوئی گرد لگی ہو اور وہ جھاڑ کر صاف کر دینا چاہتی ہوں۔ اس عمل میں یکدم شدت آنے لگی تھی۔ وہ تیز تیز یہ عمل کر رہی تھیں۔ انہیں اپنے حلق میں کچھ اٹکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر کہہ نہیں پا رہی تھیں۔ آنکھیں اوپر کو چڑھنے لگی تھیں۔ جسم اکڑنے لگا تھا۔ آنکھوں سے گرم سیال مادہ بہہ رہا تھا اور وہ بستر پر یوں پڑی تھیں جیسے مر گئی ہوں۔ مر تو وہ کئی برس پہلے ہی گئی تھیں بس پہلے حسین جسم کا خراج دیا تھا اور اب سانسوں کو خراج دینے پر مجبور تھیں۔

سزا ہے ... مائے ... سزا ہے!
میرا جسم، میرا گناہ ہے
جو ہوس کے منہ کو لگی ہے
میری قبا ہے!
جسے ڈھونڈتے ہوئے پاؤں پاؤں، چلے ہیں
دن نکل کیوں سانس سے آگے اپنے گلے میں
جو ٹھہر گئیں ذرا دھڑکنیں تو کیا ہوا
میرا آپ اپنے ہی آپ سے رہا ہوا
لڑا ہے ... مائے ... لڑا ہے
میرا جسم مجھ سے خفا ہے
جو ہوس کے منہ کو لگی ہے
میری قبا ہے!!

☆......☆......☆

''میں یہاں اکیلے کیسے رہوں گی۔'' شاہ زیب اسے اپنے اپارٹمنٹ پر لے آیا تھا۔ راستے بھر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اپارٹمنٹ پہنچ کر اس نے عریم کے سامنے پانی کا گلاس رکھا تھا اور دھیمے لہجہ میں آگے کا لائحہ عمل اس کے گوش گزار کر دیا تھا جس کا لب لباب یہی تھا کہ وہ

یہاں رہے گی، یہاں ضرورت کی ہر شے موجود ہے پھر بھی اگر اسے کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو وہ اسے بتا سکتی ہے۔عریم اس کے بولنے کے دوران بس چپ چاپ روتی رہی تھی۔شاہ زیب یہاں زیادہ دیر قیام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ باہر گاڑی میں آئیکت اس کا منتظر تھا۔آبدار اب تک نہیں ملی تھی اس لیئے آئیکت کا خیال تھا کہ انہیں ایف آئی آر درج کروا دینی چاہیئے۔شاہ زیب کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن وہ آئیکت سے فی الحال کچھ نہیں بولا تھا۔شاہ زیب جیسے ہی جانے کو کھڑا ہوا تھا وہ روتے ہوئے منمنائی تھی۔

''تمہیں اب عادت ڈالنی ہوگی عریم! کیونکہ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ بات تمہیں بھی اچھے سے معلوم ہے۔'' وہ ٹیبل سے موبائل اور والٹ اٹھاتے ہوئے بولا تھا۔

''میں سب جانتی ہوں شاہ مگر یہاں یوں اکیلے میں، تو میں مر ہی جاؤں گی۔'' وہ سسکی تھی۔اس نے عریم کا زرد چہرہ دیکھا تھا جس پر خوف کے سائے بکھرے ہوئے تھے۔اس نے آئیکت کو فون ملایا تھا اسے ہدایت دی تھی۔آئیکت اس پر خفا ہونے لگا تھا مگر اس نے آئیکت کی بات یکسر نظر انداز کر ڈالی تھی۔

''میں نے آئیکت سے کہہ دیا ہے کہ وہ گھر جا کر خالدہ بی کو لے کر آ رہا ہے۔'' وہ اس کو دیکھتے ہوئے بولا تھا اس کے چہرے پر یکدم سکون جگہ بنا گیا تھا اور وہ سوالیہ نگاہ سے شاہ زیب کو دیکھنے لگی تھی جیسے جاننا چاہتی ہو کہ یہ خالدہ بی کون ہیں۔

''خالدہ بی ہماری پرانی وفادار ملازمہ ہیں۔وہ اب یہاں تمہارے ساتھ رہیں گی۔یوں تمہیں اکیلے پن کا احساس نہیں ہوگا۔بس اتنا یاد رکھنا خالدہ بی سے تم کسی قسم کی کوئی بات نہیں کرو گی۔'' وہ ملازمہ کی تفصیل بتانے کے ساتھ اسے ہدایت بھی کر گیا تھا۔وہ آگے سے کچھ نہیں بولی تھی۔شاہ زیب کچن میں چلا آیا تھا اس نے اپنے لیئے چائے بنائی تھی۔کوئی فروٹ تو فی الحال موجود نہ تھا اس لیئے اس نے عریم کے لیئے ایک بڑے سے مگ میں نیم گرم دودھ نکالا تھا۔آدھا چمچہ چینی ڈال کر مکس کی تھی اور دونوں مگ ٹرے میں رکھتے ہوئے واپس لاؤنج میں آ گیا تھا۔

''تمہاری صحت اچھی نہیں ہے عریم، تم نے اپنی صحت اور ڈائیٹ کا بے حد خیال رکھنا ہے۔'' وہ جو اس سب ہنگامہ کے باعث بری طرح تھک گئی تھی صوفہ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی آہٹ پر چونک اٹھی تھی۔اسے یکدم شرمندگی نے آ گھیرا تھا۔وہ کچھ بول نہیں پائی تھی کہ شاہ زیب نے دودھ کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے نرمی سے کہا تھا اور اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''خالدہ بی کو میں سمجھا دوں گا، وہ تمہارا خیال رکھیں گی تم نے یقیناً کچھ نہیں کھایا ہوگا ان سے اپنے لیئے سوپ بنوا لینا۔'' وہ چائے کے سپ لیتے ہوئے ایسے بول رہا تھا جیسے درمیان میں کوئی ہنگامہ و بدنظمی ہوئی ہی نہ ہو۔

''آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟'' دودھ پی کر اسے اپنے اندر توانائی کا احساس ہوا تھا۔وہ گہری ہوتی خاموشی سے گھبرا کر بولی تھی۔وہ جو کسی گہری سوچ میں تھا عریم کی آواز پر چونک اٹھا تھا۔

''جو خود سے ہی ناراض ہو وہ کسی سے کیا ناراض ہوگا۔تم اس ناراضگی کے قصہ کو جانے دو اور خود کو اسٹرانگ بناؤ کہ زندگی آگے بہت

کٹھن ہے۔'' وہ گہری سانس کھینچ کر آزردگی سے کہتا یکدم لہجہ ہی نہیں بات بھی بدل گیا تھا۔

''آپ میرے ساتھ ہوں گے ہر کٹھنائی میں شاہ، یا آگے کے سفر میں، میں اکیلی ہوں گی۔'' اس کے لہجہ میں ایسا کچھ تھا کہ وہ عریم کو دیکھنے لگا تھا۔

''تمہارا حوالہ ایسا ہے کہ تمہیں میرے گھر سے وہ عزت و مان نہیں مل سکتا جس کی ایک بہو حقدار ہوتی ہے۔ رہا میں تو میں خود جس انتقام کی راہ پر چل رہا ہوں، برسوں سے جس کرب کی آگ میں سلگ رہا ہوں وہ آگ ایسی ہے کہ میں تمہیں اکیلا کرنے پر میں خود کو مجبور پاؤں گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے اسے بہت کچھ باور کرواتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''میں اپنی ساری کشتیاں جلا کر، اپنے سب حوالے گم گشتہ ماضی کا حصہ بنا کر صرف آپ کے حوالے، آپ کے سہارے یہاں آئی ہوں۔ اب میرا جو کچھ بھی ہے وہ آپ سے ہے شاہ۔ میرا ہر حوالہ آپ ہیں۔'' وہ اس کے مقابل آتی بولنے لگی تھی وہ آگے سے چپ تھا کہ وہ اسے کوئی امید نہیں دے سکتا تھا۔ واس کے جواب کی منتظر تھی کہ دروازہ پر بیل ہوئی تھی۔ شاہ زیب بڑی تیزی میں گیٹ کھولنے کے لئے بڑھ گیا تھا۔ وہ عریم کے ساتھ ملازمہ کو ہدایات دے کر وہاں سے نکل گیا تھا۔ جس وقت وہ گاڑی میں بیٹھا تھا آئیکت کو دیکھتے ہی اس کے غصہ و ناگواری کو صاف محسوس کر گیا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تم اس معاملہ کو اتنی غیر سنجیدگی سے کیوں لے رہے ہو۔'' وہ شازیب کو دیکھ کر غصہ سے بولا تھا۔

''محمود خان کے گھر صورتحال اس طرح تغیر پذیری کا شکار ہوئی کہ میں آبدار والے معاملے سے کچھ دیر کے لئے نظر چرانے پر مجبور ہو گیا۔'' وہ دھیمے سے بولا تھا کہ وہ مانتا تھا کہ یہ اس کی کوتاہی ہے اور آئیکت کا غصہ بجا ہے۔

''آبدار کو لاپتہ ہوئے تقریباً گیارہ گھنٹے ہو گئے ہیں۔ اس کا دن سے کوئی پتہ نہیں ہے کہ وہ کہاں گئی اور اب رات کے ساڑھے دس ہو رہے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے میری پریشانی بڑھ رہی ہے۔'' آئیکت کے انداز میں بے بسی تھی۔

''پریشان میں بھی ہوں، ہر اس جگہ جہاں اس کے ملنے کے امکانات تھے وہاں ہم اسے تلاش کر چکے۔ اب اسے ہم کہاں ڈھونڈیں، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔'' شاہ زیب کے انداز میں کافی بے بسی تھی، بار بار کے سفر نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ اسے اپنی کمر سے درد کی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مگر وہ ضبط کے مراحل طے کرتا درد کو برداشت کر رہا تھا۔ آئیکت نے اپنا مشورہ ایک بار پھر اس کے سامنے رکھا تھا اور وہ ایک بار پھر انکاری ہو گیا تھا۔ جس پر آئیکت کو غصہ نے آگھیرا تھا۔

''تم معاملہ کی گھمبیرتا کو سمجھ کیوں نہیں رہے شاہ۔ آبدار اور کزئی خاندان کی عزت ہے، گھر سے غائب ہے اور تمہیں ایف آئی آر کٹوانے میں بھی اعتراض ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے تو وہ ملنے سے رہی۔'' آئیکت بہت غصہ میں اپنا مؤقف اس کے سامنے رکھ گیا تھا۔

''آبدار گھر سے آج غائب نہیں ہوئی، یہ بات تم اچھے سے جانتے ہو کہ اسے گھر سے غائب ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ ایسے میں ہم ایف آئی آر درج کرائیں گے تو گڑے مردے اکھاڑے جائیں گے۔'' وہ آئیکت سے دوگنا سمجھ دار تھا۔ وہ بہت غصہ میں بھی کبھی بے عقلی کا ثبوت نہیں دیتا تھا۔ اس نے ہوش پر بھی جوش کو غالب نہیں آنے دیا تھا۔

''تمہارے کہنے کا کیا مطلب ہے کہ گڑے مردے نہ اکھڑیں اس لئے ہمیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا چاہئے۔'' اس نے بہت ناگواری سے شاہ زیب کو دیکھا تھا۔

''فی الحال یہ ہماری مجبوری ہے۔ ہمیں آبدار کو اپنے طور پر ہی تلاش کرنا ہوگا۔ ہم پولیس کے چکر میں پھنس کر محض خاندان کو بدنام کرنے کا باعث بنیں گے۔'' شاہ زیب اپنے مؤقف پر قائم تھا۔ آئیکت اور اس کے درمیان ایک نئی بحث چھڑ گئی تھی جسے شاہ زیب نے یہ کہہ کر فی الحال ختم کر دی تھی۔

''ہم لوگ گھر جا رہے ہیں۔ بابا اور تایا ابا کے سامنے تمام بات رکھ دیں گے پھر جو انہیں مناسب لگے کہ صورتحال ہماری سوچ سے بھی زیادہ گھمبیر ہے۔''

آئیکت آگے سے کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ لوگ گھر پہنچے تھے۔ شاہ زیب نے باپ کے اور تایا کے سامنے تمام بات رکھ دی تھی۔ وہ دونوں ہی ششدر رہ گئے تھے۔ حیرت کے بادل ذرا چھٹے تھے تو شوکت اور کرنئی بیٹے پر ہاتھ اٹھا گئے تھے۔

''ہم سب آبدار کو غلط سمجھتے رہے جبکہ وہ اتنی قصوروار نہ تھی۔'' شوکت اور کرنئی بیٹے کے دو تھپڑ لگانے کے بعد درشتگی سے بولے تھے۔ انہوں نے تمام عمر سچ و حق کا ساتھ دیا تھا۔ بات جیسے ہی ان کے سامنے آئی تھی انہیں آبدار کی نہیں اپنے بیٹے کی غلطی لگی تھی۔ شاہ زیب حیرانگی سے اپنے تایا کو دیکھ رہا تھا۔

''آبدار، جس نے ہر برے رویے کو خاموشی سے سہا، جس نے کبھی ایک حرف شکایت بلند نہ کیا وہ ایک دم بغاوت پر کیسے اتر آئی یہ بات مجھے آج سمجھ آئی ہے کہ اس معصوم کو بہکانے والا میرا بیٹا تھا۔'' وہ ایک بار پھر بیٹے پر ہاتھ اٹھا گئے تھے مگر اب کے جہانزیب اور کرنئی بھائی کے سامنے آتے انہیں غصہ ضبط کرنے کا کہہ گئے تھے۔

''تایا ابا۔ آپ اس سارے قصہ میں آبدار کو بے قصور نہیں ٹھہرا سکتے۔'' شاہ زیب نے مداخلت کی تھی اور شوکت اور کرنئی رخ اس کی جانب موڑ کر اسے گھورنے لگے تھے اس کی بات ہی ادھوری رہ گئی تھی۔

''میں آبدار کو قصوروار ٹھہرا نہیں رہا میں اسے قصوروار سرے سے مانتا ہی نہیں ہوں۔'' وہ دھاڑے تھے۔ شاہ زیب نے لب بھینچ لئے تھے۔

''بھائی صاحب، آپ غصہ نہ کریں۔ آپ کی طبیعت بہتر نہیں ہے۔'' جہانزیب اور کرنئی بھائی کو کاندھوں سے تھام کر بولے تھے۔

''آبدار چاہے شادی سے خوفزدہ تھی وہ اپنی حقیقت کھلنے سے خائف تھی مگر وہ ہرگز بھی گھر سے فرار نہ ہوتی اگر یہ بدبخت انسان اس کو

شہہ نہ دیتا۔ اگر یہ ہم سے آبدار کی سوچ شیئر کرتا تو وہ سب کبھی نہ ہوتا۔ غلطی آبدار کی نہیں ہے، ساری غلطی آئیکت کی ہے۔ اگر وہ غلط کرنے جا رہی تھی تو یہ اسے سمجھاتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا خاندان کی عزت خاک میں ملا دی۔'' ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ بیٹے کو جان سے مار دیں۔ شاہ زیب کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے کہ اسے تایا کا مؤقف بالکل درست لگا تھا یہ بات تو خود اس نے بھی آئیکت سے کہی تھی، اسے بھی یہی لگتا تھا کہ وہ اگر بروقت انہیں آبدار کے ارادوں سے آگاہ کر دیتا تو آج صورتحال قدرے مختلف ہوتی۔ آئیکت لب بھینچے کھڑا تھا اس کا باپ اس پر صحیح لعنت ملامت کر رہا تھا کہ آبدار کا ساتھ اس نے اپنی خود غرضی میں دیا تھا۔ وہ آبدار کی شادی رکوانے میں ناکام تھا وہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا اس لئے جب آبدار نے اپنی سوچ اس کے ساتھ شیئر کی تھی تو اس نے اس کو ابسام کے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ آبدار کے پاس گھر سے فرار کا ٹھپہ لگ جانے کے بعد آخری چوائس وہ خود ہی ہوگا اور گھر والے بھی خاندان کی عزت رکھنے کو آبدار کی شادی اس سے کر دیں گے مگر خود غرضی کی بنیاد پر بات بنتی نہیں ہے بگڑ جاتی ہے اور وہ بھی بگڑے ہوئے حالات کے ساتھ بے بس کھڑا تھا۔ شوکت اور کرزئی اس پر لعنت ملامت کرنے لگے تھے اور آئیکت آگے سے چپ تھا۔ اس کے ایک غلط قدم اور ذرا سی خود غرضی نے اسے سب کی نظروں سے گرا دیا تھا۔

''آئیکت نے تو جو کیا وہ کیا خاندان کی عزت کو اپنے مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا۔ تمہاری عقل کہاں گئی تھی جو تم آبدار کو اس منحوس محمود کے گھر بھیجنے پر راضی ہو گئے۔ اسے تم لوگ محمود خان کے گھر چھوڑ آئے۔'' شوکت اور کرزئی بیٹے کے بعد اب بھتیجے کو آڑے ہاتھوں لے رہے تھے۔ شاہ زیب نے تمام بات اُن دونوں کے سامنے رکھ دی تھی۔

''آبدار نے کہا کہ وہ محمود خان کو آئینہ دکھانا چاہتی ہے۔ اس سے اپنا قصور پوچھنا چاہتی ہے اور تم راضی ہو گئے۔ یہ بھی بھول گئے کہ آبدار اس منحوس انسان کی بیٹی ہے یہ بات صیغۂ راز میں ہے۔ آبدار دنیا کی نظر میں تمہاری بہن، میری بیٹی ہے اور تم نے میری بیٹی کو ایک ایسے انسان کے گھر چھوڑ دیا جو صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے، جو گناہ کر کے نادم نہیں ہوتا۔ گناہ پر بھی فخر محسوس کرتا ہے۔'' جہانزیب اور کرزئی کا سنجیدہ لہجہ ان دونوں کو ہی کسی انہونی کا پتہ دے رہا تھا۔

''تم نے آبدار کو وہاں بھیجنے سے پہلے یہ نہیں سوچا کہ وہ تمہاری بہن ہے اور اس بات کو محمود خان کس طرح اپنے حق میں استعمال کرے گا۔'' شاہ زیب جو خود کو عقل کل سمجھتا تھا اب احساس ہو رہا تھا کہ وہ تو کس قدر احمق تھا اس نے یہ سب تو سوچا ہی نہ تھا۔

''تم دونوں کو لگتا ہے کہ آبدار کہیں چلی گئی ہے، آبدار کہیں نہیں گئی، آبدار کو محمود خان نے غائب کر دیا ہے۔'' جہانزیب اور کرزئی کا انکشاف ان دونوں کے پیروں تلے سے زمین نکال لے گیا تھا۔ وہ دونوں ہی بے یقینی سے جہانزیب اور کرزئی کو دیکھ رہے تھے۔

''تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم نے محمود خان سے کہا کہ تم اس کی بیٹی کو طلاق دے دو گے، نکاح کو ماننے سے انکار کر دو گے تو وہ ڈر گیا اور آبدار کو اپنے گھر رکھنے کو راضی ہو گیا۔ تو یہ تمہاری زندگی کی سب سے بڑی حماقت ہے۔ محمود خان جس قدر گھٹیا سوچ کا مالک ہے یہ ہم

جانتے ہیں۔اس نے ڈر کر نہیں ایک پلاننگ کے تحت تمہاری مانی۔تم اسے نہیں وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا تھا۔'' شوکت اور کزئی شکستہ لہجے میں بولے تھے۔وہ بات جو دونوں بھائی ایک لمحہ میں سمجھ گئے تھے وہ بات ان دونوں کے ذہن میں نہ آئی تھی۔وہ دونوں ہی یکدم نظر چرا گئے تھے۔

''محمود خان عمر کے اس دور میں نہیں چاہے گا کہ زمانے کو اس کے کارنامے کا پتہ لگے اس لئے اس نے بے کسی ظاہر کرتے ہوئے آبدار کو اپنے گھر رکھنے کی حامی بھرلی مگر وہ اسے زمانے کے سامنے نہیں آنے دے گا۔تم نے اس کی بیٹی کو مہرہ بنایا مگر بے وقوفی کا ثبوت دے کر تم نے اپنا مہرہ خود ہی پیٹ دیا۔آبدار کو اُس کا مضبوط مہرہ بنا کر اسے کامیابی پلیٹ میں رکھ کر پیش کر دی۔اب وہ آبدار کو مہرہ بنا کر تمہیں بلیک میل کرے گا اور ہم اس کی ماننے پر مجبور ہوں گے کیونکہ آبدار اس کی بیٹی ہے یہ بات وہ اور ہم جانتے ہیں مگر زمانہ آبدار کو اور کزئی خاندان کی دختر کی حیثیت سے جانتا ہے۔وہ اب آبدار کو ہمارا منہ بند رکھنے کے لئے استعمال کرے گا۔'' شوکت اور کزئی اپنا گہرا تجزیہ پیش کر رہے تھے کہ برسوں قبل ان دونوں بھائیوں نے خاندان کی عزت بچانے کے لئے محمود خان کی منتیں کی تھیں، پاؤں پکڑے تھے۔اس وقت انہیں محمود خان کی خصلت کا اچھے سے اندازہ ہو گیا تھا۔محمود خان نے تو ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ آبشار کا ابارشن کروا دیں اور اس سارے قصہ کو لپیٹ کر کسی کنویں میں دفن کر دیں مگر ان لوگوں کے دل میں خوف خدا زندہ تھا۔ایک پل کو وہ کمزور پڑے تھے۔ڈاکٹرز سے ابارشن کی بات بھی کی تھی لیکن آبشار کی زندگی کو خطرہ تھا اور وہ دونوں بھائی اس سب کو اللہ کی رضا سمجھ کر چپ کر گئے تھے۔ان دونوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ خدا کے خلاف نہیں جائیں گے اس آزمائش پر کھرا اترنے کی کوشش کریں گے۔انہوں نے محض سوچا تھا مگر ان کی نیت کا اخلاص رب تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا تھا کہ آگے کے معاملات اللہ نے ایسے ترتیب دیئے تھے کہ ان کا مان سلامت رہا تھا اور دونوں ہمیشہ سر اٹھا کر جیئے تھے بس ایک کوتاہی ہوئی تھی کہ انہوں نے آبدار کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔اگر وہ یہاں بھی نیک نیتی کا ثبوت دیتے، آبدار کی حقیقت کو فراموش کر کے اسے محبت و عزت دیتے تو آج حالات مخالف سمت میں نہ بہہ رہے ہوتے۔

''آپ لوگوں کو لگتا ہے کہ آبدار کو محمود خان نے کہیں غائب کر دیا ہے۔'' آئیکت کے لب میکانکی انداز میں ہلے تھے۔

''ہاں، وہ جس قماش کا انسان ہے اس سے کچھ بعید نہیں ہے۔'' جہانزیب اور کزئی کے انداز میں صدیوں کی تھکن اتر آئی تھی۔شاہ زیب کو یکدم اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔اس نے دشمن کو کمزور سمجھ کر اسے اپنی کمزوری سونپ دی تھی۔اسے آبدار سے ہوئی گفتگو یاد آنے لگی تھی جب اس نے آبدار کو کہا تھا کہ محمود خان ایک معزول بادشاہ ہے جس کے جواب میں آبدار بولی تھی کہ مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔وہ بات جو وہ سمجھ نہیں پایا تھا اسے آبدار محسوس کر گئی تھی مگر اس وقت تو اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا مگر اب کڑی سے کڑی جڑ رہی تھی تو اسے اپنے فیصلہ پر، اپنی کم عقلی پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔اس نے باری باری ان تینوں کو دیکھا تھا اور کچھ سوچ کر بقیہ تفصیل بھی ان دونوں کے سامنے رکھ دی تھی۔

''خود دیکھ لو تم جس انسان نے اپنی سگی جائز اولاد کا نہیں سوچا وہ آبدار کے بارے میں کیا سوچے گا جو صرف اس کے لئے بدنامی و

رسوائی کا باعث بنے گی۔'' جہانزیب اورکزئی یہ جان کر کے محمود خان نے بیٹی کا ابارشن کروا دیا ہے وہ ساکت رہ گئے تھے کہ یہ بات ان لوگوں کے لئے تو سوہان روح تھی۔ وہ تو ایک زندگی جوان کے لئے بدنامی کا باعث تھی اسے قتل نہ کر سکے تھے اور محمود خان نے اپنے ہی خون کو صرف اپنی انا بچانے کو کیسی گزند پہنچائی تھی۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا ہو گیا ہے۔ کیا ہونے والا ہے۔ میں محمود خان کو سمجھنے میں ناکام ہو گیا۔ مجھے بس یہ لگا تھا کہ وہ نفس کے بہکاوے میں آ کر ایک گناہ کر گیا تھا اسے احساس دلایا جائے گا تو حالات بدل جائیں گے مگر میں غلطی پر تھا۔ عریم باپ کا کارنامہ جان لینے کے بعد میرے ساتھ آ گئی ہے۔ میں نے اسے اپارٹمنٹ پر چھوڑ دیا ہے۔ آگے کیا معاملات ہوں گے میری تو عقل ہی صلب ہو چکی ہے۔'' شاہ زیب کے انداز میں شکستگی تھی وہ صوفہ پر نڈھال سا گر گیا تھا۔

''سمجھ تو ہم بھی کچھ نہیں پا رہے۔ بس جتنا محمود خان کا مکروہ چہرہ ہمارے سامنے ہے اس کے ہی پیش نظر لگتا ہے کہ آبدار کو اس نے غائب کیا ہے۔ اس لئے تم ملو جا کر اس سے۔ بات کرو اس سے۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ اس نے یہ سب اس لئے کیا ہے کہ تم اس کی بیٹی کو نام نہاد نکاح کے بندھن سے آزاد کر دو۔ تم اس سے بات کرو گے تو وہ کھل کر سامنے آ جائے گا۔'' جہانزیب اورکزئی نے بڑے بھائی کو اپنے ساتھ شامل کرتے ہوئے ہم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے دونوں کا مؤقف بیٹے کے سامنے رکھا تھا۔

''اگر آپ لوگوں کا شک درست ہے تو مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنی آسانی سے کھلے گا۔'' جہانزیب کا ذہن کچھ بھی سوچنے، فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ آئیکت کی تو بولتی ہی بند تھی وہ تو بس یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے تو جو کیا تھا آبدار کو پانے کے لئے کیا تھا مگر اب لگتا تھا کہ وہ اس سے صدیوں کے فاصلے پر جا چکی ہے۔ وہ اسے کبھی پا نہیں سکے گا۔

''ہر انسان ہنڈرڈ پرسنٹ پلاننگ نہیں کر سکتا۔ ہر پلاننگ میں کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے جو مخالف پارٹی کے حق میں جاتی ہے۔'' شوکت اورکزئی کے لہجہ میں ایسا کچھ تھا کہ وہ تینوں ان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

''محمود خان موقع سے فائدہ اٹھانے والا انسان ہے مگر یہ وہ بھول گیا کہ ہر موقع سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ کچھ مواقع آئندہ کا سوچ کر ضائع بھی کرنے پڑتے ہیں۔'' ان تینوں کا ہر عضو کان بنا شوکت اورکزئی کی جانب متوجہ تھا۔

''تم نے جس وقت اپنی بیوی کو مجبور کیا کہ وہ لوگ آبدار کو اپنے ساتھ رکھیں اسی وقت محمود خان نے ایک منصوبہ سوچ لیا ہو گا۔'' شوکت اورکزئی کا لہجہ سرسراتا ہوا تھا وہ بہت سوچ سوچ کر ذہن میں تانے بانے بنتے ہوئے بول رہے تھے۔

''کیسا منصوبہ؟'' آئیکت کے منہ سے دو لفظ پھسل گئے تھے۔

''آبدار کو مہرہ بنانے کا منصوبہ۔'' شوکت اورکزئی کی جگہ جہانزیب اورکزئی بولے تھے۔ وہ ذرا سی سوچ بچار کے بعد بھائی کی سوچ تک کسی حد تک رسائی حاصل کر گئے تھے۔

''آبدار کو مہرہ بنانے والی بات تو سمجھ میں آ گئی مگر اس نے کون سے موقع سے فائدہ اٹھا کر غلطی کی میں یہ نہیں سمجھ پا رہا۔'' آئیکت کے انداز میں بے چینی و بے بسی تھی۔

''ہاسپٹل میں جو کچھ ہوا وہ اس نے نہیں سوچا ہو گا کہ وہ میرے علم میں آئے گا اور میں عریم سے کہہ دوں گا اور عریم باپ سے ہر تعلق ختم کر کے میرے ساتھ چل دے گی۔'' شاہ زیب نے ایک بار پھر اپنے عقلمند ہونے کا ثبوت فراہم کیا تھا۔ وہ باپ اور تایا کے پوائنٹ تک پہنچ چکا تھا۔

''اگر اس نے آبدار کو مہرہ بنایا تھا تو اسے چاہیے تھا کہ وہ اس مہرہ کو استعمال کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرتا مگر اس نے جلد بازی سے کام لیا۔ اس لئے اس کا مہرہ ہمارے ہاتھ آ گیا۔'' شوکت اور کزئی گہری سنجیدگی سے بول رہے تھے۔ ان کا اشارہ عریم کی طرف تھا۔ اس کا باپ کے خلاف جانا ان کے حق میں بہترین ثابت ہونے والا تھا۔ محمود خان نے یہ نہیں سوچا ہو گا کہ بات اس قدر جلدی کھل جائے گی اور اس کی بیٹی اس کی مخالفین میں سرفہرست شامل ہو جائے گی۔ عریم اگر ان معاملات سے دور رہتی، ناواقف ہوتی تو حالات یکسر بدل جاتے، محمود خان کے ہاتھ ان لوگوں کی کمزوری لگ چکی تھی۔ وہ اسے استعمال کر کے اپنے مقاصد حاصل کر سکتا تھا مگر اب معاملہ برابری کا تھا۔ شاہ زیب کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا وہ محمود خان سے نبٹنے کے ارادے باندھتا پلاننگ کر رہا تھا کہ تایا کی آواز پر چونک اٹھا تھا۔

''تم محمود خان سے جا کر ملو مگر یہ یاد رکھنا اس نے ہاسپٹل کے کارنامے کو جس آسانی سے قبول کیا ہے۔ (ان کا اشارہ ابارشن کی جانب تھا) وہ آبدار کے غائب ہونے والے معاملے میں اتنی بے وقوفی کا ثبوت نہیں دے گا۔ تم نے اب اسے کوئی کمزوری نہیں دینی، اس کی کمزوری کا فائدہ اٹھانا ہے کیونکہ بات اور کزئی خاندان کی عزت کی ہے۔ جس عزت کے لئے ہم لوگوں نے ایک گناہ کی تمام عمر آبیاری کی، اب اسی گناہ کے ہاتھوں ہم ذلیل و رسوا ہونا نہیں چاہیں گے۔'' شوکت اور کزئی کا لہجہ سرد تھا۔ وہ بھتیجے کو حالات سے اپنے تجربے و عمر کی بنیاد پر آگاہ کر رہے تھے۔ شاہ زیب آگے سے کچھ نہیں بولا تھا۔ اس نے آئیکت سے گاڑی کی چابی مانگی تھی اور ان تینوں کو مضطرب و آنے والے وقت کی فکر میں ہلکان چھوڑتا باہر نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

''میں تم سے بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔'' عبیر نے رات ہی مومل کے نمبر پر ٹیکسٹ کر کے کہا تھا کہ وہ اس سے کل صبح پہلی فرصت میں ملنا چاہتا ہے، بہت ضروری بات کرنی ہے۔ مومل کو تشویش ہوئی تھی اس نے اظہار بھی کیا تھا جس پر عبیر نے کہا تھا بات مل کر ہی آمنے سامنے بیٹھ کر کرنے والی ہے جس پر مومل کی تشویش بڑھ گئی تھی مگر وہ آگے سے کچھ کہے بنا، پوچھے بنا ہی ''اوکے'' کا ٹیکسٹ کر گئی تھی۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے بیڈ کی بائیں طرف اس امید پر نظر ڈالی تھی کہ شاید نوائم جاگ رہی ہو مگر وہ گہری نیند میں تھی اور وہ بھی ''کیا بات ہو سکتی ہے'' سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں اتر گئی تھی۔ اس نے ناشتہ کے بعد نوائم کو عبیر کے

میسجز کا بتایا تھا نوائم کو بھی فطری طور پر حیرانگی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا کیونکہ مومل کا جس طرح کا مزاج تھا جس طرح وہ عبیر سے خائف رہا کرتی تھی ان دونوں کے درمیان کالز تو دور کی بات ٹیکسٹ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا کرتا تھا اب رات گئے ٹیکسٹ کا آنا اور مل کر بات کرنے کی خواہش کا اظہار کرنا اس بات کی طرف کر رہا تھا کہ بات کوئی بہت ہی بڑی ہے۔

''تم اس سے کہہ دیتیں کہ وہ حیدر کا ٹیج آکر تم سے بات کر لے۔'' وہ حیرت سائیڈ پر رکھتی ہوئی بولی تھی۔

''میں نے عبیر سے یہی کہا تھا مگر وہ بولا کہ اسے مجھ سے بہت ضروری بات کرنی ہے جو سب کے سامنے وہ نہیں کر سکتا۔'' مومل نے اصل پریشانی کہی تھی۔

''ایسی کیا بات کرنی ہے؟'' نوائم مضطرب ہو چکی تھی۔

''یہ تو مجھے بھی نہیں پتہ۔ میں تو رات بھر میں اس نتیجہ پر پہنچی تھی کہ اس کو کہہ دوں کہ بات کرنی ہے تو گھر آجائے ورنہ رہنے دے لیکن اس کا صبح پھر ٹیکسٹ آگیا وہ پوچھ رہا تھا کہ میں کب اور کہاں آسکتی ہوں۔'' مومل اپنے ساتھ ساتھ نوائم کو بھی تشویش میں مبتلا کر گئی تھی۔

''اگر عبیر اپنی بات پر زور دے رہا ہے تو اس کا مطلب بات یقیناً بہت بڑی ہے۔ تمہیں اس سے ملنا چاہئے۔'' نوائم ترنت بولی تھی۔

مومل کا منہ بن گیا تھا۔

''عبیر جتنا بڑا ڈرامہ باز ہے میں اچھے سے جانتی ہوں اس لئے میرا اس کی باتوں میں آنے کا بالکل بھی ارادہ نہیں ہے۔'' وہ چڑے ہوئے انداز میں کہتی ڈریسنگ پر سے کیوٹکس اٹھاتی بیڈ پر آبیٹھی تھی۔

''ہر وقت کی بدگمانی بھی اچھی نہیں ہوتی مومل۔ اگر وہ تم سے کہہ رہا ہے کہ ضروری بات ہے تو یقیناً بات تو کوئی ضرور ہے۔ اس نے آج سے پہلے کبھی تم سے نہ اس طرح بات کی نہ کہیں ملنے کا کہا۔ جب ایسی حرکت اس نے ڈنمارک میں نہیں کی تو یہاں پاکستان میں کیوں کرے گا جبکہ وہ بھی جانتا ہے کہ وہاں ڈنمارک میں یونیورسٹی کے بہانے ہی بات کرنا آسان تھا اور یہاں دس ہزار مسائل ہو سکتے ہیں۔ ہماری فیملی ہرگز بھی اس بات کی تمہیں اجازت نہیں دے گی کہ تم عبیر سے یوں اکیلے میں ملو۔ اور وہ اگر ملنے کا کہہ رہا ہے تو یقیناً کوئی گھمبیر مسئلہ ضرور ہے۔'' نوائم اسے گھورتے ہوئے گہری سنجیدگی سے تجزیہ پیش کر گئی تھی جس پر مومل بری طرح چڑ چکی تھی کیونکہ نوائم کے ہر لفظ سے عبیر کے لئے ہمدردی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ عبیر کو فیور کرتی مومل کو ہمیشہ کی طرح بری طرح چڑا گئی تھی۔

''تم ہو ہی عبیر کی چمچی۔ جانے اس نے تمہیں کیا گھول کر پلایا ہے کہ تم یوں اس کی سائیڈ لیتی ہو'' وہ بڑی نفاست سے اپنے گورے ہاتھوں کی لانبی مخروطی انگلیوں کے سلیقہ سے بڑھائے ہوئے ناخنوں پر کیوٹکس لگاتے ہوئے قدرے ناراضگی سے بولی تھی۔

''میں کسی سے خوامخواہ میں بدگمان نہیں ہوتی اس لئے مجھے برائی کے ساتھ اچھائی بھی نظر آجاتی ہے۔ تمہاری طرح میں صرف برائی پر نظر رکھ کر دل میں بدگمانی کو جڑ پکڑنے نہیں دیتی۔'' نوائم نے صاف گوئی سے کہہ کر اپنا سیل فون اٹھایا تھا اور گیم اسٹارٹ کر لیا تھا۔

''نہ تم خود زیادہ مہان بنو نہ ہی اپنے سو کالڈ بھائی عبیر کو مہان سمجھو۔ مجھے بس یہ بتاؤ کہ اگر میں اس سے ملنے کو اگری کروں تو یہ سب کیسے ممکن ہوگا۔'' وہ حیرانگی سے مومل کو دیکھنے لگی تھی اسے اپنے کانوں پر شبہ ہوا تھا یوں لگا تھا جیسے کچھ غلط سن لیا ہو۔اس نے ناخنوں پر پھونکیں مارتے ہوئے کن اکھیوں سے نوائم کے چہرے کی طرف دیکھا تھا اس کے چہرے پر بے یقینی کی واضح لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔مومل بے ساختہ مسکرادی تھی۔

''تم مجھے جانتی ہو کہ مجھے اس عبیر میں، اس کی باتوں میں بالکل بھی انٹرسٹ نہیں ہے۔''

''تو پھر ملنے کی حامی کیوں بھرنا چاہتی ہو۔'' وہ مومل کی بات کاٹ کر بولی تھی۔مومل ہنس دی تھی۔

''تجسس کے خاتمہ کے لئے، پتہ تو لگے کہ موصوف ایسی بھی کیا ضروری بات کرنا چاہتے ہیں۔'' مومل کا اپنا ہی لاپرواہ دوسرے کو زچ کرنے والا انداز تھا۔نوائم لب بھینچ کر کچھ کہنے سے خود کو روکتی موبائل کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔مومل کی بات سے یوں شاک لگا تھا کہ نوائم گیم کی جانب سے توجہ ہٹا گئی تھی اور نتیجہ کے طور پر وہ راؤنڈ کلیئر کرنے میں ناکام ہوتی اپنے تمام کوائنز بھی ہار گئی تھی۔اسے شدید افسوس وغصہ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔اس نے بے دلی سے موبائل بیڈ پر اچھالا تھا اور خود اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''اب کسی بھی وجہ سے ہی صحیح تمہارے لاڈلے بھائی سے ملنے کو راضی ہو تو گئی ہوں، ایسے میں غصہ کیوں؟'' مومل اس کے غصہ کو محسوس کرتی حیرانگی سے بولی تھی اور اس نے قدم روک کر رخ موڑ کر مومل کی جانب دیکھا تھا جو اب اپنے پیروں کے ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھی۔

''تمہاری وجہ سے میرے تین ہزار کوائنز ضائع ہو گئے ہیں۔'' وہ بولی نہیں دھاڑی تھی مومل بے ساختہ ہنستی چلی گئی تھی۔

''تو تمہیں کس احمق نے کہا تھا کہ اپنا گیم چھوڑ کر میرے حسین چہرے کو دیکھو۔میں کون سا کہیں جا رہی تھی۔تم اپنا گیم ختم کر کے میرے حسین مکھڑے کا دیدار کر لیتیں۔'' مومل کا انداز شرارت لئے قدرے جلانے والا تھا۔

''حسین اور تم... کبھی آئینہ میں شکل دیکھی ہے اپنی۔'' نوائم نے گویا اس کی بات کو مذاق میں اڑانا چاہا تھا۔

''ارے جناب مومل احمد نے اپنی شکل بارہا آئینہ میں دیکھی ہے اور آئینہ بھی ہمارے حسن کی تاب لانے سے قاصر ہی رہتا ہے۔'' وہ نوائم کو چڑتا دیکھ کر مزید شوخ ہوئی تھی۔

''بس بکواس کروالو تم سے۔تم سے زیادہ حسین تو وہ ہماری ماسی سکینہ کی بیٹی ہے۔'' وہ مومل کے انداز میں میدان میں اتری تھی اسے لگا تھا کہ وہ مومل کو طیش دلانے میں کامیاب ہو گئی ہے مگر یہ نوائم کی بھول تھی۔

''میں یہ سوچ رہی ہوں کہ اگر ماسی سکینہ کی دختر نیک اختر اگر مجھ سے زیادہ حسین ہے تو تمہارے لاڈلے بھائی کا نظر انتخاب مجھ پر کیوں ٹھہرا، اس پر کیوں نہیں۔'' اس کے چہرے پر دل جلانے والی مسکراہٹ تھی۔نوائم نے بری طرح تپ کر اسے تکیہ دے مارا تھا۔

''عبیر کی عقل پر تو محبت نے پردہ ڈال دیا ہے ورنہ تم جیسی بد دماغ لڑکی سے تو اسے کوسوں دور رہنا تھا۔'' نوائم کے لہجہ سے صاف عیاں تھا کہ وہ بری طرح تپی ہوئی ہے۔

''حسین کا اضافہ کرلو تو تمہیں عبیر کی عقل پر ماتم کرنے کا نہیں میری قسمت پر افسوس کا دل کرے گا کہ مجھ جیسی حسین، قابل لڑکی کا وہ لنگور منگیتر ہے۔'' وہ مومل ہی کیا جو نوائم کو رگیدتے ہوئے عبیر کو ساتھ نہ گھسیٹے۔

''بس رہنے ہی دو، مانا تم حسین ہو تو عبیر بھی کسی سے کم نہیں ہے وہاں ڈنمارک میں لڑکیاں مرتی ہیں اس پر۔'' وہ مومل کو مبالغہ آرائی میں آگے بڑھتے دیکھ کر اس کی کمر پر ایک دھپ لگا گئی تھی۔

''اپنے بھائی کی چمچہ گیری کو ہی سہی مگر مانا تو تم نے کہ ہم حسین ہیں۔'' وہ چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتری تھی۔ نوائم کے رخسار پر شرارت سے چٹکی کاٹی تھی اور آئینہ کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ دراز قد، لانبے گیسو، گوری رنگت وہ بے حد حسین تھی اور اس پر مستزاد اسے اپنی خوبصورتی کا احساس بھی تھا۔ وہ بالوں میں برش کرتی ہوئی مومل کو ستائش بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مومل اور نوائم میں کون زیادہ خوبصورت تھا یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ نوائم کا بھی دراز قد، گوری شہابی رنگت، تیکھے نین نقش تھے لیکن دونوں کے بالوں میں واضح فرق تھا۔ مومل کے بے حد سلکی لانبے سیاہ ریشمی بال تھے جبکہ نوائم کے قدرتاً کرلی بال تھے اور اسے مومل کے بے حد چمکیلے سیدھے بال زیادہ پسند تھے۔

لگنے لگی ہوں میں حسین

آفرین ... آفرین ... آفرین

مومل نے شوخی سے گنگناتے ہوئے خود کو دیکھتی نوائم کو آنکھ ماری تھی۔ وہ سخت بدمزہ ہوئی تھی اسے مومل کی یہ چھچھورے لڑکوں والی عادت سخت زہر لگتی تھی۔ وہ رخ موڑتے ہوئے تپے ہوئے لہجہ میں بولی تھی۔

''اونہہ، کبھی عبیر کو آنکھ مارو تو مانوں کہ ہاں مومل احمد کوئی بہت چھچھوری سی لڑکی ہے۔'' نوائم کے تپے تپے لہجہ میں کہنے پر مومل بے ساختہ ہی ہنستی چلی گئی تھی۔

''تمہارا وہ بھائی پہلے ہی میرے حُسن کے آگے چاروں شانے چت ہے۔ گر جو میں نے ایسی ویسی حرکت کر دی تو اس نے پھڑک کر مر جانا ہے اس لئے مشورہ وہ دو جس میں تمہارا بھائی سلامت رہے۔'' وہ بالوں میں کیچر لگاتے ہوئے نوائم کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ مومل صرف اسے تنگ کرتی ہے ورنہ وہ ایسی کسی حرکت کا کبھی سوچے بھی ناں، وہ اسے غصہ میں کہہ گئی تھی مگر اس نے نوائم کی بات بڑی خوبصورتی سے اسی پر ڈال دی تھی۔ نوائم بے ساختہ مسکرا دی تھی۔

''رات تمہیں بتایا تو تھا کہ ابسام نے کہا ہے کہ وہ آفس سے آ کر ہمیں پھپھو کے لئے گفٹ دلانے لے جائیں گے تو تم ایسا کرو کہ عبیر کو پانچ بجے کا ٹائم دے دو۔ باقی تفصیل ابسام سے راستے میں پوچھ کر عبیر کو ٹیکسٹ کر دینا۔ وہ وہاں پہنچ جائے گا۔'' نوائم نے اس کے مسئلہ کا حل رکھا تھا۔

''مشورہ تو کمال کا ہے مگر کیا ہم ابسام بھائی کو بھی اس سب میں شامل کریں گے۔ اگر انہیں میرا عبیر سے یوں ملنا برا لگ گیا تو۔۔۔؟'' مومل چاہے بہت لاپرواہ لڑکی تھی مگر وہ کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتی تھی جو اس کے والدین کی عزت پر حرف کا باعث بنے۔ اس وقت بھی وہ مضطرب تھی۔

''تم فکر نہ کرو ہم عبیر کا شاپنگ مال میں آنا ایک اتفاق سمجھیں گے اور اسے کمپنی جوائن کرنے کی آفر کے ساتھ آگے کا لائحہ عمل تیار کر لیں گے۔'' نوائم گہری سنجیدگی سے اسے اپنے پلان سے آگاہ کر رہی تھی۔ مومل اس کی سمجھداری کی قائل ہوگئی تھی مگر یہ اس سے کہا نہیں تھا اور اپنا موبائل اٹھا کر اس نے عبیر کو مختصراً تفصیل ٹیکسٹ کر دی تھی۔ تیسرے منٹ ہی عبیر کا ''اوکے'' کا میسج آ گیا تھا وہ نوائم کو دیکھ کر وکٹری کا نشان بناتی کپڑے نکالنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

شاہ زیب نے محمود خان کے گھر جانے کے بجائے اسے کال کر کے باہر بلا لینا مناسب سمجھا تھا اسی لئے اس کا نمبر ملایا تھا مگر وہ کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ شاہ زیب کو غصہ اپنی گرفت میں لینے لگا تھا اس نے پھر ٹرائے کیا تھا اب کے کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ ہیلو کے جواب میں آگے سے نسوانی آواز کان میں پڑی تھی اس نے لب بھینچ کر اپنا تعارف کروایا تھا۔ محمود خان نے اس کا نمبر ''ایس بی'' کے نام سے سیو کیا ہوا تھا اس لئے وہ پہچانی نہیں تھیں۔ شاہ زیب کے تعارف کروانے پر ایک گہری سانس کھینچتے ہوئے اسے اپنے ہاسپٹل میں ہونے کا بتا دیا تھا۔ شاہ زیب موبائل ہاتھ میں لئے ساکت بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں میں اب تک نتاشہ محمود کی آواز گونج رہی تھی۔

''محمود پر فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ ان کی حالت کافی نازک ہے۔'' اس نے فون کر کے جہانزیب اور کرزئی کو بتا دیا تھا۔

''یہ ایک دم کیا سے کیا ہو گیا ہے، اگر پاپا اور تایا کا شک درست ہے تو آبدار تک کیسے پہنچ پائیں گے۔'' شاہ زیب اور کرزئی متفکر سا سوچ رہا تھا اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ اس لئے اس نے باپ کو بتا کر ان سے مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے یہی کہا تھا کہ وہ فی الحال عریم کو کچھ نہ بتائے اور ہاسپٹل جا کر وہاں محمود خان کی کنڈیشن کو مدنظر رکھ کر عریم کو بتائے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہاسپٹل پہنچ گیا تھا۔ اسے نتاشہ پر رحم آیا تھا وہ عورت بنا قصور کے کیا کچھ جھیل رہی تھی۔ محمود خان کا تو خیر دنیا میں کوئی تھا ہی نہیں، نتاشہ کی لے دے کر ایک ہی بہن تھی اور بیٹا خود ہاسپٹلائز ڈ تھا۔ ایسے میں نتاشہ نے یہ مشکل وقت تن تنہا گزارنا تھا۔

''ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟'' وہ چلتا ہوا نتاشہ محمود کے پاس آ رکا تھا۔

''ڈاکٹرز نے کیا کہنا ہے۔ مکافات عمل شروع ہو گیا ہے۔'' ان کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''عریم کو لے آتا ہوں۔۔۔'' وہ دھیمے سے کہہ گیا تھا۔

''ضرورت نہیں ہے۔ اسے بتا کر پریشان نہ کرنا۔ محمود خان نے تمام عمر جو فصل بوئی تھی اب اس کی کٹائی کا وقت ہے۔ ایسے میں عریم

کی قسم توڑنے کا کیا فائدہ۔'' پے درپے پڑنے والی آفت نتاشہ کو پتھر بنا گئی تھی۔

''آپ گھر چلی جائیں۔ پہلے عریم کی وجہ سے اب شوہر کی وجہ سے ہاسپٹل میں خوار ہو رہی ہیں۔ میں ہوں یہاں'' وہ دھیمے سے بولا تھا۔محمود خان کے لئے اس کے ذہن و دل میں ہمدردی کے جذبات نہ تھے مگر وہ عورت اسے قابل رحم لگ رہی تھی اس لئے وہ ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو کر انہیں آفر کر گیا تھا جسے وہ بڑی سہولت سے مسترد کر گئی تھیں۔

''آپ مجھ پر بھروسہ کرسکتی ہیں۔ میں یہ آفر ہمدری کے جذبات سے مغلوب ہو کر آپ کو کر گیا ہوں اور مجھ میں ابھی انسانیت باقی ہے۔ میں ہمدردی کی آڑ میں پیٹھ میں چھرا گھونپنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' اسے نتاشہ محمود کی آنکھوں میں آنسو چھلکتے محسوس ہوئے تھے اور وہ تب ہی بہت صاف الفاظ میں کہتا چلا گیا تھا۔

''زندگی جس موڑ پر لے آئی ہے اب اپنی مدد آپ کے تحت ہی سب کچھ کرنا ہوگا۔آج تمہاری مدد لے لوں گی تو کل سہارے کو کسے پکاروں گی؟'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی تھیں اور وہ خاموشی سے وہاں سے نکل گیا تھا۔ہاسپٹل کی راہداری عبور کرتے ہوئے اسے یکدم خیال آیا تھا کہ اسے ڈاکٹر سے محمود خان کی کنڈیشن کے بارے میں معلومات لینی چاہیں اور وہ ڈاکٹر کے روم میں چلا آیا تھا۔واپسی میں اس کے قدموں سے بے بسی لپٹی ہوئی تھی۔ڈاکٹرز محمود خان کی جانب سے بالکل مایوس تھے۔ڈاکٹر نے صاف کہہ دیا تھا کہ نہ ان کی زندگی کا بھروسہ ہے نہ ہی ان کے ٹھیک ہونے کے دس فیصد بھی چانسز ہیں۔اس نے بس ایک نظر بستر پر لاچار پڑے محمود خان کو دیکھا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے تھے۔انسان کس بات پر اکڑتا ہے۔یہ وہ سوچ رہا تھا۔اس کا دل محمود خان کی حالت دیکھ کر کانپ اٹھا تھا۔وہ شخص جو انا و غرور کا پیکر تھا بے بس ہوا بستر پر پڑا تھا۔اس کا پورا وجود مفلوج ہو چکا تھا۔نہ وہ ہل سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔غرور کا کیسا انجام تھا۔آنکھیں کھلی تھیں اور دم تھا کہ نکلتا ہی نہ تھا۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ عریم پر مزید کوئی ظلم نہیں کرے گا نہ ظلم ہونے دے گا کہ اسے محمود خان کا انجام کا پہلا سبق ہی بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔اس نے سوچ لیا تھا کہ نتاشہ کی بات نہیں مانے گا اور عریم کو منا کر ہاسپٹل لے کر جائے گا کہ محمود خان سے زیادہ نتاشہ محمود کو بیٹی کے سہارے کی ضرورت تھی۔

☆......☆......☆

''بی بی جی۔تھوڑا سا تو سوپ پی لیں۔آپ نے تو رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا'' خالدہ بی کے انداز میں منت تھی۔

''میرا دل ہی نہیں کر رہا'' وہ آزردگی سے بولی تھی۔ وہ باپ کو اتنی سنا کر شاہ زیب کے ساتھ آ تو گئی تھی مگر رات سے ہی بے چین تھی۔ایک لمحہ کو سو نہیں پائی تھی۔ جب بھی آنکھیں بند کرتی تھی لگتا تھا کہ محمود خان اسے پکار رہے ہیں۔اس کی ماما کو اس کی ضرورت ہے۔ اس نے ملازمہ سے کہا تھا کہ وہ سوپ لے جائے اور ایک گلاس دودھ لا دے۔ ملازمہ کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے موبائل اٹھا کر شاہ زیب کو کال کی تھی۔شاہ زیب گہری نیند میں تھا اس کی آنکھ بجتے موبائل کی آواز پر کھلی تھی۔اس نے موبائل اٹھایا تھا اسکرین پر عریم کالنگ

بلنک کررہا تھا۔اس نے کال ریسیو کرلی تھی۔

''شاہ۔مجھے اپنے گھر جانا ہے۔'' وہ سلام دعا کے بغیر شاہ زیب کے ''ہیلو' بولتے ہی بولی تھی۔

''کیا ہوا ہے عریم، سب خیریت ہے۔'' وہ مضطرب ہو چکا تھا۔

''میں رات بھر سو نہیں سکی۔مجھے لگ رہا ہے جیسے ماما اور پاپا کسی مشکل میں ہیں۔مجھے ان کے پاس جانا ہے۔'' وہ سسکنے لگی تھی۔شاہ زیب نے گہری سانس خارج کی تھی۔

''میں کچھ دیر تک تمہارے پاس آتا ہوں۔'' وہ اس کی بات کے جواب میں کوئی تبصرہ کئے بنا بولا تھا اور عریم کا جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ملازمہ کو چائے لانے کا کہتا وہ شاور لینے چلا گیا تھا۔کچھ دیر میں ملازمہ چائے رکھ گئی تھی۔وہ تیار ہونے کے ساتھ چائے ختم کرتا کمرے سے باہر نکلا تھا۔ڈائننگ ہال میں اس وقت گھر کی سب خواتین اور جہانزیب اور کرنزئی موجود تھے۔باپ پر سلامتی بھیجتے ہوئے اسے خیال آیا تھا کہ وہ انہیں کہاں جا رہا ہے اس بات سے آگاہ کرے یا نہیں؟ جہانزیب اور کرنزئی نے سلام کا جواب دیتے ہوئے استفسار کیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔اس کی الجھن مزید بڑھ گئی تھی۔

''پاپا، آپ میرے ساتھ آیئے۔مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ کچھ سوچ کر بول گیا تھا۔جہانزیب اور کرنزئی حیران ہوتے کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''کیا بات ہے کچھ پریشان لگ رہے ہو؟'' وہ دونوں لان میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔باپ کے پوچھنے پر اس نے عریم کی کال کا بتا دیا تھا۔

''عریم وہاں نہیں جا سکتی۔'' وہ باپ کو حیرانگی سے دیکھ رہا تھا۔

''اس نے قسم لی ہے اور قسم کا کفارہ ادا کئے بناء وہاں جانا مناسب نہیں ہوگا اسی لئے اللہ نے غصہ کو حرام قرار دیا ہے کہ انسان غصہ میں وہ باتیں بھی کر جاتا ہے جن کی ممانعت ہے۔''انہوں نے بیٹے کی حیرانگی کا جواب بڑی خوبصورتی سے دیا تھا۔شاہ زیب کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

''تم اپارٹمنٹ جانے سے پہلے مفتی صاحب سے فتویٰ لے لو، پھر ان کے فتویٰ کی روشنی میں کرنا جو بھی کرنا۔''انہوں نے دھیمے سے کہتے ہوئے بیٹے کو مفتی صاحب کا ایڈریس سمجھایا تھا اور وہ گاڑی میں آبیٹھا تھا۔اس نے مفتی صاحب سے مل کر مسئلہ ان کے سامنے رکھا تھا۔مفتی صاحب نے کفارہ ادا کرنے کی بات کرنے کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ دین میں بہت آسانی ہے۔کفارہ ادا کرنے کی نیت کے ساتھ عریم باپ سے ملنے جا سکتی ہے۔وہ مفتی صاحب کا شکریہ ادا کرتا واپس گاڑی میں آبیٹھا تھا۔اس نے عریم کو بتا دیا تھا کہ محمود خان پر فالج کا اٹیک ہوا ہے۔وہ تو پہلے ہی بے قرار تھی مزید تڑپ اٹھی تھی۔شاہ زیب نے اسے چپ کروایا تھا اور فتویٰ جو لیا تھا اس سے آگاہ کیا تھا۔

''میں کفارہ ادا کر دوں گی۔ اللہ سے اپنے کہے کی معافی بھی مانگ لوں گی، بس ابھی مجھے پاپا کے پاس لے جائیں۔'' وہ شدتوں سے روتی منت کر رہی تھی۔ شاہ زیب کی مرضی یہی تھی کہ وہ وہاں جانے سے قبل کفارہ ادا کر دے کہ چالیس دن کے لگاتار روزے رکھنا تو اس کے بس میں نہ تھا، دس غریبوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا آسان تھا مگر شاہ زیب جانتا تھا اس کی ذہنی حالت اس قابل نہیں ہے اس لئے اس نے اسے فریش ہو کر آنے کا کہا تھا۔ وہ اٹھ کر واش روم میں چلی گئی تھی۔ اسی پل ملازمہ چلی آئی تھی اور اس نے شاہ زیب کو بتایا تھا کہ عریم نے رات سے کچھ نہیں کھایا۔ یکلخت اسے غصہ نے اپنی گرفت میں لیا تھا مگر وہ خود کو سنبھالتا ملازمہ کو سوپ لانے کی ہدایت کر گیا تھا۔ عریم کے سامنے اس نے سوپ سے بھرا پیالہ رکھا تھا وہ جسے ہاتھ لگانے کو بھی تیار نہ تھی۔

''اگر ہاسپٹل اپنے پاپا کے پاس چلنا ہے تو یہ سوپ ختم کر لو۔'' اس نے سرد لہجہ میں کہا تھا اور وہ شاہ زیب کو اچھے سے جان گئی تھی اس لئے اس نے خاموشی سے ٹرے اپنے آگے کی تھی۔ دو چار چمچ بمشکل حلق سے اتارے تھے اور ٹرے سائیڈ پر کر دی تھی۔ شاہ زیب نے اپنی بات دہرائی تھی اور وہ سوپ زہر مار کرنے لگی تھی۔ جیسے ہی سوپ ختم ہوا تھا ملازمہ دو جوس کے گلاس لے کر آ گئی تھی۔ ایک گلاس شاہ زیب نے اٹھا لیا تھا اور دوسرا عریم کی طرف بڑھایا تھا۔ اس نے بے بسی سے شاہ زیب کو دیکھا تھا۔

''تم دیر کر رہی ہو عریم۔'' اس نے ٹرے میں سے گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا تھا اور شاہ زیب اسے لئے کراچی کے سب سے بڑے پرائیویٹ ہاسپٹل میں آ گیا تھا۔ وہ ماں کے گلے لگ کر بہت روئی تھی اور جس وقت وہ دونوں پرائیویٹ روم میں پہنچے تھے۔ باپ کی حالت دیکھ کر وہ اور شدتوں سے رونے لگی تھی۔ محمود خان کی حالت نے شاہ زیب کو دھچکا سا لگایا تھا۔ ان کا پورا جسم مفلوج تھا اور چہرہ بھی بگڑ گیا تھا۔ آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ عریم کو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

''پاپا۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ کل میں نے بہت بکواس کی تھی۔ میں آپ سے نفرت نہیں کرتی پاپا، نہ بحیثیت بیٹی اور نہ بحیثیت ماں۔ میں اپنے بچے کا قتل آپ کو معاف کرتی ہوں۔'' کچھ بولنے کی چاہ میں ان کے منہ سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگی تھیں۔ آنکھوں سے مستقل آنسو بہہ رہے تھے اور وہ باپ کی لاچاری پر تڑپتی ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھتی بلکتے ہوئے بولتی چلی گئی تھی۔ وہ بولنے سے قاصر تھے۔ ہلنے کے لائق نہ تھے مگر ان کی بصارت و سماعت کام کر رہی تھی۔ وہ بیٹی کو دیکھتے اس کی بات کو سنتے روتے ہوئے بے قراری سے تکیہ پر سر پٹخنے لگے تھے جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتے ہوں۔ معافی مانگنا چاہتے ہوں مگر وہ ظلم میں اتنے بڑھ گئے تھے کہ ان سے شاید معافی مانگنے کا حق بھی چھن گیا تھا۔ شاہ زیب کو تو کم از کم یہی لگا تھا۔ وہ عریم کو دیکھنے لگا تھا کل وہ کتنی غصہ میں تھی۔ اپنے بچے کا قتل کبھی نہ معاف کرنے کی قسم اٹھا گئی تھی مگر باپ کی حالت نے اس کے سارے فیصلے بدل دیئے تھے۔ ہر قسم توڑ ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اپنے بچے کا قتل اپنے باپ کو معاف کرنے کا اعلان کر گئی تھی۔

''پاپا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ایسے مت کریں پاپا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' وہ تکیہ پر سر پٹخ رہے تھے اور ان کی بے قراری عریم

کو بے سکون کر رہی تھی۔ وہ بے بسی سے ماں کو دیکھنے لگی تھی۔ نتاشہ کے لب پر جامد خاموشی تھی آنکھوں سے نمکین پانی بہہ رہا تھا۔ محمود خان کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ ان کے منہ سے نکلنے والی عجیب وغریب آوازیں عریم کا دل بند کرنے لگی تھیں۔ اس کے رونے میں شدت آ گئی تھی۔

''شاہ، پاپا کو کیا ہو رہا ہے۔ دیکھیں... پاپا...'' وہ بے ربط ہو رہی تھی۔ شاہ زیب باہر نکلا تھا کہ ڈاکٹر کو بلا سکے، ڈاکٹر کا عملہ مستعد ہو گیا تھا۔ وہ تینوں کمرے سے باہر آ گئے تھے۔

''شاہ زیب، جو کچھ تمہاری فیملی نے سہا، جو کچھ تمہاری پھپھو پر بیتی، اس کرب کی شدت کو میں آج اس لیول پر جا کر تو نہیں مگر کسی حد تک محسوس کر سکتی ہوں۔'' وہ تینوں ایک دوسرے سے نظر چرائے کھڑے تھے۔ ڈاکٹر نے محمود خان کی حالت خطرے سے باہر آ جانے کی اطلاع دی تھی اور آگے بڑھ گیا تھا۔ پھر خاموشی ان تینوں کے درمیان ٹھہر گئی تھی جسے کچھ سوچ کر نتاشہ محمود نے توڑ ڈالا تھا۔ وہ ان کی بات پر یکدم ہی لب بھینچ گیا تھا۔ ماتھے پر سبز رگ ابھر آئی تھی۔

''میرے پاس درد کا مداوا کرنے کے لئے کوئی مناسب حل نہیں ہے۔ میں اس ذلت کو بھی ختم کرنے سے قاصر ہوں جو محمود خان کے سبب تمہاری پھپھو اور خاندان کا مقدر بنی مگر آج محمود جس حالت میں ہیں، جس اذیت سے دوچار ہیں، میری تم سے التجا ہے کہ تم محمود کو معاف کر دو، اپنی پھپھو سے اپنے خاندان سے کہو کہ وہ محمود کو معاف کر دیں۔'' وہ شاہ زیب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑیں پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔ شاہ زیب آگے سے ایک لفظ کہے بنا واپسی کے لئے قدم اٹھا گیا تھا۔

''زانی کی سزا سو کوڑے مارے جانا مقرر ہے۔ وہ سو کوڑے تم مجھے مار لو شاہ زیب، مگر محمود کو معاف کر دو۔'' وہ لپک کر اس کے سامنے آ تیں ہاتھ جوڑے منت کر رہی تھیں۔

''آپ کو لگتا ہے یہ بہت آسان ہے۔'' وہ بے بس ہوا تھا۔ اسے کہاں امید تھی کہ وہ اتنی بڑی بات کہہ دیں گی۔ محمود خان کی جگہ سو کوڑے کھانے کو تیار ہو جائیں گی۔ ہاتھ جوڑ کر منت کریں گی۔

''جانتی ہوں بہت مشکل ہے۔ مگر مجھ سے محمود کی بے بسی، لاچاری دیکھی نہیں جاتی۔ ان کا دم اٹک گیا ہے۔ تمہاری پھپھو، محمود کو معاف کر دیں گی تو ان کے لئے آسانی ہو جائے گی۔ محمود بہت اذیت میں ہیں۔'' نتاشہ بری طرح رو رہی تھیں۔

''آپ محمود خان کا ساتھ دے کر غلط کر رہی ہیں۔'' وہ خود کو کمپوز کرتا ہوا بولا تھا۔ عریم ساکت پتھرائی نگاہوں سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''میں ان کی برائی میں نہ شریک تھی، نہ ان کے عمل کو درست کہہ رہی ہوں، مگر ان کا ساتھ دینے پر میں خود کو بہت مجبور پاتی ہوں۔ محمود میرے شوہر ہیں اور میں انہیں اس مشکل وقت میں تنہا نہیں کر سکتی۔ انہیں میری ضرورت ہے اور میرا فرض ہے کہ میں اس کڑے وقت میں اپنے شوہر کا سہارا بنوں۔'' وہ دھیمے سے کہہ رہی تھیں۔ وہ محمود خان کے ہر برے رویے کو فراموش کر گئی تھیں۔ انہوں نے صرف محمود خان سے محبت کی تھی، وہ محبت جو نکاح کے تین بولوں سے ان کے ذہن وہ دل میں سرایت کر گئی تھی۔ محمود خان ایک اچھے شوہر ثابت نہیں ہوئے

تھے اور وہ جو تمام عمر قربانیاں دیتیں، سمجھوتے کرتی آئی تھیں، عمر کے آخری حصہ میں ایک بری بیوی ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔ انہوں نے اپنے رشتے کی لاج رکھنی تھی، وفا نبھانی تھی۔ شاہ زیب اس عظیم عورت کو دیکھ رہا تھا جو شوہر کے عیب سامنے آنے کے بعد بھی اس کی وفادار تھی۔

''شاہ زیب، نفرت گناہ سے کی جاتی ہے، گناہگار سے نہیں۔ مجھے محمود کے گناہ سے نفرت ہے، مجھے اس احساس سے نفرت ہے جو میرے شوہر کو گناہ کی طرف لے کر گیا۔ مجھے تمہاری پھپھو سے ہمدردی بھی ہے اور وہ ہمدردی مجھے میرے شوہر کے عمل پر نفرت پر اکساتی ہے لیکن شوہر سے نفرت پر نہیں۔'' ان کا انداز بے حد ٹھوس تھا۔ وہ آگے سے کچھ کہے بناء بڑی تیزی میں وہاں سے نکل گیا تھا۔

''تمہارے پاپا بہت تکلیف میں ہیں۔ تم جاؤ شاہ زیب کے ساتھ، اسے سمجھاؤ، اگر اس کا دل نرم پڑ گیا، اس نے اپنی پھپھو سے تمہارے پاپا کو معافی دلوا دی تو تمہارے پاپا کی مشکل آسان ہو جائے گی۔'' وہ ساکت کھڑی بیٹی سے بولی تھیں اور وہ آگے سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر انہوں نے موقع نہیں دیا تھا۔

''شاہ زیب چلا جائے گا عریم۔ تم جاؤ اس کے ساتھ، تمہارے پاپا بہت اذیت میں ہیں۔ ان کی روح جسم کا ساتھ چھوڑنے کو راضی نہیں ہے۔ ان کا سانس سینے میں اٹک گیا ہے۔ اگر ہم لوگ شاہ زیب کی فیملی کی منت کر کے انہیں معافی کے لئے راضی کر لیں تو تمہارے پاپا کی منزل آگے آسان ہو سکتی ہے۔'' وہ دھیمے سے بولی تھیں۔ عریم بڑی خاموشی سے باہر کی طرف لپکی تھی۔ نتاشہ محمود کی آنکھوں کے سامنے رات کا منظر گھومنے لگا تھا۔ محمود خان کی سانس اٹک گئی تھی۔ ڈاکٹرز پمپنگ کر رہے تھے ان کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا اور ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرز کو یہی لگا تھا کہ مریض مر چکا ہے لیکن اگلے سیکنڈ ان کے وجود میں پھر جھٹکے لگنے لگے تھے، منہ سے بھیانک آوازیں نکل رہی تھیں۔ ایک لمحہ کو تو ڈاکٹر بھی ڈر گیا تھا وہ مریض سے ایک فاصلے پر جا کھڑا ہوا تھا۔ محمود خان کی آنکھیں اُوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر خود کو کمپوز کرتا پھر مریض کی جانب بڑھا تھا اسے ٹریٹمنٹ دینے لگا تھا۔ کچھ حالت سنبھلی تھی تو ڈاکٹر اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ساکت کھڑیں نتاشہ کو ساتھ آنے کا کہہ گیا تھا۔ ڈاکٹر جمیل کا تقریباً تیس سال کا ایکسپیرینس تھا جس کی روشنی میں انہوں نے نتاشہ محمود سے کہا تھا کہ ان کے شوہر کا دم ان کے سینے میں اٹک گیا ہے، کوئی ایسی بات ہے جو ان کی روح جسم کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہیں، ڈاکٹر جمیل کافی مذہبی تھے۔ انہوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے بغیر آج تک کوئی پیشنٹ ٹریٹ نہیں کیا تھا۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں بہت شفا رکھی تھی، تجربہ بھی کافی تھا۔ اب وہ مریض کی بنتی بگڑتی حالت سے جسمانی ہی نہیں روحانی طور پر بھی واقف ہو جاتے تھے اور جو حالت مریض کی تھی ایسی بہت کم پیشنٹس کی ہوتی تھی اور جن کی ہوتی تھی وہ ان کے گھر والوں سے ان کی زندگی کی دعا کرنے کا کبھی نہیں کہتے تھے۔ ان کا ایک ہی مدعا ہوتا تھا کہ وہ یہ دعا کریں کہ مریض کی اللہ مشکل آسان کر دے۔ وہ کافی علم بھی رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسی حالت اکثر کسی گناہ کے احساس، قرضہ کے بوجھ یا پیچھے رہ جانے والوں کی فکر میں بھی ہوتی ہے۔ محمود خان کی حالت انہیں چند سال پہلے لے گئی تھی۔ وہ ایک بزرگ خاتون تھیں، ان کے چہرے پر بے حد نور تھا اور ان کا سانس اٹکا ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ وہ جو

محسوس کررہے تھے اس پر ہی شک کیسے کریں کہ وہ عورت انہیں ایسی گناہ گار کم از کم نہیں لگتی تھی کہ جس کا دم اس کے سینے میں اٹک جائے، جان کنی کا مرحلہ اس کے لئے دشوار کن ہو جائے۔ انہوں نے اس عورت کی مشکل آسان کر دینے کی رب سے مناجات کی تھیں۔ اسی پل ہاسپٹل کے قانون کو توڑ کر ایک لڑکی آئی سی یو میں نرس کے بہت روکنے کے باوجود داخل ہوئی تھی اور انہیں ان کے سوالوں کا جواب مل گیا تھا۔ وہ سولہ سال کی بے حد خوبصورت لڑکی تھی اور اس کی ماں کا دم اس کی فکر میں نہیں نکلتا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی بیٹی کا کیا ہوگا۔ وہ عورت ہجرت کر کے پاکستان آئی تھی۔ اس کا شوہر پاکستان میں ہی رہتا تھا جسے فوت ہوئے دس سال ہو گئے تھے۔ شوہر کی ایک بہن تھی جو شادی کے بعد جدہ میں مقیم تھی۔ خود اس عورت کے بھائی بہن تھے نہیں، دور کے رشتہ دار سب ہندوستان میں مقیم تھے ایسے میں اس کی جوان بیٹی کو بے سہارا ہو جانا تھا۔ کچھ سوچ کر ڈاکٹر جمیل نے اس عورت سے کہا تھا کہ وہ ان کی بیٹی کو اپنی سرپرستی میں لیں گے۔ اس عورت کے چہرے پر یکدم اطمینان پھیل گیا تھا اور جان کنی کا مرحلہ با آسانی طے ہو گیا تھا۔ اس واقعہ کے بعد سے ہی ان کی حسیات مزید تیز ہو گئی تھیں۔ نتاشہ محمود نے ڈاکٹر سے کچھ نہیں کہا تھا مگر شوہر کے لئے معافی کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ دعائیں الگ کر رہی تھیں مگر ان کے لئے وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔

☆......☆......☆

''تمہیں اپنی ماما کے پاس ٹھہرنا چاہیے تھا عریم۔ انہیں تمہاری ضرورت ہے۔'' شاہ زیب جو بڑی تیزی میں کار تک آیا تھا۔ اگر آفس سے اس کی سیکرٹری کی کال نہ آجاتی تو وہ اب تک وہاں سے جا چکا ہوتا۔ وہ تقریباً بھاگ کر آئی تھی اس کی سانس اب تک پھولی ہوئی تھی۔ شاہ زیب نے اسے محض ایک نظر دیکھ کر کہا تھا۔

''ماما کو حالات نے اتنا مضبوط بنا دیا ہے کہ انہیں سہاروں کی ضرورت نہیں رہی۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی تھی۔ شاہ زیب نے کوئی تبصرہ کئے بناء اس کے لئے فرنٹ ڈور اوپن کر دیا تھا۔ کچھ دیر کی رگوں کو چیرتی ہوئی خاموشی کے بعد عریم نے بات کا آغاز کیا تھا۔ وہ اس کی منت کر رہی تھی کہ وہ لوگ اس کے پاپا کو معاف کر دیں۔ شاہ زیب لب بھینچے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

''شاہ! پاپا کا گناہ ناقابلِ معافی ہے مگر اب ان کی حالت بہت بری ہے۔ انہیں آپ لوگ خدا کے لئے معاف کر دیں۔'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔ آنسو تھے کہ رکتے ہی نہ تھے۔ شاہ زیب نے یکلخت ایک فیصلہ لیا تھا۔ اسے اپارٹمنٹ پر نہ چھوڑنے کا فیصلہ۔ وہ ابھی بھی رو رہی تھی، منتیں کر رہی تھی۔ اپنی محبت کا واسطہ دے رہی تھی۔ اپنے مرے ہوئے بچے کا واسطہ بھی دے گئی تھی مگر وہ یوں ڈرائیونگ کر رہا تھا جیسے گونگا ہو۔ کچھ بولنے سے قاصر... بہرا ہو اس کی منتیں سن ہی نہ رہا ہو۔ اندھا ہو اس کا رونا، اس کے آنسو، جڑے ہاتھ نظر ہی نہ آرہے ہوں۔ وہ اب خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ دے گئی تھی۔ بول بول کر حلق میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔ چہرہ متورم ہو گیا تھا مگر دوسری جانب کی بے حسی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔

''شاہ! اتنے تو بے حس نہ بنیں، خدا کے لئے کچھ تو بولیں۔ پاپا کو ان کے لئے نہ سہی، اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھ کر خدائی صفت کو اپنا کر، پاپا کو معاف کر دیں۔'' وہ بول بول کر تھکنے لگی تھی لیکن وہ تھکن کا اظہار تک نہیں کر سکتی تھی کہ ابھی اسے پیاس کا ایک صحرا عبور کرنا تھا۔ عریم کی منتوں میں شدت آرہی تھی اور اس کی چپ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اسے اپارٹمنٹ پر نہ لے جانے کا فیصلہ کر گیا تھا۔ تو وہ اسے آخر پھر لے کر کہاں جا رہا تھا۔ یہ راستے جو عریم کے لئے اجنبی تھے کیا شاہ زیب کے لئے بھی اجنبی تھے یا وہ جانے پہچانے، سفر پر عریم کو لے جا رہا تھا۔ وہ اسکے فیصلہ سے انجان بس منتیں کئے جا رہی تھی۔

❁ ❁

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

''آپ کیا سوچ رہے ہیں؟'' وہ حیدر صاحب کے سامنے چائے کا بھاپ اڑاتا ہوا مگ رکھتے ہوئے بولی تھیں۔

''یہی کہ ہمیں کل کی پارٹی کینسل کر دینی چاہئے۔'' وہ صاف ذہن و دل کی بات کہہ گئے تھے۔

''وہ نوجوان تو ٹھیک ہے؟ آپ ابھی ہاسپٹل سے آ رہے ہیں؟'' وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی تھیں۔

''ہاں۔ گیا تھا ہاسپٹل، فارس پہلے سے بہتر تھا۔ اسے ڈسچارج کر دیا ہے۔'' ان کی فارس نقوی سے ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ ہاسپٹل جا کر اس کے ڈسچارج ہونے کا پتہ لگا تھا اور انہوں نے فارس کے نمبر پر کال کی تھی۔ اس کا نمبر شائستہ نقوی نے انہیں دیا تھا۔ کال بھی انہوں نے ہی ریسیو کی تھی اور بیٹے کی طبیعت کافی بہتر بتا کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

''پھر آپ پارٹی کینسل کر دینے کا کیوں کہہ رہے ہیں۔'' فضہ حیدر الجھ گئی تھیں۔

''کوئی ہماری وجہ سے تکلیف میں ہے اور ہم خوشیاں منائیں۔ یہ بات مجھے بالکل بھی اچھی نہیں لگ رہی۔'' حیدر صاحب خدا ترس، انسانیت کے جذبے سے مغلوب انسان تھے۔

''آپ کی بات اپنی جگہ درست ہے۔ اچھا تو مجھے بھی نہیں لگ رہا مگر مجبوری سمجھ لیں، دعوت نامے بانٹ دیئے گئے ہیں اور اماں، بھائی سب ہماری اس خوشی میں شریک ہونے کو پاکستان آئے ہیں۔ اب ہم کینسل کر دیں گے تو سب کو کتنا برا لگے گا۔'' فضہ حیدر نے دھیمے لہجے میں ان کی توجہ دوسری جانب کروائی تھی۔

''کہتی تو تم بھی ٹھیک ہو مگر ایک عجیب سی شرمندگی اپنے احاطے میں لے رہی ہے۔'' انہوں نے بیوی کے ہاتھ سے مگ لے کر ایک گھونٹ بھرا تھا اور دھیمے سے کہہ گئے تھے۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ نیتوں کا حال اچھے سے جانتا ہے۔ نہ اس نوجوان کو ہماری طرف سے جان کر تکلیف پہنچی ہے نہ ہی ہم اس کی تکلیف پر مسرور ہیں۔ اللہ اس نوجوان کو جلد صحت یاب کر دے گا۔ آپ سب اللہ پر چھوڑ دیں۔'' فضہ حیدر نے بھرپور انداز میں تسلی دی تھی۔ ان کے اعصاب ڈھیلے پڑتے چلے گئے تھے۔

''ابسام گھر آ گیا؟'' انہوں نے موضوع بدلا تھا۔

''ابھی تو نہیں آیا۔ بچیاں بھی اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ کچھ شاپنگ کرنی ہے انہوں نے۔ ابسام نے آفس سے واپسی پر لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔'' وہ خالی مگ شوہر کے ہاتھ سے لیتیں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''پھر تم نے کیا سوچا ہے۔ بھائی صاحب سے ابسام اور نوائم کی شادی کی بات کب کرنی ہے۔'' وہ شوہر کی غیر متوقع بات پر چونک اٹھی تھیں۔

''بات کرنے کا سوچا تو تھا مگر پھر اس حادثے نے حالات ہی بدل دیئے۔اتنی پریشان کن صورتحال میں سب ذہن سے نکل گیا۔''
وہ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے بولی تھیں۔حادثہ میں ان کا بیٹا محفوظ رہا تھا مگر ان کے بیٹے کی وجہ سے کوئی تکلیف میں تھا اس لئے وہ لوگ بے سکون تھے کیونکہ ان لوگوں کے لئے اپنی ہی نہیں دوسرے کی تکلیف بھی بہت معنی رکھتی تھی۔

''موقع دیکھ کر تم اماں جان سے کہہ دو، پھر بھائی صاحب سے وہ خود ہی بات کرلیں گی۔'' حیدر صاحب نے ایک مناسب طریقہ ان کے سامنے حل کے طور پر پیش کیا تھا۔وہ محض اثبات میں سر ہلا گئی تھیں۔

''اب کیا سوچنے لگیں؟'' وہ بیوی کا پرسوچ انداز محسوس کر کے بولے تھے۔

''آبدار کے بارے میں سوچ رہی تھی، مختصر عرصہ میں ہی وہ اس گھر میں یوں رچ بس گئی تھی کہ اس کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔'' انہوں نے بیوی کی بات کی حمایت میں بات آگے بڑھائی تھی کہ اسے یاد تو وہ بھی کر رہے تھے۔

''تم پریشان نہ ہو۔ابسام نے تو اپنے طور پر کہا ہی ہے میں خود بھی آئیکت کو فون کر کے کہوں گا کہ وہ کل پارٹی میں آبدار کو لے کر ضرور آئے۔'' وہ حیدر صاحب کی بات پر مسکرا دی تھیں۔

''ابسام کو ہدایت کئی بار میں ہی نہیں امی بھی کر چکی ہیں۔'' اچھے لوگ تو خوشبو کی طرح ہوتے ہیں جو دور جا کر بھی مہکتے رہتے ہیں۔ آبدار بھی ان سب کے لئے کسی مہکتے گلاب کی مانند تھی۔

''آبدار کل آئے گی تو میں اس کو خوب ڈانٹوں گی۔ایسی بھی کیا بے مروتی کہ یہاں سے جا کر وہ ہمیں بالکل ہی بھول گئی۔'' وہ بیوی کے قدرے جذباتی نروٹھے انداز پر بے ساختہ ہنس دیئے تھے۔

''ایک تو یہ آپ کا بچپنا ختم نہیں ہوتا۔'' وہ بیوی کو چھیڑ رہے تھے اور وہ یکدم ہی سرخ پڑ گئی تھیں۔

''میں جا کر دیکھتی ہوں یہ ابسام آیا کہ نہیں۔بچیاں کب سے تیار ہو کر اس کا انتظار کر رہی ہیں۔'' وہ حیدر صاحب کو ہنستا چھوڑ کر عجلت کا مظاہرہ کرتیں باہر نکل گئی تھیں۔حیدر صاحب نے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی تھی۔ساڑھے چار بج رہے تھے انہوں نے آنکھیں موند لی تھیں۔

☆......☆......☆

عریم نئی جگہ کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔آنسو پونچھتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔شاہ زیب نے کچھ کہے بناء اس کا بازو جکڑا تھا اور اس کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے چل پڑا تھا۔لاؤنج میں اس وقت اس کی مما اور تائی کے علاوہ اس کی بہن اور تایا ابو موجود تھے۔وہ تمام چہرے اس کے لئے یکسر اجنبی تھے اور ان سب کے لئے بھی تو وہ بالکل ہی غیر شناسا تھی۔وہ سب شاہ زیب کو دیکھنے لگے تھے وہ جو لمحہ بھر کو رکا تھا پھر چل پڑا تھا۔اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا۔اس کمرے کی مالکن نماز سے فارغ ہوئی تھی۔ہاتھ میں مصلّٰہ، آنکھوں میں حیرت

لئے وہ بھتیجے کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے عریم کا بازو آزاد کیا تھا وہ بری طرح لڑکھڑاتی مصلّہ ہاتھ میں لئے دوپٹہ نماز کی طرح باندھے اس خوبصورت عورت کے قدموں میں جا گری تھی۔ اس عورت کی حیرت دوچند ہوئی تھی۔ وہ سوالیہ نگاہ سے بھتیجے کو دیکھتی کچھ زبان سے پوچھتی کہ وہ بول پڑا تھا۔

''منتیں کرنی ہیں تو کرو اس عورت کی منتیں جو تمہارے باپ کے کیئے کی سزا پچھلے کئی برسوں سے آج تک جھیل رہی ہے۔'' شاہ زیب کے سرد لہجہ میں کچھ تھا کہ آبشار اور کزئی ایک قدم پیچھے ہوئی تھیں اس لڑکی کی جانب دیکھا تک نہ تھا جو ان کے قدموں میں تھی اور اس کی بات ایسی تھی کہ عریم نے زمین پر بیٹھے بیٹھے ہی نظر اٹھائی تھی سامنے ہی تو وہ عورت تھی جس کے چہرے پر نور تھا، جس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

''مانگو اپنے باپ کے لئے اس عورت سے معافی جو تمہارے باپ کے گناہ کی زد میں آئی، سسک سسک کر کرب میں مبتلا زندگی گزارتی رہی۔'' شاہ زیب دہاڑا تھا۔ کمرے میں یکدم ہی لوگوں کا رش لگ گیا تھا۔ وہ سب جو لاؤنج میں موجود تھے آبشار اور کزئی کے کمرے میں چلے آئے تھے۔

''یہ سب کیا ہے شاہ زیب۔'' شوکت اور کزئی نے کی آواز کمرے میں گونجی تھی۔ عریم زمین سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اتنے غیر شناسا لوگوں میں آج گھری کھڑی تھی کہ ایک شخص سب سے زیادہ اجنبی لگ رہا تھا۔ اتنا انجان کہ اس کے چہرے کی طرف نگاہ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی اور اس نے ڈرتے ڈرتے آبشار اور کزئی کے چہرے کی جانب دیکھا تھا جو جانے کس احساس سے انڈے کی زردی کا رنگ اختیار کرتا جا رہا تھا۔

''محمود خان کو فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ وہ بہت اذیت میں ہے۔'' وہ کہنا شروع ہوا تھا۔ کتنے ہی لوگوں نے اپنے لب بھینچ لئے تھے۔ آبشار اور کزئی کے وجود پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ بھتیجے کی آواز کہیں بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ان کے کانوں میں محمود خان کے نام کے ساتھ ہی اس کے وہ گھٹیا الفاظ گونجنے لگے تھے جو اس نے ان کی شان میں کہے تھے۔

''اور یہ عریم محمود ہے، محمود خان کی بیٹی، جس سے اپنے باپ کی اذیت برداشت نہیں ہوئی۔ یہ اپنے باپ کے گناہ کی سزا پانے کو بھی تیار ہے۔ اس کی ماں بھی اپنے شوہر کے گناہ کی سزا جھیلنے کو بہ خوشی راضی ہے۔ بس یہ چاہتی ہے کہ اس کے باپ کا گناہ معاف کر دیا جائے کیونکہ یہ اپنے باپ کو اذیت و تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔'' شاہ زیب کا سرد لہجہ گونج رہا تھا۔ وہ آنکھوں میں اذیت لئے بھتیجے کو دیکھ رہی تھیں۔ آنسو قطرہ قطرہ پلکوں کی باڑ پھلانگتے رخساروں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ لمحہ بھر کو شاہ زیب خاموش ہوا تھا اب آبشار کو اپنی سماعتوں میں اپنی ہی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ زمین پر گرتی چلی گئی تھیں۔ کمرے میں ان کی سسکیاں بکھرنے لگی تھیں۔ شاہ زیب نے آگے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

''میں اپنے پاپا کے عمل کو بہت برا سمجھتی ہوں۔ میں مانتی ہوں ان کا گناہ ناقابلِ معافی ہے اور باخدا آج وہ بستر مرگ پر ایڑیاں نہ

رگڑ رہے ہوتے تو میں آپ لوگوں کے سامنے معافی کی درخواست لے کر ہرگز حاضر نہ ہوتی۔'' کمرے میں آبشار اور کرنزئی کی سسکیاں بلند ہو رہی تھیں۔عریم کو لگا تھا کہ وہ ایک لفظ نہیں کہہ پائے گی مگر اس نے اپنے حوصلہ کو مجتمع کر کے ہاتھ جوڑے تھے اور باپ کے لئے معافی مانگتی چلی گئی تھی۔وہ بری طرح رو رہی تھی۔

''خدا کے لئے میرے پاپا کو معاف کر دیں۔وہ بہت اذیت میں ہیں۔'' وہ آگے بڑھی تھی اور گھٹنوں کے بل جھکتی زمین پر بیٹھی سسکیاں بھرتی آبشار اور کرنزئی کے پاؤں پکڑ گئی تھی۔آبشار اور کرنزئی ایک جھٹکے سے دور ہوئی تھیں۔

''میں محمود خان کو نہ اِس جہان میں معاف کروں گی نہ اُس جہان میں۔'' وہ حلق کے بل چلائی تھیں۔شاہ زیب نے آگے بڑھ کر پھپھو کو کاندھوں سے تھام لیا تھا۔

''زیب، اس لڑکی کو یہاں سے لے جاؤ۔اس سے کہو یہ یہاں سے چلی جائے۔اس کے باپ کو معافی نہیں ملے گی۔'' وہ بری طرح بلک رہی تھیں۔ان کی دونوں بھابھیاں بھی ان کے ساتھ ساتھ رو رہی تھیں۔آبشار اور کرنزئی واحد تھیں جو شاہ زیب کو زیب کہتی تھیں ورنہ اگر کسی کو پیار میں اسے پکارنا ہوتا تھا تو شاہ کہتا تھا۔

''تمہیں اس لڑکی کو یہاں لے کر آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔'' شاہ زیب کی ماما غصہ سے کہتے ہوئے آگے آئی تھیں۔اس نے نگاہ اٹھائی تھی۔اسے ان کی آنکھوں میں اپنے لئے نفرت محسوس ہوئی تھی۔

''مجھے یہاں میری بے بسی لے کر آئی ہے۔میرے پاپا کی بہت بری حالت ہے۔انہیں آپ لوگ خدا کے لئے معاف کر دیں۔'' عریم کھڑی ہوتی پھر ہاتھ جوڑ گئی تھی اس کی آواز رونے سے بھاری ہو رہی تھی۔

''معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ہم نے برسوں قبل ہی اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔'' شوکت اور کرنزئی بالآخر بول پڑے تھے۔وہ رونا بھول کر اس باوقار انسان کو دیکھنے لگی تھی۔

''میں نے خود پاؤں پکڑ کر معافی کی بات کی تھی۔وہ شخص نہیں مانا تھا۔تب میں نے معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔وہ شخص اگر بستر مرگ پر اذیت ناک حالت میں ہے تو ہم خدا کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہماری اذیت، ہمارے صبر کو رائیگاں نہیں جانے دیا۔'' شوکت اور کرنزئی نہایت پرسکون نظر آ رہے تھے۔

''پاپا غلط تھے انہیں احساس نہیں ہوا کبھی......'' وہ بولنا چاہتی تھی۔

''اسے احساس تو آج بھی نہیں ہوا۔یہ تو تمہارے اندر کی جو بیٹی ہے وہ باپ کی فکر میں ہلکان ہوتی منتیں کرنے چلی آئی ہے۔ایسے میں معافی کیا معنی رکھتی ہے۔'' شاہ زیب کی ماما تڑخ کر بولی تھیں۔

''آپ سب ٹھیک کہتے ہیں مگر میرے پاپا بہت بری حالت میں ہیں۔آپ لوگوں نے بہت اذیت میں زندگی بسر کی۔میں مداوا بھی

نہیں کر سکتی۔ بس میں تو اللہ کا واسطہ دے کر آپ لوگوں سے معافی کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ محمود خان ظالم تھے، فریاد رسی نہ کر سکے۔ آپ لوگ مظلوم ہیں۔ میری بے کسی کو آپ سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میرے باپ کی اذیت کو ختم کر دیں۔ معاف کر دیں خدا کی رضا سمجھ کر اپنے گناہگار کو معاف کر دیں۔'' وہ اپنے جڑے ہوئے ہاتھوں پر سر ٹکاتی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کی گریہ وزاری ان سب کے دل پر اثر کر رہی تھی۔ آبشار اور کرزئی بھتیجے کا حصار توڑ کر نکلی تھیں، اپنے آنسو صاف کئے تھے اور چلتی ہوئی عریم کے پاس آن ٹھہری تھیں۔

''تمہیں لگتا ہے کہ ہمارے معاف کر دینے سے تمہارے باپ کی جان بآسانی نکل جائے گی۔ تو میں تمہارے باپ کو اس دنیا میں معاف کرتی ہوں لیکن......'' وہ اسے دیکھ رہی تھیں جس کی حالت بہت بری تھی کیونکہ اسے اپنے باپ سے بے حد محبت تھی۔ وہ اس عورت کی نگاہ سے نگاہ نہیں ملا پائی تھی مگر لفظ لیکن پر اسے اپنا سانس اٹکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''لیکن میں محمود خان کو اُس جہان میں معاف نہیں کروں گی۔ خود پر ہوئے ظلم کا رب کی عدالت میں حساب لوں گی۔'' وہ جیسے خود کو سنبھال کر بہت ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولی تھیں۔ عریم کے رونے میں یکدم ہی شدت آ گئی تھی۔ وہ آگے سے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔ آبشار اور کرزئی بے حد سکون سے اپنا فیصلہ سنا تیں، اسے ادھورا معافی نامہ سونپ کر وہاں سے نکلتی چلی گئی تھیں۔

''سزا و جزا کا فیصلہ روزِ محشر ہو گا اور یہ فیصلہ آبشار کا میں اس لئے درست مانتا ہوں کیونکہ محمود خان آج بھی اپنے کئے پر نادم نہیں، بس اپنے کئے کے باعث عذاب میں ہے اور تم اس کی بیٹی تکلیف میں ہو اور تمہاری بات کی لاج رکھتے ہوئے تمہارے باپ کو معافی نامہ دے دیا ہے۔ جا کر بتا دو اپنے باپ کو باقی بات رب کی عدالت میں ہو گی۔'' شوکت او کرزئی کا لہجہ بے حد سرد تھا۔ اسے وہ لوگ ایک لمحہ کو ظالم لگے تھے کہ وہ کسی کو معاف نہیں کر سکتے تھے اور دوسرے ہی لمحہ حق بجانب لگے تھے کہ اصل مسئلہ ہی یہ تھا کہ معافی کی ساری کوششیں اس کی اور نتاشہ کی جانب سے تھیں۔ محمود خان کو پہلے احساس نہ تھا اور اب بھی ان کی جانب سے ایک چپ تھی۔ وہ لاچار تھے، بے بس تھے مگر اشاروں، کنایوں میں تو اپنے گناہ کی معافی مانگنے کا اظہار کر سکتے تھے مگر ایسا کچھ نہ تھا۔ تو کیا محمود خان کا دل اس قدر سیاہ ہو چکا تھا......؟ مگر یہ فیصلہ انسان کیسے کر سکتے تھے؟ کیسے فرض کر سکتے تھے کہ وہ نادم نہیں......؟ اسے معافی نہیں ملنی چاہئے۔ جو سب لوگ محمود خان کو اس جہاں میں معاف کر کے اس جہاں میں حساب کی بات کر رہے تھے کیا سب دعویٰ کر سکتے تھے کہ ان کی ذات سے کبھی کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی؟ دوسروں کو آسانی، معافی نہ دینے والے خود معافی سے مبرا ہیں؟ دوسروں کو گناہگار، معافی کے قابل نہ سمجھنے والے اپنے گناہ کیوں بھول جاتے ہیں؟ شاہ زیب کو سب کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا اور وہ بہت کچھ سوچتا عین دہلیز پر پہنچیں آبشار اور کرزئی کا آگے بڑھ کر ہاتھ تھام گیا تھا۔

''عریم۔ تم اپارٹمنٹ پر چلی جاؤ، میں کچھ دیر مصروف ہوں ابھی۔ پھر مجھے ایک میٹنگ میں بھی جانا ہے۔'' اس نے گاڑی کی چابی عریم کی طرف بڑھائی تھی۔ وہ پریشان نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے عریم، تم جا سکتی ہو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت کچھ باور کرواتے انداز میں بولا تھا اور وہ

چپ چاپ آگے بڑھ گئی تھی۔ اس کی اتنی ہمت نہ ہوئی تھی کہ کسی ایک کو بھی نظر اٹھا کر دیکھ لیتی۔ وہ اس گھر کی بہو تھی لیکن اس کا حوالہ ایسا تھا کہ اسے سسرال میں بھی اسی حوالے کی نظر سے دیکھا گیا تھا اور دھتکار دیا گیا تھا۔ یہاں آتے ہوئے وہ انجان تھی اس لئے سکون میں تھی مگر واپسی مشکل ہو گئی تھی کیونکہ قدموں سے آگاہی آن لپٹی تھی۔

شاہ زیب نے پھپھو کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

''تم محمود خان کی بیٹی کو یہاں کیوں لے کر آئے تھے؟'' شاہ زیب کی ماما چیخی تھیں۔

''تمہیں محمود خان کے ساتھ اس قدر ہمدردی ہے کہ ہماری سالوں کی اذیت وتکالیف تمہیں بھول گئی ہیں۔'' اس کی تائی تابندہ نے بھی لب کشائی کی تھی۔

''ہاں۔ مجھے ہمدردی ہے لیکن محمود خان کے ساتھ نہیں۔ آپ سب کے ساتھ۔'' شاہ زیب نے محسوس کیا تھا کہ عریم اب تک کمرے کی دہلیز کے پار کھڑی ہے اس نے نامحسوس انداز میں اس طرف قدم بڑھائے تھے ان دونوں کی نگاہ ٹکرائی تھی۔ شاہ زیب کی نگاہ میں اشتعال تھا۔ عریم کی آنکھوں میں خوف بے بسی بن کر اترا تھا اور وہ بڑی تیزی میں نکلتی چلی گئی تھی اور وہ واپس کمرے کے وسط میں آن کھڑا ہوا تھا اور اس کی بات نے ان سب کو بے یقین کر ڈالا تھا۔

''محمود خان آج اس موڑ پر کھڑا ہے کہ ہم معاف کر کے خدا کی نظر میں اس کے اچھے بندوں کی فہرست میں شامل ہو سکتے ہیں...... لیکن یہ معافی صدقِ دل سے ہمیشگی کے تاثر کے ساتھ ہونی چاہیے۔'' وہ مخاطب تایا اور پھپھو سے تھا مگر دیکھ ابھی ابھی کمرے میں داخل ہونے والے باپ کو رہا تھا۔

''تم اپنی بکواس بند کرلو، یہ مت بھولو کہ میں نے کیسے ایک ناکردہ گناہ کی سزا جھیلی ہے۔ میری روح تک داغدار کر ڈالی اس شخص نے جس کے لئے تمہیں آج معافی درکار رہے۔'' آبشار اورکزئی حلق کے بل چیخی تھیں اور ایسا کرتے وہ بری طرح کانپنے لگی تھیں۔ تابندہ نے آگے بڑھ کر نند کو سہارا دیا تھا۔

''تم نے عریم کو یہاں لا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ہمارے سارے زخم جو آج بھی ہرے ہیں ان پر مرچیں ڈالنے کا کام کیا ہے۔'' شوکت اورکزئی کا لہجہ تھکن اور اذیت سے چور تھا۔

''بھائی صاحب۔ وہ لڑکی یہاں میری ایما پر آئی تھی۔'' جہانزیب اورکزئی کی بات ان سب کو بے یقین کر گئی تھی۔ شاہ زیب نے اسے جس وقت اورکزئی ہاؤس لانے کا فیصلہ کیا تھا اسی وقت اس نے باپ کو ٹیکسٹ کر دیا تھا اسے امید تو نہ تھی کہ اس کا باپ اسے اجازت دے گا لیکن اس نے مشورہ کر لینا مناسب سمجھا تھا مگر اسے سات منٹوں میں جہانزیب اورکزئی نے مثبت جواب دے ڈالا تھا اور وہ عریم کو لے کر اورکزئی ہاؤس چلا آیا تھا۔

''جو لڑکی ابھی یہاں سے گئی ہے حالات کی ستائی ہوئی ہے۔اس کے لئے زندگی کو کٹھن بنانے والا اورکزئی خاندان کا بیٹا ہے۔اگر وہ حساب لینے پر آئے تو سوچا ہے آپ سب نے کہ کیا ہوگا'' جہانزیب اورکزئی باری باری سب کو دیکھ رہے تھے۔وہ دونوں بھائی جو آدھے ادھورے جملوں سے ایک دوسرے کی مکمل بات سمجھ جاتے تھے آج بے حد حیرانی سے نافہم انداز میں کھڑے تھے۔جہانزیب اورکزئی کی باتیں کسی کو تو کیا شوکت اورکزئی کو بھی سمجھ نہیں آ رہی تھیں۔

''جو شاہ زیب نے کیا ہے میں اسے درست نہیں مانتی مگر جو محمود خان نے کیا تھا اس کا شاہ زیب کے عمل سے مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔'' رخسانہ نے شوہر کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

''بات گناہ کی ہے چاہے وہ گناہ صغیرہ ہو کہ گناہ کبیرہ۔'' جہانزیب اورکزئی ترنت بولے تھے۔

''تم جو کہنا چاہتے ہو چند لفظوں میں کہہ دو۔یوں پہیلیاں نہ بجھواؤ۔'' شوکت اورکزئی قدرے ترشی سے بولے تھے۔

''میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ شاہ زیب اس لڑکی کا مجرم ہے۔وہ سزا دینے کا اختیار رکھتی ہے مگر بے بس ہے اسے اپنے باپ کے گناہ کا نہ صرف احساس ہے وہ یہ بھی سمجھتی ہے کہ اس کو اپنے باپ کے عمل کی سزا مل رہی ہے۔اس لئے وہ شاہ زیب کو معاف کر چکی ہے۔'' انہوں نے پھر تمہید باندھی تھی ان کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ فی الوقت چند لفظوں میں بات ختم نہیں کر سکتے تھے۔

''تو تم یہ چاہتے ہو کہ ہم لوگ محمود خان کو معاف کر دیں......تو ہم اسے معاف کر چکے ہیں۔'' شوکت اورکزئی نے فوراً کہا تھا۔

''مگر میں روزِ محشر اس شخص کا گریبان ضرور پکڑوں گی۔'' آبشار بھابھی کا حصار توڑ کر نکلتیں چیخی تھیں۔

''میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سب محمود خان کو معاف کر دیں۔میں تو بس یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کچھ غلطیاں ہم سے بھی سرزد ہو جاتی ہیں۔ہم خود بھی دوسرے کی طرف معافی کی نگاہ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر اپنے رب سے ہر لحظہ اپنے گناہ کے سبب معافی کے طلب گار ہوتے ہیں۔جب رب معاف کر دیتا ہے تو ہم سب کیوں نہیں۔'' اب کے شاہ زیب بولا تھا۔

''یہ مت بھولو شاہ زیب کہ محمود خان کی ایک معمولی سی خطا نہیں ہے اس کا گناہ ہے جس کی سزا مقرر ہے۔'' شاہ زیب کی ماما کا لہجہ نہایت سخت تھا وہ بیٹے کو ناگواری سے دیکھ رہی تھیں۔

''سزا تو ہر غلطی و گناہ کی مقرر ہے۔سزا تو جھوٹ کی بھی مقرر ہے۔سزا تو غیبت کرنے والے کی بھی مقرر ہے،ماں باپ کا نافرمان بھی سزا کا حقدار ہے۔دوسرے کا حق مارنے والا بھی سزا سے نہیں بچ سکتا۔دوسرے کو کسی دوسرے کے کئے کی سزا دینے والا بھی سزاوار ہے۔سزا و جزا کا مگر فیصلہ کرنے والے ہم سب کون ہوتے ہیں۔'' شاہ زیب کا لہجہ یکدم ہی نم ہوتا چلا گیا تھا۔

''میں محمود خان کو جس اذیت میں دیکھ آیا ہوں۔یقین جانئے کہ وہ اذیت زیادہ ہے جس میں برسوں سے پھپھو رہیں،کیونکہ پھپھو تکلیف دہ اذیت میں تھیں مگر صحالین میں شامل تھیں،رب کا ساتھ میسر تھا۔آج محمود خان بے بس ولاچار ہے۔اسے جب تک پھپھو معاف

نہیں کریں گی خدا بھی معاف نہیں کرے گا۔" وہ چلتا ہوا آبشار اور کزئی کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

"آپ کی اذیتوں میں آپ کا اللہ آپ کے ساتھ تھا، جو صبر و حوصلہ کی آپ کو ہمت و توفیق دیتا رہا مگر وہ شخص اپنے گناہ کے تعاقب میں رب کی رضا کے حصار سے نکل گیا۔ پھپھو آپ اب اسے معاف کر دیں اللہ کی رضا کے لئے۔ رب معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" وہ پھپھو کے ہاتھ تھام گیا تھا۔ وہ بری طرح رو رہی تھیں۔

"عریم کو یہاں لانے کا مقصد صرف اتنا تھا کہ آپ سب دیکھ سکیں کہ وہ لڑکی جو باپ کے عمل کی سزا کاٹ رہی ہے، جس کے باپ نے اس کی گود اجاڑ دی، وہ اس کے لئے معافی کی خواستگار تھی کیونکہ وہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی ہے۔ اس نے اپنے باپ کو اپنے بچے کا قتل بھی معاف کر دیا۔ تو ہم سب کو بھی چاہیئے کہ ہم اللہ کی رضا کے لئے محمود خان کو معاف کر دیں۔ سزا و جزا کا فیصلہ رب کا ہے اسی کے پاس رہنے دیں۔ جب بے بس تھے تو ہم بھی محمود خان کے قدموں میں جھکے تھے۔ آپ وقت نے ہمیں حاکم بنایا ہے تو ہم حساب نہ کریں۔ معافی کا اذن دے دیں کہ اسی میں سب کے لئے خیر ہے۔" جہانزیب اور کزئی کی آنکھوں میں نمی تھی انہیں وہ اذیت نہیں بھولی تھی جب وہ محمود خان کے آگے سوالی تھے اور اس نے ٹھکرا دیا تھا اور انہوں نے رب سے ناطہ کچھ اور مضبوط کر لیا تھا اور ان سب نے اللہ کی رسّی کو تھاما تھا تو اللہ نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ اور جہاں ان سب سے چوک ہوئی تھی وہیں ان سب کے لئے پریشانیاں بھی تو تھیں۔ آبدار کے معاملہ میں ان سب سے ناانصافی ہوگئی تھی تو کیا ناانصافی کے بعد ان کی پکڑ نہ ہونی تھی؟

"آبدار کے معاملہ میں ہم میں سے کوئی بھی منصف نہیں رہا۔ ہم سب کو اللہ کے آگے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ آبدار نے جو بھی قدم اٹھایا وہ حالات کا پیش خیمہ تھا۔ آبشار کا ہم نے ساتھ دیا۔ آج یہ عزت سے سر اٹھا کر چلتی ہے۔ اور آبدار کو ہم سب نے اس کے باپ کے عمل کے ترازو میں یوں تولا کہ اسے بالکل ہی تنہا کر دیا۔ اور جب بیٹیوں کو بے سہارا چھوڑ دیا جاتا ہے وہ کہیں کی نہیں رہتیں۔ آبشار سب گنوا کر بھی دنیا کی نظر میں سرخرو ہے کیونکہ اسے اپنوں کا ساتھ حاصل تھا اور آبدار اس کو کسی نے سمجھا ہی نہیں۔ آج وہ کہاں، کس حال میں ہے۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا۔" جہانزیب اور کزئی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ انہیں جب سے آبدار کے گھر سے غائب ہونے کے پیچھے چھپے اسباب کا علم ہوا تھا وہ خود سے بھی شرمندہ تھے۔ وہ بس یہی سوچتے تھے کہ اگر وہ آبدار کو ایک اچھا ماحول دیتے، پیار و عزت دیتے تو وہ محمود خان تک رسائی حاصل کرنے کا سوچتی بھی نہیں۔ اسے عزت نہیں ملی تو اس نے جس کے سبب یہ ہوا تھا اس تک پہنچنے کا سوچ لیا تھا۔ ہم انسان اپنے معاملہ میں تو بلند نظری کا ثبوت دیتے ہیں مگر دوسرے کے معاملہ میں بے حد کم ظرف ثابت ہوتے ہیں اور ان سب کی کم ظرفی، بدلہ لینے کی چاہ ایک معصوم کو دربدر کر گئی تھی۔ تمام انکشافات سب کے سامنے کھل گئے تھے سب کو کہیں نہ کہیں اپنا جرم نظر آنے لگا تھا۔ سب سے زیادہ شرمندہ تو رخسانہ اور کزئی تھیں۔ کیا تھا اگر وہ آبدار کی حقیقت کو فراموش کر کے اسے مومنہ کی طرح محبت و عزت اور مان بھرا ساتھ سونپ دیتیں، ماؤں کا ساتھ تو بیٹیوں کے لئے بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔ آبشار کو ماں کا ساتھ نصیب تھا تو وہ کبیر عباسی کی محبت دل

میں بسائے ہوئے بھی، صرف ماں کا مان نہ ٹوٹے محمود خان سے شادی کے لئے راضی ہوگئی تھی۔ اس نے ماں کے لئے، ان کی تربیت کے لئے محبت کو ہری جھنڈی دکھا دی تھی۔ آبدار کے پاس تو ماں جیسے سرے سے تھی ہی نہیں۔ اس کی تربیت کی روشنی نہ تھی تب ہی وہ محبت نہ ہونے کے باوجود صرف بھٹکی ہوئی سوچ کے ساتھ، اپنے حق کے حصول کی چاہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی تھی۔ رخسانہ اور کزئی کی آنکھوں سے گرم سیال مادہ بہہ رہا تھا۔ مجرم تو آبشار اور کزئی خود کو بھی محسوس کر رہی تھیں۔ اگر ان کے ساتھ محمود خان نے زیادتی کی تھی تو وہ بھی تو تمام عمر آبدار کے ساتھ زیادتی ہی کرتی آئی تھیں۔ اس کا استحصال، اس کو بیٹی نہ ماننا...... انہوں نے تو شاید اسے انسان بھی نہ سمجھا تھا۔ دو حرف محبت کے نہ بولے تھے۔ اپنے دکھ واذیت کو اتنا محسوس کیا تھا ان سب نے کہ دوسرے کا دکھ واذیت محسوس ہونا ہی بند ہو گئے تھے۔ مکمل جہان تو کسی کو بھی نہیں ملتا۔ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون ومحبت ہی تو جہاں مکمل کرتی ہے اور ان سب کا جہاں نامکمل تھا کیونکہ وہ مظلوم ہی نہیں ظالم بھی تھے اور بیک وقت مظلوم وظالم انسان دوسرے کو معاف نہ کرنے کا فیصلہ کیسے کر سکتا ہے؟ تابندہ اور کزئی کو بھی اپنا آپ مجرم لگنے لگا تھا وہ واحد تھیں جو آبدار سے محبت وعزت سے پیش آتی تھیں مگر سب سے زیادہ ظلم تو انہوں نے ہی آبدار پر کیا تھا کہ انہوں نے اسے بہو بنانے سے یوں انکار کیا تھا کہ اس کی حقیقت اس پر منکشف ہوگئی تھی۔ اس کے سر سے آسمان، قدموں تلے سے زمین کھینچ لی گئی تھی۔ جنہیں اس نے والدین سمجھا تھا ان سے ماں باپ کہنے کا حق چھیننے والیں تو وہی مہربان تائی تابندہ تھیں۔ یہ کیسا ظلم ہو گیا تھا ان سے...... وہ بری طرح رو رہی تھیں۔ کمرے میں بے حد خاموشی تھی جس میں آبشار اور کزئی کی سسکیاں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

''میں محمود خان کو اس کے عمل کے لئے معاف کرتی ہوں۔ اس امید کے ساتھ کہ جو گناہ، جو کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوئیں میرا رب ان کو درگزر کر دے گا۔'' سسکیوں کے شور میں آبشار اور کزئی کی آواز بکھری تھی اور پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

اُن دونوں میں بہت دوستی تھی

اس دوستی کی بنیاد

کسی تیسرے شخص کی دشمنی تھی

دونوں نے اپنی ملی جلی کوششوں سے

دشمن کو رستے سے ہٹایا

اور پھر......!

وہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے

☆......☆......☆

''تم یہاں اتفاق سے آن ٹکرائے ہو یا اتفاق رائے سے......'' ابسام کی نظر شاپ میں داخل ہوتے عبیر پر جیسے ہی پڑی تھی وہ اسے

آواز دے گیا تھا اور عبیر سے بغل گیر ہوتے ہوئے شرارت سے بولا تھا۔

''میری اپنی منگیتر سے اتنی بنتی ہو تو میں خوشی سے ہی مر جاؤں۔'' اس نے ابسام کی بات مذاق میں اڑائی تھی۔ نوائم کے لبوں پر مسکراہٹ مچل گئی تھی جبکہ مومل کا منہ بن گیا تھا۔

''ڈھیٹ لوگ اتنی جلدی نہیں مرتے۔'' وہ منہ ہی منہ میں ہڑبڑائی تھی۔

''تم اس بے چارے سے اتنا چڑتی کیوں ہو؟'' ابسام نے اس کی بڑبڑاہٹ چونکہ سن لی تھی اس لئے مسکراہٹ دبا کر بولا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ یہ باتوں کے لئے انتہائی نامناسب جگہ ہے۔'' مومل کسی قسم کا تبصرہ کئے بغیر قدرے ناگواری سے بولی تھی۔

''کیا آپ لوگوں کی شاپنگ مکمل ہوگئی ہے؟'' اس نے نوائم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''شاپنگ تو ہم لوگوں کو کوئی خاص کرنی نہیں تھی۔ ہم تو پھپھو کے لئے ویڈنگ اینورسری کا گفٹ لینے آئے تھے اور چونکہ لے چکے ہیں تو بس اب واپسی کی تیاری ہے۔'' نوائم کی جگہ مومل اکھڑ انداز میں بولی تھی۔

''میں بھی گفٹ لینے ہی آیا تھا۔ مومل کیا تم میری ہیلپ کر دو گی۔ مجھے خواتین کی پسند کا بالکل بھی آئیڈیا نہیں ہے۔'' اس نے مومل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا اور وہ منہ بنا کر صفاچٹ جواب دے گئی تھی۔

''تم نوائم کی ہیلپ لے لو۔ میں بہت تھک چکی ہوں۔ سر بھی درد کر رہا ہے۔'' اس کے صاف منع کرنے پر عبیر کے چہرے پر سائے لہرانے لگے تھے جو اُن دونوں سے ہی پوشیدہ نہ رہے تھے جبکہ مومل نے تو اس کے چہرے کی جانب دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی تھی۔

''ہر وقت کی بدتمیزی بھی اچھی نہیں ہوتی مومل۔'' نوائم نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''عبیر، یہ تمہارے ساتھ جا رہی ہے۔'' نوائم کی بات ان سب کے لئے حیران کن تھی۔ ابسام بھی متحیر سا نوائم کو دیکھ رہا تھا۔

''مجھے اپنے لئے ایک ڈریس لینا ہے۔ آپ جب تک مومل کو ساتھ لے جا کر گفٹ لے لیں۔ فری ہونے کے بعد میرے نمبر پر بیل دے دیجئے گا۔'' وہ ان تینوں کو موقع دیئے بغیر پورا پروگرام ترتیب دے گئی تھی۔

''ابسام، آپ ساتھ آیئے۔ ہم وہاں دیکھتے ہیں۔ اس شاپ میں کافی اچھی ورائٹی لگ رہی ہے۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی تھی۔

متحیر سا ابسام اس کے پیچھے ہی قدم بڑھا گیا تھا۔ عبیر نے ٹائم ضائع کیے بناء باہر کی طرف قدم بڑھائے تھے اور مومل نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

''آئی ایم سوری۔ اگر آپ کو برا لگا ہو تو......'' نوائم جتنے بولڈ انداز میں سب کچھ کر گئی تھی اتنی بولڈ تھی نہیں، اس نے کن اکھیوں سے ابسام کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے برا تو نہیں لگا بس حیرت ہو رہی ہے۔ تم نے اگر عبیر کی بات کی حمایت ہی کرنا تھی تو ہم دونوں ان کے ساتھ بھی تو جا سکتے

تھے۔'' ابسام اس کے ساتھ چلتے ہوئے بول رہا تھا۔

''موّل، عبیر کو زیادہ خاص پسند نہیں کرتی، اس نے منگنی صرف دادو کی خوشی کے لئے کی ہے۔ منگنی سے پہلے تک اس کا بی ہیویئر قابل قبول تھا مگر منگنی کے بعد اس کا عبیر سے یوں مس بی ہیو کرنا اچھا شگن ثابت نہیں ہوگا اس لئے میں نے موّل کو عبیر کے ساتھ جانے کا کہا اور یہ میرا نہیں دادو کا آئیڈیا تھا۔'' نوائم کی بات پر وہ متحیر رہ گیا تھا۔ جس وقت موّل نے اسے ساری بات بتائی تھی اس نے دادو سے سب شیئر کیا تھا اور ان کو کوئی اعتراض نہ تھا اس لئے اس نے یہ قدم اٹھا لیا تھا۔

''یہ بات مگر موّل کے علم میں نہیں ہے۔ دادو کے مشورے پر میں نے ہی عبیر کو یہاں بلایا تھا'' وہ دونوں شاپنگ تو کر ہی چکے تھے گاڑی میں آ بیٹھے تھے اور نوائم اسے تمام بات بتاتی چلی گئی تھی۔ یہ بات موّل کے علم میں واقعی نہ تھی کہ اس سارے پلان میں دادو بھی شامل تھیں۔ ابسام نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا وہ گوری رنگت تیکھے نین نقش کی بے حد حسین لڑکی تھی۔

''نوائم! تم ہمارے رشتہ سے خوش ہو۔'' نوائم بری طرح چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ یہ ان کی منگنی کے بعد پہلی دفعہ تھا کہ وہ اس رشتہ کے حوالے سے نوائم سے بات کر رہا تھا اس کی مرضی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

''میں بڑوں کے فیصلہ سے مطمئن ہوں۔'' نوائم نے اپنے نرم لہجہ میں مختصر سے جواب میں گویا بات ہی ختم کر دی تھی۔ ابسام ایک نظر اس کے مطمئن چہرے کو دیکھتا ایک گہری سانس بھر کر رخ موڑ گیا تھا۔

''کل تک تو میں بھی مطمئن تھا۔ دل کیا اجنبی ہوا......سارا اطمینان بھی رخصت ہو گیا۔'' اس نے بوجھل ہوتے دل کے ساتھ سوچا تھا اور ''دل'' کی بات آئی تھی تو ذہن ''اس'' کی جانب چلا گیا تھا۔ جو اس کا دل یوں اپنے ساتھ لے گئی تھی کہ اس کا دل خود اپنے لئے ہی اجنبی و پرایا سا ہو کر رہ گیا تھا اور آبدار کے اس وقت نوائم کی موجودگی میں خیال نے ابسام کے ذہن میں ایک وحشت سی بھر دی تھی۔

''کیا زندگی یوں ہی بے ایمانی کرتے گزرے گی۔ نوائم ساتھ ہوگی، پہلو کو آباد کرے گی اور تصور میں آبدار کا خیال رقص کرے گا......تو کیا میں ایک دل ہار کر منافق ہو گیا ہوں۔ منافقوں کی طرح زندگی گزاروں گا۔'' نوائم جو اس کی طرف سے کسی بات کی منتظر تھی اسے اپنے خیالوں میں ڈوبا دیکھ کر لمحہ بھر کو مضطرب ہوئی تھی مگر دوسرے ہی لمحہ سر جھٹک کر اس نے موبائل نکال کر گیم اسٹارٹ کر دیا تھا اور وہ نوائم کو فرنٹ سیٹ پر بٹھا کر تصور میں آبدار کا خیال جگائے بے حد مضطرب ہوا جا رہا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے بے حد سادہ، بے ریا نوائم احمد کو دیکھا تھا۔ یہ لڑکی بہت سنجیدہ، بہت معصوم تھی اور وہ نوائم کو دیکھتا آگے کی زندگی کا سوچ کر ہی پریشان ہو گیا تھا۔

''مجھے آبدار کا خیال ذہن سے نکالنا ہوگا۔ میں نوائم جیسی اچھی لڑکی کے ساتھ منافقت بھری زندگی نہیں گزار سکتا۔'' اس نے خود سے عہد باندھا تھا۔ دل سے صدا ابھری تھی۔

''ذہن سے تو نکال دو گے مگر دل سے کیسے نکالو گے۔ دل سے جانے کا تو کوئی راستہ ہی نہیں۔'' وہ دل کی صدا پر بے چین ہو گیا تھا۔

''نوائم۔ کال کرو مومل کو کہاں رہ گئے ہیں یہ لوگ۔'' وہ اندر کے شور سے گھبرا کر بولا تھا۔

''ابھی میرا گیم بہت زبردست چل رہا ہے۔ کچھ دیر تک کرتی ہوں کال۔'' ابسام کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے۔ کتنی انجان تھی یہ لڑکی، جو اس کا منگیتر تھا اس کی جیسے پرواہ ہی نہ تھی۔ وہ تمام لڑکیوں کی طرح منگیتر کے منہ سے ستائشی جملے سننے کی چاہ جیسے دل میں رکھتی ہی نہ تھی۔ اس کی لاپرواہی پر گویا ابسام کو ایک سکون سا ملا تھا۔

''یہ بھی اچھی بات ہے کہ نوائم مجھ سے ہمارے رشتے سے کوئی امیدیں لگا کر نہیں بیٹھی۔'' ابسام نے اطمینان سے سوچا تھا۔ یہ اسے خیال نہیں گزرا تھا کہ ابھی کوئی امید نہیں لگائی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ آگے بھی کوئی امید نہیں لگائے گی؟ ابھی تو صرف منگنی ہوئی تھی ایسے میں امیدیں نہ لگانا ہی بہتر تھا مگر شادی کے بعد تو اس کی امیدوں کا پہلا و آخری مرکز وہی ہوگا۔

''یاہو!'' وہ خوشی سے لگاتے نعرہ پر سوچ سے باہر نکلا تھا۔ وہ گیم جیت جانے پر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ ابسام کو مومل کی کہی بات یاد آئی تھی کہ نوائم کے لئے چھوٹے بچوں کی طرح ہر چھوٹی جیت بے حد معنی رکھتی ہے مگر وہ یہ کہاں جانتی تھی کہ چھوٹی چھوٹی جیت پر خوش ہونے والی......زندگی میں بہت بڑی شکست سے دوچار ہونے والی ہے۔

''مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہارے لئے گیمز اتنے معنی رکھتے ہیں۔'' وہ جو خوش ہو رہی تھی ابسام کی آواز پر چونک اُٹھی تھی۔

''یہ جو کھیل ہوتے ہیں...... یہ انسان کو مضبوط بنا دیتے ہیں۔ ہر ہار آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے اور ہر جیت آپ کی محنت کا ثمر بن کر چمکتی ہے۔ آپ کو مزید آگے بڑھنے کو میدان مہیا کرتی ہے۔'' وہ مسکراتی نظروں سے بولی تھی۔ اسے نوائم کی اچھائی کا کچھ اور یقین ہو گیا تھا۔ وہ اسپورٹس میں ہمیشہ نمایاں کارکردگی دکھاتی رہی تھی اور یہ بات ابسام کے علم میں تھی۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اس کے ماموں عقیل احمد کو لڑکیوں کا آؤٹ ڈور گیمز میں حصہ لینا نہیں پسند اس لئے نوائم اپنے شوق کو محدود کر گئی تھی کہ وہ فطرتاً ایک فرمانبردار ٹائپ لڑکی تھی۔ اس نے مومل کو جلدی آجانے کا ٹیکسٹ کر دیا تھا۔ وہ دونوں اب اسپورٹس کو ڈسکس کرنے لگے تھے۔ ابسام پل پل حیران ہو رہا تھا کہ نوائم کا دنیا بھر کے کھیلوں اور کھلاڑیوں کے بارے میں معلومات کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ دو نفوس کی موجودگی میں پہلے جو خاموشی تھی وہ اب ٹوٹ گئی تھی۔ پہلے وقت رینگ رہا تھا اور اب تیزی سے گزرنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

''کہاں کی تیاری ہے۔'' وہ نک سک سا تیار لان تک پہنچا تھا جب باہر سے آتے آئیکت سے اس کا سامنا ہو گیا تھا۔

''امریکن ڈیلی گیشن سے میٹنگ ہے۔'' وہ رسٹ واچ پر ٹائم دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ گھڑی تین بجا رہی تھی۔ وہ بیماری کی وجہ سے آفس نہیں جا رہا تھا مگر اس کا پراجیکٹ وہ خود ہی گھر بیٹھے ہینڈل کر رہا تھا اور آج اسی سلسلے میں میٹنگ تھی۔ آئیکت نے اسے بیسٹ وشز دی تھیں اور وہ مسکراتا ہوا گاڑی کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میٹنگ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ چلی تھی۔ وہ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب تھا۔ تھکن مزید بڑھ گئی تھی۔

واپسی میں اسے عریم کا خیال آیا تھا جس طرح وہ اس کے ساتھ اپنا گھر چھوڑ آئی تھی وہ کل سے ایک ہی سوٹ میں تھی۔ ہاسپٹل بھی اسی ملگجے کپڑوں میں گئی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر عریم کے لئے خریداری کرنے آ گیا تھا۔ اسے خواتین کی پسند کا، خواتین کی شاپنگ کا بالکل بھی تجربہ و اندازہ نہ تھا۔ اس نے دس سوٹ مختلف رنگوں کے مختلف کام کے اور سادے سوٹ لئے تھے۔ اسے اس سب میں صرف پینتیس منٹ لگے تھے۔ اس نے گھڑی پر ٹائم دیکھا تھا۔ سوا پانچ بج رہے تھے۔ وہ مال سے نکلا تھا۔ اس کی نظر کافی شاپ پر پڑی تھی اس کا سر بے حد دکھ رہا تھا اور وہ کافی پینے کے خیال سے کافی شاپ میں چلا آیا تھا۔ اس وقت بہت زیادہ رش نہ تھا مگر پھر بھی کافی لوگ وہاں موجود تھے۔ ایک دو ٹیبلز پر کپلز بھی بیٹھے تھے۔ اسے یکدم یاد آیا تھا وہ عریم کے ساتھ پہلی دفعہ اس کافی شاپ میں ہی آیا تھا۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ وہ یہ سوچتے ہوئے سائیڈ کی ایک خالی ٹیبل پر آن بیٹھا تھا۔ اس نے کافی آرڈر کی تھی اور پل پل بدلتے حالات کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

''ہاں اب بولو۔ تمہیں مجھ سے ایسی بھی کیا ضروری بات کرنی تھی کہ نہ کال پر ہو سکتی تھی، نہ ہی گھر پر۔'' وہ مدھم نسوانی آواز پر چونک اٹھا تھا۔ اس کے ساتھ والی ٹیبل پر ایک خوبصورت سا کپل آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ سخت بدمزہ ہوا تھا کہ اسے خاموشی و تنہائی درکار تھی۔ وہ اٹھ کر ٹیبل چینج کرنے کا سوچ رہا تھا کہ ویٹر کافی لے آیا تھا اس نے بدمزگی کے باوجود ٹیبل چینج کرنے کا ارادہ موقوف کر دیا تھا۔ اس کی نظر ٹیبل پر اٹھی تھی۔ وہ دونوں اس رخ پر بیٹھے تھے کہ وہ انہیں مڑ کر ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے یہ غیر اخلاقی حرکت کرنا گوارا نہ کیا تھا اور کافی کے سپ لینے لگا تھا۔

''میں جانتا ہوں مومی کہ تمہیں ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا مگر میں جو تم سے ڈسکس کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے تنہائی نہیں راز داری شرط ہے۔ اس لئے میں نے اکیلے میں مل کر بات کرنے پر زور دیا۔'' عبیر کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔ مومل جو پہلے ہی تجسس کا شکار تھی مزید ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اس بات سے انجان تھے۔ انہوں نے غور نہیں کیا تھا کہ ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھے شخص تک ان کی آواز با آسانی تو نہیں مدھم سرگوشیوں میں ڈھل کر پہنچ ضرور رہی ہے۔

''ایسی بھی کیا بات......''

''میں جانتا ہوں مومل، تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔ ہماری منگنی سے تم خوش بھی نہیں ہو مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تم پر بہت بھروسہ ہے مجھے۔ اور اسی بھروسہ کی روشنی میں، میں تم سے اپنے پاپا کا ایک راز شیئر کر کے تمہاری مدد چاہتا ہوں۔'' وہ جو عبیر کی بات کے آغاز میں بری طرح بدمزہ ہوئی تھی کہ یہ سوچ کر کہ وہ اتنا تجسس پھیلا کر کیا وہی ہزار بار کی محبت کو دہرائے گا مگر بات کے اختتام تک تجسس ایک بار پھر جاگ اٹھا تھا۔

''میں تمہاری بات نہیں سمجھی۔'' وہ نافہم انداز میں سامنے بیٹھے عبیر عباسی کو دیکھ رہی تھی۔

''وہ تو میں تمہیں سمجھا دوں گا مومی، لیکن کیا میں یہ یقین رکھوں کہ میں تم پر بھروسہ کر کے کوئی غلطی نہیں کرنے جا رہا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے کہتا مومل کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔ مومل کو یکدم ہی بات غیر معمولی لگی تھی کہ اس نے آج سے پہلے عبیر کو اتنا سنجیدہ دیکھا ہی نہ تھا۔

''یہ تو تم بھی جانتے ہو عبیر کہ دھوکا دینا میری فطرت میں ہی شامل نہیں......اور مومل احمد بھروسہ کو قائم رکھنے کے لئے جان سے تو جا سکتی ہے، بھروسہ توڑ نہیں سکتی۔'' وہ اگر غیر معمولی سنجیدہ تھا تو وہ بھی اپنی ناپسندیدگی، تمام تر تلخیاں سب کچھ بھول کر بے حد سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اسے مومل سے ایسے ہی جذباتی قدرے کھرے جواب کی توقع تھی۔ وہ اتنی دیر میں پہلی بار مسکرا دیا تھا۔ ویٹر نے بھاپ اڑاتے کافی کے مگ لا کر رکھے تھے۔ ان دونوں کے درمیان ویٹر کی موجودگی تک خاموشی رہی تھی اس کے جاتے ہی عبیر نے کہنا شروع کیا تھا۔

''پاپا اپنی کلاس فیلو سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ انہیں آبشار آنٹی سے بے حد محبت تھی لیکن ان کی منگنی ہو گئی۔'' شاہ زیب کافی ختم کر چکا تھا اس لئے موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھائی تھی۔ وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوتا کہ وہ ''آبشار'' نام پر بے حد چونک اٹھا تھا۔ وہ نوجوان جو اس طرح بیٹھا تھا کہ ان دونوں کی پشت ایک دوسرے کی جانب تھی اور وہ بالکل شاہ زیب کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا وہ اس کی آواز لڑکی کے مقابلے میں زیادہ واضح وصاف سن پا رہا تھا۔ وہ جو نام سن کر چونکا تھا باقی تفصیل جیسے جیسے سن رہا تھا اس کے پیروں تلے سے زمین نکلتی جا رہی تھی۔ اسے کوئی شک نہیں رہا تھا کہ وہ ''آبشار'' کون ہے؟ کس ''آبشار'' کی بات ہو رہی ہے۔ وہ اپنی توجہ کے تمام ارتکاز اس ٹیبل پر لگا گیا تھا۔

''انکل اب اتنے سالوں بعد کیوں ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔'' عبیر نے تمام تفصیل کہنے کے بعد اپنے ارادے سے آگاہ کرتے ہوئے اس سے کیا مدد چاہیے کہتا چلا گیا تھا اور وہ اس کو درمیان میں ٹوک کرنا سمجھی سے بولی تھی۔ یہ سوال تو شاہ زیب کو بھی پریشان کر رہا تھا۔

''جن لوگوں سے محبت ہو اور وہ اگر قسمت ہم سے چھین لے تو محبت کچھ اور جڑ پکڑ لیتی ہے۔'' عبیر کا لہجہ بے حد مدھم تھا۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ تو تم بھی جانتے ہو عبیر کہ مجھے محبت اور محبت کی فلاسفی کبھی سمجھ نہیں آتی۔ اس لئے محبت کی زبان میں مجھ سے بات نہ کرو۔'' وہ اس کی آنکھوں سے نکلتی حدت سے گھبرا کر بظاہر چڑے ہوئے انداز میں بولی تھی۔ عبیر یکدم ہی ہنس دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کی حدت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

تجھے محبت کرنا نہیں آتا
مجھے محبت کے سوا کچھ نہیں آتا
زندگی گزارنے کے دو ہی طریقے ہیں محسن
ایک تجھے نہیں آتا ایک مجھے نہیں آتا

اس نے مومل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دلکشی سے شعر پڑھا تھا۔ اس کی یہ بے وقت کی راگنی آج مومل کو ہی نہیں، پچھلی سیٹ پر بیٹھے شاہ زیب کو بھی بری طرح کھلی تھی۔ اس کا موضوع سے ہٹنا اسے بے چین کر گیا تھا۔ اسے دھڑکا لگا تھا کہ کہیں وہ لوگ آدھی ادھوری باتوں کے بعد موضوع ہی نہ بدل دیں جبکہ جو کچھ شاہ زیب کے علم میں آ گیا تھا وہ پوری بات جاننا چاہتا تھا۔

''یہ محسن کون ہے؟'' اس نے ناگواری کے باوجود خود کو سوال کرنے سے روک پانے میں ناکام ہو کر پوچھ لیا تھا۔اتنی ٹینشن کے باوجود شاہ زیب کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔اسے وہ لڑکی شاعری سے یکدم نابلد لگی تھی اور یہ ایک حقیقت ہی تو تھی۔اسے اردو لٹریچر سے دس فیصد بھی لگاؤ نہ تھا۔عبیر کا دل چاہا تھا اپنا سر پیٹ لے۔

''تمہیں اتنی بڑی شاعری میں صرف لفظ محسن ہی سنائی دیا؟'' وہ اسے منہ بنا کر دیکھ رہی تھی۔

''اچھا تو تم مجھے شاعری سنا رہے تھے۔تم اتنے احمق لگتے تو نہیں ہو کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وقت مختصر ہے۔ابسام بھائی اور نوائم ہمارا انتظار کر رہے ہیں اور تم بے ہودہ شاعری کے چکروں میں وقت ضائع کرو'' وہ اب اس پر غصہ ہو رہی تھی۔

''بے ہودہ شاعری نہیں سنائی میں نے تمہیں۔میرا ٹیسٹ اتنا خراب نہیں ہے۔بس میری عقل پر اس وقت پتھر پڑ گئے تھے جب مجھے تم جیسی بد دماغ لڑکی سے محبت ہوئی تھی۔'' عبیر کے چڑے ہوئے انداز پر وہ بے ساختہ ہنس دی تھی اور وہ دل تھام گیا تھا کہ یہ لڑکی اسے بے حد عزیز تھی اور اس کی ہنسی اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی۔وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

''عقل پر پتھر کیوں دل پر پتھر بولو ناں۔میں نے سنا ہے کہ محبت تو دل سے ہوتی ہے۔'' مومل ہنسی کے درمیان شریر لہجہ میں بولی تھی۔

''ایک بار شادی تو ہو لینے دو گن گن کر بدلے نہ لئے تو کہنا۔'' وہ کچھ اس انداز میں بولی تھی کہ وہ خواہ مخواہ میں ہی شرمندہ ہو کر رہ گیا تھا اور خجالت مٹانے کو دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔

''تم گننے میں وقت ضائع کرنا۔میں اتنی دیر میں جو بدلے لینے ہوں گے با آسانی لے لوں گی۔'' وہاں اب کے بے نیازی عروج پر تھی۔عبیر کا منہ کھل گیا تھا۔

''کیوں مکھی کا قتل کرنے پر تل گئے ہو۔تمہارے بدبودار منہ میں گر کر وہ شہید ہو اس سے قبل ہی تم اپنا منہ بند کر لو۔'' مومل کی شرارت سے کہنے پر اس نے بے ساختگی میں دونوں لب باہم پیوست کر لئے تھے۔وہ یکدم ہی کھلکھلا دی تھی۔

''ہمیں موضوع کی طرف آ جانا چاہئے۔وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' وہ مومل کی بذلہ سنجی کو انجوائے کر رہا تھا مگر اس وقت وہ وقت ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ایک گہری سانس بھر کر بولا تھا اور وہ آنکھوں میں شرارت لئے مسکرا دی تھی۔دل جلانے والی،طنزیہ مسکراہٹ،عبیر نے فی الحال ضبط سے کام لیا تھا اور اس کے پھر موضوع پر آ جانے پر شاہ زیب نے سکھ کا سانس لیا تھا۔وہ جو تفصیل رہ گئی تھی وہ بھی بتا گیا اور اس کو کیا کرنا ہے کیسے اس کے ساتھ اور کزنی ہاؤس جا کر آبشار اور کزئی کے بارے میں جاننا ہے ان سے ملنا ہے وہ سارا پروگرام ترتیب دے گیا تھا۔مومل بہت سنجیدگی سے اسے سن رہی تھی۔شاہ زیب کے کان بھی ان کی ٹیبل پر ہی لگے تھے۔

''میں اب تک یہ سمجھ نہیں پا رہی کہ انکل آخر اتنے سالوں بعد آبشار آنٹی تک رسائی حاصل کیوں کرنا چاہتے ہیں؟'' وہ بات جو مذاق کی نذر ہو چکی تھی وہ بات اس نے پھر دہرائی تھی۔

''پاپا اس بھرم میں جیئے کہ ان کی محبت آبشار اور کزئی ایک خوشحال ازدواجی زندگی گزار رہی ہے اور اب انہیں پتہ لگا ہے کہ ان کی شادی ہی نہیں ہوئی تو یہ بات پاپا کی اذیتوں کو ہرا کر گئی ہے۔ وہ ایک بار اپنی محبت سے مل کر اس کا درد بانٹنا چاہتے ہیں۔ وہ وجوہات جاننا چاہتے ہیں کہ جن کے سبب وہ اپنی محبت کو آواز نہ دے سکیں۔ وہ اگر بے وفا تھیں زندگی میں آگے کیوں نہ بڑھ گئیں اور وفادار تھیں تو کیوں نہ ان کی محبت پر بھروسہ کر لیا۔ وفا کو جفا کا رنگ دے کر کیوں راہیں الگ کر لیں۔'' وہ باپ کے احساسات مومل کے گوش گزار کر رہا تھا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ انکل کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔'' وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا کہ مومل کے بول پڑنے کے سبب اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔

''سمندر میں ارتعاش تو ایک پتھر بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے لئے پورا پہاڑ گرانے کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی۔'' وہ غیر معمولی سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔

''برسوں بعد انکل کا ان کی زندگی میں داخل ہونا کوئی خوشگوار ہلچل نہیں لے کر آئے گا۔ ان کی زندگی پہلے کس طوفان سے گزری ہے یہ ہم نہیں جانتے۔ آگے کس طوفان کی نذر ہو گی ہم سوچ تو سکتے ہیں۔'' وہ نرم لہجہ میں غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ بولتی عبیر کو چونکا گئی تھی جبکہ شاہ زیب کو اس لڑکی سے اتنی سمجھداری کی توقع تو نہ تھی کہ وہ اس کے جملوں سے اسے ایک بے حد لاابالی، لاپرواہ سی لڑکی سمجھ بیٹھا تھا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔'' وہ بری طرح الجھ کر بولا تھا۔

''عبیر! مجھے نہیں لگتا کہ آنٹی نے گھر میں کسی کو انکل کے بارے میں بتایا ہو گا۔ اب وہ برسوں بعد ان تک پہنچیں گے تو کتنی ہی کہانیاں جنم لیں گی۔ اس لئے جو گزر گیا اسے بھول جانا ہی مناسب۔'' وہ اس کی توجہ اس طرف لے گئی تھی جس کا اس نے تو کیا کبیر عباسی نے بھی نہیں سوچا تھا۔

''تم کہتی تو ٹھیک ہو۔'' اس نے بمشکل چند لفظ کہے تھے۔ اسی وقت نوائم کا اس کے موبائل پر میسج آ گیا تھا۔

''تم انکل سے اس پہلو پر بھی بات کر لو، پھر جو تم لوگ چاہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' وہ نوائم کو پانچ منٹ تک آنے کا ٹیکسٹ کرتے ہوئے اسے دیکھ کر بولی تھی اور عبیر تو صرف ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' پر اٹک گیا تھا۔ اسے یکدم لگا تھا کہ مومل چاہے اس سے محبت نہیں کرتی مگر وہ ایک اچھا حساس دل رکھتی ہے اس لئے اس کے ساتھ زندگی اچھی گزرے گی۔ وہ دلکشی سے مطمئن سا مسکراتا اس کا شکریہ ادا کر گیا تھا۔ وہ ٹیبل پر سے موبائل اٹھا کر سنہری کلچ میں رکھتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کی تقلید میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ شاہ زیب کچھ سوچ کر ان دونوں کے پیچھے چل دیا تھا۔ اور عبیر جس وقت مومل کو ابسام کی گاڑی تک چھوڑ کر اپنی گاڑی تک آیا تھا شاہ زیب جو اس کے تعاقب میں تھا اس تک پہنچ گیا تھا۔

''ایکسکیوز می مسٹر عبیر۔'' گاڑی کا ڈور اوپن کرتا عبیر اپنے نام کی پکار پر چونک اٹھا تھا۔ سامنے ایک اجنبی چہرہ تھا۔

''آپ کون؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔'' وہ شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''معذرت خواہ ہوں کہ میں کافی شاپ میں آپ کی گفتگو سننے کی غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہو چکا ہوں۔'' شاہ زیب کی بات پر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

''ویسے غلطی میری نہیں، آپ نے ہی احتیاط کا دامن ملحوظ خاطر نہ رکھا۔ دائیں بائیں توجہ نہ دی اور شروع ہو گئے۔'' شاہ زیب کا ارادہ اگر اسے شرمندہ کرنے کا تھا تو وہ شرمندہ ہو چکا تھا۔ وہ یہ تک سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیسا ردعمل ظاہر کرے۔ کیا کہے؟

''دھیان تو مجھے واقعی رکھنا چاہیئے تھا مگر بعض اوقات ہم بہت محتاط بھی ہوں تو غیر احتیاطی ہو ہی جاتی ہے۔'' اس نے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا اس لیئے خود کو کمپوز کر کے بول ہی گیا تھا۔ شاہ زیب نے اسے دیکھا تھا وہ کافی خوش شکل اور وجیہہ نوجوان تھا۔

''چونکہ اب آپ سن چکے ہیں تو میں آپ سے درخواست ہی کر سکتا ہوں کہ آپ سنے کو ان سنا کر دیں۔'' وہ اس نو وارد کو اپنا معائنہ کرتے دیکھ کر گلا کھنکار کے بولا تھا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ میں سنے کو ان سنا نہیں کرنا چاہتا بلکہ جو کچھ سنا ہے اس میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں تو آپ کیا کہنا پسند کریں گے۔'' نہ جانے کیوں تمام تر تفصیل سننے کے بعد شاہ زیب بہت مطمئن تھا اور اسی اطمینان کے ساتھ وہ بول رہا تھا۔ عبیر بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''آپ، آپ کس طرح......مطلب......میں۔'' وہ بے ربط ہوا تھا۔

''میں شاہ زیب اور کزئی ہوں۔ آبشار اور کزئی کا بھتیجا۔'' اس نے اپنے سابقہ اطمینان کے ساتھ تعارف کرواتے ہوئے مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ عبیر کی تو حالت ہی عجیب ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی وحیرت کا عجب امتزاج روشنی بکھیر رہا تھا۔

''آپ سچ میں آبشار آنٹی کے بھتیجے ہیں۔'' وہ عالم بے یقینی میں متحیر سا کہتا اس کا ہاتھ تھام گیا تھا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی خاص وجہ نظر تو نہیں آ رہی مسٹر عبیر۔'' شاہ زیب دھیمے سے بولا تھا وہ یکدم ہی شرمندہ ہو گیا تھا۔

''میرا مطلب وہ نہیں تھا۔ بس میں یقین نہیں کر پا رہا۔'' عبیر کو خود کو نارمل کرنے میں بے حد وقت درکار تھا۔

''میں نے آپ کی باتیں سنی ہیں۔ آپ اور کزئی ہاؤس تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ جو بات وہاں جا کر آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ میں آپ کو بتا سکتا ہوں کیونکہ میں آپ کے ساتھ جو لڑکی تھی اس کی عقلمندی کا قائل ہو چکا ہوں۔'' شاہ زیب نے غیر معمولی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''وہ لڑکی ٹھیک کہہ رہی تھی کہ آپ کا یا آپ کے پاپا کا اور کزئی ہاؤس میں پہنچنا طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوگا اور میں انجانے میں جب آپ کی باتوں سے واقف ہو چکا ہوں تو اس کو غیبی مدد سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں تاکہ آپ کا بھی مسئلہ حل ہو جائے اور میری پھپھو کی زندگی بھی مزید انتشار کا شکار نہ ہو۔'' شاہ زیب کے انداز میں ایسا کچھ تھا کہ عبیر بے حد چونک گیا تھا۔ اس نے عبیر سے کہا تھا کہ یوں پارکنگ

میں کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں کہیں بیٹھ کر بات کرتے ہیں اور عبیر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ اس کے گھر چلے۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ سے جو بھی بات ہو وہ پاپا کے سامنے ہو۔'' عبیر اس مہربان سے شخص کو دیکھ رہا تھا۔ اسے وہ خوشی کی نوید محسوس ہو رہا تھا۔ شاہ زیب کو اس کا مشورہ نہایت مناسب لگا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایڈریس دے دے وہ اس کے گھر پہنچ جائے گا۔

''میں ڈنمارک سے پہلی بار پاکستان آیا ہوں۔ مجھے راستوں کی، ایڈریس کی زیادہ خبر نہیں ہے۔ آپ میرے ساتھ چلیئے کہ میں ویسے بھی مزید ٹائم برباد نہیں کرنا چاہتا۔ آپ جب تک نہ آئیں گے جان سولی پر لٹکی رہے گی اس لئے مناسب یہی رہے گا کہ میں اپنی گاڑی یہیں چھوڑ کر آپ کے ساتھ چلوں۔ بس آپ ابھی اسی وقت ہمارے گھر چلیں۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے میرے پاپا کس قدر مضطرب ہیں آپ سے مل کر انہیں ایک نئی زندگی مل جائے گی۔'' عبیر اب کے ذرا تفصیلی بات کہہ گیا تھا۔ جاننے کی جلدی تو اسے بھی تھی اسی لئے اس نے عبیر سے کہا تھا کہ وہ اپنی گاڑی اسٹارٹ کرے وہ اسے فالو کرے گا۔ یہ بات عبیر کو بھی بے حد مناسب لگی تھی۔

''آپ مجھے اپنا نمبر لکھوا دیں۔ کسی بھی قسم کی پریشانی کی صورت میں نمبر کام آئے گا۔'' عبیر اس کی بات کی حمایت کے بعد بولا تھا۔ شاہ زیب محض ایک نظر اس نوجوان کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔

''آپ کو لگتا ہے کہ میں کہیں بھاگ ہی نہ جاؤں۔ اگر مجھے آپ سے بات کر کے اپنا اور آپ کا مسئلہ حل کرنا ہی نہ ہوتا تو میں خود چل کر آتا ہی کیوں۔'' وہ موبائل نمبر بتاتے ہوئے بولا تھا۔

''آپ پر تو بس ایک لمحہ میں بھروسہ ہو گیا ہے مسٹر شاہ زیب، مگر میرے پاپا اس معاملہ میں خوش قسمت ثابت نہیں ہو پائے کبھی، اس لئے میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔'' عبیر نے گویا اپنے عمل کی وضاحت کی تھی اور وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہو گئے تھے۔ عبیر کی گاڑی کو وہ فالو کر رہا تھا۔ اس نے شاہ زیب کو جتنا ایڈریس یاد تھا احتیاطاً بتا بھی دیا تھا۔

''میں نہیں جانتا کہ میرا یہ قدم صحیح ہے کہ غلط۔ میں بس یہ جانتا ہوں کہ میں پھپھو کی زندگی میں کوئی طوفان نہیں چاہتا اس لئے میری کوشش ہو گی کہ کبیر عباسی ہمارے گھر تک نہ پہنچ سکیں۔'' وہ ڈرائیونگ کے دوران سوچ رہا تھا یہ جانے بغیر کہ اس کی سوچ کچھ ہی دیر میں بدل جائے گی۔ وہ کبیر عباسی کو اپنے گھر سے دور رکھنے کی سوچ بدل کر انہیں اپنے گھر تک، اپنی پھپھو سے ملوانے کو خود لے کر آئے گا۔

''پاپا کتنے خوش ہو جائیں گے۔ بس اللہ کرے کہ یہ شاہ زیب ایسی کوئی خبر نہ دے جو پاپا کے دکھ کا باعث بنے۔ یا اللہ! میرے پاپا نے بہت مشکل زندگی بسر کی ہے تو اپنی رحمت سے ان کی ساری مشکلات کو دور فرما دے۔ آگے آسانیاں عطا فرما۔ آمین۔'' وہ سوچتے ہوئے دل میں اپنے پاپا کو مخاطب کرتے ہوئے مناجات کرنے لگا تھا۔ یہ غیبی مدد اسے یقین تھا کہ یقیناً خیر لے کر آئے گی۔ اس نے اپنے باپ کے نمبر پر ٹیکسٹ کر دیا تھا کہ وہ ان سے ملوانے کو کسی کو لے کر آ رہا ہے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا بیٹا ان کی زندگی لے کر آ رہا ہے۔

☆......☆......☆

''تم بتاتی کیوں نہیں ہو، عبیر سے تمہاری کیا بات ہوئی؟''نوائم کو جاننے کی جلدی تھی اور وہ یہ بات اچھے سے جانتی تھی اس لئے جان کر وہ اس وقت کچن میں گھس گئی تھی تا کہ وہ نوائم سے بچ سکے مگر یہ کب تک ممکن تھا۔اس سے رہا ہی نہیں گیا تھا اور وہ کچن میں ہی مومل کے سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔نوائم کے استفسار پر وہ خود کو مصروف ظاہر کرتی ٹالتی رہی تھی اور وہ ناگواری سے چڑ کر بولتی مومل کو گھورنے لگی تھی۔

''تمہاری ابسام بھائی سے کیا بات ہوئی؟'' وہ کچن سے نکلی تھی اور اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔نوائم اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی اور وہ نوائم کو دیکھ کر پوچھ گئی تھی۔

''میری تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔'' وہ لاپرواہی سے بولی تھی۔

''تم راز رکھنا چاہتی ہو، پرائیویسی کنسرن ہے جو مجھ سے شیئر نہیں کر سکتیں۔''مومل میں اگلے کو زچ کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔

''میں نے ابسام سے ایسی کوئی رومانوی گفتگو نہیں کی کہ مجھے سنسر کرنا پڑے۔'' وہ چڑ کر نہایت ناگواری سے کہتی مومل کے پوچھنے پر کچھ کہنے سے قبل تمام تفصیل بتا گئی تھی۔

''ابسام نے مجھ سے پوچھا کہ میں رشتہ سے خوش ہوں، میں نے کہہ دیا بڑوں کے فیصلہ سے مطمئن ہوں۔اس کے بعد میں گیم کھیلنے لگی تھی۔میچ کے دوران بات چینج ہوگئی تھی تب ہمارے درمیان اسپورٹس زیرِ بحث آ گیا تھا۔''نوائم کی غیر معمولی سنجیدگی عروج پر تھی۔مومل کا دل چاہا تھا کہ اپنا سر پیٹ لے۔

''تم نے اتنا اچھا چانس مس کر دیا۔تم پاگل ہو نوائم۔''مومل اسے گھورتے ہوئے بولی تھی۔

''کون سا چانس؟''نوائم حیران تھی۔

''ایڈیٹ! تم اور ابسام بھائی فسٹ ٹائم اکیلے تھے۔تم ان سے اظہارِ محبت کر دیتیں۔''مومل اسے گھور رہی تھی۔

''میرا اتنا دماغ خراب نہیں تھا اور تم موضوع میری طرف موڑ کر میرے سوالوں سے بچ نہیں سکتیں اس لئے شرافت سے بتاؤ کہ عبیر تم سے کیا بات کرنا چاہتا تھا۔کیا بات ہوئی۔''نوائم کی بات پر وہ ایک گہری سانس کھینچ کر رہ گئی تھی۔

''یہ تو تمہیں پتہ ہے ناں کہ میری عبیر سے خاموشی سے اچانک منگنی اس لئے ہوئی تھی کہ انکل واپس ڈنمارک جا رہے تھے۔'' وہ مومل کی بات پر اثبات میں سر ہلا گئی تھی۔

''انکل تو اب تک ڈنمارک چلے بھی گئے ہوتے مگر عبیر نے پہلے انکل کی بات مان لی مگر بعد میں اس نے ڈنمارک جانے سے منع کر دیا۔'' وہ اصل بات بتا نہیں سکتی تھی اس لئے کچھ سچ و کچھ جھوٹ کو ملا کر بنائی کہانی اس کے گوش گزار کرتی جا رہی تھی۔

''لیکن کیوں......؟''

''انکل کو لگتا ہے کہ ان کے والدین نہیں رہے تو پاکستان میں ان کے لئے کچھ نہیں بچا۔انہوں نے اپنے والدین کی قبور کی زیارت کر

لی۔اب واپس ڈنمارک چلے جانا چاہئے مگر عبیر کی مرضی یہیں پاکستان میں رہنے کی ہے۔اس نے مجھ سے یہی بات کرنی تھی۔'' وہ نوائم کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''پھر تم نے کیا کہا......؟''

''میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اسے جو فیصلہ کرنا ہے کر لے۔ مجھے ڈنمارک میں رہنے یا پاکستان میں رہنے کہیں بھی رہنے پر اعتراض نہ ہوگا۔'' مومل کی بات پر وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

''تم نے سچ میں عبیر سے ایسے کہا۔''اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ہاں! اور مجھے لگتا ہے وہ عبیر اتنا برا نہیں ہے۔ جتنا مجھے لگتا تھا...... یا میں سمجھتی تھی۔'' نوائم کی تو بے یقینی کے مارے حالت مرنے والوں جیسی ہو رہی تھی۔

''ایک ملاقات نے تمہاری سوچ کو ہی بدل ڈالا۔امیزنگ۔''

''میری سوچ اب بھی وہی ہے نوائم! مگر جو شخص اپنے باپ کے لئے اپنا کیرئیر داؤ پر لگا سکتا ہے،اس کے خلوص پر مجھے کم از کم کوئی شک نہیں ہے۔آج میں بھی کہتی ہوں کہ عبیر میرے لئے بیسٹ چوائس ہے۔'' مومل کی یہ مجبوری تھی کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتی تھی۔ وہ ایک سچی، صاف گو لڑکی تھی جو بات جس وقت محسوس ہوتی تھی صاف کہہ جاتی تھی۔اسے عبیر کے باپ کے لئے محبت بھرے احساسات نے بے حد متاثر کیا تھا۔نوائم نے آگے بڑھ کر مومل کو گلے سے لگا لیا تھا۔

''میں تمہارے لئے بے تحاشہ خوش ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ آج تمہیں عبیر کا باپ کے لئے جذبۂ محبت و ایثار محسوس ہوا ہے تو وہ دن دور نہیں کہ تم اس کے اپنے لئے جذبات کو بھی محسوس کرنے لگو گی۔'' مومل اس کے والہانہ انداز پر کچھ بولے بناء محض مسکرا دی تھی کہ وہ فی الحال نوائم سے یہ کہنا نہیں چاہتی تھی کہ وہ آج عبیر کی آنکھوں میں محبت محسوس کر آئی ہے اور شاید اس کی آنکھوں میں اپنی صورت دیکھ، اپنے لئے بے پناہ چاہت واحترام دیکھ کر وہ اپنا دل اسے دے آئی ہے۔وہ شخص آج اس کو اپنی بے لوث چاہت سے جیت چکا ہے۔

''بدلے بدلے سے سرکار نظر آتے ہیں۔'' وہ مومل کو مسکراتے دیکھ کر کچھ شوخ ہوئی تھی۔

''نوائم! تم بکواس بند کر لو۔'' وہ اس کی معنی خیز نگاہوں سے بری طرح جھینپ گئی تھی۔نوائم اس کو نظر چراتے دیکھ کر ہنس دی تھی۔

''کہیں تمہیں عبیر سے محبت تو نہیں ہو گئی؟''اس نے شرارت سے آنکھیں گھمائی تھیں۔

''وہ کہیں کا شہزادہ گلفام نہیں ہے کہ مجھے ایک ہی ملاقات میں اس سے محبت ہو جائے۔'' وہ خود کو سنبھال کر اپنے مخصوص بے نیاز قدرے ترش لہجہ میں بولی تھی۔

''مگر ایک ملاقات کافی اثر کر گئی ہے۔دو چار ملاقاتیں ہوں گی تو تم گاتی نظر آؤ گی۔ یہ دل آپ کا ہوا۔''نوائم اسے مستقل چھیڑ رہی تھی۔

''تم اپنی بکواس بند کرلو، اچھا! میں عبیر سے کوئی رومانس بھگارنے نہیں گئی تھی۔ خود سے تو اتنا نہ ہوا کہ ابسام بھائی سے اپنے رشتے کے حوالے سے بات ہی کرلیتیں۔ محترمہ، اکلوتے فیانسی کی موجودگی میں بھی بیٹھیں گیم کھیل رہی تھیں۔ دوسروں کو نصیحت خود میاں فصیحت ......'' وہ نوائم کو پھیلتے دیکھ کر اس پر چڑھ دوڑی تھی۔ نوائم اب برے برے منہ بنانے لگی تھی۔

''میں ان سے کیا بات کرتی سمجھ ہی نہیں آیا، اس لئے گیم لگا لیا تھا۔'' وہ خجالت مٹانے کو بولی تھی۔

''میں تمہارے موبائل سے سارے گیمز ڈیلیٹ کردوں گی۔'' مومل تپ کر بولی تھی اور وہاں سے نکل گئی تھی۔

''میں کرنے دوں گی تب ناں۔'' نوائم بڑبڑاتے ہوئے اس کے پیچھے لپکی تھی۔

☆......☆......☆

''پاپا۔ ان سے ملیے، یہ شاہ زیب اورکزئی ہیں۔'' وہ ایک اجنبی کی آمد کے منتظر تھے۔ وہ اس نوجوان کو دیکھ کر چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجائے اس کی طرف بڑھے تھے اور مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا تھا کہ ان کے بیٹے کی آواز کمرے میں ہی نہیں ان کی روح میں بھی گونج اٹھی تھی۔ ان کا ہاتھ میکانکی انداز میں نیچے گرتا چلا گیا تھا۔ وہ بے یقین نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کا ''سرنیم'' سن کر یہ حالت تھی آگے ان کی جانے کیا حالت ہونے والی تھی۔ شاہ زیب انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ لانبے قد کے کافی وجیہہ الشکل انسان تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ اپنی جوانی میں کافی ہینڈسم رہے ہوں گے کہ ان کی مردانہ وجاہت تو آج بھی آشکارا تھی۔ کنپٹی کے پاس سے سفید بال ان کے بڑھاپے کی نہیں ان کی چارمنگ پرسنالیٹی میں اضافہ کا سبب تھے۔ عبیر نے مختصراً باپ کو ساری بات بتائی تھی۔ وہ یہ تو پہلے سے ہی جانتے تھے کہ وہ مومل سے ساری پرابلم ڈسکس کرنے گیا ہے مگر اب یہ جان کر کہ کسی نے ان دونوں کی باتیں سن لی تھیں اور وہ کسی اور نہیں آبشار کا بھتیجا تھا اور بات کرنے کے لئے ان کے سامنے موجود تھا۔ شاہ زیب نام ان کے لیے اتنا بھی اجنبی نہ تھا کہ اکثر آبشار اپنے بھتیجے زیب کا بہت زیادہ، بہت محبت سے ذکر کرتی تھی۔ وہ شاہ زیب جو پھپھو کی آنکھ کا تارا تھا آج کبیر عباسی کے سامنے تھا اور وہ اسے اتفاق سمجھتے کہ خدا کی طرف سے غیبی مدد......وہ بے حد بے یقین تھے۔

''میں نے آپ کو صرف اس لئے زحمت دی ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ آپ پھپھو کے بارے میں جاننے کی چاہ میں ہمارے گھر تک آئیں۔'' عبیر کے خاموش ہوتے ہی تکلیف دہ سرسراتی ہوئی خاموشی ان تینوں کے درمیان ٹھہر گئی تھی جسے شاہ زیب کی آواز نے فنا کر ڈالا تھا۔ کبیر عباسی سے زیادہ تو وہ چونک اٹھا تھا۔ اسے اندازہ ہوتا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے تو وہ اسے ہرگز بھی باپ سے ملوانے کے لئے نہ لاتا۔

''پھپھو کی زندگی پہلے ہی کئی طوفانوں سے گزر چکی ہے، نیا کوئی امتحان وہ جھیل نہیں پائیں گی۔ میں آپ کے جذبۂ محبت کی قدر کرتا ہوں مگر میں بہت مجبور ہوں اس لئے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں کہ آپ پھپھو کو بھول جائیں۔'' شاہ زیب نے صرف کہا ہی نہیں تھا باقاعدہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''لاعلمی تھی جب تک تب تک سکون تھا۔ دل کو بہلانے کے ہزار حیلے بہانے تھے۔ آگاہی ملی تو بے سکونی ہے۔ آدھی ادھوری سچائی...... وفا تھی کہ جفا، مجھے بے چین رکھے ہوئے ہے۔ دل کسی طور بہلتا ہی نہیں ہے۔'' ان کے انداز میں بے بسی و دکھ کی آمیزش تھی۔ شاہ زیب کے لب بھنچ گئے تھے۔ اس نے جڑے ہاتھوں کو کھول کر نیچے کر لیا تھا۔ خاموشی پھیل گئی تھی۔

آنکھ روتی نہیں کسی غم سے
دل بھی اکتا گیا ہے ماتم سے
روز جلتا ہوں اک جہنم میں
آج نکلوں گا اس جہنم سے

''محبت میں اگر احترام کا قائل نہ ہوتا تو آبشار کی زندگی میں برسوں قبل طوفان آتا۔ میں تو اسی لئے ملک بدر ہو گیا کہ آبشار کی زندگی کسی طوفان کی نذر نہ ہو۔ جب برسوں قبل محبت کے احترام میں چپ چاپ ہجر کو گلے لگا گیا تھا تو تم کیسے سوچ سکتے ہو کہ میں ایسی کوئی کوشش کروں گا جو آبشار کی زندگی میں طوفان لانے کا سبب بنے گی۔'' کبیر عباسی کا انداز بہت تھکا تھکا سا تھا۔

''پھپھو کی زندگی اسی لئے طوفان کا شکار نہ ہوئی تھی کہ آپ بناء کسی کوشش کے محبت کے احترام میں وصل کی تمنا فراموش کر گئے تھے۔ اب آپ کی ایک کوشش طوفان کا سبب بنے گی۔'' شاہ زیب کا انداز بہت دھیما تھا۔

''کوشش کا جب وقت تھا تب ہی نہ کی اب کیا کروں گا۔ میں تو بس آبشار کے دکھ جاننا چاہتا ہوں۔'' کبیر عباسی کی تھکن اضافہ سمیٹ لائی تھی۔

''جس دکھ کا مداوا ممکن نہ ہو اس تک رسائی حاصل کرنے کی آرزو انسان کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ راکھ سے صرف ہاتھ کالے ہوتے ہیں، روشنی کی کرن جنم نہیں لیتی۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''دکھ کا مداوا محض عمل سے تو نہیں دعا سے بھی کیا جاتا ہے مسٹر شاہ زیب۔'' شاہ زیب رک کر عبیر کو دیکھنے لگا تھا۔

''اور دعا کی روشنی میسر آجائے اس سے بڑھ کر کیا خوش نصیبی ہوگی۔'' وہ شاہ زیب کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''کچھ لوگ اتنے بد قسمت ہوتے ہیں کہ دعائیں رائیگاں چلی جاتی ہیں۔'' شاہ زیب کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگی تھیں۔

''دعائیں بھی ان کے نصیب کی سیاہی کو کم کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں۔'' وہ دونوں باپ بیٹے شاہ زیب کی آنکھوں میں بڑھتی سرخی کو دیکھ رہے تھے۔

''تم مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہو شاہ زیب۔'' وہ بیٹے کے بالکل ساتھ شاہ زیب کے عین سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اس ڈیسینٹ آدمی کو دیکھنے لگا تھا اس کا دل کہتا تھا کہ یہ شخص بھروسہ کے لائق ہے مگر وہ حالات کا ستایا ہوا تھا اور حقیقت اس قدر تلخ و اذیت ناک

تھی کہ لب سے آزاد نہ ہوتی تھی اور وہ کیسے ایک انجان، اجنبی شخص کے سامنے ساری حقیقتیں کھول دیتا۔

''میرا تم سے وعدہ ہے تم جو کچھ مجھے بتاؤ گے میرے لب سے آزاد نہ ہوگا۔ آبشار کی عزت میرے لئے میری حرمت و غیرت سے زیادہ معنی رکھتی ہے۔'' شاہ زیب انہیں دیکھنے لگا تھا جن کے لب سے نکلے ہر لفظ کی گواہی ان کی سرخ نم آنکھیں دے رہی تھیں۔ شاہ زیب کا دل خود محبت کا مسافر تھا اسے محبت کا ہر رنگ ان کی آنکھوں میں یوں محسوس ہوا تھا کہ وہ ان پر بھروسہ کرنے کا فیصلہ کر گیا تھا۔ شاہ زیب نے ماضی کی ہر تلخ حقیقت ان کے سامنے عیاں کر دی تھی۔ وہ ساکت رہ گئے تھے۔ ان کے وجود پر اشتعال و بے بسی سے لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

''آبشار کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا، میں انجان اپنی زندگی میں مگن رہا۔'' کبیر عباسی کے لب کانپے تھے۔ ان کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''جو انجان نہ تھے انہوں نے کون سا کچھ کر لیا تھا، جو آپ انجان رہ کر نہ کر پائے۔ ہم تو اذیتوں میں گھرے رہے۔ یہ بات منہ سے کہتے مر سے جاتے ہیں۔'' شاہ زیب کی آنکھیں بے حد سرخ ہو گئی تھیں۔ عبیر ایسے بیٹھا تھا جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔ اس کے بھی تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ ادھوری باتیں جب تکمیل کے مرحلے کو پار کریں گی تو اس قدر گھناؤنی حقیقت ان پر آشکارا ہو گی۔

''جس لڑکی کے سر سے آنچل نہیں اترتا تھا، اس بے رحم شخص نے میرا نام لے کر اس کے کاندھے سے عزت کی ردا اتار دی۔'' وہ کرب سے سوچ رہے تھے۔ ان کے لب بری طرح کپکپا رہے تھے۔ رنگت بے حد سپید پڑتی جا رہی تھی۔

''خدا کے لئے کبیر! چلے جائیں میری زندگی سے ورنہ میری عزت خاک میں مل جائے گی۔ میں بابا اور بھائیوں کے سامنے ہمیشہ سر اٹھا کر جینا چاہتی ہوں۔ مجھ سے محبت ہے تو میری عزت رہنے دیں۔ ہمیں وصل راس نہیں آسکتا۔ ہجر ہمارا نصیب بن چکا ہے۔'' ان کے کانوں میں آبشار اور کرنی کی نمناک آواز گونج اٹھی تھی۔ آنکھوں سے ایک تواتر سے آنسو گر رہے تھے۔

''وہ شخص اتنا ظالم کیسے ہو سکتا ہے۔'' کرب سے انہوں نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔ عبیر کو ان کا سپید پڑتا چہرہ خوفزدہ کرنے لگا تھا۔

''پاپا!'' وہ بمشکل صوفہ سے اٹھ کر باپ کے ساتھ ڈبل صوفے پر ان کے برابر آن بیٹھا تھا اور ان کا ہاتھ تھام کر پکارا تھا۔

''پاپا، خود کو سنبھالیں۔'' اس نے باپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ انہوں نے بیٹے کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا تھا۔

''چپ کر جاؤ، ابھی کبیر عباسی اتنا کمزور نہیں پڑا کہ اسے تمہارے یا کسی کے بھی سہارے کی ضرورت پڑے۔'' وہ چیخ اٹھے تھے۔ عبیر نے لب بھینچ لئے تھے اس کی آنکھوں کی سرخی قدرے بڑھ گئی تھی۔ شاہ زیب کو اپنا آپ مجرم لگنے لگا تھا۔ وہ صوفہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ کچھ بولنے کے لئے ہمت مجتمع ہی کر رہا تھا کہ کمرے کی خاموش فضا میں کبیر عباسی کا بے حد سنجیدہ و مربوط لہجہ گونج اٹھا تھا۔

''میں آبشار سے ملنا چاہتا ہوں۔'' وہ شاہ زیب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے تھے۔

''ساری حقیقت آپ کے گوش گزار کر دی ہے۔ اب بھی آپ ایسا چاہتے ہیں تو مجھے حیرت بھی نہیں ہو رہی بس افسوس ہو رہا ہے کہ مجھے آپ سے اتنی کم عقلی کی امید نہ تھی۔'' وہ ایک سرد سانس خارج کرتے ہوئے بولا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر شاہ زیب کا بازو دبوچ لیا تھا۔

''تمہیں میرا فیصلہ کم عقلی لگتا ہے تو اس میں ردو بدل کرلو۔ میں آبشار کے سر پرستوں سے ملنا چاہتا ہوں۔'' وہ اب کافی کمپوز لگ رہے تھے۔شاہ زیب کی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

''میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔''اس کا بازو اب تک ان کی مضبوط گرفت میں تھا۔

''میں آبشار سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' کوئی بم تھا جو ان دونوں کی سماعتوں پر پھٹا تھا۔

''یہ......یہ......آپ......آپ......کیا کہہ رہے ہیں۔''شاہ زیب بے ربط ہوا تھا۔وہ حیرانگی سے باپ کے پر سکون چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

''میں نے آبشار کو بے حد و بے حساب چاہا ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے چاہت سے زیادہ کچھ ہے تو وہ ہے اس کے لئے احترام۔'' وہ ساکت کھڑے شاہ زیب کا بازو آزاد کر گئے تھے۔

''میں نے صرف اس کے مان و احترام میں ہجر قبول کیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ لڑکی جو سر اٹھا کر چلنا چاہتی تھی وہ کسی سے نظر ملانے کے بھی قابل نہیں رہی۔مگر میں جب تک انجان تھا،اس نے اذیت جھیل لی مگر اب میں اس کو زمانے کی نگاہ میں سرخرو کروں گا۔آبشار اور کرنزئی جو کھو چکی ہے وہ تو میں اسے واپس نہیں دلا سکتا لیکن اب وہ آگے زندگی کا باقی ماندہ سفر سر اٹھا کر طے کرے گی۔'' وہ ایک عزم سے بول رہے تھے۔

''آپ جذباتی ہو رہے ہیں کبیر صاحب۔آپ کی فیملی ہے آپ کیوں اپنے لئے مشکلات خرید رہے ہیں۔ جو بیت گیا ویسے ہی مزید زندگی بھی گزر جائے گی۔'' شاہ زیب ان سے بے حد متاثر ہوا تھا مگر تلخ حقیقت اسے فراموش نہ ہوئی تھی اس لئے وہ تھکے ہوئے انداز میں کہہ گیا تھا۔

''پاپا کی فیملی میں ہوں اور میں پاپا کے فیصلے میں ان کے ساتھ ہوں۔'' عبیر عباسی باپ کے ساتھ آن کھڑا ہوا تھا۔انہوں نے بہت مطمئن انداز میں بیٹے کی طرف دیکھا تھا اور وہ مسکرا دیا تھا۔

''میرے پاپا نے آدھی عمر آبشار آنٹی کے ہجر میں جلتے گزار دی۔ اگر قسمت ان پر مہربان ہونا چاہے تو میں رخنہ ڈالنے کا سبب نہیں بنوں گا۔میرے لئے میرے پاپا کی خوشی معنی رکھتی ہے۔'' عبیر نے بہت محبت سے اپنے باپ کو دیکھتے ہوئے گم صم کھڑے شاہ زیب پر ایک نظر ڈالی تھی۔

''تم اپنے گھر میں بات کرو کسی کو اعتراض نہ ہو تو میں کل ہی سادگی سے نکاح کے لئے تیار ہوں۔'' شاہ زیب انہیں سمجھا رہا تھا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے مگر وہ اس کی سن لینے کے بعد بہت دھیمے لہجے میں بولے تھے۔

''کبیر صاحب، یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔'' اب وہ جھنجلا کر بولا تھا۔

''زندگی کی خوشیوں پر آبشار کا بھی حق ہے۔کیا تم اپنی پھپھو کو خوش نہیں دیکھنا چاہتے۔کیا ان کی خوشیوں کے لئے تھوڑی سی اسٹرگل

نہیں کر سکتے۔'' وہ مضطرب کھڑے شاہ زیب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''پھپھو کے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ان کو سسک سسک کر زندگی گزارتے دیکھ کر ہم سب نے کیسی بے رنگ زندگی گزاری ہے آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ برسوں گزر گئے اور کرزئی ہاؤس میں بے فکرے خوشی سے بھرپور قہقہے نہیں بکھرے، ہر ہنسی میں پھپھو کا دکھ سسک رہا ہوتا ہے۔ دادا، دادی پھپھو کے غم میں چل بسے، ان کی موت کا دکھ برداشت ہو گیا کہ ایک بار قبر میں اتار دینا تکلیف دہ ہوتا ہے لیکن روز قبر میں اترتے دیکھنا زندہ درگور ہوتے دیکھنا اذیت ناک ہوتا ہے۔تکلیف جیسے تیسے برداشت ہو ہی جاتی ہے لیکن اذیت تو روح میں اتر جاتی ہے۔جس سے چھٹکارا ممکن ہی نہیں ہوتا۔'' شاہ زیب کا لہجہ بھیگا ہوا تھا۔آنکھوں میں سرخی کے ڈورے، وہ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ گئے تھے۔

''جس لڑکی کو میں نے بے حد چاہا، اس کے بارے میں یہ سنا کہ......وہ بے آبرو کر دی گئی، میرے لئے مرنے کا مقام ہے شاہ زیب، مگر جس حوصلہ سے میں کام لے رہا ہوں میں جانتا ہوں یا میرا اللہ! بس تم ایک بار میری آبشار سے ملاقات کروا دو۔ میں اس کی گزر گئی زندگی کے کانٹے چن نہیں سکتا مگر آگے کی زندگی کو گلزار بنانے کی ایک کوشش تو کر سکتا ہوں۔ میں مانتا ہوں کہ وقت بے رحمی سے سزا دیتا گزر گیا ہے مگر کچھ پل جو بچے ہیں ان سے تو خوشیاں کشید کی جا سکتی ہیں۔یقین جانو شاہ زیب، آبشار کے ساتھ گھر بنانے کی بڑی آرزو تھی۔ زندگی کے آخری موڑ پر یہ آرزو پوری ہو سکتی ہے تو میں ایک کوشش پھر کر لینا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کے کاندھے سے ہاتھ ہٹا گئے تھے۔شاہ زیب کا دل نرم پڑ گیا تھا اسے کبیر عباسی کا فیصلہ درست لگ رہا تھا۔اس نے آنکھیں رگڑتے ہوئے مسکرا کر انہیں دیکھا تھا۔

''مجھے لگتا ہے پھپھو شادی کے لئے راضی نہ ہوں گی، اس لئے میں گھر میں آپ کا ذکر فی الحال نہیں کرنا چاہتا۔ میں پھپھو کو اپنے اپارٹمنٹ پر لے جا کر آپ کو اطلاع کروں گا آپ وہاں آکر پھپھو سے بات کر لیجئے گا۔اگر پھپھو شادی کے لئے راضی ہو گئیں تو باقی سب کو راضی کرنا میرا کام ہو گا۔'' شاہ زیب نے کچھ سوچ کر ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔ان دونوں کو شاہ زیب کی منصوبہ بندی بے حد مناسب لگی تھی۔شاہ زیب نے عبیر سے کہا تھا کہ وہ اسے کاغذ قلم لا دے۔عبیر نے چند منٹوں میں اسے اس کی مطلوبہ چیزیں پکڑا دی تھیں اس نے اپنے اپارٹمنٹ کا ایڈریس لکھ دیا تھا۔

''کب تک تم آبشار کو لا سکو گے؟'' وہ بے قراری سے بولے تھے۔

''میں بھی اب وقت ضائع کرنے کے حق میں بالکل نہیں ہوں۔اس لئے میری کوشش ہو گی کہ یہ کام کل ہی انجام پا جائے۔'' شاہ زیب نے ان کی بے قراری کو محسوس کرتے ہوئے نہایت دھیمے انداز میں کہا تھا اور ان دونوں سے باری باری مصافحہ کرتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ عبیر اسے باہر تک چھوڑنے گیا تھا اور وہ تھکے ہوئے انداز میں صوفے پر گر سے گئے تھے۔

''مجھے ایک بار آواز تو دیتیں آبشار۔'' ان کے دل سے ہوک اٹھی تھی۔

سیاہ رات میں جلتے ہیں جگنو کی طرح
دلوں کے زخم بھی محسن کمال ہوتے ہیں

''تمہیں یقین ہے آبشار کہ تمہیں میرا ہجر راس آجائے گا۔'' جس پل آبشار نے راہ بدلنے کا فیصلہ سنا کر درخواست کی تھی کہ وہ اس کی زندگی سے چلے جائیں تب آنکھوں میں ضبط کی سرخی لئے انہوں نے آبشار سے سوال کیا تھا۔

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

''مجھے نہیں پتہ کبیر کہ میں زندہ بھی رہوں گی کہ نہیں۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ مجھے اماں کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ اماں چاہتی ہیں کہ میں محبت چھوڑ دوں تو بس وہی کر رہی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ محبت چھوڑ سکتی ہوں مگر محبت کرنا نہیں چھوڑ سکتی۔ ہجر راس نہ بھی آئے، زندگی تو گزر ہی جائے گی۔ میں نے یہ فیصلہ کانٹوں پر چل کر لیا ہے۔ آپ میری مجبوری کو سمجھیں مجھے کمزور نہ کریں۔'' سر صوفہ کی پشت سے لگا تھا۔ آنکھیں بند تھیں، بند پلکوں کے پیچھے ماضی جھانک رہا تھا۔ آبشار کی آواز یوں سماعتوں میں اتر رہی تھی جیسے برسوں پرانی بات نہ ہو وہ سامنے ہی بیٹھی ہو۔

''اگر کبھی میری ضرورت پڑی تو کیا مجھے آواز دو گی آبشار۔ کبھی لگا کہ ہجر کی راتیں نہیں کاٹ سکو گی تو کیا آواز دو گی مجھے۔ کبھی لگا کہ ہجر کے دن تمہیں عفریت کی مانند نگل لیں گے تو کیا آواز دو گی مجھے۔'' کبیر عباسی نے آبشار کی نمناک آنکھوں میں جھانک کر پوچھا تھا اور وہ نفی میں گردن ہلاتی نظریں ہی چرا گئی تھی۔ کتنا صاف واضح انکار تھا مگر وہ اس کے متورم چہرے کو چند ثانیے دیکھتا کچھ کہہ نہ پانے کی الجھن میں گرفتار آنسو بہاتا، نظریں جھکا کر خاموشی کو محسوس کرتا...... سبز گھاس پر نگاہ جمائے آبشار کی دھڑکنوں کو محسوس کرتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے ایک نظم اس کے گوش گزار کرتا چلا گیا تھا۔

جب کانچ اٹھانے پڑ جائیں
تم ہاتھ ہمارے لے جانا
جب سمجھو کہ کوئی ساتھ نہیں
تم ساتھ ہمارا لے جانا
جب دیکھو کہ تم تنہا ہو

اور راستے ہیں دشوار بہت

تب ہم کو اپنا کہہ دینا

بے باک سہارا لے جانا

جو بازی بھی تم جیتو گے

جو منزل بھی تم پاؤ گے

ہم پاس تمہارے ہوں نہ ہوں

احساس ہمارا لے جانا

اگر یاد ہماری آ جائے

تم پاس ہمارے آ جانا

بس اک مسکان ہمیں دینا

پھر جان بھی چاہے لے جانا

وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بلک اٹھی تھی۔

''کبیر! میں آپ کو آج ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہی ہوں۔ راستہ بدل رہی ہوں۔ گھر کے سپنے آپ کے ساتھ مل کر سجائے مگر میری محبت کا گھروندہ آج ٹوٹ گیا ہے۔ میں مجبوریوں کے رشتے بنانے جا رہی ہوں۔ میری زندگی میں سکھ آئے کہ دکھ...... آج ہمارے راستے الگ ہو گئے ہیں۔ میں آپ کو آواز نہ دوں گی۔ مجھے زندگی کا آگے سفر تنہا، محبت کے بغیر طے کرنا ہے۔ اس لئے میں چلتے چلتے گر پڑوں گی تو آپ کو سہارے کے لئے نہیں ڈھونڈوں گی کبیر...... کہ آج ہماری داستان یہیں پر ختم ہوئی۔ میری وفا کی کہانی دوسرا رخ اختیار کرنے جا رہی ہے۔ وہ گھر جہاں سب کچھ ہوگا میری محبت...... آپ نہیں ہوں گے اور آپ مجھے مجبور نہ کریں کہ میں آپ کو یاد رکھوں، مشکل پڑنے پر آپ کو پکاروں کہ میں اب اپنی مشکلات کو خود اپنے حوصلہ کی بنیاد پر طے کرنا چاہتی ہوں۔'' کبیر عباسی کو آبشار نے واضح جواب دے دیا تھا تو وہ آج کیوں بیٹھے شکوہ کر رہے تھے کہ انہیں آبشار نے پکارا کیوں نہیں۔

''تم تو صاف کہہ گئی تھیں آبشار کہ مجھے نہیں پکارو گی۔ اور میں نے تمہاری بات مان لی تھی۔ کاش میں نے تمہیں مجبور کیا ہوتا کہ تم مشکل میں مجھے آواز ضرور دو گی۔ تو آج حالات کس قدر مختلف ہوئے۔ میں ہر بار تمہاری مان لیتا تھا۔ تمہاری مان کر ہجر گلے لگا گیا مگر اب صرف تم نے میری ماننی ہوگی۔ سن لو آبشار کہ اب میں نہیں تم میری مانو گی۔'' وہ دل ہی دل میں اسے پکارتے بند آنکھوں سے اس کے عکس کو محسوس کرتے ہوئے آنسو بہا رہے تھے۔

یہ جو پلکوں پہ
رم جھم ستاروں کا میلہ سا ہے
یہ جو تیرے بنا کوئی
اتنا اکیلا سا ہے
زندگی تیری یادوں سے
مہکا ہوا شہر ہے
سب محبت کا ایک پہر ہے
ساحلوں پہ گھروندے
بنائے تھے ہم نے، تمہیں یاد ہے؟
رنگ بارش میں کیسے
اڑائے تھے ہم نے، تمہیں یاد ہے؟
جانے کس کے لیے گھر
سجائے تھے ہم نے، تمہیں یاد ہے؟
کوئی خوشبو کا جھونکا
ادھر آ نکلتا کہیں
گم ہے نیندوں کے صحرا میں
خوابوں کا رستہ کہیں
ہر خوشی
آتے جاتے ہوئے وقت کی لہر ہے
سب محبت کا ایک پہر ہے
زندگی دھوپ چھاؤں کا
اک کھیل ہے، بھیڑ چھٹتی نہیں
اور اسی کھیل میں

دن گزرتا نہیں، رات کٹتی نہیں

پیار کرتے ہوئے آدمی کی

عمر کبھی گھٹتی نہیں

دل کی دہلیز پر عکس

روشن تیرے نام سے

رت جگے آئینوں میں

کھلے ہیں کہیں شام سے

اک دریا ہے چاروں طرف

درمیان لہر ہے

سب محبت کا اک پہر ہے

☆......☆......☆

''شادی کی پچیسویں سالگرہ مبارک۔'' حیدر صاحب نے اپنی شریک حیات کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا اور ایک سرخ گلابوں کا بوکے ان کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''آپ کو بھی۔'' وہ بوکے لیتے ہوئے بولتیں سرخ گلابوں کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے سرخ گلابوں پر اپنے لب رکھ گئی تھیں۔ گزشتہ پچیس سالوں سے وہ انہیں شادی کے تحفہ کے طور پر سرخ گلابوں کا گلدستہ ہی دیتے آرہے تھے۔

''تم نے گزشتہ چوبیس سالوں میں مجھے کوئی تحفہ نہیں دیا فضہ۔ آج سلور جوبلی کے موقع پر ہی کوئی تحفہ عنایت کردو۔ آرزو ہی رہی کہ ہماری اہلیہ بھی ہمیں کوئی تحفہ دیں۔'' وہ بیوی کو چھیڑ رہے تھے۔ فضہ نے بس ایک نظر ان کے مسکراتے وجیہہ چہرے پر ڈالی تھی۔

''آپ کا تحفہ میں ہوں حیدر۔'' وہ ہلکی سی ہنسی کے درمیان بولی تھیں۔ وہ چند ثانیے بیوی کو دیکھتے دلکشی سے مسکرا دیئے تھے۔

''اس تحفہ کے بعد تو میں نے کسی اور تحفہ کی تمنا ہی نہ کی، تم قدرت کا انعام ہو میرے لئے۔ میری محبت۔ میری شریک حیات۔ میری زندگی۔'' وہ محبت سے گندھے لہجہ میں کہتے بیوی کی روشن پیشانی پر محبت وعقیدت سے بوسہ دے گئے تھے۔

''زندگی کتنی حسین ہے ناں حیدر۔'' وہ حیا سے سرخ پڑتے چہرے کو جھکاتے ہوئے بولی تھیں۔

''ہاں۔ فضہ کے دم سے حیدر کی زندگی بہت حسین ہے۔'' وہ محبت سے چور لہجہ میں بولے تھے۔ انہوں نے بیوی کے دونوں ہاتھ، ہاتھوں میں تھامے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت مہرون رنگ کے اسٹائلش سوٹ میں آنکھوں میں کاجل اور لبوں پر لپ اسٹک لگائے، ہاتھوں

میں سنہری اور مہرون چوڑیاں پہنیں آنکھوں کے راستے ان کے دل میں اتری جا رہی تھیں۔ کہتے ہیں کہ محبت وقت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے اور انہوں نے اپنی محبت کو ہر گزرتے دن کے ساتھ نمو پاتے دیکھا تھا۔ فضہ نے اپنا ملک چھوڑ کر حیدر کا ساتھ قبول کیا تھا اور انہیں گزشتہ پچیس برسوں کے ایک لمحہ میں بھی کبھی اپنے فیصلہ پر پچھتاوے کا سامنا نہ ہوا تھا۔ حیدر ان کی سوچ سے زیادہ مخلص اور پیار کرنے والے جیون ساتھی ثابت ہوئے تھے۔ ایسام ان کی واحد اکلوتی اولاد تھا۔ بیٹی کی ان دونوں کو ہی بے حد چاہ تھی مگر حیدر نے کبھی ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ انہیں اپنی زندگی میں کمی لگتی ہے کہ انہوں نے اس بات کو محسوس ہی نہ کیا تھا کہ ان کی بیوی انہیں مزید اولاد نہیں دے سکتیں کہ ان کے لئے فضہ معنی رکھتی تھیں اور فضہ کی خوشی کے لئے انہوں نے اپنی خوشی ہمیشہ سائیڈ کر دی تھی۔ وہ دونوں گزرے وقت کے سکھ، دکھ کو یاد کرتے مسکرا رہے تھے، آنسو بہا رہے تھے۔ فضہ ان کے مسکراتے چہرے کو دیکھ رہی تھیں وہ آج بھی کتنے تروتازہ کس قدر شاداب تھے۔ انہیں وہ پل یاد آنے لگا تھا جب حیدر نے انہیں پرپوز کیا تھا اور ان کے جواب کے منتظر تھے۔ وہ اقرار منہ سے کر نہیں پا رہی تھیں کہ ان کی تربیت خالص مشرقی انداز میں ہوئی تھی۔ وہ حیدر کے ''آئی لو یو'' کے جواب میں مزے سے ''آئی لو یو ٹو'' نہیں کہہ سکتی تھیں۔ ان کی شرم وحیا، ان کی نسوانی انا آڑے آ گئی تھی۔ بس انہوں نے اثبات میں گردن ہلا کر مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ بعد میں ان کی کتنی ہی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ہر ملاقات میں حیدر نئے انداز میں اظہارِ محبت کرتے تھے۔ وہ بس اپنی قسمت پر نازاں مسکراتی رہتی تھیں۔ انہیں وہ شام یاد آنے لگی تھی جب حیدر نے ان سے کہا تھا کہ وہ اپنے والدین کو نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ پاکستان جانے کو راضی ہو جائے۔ فضہ کا دل تو حیدر کی مان رہا تھا مگر دماغ ماننے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ وہ ایک ایسے ملک میں نہیں آنا چاہتی تھیں جہاں سہولیات کی کمی تھی مگر حیدر کی محبت انہیں کھینچ رہی تھی۔ ان سے اقرار کرتے ہی بنی تھی۔

''تمہیں یاد ہے وہ شعر جو تم نے اقرار اور اپنی محبت کی شدت کا گواہ بنا کر میری سماعتوں کی نذر کیا تھا۔'' فضہ ہی نہیں حیدر بھی ان ہی لمحات کو سوچ رہے تھے اور لبوں سے یوں کہا تھا کہ وہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں گردن ہلا گئی تھیں۔

''میں وہ آج پھر تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں فضہ۔'' وہ بیوی کا ہاتھ تھام کر بولے تھے اور فضہ کافی شاپ کی ٹیبل پر جا بیٹھی تھیں۔ انہیں لگا تھا کہ درمیان میں جیسے پچیس برس آئے ہی نہ تھے۔ حیدر اور وہ آمنے سامنے تھے۔ حیدر اپنی محبت کا یقین دلانے کو کبھی لفظ چن رہا تھا تو کبھی آنکھوں میں محبت کے دیئے روشن کئے فضہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کبھی حیا سے سرخ پڑتی تھی تو کبھی آنے والے وقت کی آہٹ اسے سہانے لگتی تھی۔

''تم پاکستان آنے کے نام سے ہی کس قدر خوفزدہ ہو گئی تھیں۔'' وہ انہیں حال میں لے آئے تھے۔

''مگر آپ کا یقین، آپ کی محبت جیت گئی حیدر۔'' وہ حیدر کی محبت لٹاتی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا کر بولی تھیں اور ان کی فرمائش پر دھیمے پر اثر لہجہ میں شعر پڑھنے لگی تھیں۔ وقت جیسے تھم سا گیا تھا کہ پیار کرنے کی عمر نہیں ہوتی۔ محبت تو وہ جذبہ ہے اگر جیت سے سرشار ہو جائے تو روحوں کو منور کر دیتا ہے۔

اس شرط پر کھیلوں گی پیا پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں ہاروں تو پیا تیری

☆......☆......☆

''بات ہوئی تمہاری اپنی ماما سے۔'' شاہ زیب جس وقت کبیر عباسی کے گھر سے نکلا عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ بری طرح تھک چکا تھا اس کا ارادہ گھر جا کر آرام کرنے کا تھا مگر عریم کا خیال آ گیا تھا اس لئے وہ اپارٹمنٹ پر چلا آیا تھا۔ عریم سابقہ ملگجے حلیہ میں تھی۔ اس کی آنکھیں و چہرہ گریہ وزاری کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے۔ اس نے وہ تمام شاپرز جو لا کر صوفہ پر ڈالے تھے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عریم سے کہا تھا کہ وہ فریش ہو کر آ جائے۔ اس نے بے دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کرنا چاہا تھا مگر وہ اسے شاپرز لے جانے کا اشارہ کرتا ملازمہ کو آواز دے گیا تھا۔ اسے آدھ گھنٹہ تک کھانے کا انتظام کرنے کا کہتا وہ بیڈ روم میں آیا تھا۔ عریم سامان بیڈ پر بکھرائے الجھن آمیز نظروں سے ساری چیزیں دیکھ رہی تھی۔ شاہ زیب نے ایک گھوری اس پر ڈالی تھی اور قدرے غصہ سے سارا سامان سائیڈ میں کر کے بستر پر نیم دراز ہو گیا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے اس کے بے حد سنجیدہ چہرے کو دیکھا تھا اور ایک سوٹ پہننے کے لئے سلیکٹ کر لیا تھا۔ وہ وہاں سے جاتی کہ شاہ زیب کی آواز گونج اٹھی تھی۔

''جی ہوئی تھی۔ پاپا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ماما بے حد پریشان ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے تھے۔

''ہم سب نے تمہارے پاپا کو معاف کر دیا ہے۔'' اس کے ہاتھ سے کپڑے چھوٹ گئے تھے وہ بے حد حیرانی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ شاہ زیب نے اس کی حیرت کو نظر انداز کر کے اس کے جانے کے بعد ان سب کے درمیان جو بات ہوئی تھی اس میں سے جو عریم کو بتانے والی باتیں تھیں سب بتا دی تھیں۔ عریم یکدم ہی بے تحاشہ رونے لگی تھی۔ وہ اس کا شکریہ کہنے کو لفظ جوڑ رہی تھی کہ دروازہ پر دستک ہوئی تھی۔

''تم فریش ہو جاؤ۔ میں گھنٹہ تک یہاں ہوں واپسی پر تمہیں ہاسپٹل چھوڑ دوں گا اگر تم چاہو گی تو۔'' وہ اس کے کہنے پر کپڑے لئے واش روم کی طرف بڑھ گئی تھی اور اس کے منظر سے ہٹتے ہی شاہ زیب نے آواز لگائی تھی۔

''آ جایئے۔'' اور خالدہ بی چائے کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہو گئی تھیں۔ اس نے چائے کے سپ لیتے ہوئے موبائل انبوکس چیک کیا تھا۔ چند ایک ضروری میسجز کا رپلائی دیا تھا اور گھر کے لینڈ لائن نمبر پر کال ملائی تھی۔ کال مومنہ نے ریسیو کی تھی۔ شاہ زیب سے تو اسے پہلے ہی ڈر لگتا تھا۔ جیسے ہی اس نے کہا تھا۔

''شاہ زیب بات کر رہا ہوں۔'' مومنہ کے ہاتھ میں ریسیور کانپ گیا تھا۔

''سچ میں بھیا میں نے خود کال ریسیو نہیں کی وہ تو ماما نے خود کہا تھا تب ہی۔'' مومنہ بے حد خوفزدہ انداز میں کہنے لگی تھی۔ شاہ زیب کو بہن

پر پیار بھی آیا تھا اور افسوس بھی ہوا تھا۔ کسی کے جرم کی سزا کس کو ملتی رہی تھی۔ دودھ کا جلا چاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے اور وہ سب بھی دودھ کے جلے تھے اس لئے احتیاط پسندی نے پابندیوں کا گراف بے حد بلند کر دیا تھا۔

''میں اپنی بہن کو بہت اچھے سے جانتا ہوں اس لئے تمہیں صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ماما کو بتا دینا کہ میں باہر ہوں۔ گیارہ بجے تک واپس آؤں گا۔ کھانے پر میرا انتظار نہ کیا جائے۔'' وہ بہت نرمی سے بولا تھا کہ مومنہ کی حالت بے یقینی سے مرنے والی ہوگئی تھی۔ وہ پہلے تو نرمی سے بات کر لیتا تھا مگر آبدار والے واقعہ کے بعد آمنہ و مومنہ بھی اس کے زیر عتاب آئی رہتی تھیں۔

''جی میں ماما کو بتا دیتی ہوں۔'' وہ اٹک اٹک کر بولی تھی اور مومنہ سے بات کرتے ہوئے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب سب سے پہلے اپنی بہن کا اعتماد بحال کرے گا۔ اسے عزت و محبت اور مان دے گا جس کی وہ حقدار ہے۔

''زندگی میں ہم سب نے کئی فیصلے بے حد مناسب و مثبت کئے مگر کچھ فیصلے بے حد غلط تھے اور میں ان تمام غلط فیصلوں کو ایک مثبت سمت ضرور دوں گا۔ جو خوشیاں اور کزنز خاندان سے روٹھ گئی ہیں وہ خوشیاں میں ڈھونڈ کر لاؤں گا۔ پھپھو، آبدار، آمنہ، مومنہ، ماما اور تائی ان سب کے ڈر، ادھوری خوشیوں اور پورے دکھوں کو ختم کر کے زندگی کا آنے والا ہر لمحہ بھرپور مکمل خوشیوں سے منور کروں گا۔ یہ میرا خود سے وعدہ ہے۔'' اس نے سیل فون ٹیبل پر ڈالتے ہوئے بے حد مثبت انداز میں سوچتے ہوئے آگے کا لائحہ عمل ابھی سے تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔

آہٹ پر اس نے چونک کر دیکھا تھا۔ نظر واش روم سے نکلتی عریم پر پڑی تھی۔ سبز رنگ کے کرتے اور ہم رنگ چوڑی دار پاجامے میں وہ نکھری نکھری اس کے سامنے تھی۔ اس نے کاندھوں پر ہم رنگ دوپٹہ ڈالا ہوا تھا۔ سر پر تولیہ بندھا ہوا تھا۔

''مجھے عریم کے حقوق کے لئے بھی دل سے کوشش کرنی ہوگی۔ اپنے کئے ہر ظلم کا ازالہ کرنا ہوگا۔'' وہ اس پر نظر جمائے سوچ رہا تھا اور وہ جو اس کے کمرے میں موجودگی کے خیال سے ہی بالوں میں ٹاول لپیٹ کر کاندھوں پر دوپٹہ ڈال کر آئی تھی اس کی نظروں سے بے حد کنفیوز ہوگئی تھی۔

''آبدار نے ٹھیک کہا تھا کہ ایک عورت پر ہوئے ظلم کا بدلہ دوسری عورت سے لینا سراسر ظلم ہے۔'' اور وہ یہ ظلم اب نہیں کرے گا۔ دل ہی دل میں تہیہ کر چکا تھا۔ عریم اس کی مستقل نگاہ خود پر جمے دیکھ کر بے حد کنفیوز ہوگئی تھی۔ اس نے بالوں سے ٹاول کھینچا تھا اور لرزتے دل کے ساتھ ٹاول، ٹاول اسٹینڈ پر ڈالتی کانپتے ہوئے ڈریسنگ کی طرف بڑھی تھی۔ برش اٹھا کر لرزتے ہاتھوں سے گیلے بالوں میں پھیرنے لگی تھی۔ شاہ زیب اس کی کیفیت سے انجان اپنی ہی سوچوں میں غلطاں جوڑ توڑ میں لگا تھا۔ اس نے آئینہ میں صاف نظر آتے شاہ زیب کو دیکھا تھا جو اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا تھا۔ شور کی آواز پر وہ خیالوں سے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے عریم کی جانب دیکھا تھا اور اسے پاس آنے کا کہہ گیا تھا۔

''وہ، میں دیکھ کر آتی ہوں۔ خالدہ بی نے کھانے کا انتظام کیا یا نہیں۔'' وہ اس کے بلانے پر کانپتے لہجہ میں بولی تھی مگر قدم آگے بڑھا

بھی نہیں پائی تھی کہ اس کی آواز اٹھتے قدموں کو جکڑ گئی تھی اور وہ باہر جانے کی بجائے مرے مرے قدم اٹھاتی ہاتھوں کو مسلتی، لب کچلتی اس کے سامنے بیڈ سے کچھ فاصلے پر آن ٹھہری تھی۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔'' وہ اس کے ہوائیاں اڑاتے چہرے کو دیکھ کر بول گیا تھا۔

''جج......جی......میں......میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ نظر اٹھائے بناء منمنائی تھی اس کی کیفیت سمجھنے میں اسے ایک لمحہ لگا تھا وہ اگر پہلے اس کی جانب متوجہ ہوتا تو پہلے ہی اس کا ڈرنا، حیا سے لرزنا بھانپ جاتا۔ اس کے لبوں پر بے حد دلکش مسکراہٹ آن ٹھہری تھی وہ اس کا جائزہ لینے لگا تھا۔ سبز اسٹائلش سوٹ میں اس کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔ رونے سے جو چہرے پر سوگواری تھی وہ اس کے حسن میں اس وقت دلکشی کا باعث بن گئی تھی۔ پشت پر بکھرے سیاہ آبشار سے بال وہ اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا اور وہ بھاگنے کے، فرار ہونے کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اس کی نظروں سے گھبرا کر جیسے ہی جانے کو مڑی تھی وہ اس کی گوری کلائی اپنی گرفت میں لے گیا تھا۔ وہ پوری جان سے لرز اٹھی تھی۔

''شاہ۔'' وہ بیڈ سے اتر کر اس کے عین سامنے آن کھڑا ہوا تھا اور وہ اس کی نگاہوں کی وارفتگی سے گھبرا کر منمنائی تھی۔

''ہاں، بولو میں سن رہا ہوں۔'' وہ ہاتھ آزاد کروانے کی جہد میں تھی اور وہ با آسانی اس کی کلائی آزاد کرتے ہوئے مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی اسی لئے آگے بڑھی تھی۔ اب کہ وہ اس کا سبز آنچل تھام کر اس کے وہاں سے جانے کی راہ مسدود کر گیا تھا۔

''تمہیں کچھ کہنا تھا۔'' وہ اس کا سبز آنچل ہاتھ پر لپیٹتے ہوئے آگے کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا وہ پیچھے کی طرف ہوتی بیڈ پر گری تھی۔

''مم......مجھے......کچھ......نہیں......کچھ بھی تو نہیں کہنا تھا۔'' وہ بیڈ پر کچھ یوں گری تھی کہ اگر بیڈ کراؤن کے ساتھ دونوں تکیہ ملا کر نہ رکھے ہوتے تو اس کی پشت ضرور متاثر ہوتی۔

''کیوں، تمہیں کیوں کچھ نہیں کہنا۔ فون پر تو بہت کچھ کہا کرتی تھیں۔'' وہ اس کی حالت سے محظوظ ہوتا مسکرا رہا تھا اور وہ اس کی مسکراہٹ میں کھو سی گئی تھی۔ ان کے مختصر سے ساتھ میں اس نے شاہ زیب کو بہت کم مسکراتے دیکھا تھا مگر اس کی مسکراہٹ بلاشبہ اتنی حسین تھی کہ وہ ہر بار محو ہو جاتی تھی۔

''ایسے دیکھو گی مجھے تو تمہاری آنکھوں پر مجھے پیار آ جائے گا۔'' وہ اس پر جھک کر شرارت سے بولا تھا اور اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''پلیز شاہ۔'' وہ روتے ہوئے کچھ کہنے کی چاہ میں سسکنے لگی تھی۔ وہ اس کے رونے کا اس وقت کوئی مطلب اخذ کرنے سے قاصر رہا تھا اور اس نے عریم کی بے داغ پیشانی پر لب رکھے تھے اور اس کا سبز آنچل اس کے سر پر ڈالتے ہوئے بول گیا تھا۔

سبز چنری میں باندھنا مجھ کو

میں محبت کا سرخ وعدہ ہوں

وہ نم آنکھوں میں حیرت لئے اسے دیکھنے لگی تھی جو سیدھا ہوتے ہوئے بیڈ پر عین اس کے سامنے ٹک گیا تھا اور مسکرا کر اس کی نم پلکوں میں دیکھ رہا تھا۔

''شاہ۔انتقام پورا ہو چکا ہے۔جسے آپ سزا دینا چاہتے تھے اسے قدرت بہت بڑی سزا دے چکی ہے۔اور اسے اپنے طور پر آپ معاف بھی کر چکے ہیں۔ایسے میں یہ محبت کا ڈرامہ اب ترک کر دیں۔'' وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بلک اٹھی تھی۔شاہ زیب لمحہ بھر کو ساکت رہ گیا تھا۔اسے عریم سے اس بات کی توقع ہی نہ تھی مگر اس کی بے یقینی بھی تو اتنی بے جا نہ تھی۔وہ ایسے کہنے میں حق بجانب تھی یہ بات وہ مانتا تھا اس لئے خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لئے تھے۔وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔

آرزو تھی کیا......اور کس قدر
تم کو تھی چاہت ہماری
ارے جانے کس لئے روٹھ سی گئی
اک پل میں دنیا وہ ساری
ارے کیا کریں، کیا کریں، کیا کریں
آنکھیں ہیں ابھی تھوڑی تھوڑی نم
آنکھوں میں کہیں سپنے نہ ہوں کم
تھوڑی سی خوشی، تھوڑا تھوڑا غم

''میں نے تو صرف آپ پر اعتبار کیا تھا شاہ۔آپ کی آنکھوں میں چاہت دیکھی تھی۔ایک پل میں آپ نے میرا بھرم توڑ ڈالا، مجھ سے جینے کی وجہ ہی چھین لی۔میں آپ کے منہ سے لیکن اب مزید محبت کے جھوٹے راگ نہیں سن سکتی۔جو بات نہیں ہے اسے مت کہیں۔نہ کہیں مجھے کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے۔'' وہ اپنے ہاتھ چھڑاتی بیڈ سے ہی اٹھ گئی تھی مگر وہاں سے جا نہیں پائی تھی وہ اس کی کلائی پر پھر گرفت کر گیا تھا۔

''تمہارا دل توڑا ہے میں نے عرمی۔اور دل توڑنے کی جو سزا دینا چاہو دے لو مگر مجھے میری صفائی میں بولنے کا ایک موقع تو دے دو۔'' وہ اس کی نمناک آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا تھا۔

''صفائی میں تو آپ بہت بول چکے، بتا چکے مجھے کہ آپ نے جو کچھ انتقام کی آگ سرد کرنے کو کیا......اور سزا کی بات کہاں سے آ گئی ہے۔میں تو آپ کو معاف کر چکی ہوں۔میں تو آپ سے نظر ملانے کے قابل نہیں ہوں۔ایسی باتیں کر کے کیوں مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔'' وہ نظر چرا کر روتے ہوئے بولتی ہاتھ چھڑانے کی جہد میں تھی جسے شاہ زیب نے ناکام بنا ڈالا تھا۔

پیار کی حسین ڈور سے یہاں

جیون کو باندھا گیا ہے

ارے جانیں یہ سبھی

جیسی ہو خطا ویسی ہی اس کی سزا ہے

توڑو گے جو دل ٹوٹے کا ستم

آنکھوں میں کہیں سپنے نہ ہوں کم

''دیکھو! تمہارا دل توڑا ہے اور اس کی جو چاہے تم مجھے سزا دے سکتی ہو۔ باخدا میں اُف نہیں کروں گا۔'' وہ دھیمے سے بول رہا تھا۔

''میں لیکن آپ کو سزا نہیں دینا چاہتی۔ میرے لئے یہی سزا کافی ہے کہ میں نے تو محبت کی اور آپ نے میری محبت کا مذاق بنایا۔'' وہ اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے کھینچ گئی تھی۔

''آپ کو میرے پاپا کو سزا دینی تھی، ان سے انتقام لینا تھا ناں تو مجھے جان سے مار دیتے مگر میرے دل کے ساتھ تو نہ کھیلتے۔ میں یہ سمجھتی رہی کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کی محبت میں، میں نے آپ پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور آپ کو تو مجھ سے محبت ہی نہیں ہے۔ یہ خیال مجھے مار ڈالے گا شاہ، کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولتی اس کا گریبان مٹھیوں میں جکڑتی ہچکیوں سے روتی اس کے سینے پر سر رکھ گئی تھی۔

''میں نے تو آپ کو جیتنا چاہا تھا اور آپ نے مجھے ہی مجھ سے چھین لیا۔ محبت نہ تھی تو کیوں کیا تھا محبت کا ڈرامہ...... گن پوائنٹ پر نکاح پڑھوا لیتے ناں شاہ تو اتنی تکلیف نہ ہوتی، جتنی تکلیف محبت کا کھیل رچا کر آپ نے مجھے پہنچائی ہے۔ آپ نے میرے سچے جذبات کی توہین کی۔ کیا بگاڑا تھا میں نے آپ کا۔ کیوں محبت کا ڈھونگ رچایا۔ انتقام کی کئی راہیں تھیں۔ میرے دل کے ساتھ کھیلنا کیوں ضروری ہو گیا تھا۔ کس بات کی سزا دی مجھے۔'' وہ اس کے سینے سے سر ٹکائے سارے گلے سارے شکوے کرتی جا رہی تھی۔

الجھن کیا بتاؤں؟ میں تمہیں اپنے دل کی

تیرے ہی گلے لگ کر تیری ہی شکایت کو جی چاہتا ہے

''محبت کا محض ڈھونگ نہیں رچایا تھا میں نے عریم۔ میں نے بھی تم سے اتنی ہی محبت کی ہے جتنی کہ تم نے۔'' وہ اس کی پشت پر بازو حمائل کرتے ہوئے لب اس کے بھیگے بالوں والے سر پر رکھتے ہوئے کہتا چلا گیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کے سینے سے سر اٹھا کر فاصلہ قائم کیا تھا۔

''اب کوئی مذاق، کوئی جھوٹ میرا دل برداشت نہیں کر پائے گا شاہ۔'' وہ بہت تڑپ کر اس سے الگ ہوتے ہوئے بولی تھی اور وہ اس کو

بازو کو تھام کر اسے بیڈ پر بٹھاتے ہوئے عین اس کے سامنے بیٹھ کر اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ گیا تھا۔

نیلا آسماں سانولی زمین
ویسی کی ویسی وہیں ہے
ارے لوٹ کے مگر دیکھنا کبھی
ماضی میں کچھ بھی نہیں ہے
ارے جان لو، جان لو، جان لو
دوری ہو جہاں، جلتے ہیں قدم
آنکھوں میں کہیں، سپنے نہ ہوں کم

''زندگی انسان کو بے حد بری طرح آزماتی ہے اور جب زندگی ہمیں آزماتی ہے تو ہم خود سے وابستہ لوگوں کو ہی آزمانے لگتے ہیں۔ اپنے حصہ کی جلتی زمین پر ہم اپنے پیاروں کو بھی گھسیٹ لیتے ہیں۔ تم میری محبت ہو عریم، مگر میں نے تمہیں اس انتقام کی بھینٹ یوں چڑھایا کہ دل میں محبت اور لب پر نفرت لئے تمہیں آزماتا رہا، سزا دیتا رہا۔'' وہ اس کی بے یقین نگاہوں میں جھانکتے ہوئے آزردگی سے بولا تھا۔

''مگر تمہیں تکلیف دے کر لمحہ بھر کو سکون سے نہیں رہا میں۔ تمہاری آنکھوں سے گرے آنسو اپنے دل پر محسوس کئے ہیں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دو۔'' وہ محبت سے کہتا اس کے سامنے ہاتھ جوڑ گیا تھا اور وہ اس کے جڑے ہاتھوں پر سر رکھتی بری طرح بلک اٹھی تھی۔

''شاہ، جب آپ نے کہا کہ آپ کو مجھ سے محبت نہیں، میں تو مر ہی گئی تھی۔'' وہ ہچکیاں بھر رہی تھی۔

''جب میں نے اپنی عریم سے یہ کہا تھا کہ مجھے اس سے محبت نہیں تو مر تو میں بھی گیا تھا۔'' اس کا رونا برداشت نہیں ہو رہا تھا مگر وہ اسے آج رونے دینا چاہتا تھا تاکہ آگے زندگی میں صرف کھلکھلاہٹیں ہوں۔ وہ بہت تڑپ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''محبت کو جھوٹ کے ریپر میں سجا کر پیش کرنا اتنا آسان نہ تھا عرمی۔ کیسے کیسے تڑپا ہوں۔ تکلیف تم کو دے رہا تھا، اذیت یہاں دل پر محسوس کر رہا تھا۔ اپنے چاہنے والوں کو تڑپا کر تڑپنے کا نظارہ دیکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ جان ہتھیلی پر لئے تم پر ستم کر رہا تھا اور ہر ستم میری سانس کے لئے کیسا آزار تھا...... ہر لحظہ لگتا تھا......اب سانس نکلی کہ تب نکلی۔'' وہ اپنے دل پر دایاں ہاتھ رکھے آزردہ لہجہ میں بولتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں کس کس پل نے، کس کس احساس نے نمی بھری تھی بس یہ وہی جانتا تھا۔ وہ اور شدتوں سے رونے لگی تھی۔

''شاہ! ہمارا بچہ......وہ نہیں رہا شاہ......'' وہ بے ربط ہوئی تھی اور اس نے اسے بازو پکڑ کر اپنی اور کھینچا تھا اور وہ اس کے سینے سے آ لگی تھی۔

''اس کے لئے تم مجھے معاف کر دو۔ مجھے ذرا بھی یہ خیال گزرتا کہ اس انتقام کی بھینٹ ہمارا بچہ چڑھ جائے گا تو باخدا میں محمود خان سے انتقام لینے کا نہ سوچتا۔ معاملہ اللہ پر چھوڑ کر سزا و جزا کا انتظار کرتا۔ میری بے صبری میرے بچے کی قاتل بن جائے گی یہ میں نے خواب

میں بھی نہیں سوچا تھا۔'' وہ اس کے سینے سے لگی بری طرح رو رہی تھی اور شاہ زیب کے آنسو اس کے بالوں میں جذب ہونے لگے تھے۔

''میں نے اپنے بچے کے لئے کتنے سپنے سجائے تھے۔ مجھے لگتا تھا کہ ہمارا بچہ ہمارے درمیان کے تمام فاصلوں کو مٹا دے گا۔'' عریم بولی تھی۔ اس کے رونے میں بدستور اضافہ ہو رہا تھا وہ خود کو کمپوز کر کے اسے تسلی دینے لگا تھا۔

''ماں بننے کا احساس ہی بہت خوبصورت تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ ایک زندگی جو میرے وجود میں پل رہی ہے، یہ میری خوشیوں کی ضامن ثابت ہو گی مگر سب بکھر گیا۔ میری پہلی خوشی مجھ سے روٹھ گئی شاہ۔ میں آپ کے اور اپنے بچے کی حفاظت نہ کر سکی۔ ہم سے ہمارا بچہ چھن گیا۔'' وہ دکھ جو اس نے تنہا اپنی ذات پر جھیلا تھا شاہ زیب کا ساتھ میسر آیا تھا تو وہ ہر دکھ کہتی چلی گئی تھی۔

''ہر کام میں خدا کی کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس تکلیف میں کتنی راحتیں چھپی ہیں ان کو محسوس کرو عرمی۔ رب کی ناشکری نہ کرو۔'' وہ اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے بولتا اس کے آنسو صاف کر گیا تھا۔ اسے ہنسنے کا کہہ رہا تھا مگر اس کے لبوں پر خوشی کی کوئی کلی چٹخ نہ سکی تھی۔ اس کا دل کیا تھا بہت سا ہنسنے کا...... مگر انسان بعض اوقات اپنے درد میں گم ہو کر لب پر آئی ہنسی کو خالی ہاتھ، خالی دل، لوٹاتے ہیں، تو تب جب ہنسنے کا دل کرتا ہے تب ہنسی لبوں پر آ کر ٹھہر جاتی ہے کہ کچھ دکھ ہی نہیں کچھ خوشیاں بھی خراج مانگتی ہیں۔ اس نے بھی شاہ زیب کو پانے کی خوشی کے لئے کیا کچھ کھویا تھا۔ کتنی ہی مسکراہٹوں کی قربانی دی تھی تو آج اس کا ساتھ نصیب ہوا تھا اور اولاد کے کھونے کا دکھ ایسا ملا کہ وہ اس ساتھ پر بھی خوش نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے روانی سے آنسو بہتے جا رہے تھے۔

''شاہ۔ میں نے تو سوچا ہی نہ تھا کہ آپ کی محبت پانے کو مجھے کیا کچھ قربان کرنا پڑے گا۔ یہاں تک کہ مجھے اپنی اولاد کی بھی قربانی دینی ہو گی۔'' وہ بلک رہی تھی اس نے لب بھینچ لئے تھے۔ بعض دفعہ کچھ کہنے کو جیسے بچتا ہی نہیں ہے۔ دو حرف تسلی کے لبوں کے قفس سے آزاد نہیں ہو پاتے۔ ان دونوں کے درمیان یکدم ہی گہری رگوں کو چیرتی خاموشی ٹھہر گئی تھی۔

''ماضی کو بھول کر آگے بڑھو، جو کھو گیا اس پر نہیں آنے والی خوشیوں پر نظر رکھو۔ جو غلطیاں میں سرزد کر چکا ہوں تم انہیں دہرانے کی طرف سفر نہ کرو۔ یہ ماضی کی تلخیاں انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ تم ماضی کی غلطیوں کو ذہن و دل سے جھٹک کر آگے بڑھو، زندگی بہت حسین ہے۔ ہم دونوں مل کر زندگی کو حسین بنائیں گے۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ بولو ساتھ دو گی میرا۔'' اسے زندگی نے ایسے سبق دیئے تھے کہ وہ آگے بڑھنے کے لئے خود کو راضی کر چکا تھا اور اب عریم کو نئی امید دے کر وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلا گیا تھا۔

''آپ زندگی کے ہر قدم پر مجھے اپنے ساتھ پائیں گے شاہ۔ میں جیت کے ہر سفر میں آپ کا ساتھ نبھاؤں گی۔ اور ہار کی ہر دوڑ میں آپ کا حوصلہ بنوں گی۔'' وہ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اتنی دیر میں پہلی دفعہ مسکرائی تھی۔ شاہ زیب کو یکدم لگا تھا زندگی آگے سہل...... بہت سہل ہے۔ وہ اسے خود سے لگا گیا تھا اور وہ اپنے جیون ساتھی کے کاندھے سے لگی مطمئن تھی۔ اسے بھروسہ تھا کہ آگے زندگی کا ہر سکھ و دکھ وہ مل کر بانٹیں گے۔ سکھ کے دن مل کر جئیں گے، دکھ کی شامیں مل کر گزار لیں گے کہ وہ دونوں محبت کے مسافر تھے...... اور ایک دوسرے

کے دل کو تو نہ جانے کب جیت چکے تھے لیکن اب سکھ دکھ کا ساتھی ثابت ہو کر زندگی کی خوشیوں کو جیتنا تھا۔

''آئی لو یو عریم۔'' شاہ زیب نے پہلی دفعہ ذہن و دل کی سچائی کے ساتھ اس سے اقرار محبت کیا تھا اور اس کے ماتھے پر لب رکھ دیئے تھے وہ خود کو بہت معتبر محسوس کرنے لگی تھی۔ اس کے لبوں پر شرمیلی مسکان تھی اور یہ مسکان شاہ زیب کی آگے کی زندگی کی کٹھنائیوں میں زادِ راہ ثابت ہونے والی تھی کہ ابھی تو اس نے عریم کو اپنے گھر والوں سے اس کا اصل مقام دلوانا تھا۔ اس کے عزائم پکے اور ارادے مضبوط تھے وہ جانتا تھا کہ یہ مشکل ہو گا مگر ناممکن نہیں کہ وہ سب بھی سمجھ گئے تھے کہ کسی کو معاف دل سے کیا جاتا ہے اور معاف کرنے کے بعد سب کچھ فراموش کر دیا جاتا ہے اور وہ اپنے گھر والوں کو اس سب کے لئے اسے یقین تھا کہ راضی کر لے گا اور اسے عریم پر بھی بھروسہ تھا کہ وہ اپنی محبت و ایثار سے اس کے گھر والوں کے دل میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس کے مسکرانے پر شاہ زیب نے دھیمی سی سرگوشی کی تھی اور وہ حیا سے سرخ پڑتی نظر جھکا گئی تھی۔

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں ، ہاروں تو پیا تیری
ہر لحظہ خیال تیرا رکھوں گی صرف اتنا
بیٹھ جاؤں تو بھی تیری اٹھ جاؤں تو بھی تیری
کچھ کر لوں گی حال اپنا ایسا میں ہمسفر
آنکھ لگے تو بھی تیری آنکھ کھلے تو بھی تیری
تیری ہر آہٹ پہ پالوں گی تعبیر ایسی
ہنس جاؤں تو بھی تیری روٹھ جاؤں تو بھی تیری
میں ساتھ تیرا کچھ ایسے دوں گی جان جہاں
زندہ ہوں تو بھی تیری مر جاؤں تو بھی تیری۔

☆......☆......☆

''آپ سب لوگ مجھے معاف کر دیں۔'' دیورانی، جیٹھانی رات کے کھانے کی تیاری کے بعد لاؤنج میں بیٹھی تھیں۔ مومنہ نے شاہ زیب کی کال کا بتا دیا تھا۔ آمنہ ٹی وی پر کوئی ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ مومنہ بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ آبشار کو دیکھ کر ان چاروں کو ہی حیرت ہوئی تھی پھر آبشار کی بات ایسی تھی کہ حیرت دو چند ہو گئی۔ وہ لاؤنج کے وسط میں ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں۔

''آبشار! ایسے کیوں بول رہی ہو۔'' تابندہ اٹھ کر نند تک پہنچی تھیں اور اس کے ہاتھ تھام لئے تھے۔

''میری وجہ سے اس گھر کی خواتین نے خواہشوں کو مار کر ایک بے رنگ زندگی گزاری۔ آپ چاروں خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔'' وہ بری طرح رونے لگی تھیں۔

''معاف تو تم ہم سب کو کر دو، تمہاری بے رنگ زندگی کے ہم سب ذمہ دار ہیں۔ ہم نے تکلیف و دکھ کی گھڑیوں کو اپنے سر پر سوار کر لیا۔ تدبیر سے تکلیف کا مداوا تو کیا مگر ایسی کوئی تدبیر نہ نکالی کہ تمہارے دکھ گھٹ جاتے۔ ہم لوگ توازن نہ رکھ سکے۔'' رخسانہ اور کزئی آگے بڑھ کر نم لہجہ میں بولی تھیں۔

''میں تو آپ سب کی بے حد مشکور ہوں، میری جیسی لڑکیوں کو معاشرہ تو بعد میں دھتکارتا ہے پہلے تو گھر والے ہی ٹھوکر مار دیتے ہیں مگر آپ نے، بھابھی نے بھائیوں نے میرا ساتھ دیا۔ مجھے امان دی۔'' وہ رخسانہ اور کزئی کے سینے سے لگیں بری طرح رو رہی تھیں۔

''شوکت بھائی صاحب، بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ تم نے اس خاندان کی عزت رکھی تھی۔ تم اس خاندان کی عزت کی امین تھیں۔ تمہارے ساتھ جو غلط ہوا اس کے بعد ہم سب تمہیں تنہا نہیں کر سکتے تھے۔ بس ہم سے چوک ہو گئی ہم نے تمہارا ساتھ تو دیا مگر توازن نہ رکھا۔'' رخسانہ بہت محبت سے بول رہی تھیں۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ زندگی میں توازن بہت ضروری ہے جیسے آبشار کا سب نے ساتھ دیا تھا۔ آگے زندگی میں اگر حوصلہ کرتے تو آبشار کی شادی ہو سکتی تھی۔ اس کی زندگی میں بھی رنگ بھر سکتے تھے۔ آبدار کی زندگی پر سکون گزر سکتی تھی وہ آج ان کے ساتھ ہوتی لیکن وہ تو اللہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ کسی کو بھی علم نہ تھا۔

''رخسانہ ٹھیک کہہ رہی ہے آبشار، زندگی میں ہم سب سے کئی فیصلے جہاں درست ہوئے وہیں کافی فیصلے غلط بھی ہو گئے اور ہم سب سے آبدار کے معاملے میں چوک ہو گئی۔'' تابندہ اور کزئی کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''میں اسے ماں کا پیار نہ دے سکی۔'' رخسانہ اور کزئی کی شرمندگی بڑھ گئی تھی۔

''میں نے اسے ہمیشہ سپورٹ کیا۔ اس کے ساتھ نرمی کی مگر سب سے برا میں ہی کر گئی۔ اگر میں درست فیصلہ کر کے اس وقت آئیکت سے آبدار کی شادی کی مخالفت نہ کرتی تو آج آبدار ہمارے ساتھ ہوتی۔'' تابندہ اور کزئی کی شرمندگی و ملال تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ان لوگوں کو یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ بیٹیوں کا جب ساتھ دیا جاتا ہے، انہیں مان دیا جاتا ہے تو وہ اپنی خواہشوں سے، اپنی خوشیوں سے دست بردار ہونے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ اگر آبشار اور کزئی معاشرہ میں آج بھی باعزت طور پر زندگی گزار رہی تھیں تو اس کی وجہ باعزت گھرانہ نہ تھا۔ ان کے نام کے ساتھ جڑا ''اور کزئی'' ان کی حفاظت و عزت کا ضامن نہ تھا کہ عزتوں کی ضمانت نام، رتبہ، شان و شوکت نہیں ہوتے۔ عزتوں کے ضامن تو رشتے ہوتے ہیں۔ وہ رشتے جو عیب جوئی کے بجائے، دھتکارنے کے بجائے جب گلے لگاتے ہیں تو آبشار جیسی ستم کی ماری بہن، بیٹی بھی معاشرہ میں قابل فخر گردانی جاتی ہیں۔ انہیں لوگ جھک کر سلام کرتے ہیں، عزت کرتے ہیں اور جب رشتے ہی خود اپنی بہن، بیٹیوں کو ٹھکرا دیتے ہیں، ان کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں، ان کی غلطیوں کا پرچار کرتے ہیں، ان پر ہوئے ظلم کو آشکار

کرتے ہیں تو آبدار جیسی لڑکیاں دربدر ہو جاتی ہیں۔ ظلم کی چکی میں حالات کے مارے ستم طریف لوگ ہی نہیں پستے۔ یہ بدنصیبی تو ان کے نصیب میں بھی آتی ہے جنہیں، جن کے اپنے اکیلا کر دیتے ہیں۔ آبشار اور کنزئی کو اکیلا نہ کیا گیا۔ اسی لیے ان پر ہوئے ظلم کی کسی کو خبر تک نہ تھی وہ سب کچھ گنوا کر بھی کسی کے سامنے شرمندہ نہ تھی اور آبدار اس کو ایسے اکیلا کیا گیا کہ وہ کچھ نہ کر کے بھی کچھ نہ گنوا کر بھی آج سب کے سامنے شرمندہ تھی۔ اس کے غلط قدم کے باعث وہ سب بھی شرمندہ تھے اور ملال میں تھے کہ اگر آبدار کا ساتھ دیتے تو آبدار ایسا کوئی قدم نہ اٹھاتی جو ان لوگوں کی رسوائی کا باعث بنتا۔ بیٹیوں کو تو جتنا مان دیا جائے وہ اتنا ہی جھک کر خاندان کی عزت رکھتی ہیں۔ زمین بن جاتی ہیں۔ احسانوں تلے دب کر پھر کسی زیادتی پر اف نہیں کرتیں۔

''آبدار کی گناہگار تو میں ہوں۔ وہ میری بیٹی تھی۔ میں اسے مان و عزت نہ دے سکی۔ میں بھول گئی تھی کہ عزت تو پھٹی چادر سے بھی چھپائی جا سکتی ہے۔ میں اپنے داغ داغ وجود سے آبدار کے لئے روشنی بن سکتی تھی۔ اس کی زندگی کو داغ بننے سے بچا سکتی تھی لیکن میں اپنی بیٹی کے لئے روشنی نہ بن سکی۔'' آبشار شدتوں سے رو رہی تھیں۔ سانپ مر چکا تھا بس اب لکیر ہی پیٹی جا سکتی تھی اور وہ سب یہی کر رہے تھے۔ اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

''آبدار کے ہم سب مجرم ہیں۔ بس وہ ایک بار واپس آ جائے ہم سب اس سے معافی مانگ لیں گے۔'' رخسانہ اور کنزئی گہرے ملال سے بولی تھیں۔ انہوں نے کتنا بڑا ظرف دکھایا تھا۔ سب کچھ جانتے ہوئے کسی اور کی ایسی اولاد جس کو معاشرہ کبھی تسلیم نہیں کرتا، اسے اپنی بیٹی بنایا، نام دیا، عزت و مقام دیا مگر بیٹی بنا تو لیا مگر بیٹی سمجھا نہیں...... معاشرے میں تو مقام دلوا دیا مگر دل میں کوئی مقام نہ دے سکیں۔ وہ بہت اعلیٰ ظرفی کے میدان میں جیت کر کچھ یوں سرخرو ہوئیں کہ بعد میں ان سے اعلیٰ ظرفی و کمظرفی کا فرق ہی بھول گیا۔ وہ نہایت پستی میں اتر گئیں۔ کمظرف ثابت ہو گئیں مگر انہیں احساس نہ ہوا کہ انہوں نے اپنی کی نیکی پر ہمیشہ غرور کیا اور جس نیکی پر غرور کیا جائے وہ یونہی ضائع ہو جاتی ہے۔ رخسانہ اور کنزئی کی نیکی بھی ضائع ہو گئی تھی۔ وہ غرور نہ کرتیں، قدر کرتیں تو آج حالات مختلف ہوتے۔ وہ ایک نیک اور قابل تعریف کام کرنے کے بعد بھی ملال و شرمندگی میں مبتلا نہ ہوتیں۔ ہم انسان ہمیشہ ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتے ہیں۔ وہ سب بھی ٹھوکر لگتے ہی سنبھلنے کے مرحلے میں داخل ہو گئے تھے۔

''میری آپ سے ایک گزارش ہے چھوٹی بھابھی۔'' وہ رخسانہ اور کنزئی کا ہاتھ تھام کر بولی تھیں وہ سوالیہ نگاہوں سے آبشار کو دیکھنے لگی تھیں۔

''زندگی کچھ سزا جھیلتے، کچھ سزا دیتے ہی گزر گئی۔ میں یہی چاہتی ہوں آگے کی زندگی میں سزا و جزا کا فیصلہ ہم خود نہ کریں۔ سزا و جزا کا کلی اختیار رب کا ہے اور ہم یہ اختیار اپنے رب کے پاس ہی رہنے دیتے ہیں۔ خدا کی مصلحتوں میں اپنی مرضی کے حاشیے کھینچنے سے خدا کے فیصلے، اس کی مصلحتیں نہیں بدلتیں اس لئے اس گناہ کو ترک کر دینا ہی ہم سب کی آگے کی زندگی کو پر سکون بنا سکتا ہے۔'' آبشار اور کنزئی کا لہجہ بے حد سادہ اور ٹھہرا ہوا تھا۔

''میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھی؟'' رخسانہ اورکزئی کا انداز نافہم تھا۔ وہ الجھ کر آبشار کو دیکھ رہی تھیں۔

''ہم انسان بے اختیار ہیں۔ سارے اختیار اس رب کائنات کے پاس ہیں۔ اس کے فیصلوں کو ہم بدل نہیں سکتے۔ اس کے فیصلوں پر سر جھکا کر بندگی کا حق ضرور ادا کر سکتے ہیں۔'' آبشار کا لہجہ کانپ رہا تھا وہ اب باقاعدہ رو رہی تھیں۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ سب شاہ زیب کو معاف کر دیں۔ اس نے جس لڑکی سے شادی کی ہے اس لڑکی کے حوالے کو بھول جائیں اور اسے شاہ زیب کی بیوی کی حیثیت سے ہی نہیں اس گھر کی بہو کی حیثیت سے پورے حق و مان کے ساتھ اس گھر میں رخصت کر کے لے آئیں۔'' آبشار کی بات سے کمرے میں سناٹا پھیل گیا تھا۔ وہ میکانکی انداز میں آبشار کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ کھینچ گئی تھیں۔

''میں جانتی ہوں یہ بہت مشکل ہے مگر ناممکن نہیں ہے۔ جو ظلم اس گھر میں آبدار پر ہوا، میں نہیں چاہتی کہ ہم سب اس ظلم کو دہرائیں۔ وہ لڑکی بے قصور ہے اسے اس کے باپ کی سزا دینا کہیں سے بھی بنتا نہیں ہے مگر پھر بھی شاہ زیب نے اسے کافی سزا دے دی ہے۔ اب اس مسئلے کو یہیں ختم ہو جانا چاہئے۔ اس لڑکی کو عزت سے بہو بنا کر لانا بے حد ضروری ہے ورنہ انتقام کا یہ سلسلہ آگے مزید تباہیاں لائے گا۔'' آبشار نے اپنے آنسو رگڑے تھے اور باری باری دونوں بھابھیوں کی جانب دیکھا تھا۔

''میں محمود خان کو رب کی رضا سمجھ کر معاف کر چکی ہوں۔ بھائی بھی معاف کر چکے ہیں اور معاف کرنے کے بعد کسی اور کو اس گناہ کی سزا دینا نہایت کم ظرفی ہو گی۔ اور وہ لڑکی اب صرف محمود خان کی بیٹی نہیں، ہمارے شاہ زیب کی بیوی ہے۔ ہمارے خاندان کی عزت ہے اور اورکزئی خاندان نے جب جب بہن بیٹی کی عزت رکھی تب تب زندگی مہربان رہی۔ آبشار اور آبدار کی زندگیاں سب کے لئے مثال ہیں۔ ساتھ دیا تو آبشار کا سر اٹھا رہا، ساتھ نہ دیا تو آبدار کا ہی نہیں خاندان کا سر بھی جھک گیا۔ اب محمود خان کی سزا اس کی بیٹی کو نہیں۔ اس خاندان کی عزت اس کی بہو کو دی جائے گی اور میں ایسا نہیں چاہتی۔ بھابھی آپ پلیز شاہ زیب کی بیوی کو دل سے بہو تسلیم کر کے اس گھر میں لے آئیں۔'' آبشار ہچکیوں سے روتے ہوئے بولی تھیں۔

''آبشار ٹھیک کہہ رہی ہے رخسانہ، نفرت و انتقام کا سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیے۔ ہر جیت سر اٹھا کر نہیں حاصل کی جاتی...... کئی دفعہ جیت کے حصول کے لئے جھکنا بھی پڑتا ہے اور ہم سب کو بھی جھک کر دنیاوی و اخروی جیت و کامیابی مل سکتی ہے تو سودا ہرگز بھی نقصان دہ نہیں ہے۔'' تابندہ نے آگے بڑھ کر دیورانی کا ہاتھ تھام کر روتے ہوئے کہنا شروع کیا تھا۔

''ان دونوں بچیوں کو دیکھو، ان دونوں نے کیسے بے گناہی کی سزا کاٹی ہے۔ ان پر زندگی کا، خواہشوں، خوشیوں کا دائرہ کیسے تنگ کر دیا ہم سب نے۔ اب بس بہت ہو گیا۔ ان بچیوں کا بھی خواہش پالنے، خوشیوں کی آرزو کرنے، خواب سجانے کا حق ہے۔ حق مت چھینو۔ حق چھیننے سے قلبی سکون رخصت ہو جاتا ہے۔ سب کچھ رب کی رضا کے لئے کرو۔ زندگی ہم سب کی سہل ہو جائے گی۔ دوسروں کو معاف کر کے آسانیاں دینے والے ہی پرسکون رہتے ہیں۔ ہم سب نے مل کر سکون قلب کی راہیں ہموار کرنی ہیں۔'' آمنہ وہ مومنہ تو وہاں یوں موجود تھیں جیسے نہ ہوں۔ وہ تینوں نند بھاوجیں ہی دکھ سکھ کہہ رہی تھیں اور ان لوگوں کو پتہ ہی نہیں لگا تھا کہ کب جہانزیب اورکزئی وہاں چلے آئے

اور بیوی کے عین سامنے رک کر کہتے چلے گئے تھے۔ رخسانہ نے بس ایک نظر شوہر کو دیکھا تھا انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حوصلہ دیا تھا۔ وہ کچھ دور کھڑیں ان دونوں لڑکیوں کو دیکھنے لگی تھیں جنہوں نے جبرِ مسلسل کی مانند زندگی کاٹی تھی ایسے جرم میں جو ان سے سرزد نہ ہوا تھا۔ رُخسانہ نے آگے بڑھ کر اپنی بیٹی کو ہی نہیں بھتیجی کو بھی گلے سے لگا لیا تھا اور شدتوں سے رونے لگی تھیں۔ جہانزیب اور کزئی نے اپنی بہن آبشار کو کاندھے سے لگا کر اس کے سر پر دستِ شفقت رکھا تھا اور وہ مطمئن ہو گئے تھے۔

ہے دعا یاد مگر حرفِ دعا یاد نہیں
میرے نغمات کو اندازِ نوا یاد نہیں
ہم نے جن کے لئے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہد وفا یاد نہیں
زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں
میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں
کیسے بھر آئیں سرِ شام کسی کی آنکھیں
کیسے تھرائی چراغوں کی ضیاء یاد نہیں
صرف دھندلائے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا، کون ہوا، مجھ سے خفا یاد نہیں
آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں

☆......☆......☆

''ماما! آپ گھر چلی جائیں پلیز۔ اس طرح تو آپ بیمار ہو جائیں گی۔'' وہ کچھ دیر قبل ہی شاہ زیب کے ساتھ ہاسپٹل پہنچی تھی۔ محمود خان کی حالت پہلے سے زیادہ خراب تھی۔ ڈاکٹرز جواب دے چکے تھے۔ شاہ زیب ڈاکٹر سے بات کرنے گیا ہوا تھا اور وہ ماں کے زرد اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر نرم لہجہ میں بولی تھی۔

''نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم میری جانب سے فکرمند نہ ہو۔ جس رب نے پریشانی دی ہے وہی اس سے نمٹنے کا حوصلہ بھی دے گا۔'' نتاشہ کا لہجہ بے حد پرسکون و مربوط تھا۔ انہوں نے بیٹی کا رخسار نرمی سے تھپکا تھا۔

''لیکن ماما۔''

''کہاناں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بیٹی کی بات کاٹ گئی تھیں اس نے لب بھینچ لئے تھے۔

''تم ماشاءاللہ بہت مطمئن لگ رہی ہو۔باری تعالیٰ سے دعا ہے وہ تمہیں ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔'' وہ بیٹی کا چہرہ دیکھ کر پہلی نظر میں ہی چونک اٹھی تھیں موضوع بدلنے کو دھیمے سے مسکراتے لہجہ میں بولی تھیں۔

''شکریہ ماما۔'' وہ ماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولتی تمام بات کا کچھ ضروری حصہ ماں کے گوش گزار کر گئی تھی۔

''ماما! شاہ مجھ سے محبت کرتے ہیں بس یہ احساس میری زندگی کا کل اثاثہ ہے۔آپ دعا کیجئے گا کہ شاہ کی محبت تاحیات میرے لئے روشن سایہ کئے رہے۔اور شاہ کی فیملی میرا حوالہ بھول کر مجھے اپنا لے، بہو تسلیم کر لے۔'' اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔نتاشہ نے بیٹی کو خود سے لگا یا تھا اور اس کا سر تھپکنے لگی تھیں۔

''تم حوصلہ مت ہارنا۔کچھ باتوں کو بھولنا آسان نہیں ہوتا۔ایسے میں رویے خراب ہو ہی جاتے ہیں۔تم خراب رویوں پر بھی دھیان نہ دینا۔جتنا نرم پڑو گی اتنا ہی دل جیتنا تمہارے لیے آسان ہو گا۔نرم مٹی ہر روپ میں ڈھل جاتی ہے اس لیے تم نے ہر وہ روپ اپنانا ہے جس سے تمہارے پاپا کے کئے کا ازالہ ہو سکے۔تمہارے لیے زندگی مہربان ہو سکے۔وہ رشتے تمہارے لیے نرم پڑ سکیں جو کب کے اپنے لیے بھی پتھر ہو گئے ......اور جانتی ہو نا کہ پتھر پر بھی بوند بوند پانی گرے تو اس میں سوراخ ہو جاتا ہے لیکن اس کے لیے بڑی لمبی تپسیا کرنی پڑتی ہے۔خونِ جگر دینا پڑتا ہے۔تم بس حوصلہ نہ ہارنا۔تم یہ یاد رکھنا کہ تم محمود خان کی ہی نہیں نتاشہ کی بھی بیٹی ہو۔اس عورت کی بیٹی جس نے تمام عمر شوہر کا ناجائز رویہ برداشت کیا صرف گھر بنائے رکھنے کے لیے اور عمر کے آخری دور میں بھی شوہر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔محمود کو اس وقت چھوڑنا میرے لیے بے حد آسان ہے مگر میں ایسا نہیں کر سکتی کہ میں نہیں چاہتی کہ میرا کوئی قدم میری بیٹی کے لیے مشکلات کا سبب بنے اور لوگوں کا ایثار پر سے، بیوی کی وفا پر سے اعتبار اٹھ جائے، اعتبار قائم کرنے کے لیے جہد کرنی پڑتی ہے۔اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔پھر سحر ضرور طلوع ہوتی ہے بیٹا۔ہر رات کے پہلو میں دن کے اجالے کی نوید جیت بن کر مسکراتی ہے۔'' وہ بہت نرمی سے، محبت سے بیٹی کو سمجھا رہی تھیں۔زندگی گزارنے کا قرینہ دے رہی تھیں۔وہ ماں کی باتیں غور سے سنتی ماں کے گلے سے لگ کر رونے لگی تھی۔شاہ زیب وہاں سے ہی پلٹ گیا تھا۔اسے نتاشہ کی باتیں سن کر اس عظیم عورت پر بے تحاشہ پیار بھی آیا تھا۔احترام سے ذہن و دل اس کے سامنے جھکتے ہوئے بھی محسوس ہوئے تھے اور وہ بے حد مطمئن بھی ہو گیا تھا کہ وہ عریم کو اس کی ماں کے کردار کے آئینہ میں دیکھ کر اس کا ایک قابل ستائش روپ تراش سکتا تھا کہ بیٹیاں ماؤں کا پرتو ہوتی ہیں۔اور اسے نتاشہ کی اچھائی پر کبھی بھی کوئی شک نہ رہا تھا اور آج کچھ اور یقین ایسا ملا تھا کہ اسے یقین ہو چلا تھا کہ عریم اس کے لیے اس کی آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہترین عورت، ایک اچھی ماں ثابت ہو گی۔اس نے دل ہی دل میں رب کا شکر ادا کیا تھا۔

☆......☆......☆

''مان جایئے ناں بھائی صاحب، میری خاطر۔'' ناشتہ کی ٹیبل پر ہی ان سب نے ان دونوں میاں بیوی کو شادی کی سالگرہ کی مبارک دی تھی اور گفٹس شام میں تقریب میں دینے کا بتا کر مومل ہنسنے لگی تھی۔ فضہ نے اپنی اس نٹ کھٹ بھتیجی کو مسکرا کر دیکھ کر اس کی ناک کھینچی تھی۔ وہ بالکل مومل جیسی تھیں...... یا یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ مومل اپنی پھپھو پر گئی تھی۔ نٹ کھٹ، اظہارِ خیال کرنے میں منہ پھٹ، سب کی فکر کرنے والی۔ وہ گہری سوچ میں تھیں جب شکیل احمد نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعائیں دی تھیں اور وہ جو بات کرنا چاہتی تھیں کر نہیں پائی تھیں۔ مصروفیت اور پریشانی کے باعث ماں سے بھی ذکر کرنے کی مہلت نہ ملی تھی وہ بات ایک دم ہی ان کے منہ سے پھسل گئی تھی۔ شکیل احمد نے قدرے حیرانگی سے بہن کو دیکھا تھا اور وہ بہنوں والے حق کو استعمال کرتے ہوئے ریکوئسٹ کر گئی تھیں۔

''ایک دم یہ کیسا فیصلہ کر کے بیٹھ گئی ہو۔ اتنی جلدی کی کیا ضرورت ہے۔ نوائم تمہاری ہی بہو بنے گی۔ یہ تمہارے بھائی کا تم سے وعدہ ہے۔'' وہ بہن کی آس بھری نگاہوں کو محسوس کرتے ہوئے اس کا ہاتھ شفقت سے اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بہت محبت سے بول گئے تھے۔ ابسام اور نوائم بھی موجود تھے۔ ابسام کا دل اندر ہی اندر ڈوبتا چلا گیا تھا۔ نوائم کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا تھا اس کے چہرے پر حیا کے سارے رنگ بکھر چکے تھے۔

''بس میں چاہتی ہوں کہ آج ہی نوائم اور ابسام کا نکاح ہو جائے۔ رخصتی نوائم کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد۔'' وہ بھائی کو حق سے دیکھتے ہوئے ڈٹ گئی تھیں۔

''اماں! آپ سمجھائیں اسے۔ کیسی بچوں والی ضد لے کر بیٹھ گئی ہے۔'' شکیل احمد بہن کو اتنے بڑے معاملے پر بچوں کی طرح ضد کرتے دیکھ کر جھنجھلا کر ماں کی مدد کے لئے انہیں پکار گئے تھے۔

''بہن ہے تمہاری، حق سے ضد کر رہی ہے تو مان رکھ لو۔'' حاجرہ بیگم نے بیٹی کی سائیڈ کچھ یوں لی تھی کہ ان کا جواب بھی سب کے سامنے آ گیا تھا۔

''دیکھیں بھائی صاحب۔ اب تو اماں بھی راضی ہیں۔'' فضہ اب مزید لاڈ سے بولی تھیں۔

''تمہاری بھابھی راضی نہیں ہوں گی، چاہو تو پوچھ لو۔'' شکیل احمد ایک غصیلے قدرے دھیمے مزاج کے بے حد سنجیدہ آدمی تھے۔ ان کے سامنے کوئی زیادہ ٹھہرتا نہ تھا مگر فضہ ان کی چھوٹی بہن تھی اس کی محبت میں وہ نرم پڑ جاتے تھے اور اس وقت تو وہ کچھ یوں بوکھلائے تھے کہ ایک بے حد غیر متوقع بات کر گئے تھے۔ سب دبے دبے انداز میں ہنسنے لگے تھے۔

''بھئی، میں کیوں راضی نہ ہوں گی۔ جس بہن کو آپ انکار نہیں کر سکتے، میں انکار کر کے کیوں بری بنوں گی۔'' نوائم کی مما گڑبڑاتے ہوئے انداز میں یوں بولی تھیں کہ سب کی دبی دبی ہنسی قہقہوں میں بدل گئی تھی۔ وہ کبھی بھی روایتی بھابھی ثابت نہ ہوئی تھیں کہ فضہ ایک تو دوسرے ملک میں رہتی تھیں اور پرسے ان کا مزاج بھی کافی دوستانہ تھا اور وہ دونوں بھاوجیں بھی اچھے پڑھے لکھے گھرانوں کی سلجھی ہوئی بیٹیاں تھیں، اسی لئے وہ سسرال میں بھی اچھی بہو اور اچھی بھابی ثابت ہوئی تھیں۔

''بہت بہت شکریہ بھابھی۔آپ نے جس حق اور مان کے ساتھ مجھے نوائم سونپی ہے آپ کو کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی میں نوائم کو بہو نہیں بیٹی بنا کر رکھوں گی۔'' فضہ بھائی کے سامنے سے ہٹ کر بھابھی کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھیں۔حیدر صاحب مطمئن سے مسکرا رہے تھے۔موحل نے فرار ہوتی نوائم کا ہی نہیں ابسام کا بھی ہاتھ پکڑ کر وہاں سے جانے سے روکا ہوا تھا اور دونوں کو چھیڑنے لگی تھی مگر وہ دونوں ہی وہاں سے نکل گئے تھے۔نوائم تقریباً بھاگتے ہوئے ابسام سے بھی پہلے وہاں سے جا چکی تھی اور وہ سب نکاح کی تیاری کے بارے میں بات کرنے لگے تھے۔

''کتنی یادگار تقریب ہوگی ہماری شادی کی پچیسویں سالگرہ اور ہمارے اکلوتے بیٹے کا نکاح۔لوگ اس تقریب کو صدیوں یاد رکھیں گے۔'' فضہ حیدر کا اپنا ہی مخصوص بے فکرا کھنکتا ہوا لہجہ تھا جس میں زندگی کے سارے رنگ بکھرے تھے۔انہیں سرپرائز بہت پسند تھے جس طرح ان سب نے پاکستان آ کر سرپرائز دیا تھا اب وہ تمام مہمانوں کو نکاح کا اناؤنس کر کے سرپرائز دینے والی تھیں۔فضہ حیدر کو خوش و مطمئن دیکھ کر وہ سب بھی بے حد مطمئن ہو گئے تھے۔وہ دونوں میاں بیوی ہر لحاظ سے مطمئن تھے کہ انہیں یقین تھا کہ ان کی بہن و نندان کی بیٹی کے لئے روایتی ساس ثابت نہ ہوگی، بہت زندہ دل فضہ حیدر ان کی بیٹی کے لئے شجر سایہ دار ثابت ہوگی اور ماں باپ کے لئے بیٹی کے سکھ سے بڑھ کر کوئی سکھ نہیں ہوتا۔شکیل احمد نے بیوی کے چہرے کی جانب دیکھا تھا اور انہیں مطمئن سا مسکراتے دیکھ کر رب کا شکر ادا کر کے خود بھی مسکرا دیئے تھے۔

☆......☆......☆

آ بھی جا رت بدل جائے گی
چاندنی رات ڈھل جائے گی
رخ سے پردہ ہٹا لیجئے
میری حسرت نکل جائے گی
ان کو لے آؤ چارہ گروں
میری حالت سنبھل جائے گی
تم نہ آؤ نہ تو خط بھیج دو
کچھ طبیعت سنبھل جائے گی
ہے پریشان سنبھالو ذرا
زلف رخ پہ مچل جائے گی
تیرے بن چاندنی میرے گھر
آج آئی نہ کل آئے گی

تیرے کوچے کی سرکش ہوا
خاک چہرے پہ مل جائے گی
اے فنا! دل لگا لو کہیں
زندگی رخ بدل جائے گی

ابسام آفس میں بیٹھا تھا۔معمول کی مانند سارے کام نپٹا رہا تھا مگر دل الجھا ہوا تھا، ذہن بگڑا ہوا تھا اور لب خاموش تھے۔بے حد خاموش جیسے اب کبھی نہ بولیں گے۔اس نے تھک کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا لی تھی اور آنکھیں موند لی تھیں اور جس سے بچنے کو وہ راہِ فرار اختیار کرتا پھر رہا تھا، خود سے چھپتا پھر رہا تھا وہ چھم سے پلکوں کی دہلیز پر آن بیٹھی تھی۔

''آبدار!'' اس نے آنکھیں کھول دی تھیں، لب ہنوز خاموش تھے یہ صدا تو دل سے ابھری تھی اور دل کے سناٹوں میں معدوم ہو گئی تھی۔

''آبدار! میں تمہیں یاد نہیں کرنا چاہتا، میری زندگی کو آزمائش کی بھٹی کی نذر نہ کرو، میں متحمل نہیں ہو سکتا۔'' اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے تھے۔

''ابسام! بہت محبت کرتی ہوں آپ سے، میری محبت کو بس ایک بار شرفِ قبولیت بخش دیں۔آپ سے وعدہ ہے پھر آپ کی راہ میں نہ آؤں گی۔'' سماعتوں میں بھیگی مترنم آواز گونجی تھی۔

''بہت مجبور ہوں آبدار، میرے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہیں۔میں آئیکت کا بھروسہ نہیں توڑ سکتا۔اس کی امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔میری محبت کو سزا نہ دو۔مت یاد آؤ۔خدا کے لئے آبدار، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔نہیں کر سکتا میں اقرار کہ مجھے بھی تم سے محبت ہے۔'' وہ بات جو وہ آبدار کی منتوں کے بعد بھی نہ کہہ سکا تھا آج روتے دل کے ساتھ خود سے کہہ رہا تھا، وہ اقرار جو آبدار کو نہ سونپ پایا تھا وہ اقرار خود سے کر رہا تھا۔محبت کو جھٹلا کر محبت کو محسوس کر رہا تھا۔

جو بات ہم کہہ نہیں سکتے، اسے ہم فرض کرتے ہیں
چلو ہم فرض کرتے ہیں، ہمیں تم سے محبت ہے

''آبدار! تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم اس بھرم میں رہو کہ صرف تم نے مجھ سے محبت کی ہے۔میں تم سے محبت نہیں کرتا کہ جس دن تمہیں یہ لگا پتہ کہ تم محبت کے سفر میں تنہا نہ تھیں۔تم جی نہیں پاؤ گی۔جیسے میں تل تل کر کے مر رہا ہوں۔تمہارے لیے بھی تمہارا ہر سانس آزار بن جائے گا۔بہت بے بس ہو جاتا ہے انسان جسے چاہتا ہے اسے کہہ نہیں سکتا اور کہہ دے تو اسے پا نہیں سکتا۔ہم دونوں کے دل تو ایک دوسرے کے لئے دھڑکنا سیکھ گئے آبدار، لیکن ہم دونوں کبھی ایک ہو نہیں سکتے۔ہماری قسمت کے ستارے ایک الگ سمت میں رواں دواں ہیں۔'' اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔آبدار کو محسوس کیا تھا اور آنسوؤں کو بہہ جانے دیا تھا۔

''میں تمہاری حقیقت سے واقف ہوں۔ میرا دل تمہاری اس نا کردہ خطا کو بخش سکتا ہے۔ میرا دل تمہیں ہر حال میں قبول کر سکتا ہے لیکن میرے پیرنٹس، یہ معاشرہ اور تلخ رسومات یہ حقیقت نہیں تسلیم کر سکتیں۔ میں تم سے محبت تو کر سکتا ہوں۔ تمہیں عزت دلانے کا دعویٰ بھی کر سکتا ہوں مگر تمہیں معاشرے میں عزت و مقام دلا نہیں سکتا کہ کچھ حقیقتیں بدلی نہیں جا سکتیں اور میں تم سے محبت ہونے کے باوجود تمہارے لئے کوئی اسٹیپ نہیں لے سکتا کیونکہ میں اپنے والدین کے خلاف نہیں جا سکتا۔ میں اپنے دوست کا دل نہیں توڑ سکتا۔ اس کا اعتبار نہیں توڑ سکتا۔ میں کمزور نہیں ہوں، بہت مجبور ہوں۔ بے کس ہو، ہجر بانہیں کھولے میرا منتظر ہے اور میں تماش بین بنا ہوا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا آبدار۔ تمہارا مجرم ہوں مگر میں دھوکہ نہیں دے سکتا۔ نہ تمہیں، نہ ہی آئیکت کو۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔'' اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پیرنٹس یہ جان کر کے آبدار اورکزئی خاندان کی بیٹی نہیں ہے کسی گناہ کی پیداوار ہے اسے کبھی بھی بہو تسلیم نہیں کریں گے۔ اس کا دل کہتا تھا کہ وہ حوصلہ کر کے آئیکت کو بتا دے کہ وہ آبدار سے محبت کرتا ہے مگر اسے ڈر لگتا تھا کہ اس کا دوست اس سے بدظن نہ ہو جائے۔ اور وہ اپنے دل کے لئے، اپنے دل کی خوشی کے لئے آئیکت کی خوشی اس کی محبت نہیں چھین سکتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جو عزت و محبت اسے آئیکت دے سکتا ہے، جو مان اسے آئیکت کی فیملی سے مل سکتا ہے اس کی فیملی سے نہیں مل پائے گا۔ اس لئے اس نے آبدار کی محبت کا جواب بے رخی سے دیا تھا۔ اس کا دل تڑپ رہا تھا مگر اس کے ہجر کو گلے لگانا اس کی مجبوری تھی۔ وہ خود غرض نہیں تھا۔ اس لئے آئیکت کا سوچ رہا تھا۔ وہ آئیکت کی محبتوں کا امین تھا اور وہ دوست کی محبت پر شب خون نہیں مار سکتا تھا۔ اسے آبدار کا بھی خیال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آبدار ایک اچھی پرسکون زندگی گزارے جس میں اپنوں کے ساتھ ہو۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنی محبت کا واسطہ دے کر والدین کو شادی کے لئے راضی تو کر سکتا ہے۔ آبدار کو ان کی بہو تو بنا سکتا ہے مگر آبدار کا مقام ان کے دل میں نہیں بنا سکتا اس لئے اسے یہی ٹھیک لگتا تھا کہ آبدار کی شادی آئیکت سے ہو مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ آئیکت کی فیملی نے بھی اسے ٹھکرا دیا تھا اسی لئے وہ دربدر ہوئی تھی۔ آئیکت نے اسے آدھی ادھوری سچائی بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ کچھ فیملی اشوز ہیں۔ آبدار کی جان کو خطرہ ہے اس لئے وہ آبدار کو اپنے گھر پر رکھنے کے لئے راضی ہو گیا تھا۔ اس پر آبدار کا راز کھلا تھا اور وہ سناٹے میں آ گیا تھا۔ اسے بس یہی بتایا تھا آئیکت نے کہ وہ اس کی پھپھو کی ان چاہی بیٹی ہے۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان کی فیملی میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اور وہ یہ خود سے سوچ نہیں سکتا تھا کہ اسے تو سامنے کی حقیقت نظر آ رہی تھی۔ اسے یہ نظر آ رہا تھا کہ آبدار کے نام کے ساتھ اورکزئی لگا تھا۔ وہ اس بات پر مطمئن تھا کہ جو خوشیاں، مان وہ آبدار کو نہیں دلا سکے گا وہ آئیکت کی ہمراہی میں اسے میسر ہو گا۔ وہ کتنی بڑی غلط فہمی کا شکار تھا۔ وہ آئیکت کے دل کا سوچ کر، آبدار کے مان کا سوچ کر۔ اپنے لئے کانٹوں بھری ہجر زدہ زندگی چن رہا تھا۔ اسے ذرا بھی شک ہوتا کہ آبدار کے ساتھ ان سب کا رویہ اچھا نہیں۔ تابندہ اسے اپنی بہو بنانے کو نہیں راضی ......تو وہ آبدار کے حق میں فیصلہ کر کے ماں کو منا لیتا لیکن وہ ایک بھرم میں تھا اور اس نے اپنے طور پر آبدار کے لئے خوشیوں بھری، عزت و مان سے جگمگاتی زندگی چن لی تھی۔ بعض دفعہ لاعلمی کیسے دل کا خون کر دیتی ہے۔ غلط فیصلے کروا دیتی ہے۔ یہ انسان کو سمجھ نہیں آتا۔ ابسام بھی انجان تھا۔ انجانے میں اپنے ہی نہیں آبدار کے ساتھ بھی بے حد غلط کرنے جا رہا تھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہیں بہت جلد میری شادی کی خبر ملے گی۔ آج جب تم ویڈنگ اینورسری کی رنگارنگ تقریب میں شریک ہو گی تو تم پر انکشاف ہو گا کہ میں راہ بدل گیا ہوں۔ میں نے اپنا آپ نوائم کے نام کر دیا ہے۔ اس کے تمام حقوق اپنے نام کروا لئے ہیں۔ یہ انکشاف تمہیں وقتی طور پر بہت دکھی کر دے گا مگر مجھے یقین ہے کہ جب تم آئیکت کے ساتھ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرو گی تو تمہارا دکھ کم ہو جائے گا۔ آئیکت کی محبت، تمہیں میری محبت بھلانے میں مدد دے گی۔'' اس نے آنکھیں اور چہرہ رگڑ ڈالا تھا۔

''میری دعا ہے آبدار کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔ تمہاری زندگی میں کبھی کوئی غم نہ آئے۔'' اس نے آبدار کو اپنے پاس محسوس کرتے ہوئے اسے دعا دی تھی یہ جانے بغیر کہ کچھ لوگوں کو دعائیں راس نہیں آتیں۔

نہ گلہ کیا نہ خفا ہوئے یونہی راستے میں جدا ہوئے
نہ تو بے وفا نہ میں بے وفا جو گزر گیا سو گزر گیا
وہ غزل کی اک کتاب تھا وہ گلوں میں ایک گلاب تھا
ذرا دیر کا کوئی خواب تھا جو گزر گیا سو گزر گیا
وہ اداس دھوپ سمیٹ کر کہیں وادیوں میں اتر گیا
اسے اب نہ دے میرے دل صدا جو گزر گیا سو گزر گیا
مجھے پت جھڑوں کی کہانیاں، نہ سنا سنا کر اداس کر
تو خزاں کا پھول ہے مسکرا، جو گزر گیا سو گزر گیا
تجھے اعتبار و یقین نہیں، نہیں دنیا اتنی بری نہیں
نہ ملال کر میرے ساتھ آ، جو گزر گیا سو گزر گیا
یہ سفر بھی کتنا طویل ہے، یہاں وقت بھی کتنا قلیل ہے
کہاں لوٹ کر کوئی آئے گا جو گزر گیا سو گزر گیا

❁ ❁

(جیتوں تو تجھے پاؤں ناول ابھی جاری ہے، بقیہ واقعات آئندہ ماہ، اگلی قسط میں ملاحظہ فرمائیں)

''کیسے ہیں آپ۔''اس کے اٹھتے قدم فارس نقوی کو دیکھ کر رکے تھے اور وہ اسے سلام کر گئی تھی۔وہ جو اسے دیکھ کر خود کو سنبھال نہیں پایا تھا وہ اس سے خیریت پوچھنے لگی تھی۔

''دھوکہ کھا کر کوئی کیسا ہو سکتا ہے؟'' وہ خود کو کمپوز نہ کر پایا تھا اور الٹا اس سے سوال کر گیا تھا وہ جو پہلے ہی فارس کے سامنے کے خیال سے ہی شرمندہ تھی اس کا سر ندامت سے جھکتا چلا گیا تھا۔محمود خان کی حالت بدستور خراب تھی۔ڈاکٹرز نے جواب دے دیا تھا اور نتاشہ نے سب کے مشورے پر انہیں گھر پر شفٹ کروا لیا تھا کیونکہ ڈاکٹرز تو جواب دے چکے تھے۔انہوں نے ڈسچارج کروا لینے کا بھی کہہ دیا تھا۔ نتاشہ سب کے کہنے پر راضی ہوئی تھیں۔انہوں نے دو نرسوں کا بھی انتظام کروا لیا تھا۔وہ جانتی تھیں کہ صرف سانس اٹکی ہوئی ہے اور وہ سانس ہے تو آس کے مصداق اپنی سی ہر ممکن کوشش کر لینا چاہتی تھیں۔فارس نقوی جو خود بیمار تھا اس کے زخم بھی مندمل نہ ہوئے تھے مگر خالو کی طبیعت کا گاہے بگاہے سن رہا تھا۔ان کے گھر شفٹ ہو جانے کا سن کر انہیں دیکھنے آیا تھا کہ پہلا سامنا دشمن جاں سے ہو گیا تھا۔عریم وہ پہلی لڑکی تھی جس کے فارس نے خواب سجائے تھے،جس کے لئے محبت محسوس کی تھی اور اس نے کیسا دھوکہ کیا تھا انگوٹھی اس کے نام کی پہن لی تھی اور بیوی کسی اور کی بن گئی تھی۔اس کی آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگی تھیں۔

''میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔''عریم نے نظر ندامت سے جھکائے جھکائے نم لہجہ میں منت کی تھی۔

''کتنی محبت تھی تمہارے لئے میرے دل میں۔تمہاری خوشی کے لئے میں نے انکل کو راضی کیا۔اور تم دھوکہ دے رہی تھیں۔''فارس کی آنکھوں میں ضبط کی لالی بکھر گئی تھی۔

''میں آپ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتی تھی مگر پاپا میری نہیں سن رہے تھے۔میں بہت مجبور ہو گئی تھی۔''اس نے تمام تفصیل فارس کے سامنے بیان کر دی تھی۔

''مگر تمہیں انکل کے خلاف جا کر نکاح نہیں کرنا چاہیے تھا۔تمہارے سبب انکل کی یہ حالت ہے۔گر انہیں کچھ ہو گیا تو کیا تم خود کو معاف کر پاؤ گی۔خوش رہ پاؤ گی۔''وہ رونا بھول کر حیرت سے فارس کو دیکھ رہی تھی۔وہ کیا کہہ رہا تھا وہ بالکل بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔وہ نا سمجھی کا اظہار کرتی کہ اسی پل وہاں نتاشہ چلی آئی تھیں اور فارس ان کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔وہ فارس کے سلام کا جواب دیتیں اسے محمود خان کے روم میں جانے کا کہہ گئی تھیں اور فارس کے منظر سے ہٹتے ہی نتاشہ جو کچھ بولی تھیں اسے سن کر عریم حیرت و صدمہ سے پتھرا کر رہ گئی تھی۔

''ہو سکے تو اس کے لئے مجھے معاف کر دینا عریم مگر مجھے محمود کا پردہ رکھنے کے لئے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔''وہ نرمی سے بولی تھیں کہ انہوں نے بہن کو بتایا تھا کہ عریم نے کسی لڑکے سے نکاح کر لیا تھا اور یہ بات ان لوگوں کے سامنے آئی تو محمود یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ ماں کے ذریعے تمام بات فارس تک بھی پہنچ گئی تھی اس کا تو دل ہی بے نیل و بے مراد رہ گیا تھا مگر وہ اب کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی محبت کسی

کی بیوی بن چکی تھی۔

''ماما! یہ جھوٹ کب ہے۔ یہ ہے تو سچ ہی اس لئے آپ نے جو کہا درست کہا۔'' وہ خود کو سنبھال کر بولی تھی۔

''محمود کا عیب رکھنا میری مجبوری نہیں، میرا فرض ہے مگر اس فرض کو نبھاتے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ تمہاری خالہ تم سے سخت ناراض ہیں۔ تمہیں اب ساری زندگی ان کی ناراضگی وغصہ برداشت کرنا پڑے گا مگر میرے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں محمود کا راز عیاں نہ ہو جائے......اور تمہارے نکاح کا بھی کبھی تو بتانا ہی تھا۔'' نتاشہ بیٹی کے سامنے شرمندہ تھیں مگر اسے ماں کا فیصلہ درست لگا تھا۔

''ماما! میرے نکاح کا تو پتا چلنا ہی تھا۔ ایسے میں اگر پاپا کا بھرم بھی رہ گیا ہے تو یہ بات میرے لئے شرمندگی کا باعث نہیں ہے اور میں آنی کو منالوں گی۔'' وہ مسکرا کر ماں کو دیکھنے لگی تھی۔ وہ بیٹی کا سر تھپکتیں وہاں سے نکل گئی تھیں۔ رات ہی محمود خان کو ڈسچارج کیا گیا تھا اور شاہ زیب نے اسے اپارٹمنٹ چھوڑنے کی بجائے اس کے گھر چھوڑ دیا تھا اور شاہ زیب گھر پہنچا تھا تو اسے سب کے فیصلے سے آگاہی مل گئی تھی۔ یہ بات اس کے اطمینان کے لئے کافی تھی کہ اس کے والدین اس کی بیوی عریم کو رخصت کروا کر اور کزنی ہاؤس میں لانے کو تیار ہو گئے ہیں۔ اس نے فی الحال عریم کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ عریم نے آنسو گرتے ہوئے کمرے کی طرف بڑھنا چاہا تھا کہ ملازمہ سیل فون لئے چلی آئی تھی۔

''یہ تو پاپا کا موبائل ہے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ملازمہ کے ہاتھ سے موبائل لیتے ہوئے زیرلب کہا تھا۔

''جی چھوٹی بی بی۔ بڑے صاحب کا موبائل ہے۔ جانے کب سے بج رہا تھا تو سوچا آپ کو دے دوں۔'' ملازمہ بول رہی تھی مگر وہ سن کہاں رہی تھی اس کی نظر تو اسکرین پر بلنک ہوتے نمبر پر تھی۔

''یہ تو ہمارے فارم ہاؤس کا نمبر ہے۔'' وہ بڑبڑائی تھی۔ کال ریسیو کرتی کہ لائن کٹ چکی تھی۔ وہ لینڈ لائن نمبر تھا جس سے چھ مسڈ کالز آئی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر سیل فون لئے اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور آتے ہی اس نے کال ہسٹری چیک کی تھی۔ لاسٹ کال جو ریسیو ہوئی تھی وہ نمبر ایس بی کے نام سے سیو تھا۔ چیک کرنے پر اسے پتہ لگا تھا کہ یہ نمبر شاہ زیب کا ہے۔ لاسٹ ڈائل کال اسی لینڈ لائن نمبر پر تھی جس سے پہلے بھی کئی بار مسڈ کالز آ چکی تھیں۔ سیکنڈ لاسٹ کال ایک موبائل نمبر پر تھی اور یہ نمبر سیو نہیں تھا۔ گزشتہ دو دن میں اس موبائل نمبر سے بھی کئی بار مسڈ کالز آ چکی تھیں۔

''یہ آخر کون ہے جو پاپا کو بار بار کال کر رہا ہے۔'' وہ بری طرح الجھ کر سوچ رہی تھی۔

''اور جہاں تک میرا خیال ہے۔ فارم ہاؤس تو بند ہی رہتا ہے وہاں تو چوکیدار کے علاوہ کوئی ملازم بھی نہیں رکھا ہوا پاپا نے۔ تو پھر وہاں کے لینڈ لائن سے کون مستقل پاپا کو کال کر رہا ہے۔'' وہ میسج انبوکس چیک کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ انبوکس بالکل خالی تھا۔ ریسیو ٹیکسٹ اور سینڈ میسجز سب ڈیلیٹ تھے۔

''ماما سے پوچھتی ہوں۔شاید انہیں کچھ معلوم ہو۔'' وہ کچھ سوچ کر آگے بڑھی تھی کہ سیل فون جو تا حال اس کے ہاتھ میں تھا پھر شدومد سے بجنے لگا تھا۔وہ شش و پنج میں تھی کہ کال ریسیو کرے یا نہ کرے کہ محمود خان جتنے سخت مزاج آدمی تھے انہوں نے بیٹی تو کیا کبھی اپنا موبائل بیوی کو بھی ہاتھ لگانے کی اجازت نہ دی تھی۔جس وقت نتاشہ آناً فاناً محمود خان کو ملازموں کی مدد سے ہاسپٹل لے کر گئی تھیں وہاں نرس نے انہیں محمود خان کی پینٹ کی پچھلی پاکٹ سے برآمد ہونے والا موبائل لا کر دیا تھا جس پر انہوں نے شاہ زیب کی کال ریسیو کی تھی اور موبائل اپنے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا تھا اور جب گھر آئی تھیں انہیں موبائل نکالنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔وہ گاڑی میں بیٹھنے کو تھیں جب ان کے موبائل پر کال آنے لگی تھی اور انہوں نے اپنی بہن شائستہ کو محمود خان کی طبیعت کا بتا کر اپنا موبائل بیگ میں ڈالا تھا اسی وقت ان کی نظر محمود خان کے موبائل پر پڑی تھی۔انہوں نے موبائل نکال کر ملازمہ کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''صاحب کا موبائل ان کے کمرے میں رکھ دو۔'' ملازمہ اثبات میں گردن ہلاتی موبائل پکڑ گئی تھی اور اس نے وہ کچن میں ہی رکھ لیا تھا اور رکھ کر بھول گئی تھی۔ایک دو بار جب بھی بجا وہ ان سنا کر گئی تھی کہ پڑھی لکھی نہ تھی اسے نہیں پتہ تھا کہ اس پر کال کیسے ریسیو ہو گی۔جب جب موبائل بجتا تھا وہ سوچتی تھی کہ کام سے فارغ ہوتے ہی صاحب کا موبائل ان کے کمرے میں رکھ آئے گی مگر ہر بار بھول جاتی تھی اور آج جیسے ہی بجنا شروع ہوا تھا وہ کچھ سوچ کر کچن سے نکلی تھی۔اس کا ارادہ تھا کہ وہ بڑی بیگم صاحبہ کو ہی واپس پکڑا دے گی مگر اس کی نظر عریم پر پڑی تھی اور وہ چھوٹی بی بی کو فون پکڑا کر واپس کچن میں چلی گئی تھی۔عریم نے ماں سے بعد میں ڈسکس کرنے کا سوچتے ہوئے کال ریسیو کر لی تھی۔وہ ہیلو بولتی کہ اس سے قبل ہی ایک مردانہ (قدرے بے قراری لئے) آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

''صاحب! آپ تو مجھے مصیبت میں پھنسا کر غائب ہی ہو گئے۔میری کال بھی نہیں اٹھاتے۔میں کال کر کر کے تھک گیا۔اس لڑکی کا کیا کرنا ہے بتا دیں۔اس لڑکی نے تو میرا جینا حرام کیا ہوا ہے۔'' کال اتنی مشکلوں سے اٹینڈ ہوئی تھی اسی لحاظ سے دوسری جانب بے قراری و عجلت کا مظاہرہ ہوا تھا اور عریم تو ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

''صاحب! بولتے کیوں نہیں۔کیا کروں اس لڑکی کا۔آزاد کر دوں یا اوپر پہنچا دوں۔کوئی حکم کریں بس۔'' مردانہ آواز میں اب بے قراری کی جگہ راز داری اور وفاداری و جانثاری بولنے لگی تھی۔عریم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا مگر اس کے ذہن نے بڑی تیزی سے کام کیا تھا۔دوسری جانب موجود شخص کو شک ہوتا اس سے قبل ہی اس نے لائن کاٹ دی تھی۔

''یہ شخص کون تھا۔کس لڑکی کی بات کر رہا تھا۔'' وہ بری طرح الجھ کر سوچ رہی تھی کہ یکدم اس کے ذہن میں کوندا سا لپکا تھا۔

''او مائی گاڈ۔پاپا ایسا نہیں کر سکتے۔'' اس نے اپنی ہی سوچ کی نفی کی تھی۔

''پاپا سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔شاہ کو کال کرنی چاہیئے۔'' وہ لرزتے دل کے ساتھ بیڈ کی طرف لپکی تھی اور تکیہ کے نیچے پڑا اپنا سیل فون اٹھایا تھا۔

''اف ۔شاہ پلیز میری کال ریسیو کریں ۔اٹس ارجنٹ ۔'' تیسری بیل پر بھی کوئی شنوائی نہ ہوئی تھی اور چوتھی بیل جانے ہی لگی تھی کہ لائن کاٹ دی گئی تھی ۔اسے شاہ زیب پر غصہ آیا تھا مگر اس نے کچھ سوچ کر اب کے اسے ٹیکسٹ کیا تھا جس کا اگلے منٹ پہ جواب حاضر تھا۔

''بہت ضروری کام سے کہیں جا رہا ہوں ۔بعد میں کروں گا بات ۔'' اس نے لب بھینچ لئے تھے اور پھر کال کرنے لگی تھی ۔

''شاہ ۔میری کال ریسیو کریں کہیں بہت دیر نہ ہو جائے ۔آبدار ۔''اس نے اپنے اپارٹمنٹ کی جانب بڑھتے ہوئے عریم کی کال کاٹ دی تھی تب اس نے پھر میسج کیا تھا ۔اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ اپنے شک کا کس طرح اس کے سامنے اظہار کرے وہ بھی میسج میں اس لئے اس نے کال ریسیو کرنے کی درخواست کے ساتھ محض آبدار کا نام لکھ دیا تھا ۔اسے یقین تھا کہ وہ میسج پڑھتے ہی اسے کال کرے گا ۔

''تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو ۔'' آبشار ایک طویل عرصہ بعد گھر سے نکلی تھیں وہ بھی بھتیجے کے مجبور کرنے پر شاہ زیب نے ان سے کہا تھا کہ وہ انہیں کہیں لے جانا چاہتا ہے ۔وہ انکار کر گئی تھیں تب انہیں شاہ زیب نے اپنی قسم دی تھی اور وہ شاہ زیب سے جس قدر محبت کرتی تھیں چپ کر گئی تھیں اور ہار ماننے والے انداز میں پوچھا تھا کہ کب تک جانا ہے اور اس نے آدھے گھنٹے تک تیار ہو جانے کا کہہ دیا تھا اور ان کے ہی کمرے میں نیم دراز ہو گیا تھا۔

''کسی سے ملوانا چاہتے ہو؟''انہوں نے دھیمے سے پوچھا تھا۔

''شاید......'' وہ مسکرایا تھا۔

''ابھی ہی چلتے ہیں تا کہ ایک گھنٹہ تک عصر سے پہلے واپس آ جائیں ۔'' وہ دھیمے سے کہتیں جانے کو تیار تھیں اس نے اپنی پھپھو کو دیکھا تھا ۔بے حد گوری رنگت ،سفید دوپٹے کے ہالے میں دمک رہی تھی ۔تیکھے نین نقش ،متناسب سراپا ،وہ بے حد حسین تھیں ۔شاہ زیب کی آنکھیں احترام سے جھک گئی تھیں ۔وہ کچھ سوچ کر اٹھا تھا اور اس نے پھپھو کی وارڈ روب کھولی تھی ۔اس نے اپنی پھپھو کو کئی سالوں سے بے حد پھیکے رنگ کے بالکل سادہ کپڑے پہنے دیکھے تھے مگر اسے اندازہ تھا کہ اس کی پھپھو اپنے زمانے میں کافی خوش لباس ہوں گی اس لئے اس نے وارڈ روب کھولی تھی ۔آبشار پہلے تو حیران ہوئی تھیں پھر اسے دیکھنے لگی تھیں ۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے شاہ ،خواتین کی الماریوں میں جھانکا تا کی کرتے شرم آنی چاہئے ۔'' آبشار سخت متحیر و قدرے غصہ میں تھیں ۔اس نے ایک کے بعد دوسرا ڈور کھول کر متلاشی نگاہیں گھمائی تھیں اور ایک ہینگر کھینچ کر ڈور بند کر دیا تھا ۔

''خواتین کی الماریوں کی تلاشی لینا قبیح فعل ہو سکتا ہے مگر ماں جیسی پھپھو کی الماری میں گھسنا شرارت اور مجبوری ہو سکتی ہے جس پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتا ۔آپ بھی نہیں بیوٹی فل لیڈی ۔'' شاہ زیب نے احترام و شرارت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہتے ہوئے حیران کھڑی پھپھو کی جانب دیکھا تھا ۔

''آپ یہ ڈریس پہن کر تیار ہو جائیں ۔'' وہ جو بھتیجے کے انداز پر ہی چپ کی چپ رہ گئی تھیں اس کے ہاتھ میں موجود ڈریس کو دیکھ کر ان کو

اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ یہ وہی ڈریس تھا جو انہوں نے اس شام پہنا تھا جس شام کبیر عباسی کو الوداع کہنے کافی شاپ گئی تھیں۔

''کیا ہوا ہے پھپھو۔'' شاہ زیب، پھپھو کو کانپتے دیکھ کر ان کے کاندھے تھام گیا تھا وہ ان کی کیفیت سے انجان تھا اور ان کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''تم یہ ڈریس واپس رکھ دو۔ تم تو جانتے ہو میں ایسے ڈریسز نہیں پہنتی۔'' وہ کانپتے لہجے میں بولی تھیں۔

''پھپھو۔ زندگی کا بہت سا وقت بے رونق مانند خزاں گزر گیا۔ اب زندگی کی بہار آپ کو تلاش کرتی ہوئی آپ تک آنا چاہے تو آپ اسے نہ روکیں۔ زندگی پر، زندگی کے رنگوں پر آپ کا بھی حق ہے۔'' وہ ڈریس ان کے ہاتھ میں زبردستی پکڑاتے ہوئے نرمی سے کہتا ان کے آنسو صاف کرنے لگا تھا۔

''مجھے کسی بہار کا انتظار نہیں ہے شاہ زیب۔ میں اپنی زندگی سے سمجھوتہ کر چکی ہوں۔'' وہ سسکی تھیں۔

''پھپھو۔ سمجھوتہ تو رشتوں کو نکھار دیتا ہے ناں، اور دیکھیں آپ نے اگر سمجھوتے کیئے تو آپ کے رشتوں نے بھی آپ کا کتنا ساتھ نبھایا......مگر اب زندگی کو سمجھوتہ سے آگے نکل جانا چاہیئے۔ بہاریں آپ کی بھی منتظر ہیں۔ خوشیوں پر آپ کا بھی حق ہے۔'' وہ بہت نرمی سے بول رہا تھا اور وہ رونے لگی تھیں۔ اس نے پھپھو کو کاندھے سے لگا کر ان کا سر تھپکنا شروع کر دیا تھا۔

''پھپھو، آپ نے اپنے ہر راز کا امین بنایا۔ اپنے ذہن و دل کی بات مجھ سے کہی، میں آپ کے لئے اب کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ ایسا کچھ جو آپ کی پھیکی زندگی کو گل گلزار کر دے اور آپ بس مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ آپ کا یہ بیٹا آپ کے ساتھ اب کچھ غلط نہ ہونے دے گا۔ آپ یہ لباس میرے یقین کی روشنی میں زیب تن کر کے میرے ساتھ چلیں۔ سبز رنگ خوشحالی کی ٹھنڈک کی علامت ہے اور مجھے یقین ہے کہ آج آپ کی زندگی یوٹرن لے گی۔ آپ کی زندگی میں خوشیاں ٹھنڈی چاندنی کی مانند بکھر جائیں گی۔ بس ایک بار مجھے وہ کرنے دیں جو میں کر رہا ہوں۔ مجھے آج اتنا حق دے دیں کہ میں جو چاہوں، جیسے چاہوں کروں۔ آپ بس اپنے بیٹے کا مان رکھ کر چپ چاپ کرتی جائیں۔'' اس نے محبت و عقیدت سے اپنی پھپھو کی صبیح پیشانی پر بوسہ دیا تھا اور وہ الجھ گئی تھیں کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر بھتیجے کے لبوں پر حق و مان کی داستان تو آنکھوں میں التجا تھی۔ وہ جسے نظر انداز نہ کر پائی تھیں۔ شاہ زیب نے نیچے گرا ڈریس اٹھا کر پھپھو کی طرف بڑھایا تھا اور وہ جسے کانپتے ہاتھوں سے پکڑتیں واش روم کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ اس نے ان کے منظر سے ہٹتے ہی کبیر عباسی کو فون کر دیا تھا۔ اس نے ایک طویل عرصہ بعد یا شاید اپنے ہوش میں پہلی دفعہ اپنی پھپھو کو گہرا سبز رنگ پہنے دیکھا تھا۔ اس کے دل سے دعا نکلی تھی کہ یہ رنگ ان کی زندگی میں خوشحالی لے آئے۔ اس نے ماں کو ناشتہ کے بعد ہی بتا دیا تھا کہ وہ آبشار کو آج اپنے ساتھ کہیں لے جائے گا جس وقت وہ بھتیجے کے ساتھ چلتیں لاؤنج میں آئی تھیں رخسانہ کچن کی طرف بڑھ رہی تھیں آبشار کو دیکھ کر چونک اٹھی تھیں۔ سادگی کے باوجود گہرے سبز رنگ کی چنری کے ہالے میں ان کا پرنور گلابی چہرہ دمک رہا تھا۔ رخسانہ نے دل ہی دل میں ''ماشاءاللہ'' کہا تھا اور آگے بڑھ کر آبشار کے سر پر دستِ شفقت رکھ دیا تھا۔

''بڑی آرزو تھی کہ تمہیں خوش و خرم رنگوں سے سجا دیکھیں۔آرزو تو پوری نہ ہوئی مگر آج اس رنگ میں تمہیں دیکھ کر دل خوشی سے بھر گیا ہے۔'' رُخسانہ نے اپنی اکلوتی نند کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔آبشار کی آنکھیں پانیوں سے بھرنے لگی تھیں۔آبشار یا رخسانہ کچھ کہتیں اس سے قبل ہی شاہ زیب نے پھپھو کا ہاتھ تھاما تھا اور باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔وہ راستے میں تھا جب عریم کی کال آنے لگی تھی جسے وہ نظر انداز کر گیا تھا۔اس نے آبشار کو اپارٹمنٹ میں چھوڑا تھا اور خود باہر نکل گیا تھا۔خالدہ بی کو اُس نے رات ہی عریم کو اس کے گھر چھوڑ کر اپارٹمنٹ سے پک کر کے اور کزئی ہاؤس چھوڑ دیا تھا۔اس نے باہر نکل کر کبیر عباسی کا نمبر ڈائل کیا تھا۔وہ کچھ ہی دیر میں وہاں پہنچنے کا بتا کر رابطہ منقطع کر گئے تھے۔اس کے موبائل پر پھر عریم کی کال آنے لگی تھی۔اس نے لب بھینچ لئے تھے وہ کال ریسیو کرتا کہ اسے کبیر عباسی آتے دکھائی دیئے تھے۔اس نے لائن کاٹ دی تھی۔میسج کی پھر گھنٹی بجی تھی۔اس نے اپنی طرف بڑھتے کبیر عباسی کو دیکھتے ہوئے بے خیالی میں میسج اوپن کر دیا تھا۔

''خدا کے واسطے شاہ، میری کال ریسیو کریں۔میرا اس وقت آپ سے بات کرنا بے حد ضروری ہے۔میں آپ کو آبدار کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔'' کبیر عباسی اس کے عین سامنے آن رکے تھے۔اس کی نظریں موبائل اسکرین پر جمی تھیں۔اس نے عریم کے تینوں میسج پڑھ ڈالے تھے اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔کبیر عباسی بھی چونک اٹھے تھے۔وہ کچھ پوچھتے کہ اس نے اپارٹمنٹ کا فلور اور نمبر بتایا تھا اور چابیاں ان کے حوالے کر دی تھیں۔

''پھپھو سے آپ بات کر لیں اور واپسی پر انہیں گھر ڈراپ کر دیجیئے گا۔مجھے ارجنٹ لی کہیں پہنچنا ہے۔''اس نے چابیاں دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اپارٹمنٹ جاتے ہوئے لاک کر دیں اور اس نے باقی ہدایت بھی بڑی جلدی میں دی تھی وہ پریشان ہو گئے تھے۔استفسار بھی کیا تھا۔

''جی سب ٹھیک ہے۔آپ پریشان نہ ہوں۔میں چلتا ہوں۔'' وہ کبیر عباسی کو موقع دیئے بنا اپارٹمنٹ کی تفصیل بتا کر وہاں سے بڑی تیزی میں نکلا تھا اور اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں پہنچ گیا تھا۔اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے عریم کو کال ملائی تھی۔عریم نے محمود خان کے موبائل پر آنے والی کال سے اپنے شک تک کی تفصیل شاہ زیب کے گوش گزار کر دی تھی۔

''تم گیٹ پر پہنچو میں دس منٹ تک تمہیں پک کر لیتا ہوں۔'' وہ تفصیل سن کر بولا تھا۔

''کیا آپ کے ساتھ جانا میرا بہتر رہے گا۔'' وہ مضطرب ہو گئی تھی اور اس نے فقط ''ہاں'' کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔وہ عریم کو ساتھ دو وجوہات کی بناء پر لے جا رہا تھا۔اول کہ اس کی مدد سے فارم ہاؤس تک با آسانی پہنچ جائے گا اور اس کا تلاش میں وقت ضائع نہ ہو گا۔دوم کہ وہ وہاں پر موجود ملازموں کہ پہچان کر حکم دے سکتی تھی۔اسے وہاں عریم کا لے جانا رسک بھی محسوس ہو رہا تھا مگر وہ جو پلاننگ سوچ رہا تھا اس کی کامیابی کے لیے عریم کو ساتھ لے جانا ضروری تھا۔اس نے آئیکت کو فون کر دیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی ہی نہیں شاہ زیب کی پستول بھی لیتا آئے۔سوئے اتفاق کہ آئیکت گھر پر ہی تھا اس لئے اس نے اپنی ہی نہیں آئیکت کے لاکر سے اس کی پسٹل بھی نکالی تھی اور تیزی سے باہر کی جانب لپکا تھا۔آئیکت کو اس نے ملنے کا مقام بتا دیا تھا۔شاہ زیب کا ارادہ تھا کہ آئیکت اس کی گاڑی کو فالو کر کے پہنچے یہی مناسب ہو گا کیونکہ اسے آئیکت سے اپنی پستول بھی لینی تھی۔اس نے عریم کو پک کر لیا تھا اور وہ نئے سرے سے اسے بتا رہی تھی اور

وہ اسے اپنی پلاننگ سے آگاہ کر گیا تھا۔ اس نے یہی پلان کیا تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر کچھ ظاہر کئے بنا ایک رات ٹھہرنے کے ارادے سے آنے کا کہے گی اور یہ بھی ساتھ کہہ دے گی کہ محمود خان اور ان کی اہلیہ بھی آدھ گھنٹہ تک پہنچ جائیں گے۔ عریم جو کافی ڈری ہوئی تھی اسے اب قدرے اطمینان ہوا تھا۔ وہ تو بس یہی دعا کر رہی تھی کہ اس کا شک جھوٹا ثابت ہو جائے۔ آبدار کو اس کے پاپا نے کڈنیپ نہ کیا ہو کہ اس طرح ایک اور گناہ ان کے کھاتے میں لکھا جائے گا اور وہ اور اس کی ماما سب کے سامنے مزید جھوٹے پڑ جائیں گے۔

''یا اللہ! مدد کرنا میری، چاہتی تو یہی ہوں کہ آبدار کو پاپا نے کڈنیپ نہ کیا ہو اگر وہ ایسا کر گئے ہیں تو آبدار ہمیں بالکل ٹھیک، باحفاظت، باعزت مل جائے ورنہ میں شاہ سے نظر نہیں ملا پاؤں گی۔'' وہ مضطرب سی دل ہی دل میں رب سے التجا کرتی۔ ہتھیلیوں کو باہم جوڑے مسلتے ہوئے لب چبا رہی تھی۔

''تم پریشان نہ ہو۔ اللہ نے راہ دکھائی ہے، وہی آسانی بھی عطا کرے گا۔'' وہ شاہ زیب کی آواز پر چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

''شاہ! اگر میرا شک درست نکلا تو میں، میں تو آپ سے نظر ملانے کے بھی قابل نہ رہوں گی۔'' وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ اس نے لب بھینچ لئے تھے۔

''میں نے اس نہج پر جا کر نہیں سوچا تھا عریم، میں محمود خان کی سانپ کی سی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود بھی جان ہی نہ سکا کہ وہ اتنا بھی گر سکتا ہے۔ نہیں سوچ سکا کہ آبدار کو اس نے اغوا کیا ہوگا۔ ایسا ہوا ناں، عریم تو میں......'' وہ مہارت سے ڈرائیو کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اس کے بابا اور تایا کا شک درست ثابت ہو گیا تھا کہ وہ اسے درمیان میں ہی ٹوک گئی تھی۔

''کچھ مت کہیں شاہ، میری خاطر پلیز۔'' وہ آنکھوں میں آنسو لئے منت کر رہی تھی۔ شاہ زیب نے محض ایک نظر اسے دیکھا تھا اور اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر لی تھی۔

''مجھے تو لگا تھا میری آزمائش ختم ہوئی۔ میرے اللہ میں کسی نئی آزمائش کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ مجھ پر رحم فرما۔'' اس نے سر سیٹ کی پشت سے لگا کر رب سے التجا کی تھی کہ اب بس اسی رب کائنات کا سہارا تھا۔ وہی اس کے لئے آسانیاں فراہم کر سکتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں آبدار کی خیریت کی بھی دعا کرتی جا رہی تھی۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ آبدار کی سلامتی ہی اس کی آگے کی زندگی میں خوشیوں کی ضامن ثابت ہونے والی تھی۔ اسے کل ہی تو لگا تھا کہ زندگی مہربان ہو گئی، ماں کی دعائیں مستجاب ہو گئیں لیکن امید کے، خوشیوں کے رنگ کتنی جلدی خوف کے سائے میں لپٹ کر پھیکے پڑ گئے تھے۔

ہم کو غالب نے یہ دعا دی تھی
تم سلامت رہو ہزار برس
یہ برس تو فقط دنوں میں گیا

اس کے دل سے اک ہوک سی اٹھی تھی۔اسے شاہ زیب کی غیر معمولی سنجیدگی بری طرح ہولا رہی تھی۔وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتی مناجات کو تیز کرتی پھر سے آنکھیں موند گئی تھی۔وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے خطرہ کبھی بھی ٹلا نہیں کرتا۔مصیبت تو بند دروازوں سے بھی چلی آتی ہے اور خوشیوں کا راستہ کھلی کھڑکیاں بھی بند کر دیتی ہیں اور اسے بھی ہر طرف سے اپنے لئے آفتیں آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔شاہ زیب کی سوچ بھی منتشر تھی وہ جو یہ پلاننگ کر رہا تھا کہ وہ عریم کو اورکزئی ہاؤس میں بہو کی حیثیت سے عزت و مان دلوائے گا اور اب لگ رہا تھا جیسے یہ مزید مشکل ہو گیا ہے۔وہ آبدار کے لئے پریشان تھی کہ وہ تین دن سے غائب تھی۔اسے آبدار کی فکر تھی وہ اسے ہر ممکن تلاش بھی کر چکا تھا۔وہ عریم کے خدشہ و شک کی بنیاد پر اس کے ساتھ فارم ہاؤس جا تو رہا تھا مگر اس کا روم روم دعا گو تھا کہ اسے آبدار وہاں نہ ملے کہ اس طرح محمود خان کا ایک گناہ اور اس کے کھاتے میں لکھا جائے گا اور عریم کے لیے مشکلات کھڑی ہوں گی۔وہ دونوں اس وقت ایک ہی بات کو ایک ہی زاویے سے سوچ رہے تھے۔سفر طویل تھا مگر سفر کتنا ہی طویل، کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو تمام ہو ہی جاتا ہے۔یہ تمام ہوا سفر کس کے لئے آسانی کس کے لئے دشواری لے کر آنے والا تھا یہ عقدہ بہت ہی جلد کھل جانا تھا۔عریم کی نبض ڈوب ڈوب کر ابھر رہی تھی۔

☆......☆......☆

کسی نظر کو تیرا انتظار آج بھی ہے
کہاں ہو تم کہ یہ دل بے قرار آج بھی ہے
وہ وادیاں وہ فضائیں کہ ہم ملے تھے جہاں
میری وفا کا وہیں پر مزار آج بھی ہے
نہ جانے دیکھ کے کیوں ان کو یہ ہوا احساس
کہ میرے دل پر انھیں اختیار آج بھی ہے
وہ پیار جس کے لئے ہم نے چھوڑ دی دنیا
وفا کی راہ میں گھائل وہ پیار آج بھی ہے
یقین نہیں ہے مگر آج بھی یہ لگتا ہے
میری تلاش میں شاید بہار آج بھی ہے
نہ پوچھ کتنے محبت کے ستم کھائے ہیں
کہ جن کو سوچ کے دل سوگوار آج بھی ہے

آبشار صوفہ پر بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے آہٹ پر سر اٹھایا تھا ان کی آنکھوں کے سامنے زمین و آسماں گھوم گئے تھے۔ وہ کھڑی ہو گئی تھیں۔ وہ پتھرائی نگاہوں سے کبیر عباسی کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں بھی تو یونہی لگا تھا جیسے وقت کی گردش تھم گئی ہو۔ وہ دونوں آج برسوں بعد ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ وہ جو ایک دوسرے کو قسمت کی ستم ظریفی کے باعث ''الوداع'' کہہ چکے تھے۔ وہ پھر آن ملے تھے۔ وہ اسے قسمت کا نیا وار سمجھتیں کہ بہار کی آمد کی نوید۔ کچھ بھی تھا وہ پورے وجود سے لرز اٹھی تھیں۔ آنکھوں سے نمکین پانی بہہ رہا تھا۔ کبیر عباسی کو لگا تھا کہ وہ خود پر ضبط نہ کر پائیں گے۔ ان کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ سامنے وہ عورت کھڑی تھی جسے وہ عین بہار کے دنوں میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ دونوں جو ایک دوسرے کا بھرم رکھنے کو ہجر کو گلے لگا گئے تھے ان کی نظروں میں آج پھر محبت رقصاں تھی۔ ماضی کی خوش رنگ تتلیاں اردگرد ناچ رہی تھیں۔ ماضی کی تلخیاں حلق میں آنسوؤں کے گولہ کے ساتھ اٹکتی جا رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے خاموش کھڑے تھے۔ آنکھوں کے سامنے پہلی ملاقات کا منظر تھا۔ یونیورسٹی کا لان، کینٹین، لائبریری۔ ایک ایک کر کے سارے حسین منظر نگاہوں میں ناچنے لگے تھے۔ آنکھوں کے سامنے آبشار کا مسکراتا حیا سے سرخ پڑتا چہرہ تھا۔ نگاہ کبیر عباسی کا زیرلب مسکراتا روشن چہرہ محسوس کر رہی تھی۔ سمے کا پھیر بدلا تھا۔ مسکراہٹ نے آنسوؤں کا لباس پہن لیا تھا۔ وہ ملتجی تھی۔ راہ بدلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ وفا کا یقین دلاتا ٹھہرے رہنے پر بضد تھا۔ روشن چہرہ ہجر کی آہٹ سے زرد پڑ گیا تھا۔ تاریک ہو گیا تھا۔ حیا کی سرخی خوف کے لہو سے تمتمانے لگی تھی۔ راستے بدل گئے تھے۔ دیارِ غیر کی اجنبی ہوائیں تھیں۔ دن رات کی مشقت تھی۔ وجود سلامت تھا اور سینے میں ہی دل کہیں مر گیا تھا۔ ایک اجنبی عورت نکاح کے تین بولوں سے زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ اجنبیت ختم ہو گئی تھی لیکن غیریت کا احساس زندہ تھا۔ برس یونہی گزر گئے تھے۔ پیچھے سب چھوٹ گیا تھا۔ چھوٹا ہوا مال و متاع دھیرے دھیرے ختم ہوتا گیا۔ قبر میں اتر گیا۔ ایک غیریت کا احساس دلاتی عورت جو تمام حقوق رکھتی تھی وہ ہر شے پر قابض ہو گئی۔ ایک ننھا پھول زندگی میں چلا آیا۔ مشقت کچھ اور بڑھ گئی۔ پیچھے قبریں تیار ہو گئیں۔ دل کی قبر یاد سے منور رہی۔ دیارِ غیر چھوٹ گیا اور آج وہ پھر اس کے سامنے تھا۔ جو زندگی تھی، جو دل تھی، جو سانس تھی، جو آس تھی۔ وہ ہجر کے دن میں الجھی تھی۔ ہوس کا شکار ہوئی تھی۔ معمولات زندگی بدل گئے تھے۔ گوشہ نشین ہو گئی تھی۔ ان چاہی اولاد کو دھتکار دیا تھا۔ اپنوں سے دوری اختیار کر لی تھی۔ ننھا بھتیجا دھیرے دھیرے احساس پر چوٹ لگاتا، رازوں کا امین بن گیا تھا اور امین نے آج ان دونوں کو سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ دونوں کی آنکھوں کے پیچھے اپنی اپنی زندگی کی ریل سی چل رہی تھی۔ آبشار کی سسکیاں بلند ہونے لگی تھیں۔ کبیر عباسی کی آنکھوں سے آنسو گرے تھے۔ انہوں نے کسی قسم کی تمہید باندھنے کی بجائے خود کو کمپوز کر کے آبشار کو دیکھا تھا اور اپنا مدعا اس کے سامنے رکھ دیا۔

''آبشار۔ مجھ سے شادی کرو گی۔'' وہ رونا بھول کر انہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ شخص اب کچھ کچھ بوڑھا ہو گیا تھا اس کی قلمیں سفید تھیں جو اس کے بڑھاپے کی گواہ تھیں مگر اس کا دل آج بھی جوان تھا۔ زندگی پانا چاہتا تھا۔ اس نے بات وہیں سے شروع کر دی تھی جہاں برسوں قبل تسلسل ٹوٹ گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے درمیان میں طویل برسوں کی دیوار حائل ہی نہ ہوئی تھی بس گفتگو میں ذرا سا وقفہ آ گیا تھا۔ وہ

سانس لینے کو رکا تھا۔سانس بحال ہوئی تھی تو جملہ مکمل ہو گیا تھا۔آبشار کے رونے میں یکدم ہی شدت لپک آئی تھی۔

''مجھے قسمت نے آپ کے قابل نہیں چھوڑا کبیر۔'' وہ گھٹنوں کے بل کارپٹ پر گرسی گئی تھیں۔شدتوں سے رو کیا رہی تھیں، کبیر عباسی کے ضبط کی آزمائش کر رہی تھیں۔

''مجھے شاہ زیب نے تمام تر اذیت ناک حقیقت بتا دی ہے آبشار۔'' وہ دوزانوں ان کے سامنے آن بیٹھے تھے اور وہ نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ میری اذیت ناک داستان سن کر بھی چلے آئے ہو تو اتنا ضبط کہاں سے آیا......اتنا حوصلہ کیونکر پیدا کر لیا۔

''میرے لئے آبشار اور کنزئی کا جسم کبھی بھی معنی نہیں رکھتا تھا۔میری نظر جب اٹھی دل پر ٹھہر گئی۔دل سے آگے نظر کبھی گئی ہی نہیں۔میرے لئے جسم بے معنی، دل با معنی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہنے لگے تھے ان کا وجود پانی بننے لگا تھا۔

''تمہارا جسم داغدار ہے۔تم مجھے اس لئے اپنے قابل نہیں سمجھتیں تو میں نے تمہارا جسم دیکھا ہی کب......؟ تمہارے جسم کی چاہ کی ہی کب؟ میں نے تو دل دیکھا، دل کو چاہا، دل سے چاہا، تمہارا دل آج بھی میرا ہے۔آج بھی اس پر کسی کا سایہ نہیں ہے۔آج بھی میرے لئے دھڑکتا ہے۔آج بھی تمہارے دل کی سرزمین توحید کی قائل، پاک وصاف ہے۔گندگی سے مبرا ہے۔تو کیسے کہہ سکتی ہو کہ تم میرے قابل نہیں ہو۔ایک تم ہی تو میرے قابل ہو آبشار۔ہمارے دل آج بھی ایک دوسرے کے لئے پاکیزہ ہیں تو ہم کیسے ایک دوسرے کے قابل نہیں ہیں۔'' وہ شدتوں سے رو رہی تھیں اور وہ آنکھ میں آئی نمی کو محسوس کرتے جذبات کی شدتوں کے ساتھ کہتے چلے گئے تھے۔

تیری آنکھوں نے یوں ملتے ہی
دھیرے سے مجھ سے کہا ہے
یہی رک جا، تھم جا، ٹھہر جا
تیری منزل کا یہ پتہ ہے
رشتہ ہے یہ دل کا کوئی
محسوس یوں ہونے لگا ہے
احساس جو من میں جگا ہے
یہ پیار نہیں ہے تو کیا ہے
میری چاہت کا سفر
ہے کیسے موڑ پر
کوئی دل میں رہ کے بھی میرے

ہے مجھ سے بے خبر
ہے اپنا سا مگر
نا محرم ہمسفر

''دنیا دل نہیں جسم دیکھتی ہے کبیر۔ اپنی زندگی کو میرے لئے آزمائش نہ بنائیں۔ یہ وہ کالک ہے جس نے میرے ہی نصیب کو داغدار نہیں کیا، مجھ سے وابستہ ہر ایک رشتہ کا سکون وچین، آسودگی وخوشی صلب کر لی۔ اپنی نسلوں کے لئے، اپنے رشتوں کے لئے خسارہ نہ چنیں۔'' وہ ہمیشہ کی طرح کبیر عباسی کی محبت کے آگے خود کو جھکتا محسوس کر رہی تھیں۔ دل کو ڈوبتا محسوس کر رہی تھیں۔ لبیک کی طرف قدم بوسی کرتا محسوس کر رہی تھیں لیکن وہ اپنے ایک احساس کے لئے دوسروں سے احساس نہیں چھیننا چاہتی تھیں۔ وہ تو اپنی بھابھیوں، بھتیجیوں کا خود کو مجرم پاتی تھیں۔ اب ان میں حوصلہ نہ تھا کہ وہ کبیر کی بہو بیٹیوں کے لئے آزمائش کی گھڑی بنیں۔ وہ کبیر عباسی کے جذبات، ان کے الفاظ کے جال میں خود کو گھرا محسوس کر رہی تھیں مگر تلخ حقیقتوں نے انہیں خواب دیکھنا، دل کے پیچھے جانا فراموش کر کے جینا سکھا دیا تھا۔

تیری سانسوں سے بندھا
دل تھا تجھ سے ہی جڑا
آج دوری ہے یہ کیوں
کیوں وحشت، یہ جنوں
بن تیرے اک خلا
کس طرح سانس میں لوں
آ مجھے تو ہی بتا
میں جیوں نہ جیئوں
دل کا کیا رنگ کروں؟

''تم دنیا کی پرواہ چھوڑ دو، آبشار نہ بھولو کہ دنیا کے لئے تم نے میرا دل اجاڑ دیا تھا۔ مجھے چھوڑ دیا تھا۔ راہ بدل لی تھی، تنہا کر دیا تھا۔ میں نے کیسے زندگی گزاری، بے رنگ پھیکی زندگی، جسم کا رشتہ تو میں نے بھی باندھا تھا کسی سے مگر پھر بھی دل وحشتوں کے آنگن میں پھیلتا، سکڑتا رہا۔ میرا آنگن تم بن اجڑا، خالی ہے۔ زندگی بھی جی۔ رشتوں کا احساس بھی پایا مگر دل کا کیا آبشار، آج بھی تم سے جڑا ہے۔ میری بیوی میرے آنگن میں رہی مگر دل اس مہک کو محسوس نہ کر پایا۔ رشتہ تھا، محبت تھی، احساس تھا، میرا قلب کا تعلق نہ تھا۔ یہ محبت ہر کسی سے نہیں ہو جاتی آبشار۔ یہ دل ہر کسی کا اسیر نہیں ہو جاتا۔ دل توحید کے قائل ہوتے ہیں۔ میرے دل کو نہ آزماؤ، نہ آزماؤ آبشار۔'' وہ وہاں سے نکل

جانا چاہتی تھیں وہ ان کی راہ میں آ گئے تھے۔ وہ بلکنے لگی تھیں۔ ان کے اپنے آنسو گرنے لگے تھے۔

رنگ بھرتا نہیں کوئی میرے خالی پن میں
لڑکھڑاتے ہیں قدم اجڑے ہوئے آنگن میں
کون ہمراہی میرا، کس کے میں ساتھ چلوں
آ مجھے تو ہی بتا، میں جیوں نہ جیوں
دل کا کیا رنگ کروں
زندگی ایسے لگے جیسے کلی مرجھائے
تو نہ آئے تو بتا کیسے بہار آ جائے
تو بچھڑ کر نہ ملا، اب تجھے کیا میں کہوں
آ مجھے تو ہی بتا میں جیوں نہ جیوں
دل کا کیا رنگ کروں؟

''محبت تو میں نے بھی صرف وصرف آپ سے ہی کی ہے۔ میرے دل کا ایک سب سے سنہرا کونا آج بھی آپ کی محبت سے آباد ہے مگر وقت اتنی مسافتیں طے کر چکا ہے کہ دلوں میں محبت روشن کئے ہمیں یونہی زندگی کا باقی ماندہ سفر طے کرنا ہوگا۔ عمر کے اس دور میں، میں اپنوں کے لئے آزمائش نہیں بننا چاہتی۔ دنیا کا سامنا نہیں کر سکتی۔ شادی میرے نصیب میں نہیں ہے کبیر۔ آپ دل کے محرم تو ہیں مگر میرے محرم نہیں بن سکتے۔ زمانہ اسے قبول نہیں کرے گا اور میں عمر کے اس دور میں دل کے ہاتھوں رسوائی قبول نہیں کر سکتی۔'' وہ خود کو سنبھال گئی تھیں۔ جذباتی عمر میں انہوں نے کوئی ایسا فیصلہ نہ لیا تھا تو وہ اب جذباتیت کی عمر ڈھل جانے کے بعد حقیقتوں کی بھٹی میں جلتے ہوئے ایک جذباتی فیصلہ نہیں لے سکتی تھیں۔ بہت چاہ کر بھی نہیں...... دل کے محرم کے لئے بھی نہیں...... دل کی خوشی کے لئے بھی نہیں......

یہ جو بندھن تجھ سے جڑا ہے
مجھے قسمت سے ہی ملا ہے
مجھے اپنا جو مان لیا ہے
پھر کیوں مجھ سے تو جدا ہے
بانٹے جو میری تنہائی
سوا تیرے کوئی نہیں ہے

کیسا یہ ستم ہے دل پر

تجھے پا کر بھی تجھے تیری کمی ہے

میرے آنسو بے اثر

میری آہیں بے ثمر

کوئی دل میں رہ کر بھی میرے

ہے مجھ سے بے خبر

نامحرم ہمسفر......!

''آبشار! کب تک تم لوگوں کے خیال سے، دنیا کے ڈر سے خود کو سزا دیتی رہوگی۔ دل کی مان لینے میں حرج کوئی نہیں ہے۔ زندگی کی بہاروں پر کیا اہل دل کا حق نہیں ہوتا؟ ہم اہل وفا کب تک کسی کے خوف سے زمانے کے ستم رسیدہ رسومات کے ڈر سے اپنے دلوں کو کند چھری سے ذبح کرتے رہیں گے۔ یہ ظلم تم برسوں قبل کر چکیں۔ تاریخ نہ دہراؤ۔ آج صرف دل کی سنو۔ دل کے لئے سنو۔ جو دل کہتا ہے وہ کرو۔ اقرار سونپ دو مجھے۔ میری وفا، آج بھی تمہاری منتظر ہے۔ میرا دل آج بھی تمہارے لئے دھڑکتا ہے۔ میرا دل بھی زندگی محسوس کرنا چاہتا ہے۔ تم دل سے دل کو مل جانے دو۔'' وہ آنکھوں میں التجا لیے، منت کر رہے تھے۔ وہ یہ سوچ رہے تھے کہ برسوں قبل انہوں نے آبشار کو مجبور کیا ہوتا، منت کی ہوتی تو آج وہ ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر نہ ہوتے۔ ان کے درمیان صدیوں کی دوریاں حائل نہ ہوتیں۔ وہ آج کوئی کسر نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ماضی کی غلطی دہرانا نہیں چاہتے تھے۔ برسوں قبل وہ آبشار کی مان گئے تھے۔ آج انہوں نے آبشار سے اپنی منوانی تھی۔ دل کی جیت حاصل کرنی تھی۔ محبت حاصل کرنی تھی۔

تجھے مل کے یہ دل کہتا ہے

کہ میں خود سے ہی آج ملی ہوں

تیرے لفظوں کی گہرائی میں

میں یوں پل پل رو رہی ہوں

تجھے پانے کی آس نہیں ہے

تجھے کھونے سے پر ڈرتی ہوں

تیرے بن مجھ کو لگتا ہے

میں ادھوری سی ایک دعا ہوں

میری باتوں کا مگر
کوئی تجھ پہ نہ ہوا اثر
کوئی دل میں رہ کے بھی میرے
ہے مجھ سے بے خبر
نامحرم ہمسفر......!

''دل کا سودا کر کے میں نے عمر بھر کے لئے اپنوں کا ساتھ چنا اور یہ گھاٹے کا سوا تو نہ تھا کبیر۔'' وہ آنسو سبز آنچل میں جذب کرتے ہوئے خود کو کمپوز کرتے ہوئے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولی تھیں۔ وہ اب کچھ متحیر ہوئے تھے اور وہ ان کی حیرت محسوس کرتیں مسکرا دی تھیں۔ کبیر عباسی کو کلیاں سی چٹکتیں محسوس ہوئی تھیں۔

''میں نے اپنوں کے مان کے لئے، ماں کی تربیت کے لئے ''دل'' اور ''محبت'' تیاگ دی۔ قسمت نے مجھ سے عزت کی قبا چھین لی۔ میں بے لباس ہوگئی۔ وجود داغدار ہوگیا۔ دل سسکتا رہ گیا۔ میں نے اف نہ کیا کبیر۔'' وہ صوفہ پر بیٹھ گئی تھیں۔ آنسو قطرہ قطرہ رخساروں پر گر رہے تھے۔

''پتہ ہے کیوں؟'' وہ ان کے سامنے صوفہ پر آ بیٹھے تھے اور انہوں نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھا کر کبیر عباسی کو دیکھا تھا وہ نفی میں گردن ہلا گئے تھے۔

''میری تذلیل پر، میرے دکھ پر رونے کو میری ماں تھی۔ میرے بھائی تھے۔ بہنوں جیسی بھابھیاں تھیں جنہوں نے ایک لمحہ کو بھی مجھے تنہا نہ کیا۔ میرے ساتھ سایہ کی مانند رہے۔ اسی سایہ کی مانند جو غم کی دھوپ میں چھوڑ جاتا ہے میرے اپنوں نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میرے بھائی نے میرے سر پر عزت و مان کی چادر رکھی۔ میری اَن چاہی اولاد کو اپنا نام دیا تھا۔ ایسا پتہ ہے کیوں ہوا؟'' آبشار اور کزئی کا لفظ لفظ گھر والوں کی محبت سے سرشار تھا۔ احترام سے لبریز تھا۔ وہ ان کے روشن چہرے کو لمحہ بھر دیکھ کر احترام سے نگاہ ہی جھکا گئے تھے۔

''کیونکہ میں نے دل کو داغ جدائی دے کر صرف اپنوں کا مان رکھا۔ اماں کی بات کی، ابا کے فیصلہ کی لاج رکھی۔ میرے جسم سے عزت کی ردا چھن گئی تو میرے باپ بھائیوں نے مان رکھا۔ عزت کی چادر دی۔ دل کی راحت حاصل کرتی کبیر تو اپنوں کو کھو دیتی۔ زندگی میں سب کچھ مل جاتا ہے، اپنوں کا ساتھ حاصل کرنے کے لئے کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ میری ایک، فقط ایک قربانی کی میرے ماں جائیوں نے یوں لاج رکھی کہ آج بھی زمانہ مجھ پر بیتی داستان سے انجان ہے۔ ہم لڑکیاں دل کی مان کر اپنوں کو اپنے خلاف کر لیتی ہیں۔ میں نے رشتوں کی مان کر اپنوں کو، اپنوں کے دل کو جیت لیا۔ خسارے کا سودا نہ کیا تھا میں نے۔ یہ مجھے زندگی کو گزارتے احساس ہوا۔'' وہ اب باقاعدہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔ یہ آبشار اور کزئی کی قسمت تھی کہ انہیں اعلیٰ ظرف رشتے میسر آئے تھے جنہوں نے آبشار کا اس وقت

ساتھ دیا جب انہیں اپنوں کے ساتھ کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ جتنا ظرف، جتنا حوصلہ ان کے بھائیوں نے دکھایا تھا یہ ان کی خوش بختی تھی اور سب سے بڑھ کر ان کی بھابھیاں وہ اس دنیا کی تو لگتی ہی نہیں تھیں۔ نہ جلاپا تھا، نہ حسد تھا۔ انہوں نے نند کو چاہت، عزت، مان دیا تھا۔ آبشار رب کی ہمیشہ شکرگزار رہی تھیں کہ اس نے ان کی آزمائش تو کی تھی مگر اپنوں کا ساتھ نہ چھینا تھا ورنہ سب سے پہلے تو اپنے ہی پرائے ہو جاتے ہیں۔ وہ ساری تفصیل بتا کر چپ کر گئی تھیں۔ کبیر عباسی کو ان کے گھر والوں کی بڑائی و اعلیٰ ظرفی کے آگے اپنا دل، ذہن جھکتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ کمرے میں خاموشی پھیل گئی تھی۔

''تمہارے فیصلے کی میں نے برسوں قبل بھی لاج رکھی تھی۔ تمہارا فیصلہ مجھے بے حد مناسب لگا تھا آبشار۔ کہ میں سمجھتا ہوں کہ رشتوں اور محبت میں سے کبھی ایک چیز کا انتخاب کرنا پڑے تو لڑکیوں کو رشتوں کا انتخاب کرنا چاہیئے کہ مرد تو تنہا زندگی کی مشکلات سے گزر سکتا ہے مگر عورت کو پل پل کسی کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے اور عورت رشتوں کے بغیر ایک کٹی پتنگ بن جاتی ہے۔ کہاں جا گرے اسے خود بھی نہیں ہوتا پتہ۔ تم نے خود کو کٹی پتنگ بننے سے بچایا۔ میرا دل تمہارے احترام میں اس شام بھی جھک گیا تھا آج بھی میں تمہاری محبت، تمہاری سوچ کے آگے خود کو بہت چھوٹا پا رہا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں پھنسائے وہ چہرے سے ہی بے حد مضطرب لگ رہے تھے۔ آبشار نے اس وقت رشتوں کا انتخاب کیا تھا اور انہوں نے صرف ''دل'' کا جب ہی تو وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو اپنے واحد رشتوں کو تنہا کر گئے تھے اور آج آبشار سب گنوا کر بھی سب کچھ پا گئی تھیں اور وہ سب کچھ پا کر بھی خالی ہاتھ تھے۔ دل کی راہ پر چلتے جنت سے دور ہو گئے تھے۔ دل کی راہ پر چلتے شرعی حق کے ساتھ زندگی میں شامل عورت کو بھی مان و محبت نہ دے سکے تھے اور اب وہ دل کی راہ پر چلتے آبشار کی راہیں کھوٹی کرنے چلے آئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو، چہرے پر ندامت تھی۔ دل کو جیت لینے کی چاہ نے انہیں زندگی کے ہر میدان میں ہرا دیا تھا۔ تہی دست آبشار اور کزئی نہیں، کبیر عباسی تھے۔ جو ایک محبت کے لئے زندگی کا ہر رشتہ، ہر چاہت ٹھکرا گئے تھے جبکہ دل کیا تھا گوشت کا ایک لوتھڑا...... اور ماں باپ زندگی کی اساس...... رشتے زندگی کی بنیاد...... کیا ظلم کمایا تھا انہوں نے...... نہ صنم ملا، نہ وصال یار...... زندگی بے رنگ، کتنوں کی مجرم بن گئی۔ بروقت درست فیصلے کتنے ضروری ہوتے ہیں۔ یہ انہیں آج آبشار اور کزئی کو دیکھ کر احساس ہوا تھا۔

اس کی نظر ایسے جھکی
کہ جھک گئے سجدے میں ہم
مانگا نہیں کچھ بھی مگر
بس اک پل، نظرِ کرم
اک نور سا ہے چار سُو

کہنے لگی یہ آرزو

جو ہے لکھا تقدیر میں

وہی عشق ہو میرے روبرو

کوئی رستہ مولا مجھ کو دکھا دے

میری منزل مولا مجھ سے ملا دے

کہہ رہی ہے میری بندگی

ایک پل جو دل میں اتر جاتا ہے

ایک پل نظر میں ٹھہر جاتا ہے

ایک پل کیوں مل کر بچھڑ جاتا ہے

ایک پل......!

ایک پل کی تھی محبت اور صدیوں کے فاصلے تھے......عمر بھر کے روگ تھے۔وہ دونوں چپ تھے،قسمت سرگوشیاں کر رہی تھی،راستے پھر الگ ہو گئے تھے۔دل کے نصیب میں شاید آرام و وصل تھا ہی نہیں۔

☆......☆......☆

''خدا کے لئے کھولو دروازہ......جانے دو مجھے۔''اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہاں کب سے موجود تھی۔کسی نشہ آور دوا کے زیر اثر وہ سوئی رہتی تھی۔آنکھ کھلتی تھی تو حواس کام نہ کرتے تھے۔ایک بھاری ڈیل ڈول کی عورت زبردستی روٹی کے چند لقمے اسے زہر مار کرواتی تھی اور کچھ دیر سوچنے کی کوشش میں ہلکان ہونے کے بعد وہ پھر غنودگی میں چلی جاتی تھی۔آج صبح وہ موٹی عورت جس وقت کمرے میں آئی تھی وہ سر تھامے بیٹھی تھی اسے اس لڑکی پر رحم آ گیا تھا گزشتہ دنوں میں جو وہ صبح و شام اسے نیند آور دوائیاں ساتھ دے رہی تھی آج نہ دی تھیں۔جس کا نتیجہ تھا کہ تقریباً چھ،سات گھنٹے پہلے کی کھائی ڈوز کی وجہ سے وہ سوتی رہی تھی مگر اب آنکھ کھلی تھی تو حواس قدرے بحال تھے۔اسے کچھ یاد آنے لگا تھا کہ وہ محمود خان کے گھر کے بڑے سے گیٹ سے باہر نکلی تھی۔گلی کے کونے تک پہنچی تھی کہ ایک گاڑی اس کے بہت قریب آن رکی تھی۔وہ سنبھلی بھی نہ تھی کہ پچھلی سیٹ پر موجود عورت نے اسے بازو سے تھام کر اندر گھسیٹ لیا تھا۔وہ پہلوان نما عورت تھی جس کا آبدار جیسی نرم و نازک لڑکی جو اس صورتحال پر حواس باختہ تھی مزاحمت تک نہ کر پائی تھی۔اس عورت نے پھر شاید اسے کلوروفام سنگھایا تھا جس کے باعث وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور آج اسے صحیح معنوں میں ہوش آیا تھا۔کچھ دیر کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ دروازے تک پہنچی تھی اور دروازے کو بری طرح پیٹنے لگی تھی۔

''کوئی ہے۔کوئی تو میری مدد کرو۔'' وہ دروازہ بجا بجا کر تھک گئی تو دروازہ سے پشت لگا کر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی وہ سسکنے لگی تھی۔

''میں یہاں سے کیسے نکلوں۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔میری تو کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔یا اللہ! میری مدد کر۔'' وہ ہر بے بس انسان کی مانند ہر راستہ بند ہونے کے بعد اسی رب کائنات کو پکار رہی تھی جس کے قبضہ میں اس کی جان تھی۔

''مجھے تو یہ بھی اندازہ نہیں ہو رہا کہ میں یہاں کب سے ہوں......؟ میرے غائب ہونے کا اور کرنزئی ہاؤس میں کسی کو علم ہے بھی کہ نہیں، میں یہ کس مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہوں۔تو ہی میری مدد کرسکتا ہے میرے اللہ! مجھے اس مصیبت سے نکال دے۔'' وہ بری طرح رو رہی تھی۔پورے کمرے کا وہ کئی بار چکر لگا چکی تھی۔کوئی کھڑکی نہ تھی۔کوئی روشندان نہ تھا، رو رو کر، چیخ چیخ کر اس کے حلق میں کانٹے کھڑے ہونے لگے تھے۔کمرا ہر بنیادی سہولت سے مزین تھا۔کمرے کی آرائش بھی کمال تھی۔بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ایک جگ رکھا تھا جس میں بہت تھوڑا سا پانی تھا۔اس نے گلاس کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی۔ناکام لوٹی تھی اور اس نے جگ سے منہ لگا دیا تھا۔اسے اپنا معدہ بھی خالی خالی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کئی دن سے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔ایک عورت کا ہیولہ سا اس کی نگاہ میں گھوما تھا۔جو اسے زبردستی کچھ کھلانے کی کوشش کیا کرتی تھی کہ اسے تو اوپر سے ہی یہی آرڈر ملے تھے کہ اس لڑکی کو حواس سے بیگانہ رکھنا ہے۔اس لئے اس کی حفاظت کی ذمہ داری پر معمور عورت کو اس کے کھانے پینے کی زیادہ پرواہ نہیں ہوتی تھی۔وہ اسے چند لقمے کھلا کر نیند کی گولیاں کھلا دیتی تھی۔آبدار کو اس لحاظ سے کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ذہن ابھی بھی سویا سویا سا تھا۔پانی پی کر اسے سکون و تراوٹ کا احساس تو کیا ہوتا، ابکائی آنے لگی تھی۔یہ خالی معدہ کا احتجاج تھا۔اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

''تم نے گھر چھوڑ کر سب سے بڑی غلطی کی ہے آبدار۔'' کانوں میں شاہ زیب اور کرنزئی کا سرد لہجہ گونجا تھا۔

''مجھے بچالیں آ کر شاہ بھیا ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' وہ بلک بلک کر رونے لگی تھی۔

''لڑکیوں کو گھر کی دہلیز پار کرنے سے قبل ہزار بار سوچنا چاہئے آبدار۔لڑکیوں کی عزت چادر اور چاردیواری سے ہوتی ہے۔لڑکیاں جب چاردیواری کو اپنی خوشی کے حصول کے لئے پار کرتی ہیں تو چادر میلی ہوجایا کرتی ہے۔'' شاہ زیب کی آواز لمحہ بہ لمحہ اس کے تعاقب میں تھی۔

''چادر میلی ہونے کے لئے چاردیواری کا پھلانگنا تو ضروری نہیں، جن کی قسمت خراب ہو وہ چادر کی حفاظت کرتے، چاردیواری کی عزت رکھتے بھی تو اپنی چادر کو ہوس کے حوالے کر بیٹھتی ہیں۔'' اس کو اپنا جواب یاد آیا تھا اور وہ ہچکیاں بھرنے لگی تھی۔

''قسمت کی بدبختی کا ذکر نہ کرو آبدار کہ جو پھپھو کے ساتھ ہوا اس کو نظر میں رکھ کر اپنی عزت ہتھیلی پر لئے گھر سے نکل پڑنا دانشمندی ہرگز بھی نہیں ہے۔جو اماں کسی بھی عورت کو گھر کی چاردیواری سے ملتی ہے وہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کو نہیں ملا کرتی۔پھپھو کو بے عزت کیا گیا، یہ ان کی بدبختی......تم تو خود بے عزت ہونے کو گھر سے نکل پڑیں یہ تمہاری کم نصیبی۔'' شاہ زیب کا چہرہ کیسے غصہ وضبط سے سرخ پڑ گیا تھا وہ اس وقت جوش میں تھی محسوس نہ کر پائی تھی۔اب ہوش آیا تھا تو اس کو شدت سے مدد کے لیے پکار رہی تھی جس کی نصیحت کو خاطر میں نہ

لاتی تھی۔ کچھ انسانوں کو ٹھوکر لگنے سے پہلے دنیا پتھر معلوم ہوتی ہے اور خود اپنا آپ شیشہ سا نازک لگتا ہے مگر جب ٹھوکر لگتی ہے تو پتہ لگتا ہے کہ ٹھوکر کے لئے کبھی پہاڑ، یا کسی اینٹ و پتھر کی ضرورت نہیں ہوتی، اک کنکر، اک نوکیلا شیشہ بھی کافی ہوتا ہے۔ پتھروں کی بستی میں پھر شیشہ ٹوٹ جاتے ہیں تو پھر الزام کسی اور کو کیا دینا۔ اسے تو ٹھوکر اپنے ہی وجود سے لگی تھی۔ اپنے ہی فیصلہ سے لگی تھی۔ وہ کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کرتی کہ اسے تو خود اپنے ہاتھ اپنے ہی خون سے بھرے ہوئے لگ رہے تھے۔ آج دنیا شیشہ خود پتھر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کی دشمن بن گئی تھی۔ اس کی پہلی غلطی کہ اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔ دوسری غلطی جنہوں نے سہارا دیا انہیں چھوڑ کر اس شخص کو للکارنے چل پڑی تھی جس نے دھتکار دیا تھا، جو ایک دفعہ سہارا نہیں بنتے ان سے سہارے کی امید کرنا بے وقوفی ہوتی ہے اور وہ اس بے وقوفی کی سزا بھگت رہی تھی۔ اپنا نام، اپنی پہچان کے لئے نکلی تھی آج کیا تھا اس کے ہاتھ میں، رسوائی بے بسی، ایک اغوا شدہ لڑکی کا ٹائٹل، جو رہا سہا بھرم تھا وہ بھی ہاتھ سے گیا۔ اس کی کم عقلی اسے آج کس مقام پر لے آئی تھی۔

''سنا ہے لوگ بددعاؤں سے مر جاتے ہیں۔ آپ سب تو یہی چاہتے ہیں نہ کہ میں مر جاؤں، اس لئے بددعا دیں مجھے کہ میری زندگی جلد ختم ہو جائے۔'' جس وقت تابندہ نے اس کی اور آئیکت کی شادی کی سخت ترین مخالفت کی تھی تب وہ آنکھوں میں وحشت لئے اپنی تائی سے بولی تھی۔ اسے آج سب کے اچھے و برے رویے یاد آ رہے تھے۔

''دنیا کے لئے نہ سہی آپ سب کے لئے مر ہی جاؤں گی۔ جب انسانوں کی قدر نہ ہو، نام و پہچان اور رتبہ کی اہمیت ہو تو رشتے ویسے ہی مر جاتے ہیں اور میرا تو آپ لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں۔ دعا کریں کہ میں مر جاؤں۔'' وہ ایک ایک کو یاد کرتے اپنے لفظوں پر آج بے تحاشہ رو رہی تھی۔ وہ سب سے ایک دم ہی کتنا بدگمان ہو گئی تھی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئیکت کے دوست کے گھر جا پڑی تھی اور اب یہ کہاں آ پہنچی تھی۔

''مجھے معاف کر دیں تائی اماں۔ بس ایک بار اسی محبت سے دیکھیں، صرف ایک نظر شفقت کی، میری روح میں اداسی تحلیل ہو گئی ہے۔ آپ سب کے ناروا سلوک، میرے غلط قدم مجھے یہاں تک لے آئے ہیں، کہیں سے آ جائیں اور مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ مجھے آئیکت کی بیوی نہ بنائیں، مجھے بہو تسلیم نہ کریں۔ وہ آدھی ادھوری شفقت مجھے واپس لوٹا دیں۔'' کمرے میں اس کے بین، اس کی ہچکیاں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔

کہاں کی لاج کیسی شناسائی

حصہ میں آئی صرف تنہائی......!

اس کے اندر کوئی بہت زور سے ہنسا تھا وہ ڈر کر اس اکیلے انجان کمرے کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنی ہنسی کے ساتھ اپنے ہی کہے جملے گونج اُٹھے۔

''کچھ تکلیف دہ رشتے اگر بروقت ختم کر دیئے جائیں تو باقی ماندہ رشتوں کی عمر طویل ہو جاتی ہے۔'' اس وقت اس نے اپنی حقیقت کے عیاں ہو جانے کے بعد یہ بات رخسانہ اور کزنی سے کہی تھی اسے ملال تھا کہ جسے ماں کہتی تھی، نہ ہی وہ ماں تھی، نہ ماں ثابت ہوئی تھی، اس نے تو اپنے طور پر تکلیف دہ رشتہ ختم کر دیئے تھے آج ان ہی رشتوں کو یاد کر کے رو رہی تھی کہ وہ رشتے اس کی امان، اس کا تحفظ تھے اور آج وہ در بدر تھی۔ اس کی ہچکیاں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔

تجھ سے ناراض نہیں زندگی، حیران ہوں میں
تیرے معصوم سوالوں سے، پریشان ہوں میں
جینے کیلئے سوچا ہی نہیں، درد سنبھالنے ہوں گے
مسکرائیں تو مسکرانے کے قرض اتارنے ہوں گے
مسکراؤں بھی تو لگتا ہے، جیسے ہونٹوں پہ قرض رکھا ہے
زندگی تیرے غم نے ہمیں رشتے نئے سمجھائے
ملے جو ہمیں دھوپ میں ملے چھاؤں کے ٹھنڈے سائے
آج اگر بھر آئی ہے بوندیں برس جائیں گی
کل کیا پتا ان کے لئے آنکھیں ترس جائیں گی
جانے کب گم ہوا کہاں کھویا، ایک آنسو چھپا کے رکھا تھا
تجھ سے ناراض نہیں زندگی، حیران ہوں میں

''میں اتنی بدقسمت ہوں کہ آج یہاں تنہا پڑی ہوں، کوئی میری مدد کو بھی نہیں آ رہا...... میرے رشتے میرے نہ ہوئے۔ میں ان کو کھو بیٹھی ہوں۔ میری قسمت میں اندھیرے در آئے ہیں۔'' اس کے ذہن میں اذیت ناک سوچیں ابھر رہی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا رہا تھا۔

''میری شرمناک حقیقت میری خوشیوں، میرے رشتوں کو کھا گئی، بھری دنیا میں تائی اماں تھیں جن کی محبت و توجہ حاصل تھی۔ وہ مجھ جیسی لڑکی کو بہو نہیں بنا سکتی تھیں اسی لیے تائی اماں کی بھی محبت چھن گئی مجھ سے۔'' اسے پل پل کمرے میں تاریکی کا احساس بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

جب شام کے سائے ڈھلتے ہیں
اور چلتی ہے پاگل پروائی
روتے ہیں لپٹ کر آپس میں
تب میں اور میری تنہائی

وہ تنہائی جو بچپن میں
میرے ساتھ ہمیشہ کھیلی ہے
نہیں چھوڑا جس نے ساتھ میرا
جو اب بھی میری سہیلی ہے
جب سونی سونی لگتی ہے
اسے میرے گھر کی انگنائی
روتے میں لپٹ کر آپس میں
تب میں اور میری تنہائی

''ابسام۔''اس نام کے خیال سے ہی دل سے آہ آزاد ہوئی تھی۔آنکھوں کے سامنے کتنے منظر دھندلانے لگے تھے۔

''ابسام، میری پہلی چاہت، جسے دیکھ کر زندگی محسوس ہوئی، مگر میری شرمناک حقیقت نے ابسام کے دل پر قفل لگا دیئے، میں جانتی ہوں کہ میری محبت ابسام کے لئے معنی نہیں رکھتی، وہ ایسی لڑکی سے کیسے محبت کر سکتے یں، کیسے بیوی بنا سکتے ہیں جو بے نام ونشان ہے۔ زندگی سے بس اب تو یہی گلہ ہے کہ ابسام سے مجھے محبت نہ ہوئی ہوتی یا ابسام کا ذہن ودل میری محبت کے لئے کشادہ ہو جاتا۔ وہ محبت نہ کرتے ،شادی بھی نہ کرتے مگر میری محبت کو شرفِ قبولیت کی سند دے دیتے مگر میری بدقسمتی یہاں بھی عروج پر رہی۔''اس کو ڈوبتے ذہن و دل کے ساتھ کتنے ہی منظر یاد آئے تھے جب وہ ابسام کو دیکھ رہی تھی۔اس کے لیے دل کو نرم ہوتا محسوس کر رہی تھی اس سے اپنی محبت کا اقرار کر رہی تھی، محبت کی بازی میں مگر وہ ناکام ہوگئی تھی۔ وہ اپنی محبت کو جیت نہ سکی تھی اس نے محبت ہار دی تھی......اور ناکام یکطرفہ محبت کے لئے اس نے آئیکت کو بھی خود سے بدظن وبدگمان کر ڈالا تھا۔اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی اور کمرے کی خاموش فضا میں تحلیل ہوگئی تھی۔

ارمان مچلتا ہے کوئی
جب میرے سلگتے ہوئے دل کا
میں چوری چپکے دیکھتی ہوں
جب خواب کوئی مستقبل کا
جب گونجتی ہے میری سانسوں میں
بے نام سی کوئی شہنائی
روتے ہیں لپٹ کر آپس میں
تب میں اور میری تنہائی

''ابسام۔آپ کی محبت میں، میں نے اپنا واحد غمگسار بھی کھو دیا۔ میں آئیکت کے ساتھ دھوکہ نہیں کرنا چاہتی تھی، انہیں تکلیف نہ ہو یہ جان کر کہ میں ان سے نہیں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے شاہ بھیا کے سامنے کہہ دیا کہ میں آئیکت سے شادی نہیں کروں گی اور آئیکت مجھ سے ناراض ہو گئے۔ آئیکت کا ساتھ ہوتا تو میں آج یہاں بے یارو مددگار نہ پڑی ہوتی۔ واحد آئیکت ہی تو میرے لئے اندھیرے میں روشنی کی کرن تھے۔اب وہ مجھے خودغرض، مطلبی اور احسان فراموش سمجھتے ہیں۔ وہ بھی مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ مجھے تو نہ بیگانگی راس آئی، نہ خلوص نے کوئی رنگ جمایا، محبت بھی ہار بیٹھی، دوستی کا ساتھ بھی چھوٹ گیا۔ میں حرماں نصیب آبدار، نام کو نایاب موتی مگر میں تو مٹی میں ملنے کے بھی قابل نہیں۔'' اسے اب غنودگی محسوس ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے گوشے بھیگے ہوئے تھے۔لب پر آہ تھی، ذہن تاریک ہوتا جا رہا تھا۔

ہونٹوں پہ کبھی جو آ نہ سکی
میں کھو گئی ان فریادوں میں
راس آئے نہ چیت وساکھ مجھے
جلتی رہی ساون بھادوں میں
جس وقت دکھائی دیتا ہے
مجھے ہر اک موسم ہرجائی
روتے ہیں لپٹ کر آپس میں
تب میں اور میری تنہائی

''کاش! میں اورکزئی خاندان کے احسانوں تلے دبی نہ ہوتی۔ مجھ پر اورکزئی خاندان کا نام، مقام، پہچان قرض نہ ہوتا......تو میں محمود خان جیسے مردوں کو چیخ چیخ کر بتاتی کہ دیکھو تم جیسے مردوں کی نام نہاد ہوس میں لپٹی مردانگی، کیسے ایک جیتے جیتے انسانوں کو مار ڈالتی ہے۔ باپ کا نام اولاد کے لئے کتنا بڑا مضبوط حصار ہوتا ہے اور جو بچہ اس حصار سے محروم ہو، اس کی تو دنیا ہی لٹ جاتی ہے۔ وقتی لذت حاصل کرنے والے ہوس کے پجاریوں دیکھو، کیسے زندگی ختم ہو رہی ہے۔ کیسے عزت کی چاہ میں ذلت مقدر ہوئی ہے۔ دیکھو سہارا دینے والے جب ظالم ہو جاتے ہیں تو کیسے آبدار جیسی لڑکیاں گھروں سے فرار ہوتی ہیں۔ دیکھو کسی کے گناہ کو کوئی گلے نہیں لگاتا، مجبوری کے طوق، راحت گل کا سبب نہیں بنتے، عزتوں کو پامال کر کے جو فصل بوئی جاتی ہے وہ فصل راحت، کاشت نہیں کرتی، سسک سسک کر جیتی ہے۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتی ہے۔ دیکھو محمود خان، تمہارے گناہ کی لذت زیادہ تھی کہ میرے صبر کی انتہا زیادہ ہے۔ میرے مرنے کا تسلسل زیادہ ہے۔ میں محمود خان کا پردہ چاک نہیں کر سکتی، دنیا کے کسی مرد کو محمود خان کے قدم کی ہولناکی بیان نہیں کر سکتی۔ میرا روم روم اورکزئی خاندان کا مقروض ہے......مگر میری بددعا ہے محمود خان کو......اس جیسے ہوس پرست مرد عورتوں کو، جو گناہ کا بیج بوتے ہیں، دوسروں کی آزمائش لیتے ہیں، میری بددعا ہے محمود خان،

جیسے آج میں بے یارو مددگار، کچھ غلط نہ کر کے بھی ایک ایک سے شرمندہ، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہی ہوں، تم اس سے بھی زیادہ ذلت آمیز موت کا شکار ہو گے۔ میری بددعا ہے محمود خان، تم ایک پل کو بھی سکون نہ پاؤ، تم جیسے مرد، جو مردوں کے نام پر طمانچہ کی مانند ہیں، کبھی راحت قلب کو محسوس نہ کر سکو۔ دنیا تم سے چھن جائے۔ رب تم سے روٹھ جائے۔ محمود خان، میں روز محشر تمہارا گریبان ضرور تھاموں گی، یہاں میں مقروض ہوں، عزت رکھنا میرا فرض ہے اس جہاں میں جب سب کی نیکیاں، عیوب عیاں ہوں گے تب میں تم سے حساب لوں گی۔ معاف نہیں کروں گی۔ اپنی ماں کی اذیت، اپنی ذلت، زندگی جینے کی آرزو میں جو مرنے چلی ہوں، یہ تمام اذیتیں مر کر بھی یاد رکھوں گی۔ تم جیسوں کو احتساب کے عمل سے گزرنا ہوگا۔ یہ میرے رب کا وعدہ ہے۔ تم دنیا و آخرت میں اپنے کیئے کی جزا و سزا ضرور پاؤ گے۔ ضرور پاؤ گے محمود خان، ضرور پاؤ گے۔"

وہ چپ تھی، بالکل چپ۔ ذہن سرگوشیاں کر رہا تھا۔ دل سے آہیں نکل رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے سارے پیاروں کے چہرے بند ہوتی پلکوں پر آن سمائے تھے۔ وہ ایک ایک سے معافی مانگتی محمود خان کو بددعائیں دیتی، اپنے ذہن کو خاموش ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ خاموشی میں اسے آہٹ سی ہوئی تھی۔ اسے لگا تھا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ اسے لگا تھا کہ اسے شاہ زیب، اس کا بھائی پکار رہا ہے مگر وہ کوئی ریسپانس دینے سے قاصر تھی۔ "میرا کوئی بھائی نہیں ہے۔" اندر کچھ سک کر ٹوٹا تھا۔ اسے لگا تھا کہ اسے آئیکت اس کا واحد دوست و غمگسار پکار رہا ہے۔ "میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ مجھ جیسوں کا کوئی دوست، کوئی رفیق نہیں ہوتا۔" دل سے کراہ نکلی تھی اور ذہن و دل تاریک ہو گئے تھے۔ اب اسے کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ قطرہ قطرہ موت اس کے وجود میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ زندگی اپنے ہاتھ کھینچ رہی تھی۔ موت کا شکنجہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ سانس بہت تیز چل رہی تھی۔ یوں لگتا تھا اس کی سانس لمبے سفر سے آئی ہے۔ اب اسے کچھ پل کا آرام چاہیے۔ سانس کو بھی سانس لینے کی چاہ تھی مگر بس دو سیکنڈ کا اس کی سانس نے آرام کیا تھا اور زندگی، زندگی کے ہاتھوں سے نکل کر موت کی آغوش میں جا سمائی تھی......!!!

نام گم جائے گا، چہرہ بدل جائے گا
میری آواز ہی پہچان، گر یاد رہے
وقت کے ستم کم حسیں نہیں
آج ہیں یہاں، کل کہیں نہیں
وقت سے پرے اگر مل گئے ہیں
میری آواز ہی پہچان ہے، گر یاد رہے
جو گزر گئی کل کی بات تھی
عمر تو نہیں، ایک رات تھی
رات کا سرا اگر پھر ملے کہیں

میری آواز ہی پہچان ہے، گر یاد رہے
دن ڈھلے جہاں رات پاس ہو
زندگی کی لو، اونچی کر چلو
یاد آئے گر کبھی، جی اداس ہو
میری آواز ہی پہچان ہے، گر یاد رہے

☆......☆......☆

''کچھ لوگ تو آج پہچانے ہی نہیں جا رہے۔'' مومل کے اٹھتے قدم رکے تھے اور وہ آواز کے تعاقب میں دیکھنے لگی تھی۔ پلر سے ٹیک لگائے، سینے پر ہاتھ باندھے، سیاہ رنگ کے ڈنر سوٹ میں عبیر عباسی کی وجاہت بے حد نمایاں تھی۔ یکدم ہی مومل کا دل ایک انوکھی لے پر دھڑک اٹھا تھا جس پر وہ پریشان کم حیران زیادہ تھی۔

''آنکھوں کے راستے دل میں اتارنے کا ارادہ ہے تو بصد شوق مجھے نہارتی رہو۔'' اس نے مومل کی نگاہیں خود پر محسوس کی تھیں، ہلکے سے کھنکارا تھا اور اس کے خجل ہو کر نگاہ چرانے پر وہ اپنی ازلی شوخی، شرارت سے کہہ گیا تھا۔

''تم کون سے شہزادۂ گلفام ہو جو میں تمہیں دیکھوں، آنکھوں کے راستے دل میں اتاروں۔'' مومل اس کی معنی خیز نگاہوں پر جز بز ہوتی اپنے مخصوص کٹیلے لہجے میں بولی تھی۔

''تم مانو گی کہاں کہ میں ٹھہرا ازلوں سے شہزادہ اور تم میری نخریلی شہزادی۔'' وہ مومل کے کٹیلے لہجہ میں کاٹ کی جگہ عجیب سی نرمی محسوس کر کے ذومعنی لہجہ میں بولا تھا۔ مومل کو اپنے دل کی دنیا میں رنگ اترتے محسوس ہوئے تھے۔

''تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو عبیر۔'' وہ کھوئے کھوئے سے لہجہ میں دھیمے سے پوچھ رہی تھی۔

''جتنی محبت کوئی زندگی سے کرتا ہے اس دل میں تمہارے لئے۔'' عبیر کا لہجہ جذبوں کی آنچ سے دہک اٹھا تھا۔ مومل کے عارض سرخیاں چھلکانے لگے تھے۔

''اگر میں کہوں کہ میں محبت کو محسوس کرنے لگی ہوں، ڈرتی ہوں کہ تمہاری محبت مجھ پر سے اپنا حصار نہ کھینچ لے تو......تم کیا کہو گے۔'' اس نے لرزتی ہوئی پلکیں اٹھائی تھیں اور خود کو دیکھتے عبیر پر جا ٹھہری تھیں۔ عبیر جو اس میں آج پہلی ہی نگاہ میں واضح تبدیلی محسوس کر گیا تھا اس کے رنگ بکھیرتے چہرے کو دیکھنے لگا تھا۔ اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا کہ وہ لڑکی جس سے اسے بے پناہ محبت تھی، وہ اس کی محبت کی نفی کرتی، یکدم ہی اس کی محبت پر ایمان لے آئی تھی۔ عبیر کو لگا تھا جیسے آج اسے نئی زندگی ملی ہو ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آ گئی ہو۔ بہاریں اس کے قدموں میں سجدہ ریز ہوں اور محبت گلابی فراک پہنے، سیاہ بال کھولے، آنکھوں میں کاجل لگائے، رخساروں پر غازہ بکھرائے، لبوں

پر سرخی سجائے، کانوں میں جھمکے اٹکائے، کلائیوں میں چوڑیاں کھنکنائے، اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔
''تو بس پھر میں یہی کہوں گا کہ سب کچھ بدل سکتا ہے، سب کچھ ختم ہوسکتا ہے لیکن عبیر عباسی کی محبت نہ بدل سکتی ہے، نہ ختم ہوسکتی ہے۔ میری آخری سانس تک، میری ہر وفا، میری محبت میرا سب کچھ مومل کے نام ہوگیا ہے۔'' عبیر کا لہجہ محبت کی آنچ سے سلگ رہا تھا۔
''تم سچ کہہ رہے ہو عبیر، کیا میں بھروسہ کرلوں؟'' مومل کی آنکھوں میں خوف کی عجب پرچھائیاں تھیں۔ وہ کتنی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ عبیر کا دل قربان ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے کہاں اندازہ تھا کہ اس کی محبت مومل کے دل میں اتر جائے گی۔ کہاں وہ اسے پانا ہی نہیں چاہتی تھی، اسے کھونے سے ڈرنے لگے گی۔ جس کی محبت کو وہ ٹھکراتی رہی تھی، ایک لمحہ کا عمل تھا اور وہ محبت کو یوں محسوس کرنے لگی تھی کہ محبت اس کا نصب العین بن گیا تھا۔ عبیر اسے بہت محبت سے دیکھ رہا تھا۔ اپنی وفا کا یقین دلا رہا تھا اور اس کی ہر بات مومل کو دل کی سرزمین پر ایک خوبصورت پھول کھلاتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جو اس سے گن گن کے بدلے لینے کی منصوبہ بندی کرتی رہی تھی۔ اس کی سرگوشیوں پر حیا سے سرخ پڑتی مستقبل کے سنہرے سپنے سجا رہی تھی۔
''عبیر! اپنے لئے تمہاری محبت کی شدتیں کبھی محسوس نہیں کر پائی تھی مگر انکل کے لئے بے قراری نے مجھ پر کھولا کہ تم ایک اچھے انسان ہو، ایک پرخلوص و پیارے سے دل کے مالک ہو اور میں اعتراف کرتی ہوں کہ دادو کا کہنا بالکل ٹھیک تھا کہ میں تمہارے ساتھ بے حد خوش رہوں گی۔ آج میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ میں اور تم ایک دوجے کے لئے ہی بنے ہیں اور میں تمہارے ساتھ بہت خوش رہوں گی۔'' وہ کچھ کہہ رہا تھا اور وہ دل ہی دل میں سوچتی اپنے اندر اطمینان سا اترتا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے لبوں پر الوہی مسکراہٹ رقصاں تھی جسے محسوس کر کے عبیر بھی دلکشی سے مسکراتا اس کی مسکراہٹ کی تعریف کرنے لگا تھا۔

''مسٹر عبیر، اب زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مت بھولو کہ ہم اس وقت پارٹی میں موجود ہیں۔'' وہ سکون سے مسکراتی اس پر گھوری ڈال کر بولتی آگے بڑھنے کو تھی کہ وہ اس کی کلائی تھام گیا تھا۔ ''آئی لو یو مومل......'' اس نے عبیر کی بات سنی تھی، سرخ پڑ گئی تھی۔ آگے سے بڑا دل چاہا تھا کہ وہ اسے ''آئی لو یو ٹو'' کہے مگر لب حیا سے سل گئے تھے۔ اسے نوائم کی بات یاد آئی تھی کہ مرد محبت کا اظہار کرتا اچھا لگتا ہے عورت کے جذبات چھپے رہیں یہی ان کی اصل خوبصورتی ہوتی ہے۔ وہ اپنی کلائی آزاد کرواتی آگے بڑھ گئی تھی۔ عبیر اسے شور و ہنگامے کا حصہ بنتے دیکھ رہا تھا۔ آج اس کا دل بے حد خوش تھا وہ اپنی سرشاری کو عیاں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ''ڈی جے'' سے کوئی بات کی تھی۔ اور کچھ ہی دیر میں علی حیدر کی آواز اس کے دل کا اظہار و قرار بن کر اہل محفل کے کانوں میں رس گھولنے لگی تھی اور گیت اس نے جس کے لئے لگوایا تھا وہ رنگ بکھیرتے چہرے کے ساتھ، دل سے محسوس کرتی پلکیں جھکائے کھڑی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اس پر نظر میں ڈالتا جا رہا تھا جس کا آج سب سے حسین روپ اس کے سامنے تھا۔ اس کے دل سے دعا نکلی تھی کہ یہ دل کے قرار کا موسم کبھی نہ ڈھلے۔ محبت ہمیشہ ان کے گرد اپنا حصار باندھ کر رکھے۔ ان کے راستے کی ہر دیوار گر جائے۔ وہ مومل کا دل جیت کر بے حد مطمئن تھا اور مومل اپنی ہار پر

بے حد آسودہ تھی کہ یہ ہار اس کی زندگی کی سب سے بڑی جیت تھی۔ اس نے فاصلے پر کھڑے علی حیدر کی آواز کے ساتھ مدھم مدھم آواز ملاتے عبیر کو دیکھا تھا اور رب کا شکر ادا کرتی، کومل کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

قرار، دل کا قرار تم ہی تو ہو
تم سے یہ کہنا تھا، ہاں تم سے کہنا تھا
دیکھوں تمہیں اپنی آنکھوں سے
سپنوں میں، نیندوں، خیالوں میں
تم مجھ کو اپنا بنا لینا
دھڑکن سے دھڑکن ملا لینا
اوہو ہو ووو دیوار
کوئی دیوار سامنے آئی گرا دوں گا
ہاں میں گرا دوں گا
کرتا رہوں پیار کی باتیں
ساون کی جیسے ہوں برساتیں
جادو تم نے یہ کیا کیسے
مجھ کو ہی مجھ سے جدا کر کے
اوہو ووو ہاں پیار
جب بھی چاہو پاس پیار سے بلا لینا
ہاں تم بلا لینا......!

''کومل، تمہیں نہیں لگتا کہ آج اس رنگ و بو کی محفل میں پرستان کی ایک پری گلابی فراک میں محبت کی چھڑی لیے چلی آئی ہے۔'' وہ ان دونوں کے پاس آن ٹھہرا تھا، مخاطب کومل سے تھا دیکھ موبل کو رہا تھا جس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ عبیر کو گھورنے لگی تھی جبکہ کومل بری طرح ہنسنے لگی تھی۔

''موبل آپی کو پری کہہ رہے ہیں ناں آپ۔'' کومل کی عبیر سے کافی بے تکلفی تھی وہ اسے اپنا بڑا بھائی کہتی تھی۔

''شاید۔'' اس نے شرارت سے موبل کو دیکھ کر کومل کے ہاتھ پر ہاتھ مارا تھا اور وہ ان کو ہنستا دیکھ کر دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

''دیکھو دیکھو کومل پری مسکرا رہی ہے۔'' وہ آنکھوں میں مسکان، لبوں پر شرارت لئے بولا تھا۔ مومل بری طرح جھینپتی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی تھی۔ عبیر محبت کی جیت پر بے حد آسودگی محسوس کرتا دل سے مُسکرا دیا تھا......

☆......☆......☆

''سلام بی بی۔'' وہ تینوں فارم ہاؤس پر پہنچ چکے تھے۔ وہ وہاں پہلے کئی بار آ چکی تھی۔ اسے پہچان کر چوکیدار نے سلامتی بھیجی تھی۔ شاہ زیب کو گونا گو سکون کا احساس ہوا تھا کہ یہ پہچان ان کے لئے سودمند ثابت ہونے والی تھی کہ وہ راستے میں اسے بتا چکی تھی کہ فارم ہاؤس پر کوئی ملازم مستقل بنیادوں پر نہیں رکھے ہوئے، ایک واحد چوکیدار مستقل بنیادوں پر رکھا ہوا ہے اگر وہ تبدیل ہو گیا ہو تو پھر وہ کچھ نہیں کہہ سکتی اور پرانے چوکیدار کو دیکھ کر عریم کو بھی ایک ڈھارس سی بندھی تھی۔ اسی وقت سیاہ رنگت کا ایک پینتیس سال کا شخص ادھر آ گیا تھا اور انہیں سوالیہ نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ ان میں سے کوئی کچھ کہتا کہ چوکیدار نے تعارف کی رسم نبھائی تھی۔

''مالک لوگ ہیں، اندر لے جا، خاطر مدارت کر، بڑے صاحب بھی کچھ دیر میں آتے ہوں گے۔'' اس شخص کے چہرے پر پریشانی لمحہ بھر کو محسوس ہوئی تھی۔ شاہ زیب کو خیال گزرا تھا کہ کال اسی نے کی ہوگی۔ وہ تینوں اندر چلے آئے تھے۔

''یہاں کتنے ملازم ہیں؟'' آئیکت نے پوچھا تھا۔

''چوکیدار کے علاوہ میں اور میری گھر والی ہے۔'' وہ الجھا ہوا تھا مگر چوکیدار کی تصدیق کے بعد شک کی گنجائش نہ تھی۔

''آپ لوگ اچانک آ گئے، بتا کر آتے تو کھانے کا انتظام ہی ہو جاتا۔'' وہ عورت جو بھاری ڈیل ڈول کی تھی وہ الجھی ہوئی تھی، مضطرب سی بولی تھی۔

''پاپا کا کچھ دن قبل ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا، ڈاکٹرز نے آب و ہوا کی تبدیلی کا کہا ہے۔ شہر سے باہر جانے کو پاپا راضی نہیں ہوئے اس لئے فارم ہاؤس کا پروگرام بن گیا تھا۔ تم لوگ کھانے کا انتظام کر لو، کسی چیز کی کمی ہے تو بتا دو پاپا لوگ راستے میں ہوں گے لیتے آئیں گے۔'' شاہ زیب گہری سنجیدگی سے بولا تھا۔

وہ دونوں آگے سے کچھ نہیں بولے تھے۔ وہ شخص گہری سوچ میں تھا اسے یہ سب انہونی کا پتہ دے رہا تھا۔ شاہ زیب نے اسے بار بار سوچ میں ڈوبتے دیکھ کر وقت ضائع کرنا غیر مناسب سمجھا تھا۔ اسے لگا تھا کہ یوں وقت دے کر وہ اس شخص کو پلاننگ کرنے کا موقع دے رہے ہیں۔ شاہ زیب نے اسے اشارہ کیا تھا۔ آئیکت جسے سمجھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اس نے پینٹ کی پچھلی جیب سے ریوالور نکالی تھی اور اس انجان شخص پر تان لی تھی۔ وہ بھونچکارہ گیا تھا۔ اس کی چھٹی حس جو اسے خبردار کر رہی تھی تو غلط نہ تھا۔ وہ ان دونوں نوجوانوں کو دیکھ رہا تھا جو ان دونوں میاں بیوی پر پستول تانے کھڑے تھے۔

''کون ہو تم لوگ۔'' اس کی آواز میں خوف کا عنصر تھا کہ زندگی تو سب کو ہی پیاری ہوتی ہے۔ شاہ زیب نے دھیمے دھیمے بات کہنا

شروع کی تھی۔

''تم لوگوں سے جھوٹ نہیں کہا ہے۔ یہ لڑکی محمود خان کی بیٹی ہے اور میں اس کا شوہر ہوں۔ ہم یہاں صرف اس لڑکی کو بازیاب کروانے آئے ہیں جسے محمود خان نے کڈ نیپ کروایا ہے۔'' شاہ زیب کا لہجہ بے حد ہموار تھا۔ وہ شخص انجان بن گیا تھا۔ آئیکت نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر لگایا تھا۔

''سیدھی طرح بتاؤ لڑکی کہاں ہے، ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو اسی میں تمہاری بھلائی ہے، کچھ دیر میں یہاں پولیس پہنچ جائے گی۔ پھر تم لوگ خود کو بچا نہیں پاؤ گے۔'' آئیکت بری طرح سے دھاڑا تھا۔ وہ عورت ڈر گئی تھی، جان تو خطرے میں محسوس ہو رہی تھی، پولیس کا نام سن کر رہا سہا سکون بھی برباد ہوا تھا۔ وہ عورت رٹو طوطے کی طرح تمام بات کہہ گئی تھی کہ وہ دونوں میاں بیوی چوکیدار اسلم کے رشتہ دار تھے۔ دو ماہ قبل چوکیدار اسلم نے انہیں محمود خان سے ملوایا تھا اور کام پر رکھنے کی گزارش کی تھی۔ محمود خان نے ان دونوں کو فارم ہاؤس کی دیکھ بھال پر معمور کر دیا تھا۔ جس وقت عریم نے کہا تھا کہ آبدار وہاں آنا چاہتی ہے، اگر انہوں نے روکا تو شاہ زیب اسے طلاق دے دے گا۔ انہوں نے ایک پلاننگ کے تحت حامی بھر لی تھی۔ ظاہر یہی کیا تھا جیسے سب کچھ مجبوری میں کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجید کو اپنے آفس بلا لیا تھا اور اس سے کہا تھا کہ ایک لڑکی کو کڈ نیپ کرنا ہے۔ مجید نے ایسا کام کبھی نہ کیا تھا وہ انکاری ہو گیا تھا مگر محمود خان نے اسے یقین دلایا تھا کہ اسے یا اس کی بیوی کو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو گا۔ تین لاکھ کی کثیر رقم اسے آفر کی تھی۔ مجید کے دل میں لالچ آ گیا تھا۔ اس نے حامی بھر لی تھی۔ محمود خان نے اسے کام سمجھا دیا تھا۔ انہیں آبدار کو محمود خان کے گھر کے باہر سے اغواء کرنا تھا۔ ان دونوں کو وہاں پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ آبدار ان کے گھر تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی لعن طعن، آئینہ دکھانا، ان کی پلاننگ پر پانی پھر گیا تھا۔ وہ آگے کا سوچ بھی نہیں پا رہے تھے کہ کیا ہو گا۔ انہیں دھڑکا لگ گیا تھا کہ اب زمانے پر ان کی حقیقت کھل جائے گی۔ مگر ان کے دل کو یہ سکون ہی کافی تھا کہ آبدار کے نام کے ساتھ اورکزئی لگا ہے۔ وہ تو یہی سمجھے ہوئے تھے کہ اورکزئی خاندان نے آبشار کا ابارشن کروا دیا ہو گا مگر ان کی سوچ باطل ہو گئی تھی ان کی ناجائز بیٹی ان سے ملنے آ رہی تھی۔ اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ آبدار کی حقیقت کو زمانے کے سامنے عیاں کر دینے کی دھمکی کے ساتھ اورکزئی خاندان کو چپ رہنے کے لیے شاہ زیب کو عریم کو طلاق دینے کے لیے مجبور کر لیں گے اسی لیے انہوں نے آبدار کو آنے کی اجازت دے کر اس کے اغواء کی سازش کی تھی۔ وہ بظاہر رو رہے تھے، معافی مانگ رہے تھے مگر ان کا ذہن پلاننگ میں تھا۔ مگر وہ کچھ سوچ نہیں پائے تھے اور وہ لڑکی آبدار جس طرح آئی تھی واپس جا رہی تھی۔ یہ بات ان کے حق میں جاتی تھی۔ محمود خان نے بلا ٹلنے پر سکون محسوس کیا تھا کہ نئی آفت عریم کی بیماری کی صورت میں نازل ہوئی تھی۔ وہ بیٹی کو لئے ہاسپٹل دوڑے تھے۔ عریم کی حالت کافی نازک تھی۔ ڈاکٹرز اس کی جانب سے تقریباً مایوس تھے اور ان کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ انہوں نے بچہ کا پوچھا تھا۔ ڈاکٹرز نے بچہ کی طرف سے کلی اطمینان دلایا تھا اور کہا تھا کہ ان کی بیٹی کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے، کچھ دیر تک اگر اس کی حالت نہ سنبھلی تو پھر کچھ نہیں کہا جا سکتا اور انہوں نے

ڈاکٹر کو ایک لاکھ روپیہ کی آفر کے ساتھ کہا تھا رہ وہ بچہ ضائع کردے۔عریم کی جان کو خطرہ تھا لیکن وہ رسک اٹھانے کو تیار تھے۔ڈاکٹر آئیں بائیں شائیں کر رہی تھی۔لاکھ ڈیڑھ لاکھ میں تبدیل ہو گیا تھا۔اتنی ہینڈسم آفر تھی کہ ڈاکٹرنی اپنے ایمان کا سودا کر گئی تھی کہ یہ کام اس کے لئے مشکل نہ تھا وہ یہ کام دس، پندرہ ہزار میں بھی کر دیا کرتی تھی۔اور یہاں تو اسے ڈیڑھ لاکھ مل رہے تھے۔محمود خان کا کام ہو گیا تھا۔یہاں ڈاکٹرنی نے اطلاع دی تھی اور وہیں ان کے نمبر پر کال آنے لگی تھی۔مجید کا نمبر دیکھ کر ان کا خون کھول اٹھا تھا۔وہ اس سے بعد میں نپٹنے کا فیصلہ کرتے لائن کاٹ گئے تھے مگر یکے بعد دیگرے ایک کے بعد ایک کال یوں آ رہی تھی کہ انہیں کال ریسیو کرنا پڑی تھی۔وہ مجید پر غصہ ہو رہے تھے اور مجید نے یہ کہہ کر کہ وہ لڑکی کو اغوا کر چکا ہے اور وہ بے ہوش حالت میں گاڑی کی سیٹ پر پڑی ہے وہ اسے لئے فارم ہاؤس جا رہا ہے۔محمود خان کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔وہ وہاں ان لوگوں کے سامنے ذلیل کر کے جا چکی تھی جو حقیقت سے آشناء تھے، زمانے تک بات جانے کی فکر نہ رہی تھی کہ وہ یہ جان گئے تھے کہ آبدار کے نام کے آگے جہانزیب اور کرزئی کا نام لگا ہے۔ایسے میں کڈنیپ کی ضرورت نہ رہی تھی۔وہ کہنے ہی لگے تھے کہ اس لڑکی کو چھوڑ دیں کہ ان کا ذہن ان کو نئی بات سمجھا گیا تھا اور انہوں نے مجید کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان سے دو دن تک کوئی رابطہ نہ کرے اور اس لڑکی کو وہاں سے فرار نہ ہونے دے۔اس لڑکی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچانے کی ہدایت کے ساتھ اسے بے ہوش رکھنے کی ہدایت بھی کر ڈالی تھی۔محمود خان نے ایسا اب صرف اس سوچ کے تحت کیا تھا کہ وہ آبدار کو مہرہ بنا کر شاہ زیب سے بیٹی کو طلاق دلوائے گا۔یہ اس لئے اسے مشکل نہیں لگ رہا تھا کہ آبدار زمانے کی نظر میں اور کرزئی خاندان کی عزت تھی اور وہ جانتا تھا کہ اور کرزئی خاندان عزت اور بھرم کے قائم رہنے کے لئے ہر حد تک جا سکتا ہے۔وہ بے حد پرسکون تھا مگر یہ بات محمود خان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ شاہ زیب ابارشن کے بارے میں جان جائے گا اور بیٹی کو جب یہ بات پتہ چلے گی وہ باپ کے منہ پر تھوک کر چلی جائے گی۔وہ جو ایک کے بعد ایک پلاننگ کر رہا تھا، اس مالک کل نے اس کی ساری پلاننگز کو برباد کر دیا تھا۔وہ جو فرعون بنا دوسروں کی زندگیوں کے معاملات طے کرتا، عزت و جان کے سودے کرتا پھر رہا تھا، بے بسی و لاچاری سے بستر پر آن پڑا تھا۔پہلا ہی وار اس کے لئے آخری ثابت ہوا تھا۔ساری اکڑ اور غرور نکل گیا تھا۔تین دن گزر چکے تھے اور مجید ہدایت کے مطابق ان سے رابطہ کر رہا تھا لیکن وہ اس قابل ہی نہ رہے تھے کہ کسی سے کلام کر پاتے، کہاں سازشوں کو وقت دیتے، مجید ان کی بیماری سے ناواقف تھا۔موبائل اور فارم ہاؤس کے لینڈ لائن نمبر سے مستقل رابطے کی کوشش میں تھا اور اس کی یہ کوشش عریم کے دل میں شک ڈال گئی تھی اور وہ لوگ وہاں پہنچ گئے تھے۔

"صاحب، میں نے جو کیا لالچ میں آ کر کیا۔مجھے معاف کر دو۔ہمیں پولیس کے حوالے نہ کرنا۔" مجید تفصیل بتا کر منتوں پر اتر آیا تھا۔وہ دونوں میاں بیوی کوئی عادی مجرم نہ تھے یہ ان کا پہلا جرم تھا۔تب ہی ہ اپنے بچاؤ کے لئے کوئی مناسب تدبیر نہ کر پائے تھے اور رٹو طوطے کی مانند سب راز کھول دیئے تھے مگر وہ آبدار کو یہاں سے لے جانے سے پہلے تک ان پر بھروسہ کرنے کے حق میں نہ تھا۔اس نے آئیکت کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس عورت کو یرغمال بنا کر رکھے اور وہ مجید کے ساتھ آگے بڑھا تھا تا کہ مجید کسی قسم کی چالاکی نہ کر سکے۔شاہ

زیب نے یہ نہیں سوچا تھا کہ چالاکی کرنی ہوتی تو ساری بات سچائی سے کیوں بتاتا؟ مجید نے روم ان لاکڈ کیا تھا۔اس نے خود پستول مجید پر تانتے ہوئے عریم کو ہدایت کی تھی کہ وہ اندر جا کر دیکھے کہ اندر آبدار ہے بھی کہ نہیں ......؟اس پر مجید نے کہا تھا۔

''صاحب، آپ خود بھی جا کر دیکھ لو، میں پیشہ ور مجرم نہیں ہوں، پہلی بار پیسے کی لالچ میں کسی لڑکی کو اغواء کیا ہے۔جیل جانے سے ڈرتا ہوں اس لئے تمہارا ساتھ دے رہا ہوں۔بھروسہ کرو مجھ پر۔''اس نے ایک نظر مجید پر ڈالی تھی اسے وہ شخص کافی بے ضرر معلوم ہوا تھا۔ اس کی بیوی آئیکت کی گن کے نشانے پر تھی۔ یہ سوچ کر شاہ زیب دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا تھا۔کمرے کے عین وسط میں وہ اوندھی پڑی تھی۔سیدھا کیا تھا۔وہ آبدار ہی تھی جس کی آنکھیں بند تھیں۔وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی جو اس کے زندہ ہونے کا ثبوت بن کر ان دونوں کو اطمینان دلا گئے تھے۔شاہ زیب اسے پکار رہا تھا۔وہ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی۔عریم نے پانی کے لئے کمرے میں نظر دوڑائی تھی۔اکلوتا جگ خالی تھا۔اس نے مجید کو پانی لانے کا کہا تھا وہ دوڑ کر جگ بھر لایا تھا۔شاہ زیب نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تھے مگر غنودگی کی وہی سابقہ کیفیت تھی۔ دھیرے دھیرے بڑبڑاہٹ بند ہوتی چلی گئی تھی۔شاہ زیب نے اس کی نبض چیک تھی۔دل کی دھڑکن پر کان لگائے تھے۔کچھ بھی نارمل کا اشارہ نہیں دے رہا تھا۔عریم پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی وہ اس کی حالت دیکھ کر رونے لگی تھی۔شاہ زیب نے اسے ڈپٹ کر آبدار کو اٹھایا تھا۔

''ہمیں اسے لے کر جتنی جلدی ہو سکے ہاسپٹل پہنچنا ہوگا۔'' وہ باہر کی جانب لپکا تھا۔آئیکت کی جیسے ہی ان پر نظر پڑی تھی۔وہ شاہ زیب کی بڑبڑاہٹ فراموش کر کے ان کی طرف آیا تھا۔

''اسے کیا ہوا ہے، یہ بے ہوش کیوں ہے؟'' آئیکت کا دل کانپ رہا تھا۔

''صاحب کی ہدایت تھی کہ لڑکی کو بے ہوش رکھنا ہے۔اسے نیند کی گولیاں دیتے رہے ہیں۔'' وہ عورت ڈرتے ڈرتے بولی تھی۔ان میں سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا تھا۔وہ دونوں شاہ زیب کے پیچھے لپکے تھے۔شاہ زیب نے ہوش وخرد سے بیگانہ آبدار کو بیک سیٹ پر ڈالا تھا اور عریم کے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔آئیکت اپنی گاڑی میں آ بیٹھا تھا مگر اسے لگ رہا تھا کہ پل پل وہ اپنی زندگی سے دور جا رہا ہے۔

''آبدار! بس ایک بار اچھی ہو جاؤ، صرف ایک بار مجھے میری صفائی دینے کا موقع دے دو۔'' وہ شاہ زیب کی گاڑی کے پیچھے گاڑی دوڑاتا سوچ رہا تھا۔وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جو وقت ایک بار ہاتھ سے نکل جائے ہاتھ نہیں آتا۔

زندگی کے سفر میں گزر جاتے ہیں جو مقام

وہ پھر نہیں آتے، وہ پھر نہیں آتے

پھول کھلتے ہیں، لوگ ملتے ہیں مگر

پت جھڑ میں جو پھول مرجھا جاتے ہیں
وہ بہاروں کے آنے سے کھلتے نہیں
کچھ لوگ اک روز جو بچھڑ جاتے ہیں
وہ ہزاروں کے آنے سے ملتے نہیں
عمر بھر چاہے کوئی پکارا کرے ان کا نام
وہ پھر نہیں آتے، وہ پھر نہیں آتے
آنکھ دھوکہ ہے، کیا بھروسہ ہے، سنو
دوستو، شک دوستی کا دشمن ہے
اپنے دل میں اسے گھر بنانے نہ دو
کل تڑپنا پڑے یاد میں جن کی
روک لو، روٹھ کر ان کو جانے نہ دو
بعد میں پیار کے چاہے بھیجو ہزاروں سلام
وہ پھر نہیں آتے، وہ پھر نہیں آتے
صبح آتی ہے، رات جاتی ہے، یونہی
وقت چلتا ہی رہتا ہے رکتا نہیں
ایک پل میں یہ آگے نکل جاتا ہے
آدمی ٹھیک سے دیکھ پاتا نہیں
اور پردے پہ منظر بدل جاتا ہے
ایک بار چلے جاتے ہیں، جو دن، رات، صبح و شام
وہ پھر نہیں آتے، وہ پھر نہیں آتے

آئیکت کا ہی نہیں، عریم کا دل بھی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ شاہ زیب اسے راستے میں جو پہلا ہاسپٹل پڑا تھا وہیں لے آیا تھا اور اب وہ تینوں اس کی زندگی کے لئے دعا گو تھے۔

☆......☆......☆

''ابسام حیدر، آپ کو نوائم شکیل احمد اپنے نکاح میں قبول ہیں۔'' محفل اپنے عروج پر تھی۔ حیدر صاحب اور فضہ حیدر نے کیک کاٹا تھا اور تحائف وصول کیئے تھے، ہر طرف ہنسی، قہقہے بکھرے تھے۔ اس سارے ہنگامے کے دوران حیدر صاحب نے بیٹے کے نکاح کا اناؤنس کیا تھا۔ اہل محفل حیرت وخوشی سے جھوم اٹھے تھے۔ بہت قریبی احباب ہی مدعو تھے۔ زیادہ تر واقف تھے کہ نوائم اور ابسام کی منگنی ہو چکی ہے اس لحاظ سے حیرت کسی کو نہ تھی سب سرپرائز پر حیرت زدہ تھے۔ مولوی صاحب کے آتے ہی ایجاب وقبول کا مرحلہ آغاز پکڑ گیا تھا۔ ابسام حیدر کی وہ حالت تھی کہ اب جان نکلی کہ تب اس کو اپنے کانوں میں مولوی صاحب کی آواز آتی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے کان تو آبدار کی سرگوشیوں میں لگے تھے۔

''ابسام! محبت ایک بے حد بے اختیار جذبہ ہے۔ جو جذبہ میں برسوں کے ساتھ میں، دوستی واپنائیت کے کسی بھی رنگ میں آئیکت کے لئے محسوس نہ کر سکی وہ جذبہ میں نے پہلی نظر میں چند دنوں میں آپ کے لئے شدت سے محسوس کیا ہے اور مجھے اس کا اظہار کرتے ذرا بھی شرمندگی نہیں ہے، مجھے آپ سے محبت ہے اور میں اقرار کرتی ہوں۔'' اس کا ذہن ودل کہیں اور سفر کر رہے تھے۔ اہل محفل پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ فضہ حیدر گھبرا کر حیدر صاحب کو دیکھنے لگی تھیں۔

''میں بھی اقرار کرتا ہوں آبدار کہ میں نے جو جذبہ برسوں کے ساتھ میں، سالوں کی منگنی میں نوائم کے لئے محسوس نہیں کیا وہ میں تمہارے لئے محسوس کرتا ہوں۔ مجھے بھی تم سے محبت ہے۔ سنا آبدار صرف تم سے محبت ہے۔ میں تمہاری محبت کو شرفِ قبولیت بخشتا ہوں۔ اپنی محبت کا اقرار کرتا ہوں۔ تمہیں میرے منہ سے فقط ایک جواب سننا تھا تو سنو آبدار......دل سے......کان لگا کر سنو۔'' وہ وہاں ہو کر بھی موجود نہ تھا وہ آبدار کو جس محبت کا جواب محبت سے اکیلے میں، تنہائی میں نہ دے سکا تھا آج بھری محفل سے کٹ کر اس کی سرگوشیوں کو دل سے محسوس کرتا، دل سے جواب دیتا جا رہا تھا۔ اس کی سرگوشیاں دل سے تھیں، دل کے لئے تھیں کہ محفل پر چھایا سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔

''ہاں۔'' وہ ایک جذب کے عالم میں بولا تھا اور محفل میں مبارک سلامت کا شور گونج اٹھا تھا اور اسے دل کی محفل سے کھینچ لایا تھا۔ وہ چونک اٹھا تھا۔ نظر ماں کے مسکراتے چہرے پر پڑی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں براجمان نوائم کی موجودگی کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ اس نے نظر جھکائی تھی۔ مولوی صاحب نے بات دہرائی تھی۔ اس نے دل کے محرم سے نظر چرائی تھی۔ خود کو وقت کے دھارے پر چھوڑا تھا اور نوائم کو اپنے نکاح میں قبول کر لیا تھا۔

''قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے۔'' تین بار اس کے لب سے آزاد ہوا تھا اور اسے لگا تھا کہ محبت اس کے اندر ہی دم توڑ گئی ہے۔

''میں اس کے لئے آپ کو معاف نہ کروں گی ابسام۔'' آنسوؤں میں ڈوبی سرگوشی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ وہ کچھ جواب دیتا کہ اسے سب اپنے منتظر لگے تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا ایک ایک سے اپنی محبت کی موت پر، اپنے دل مردہ کے سوگ میں گلے ملنے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آبدار ایک خواب ہوئی، اب اسے خود سے نظر چرا کر عمر تمام کرنی ہوگی۔ اس کی نظر اٹھی تھی۔ نوائم سرخ رنگ کی پشواز میں نیٹ کا گھونگھٹ

ڈالے بیٹھی تھی۔اس کی جھکی پلکیں دیکھ کر وہ نظر چرا گیا تھا۔اسے لگا تھا کہ اس کا دل بند ہونے کو ہے۔اسے ہوا میں موت کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔دل کو مرحوم کہنے کا دل شدت سے کرلایا تھا۔اس نے نوائم پر سے نگاہ ہٹالی تھی۔آسمان پر نگاہ کی تھی۔

''لگتا ہے آج میں مر گیا ہوں۔دل مرحوم کو سینے میں دفن کر دیا ہے۔محبت کا مرقد، میرا اپنا وجود بن گیا ہے۔''اس نے آنسو اپنے اندر اتارے تھے۔اسے فضا میں آخری ہچکی محسوس ہوئی تھی۔وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔اسے ہر جگہ آبدار نہ ہو کر بھی محسوس ہو رہی تھی۔آسمان کا رنگ لہو رنگ ہو رہا تھا۔یوں لگتا تھا کہ ایک محبت کا قتل آسمان کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''تم میری یادوں میں ہمیشہ مسکراتی رہو گی۔میں جینا چھوڑ سکتا ہوں مگر تم سے محبت کرنا نہیں آبدار......''اس نے آنسو رگڑے تھے اور باپ کی آواز پر پلٹ کر ان کو دیکھ کر ان کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

''ابسام! مجھے روک لیں، آج اگر گئی تو کبھی لوٹ کر نہ آؤں گی، کبھی مسکرا نہیں سکوں گی، مجھے آپ کبھی بھول نہیں پائیں گے، پل پل یاد کریں گے تب بہت دیر ہو چکی ہوگی۔آپ ہی میری جیت، آپ ہی میری ہار ہیں، میرے جینے کی وجہ آپ میری واحد خوشی ہیں، آپ کا ساتھ جو چھوٹا تو سانس آزار ہو جائے گی۔میں آپ کو جیتنا نہیں چاہتی، میں تو آپ پر خود کو وار دینا چاہتی ہوں۔ہار دینا چاہتی ہوں۔''وہ آگے بڑھ رہا تھا اور ماضی اسے اپنی اور کھینچ رہا تھا۔آبدار کے آنسو سمندر بنے آگے بڑھنے کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے مگر وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔وہ رشتوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔محبت سے دور ہو رہا تھا۔اس نے اپنے مقام، اپنے رشتوں کے لئے محبت ہار دی تھی۔یعنی آج ابسام حیدر سب کچھ پا کر بھی تہی دست رہ گیا تھا۔وہ آج زندگی ہی ہار بیٹھا تھا۔

کبھی یادوں میں آؤں، کبھی خوابوں میں آؤں
تیری پلکوں کے سائے، میں آکر جھلملاؤں
میں وہ خوشبو نہیں جو ہوا میں کھو جاؤں
ہوا بھی چل رہی ہے مگر تو ہی نہیں ہے
فضا رنگین وہی ہے کہانی کہہ رہی ہے
مجھے جتنا بھلاؤ میں اتنا یاد آؤں
جو تم نہ ملتیں ہوتا ہی کیا ڈھونڈ لانے کو
جو تم نہ ہوتیں ہوتا ہی کیا ہار جانے کو
میری امانت تھیں تم، میری محبت ہو تم
تمہیں کیسے میں بھلاؤں!

ترپ رہے ہو زمانے سے مسکرانے کو
ترس رہے ہو زمانے سے پاس آنے کو
تیری دھڑکنوں میں بس کر، تیری سانسوں میں رہ رہ کر
تمہیں ہر پل ستاؤں......!

☆......☆......☆

گیارہ سال بعد:۔

وارڈ نمبر 4، کمرہ نمبر 30، بیڈ نمبر 12 کا مریض آج پھر حالتِ کرب میں تھا۔ آج تک کوئی یہ نہیں جان سکا تھا کہ اس مریض کے ساتھ آخر مسئلہ کیا تھا۔ وہ تقریباً نو برس قبل اس ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوا تھا۔ اسے تقریباً گیارہ برس قبل فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے وقت کے ساتھ بہترین نگہداشت اور علاج کے ذریعے اپنے ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے اب صرف ''غوں غاں'' کی آوازیں نہیں نکلتی تھیں۔ وہ ٹوٹے پھوٹے چند جملے بھی کہنے کے قابل ہو چکا تھا مگر نو برس پہلے وہ اس ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوا۔ اس وقت کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ بظاہر نظر آنے والا ہی مسئلہ نہیں ہے اس کی جان کے ساتھ کتنے ہی جھمیلے چمٹے ہیں۔ جو رات بھر اسے ڈراتے ہیں۔ اس کا وجود جھٹکے کھانے لگتا ہے۔ اس کے بستر سے ایک عجیب سی مہک آنے لگتی تھی۔ ایسی مہک کہ ڈاکٹرز اور نرسز کو سانس لینا محال ہو جاتا تھا۔ وارڈ بوائے روز بستر کی چادر جیسے بدلتا تھا وہی اس روح کو چیرنے والی بدبو کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کا دم گھٹتا تھا مگر وہ سب اپنی اپنی جگہ، اپنے اپنے فرائض و کام کے آگے مجبور تھے۔ ڈاکٹرز اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ ٹریٹمنٹ چل رہا تھا۔ جو کئی ایک مسئلہ تھے، ان پر قابو پایا جا چکا تھا۔ اس کا فالج زدہ جسم حرکت کے قابل ہو چکا تھا لیکن اس کے ساتھ اصل مسئلہ کیا تھا کوئی آج تک نہیں سمجھ سکا تھا۔ کمرہ نمبر 30 چیخوں سے لرز رہا تھا۔ نرس جس کی ڈیوٹی تھی وہ اندر جانے سے خوفزدہ تھی۔ نوکری نہ چلی جائے کے خوف نے اس کے پہلے خوف پر شکنجہ کمزور کیا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ مریض بستر پر چت لیٹا تھا۔ یکدم اس کے جسم کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ منہ سے عجیب و غریب آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ نرس کی آنکھیں خوف سے پھیلنے و سکڑنے لگی تھیں۔ وہ مریض جو اٹھ کر بیٹھنے کے قابل نہ تھا وہ یکدم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ اپنے جسم کو نوچ رہا تھا، کاٹ رہا تھا۔ نرس کی خوف سے چیخیں بلند ہو گئی تھیں۔ باقی عملہ جتنی دیر میں وہاں پہنچا اس نرس کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ اسے دو نرسوں نے دائیں بائیں سے تھام لیا تھا۔ اس نرس نے ڈرے ڈرے انداز میں نظر بستر تک اٹھائی تھی۔ وہ مریض اب واپس سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ خون کے قطرے اس کے بیڈ سے نیچے لٹکتے ہاتھ سے گرتے جا رہے تھے اور نرس یہ سوچ کر کانپ رہی تھی کہ وہ کیسے سیدھا ہوا، کیسے بیٹھا، کیسے واپس لیٹا۔ یہ آج تک کوئی نہیں جان سکا تھا۔ مریض کی آوازیں بدستور کمرے کی فضا میں بکھر رہی تھیں۔

''مجھے معاف کر دو...... معاف کر دو...... خدا کے لئے...... معاف کر دو'' عملہ دھیرے دھیرے اپنے کام کی طرف بڑھ رہا تھا۔

کمرے کی آوازیں سرگوشیوں میں ڈھلنے لگی تھیں۔ دوسروں کو اذیت دینے والا خود ایسی بیماری و اذیت میں مبتلا تھا کہ میڈیکل سائنس بھی حیران تھی۔ خدا کی لاٹھی بڑی بے آواز ہوتی ہے۔ جب پڑتی ہے تو اچھے اچھے فرعون بھی فرعونیت سے توبہ کر لیتے ہیں۔ وہ کسی کی بددعاؤں کے حصار میں تھا۔ جو زندہ تھے وہ سب معاف کر چکے تھے۔ بیوی نے جب تک ممکن تھا، ساتھ دیا تھا اور جب خوف کے سائے پھیلے تھے تو مینٹل ہاسپٹل میں داخل کروا دیا تھا۔ اس کے بعد وہ بھی زندہ نہیں رہی تھیں۔ محمود خان کو ہاسپٹل شفٹ کروانے کے محض پندرہ دن بعد نتاشہ وفات پا گئی تھیں۔ عریم اکثر باپ سے ملنے آ جاتی تھی۔ وہ ان کے لئے بہت دعائیں کرتی تھی۔ آبشار اور کزئی سے بار بار معافی مانگتی تھی۔ آبشار کو آج بھی ہسٹریا کے دورے پڑتے ہیں۔ وہ ذلت انہیں باوجود اس کے کہ انہوں نے سچے دل سے محمود خان کو معاف کر دیا ہے، بھولتی ہی نہ تھی اور یہ اذیت مر کر ہی جان چھوڑنے والی تھی۔ آبشار کا معاف کر دینا بے سود تھا کہ وہ تو آبدار کی بددعاؤں کے زیر اثر آ چکے تھے۔ بددعائیں ان کے تعاقب میں کچھ یوں تھیں کہ کبھی وہ بیمار لگتے، کبھی نارمل، کبھی پاگل...... مگر انہیں معافی نہیں ملنی تھی کہ بددعا دینے والی، معاف نہ کرنے کا عزم لئے اس دنیا سے جا چکی تھی۔ آبدار کی جس تنگ ماحول میں پرورش ہوئی تھی وہ اس کا نصیب بن گئی تھی۔ اُسے کسی نے معاف نہ کیا اور وہ بھی محمود خان کو معافی کا اذن دیے بنا ایڑیاں رگڑتی مر گئی تھی۔ آبدار کی موت ان سب کے لئے اذیت ناک تھی لیکن محمود خان کے لئے آزمائش بن گئی تھی۔ محمود خان کو کبھی آبشار کی چیخیں سونے نہیں دیتی تھیں تو کبھی آبدار آنکھوں میں نفرت لئے ان کے سامنے آن کھڑی ہوتی تھی۔ وہ چیختے تھے، جسم نوچتے تھے۔ معافی مانگتے تھے مگر سب بے سود، گیارہ برس گزر گئے تھے۔ موت ان پر اب تک مہربان نہ ہوئی تھی۔ ان کی یہ سزا ابھی مزید کتنے برس جاری رہنا تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کوئی جانتا تھا تو وہ رب کائنات جس کے اختیار میں سب کچھ تھا، جس کی بے آواز لاٹھی محمود خان کے کس بل نکال گئی تھی۔ آج ان کے حواس اتنے بھی نہ رہے تھے کہ وہ معافی ہی مانگ لیتے، ٹوٹے پھوٹے لفظ جنہیں آج تک کوئی سمجھ نہ پایا تھا۔ ان کے لب سے آزاد ہو رہے تھے۔ کمرہ میں گھٹن بڑھ رہی تھی۔ بدبو تھی کہ پھیلتی جا رہی تھی۔ دم گھٹ رہا تھا اور سانس چل رہی تھی۔

سانپ کا بل ہے شاید
میرے کمرے میں!
مجھ کو مردہ چوہوں کی بو!
سونے ہی نہیں دیتی ہے!
سو جاؤں تو
سینکڑوں خوابوں کی پھنکاروں سے میں اٹھ جاتا ہوں
میری نیندوں کو ڈس کر وہ

بل میں جا کر چھپ جاتا ہے
سانپ کا بل ہے شاید میرے کمرے میں
روز میری گردن پہ ان دانتوں سے زہر ٹپکتا ہے
روز صبح بستر پہ کوئی کینچلی مل جاتی ہے نئی
رات کو میں وہ کینچلی پہنے
پھر بل میں گھس جاتا ہوں
سانپ کا بل ہے شاید میرے کمرے میں!

☆......☆......☆

''چاچو، میں نے بھی آپ کے ساتھ جانا ہے۔'' چار سالہ مریم لپک کر اس کے پیروں سے لپٹ کر بولی تھی۔ آئیکت اورکزئی نے اسے گود میں اٹھا لیا تھا۔

''چاچو کی جان! چاچو ابھی ایک کام سے باہر جا رہے ہیں۔ واپسی پر اپنی گڑیا کو ساتھ لے جا کر آئس کریم کھلائیں گے۔'' اس نے مریم کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔ مریم کی اس سے کافی اچھی انڈراسٹینڈنگ تھی۔ مریم کی آئیکت سے کافی اٹیچمنٹ تھی۔ وہ اس کی بات فوراً مان گئی تھی۔ اس نے مریم کو گود سے اتارا تھا اور اس کی نظر عریم پر پڑی تھی۔

''آئیکت بھائی۔ کب تک آپ کسی کی یادوں میں زندگی گزارتے رہیں گے۔ زندگی کی رنگینیوں پر آپ کا بھی حق ہے۔ آپ کو زندگی کے سفر میں اب آگے بڑھ جانا چاہئے۔'' عریم کا دل اس کو دیکھ کر بہت دکھتا تھا۔ احساس ندامت سے وہ خود کو اس کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل بھی نہیں سمجھتی تھی۔ گزشتہ برسوں میں کئی بار وہ اس کو شادی کا مشورہ دے چکی تھی مگر وہ کسی کی سنتا ہی کب تھا۔

''جب تک سانس ہے بھابھی! یادیں ہی تو میرے جینے کا سہارا ہیں۔ جسے اپنے ہاتھوں گنوا دیا۔ اب اسے یادوں میں بھی زندہ نہ رکھوں، بھول جاؤں، آگے بڑھ جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔'' آئیکت کی آنکھیں لہو سمیٹ لائی تھیں۔ عریم آگے سے کچھ کہتی کہ وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ عریم جانتی تھی کہ وہ آبدار کی قبر پر جا رہا ہے۔ اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔ گیارہ سال قبل آبدار کی موت واقع ہوگئی تھی۔ وہ تینوں جس وقت اسے ہاسپٹل لے کر پہنچے، اس کی سانس چل رہی تھی۔ ڈاکٹرز اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ اورکزئی ہاؤس کا ایک ایک فرد ہاسپٹل پہنچ گیا تھا۔ سب آبدار کی زندگی کے لئے دعا گو تھے لیکن وہ سب کو روتا، ندامت میں گھرا چھوڑ کر ابدی سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔ ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ ہیوی ڈوز کے علاوہ اس کے دماغ کی سب سے حساس نس ڈیمیج ہوگئی تھی۔ اسے نیند آور دوائیاں نہ کھلائی گئی ہوتیں تو اس کے بچنے کے چانسز ہو سکتے تھے لیکن موت کو آنے سے روکنا کسی کے بھی اختیار میں نہ تھا اس لئے بے وجہ، وجہ بن گئی تھی۔ اس کی موت کے ساتھ

کتنے ہی لوگ قبر میں اتر گئے تھے۔احساس ندامت تھا کہ ہر پل کے ساتھ سوا ہوتا جا رہا تھا۔

دوست میں تیرے غم میں سانسیں

کاٹ رہا ہوں ایسے

کوئی پنچھی پر کٹوا کے اُڑنا چاہے جیسے

قصے ساتھ نبھانے کی قسمیں ہونگی کیسے پوری

دل کو چبھے جو من کو کاٹے، کیسی ہے یہ دوری

کیسی ہے یہ دوری......!

اب میرا جیون بیت رہا ہے ایسے ویسے

کوئی پنچھی اڑنا چاہے جیسے......!

گیارہ سال گزر گئے تھے آبدار کو زندگی سے گزرے، گیارہ سالوں میں زندگی کا نقشہ ہی بدل گیا تھا، کتنے ہی زندہ جسم روح کی قید سے آزاد ہو کر قبر میں اتر گئے تھے۔شوکت اور کرنل آبدار کی وفات کے تین ماہ بعد ہی خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔عریم کو وہ سب لوگ سب کچھ بھلا کر اور کرنل ہاؤس عزت و مان کے ساتھ رخصت کر لائے تھے۔آمنہ اور مومنہ کی شادیاں ہوگئی تھیں۔عریم اور شاہ زیب کے دو جڑواں بیٹے اور ایک بیٹی مریم تھی۔آئیکت نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔وہ اب تک اس ملال میں تھا کہ اس نے کیوں آبدار کا ساتھ چھوڑا، اس سے کیوں اپنی دوستی چھین لی، کیوں اسے اکیلا کر دیا۔اس کیوں کا اس کے پاس بہت مدلل جواب تھا مگر جسے جواب دینا تھا وہ ہی نہیں رہی تھی۔اب وہ چاہے دیواروں سے سر ٹکراتا، کتنی ہی صفائیاں پیش کرتا مگر سب لاحاصل تھا۔آئیکت کو دیکھ کر ان سب کے اندر احساس زیاں بڑھتا جاتا تھا۔سب نے بے حد کوشش کی تھی کہ وہ شادی کر لے مگر وہ نہیں مانا تھا۔تین سال قبل اس کی والدہ تابندہ اور کرنل بھی چل بسی تھیں۔جہانزیب اور کرنل اور رخسانہ کوشش کرتی تھیں کہ آئیکت شادی پر راضی ہو جائے مگر وہ اپنے فیصلہ سے ایک انچ نہیں ہٹتا تھا اور یوں ہی گیارہ برس گزر گئے تھے۔پچھلے گیارہ برسوں میں اگر کچھ بہت اچھا ہوا تھا تو وہ تھی آبشار اور کرنل کی کبیر عباسی سے شادی۔وہ تو اپنے طور پر منع کر چکی تھیں، ان کا فیصلہ کبیر عباسی کے ذریعے شاہ زیب تک پہنچ گیا تھا۔سب آبدار کی جواں موت پر سوگوار تھے۔آبشار بے حد شرمندہ تھیں مگر اب سب لاحاصل تھا۔اس لئے شاہ زیب نے تمام صورتحال سے تایا اور باپ کو آگاہ کر دیا تھا اور ان کا بھی یہی فیصلہ تھا کہ آبشار کی شادی ہو جائے۔آبدار کی موت کے ڈھائی ماہ بعد ان کا سادگی سے کبیر عباسی سے نکاح کر دیا گیا تھا۔کبیر عباسی تو پاکستان میں رہنے کا فیصلہ کر چکے تھے، یہی عبیر کی بھی خواہش تھی لیکن آبشار نے ملک چھوڑ کر جانے کو ترجیح دی تھی۔وہ سب کا سامنا نہیں کر سکتی تھیں۔انہیں ملنے جلنے والوں کی باتوں کا ڈر تھا اس لئے جب انہوں نے اپنے ذہن و دل کے خدشات سب کے سامنے کہے تھے تو وہ کبیر عباسی تک

پہنچ گئے تھے اور یوں وہ لوگ واپس ڈنمارک چلے گئے تھے۔ساڑھے دس سال کا عرصہ بیت گیا تھا اور وہ پاکستان واپس نہیں آئی تھیں۔ انہیں عریم سے بھی بچنا تھا، آبدار کی یادوں سے بھی بچنا تھا اس لئے وہ چاہ کر بھی پاکستان آ نہیں پائی تھیں۔سب ان کی حالت کو سمجھتے تھے اس لئے فورس نہیں کرتے تھے۔شاہ زیب کو اپنی پھپھو آج بھی خود سے زیادہ عزیز تھی۔اس نے اپنی پھپھو کی راہ کے تمام کانٹیں چن لئے تھے۔وہ کبیر عباسی کے ساتھ ایک آسودہ زندگی بسر کر رہی تھیں۔آٹھ سال قبل عبیر کی مومل سے شادی ہو گئی تھی۔ان کا ایک بیٹا تھا جو مومل سے زیادہ آبشار کے پاس رہتا تھا۔ان کی آغوش میں پل کر سات برس کا ہو چکا تھا اور عبیر اس کے لئے مومل کا احسان مند تھا۔مومل اور اس کی آج بھی بے حد لڑائیاں ہوتی ہیں مگر وہ لڑ بھڑ کر ایک ہو جاتے ہیں کیونکہ ان دونوں کے دل ایک ہی لے پر دھڑکتے ہیں۔وہ ماضی کو سوچتا ڈرائیونگ کرتا قبرستان پہنچا تھا۔

کاش! ملتے جو دو لمحے تو میں یہ کہہ سکتا
مجھے چھوڑ کر یوں جانے والے میں یوں نہیں رہ سکتا
میں یوں نہیں رہ سکتا......!
بس گیا تو ایسے دیس میں جا کے، جا سکے نا سندیسے
کوئی پنچھی اڑنا چاہے جیسے......!

''مجھے معاف کر دو آبدار''وہ اس کی قبر پر تازہ پھول ڈالتے ہوئے فاتحہ خوانی کے بعد وہیں بیٹھ گیا تھا اور اس سے بات کرنے لگا تھا جو منوں مٹی تلے سو رہی تھی۔

''میں اس اعتراف کو کر کے تھک گیا ہوں آبی، کہ میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے کیا۔''اس کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''میری تھکن سمیٹ لو۔معاف کر دو مجھے۔مجھے اندازہ ہوتا کہ میں بھیڑ میں تمہیں تنہا کروں گا تو تم موت کے میلے تک جا پہنچو گی تو باخدا میں خودغرض بن جاتا۔کبھی وہ سب نہ کہتا تم سے۔''اس کے آنسو روانی سے گر رہے تھے۔یہ باتیں اب پرانی ہو چکی تھیں مگر اذیت کے رنگ آج بھی کتنے گہرے تھے یہ کوئی آئیکت اور کزئی سے پوچھتا۔جس نے آبدار کی آنکھوں میں ابسام کی محبت محسوس کی تھی۔ابسام کے گھر کو چھوڑتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو تکلیف تھی اسے محسوس کر کے آئیکت نے راہ بدل لی تھی۔اس نے سوچا تھا کہ کہیں وہ اس کے احسان تلے دبی دل کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کر جائے اس لئے وہ اس کے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کر گیا تھا مگر اسے یہ نہیں پتہ تھا کہ کچھ لوگوں سے اتنی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں کہ اگر وہ بے آس رہ جائیں تو انسان اندر سے مر جاتا ہے۔آبدار کے لیے بھی یہ بات کافی تکلیف دہ تھی۔

مولا تو ہی کہتا تھا کہ دل سے نہیں کھیلے گا
کوئی بھی بندہ صبر کی حد سے زیادہ نہ جھیلے گا

زیادہ نہ جھیلے گا......!

دوست میں تیرے غم میں سانسیں

کاٹ رہا ہوں ایسے

کوئی پنچھی پر کٹوا کے اُڑنا چاہے جیسے......!

''تم ایک بار مجھ سے میرا حال دل سن لیتیں۔ایک بار راہ بدلنے کی وجہ پوچھ لیتیں۔ایک بار مجھے صفائی کا موقع دے دیتیں آپی۔''

اس کے آنسو تھے کہ روانی سے بہتے جا رہے تھے مگر وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا۔رونا، خوش ہونا، دکھ محسوس کرنا، اذیت و ذلت سے گزرنا سب زندگی کے جھمیلے ہیں اور وہ اس سب سے آزاد ہو چکی تھی۔جانے والا جا چکا تھا۔اب لکیر پیٹو کہ شکست کا ملال کرو۔جیت ہاتھ سے جانے کا ماتم کرو اس نے نہیں آنا تھا کیونکہ بے رحم موت زندگی کو نگل گئی تھی۔قبر کی مٹی میں آئیکت کے آنسو جذب ہوتے جا رہے تھے۔وہ تمام اعترافات کر کے تھک چکا تھا۔تمام ذہن و دل کی باتیں خاموش قبر کے حوالے کر دی تھیں اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا تھا۔پھر یہیں لوٹ آنے کے لئے کہ جب تک اسے زندہ رہنا تھا سانسوں کا خراج دینا تھا۔محبت کے بچھڑنے کا ماتم کسی معمول کسی عادت کی مانند کرنا تھا اور کرتے چلے جانا تھا۔

سانس لینا بھی کیسی عادت ہے

جیئے جانا بھی کیا روایت ہے

کوئی آہٹ نہیں بدن میں کہیں

کوئی سایہ نہیں ہے آنکھوں میں

پاؤں بے حس ہیں چلتے جاتے ہیں

اک سفر ہے جو بہتا رہتا ہے

کتنے برسوں سے، کتنی صدیوں سے

سانس لیتے ہیں، جیتے رہتے ہیں

عادتیں بھی عجیب ہوتی ہیں

☆......☆......☆

''کیا سوچ رہی ہو آبش!'' وہ بستر پر نیم دراز کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے۔آبشار نے عشاء کی نماز کے بعد معمول کے وظائف ختم کیے تھے اور مصلہ رکھ کر بیڈ تک آئی تھیں۔وہ آبشار کی غیر معمولی سنجیدگی کو محسوس کرتے کتاب ٹیبل پر رکھ کر نرمی سے پوچھ گئے

تھے۔انھوں نے نفی میں گردن ہلائی تھی گویا کہنا چاہا تھا کہ کچھ نہیں سوچ رہیں۔مگر انھوں نے ظاہر پر توجہ نہ دی تھی جو پوشیدہ تھا اسے محسوس کرتے آبشار کا ہاتھ تھام گئے تھے۔

''آبدار کے بارے میں سوچ رہی ہو؟''نرم سی آواز میں استفسار ہوا تھا اوران کے آنسو گرنے لگے تھے۔

''آبدار کی کل گیارہویں برسی ہے۔''وہ سسکی تھیں۔

''مومل بیٹی کو یقیناً یاد ہوگا کل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کرلیں۔''وہ نرمی سے بول گئے تھے۔

''میں آپی کے ساتھ انصاف نہیں کرسکی......خود پر بیتے ظلم کی سزا اس مظلوم کو یوں دی کہ وہ جان کی بازی ہی ہار گئی۔''وہ سسک اٹھی تھیں۔

''جو ہوا سب اللہ کی رضا......جس بات کا اختیار تمھارے ہاتھ نہ تھا خود کو تمام عمر اس بات کی سزا دینے سے پہلے بھی کچھ حاصل نہ ہوا ......نہ اب ہوگا......اس لیے وقت کے ساتھ آگے بڑھنا سیکھو آبشار......''کبیر عباسی بہت نرمی سے محبت بھرے لہجے میں بولے تھے۔

''میں اپنی اذیتوں میں گھری آبدار کے لئے اذیت کا جہاں تعمیر کرتی گئی یہ پچھتاوا مجھے جینے نہیں دیتا کبیر......''وہ بری طرح رو رہی تھیں۔شادی انھوں نے شوکت اور کزئی کے مجبور کرنے پر کی تھی اور شادی کے بعد بھی انھیں ہسٹریا کے دورے پڑتے تھے۔شدت پہلی سی نہ تھی دورانیہ بھی کم ہوگیا تھا مگر جب بھی کیفیت ہوتی تھی کبیر عباسی بہت ضبط کا مظاہرہ کرتے تھے کہ انھوں نے محبت کو ایک جہان لٹا کر حاصل کیا تھا وہ ایک خیال رکھنے والے اعلی ظرف شوہر ثابت ہورہے تھے اور اس کے لئے آبشار خدا کی شکر گزار تھیں کہ کانٹوں کی راہگزر گلزار بن گئی تھی لیکن آبدار کا سوچ کر وہ بے چین ہوجاتی تھیں۔سوچتی تھیں کہ اگر خود پر ہوئے ظلم کی سزا آبدار کو نہ دیتیں تو آج ضمیر کی عدالت میں سرخرو ہوتیں۔مگر انسان کو اکثر باتیں وقت گزرنے کے بعد ہی سمجھ آتی ہیں۔

''تمھارا پچھتاوا آبدار کی کسی تکلیف کو ختم نہیں کرسکتا آبشار......وہ اب ہر لذت سے ماورا ہوگئی ہے اس جہاں چلی گئی ہے جہاں آنسو نہیں پہنچتے......سسکی نہیں جاتی......صرف دعائیں پہنچتی ہیں......تم بس آبدار کے ایصال ثواب کا اہتمام کیا کرو......اللہ اسے جنت میں کروٹ کروٹ آرام نصیب کرے۔''وہ بیوی کا سر کاندھے سے لگائے بہت نرمی سے بولے تھے۔پچھتاوے تو خود ان سے لپٹے ہوئے تھے اور وہ بے بس تھے اسی لیئے انھوں نے اپنی جائیداد کا آدھا حصہ والدین کے ایصال ثواب کی نیت سے ٹرسٹ میں دے دیا تھا۔جو نہ کرسکے تھے اس پر پچھتانے سے بہتر جو کرسکتے تھے اس طرف نگاہ مرکوز کرلی تھی......

''کاش!میں تم سے معافی مانگ لیتی آپی......مگر تم ساری عمر محبت سے میری طرف دیکھتیں......مجھ سے معافی مانگنے کا حق ہی چھین لے گئیں......ہوسکے تو مجھے معاف کردینا۔''وہ سسکی تھیں۔مگر ان کی آہ سینے میں ہی دبی رہ گئی تھی کیونکہ آبدار جسے انھوں نے کبھی پیار سے نہ دیکھا تھا جس کے لیے مامتا کے جذبات ابھر نہ سکے تھے جب وہ دنیا سے گئی تھی انھیں مجرم بنا گئی تھی۔ہم انسان بیک وقت ظالم بھی ہوتے ہیں مظلوم بھی بس اگر جب وقت ہمارے اختیار میں ہو ہم اپنے حصہ کے مجرم کو معاف کرنے کا ظرف پیدا کرلیں تو زندگی پچھتاوے کی قید سے

نکل آئے لیکن یہ بات جب سمجھ آتی ہے تو بہت سے پیارے لوگ قبر میں اتر چکے ہوتے ہیں اور معافی کی چاہ......زندگی کو پچھتاوا بنادیتی ہے۔

''میں نے محمود خان کو معاف کیا'' وہ جو کہتی تھیں کہ محمود خان کو معاف نہ کریں گی۔خود کو جب سے آبدار کا مجرم پاتیں معافی کی خواستگار ہوئی تھیں۔شاہ زیب سے بات ہوتی تھی تو اس سے کہتی تھیں کہ وہ عریم کے ذریعے محمود خان تک ان کا معافی نامہ پہنچادے۔وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ محمود خان تو آبدار کی بددعاؤں کے حصار میں ہے......آبدار کی زندگی ان کے سبب ہی اذیت وشرمناک تھی اور وہی اس کی زندگی چھیننے کا سبب بن گئے تھے۔محمود خان زانی ہی نہیں قاتل بھی تھے اپنی ہی بیٹی کی گود اجاڑ دی تھی اور آبدار کے لئے ذلت کا گڑھا کھود گئے تھے۔ یہاں تھوڑی سی شرافت وانسانیت دکھا جاتے تو شاید آبدار زندہ ہوتی اور وہ زندگی کی قید سے آزاد ہوجاتے لیکن انھوں نے آبدار کے لیے ذلت کا انتظام کر کے اس کے لیے موت کا جو جال بچھایا تھا اس میں خود گرفتار ہوگئے تھے کہ اللہ کی حکمت کے آگے ان کی ہر چال ناکام تھی اور یہ بات جس انسان کو سمجھ آجائے اس کا خیر کا سفر شروع ہوجاتا ہے۔اور جو نہ سمجھ پائے خود کو عقل کل سمجھ کر فرعونیت پر کمر بستہ ہو اس کو ڈوبنے کے لیے چلو بھر پانی بھی نصیب نہیں ہوتا۔دنیا میں عبرت کا نشان بن کر رہ جاتا ہے۔

کبیر عباسی نے بیوی کے آنسو صاف کیے تھے اور وہ اللہ کی اس نعمت پر شکر ادا کرتیں شوہر کو دیکھ مسکرادی تھیں۔پس ثابت ہوا ہر مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔

ہاتھ پھیلائے سرِ راہگزر جانے دو
چاہنے والے کو اس طرح تو مر جانے دو
سونے دیتی ہے کہاں چشم شرر بار مجھے
اپنے گیسو مرے چہرے پہ بکھر جانے دو
کس کو ہے حسرتِ آسائشِ جاں دنیا میں
جس طرح سے بھی گزرتی ہے گزر جانے دو
قیدِ زنداں سے تو بہتر ہے رہائی میری
زندہ رہنے نہیں دیتے ہو تو مر جانے دو
توڑ دو سلسلہ وہم و گماں کی کڑیاں
ورنہ اقدار کا شیرازہ بکھر جانے دو
سطوتِ جبر کو ٹوکے، ہے یہ کس میں جرات
جو بھی الزام ہے تقدیر کے سر جانے دو

چھین لو مجھ سے رواداری اِحساسِ وفا
یا درِ یار پہ با دیدہ تر جانے دو
ان کا آنا بھی ہے اندازِ تغافل جیسا
دو گھڑی بیٹھے نہیں، کہتے ہیں گھر جانے دو
چاند ہو تم تو مرا ساتھ کہاں تک دو گے
مجھ کو مانگے کی بلندی سے اتر جانے دو
اپنے قابو میں نہیں دل کا سفینہ ناظر
جس طرف رخ ہے ہواؤں کا ادھر جانے دو

☆......☆......☆

''کیا ہوا عرمی' یہاں ایسے کیوں کھڑی ہو۔'' عریم کو لان میں کھڑے دیکھ وہ حیران سا اس کے سامنے آن رکا تھا۔ اس نے آواز پر چونک کر شاہ زیب کو دیکھا تھا۔

''ویسے ہی......'' آنسو رگڑتی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی شاہ زیب حیرت زدہ سا اس کے پیچھے ہی بڑھنے لگا تھا۔

''کسی نے کچھ کہا ہے عرمی' کوئی بات ہوئی ہے؟'' وہ کمرے میں پہنچتے ہی عریم کو کاندھوں سے تھام گیا تھا۔

''ہم جیسے حرماں نصیبوں کو کوئی کچھ کیا کہے گا......ہم تو بس اپنے نصیب کا بھگت رہے......دوسرے کے جرم کی سزا میں ہیں۔'' وہ خالی خالی نظروں سے شاہ زیب کو دیکھتے ہوئے بے بسی سے منمنائی تھی۔

''عریم' صاف کہو ناں' مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔'' وہ الجھ کر بولا تھا۔

''مجھے لگا تھا کہ میرا ایثار، میرا صبر رنگ لائے گا شاہ! لیکن' میں تو آج بھی صرف محمود خان کی بیٹی ہوں ......میری برداشت' میری قربانیاں بھی مجھے اس گھر کی بہو نہ بنا سکیں آج بھی مجھے جب ذلیل کیا جاتا ہے تو صرف اس لیے کہ میں محمود خان کی بیٹی ہوں جو رویہ ماضی میں آبدار کے ساتھ روا رکھا گیا اب وہی میرا نصیب ہے اور جیسے گھٹ گھٹ کر جیتی بلآ خر آبدار مرگئی ایک دن میں بھی مر جاؤں گی۔'' وہ سسکنے لگی تھی۔ شاہ زیب نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور بیڈ پر بٹھاتے ہوئے اس کے لئے جگ سے پانی نکالا تھا۔ وہ بڑی خامشی سے گلاس تھام کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی تھی۔ شاہ زیب نے دھیمے سے اس سے پوچھا تھا اور وہ تفصیل اس کے سامنے رکھ گئی تھی۔ جس وقت مریم نے آئیکت کے ساتھ جانے کی ضد کی تھی اور آئیکت اسے بہلا کر چلا گیا تھا اسی وقت رخسانہ وہاں چلی آئی تھیں۔ وہ کافی خاموش ہوگئی تھیں مگر اس وقت وہ اس پر غصہ ہو رہی تھیں آئیکت کی بے رنگ زندگی کا قصوروار اس کے باپ کو ٹھہراتیں اس کو کافی سنا گئی تھیں۔ وہ آگے سے چپ رہی تھی کہ

اس نے گزشتہ گیارہ سالوں میں کبھی ساس کو پلٹ کر جواب نہیں دیا تھا اول تو ماں کی تربیت ایسی نہ تھی دوم وہ باپ کے جرم کی وجہ سے بھی کسی کے سامنے خود کو نظر اٹھانے کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ مومنہ، اس کی نند کا رویہ اس کے ساتھ کافی اچھا تھا کہ مومنہ بے ضرر سی تھی اس کے لیے ہر چھوٹی خوشی معنی رکھتی تھی اور وہ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ شادی سے پہلے جو روک ٹوک اور سختیاں جھیلیں تھیں وہ شادی کے بعد ختم ہو گئی تھیں اس کا شوہر بہت اچھا تھا جس وقت شادی ہوئی وہ بی اے سال اول کی طالبہ تھی کیونکہ شاہ زیب نے خود سے کیا عہد نبھایا تھا بہن کو اعتماد دیا تھا اور اس کی تعلیم کا سلسلہ پھر شروع کروا دیا تھا جس پر مومنہ بہت خوش تھی اور شادی جس سے ہوئی وہ ایک اچھا جیون ساتھی ثابت ہوا اس نے شادی کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ماسٹرز کر لیا تھا۔ مومنہ کو دیکھ شاہ زیب بے حد خوش تھا کہ اس کی بہن کی زندگی سنور گئی تھی۔ آمنہ کا رویہ البتہ عریم کے ساتھ تحقیر آمیز ہوتا تھا وہ میکے بہت کم آتی تھی والدین کی وفات کے بعد یہ سلسلہ مزید رک سا گیا تھا وہ شاہ زیب سے محبت کرتی تھی اور اسی لیئے عریم سے اسے ایک خاص قسم کا بیر تھا۔ اس کی شادی شدہ لائف درمیانی درجہ کی بہتر گزر رہی تھی اس کی ساس سخت مزاج تھی البتہ شوہر کی طرف سے اطمینان تھا لیکن وہ آج بھی شاہ زیب کو بھلا نہیں پائی تھی کہ جس انسان کی محبت کو عمر کے ساتھ پروان چڑھایا تھا وہ شخص نصیب نہ تھا مگر دل سے نکلتا بھی نہ تھا۔ یہ چاہت کے سلسلے بڑے ہی جان لیوا ہوتے ہیں انسان کو کبھی زندگی دان کر دیتے ہیں کبھی زندگی چھین لیتے ہیں۔ کسی کی زندگی کو آنسو تو کسی کی زندگی ہنسی بنا دیتے ہیں۔ کوئی وصل کی خوشبو سے محروم کر دیا جاتا ہے اور کوئی ہجر کے لئے نہیں بنا ہوتا...... کون' کب' کیا پا لے...... کب' کس چیز سے محروم ہو جائے یہ انسان کو سمجھ نہیں آتا۔ انسان محبت کرنے میں بے اختیار...... نفرت کے معاملے میں بھی بے اختیار...... محبت کیوں ہوئی انجان...... نفرت کیوں ہے بھی انجان...... بس بے اختیاری کی کیفیت میں بھی ایک اختیار کی کیفیت پنہاں ہوتی ہے جو اس ڈور کو تھام لیتا ہے وہ کامیاب کچھ پا کر بھی مطمئن کچھ نہ پا کر بھی پرسکون اور جو اس ڈور پر گرفت نہیں کر پاتا عمر بھر کے پچھتاوے اس کا مقدر بن جاتے ہیں۔ پچھتاوے سے بچنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ جب اختیار کی ڈوری کھینچی جائے تو صبر کرے اور اختیار کی ڈور سونپ دی جائے تو معاف کر دے کہ مظلوم بھی ظالم بننے لگے تو زندگی صرف انتقام و بدلہ کے پر جوش خون سے رنگ جاتی ہے اور نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں سکون کھو جاتا ہے اور پچھتاوا عمر بھر کا روگ بن جاتا ہے۔

''ایسے مت بولو عریم...... تمہاری یہ باتیں مجھے تکلیف دیتی ہیں۔'' وہ رخسانہ اورکزئی کی باتیں ان کا رویہ کہتی جا رہی تھی کہ شاہ زیب نے اسے ٹوکا تھا۔

''تکلیف تو مجھے بھی ہوتی ہے شاہ! مگر مجھے کب تک میرے باپ کے کیئے کی سزا کے طور پر زیر عتاب لایا جاتا رہے گا...... جو اپنے کیے کی سزا خود بھگت رہا ہے...... جو آج نہ زندوں میں ہے...... نہ مردوں میں...... جس کی زندگی صرف دوسروں کے لئے عبرت کا نشان ہے۔'' وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

''تمہیں' ماما کسی کے کیئے کی سزا نہیں دے رہی ہیں عرمی' ماما تو خود پچھتاووں کی آگ میں جل رہی ہیں ایسے میں کبھی تلخ ہو جاتی ہیں تو

تم نظرانداز کر دیا کرو......'' وہ عریم کو کاندھے سے لگا کر اس کی پیٹھ تسلی دینے والے انداز میں تھپکتے ہوئے نرمی سے کہنے لگا تھا۔

''شاہ میں نے تو آنٹی کو کبھی ایک حرف بھی نہیں کہا مگر آئیکت بھائی اگر شادی کے لئے راضی نہیں ہوتے تو اس میں میری کیا خطا ہے جو مجھے سنایا جاتا ہے کہ آئیکت بھائی اگر یوں جوگ لیے پھر رہے تو میرا باپ اور میں ذمہ دار ہیں۔'' وہ اس سے الگ ہوتی بہت تڑپ کر بولی تھی۔

''جس طرح آبدار کی موت ہوئی ہے وہی ماما کے لئے بہت بڑی سزا ہے وہ خود کو معاف نہیں کر پاتیں اور آئیکت کی بے رنگ زندگی ان کے پچھتاووں کو بڑھا دیتی ہے اس لیے وہ تمھیں کچھ کہہ دیتی ہیں تو تم درگزر سے کام لیا کرو عری......رشتوں کو مزید مت الجھنے دو۔'' وہ روتی ہوئی بیوی کا ہاتھ تھام گیا تھا اسے عریم سے محبت تھی اور اس نے بدلہ کی آگ میں جلتے جو کیا تھا بس وہی کیا تھا وہ اپنے بچے کی موت' محمود خان کی حالت اور آبدار کی موت کے سبب سب کچھ فراموش کر گیا تھا وہ عریم سے بے حد محبت کرتا تھا اور ایک اچھا جیون ساتھی ثابت ہو رہا تھا عریم نے اگر اس کی محبت میں سب کچھ تیاگ دیا تھا تو شاہ زیب نے اس کے مقدر کو سونے نہیں دیا تھا وہ اپنی محبت سے اپنی وفا اور ایثار سے شاہ زیب کا دل جیت گئی تھی اور شاہ زیب ہر غلط سوچ اور بدلہ کو بھول کر عریم کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وقت گزرنے کے بعد پچھتاوے اس کا مقدر ہوں اس لیے اس نے اپنی سوچ کو مثبت راہ دے کر خود کو پچھتاووں میں گھرنے اور عریم کی نظروں سے گرنے سے بچا لیا تھا۔

''میں بہت کوشش کرتی ہوں شاہ' مگر میں آئیکت بھائی کے لیے کچھ نہیں کر پاتی ان کی ویران زندگی تو مجھے چین نہیں لینے دیتی...... پاپا' کے ظلم آپ سب کے سامنے نظر اٹھانے نہیں دیتے۔'' وہ شاہ زیب کے ہاتھوں پر سر رکھ گئی تھی۔

''سب نے یہ بھلا دیا ہے عری کہ تم محمود خان کی بیٹی ہو بس حوالہ کا پتہ کبھی کبھی ہوا سے الجھ بیٹھتا ہے تو سرسراہٹ تمھارے کانوں میں زہر گھول دیتی ہے جو لوگ پہلے ہی اپنے رویوں کے باعث نادم ہیں وہ اپنے رویے خراب کر کے باقی معاملات بھی بگاڑ نہیں سکتے مگر انسان ہیں ناں چوک ہو جاتی ہے تم بس درگزر کرنا سیکھو۔'' وہ بہت محبت سے اسے نئے پہلو سے آشنائی دے گیا تھا۔ یہ بات تو عریم بھی مانتی تھی کہ جن حالات میں شادی ہوئی اور پھر جس طرح اس کے باپ محمود خان کی پلاننگ کے سبب آبدار مر گئی تو جب وہ رخصت ہو کر اور کزئی ہاؤس آئی تھی تو اسے ڈر تھا کہ اس گھر کے مکین اسے برداشت نہ کریں گے اسے طعنہ دے کر ذلیل کر کے چند دنوں میں ہی اورکزئی ہاؤس سے نکال باہر کریں گے مگر وہ سب اس کے ساتھ بہت نارمل رویہ رکھے ہوئے تھے۔ رخسانہ کبھی روایتی ساس ثابت نہ ہوئی تھیں ایسے میں اگر کبھی تلخ ہو جاتی تھیں تو اسے ہی برداشت سے کام لینا تھا۔

''شاہ! آپ کو تو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے ناں......؟'' شاہ زیب نے اسے دیکھا تھا جو آنکھوں میں آنسو لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کوئی ایک شکایت ہو تو کہوں بھی......تم شکایت کی بات کرتی ہوں یہاں تو معاملہ شکایات تک پہنچا ہوا ہے۔'' وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا اور وہ تڑپ اٹھی تھی۔

''ایسے تو نہ کہیں شاہ.....'' وہ گویا بے چین ہو گئی تھی۔

''پھر کیسے کہوں عرمی.....اب سچ بھی نہ بولوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔

''میری تو پوری کوشش ہوتی ہے میری ذات سے آپ کی فیملی کو اور آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے.....کوئی شکایت نہ ہو مگر میں اپنی کوشش میں نا کام ہو گئی ہوں.....'' وہ رونے لگی تھی۔

''ہاں' نا کام تو تم ہو گئی ہو مگر اب کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔'' وہ بے حد معصومانہ وقدرے بے چارگی کے احساس میں گھر کر بولا تھا۔

''آپ مجھے بتا دیں آپ کو مجھ سے جو' جو شکایات ہیں.....میں انھیں دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی۔'' وہ اس کے ہاتھ تھام کر عزم سے بولی تھی۔

''مجھے تو بس یہی شکایت ہے کہ تم مجھ سے اتنی محبت کیوں کرتی ہو.....کیوں رکھتی ہو میرا اتنا خیال.....کیسے تم مجھ سے اتنی بے لوث محبت کر لیتی ہو.....کیسے تم نے میرا ہر برا رویہ بھلا دیا.....'' وہ مدھم پر فسوں لہجہ میں استفسار کر رہا تھا۔

''آپ بہت خراب ہیں شاہ' میری جان نکال دی تھی آپ نے.....'' وہ جو شکایات کا لفظ سن کر ہی سہم گئی تھی اس کی وضاحت پر مطمئن ہو کر ہاتھ کا مکا سا بنا کر اسکے سینے پر مار گئی تھی۔ وہ اسے دیکھنے لگا تھا جس کا چہرہ دو منٹ پہلے زرد ہو رہا تھا اب گلابیاں چھلکانے لگا تھا۔ یہاں آ کر ہی تو شاہ زیب بے بس ہو جاتا تھا عریم کی بے پناہ سب کچھ نچھاور کر دینے ،لٹا دینے والا انداز محبت شاہ زیب کو فخر میں مبتلا کرنے کے ساتھ' بے چین بھی کر دیتا تھا۔

''جان نکالی نہیں ہے مگر میری بات کا جواب نہ دیا تو جان سچ میں نکال دوں گا۔'' وہ خجالت مٹانے سوچ کا اثر زائل کرنے کو برہم ہوا تھا اور وہ ہنس دی تھی.....ہنسی کیا تھی یوں لگا تھا دکھ کی بھٹی میں جلتی زندگی کو خوشی کا شعلہ مل گیا ہو وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ گیارہ سال کم نہیں ہوتے مگر اس کا شباب آج بھی عین عروج پر تھا کہ کلی پھول تو کب کی بن چکی تھی اور اب پھول بہاروں سے جا ملا تھا۔

''محبت کیوں کرتی ہوں یہ تو نہیں جانتی شاہ! مگر محبت کرنا چھوڑی تو مر جاؤں گی۔'' وہ بہت نرم لہجہ میں بولی تھی۔

''اتنی شدید محبت کرنا کہاں سے سیکھا ہے عریم..؟'' وہ اسکے جذبوں کے آگے خود کو جھکتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

''محبت کرنا سیکھا' سکھایا نہیں جاتا.....محبت تو وحی کی صورت دل میں نازل ہو جاتی ہے اور آپ تو میری زندگی ہیں.....میرا عشق اور آپ کی ہر خطا میری محبت کی نظر میں ایسے ہے جیسے خطا سرزد ہی نہ ہوئی ہو.....میرے لیے آپ کا ساتھ با معنی ہے اس کے بعد ہر بات بے معنی یہاں تک کہ یہ بھی کہ آپ میرے ساتھ کچھ غلط کر چکے ہیں.....میری محبت کا قلب بہت وسیع ہے شاہ! جس میں آپ کی محبت یوں سمائی ہے کہ آپ کے غصہ' ناروا سلوک اور زیادتی کو ٹھہرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔'' وہ لفظوں و لہجہ میں شاہ زیب کی محبت سمو کر بولی تھی۔ شاہ زیب نے اس کی حسین آنکھوں میں اپنا عکس دیکھا تھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

''عریم' میں بھی تم سے بہت محبت کرتا ہوں تم نے اپنی وفا سے اپنی محبت سے مجھے جیت لیا ہے.....میرے دل کو جیت لیا ہے۔'' وہ

اس کے مخملی ہاتھ پر لب رکھ گیا تھا وہ حیا سے سرخ پڑتی مسکرائی تھی۔

''میری دعا ہے ہمارا ساتھ ازل سے ابد تک قائم رہے۔'' وہ حیا سے چہرہ جھکا کر بولی تھی اور شاہ زیب 'آمین' کہتا دل کشی سے ہنس دیا تھا۔ان کی زندگی آگے محبت کی جیت سے سرشار بے حد آسودہ گزرنے والی تھی کہ جب انسان اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر نہ صرف معافی مانگ لے آئندہ گزشتہ کسی غلطی کو دہرائے بھی نہیں......تو زندگی مسکرا اٹھتی ہے برائی اور بدلہ ہار جاتا ہے اور اچھائی اور محبت جیت جاتی ہے۔عریم نے شاہ زیب کو دیکھا تھا جس کا بے مہر و سنگدلانہ رویہ یوں امرت سمجھ کر پیا تھا کہ آج وہ اپنے پیا کو'اس کی محبت کو جیت گئی تھی وہ جیت سے سرشار محبت سے شاہ زیب کی کھلی کھلی مسکراہٹ دیکھ رہی تھی یہ مسکراہٹ اس کی محبت کی جیت تھی وہ 'ماشاللہ' کہتی اس کے سینے پر سر رکھ گئی تھی۔

''آئی لو یو جان شاہ......'' اس نے عریم کے کان کی لو چومتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔عریم چھوئی موئی سی ہوتی پر حجاب مسکان چہرے پر سجائے محبت کو اپنے آس پاس محسوس کرتی کھلکھلائی تھی کہ جیت کر اس نے شاہ زیب کو پایا تھا اور ہار کر شاہ زیب اسے پا گیا تھا۔

''آئی لو یو ٹو جان عریم......'' وہ آج پہلی دفعہ محض شاہ زیب کی نقل کرتے ہوئے اسی کی طرح محبت کا جواب محبت سے دے گئی تھی وہ عریم کی شرارت پر دل کو جھومتا ہوا محسوس کر رہا تھا اس نے عریم کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا وہ گھبرائی تھی' قدرے شرمائی تھی اور کمرہ شاہ زیب کے محبت اور جیت سے مخمور قہقہہ سے گونج اٹھا تھا۔

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں' ہاروں تو پیا تیری

☆......☆......☆

''آبی! دیکھو جن لوگوں کی نظر میں تم خار بن کر چبھتی تھیں وہی لوگ اب تم سے معافی کی آرزو میں سانس بھرتے......اشک ندامت پیتے......نظر چرائے پھرتے ہیں۔'' آبدار کی گیارہویں برسی کا اہتمام تھا۔غریبوں میں کھانا تقسیم کیا گیا تھا۔گھر میں قرآن خوانی کروائی گئی تھی۔خاندان اور ملنے جلنے والے جو آبدار کے گھر سے فرار پر طرح طرح کی باتیں بناتے تھے اس کی جواں مرگی نے کچھ کے منہ پر چپ کے تالے ڈال دیئے تھے اور کچھ لوگ جنہیں دوسرے کے زخموں کو کریدنے کا مرض لاحق تھا انہیں آبدار کے اغوا کا بتا کر انہیں منہ پر افسوس اور پیٹھ پیچھے توبہ تلا کرنے کا موقع فراہم کر دیا گیا تھا۔وہ آج بھی آبدار کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے گیا تھا۔سرشام گھر آ گیا تھا اسے عریم کے ذریعے برسی کے اہتمام کا پتہ چلا تھا اور وہ بس ایک نظر رخسانہ اور کزئی کے متورم چہرے اور جہانزیب اور کزئی کے سوگوار انداز پر ڈالتا اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔اس نے آبدار کی تصویر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر الٹی رکھی ہوئی تھی ملازمہ کمرے کی صفائی کر کے وہ فریم بھی چمکا کر واپس الٹا کر جاتی تھی کہ پہلی دفعہ تصویر سیدھا کرنے پر آئیکت نے ملازمہ کو صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ تصویر سیدھی نہیں ہوگی جس کی قسمت ہی بگڑ گئی تھی جس کی ہر ترتیب الٹی پڑی تھی ہر خواہش ادھوری رہ گئی تھی وہ اس کی تصویر کو سیدھا کرنے کی چاہ ہی بھلا بیٹھا تھا۔آج پورے دس سال اور گیارہ ماہ بعد اس نے تصویر کو سیدھا کیا تھا۔آبدار کا خوبصورت بے ریا چہرہ جو پتلیوں میں برسوں سے ٹھہرا تھا مجسم حقیقت بنا سامنے

تھا مگر کچھ حقیقتیں بڑی جان لیوا ہوتی ہیں......زندگی چھین کر سانسیں دان کر جاتی ہیں......فریم پر آئیکت کے آنسو گرے تھے اور وہ خود کلامی سے نکل کر تصویر سے بات کرنے لگا تھا۔

''معافی کی خواہش میں تو میں بھی جی رہا ہوں میرا قصور بس اتنا ہے کہ میں نے تمھیں زندگی کی وہ خوشی دینا چاہی جو تمھارا نصیب نہ تھی......میری تدبیر تمھاری تقدیر کے ہاتھوں مات کھا گئی...... جسے تم نے جیتنا چاہا وہ تمھاری شکست بنا میری محبت کے نصیب میں بھی مات لکھ گیا میں تمھیں جیت نہ سکا آبی......''اس کے آنسو تصویر پر گرتے جارہے تھے۔آبدار کو ابسام کی محبت پانے کے لئے آزاد کرتا وہ آج اپنی ہی محبت کے آگے شرمسار تھا کہ اس نے اعتبار کی مالا توڑ ڈالی تھی......وہ زندگی میں کبھی کوئی فیصلہ درست نہیں لے پایا تھا......اس کا غلط فیصلہ ہی تھا جو آبدار کو در بدر کرتا موت کی آغوش میں پہنچا گیا تھا......یہ اس کا ہی غلط فیصلہ تھا کہ آبدار کی محبت ابسام دینے کی آرزو میں وہ آبدار کا واحد سہارا دوستی چھین گیا تھا۔اس نے آبدار سے درد بانٹنے کی وجہ چھین لی تھی وہ یہ بھول نہیں پاتا تھا کہ آخری ملاقات میں آبدار اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی......وہ کتنا بھروسہ کرتی تھی..اس کی دوستی پر کیسا مان تھا اور وہ سب بکھیر گیا تھا۔

میری زندگی سنواری مجھ کو گلے لگا کے
بیٹھا دیا فلک پہ مجھے خاک سے اٹھا کے
یارا تیری یاری کو میں نے تو خدا مانا
یاد کرے گی دنیا تیرا میرا افسانہ
تیرے جیسا یار کہاں ، کہاں ایسا یارانہ
میرے دل کی یہ دعا ہے کبھی دور تو نہ جائے
تیرے بنا ہو جینا وہ دن کبھی نہ آئے
تیرے سنگ جینا یہاں' تیرے سنگ مرجانا
یاد کرے گی دنیا تیرا میرا افسانہ

وہ تصویر پر چہرہ ٹکائے بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

''آئیکت ! آپ میرا واحد سہارا ہیں...... مجھے تو ماں' باپ' بہن' بھائی ہر ایک رشتہ نے ٹھکرا دیا بس ایک آپ کی دوستی......آپ کا محبت بھرا ساتھ میرے لئے سب کچھ ہے...... مجھے لگتا ہے کہ جس دن آپ کا مہربان ساتھ چھوٹا میں تو مر ہی جاؤں گی۔''اس کے کان میں آبدار کی آواز گونجی تھی یہ بات اس نے ابسام کے گھر جانے سے پہلے اپنی حقیقت کے عیاں ہونے کے بعد بھی آئیکت کو اپنے ساتھ پا کر بہت خلوص سے کہا تھا۔

''میں تمھیں کھونے سے ڈرتا تھا آبی......اور میں نے تمہیں کھو دیا......دوستی کی مالا توڑ ڈالی......آبدار تم نہیں مریں......مر تو میں گیا ہوں......کاش میں تم سے کہہ دیتا کہ آبی میں تم سے ناراض نہیں ہوں تمھیں ابسام سے محبت ہے تو بس تمھاری محبت کے لیے اپنی محبت چھوڑ

رہا ہوں......'' کمرے میں اس کی سسکیاں سفر کر رہی تھیں۔ پچھتاوے کا ناگ اسے ڈس رہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے آئیکت جیسے میرا ناپاک وجود محبتوں کے لئے بنا ہی نہیں ہے...... مجھے لگتا ہے جو خواہش مجھے اپنی اور کھینچ رہی ہے آپ کا مہربان ساتھ لے کر ہی ٹلے گی......'' اسے روتے ہوئے آبدار کی بات یاد آئی تھی جو اس نے ابسام کے گھر پر بات کرتے ہوئے کہا تھا اور جس پر ہی تو وہ ٹھٹک گیا تھا اور اس کے بعد جائزہ لیتا رہا تھا اور جس دن ابسام کا گھر چھوڑا تھا اس دن جو آبدار کی حالت تھی۔ وہ شک یقین میں بدل گیا تھا کہ آبدار کو ابسام سے محبت ہو گئی ہے......جس وقت آبدار نے کہا تھا کہ آئیکت دنیا کا آخری مرد بھی ہوا تو وہ اس سے شادی نہ کرے گی......رہی سہی کسر پوری ہو گئی تھی۔ آئیکت جان گیا تھا کہ آبدار نے ایسا صرف اسے بدگمان کرنے کو کہا تھا اور اسی لئے تو وہ آبدار پر غصہ ہوا تھا تا کہ زندگی اسے آگے بڑھنے' محبت پانے کا موقع دے تو وہ آئیکت کے احسانوں تلے دبی آگے بڑھنے میں ناکام نہ ہو جائے مگر آئیکت یہ نہیں جانتا تھا کہ جس کو قسمت ٹھکرا دے' جو بنا رشتہ بنا نام و مقام کے دنیا میں آنکھ کھولیں وہ بنا کسی پہچان کے ہی مر جاتے ہیں کہ کچھ لوگوں کی قسمت مہربان نہیں ہوتی اور جبر مسلسل کا سلسلہ ختم ہوتا ہے تو میٹھی نیند سو جاتے ہیں زندگی پہچان کی آرزو میں ہی مٹ جاتی ہے حرف غلط کی مانند......! اور یہ دوسروں کے لئے عبرت ہی تو ہوتی ہے جو سمجھ گیا وہ کامیاب ہوا زندگی کی اصل جیت نصیب ہوئی اور جو نہیں سمجھا نفس کی غلامی کی اس نے اپنی ہر نسل کے لئے خسارے چن لئے۔

آئیکت نے ایک نظر آبدار کی تصویر کو دیکھا تھا تصویر مکمل تھی مگر زندگی کتنی ادھوری تھی......آنسو قطرہ قطرہ کر کے آنکھوں سے نکلتے...... گالوں پر بہتے......آبدار کی تصویر پر گرنے لگے تھے......لب سے اک آہ نکلی تھی جو تصویر کے شیشہ سے ٹکراتی معدوم ہو گئی تھی......کمرے میں موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا وہ زندہ آبدار کو مرتے دیکھ رہا تھا......قبر میں اتار آیا تھا اور آج بھی گیارہ برس بعد بھی اس کا دل کہتا تھا آبدار کوئی بات کرو......آبدار معاف ہی کر دو......آبدار لوٹ کر نہ آؤ......ساتھ ہی لے جاؤ......زندگی میں تو ساتھ جی نہ سکے......مر کر ساتھ جی لیں گے...... ذرا سی بات ہی کر لو......مگر تصویر چپ تھی......آئیکت کے جذبات مگر آج بھی بولتے تھے اور زندہ رہنے تک بولتے ہی رہنا تھا......آبدار کی تصویر آئیکت کے ہاتھ میں تھی......ایک اور سیاہ رات اس سے محو کلام تھی اور ہجر کی لمبی کالی راتیں کاٹنے کو خود کلامی بھی بڑا سہارا ہوا کرتی ہے!

چپ چاپ بہت ہو تم
کوئی بات کرو جاناں!!!
محروم وفا ہوں میں
تیرے در پہ کھڑا ہوں میں
خیرات کرو جاناں!!
کوئی بات کرو جاناں!!!
دور ہو تنہائی

میرے خواب میں آجاؤ
اتنا تو کرو جاناں!!
یہ ہجر کی کالی رات
ہمیں دے نہ جائے مات
اسے سحر کرو جاناں!!
کوئی بات کرو جاناں!!!
الفت کی وادی میں
دکھ سکھ کا ساتھی ہوں
میرے ساتھ چلو جاناں!!
کوئی بات کرو جاناں!!!
میں کیسا دیوانہ ہوں
تیری تصویر سے کہتا ہوں
چپ چاپ بہت ہو تم
کوئی بات کرو جاناں!!!

☆......☆......☆

قطرہ قطرہ رات بھیگ رہی تھی۔ کھڑکی کے سامنے کھڑا وہ شخص آج بھی گہرے ملال میں تھا، کئی رتوں کے افسوس میں گھرا، نئی رتوں سے ناراض وہ شخص کسی کو یاد کر رہا تھا۔ اس کی بیٹی اس کے پاؤں سے آ کر لپٹ گئی تھی جسے وہ گود میں اٹھاتا بستر پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اسے اللہ نے گزشتہ 10 برسوں میں چار بیٹیوں سے نوازا تھا اور اسے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی جس کی عمر ڈھائی سال تھی۔ بے حد عزیز تھی۔ اس کی آنکھوں میں کسی کا عکس یوں سمایا تھا کہ اسے اپنی بیٹی کے لئے شفقت سے بڑھ کر احترام کا جذبہ امڈتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ نوائم کے ساتھ وہ بظاہر بے حد خوش تھا۔ اس کے دل کا کونا ویران، گنجان، غیر آباد تھا۔ اس نے کبھی نوائم پر یہ عیاں نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ کسی کی محبت دل میں چھپائے اس کی موت کا غم مناتا ہے۔ مومل اس کے دکھ کی گواہ ہی نہیں شریک بھی بن گئی تھی۔ اس نے آبدار کی موت کے بعد مومل کے پوچھنے پر کہ وہ آبدار سے محبت کرتا ہے، وہ اقرار کر گیا تھا۔ اس نے مومل کے سامنے دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ مومل اس کے دل کی راز کی امین تھی۔ مومل کا دل آبدار کی محبت کو محسوس کر کے ہی تو محبت محسوس کرنے لگا تھا۔ آبدار کی ناگہانی موت نے مومل کے ذہن و دل پر بھی گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ نوائم سے اپنے اس دکھ کو بانٹ نہیں سکی تھی۔ وہ یہ دکھ عبیر سے بھی نہیں بانٹ سکتی تھی کہ وہ آبدار کے راز کو کسی کے سامنے عیاں کر

کے خائن نہیں بن سکتی تھی اور اسے تو ابسام کا بھی بھرم رکھنا تھا۔ابسام اور نوائم کی چھوٹی بیٹی جس کا نام صدف تھا وہ قوت گویائی وسماعت سے محروم تھی۔ یہ قدرت کی طرف سے آزمائش تھی۔ سزا تھی کہ جزا، وہ یہ بات کبھی جان نہیں پایا تھا نہ ہی جاننے کی کوشش کی تھی۔اس کا یہ ماننا تھا کہ اس کے رب کی مصلحت ہے۔اور وہ رب کی رضا میں راضی و مطمئن تھا۔نوائم نے بھی کبھی شکوہ بلند نہ کیا تھا وہ ہر حال میں راضی رہنے والی صابر شاکر ٹائپ لڑکی تھی۔ وہ شوہر کا کھویا کھویا بے حد چپ انداز محسوس کرتی تھی لیکن وہ اگر بھرم رکھنا چاہتا تھا تو وہ اس کو توڑ نہیں سکتی تھی۔اس نے شوہر کی وفا اور محبت میں کسی قسم کی کبھی کمی نہ کی تھی۔ان کی زندگی بے حد خوش وخرم انداز میں گزر رہی تھی۔ابسام کی طرف سے محبت کا خالی پن اسے کبھی کبھی اداس کر دیتا تھا مگر وہ اف نہیں کرتی تھی کہ وہ اس کیفیت سے ڈرتی تھی کہ بات کہی اور کہہ کر گنوائی وہ دونوں کا ہی بھرم رکھتی تھی۔ وہ جس وقت کمرے میں آئی،صدف کو وہ گود میں لئے اس کے ماتھے پر شفقت بھرا بوسہ دے رہا تھا اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔نوائم کے لئے یہ منظر ہمیشہ آسودگی کا باعث تھا، وہ اپنی بیٹیوں پر بہت مہربان ایک شفیق باپ تھا۔اس نے کبھی بیٹے کے لئے خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔حیدر صاحب اور فضہ حیدر نے بھی کبھی اسے بیٹے کا طعنہ نہیں دیا تھا۔ان کے لئے چاروں پوتیاں بے حد اہم تھیں۔وہ دونوں پوتیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔صدف میں تو ان سب کی جان تھی۔ڈاکٹرز کو دکھایا گیا تھا۔کچھ سالوں بعد ممکن تھا کہ اس کا علاج ہو سکے۔مگر بہتری کے چانسز پانچ فیصد بھی نہ تھے۔

''نوائم! جانے انجانے میں،میں تمہارے ساتھ زیادتی کر ہی جاتا ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔'' وہ بیوی کو خاموشی سے پلٹتے دیکھ کر اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے خود سے بولا تھا۔صدف اس کی گود میں سو چکی تھی۔اس نے پیتا سے لبریز نگاہ بیٹی کے معصوم سوئے ہوئے چہرے پر ڈالی تھی اور واپس کھڑکی میں آ کھڑا ہوا تھا۔

''آبدار! جو ہوا ایسا میں نے نہیں سوچا تھا۔ مجھے تو بس یہی لگا تھا کہ میں تمہیں خوش نہیں رکھ پاؤں گا،تمہیں مقام دلا نہیں پاؤں گا بس اس لئے،میں نے اپنی محبت دل میں دبا لی اور آج میری محبت میرے دل کا سب سے بڑا روگ بن چکی ہے۔ جینے کی آرزو میں روز مرتا ہوں،مرنے کی چاہ روز مجھے زندہ کر دیتی ہے۔''اس کی آنکھوں کی نمی رخساروں پر اترنے لگی تھی۔

''تم جیت گئیں آبدار!اور میں اپنی جیت بھی ہار گیا ہوں۔'' آسمان پر چاند اکیلا تھا۔ستارے کہیں دور چمک رہے تھے۔اسے لگا تھا کہ وہ بھی ایک چاند ہے،اکیلا، بالکل تنہا،اور آبدار ستاروں کے ساتھ مل گئی ہے۔اس کی نظر کے سامنے ہو کر بھی اوجھل ہے۔ابسام نے آنسو بہنے دیے تھے کہ کسی کی یاد میں،کسی کی محبت میں بہائے جانے والے اشک سنہرے آبدار سے کم نہیں ہوتے اور وہ آنکھوں سے گرتے موتی چنتا،آس پاس محبت کی خوشبو کو محسوس کرتا یادوں کو مزید گہرا ہوتا محسوس کرنے لگا تھا۔

''ابسام! میں کہیں بھی رہوں گی۔آپ کی محبت میرے دل میں جاوداں رہے گی۔ میں نے اپنی جیت،اپنی شکست سب آپ کی محبت کے نام کر دی ہے۔ جیت کر نہ سہی میں ہار کر آپ کو پا لوں گی۔آپ میری محبت کا اقرار بھلے نہ کریں،زندگی بسر میری محبت میں ہی کریں گے۔یہ دعویٰ نہیں میری ہار کی جیت ہے۔''فضا میں آبدار کا لہجہ مسکرا رہا تھا۔وہ آج پھر عہد کر گیا تھا کہ آبدار کی قبر پر ضرور جائے گا مگر یہ عہد

پچھلے گیارہ سال سے روز ٹوٹ جاتا تھا......آبدار کے دل......ابسام کی نیند کی طرح......اس کی نیند تو آبدار سو گئی تھی کبھی نہ جاگنے کے لیے......ابسام نے ایک خلش کے چلتے، تمام عمر سوئی آنکھوں، سسکتے دل کے ساتھ جاگنا تھا......اُس عہد کی تجدید کے لیے جو آبدار سے کیا ہی نہ تھا......

وہ خود آنسو بہائے گا ذرا تم مر تو جانے دو
مجھے واپس بلائے گا ذرا تم مر تو جانے دو
میں تیرا تھا، میں تیرا ہوں، ترا تا عمر رہنا ہے
بڑی قسمیں وہ کھائے گا ذرا تم مر تو جانے دو
وہ جن باتوں پہ ہنستا ہے مجھے دیوانہ کہہ کر
وہ سب باتیں بتائے گا ذرا تم مر تو جانے دو
اگر میں زندہ رہتا تو مجھے وہ خوش بہت رکھتا
یہ سب سے کہتا جائے گا ذرا تم مر تو جانے دو
جسے فرصت نہیں، فرصت میں مجھ کو یاد کرنے کی
نہ مجھ کو بھول پائے گا ذرا تم مر تو جانے دو
جو اب تنقید کرتا ہے میری شاعر مزاجی پر
غزل میری سنائے گا ذرا تم مر تو جانے دو
ابھی تو روٹھ کر مجھ سے وہ میلوں دور بیٹھا ہے
مجھے آ کر منائے گا ذرا تم مر تو جانے دو
جسے پاگل وہ کہتا ہے وہی پاگل اسے اک دن
بہت ہی یاد آئے گا ذرا تم مر تو جانے دو

ختم شد